

دلچسپ اور سنسنی خیز کہانیوں کا مجموعہ

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ کراچی

جنوری 2014

نگرانِ اعلیٰ

معراجِ وحول

پاک سوسائٹی ڈائجسٹ کا مہینہ

www.paksociety.com

www.paksociety.com

7
چینی ننگ چینی
مدیر اعلیٰ

فائز کی کہانیاں
نفسیاتی تحلیلی غنیمتیں اور کلاسیک

14
جلاو صفت
کاشف زبیر

حالات کو سنگین سے سنگین بنادینے والے
گڑبڑ کے تباہ کن نشان کا سنسنی خیز حوالہ

61
ہیرو
آصف ملک

ان جان لیوا لمحات کی اذیتیں جب
سانپ کا زہر بھی تریاق بن جاتا ہے...

75
چشم دید
سکندر علیم

باریک بینی سے ماحول میں پیدا ہونے
والے تغیر کا غیر معمولی ایہام

87
شکار گاہ
جمال دستی

ہم پیشہ... ہم خیال جوڑے کی ہمراہی
میں زینہ بہ زینہ عبور کرتے جرم کے مراہل

135
ایک تیر دو شکار
سلیم انور

جلنے اور بجانے شخصیت کے دو پہر
روپ..... جرم کی دنیا کا ڈھلائی ڈراپ سین

96
گروا جی
اسما قادری

تقدیر کی فسوں مری قہرمت کی چھابازی کا مقدّر
کا کھیل: ملے اور پھر مجھے ان لوگوں کی کہانی

91
بد مہ کا مالہ
بشری امجد

مخلص دوستوں کی سنگت... جو نفسیاتی
گرہوں کو سلجھانے کا ہنر رکھتے تھے...

جلد 44 • شماره 01 • جنوری 2014 • زیر سالانہ 700 روپے • قیمت فی پرچہ پاکستان 60 روپے

خط و کتابت کا پتہ: پوسٹ بکس نمبر 229 کراچی 74200 • فون 35895313 (021) نیکس 35802551 (021) E-mail: jdpgroup@hotmail.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

دوران ملازمت ایک دوسرے کے درمیان
بہسی چٹپٹا کھیت کا حیرت انگیز تجزیہ

زندگی کی بساط پر اندھ جوا کھیلنے
والے کھلاڑی کی ہوش ربا داستان

کھیل ہی کھیل میں زندگی
کا پانسہ پلٹ دینے والی بازی

سڑکی سب کے تن غم میں
ایک خیال انگیز کہانی...

بازی عشق میں دغا بازی کی
ملاوٹ کا تلخ و کسلا واقعہ

ایک اجنبی کی دوستی اور شناساکی
دشمنی کا سنسنی خیز فسانہ

سراپوں اور خوابوں کے سلسلے پر محیط ایک
خونی پرتو جس سے ہرق کہانی...

زندگی کی بازی ہار کے اپنی بالادستی
ثابت کر دینے والے قانع کا احوال



عزیزانِ من... السلام علیکم!

سال نو کا پہلا شمارہ مبارکباد کے ساتھ حاضر ہے۔ پچھلے ماہ نیلسن منڈیلا کی تدفین تو ہو گئی لیکن یہ نام تاریخ میں حریت قلم و قریض کے حوالے سے ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اپنے سیاہ فام ہم وطنوں پر گوری اقلیت کے وحشیانہ تسلط کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے کے جرم میں اس نے اپنی جوانی کے 27 برس سلاخوں کے پیچھے گزار دیے۔ آخر کار اسے جھکانے کی کوشش کرنے والے خود سرنگوں ہو گئے۔ خداری کی تہمت ملیا میٹ ہو گئی۔ وہ اپنی قوم کا محسن اور ہیرو قرار پایا۔ اسے کہتے ہیں سیاسی مہتمما۔ اب ذرا ہم اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیں۔ ہر آنے والی قیادت اپنی پارسیائی کے گن گاتے ہوئے، جانے والوں کے ہزاروں میب گنوا رہی ہے۔ جب وہ چلے جاتے ہیں تو ان کے کارنامے سامنے آنا شروع ہو جاتے ہیں۔ ہمارے ملک میں سارے مسائل کی جڑ صرف ایک ہے۔ ہم قیادت کے بحران سے دوچار ہیں۔ مسائل ہیں اور ان کے حل کے لیے وسائل بھی دستیاب ہیں، مگر یہ تو صرف اور صرف بے لوث قیادت کی۔ ہم یورپی یونین کو پکڑے کی ڈیوٹی فری برآمد کی اجازت ملنے پر بھٹیس بہا رہے ہیں کہ ہماری یہ برآمدات ایک ارب ڈالر تک پہنچ جائیں گی۔ بنگلہ دیش جو 24 برس ہمارا شریک بازار رہنے کے بعد ہم سے الگ ہوا، آج 25 ارب کی برآمدات کر رہا ہے۔ ان کا ٹکا ہمارے روپے سے زیادہ اور مستحکم ہے۔ ہمارے یہاں ایسے کام صرف اور صرف قلعہ قیادت ہی دکھا سکتی ہے جو دوسروں کے پھنے میں اپنی ٹانگ اڑانے کے بجائے قومی مسائل پر توجہ مرکوز رکھے۔ یہاں یہ عالم ہے کہ دنیا کے، اور دراز علاقوں میں مسلمانوں کو پاکستان کے ذریعے یہ علم ہوتا ہے کہ ان پر ظلم ہو رہا ہے گویا سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے۔ ملک میں برپا اندھیر مگر اور لوٹ مار سے صرف نظر کر کے عالمی منظر نامے میں زندہ رہنے کی کوششیں ہمیں تیزی سے تباہی کی طرف لے جا رہی ہیں۔ بقا کی راہ صرف ایک ہے۔ ہم دوسروں پر اپنی پسند و ناپسند مسلط کریں نہ بیرونی قوتوں سے دہشت گردی کے طلب گار ہوں۔ اب تک ہماری ہر قیادت کا یہ وسیعہ رہا ہے کہ لشکرزی لولی معیشت کو ریڑھی پر ڈال کر مستحکم تو آنا معیشتوں کے بازار میں امداد و خیرات کی صدائیں لگانے لکل کھڑی ہوتی ہیں۔ کچھ تو میں ہماری حالتِ تدار اور درونک صدائوں پر رحم کھا کر اور کچھ اپنے مقاصد کے حصول کے لیے ہماری بھولی میں کچھ نہ کچھ ڈال دیتی ہیں۔ دوسری طرف حال یہ ہے کہ مال و زر کے زور پر اسمبلیوں میں پہنچنے والے ہماری اشرافیہ کے متحد ادارہ کین ارب پتی اور کروڑ پتی ہو گئے ہیں جبکہ عام آدمی وال روٹی کے چکر میں غن چکر بنا ہوا ہے۔ ہمارے نام نہاد رہنماؤں اور کرپٹ بیوروکریسی کے اربوں ڈالر کے جوائے غیر ملکی بینکوں میں محفوظ پڑے ہیں، وہ ان سب حقائق پر مستزاد ہیں۔ کاش، ہمارے موجودہ حکمران جزأت رندانہ سے کام لے کر بین الاقوامی مالیاتی قوانین کے تحت ہم سے چھینا ہوا یہ کالا دھن ملک میں واپس لائیں۔ ایسا ہو گیا تو ہماری معیشت ریڑھی سے کود کر خود دوڑ لگنے کے قابل ہو جائے گی مگر بات وہیں آ جاتی ہے کہ کون سا ہفتا ہے فغان درویش... آئیے! اس میدان سے دوڑ لگاتے ہیں آپ کی پُرسور محفل میں جہاں نئے سال کے نئے دلوں نے انگڑائیاں لے رہے ہیں۔

اسلام آباد سے سید شکیل حسین کاظمی کی تحفہ "تمام موسم اللہ پاک کے بنائے ہوئے ہیں اور سب ہی نوع انسانی کے لیے اپنی اپنی جگہ بہت مفید ہیں مگر اپنی طبیعت کو ہمیشہ سرد موسم ہی زیادہ پسند آیا ہے۔ ماہ دسمبر کی سب سے اہم بات سردی ہی ہے اور پیارے قائد کی پیدائش کا دن۔ دسمبر کا جاسوسی اس دفعہ بنا کسی تاخیر کے چار تاریخ کو ہی مل گیا۔ سرورق میں خاتون کی زخمی نظر میں کوئی گہرہ شکوہ پنہاں تھا۔ بہر حال اچھا سرورق تھا۔ میانوالی سے احسان سحر کی ناپسندیدگی کی سند ملنے پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ جنوکی سے ایف ایم صاحبہ کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ بے شک عمران کا کردار ایسا ہی یادگار تھا۔ خطوط میں کبیر عباسی، زویا اعجاز، اور بیس احمد، محسن علی موم اور آغا فرید احمد خان نے بہت اچھا لکھا۔ انک سے بشیر احمد خان صاحب کو بھی تہ دل سے خوش آمدید کہتا ہوں۔ افتخار احمد اعوان اور ہمایوں سعید آپ دونوں کی محبت کا بہت شکریہ کہ آپ نے مجھے یاد رکھا۔ ہمایوں سعید آپ میری پڑوسن کے ذکر کو لے کر کافی جذباتی ہو گئے ہیں مگر میں نے پہلے بھی بتایا تھا کہ وہ صرف ایک قلمی کردار ہے اور کچھ نہیں۔ پھر بھی میں آپ کی توجہ اور وقت کا مشکور ہوں جو آپ نے میرے اس قلمی کردار کے لیے مختص کیا۔ قیصر اعوان صاحب، عبادت کاظمی اصل میں پڑوسن کے بہانے میں یاد کر رہے تھے۔ ویسے آپ تمام دوستوں نے جس انداز میں اس کردار کو پذیرائی بخشی ہے، مجھے لگنے لگ گیا ہے کہ میں اچھی کردار نگاری کر سکتا ہوں۔ اس لیے شاید پانچ، دس، بیس یا پچیس سال تک کوئی کہانی لکھ ہی لوں۔ کہانیوں میں سب سے پہلے گرداب کا مطالعہ کیا۔ جیسے جیسے کہانی آگے کو جا رہی ہے، اس میں دلچسپی اور لگاؤ بڑھتا جا رہا ہے۔ سلو "را" کے اسجٹس کے لیے یقینی طور پر لوہے کا چنا ثابت ہوگا اور شہریار سے بھی اسی قسم کی توقع ہے، بے شک وہ ابھی ان کے قبضے میں ہے۔ جواری میں چودھری فرید الدین عرف خاور عرف سلیم کی شاخت کافی قابل توجہ معاملہ بن گئی ہے۔ احسان اللہ سے بھی بعید نہیں کہ وہ ہنوز شکوک و شبہات میں ہی مبتلا ہو اور پوری طرح تسلی کے بعد ہاتھ ڈالے خاور پر۔ انور علی کے کردار اور حالات و واقعات میں اتاری والے رفتی احمد شیرازی کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ ایچ اقبال ابتدائی صفحات پر شرربار کے ساتھ حاضر ہوئے۔ بہت حد تک یہ ایک اچھی کہانی تھی مگر کچھ زیادہ ہی تیز رفتار تھی اس لیے کافی حد تک غیر حقیقی لگی۔ کاشف زبیر کی حساب کتاب بہت عمدہ کہانی تھی جو کہ رزق حلال عین عبادت ہے کی نمائندگی نظر آتی۔ منظر امام کی فقیرانہ لکل گو کہ استاد کی پرانی کہانیوں کی طرح یکسانیت کا شکار تھی مگر پھر بھی وہ جتنی زبان پڑھ کر عجب سادہ لطف آتا ہے۔ سرورق کے رنگوں میں طبع ابوبھٹی کی زرخیز مٹی ایک اچھی کاوش ثابت ہوئی۔ کہانی موضوع کے اعتبار سے بہترین تھی اور جذبہ حب الوطنی سے لبریز بھی۔ بس تھوڑا سا پلاٹ میں کمی بیشی لگی جو شاید میری کم علمی کے باعث لگا ہو مجھے۔ احمد اقبال صاحب نے سرورق کے

دوسرے رنگ میں بہترین آغاز کے ساتھ عکس لہورنگ کو شروع کیا اور آخر میں کہانی کے انجام میں بلا کی نقشہ ڈال دی۔ کوئی بھی بات اپنے انجام تک نہ پہنچی۔ جتنے موضوع اور رخ بن گئے تھے کہانی کے کم از کم ایک دو کو تو مکمل کر دیتے۔“

لاہور سے زویا اعجاز کی رائے ”جاسوسی نے اس بار بھی اپنے انتہائی ایسے ہی ترسایا جیسے پاکستانی کرکٹ ٹیم فتح کے لیے اور حکومت سی این جی کے لیے ترسائی ہے۔ ادارہ پڑھ کر یہی کہا جاسکتا ہے ہوسترہ شجر سے امید بہار رکھ۔ عمران بلوچ کی وفات کا بہت رنج ہوا، پروردگار انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ بشیر احمد خان کی تجویز کی ہم مکمل تائید کرتے ہیں۔ کاظمی صاحب، ہم آپ کے شیکسپیر کی پشتوں سے کافی متاثر ہیں جس کا عنوان ہے بریوینی از دی سول آف مائنڈ۔ انجمن برادر اور عروج ناز کا شکریہ۔ ہمایوں سعید نے بالآخر ہماری عظمت کے قائل ہو کر دانشمندی کا ثبوت دے ہی دیا۔ آغا فرید پھانوسے فیصد تبصرہ نکلتے چینی پر اور تین سطریں کہانیوں پر لکھتے ہیں کمال کرتے ہو یا نڈے جی۔ لگتا ہے کچھوے کی رفتار سے شمارے کا مطالعہ کرتے ہیں آپ۔ شہنشاہ جنات اوہ سوری میرا مطلب ہے شہزادہ کو ہمارے عقل کی بھی آپ نے خوب کھنی۔ بھائی جس میں عقل ہوگی وہ نقل کرے گا ہی کیوں؟ اب رخ کرتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ شرر بارانج اقبال کی تصنیف مکی لاقانونیت اور طنز اراج کو صلیب مقرر طاس پر بکھرنے کی کاوش اچھی تھی۔ نازیہ نے خود کو شاید ایکٹا کیور کی سپر وین ہیر وین سمجھ لیا تھا۔ گرداب بہت زبردست جاری ہے۔ سلوا اپنی موجودہ شخصیت کے تخلیق کار بھنی کر کو لازمی مہرت ناک انجام سے دو چار کرے گا۔ اسلم بھی بہت نازک صورت حال میں پھنس چکا ہے۔ جواری رفتہ رفتہ اپنے جوین پر آ رہی ہے۔ انور فیکے پتر کا جانشین ثابت ہو رہا ہے۔ رشیم میں اس کی ڈھکی چھپی دلچسپی کافی معنی خیز محسوس ہو رہی ہے۔ سرورق کا پہلا رنگ بالکل پھیکا رہا۔ ایک بے حد عمدہ قصیم کو موزوں طریقے سے نہ لکھا جاسکا۔ تحریر حکیمین گاجر کا حلوہ بن کے رہ گئی۔ دوسرا رنگ قدرے بہتر تھا۔ دادا صاحب کا اصل روپ سامنے آ جاتا تو اختتام مزید نکھر جاتا۔ طبع زاد کہانیوں میں حساب کتاب ٹاپ پر رہی۔ سفید پوش طبقے کے مسائل بہت خوب صورتی سے بیان کیے گئے۔ فقیرانہ قتل ایورج رہی۔ مترجم کہانیوں میں شوقیہ سراغ رساں، تعاقب، دوسرے، غریب قدرے بہتر لکھیں باتوں نے بور کیا۔ اس دعا کے ساتھ اختتام کرتی ہوں کہ نیا سال وطن عزیز کے لیے امن و سلامتی اور اہل وطن کے لیے خوشیوں کا پیغام بر بن کر آئے۔“

میانوالی سے احسان سحر کی تفصیلی باتیں ”حسب معمول جاسوسی تھوڑا لیٹ لیا۔ ٹائٹل کا جو انداز دکھایا گیا وہ رنگوں میں کہیں بھی نظر نہ آیا۔ محفل قوس قزح... میں بکھرے رنگوں کی طرف بڑھے جہاں ہر کوئی اپنا رنگ بکھیرتا نظر آیا۔ ٹکٹل کاظمی جی! کیوں پچھلی عمر کا رونا رور ہے ہو۔ اس عمر میں اللہ اللہ کرو۔ کیوں کسی بوڑھی عسائی کو اس عمر میں بدنام کرنے پر تلے ہو، پوتے پوتیوں کو کھلاؤ بیٹھ کر ہاتھ میں صلیب لے کر صرف۔ آغا جی اوٹلم۔ پچھلے ماہ جھولے والی بات پر دل سے معذرت چاہتا ہوں، مطلب وہ کہیں تھا بات کا، جو لیا گیا۔ خود مجھے بھی بہت اذیت ہوئی۔ قصور کسی کا نہیں۔ پہلی کہانی سے اس ماہ کے تازہ بھول کا آغاز کیا۔ شرر بارانج اقبال کافی ماہ کے انتظار کے بعد ہٹا پھلکا انداز لیے حاضر ہوئے۔ نہ الجھاؤ تھا کہانی میں، نہ کرداروں کی بھرمار، آسانی سے ہضم ہو جانے والی تحریر بہت ہی خستہ گئی۔ ڈھونگ میں میاں بیوی کا ایسا شاطر ڈھونگ کہ اینڈ پر بھی قاری کو چوٹا گیا۔ پہلی بار ایسی اتفاقہ صورت حال میاں بیوی کے درمیان دکھی، بہت خوب۔ دوسرے، کافی پر اسراریت پھیلنے کے پھر میں کہانی اپنا معیار کھو گئی۔ پہلے ناز انسان ہوتا ہے لیکن مرنے کے بعد اس طرح کی پھوٹیشن پیدا نہیں ہوتی۔ حقیقت کے بجائے صرف سراب ہی سراب نظر آیا۔ گرداب میں اس ماہ جاوید علی چھائے رہے۔ لٹکار کی طرح کافی کاری زخم پہنچایا بھارتیوں کو۔ سمجھ میں بھی وہی عورت کا جنونی انتقام پڑھنے کو ملا جو کہ شادی شدہ حضرات کے لیے سبق بھی ہے، آگے ان کی مرضی۔ شوقیہ سراغ رساں، پہلی سبق کافی ہے کہ جو انسان کا پیشہ ہے اسی پر خوش رہے تو اچھا ہے ورنہ ایسے شوق بہت ہی بھاری پڑتے ہیں۔ رنگوں میں سب سے پہلے احمد اقبال کے رنگ کا مطالعہ کیا۔ اسٹوری شروع میں تو متاثر نہ کر سکی لیکن پھر رچ میں باپ کی پر اسرار گمشدگی اور دادا کی پر اسرار سرگرمیوں کی وجہ سے دلچسپی پیدا ہوئی لیکن پھر ساری دلچسپی دھری کی دھری رہ گئی جب ان سب کرداروں پر پڑا پردہ بھی نہ بچھٹ سکا۔ افسوس ہے کہ پانی پی کر بھی پیاسے ہی رہے۔ پہلا رنگ، جذبہ حب الوطنی کا احساس جگاتی خوب صورت تحریر تھی۔ پاکستان میں جب تمام اداروں کے ساتھ مساوی سلوک ہی نہ ہوگا تو ایسے واقعات ہی ہوں گے اور پولیس والوں کو ہمیشہ ہی تنقید کا نشانہ بنانے والے یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ ایسی سہولتیں انہیں نصیب ہیں۔“

وزیر آباد سے محمد احسن زمان کی داستان ”نگاہ رو برو، باادب، با ملاحظہ، ہوشیار، مابدولت، بغیر دولت کے تشریف لا رہے ہیں۔ ارے، اتنا حیران پریشان کیوں تک رہے ہیں۔ جناب کم و بیش ڈیڑھ دہائی کی غیر حاضری کے بعد محفل ہاؤ ہو میں غوطہ زن ہیں۔ پچھلے مہینے ایک سفر در پیش تھا۔ حسب عادت نظر انتخاب جاسوسی پر جا اٹھی اور میں پھر سے جاسوسی کا اسیر ہو گیا۔ پچھلے ماہ بھی قلم اٹھایا لیکن حالات کی کمی سے قلم کی کڑواہٹ بڑھ گئی۔ اب پھر ہمت کی ہے دیکھیے کیسا استقبال ہوتا ہے۔ (یقیناً اچھا بہت اچھا) سرورق پر خوب صورت چہرے کی رعنائی خون آلود ہاتھ کی وجہ سے ماند پڑ گئی تھی۔ پس منظر میں شمع ہاتھ میں لیے خاتون نہ جانے کیا ڈھونڈ رہی ہیں اور عینک والے صاحب بھی حیرت زدہ انداز میں اپنی عینک درست کر رہے ہیں کہ کیا ہو رہا ہے۔ اپنی محفل کا رخ کیا تو یہاں سارے نام ہی اچھی نظر آئے۔ اچھا اقبال کا نام پڑھ کر کہانی شروع کی، بڑی عجیب لگی۔ مجھے قطعاً اندازہ نہ تھا کہ انجام یہ ہو گا۔ لیکن شاید ہمارا وتیرہ جتا جا رہا ہے کہ خود جینے کے لیے دوسرے کو مارتا ضروری ہے۔ کم از کم ملک کے سب سے بڑے شہر کے حالات کو دیکھیں تو یہ سب درست لگ رہا ہے۔ تو ریر یا ض کی شاطر اچھی لگی واقعی مجرم کتنا ہی چالاک کیوں نہ ہو، کوئی نہ کوئی غلطی ضرور کر بیٹھتا ہے۔ نیٹ کا کردار کافی پر اسرار رہا۔ تعاقب میں لیسن مجھے شروع شروع میں فراڈ لگا لیکن دھوکے باز تو ڈیل نکلا۔ ویسے مجھے امید نہ تھی کہ لیسن کا میاں ہو جائے گا۔ ناکامی کا مزہ دیکھنا پڑے گا لیکن کہاں جی، لیسن نے بالآخر دماغی کھیل میں جیت حاصل کر لی اور کڑیاں ملا کر ڈیل کی گردن ٹاپ لی۔ بابر نعیم کی ڈھونگ بہت شاعرانہ رہی، مختصر مگر پڑاثر۔ مریم کے خان کی دوسرے، اف اللہ کی پناہ مجھے علم ہوتا کہ یہ کہانی اتنی خوفناک، ہولناک، جیت ناک اور پر اسرار نکلے گی تو میں بھی ابھی اسے رات کو نہ پڑھتا۔

ٹھنڈے پسینے چھوٹ گئے چنانچہ فوراً ڈائجسٹ بند کیا اور کچے کے نیچے چھپا دیا لیکن کہاں جی... نیند نے دور سے ہی جھنڈی دکھائی۔ اللہ کی ماری اس ہسپتالزم کے ماہر پر، اچھے بھلے مردے کو کھڑا کر دیا اور ہماری ریزہ کی ہڈی میں ابھی تک سسٹامٹ ہو رہی ہے۔ (بڑے ڈرپوک ہیں)۔ اب گرداب کی بات ہو جائے۔ میں صرف سلو اور شہر یار والا حصہ ہی پڑھتا ہوں۔ بقیہ اسلم والے کھیل کی ابھی مجھے سمجھ نہیں آ رہی۔ سلو اور شہر یار والے واقعات ہی دل گرما دینے والے ہیں۔ مسلمانوں میں یہی خوبی ہے کہ وطن پیچھے چھوڑ دیتے ہیں اور مذہب آگے آجاتا ہے۔ جیسا کہ بھائی جی کر رہے ہیں، دونوں خوب کھل کر کھیل رہے ہیں اور باطل کے سینوں پر مونگ دل رہے ہیں۔ عکس قاطر کی فریب نے بھی تھرا دیا۔ اچھے بھلے پڑھتے پڑھتے پھر خونخواری آن ٹپکی۔ ڈر کھولا کی جوڑی نے بے چارے ڈیرک کے کس بل نکال دیے۔ ہم جیسے کمزور دل والے تو ان کہانیوں کو نہیں پڑھ سکتے جی۔ ابھی لکھ دیا کریں کہ کمزور دل والے حضرات نہ پڑھیں جیسے ڈراؤنی فلموں کے لیے لکھا ہوتا تھا۔ (تجویز کا شکریہ! آئندہ یہی کریں گے) میونسٹریز، شوقیہ سراغ رساں کے ہمراہ تھیں۔ پال بے چارہ عورت کی عیاری کا شکار ہو گیا۔ جواری جسے احمد اقبال لکھ رہے ہیں، پورے شمارے میں میری پسندیدہ کہانی ہے۔ اکبر اور انور کی آویزش کا نتیجہ نہ جانے کیا نکلے ان کی نوک جھونک کا بے حد مزہ آرہا ہے۔ جمال دتی صاحب چکر باز لے کر آئے ہوئے تھے۔ ویسے جمال دتی جمشید دتی صاحب کے کیا لگتے ہیں؟ (آپ کو کیا پریشانی ہے؟) حساب کتاب بہت شاندار رہی۔ فقیرانہ نقل میں استاوی کی جناتی زبان پڑھ کر خوب لطف اندوز ہوا۔ مزاحیہ انداز خوب رہا۔ زرغین زمین شمارے کا پہلا رنگ تھا۔ دانش کا کردار تو ہمارے معاشرے کی شان ہے لیکن انہیں پنپنے ہی کون دیتا ہے۔ غیر ملکوں کا کھیل اس ملک میں اب بہت ہو چکا دیکھیے کب بساط بدلتی ہے بلکہ پلتی ہے کیونکہ کافر بھی تدبیر کر رہا ہے اور اللہ بھی تدبیر کر رہا ہے اور اللہ ہی خوب تدبیر کرنے والا ہے۔ آپ کا کہنا بجا ہے کہ ریاست کے پانچوں ستون دوبارہ شہید ملت والے زبردست کے کی شکل اختیار کر گئے تو پھر دشمن پانی بھرتا نظر آئے گا۔ عکس لہورنگ، احمد اقبال کی کہانی تھی۔ اس کہانی کا انجام بڑا عجیب اور عمومی سا تھا۔ دادا صاحب کا کردار بہت پر اسرار رہا۔ مجھے ان کی اس طرح خودکشی کی توقع نہ تھی اور یہ بھی کہ شاید کوئی خونخوار قسم کی جنگ ہوگی جس میں کہ یوسف صاحب کوئی ہیرو جیسا کردار ادا کریں گے اور وہیں پر مریم سے ملاقات ہو جائے گی۔ لیکن معاملہ بالکل الٹ رہا۔ تبصرہ تمام ہوا۔ اتنا عرصے بعد پڑھنے کے بعد کچھ پرانی باتیں تازہ ہو گئیں۔

ڈاکٹر عمران فاروق جھنگ سے لکھتے ہیں "دسمبر کا جاسوسی 6 تاریخ کی ٹھنڈی ہوئی صبح گند مارنگ کا سلجھٹ پلس گرم گرم چائے کے ساتھ جلوہ افروز ہوا۔ دونوں ہاتھوں سے دیکھ کر کیا۔ سب سے پہلے ٹائٹل پر نظر پڑی، بہت خوب ڈاکٹر انکل۔ ہمایوں سعید بڑے فریم والی نظر کی ٹینک لگا کر مٹکئی کے بعد بھائی کو ڈھونڈنے کی کوشش کر رہے ہیں تو بڑی آپا ماہاتی ہاتھوں میں مشعل اٹھائے جتنو بنی ہوئی ہیں، واؤ۔ نیچے صنف نازک رو رو کر اپنے آپ کو اور بھی زیادہ معصوم ثابت کرنے کی کوشش میں مصروف ہے۔ مجموعی طور پر ٹائٹل میری گرم گرم چائے کی طرح بہت اچھا لگا۔ چائے ختم کر کے جلدی سے محفل باؤنسر + گنگلی + دوسرا کی جانب بڑھے۔ تمام دوستوں کے محبت نامے دیکھے۔ بھائی احسان سحر کی شکایتیں اور گری صدارت بھئی مان گئے۔ انکل جی آپ کو مبارک باد قبول ہو۔ کہانیوں کے حلق آپ کی جو رائے ہے، میں بھی سو فیصد متفق ہوں۔ مس ایف ایم صاحب! آپ اتنا سوچوں میں گم رہی ہو کہ اپنا نام بہت ہی شارٹ کٹ کر دیا ہے۔ تبصرہ لکھتی رہنا یہ نہ ہو کہ سوچوں میں پوری سردیوں کا موسم بھی ہاتھ سے نکل جائے ہا ہا... تمام نئے دوستوں کو موسٹ ویکم ان جاسوسی۔ بھائی کاظمی صاحب! آپ ہمایوں سعید کے بارے میں اپنے کہے الفاظ واپس لو، یہ نہ ہو کہ آپریشن کے بعد پتا چلے کہ ہمایوں سعید ہمارے گنی ہے اور کاظمی نے اپنی پڑوسن سے بات کرنا چھوڑ دی ہے۔ بھائی فہد علی جنجوعہ آپ نے مجھے دوبارہ چائے + پکوڑے کی طلب محسوس کروادی۔ بیگم ایک کپ چائے پلیز۔ بڑی آپا ماہا ایمان اور چھوٹی آپا طاہرہ گلزار صاحب آپ دونوں کہاں تم ہو۔ جمعے کی نماز کے بعد میں نے خصوصی طور پر بھائی قیصر ایمان، حافظ شاہد عمران، رانا منشی حماد فرہاد اور دوسرے تمام بھائی جو جیلوں میں قید ہیں تمام کے لیے دعا مانگی ہے۔ اللہ پاک آپ سب کو رہائی عطا فرمائے، آمین۔ بھائی عمران بلوچ مرحوم کو اللہ تبارک و تعالیٰ جو اررحمت میں جگہ دے، درجات بلند کرے، آمین۔"

بکر سے شمر خان کی عقل مندی "اس بار جاسوسی نے اپنے بے مثال روپ کا نظارہ 5 تاریخ کو کروایا۔ ٹائٹل پر لاش! کچھ اچھا نہ لگا کہ اخبارات کے بعد اب یہاں بھی یہ دیکھنا پڑا۔ سب سے پہلے پیچھے گرداب کی طرف۔ یہاں ہم نے کافی تیزی دیکھی۔ قسط ختم ہونے کا احساس تب ہوا جب اگلی کہانی کا نام پڑھا۔ سلو کا ہر وقت چوکنار ہنا کام آئی گیا۔ اسے اپنے ساتھ لے جانے کے لیے آنے والے ناکام ہی رہے۔ شہر یار نے ڈرا بے احتیاطی کا مظاہرہ کیا۔ رانے آخر اپنے شہزور کو ڈھونڈ نکالا۔ ادھر ماہ بانو کا بھی کچھ نہ بن سکا۔ مشاہد خان ان ایکشن اگلی قسط کا بے چینی سے انتظار ہے۔ دوسرا سلسلہ جواری۔ چودھری انور کے گرد یہ کہانی گھومتی رہی۔ اب اس کا باب بند ہی کر دیں۔ نادر شاہ اور فرید کے ٹکراؤ کا انتظار ہے۔ ڈھونگ، واہ کیا کہانی تھی۔ پڑھ کر بہت مزہ آیا۔ فریب میں فریبی خود فریب میں آگیا اور جان سے گیا۔ مریم کے خان کی ہر کہانی بہت ہی خوب صورت ہوتی ہے۔ ان سے درخواست ہے کہ امر کی اور چینی ٹکراؤ کی ایک اور کہانی لکھیں۔ اس سے پہلے کہ آپ ہمارے شیطان کی آنت جتنے خط کو بلیک لسٹ کر دیں، خدا حافظ۔"

مانسہرہ سے ڈاکٹر نعیم اکبر سحر کی چھبھاہٹیں "چار دسمبر کو جاسوسی ہاتھ آیا۔ ہماری محفل شوگر پوائنٹ شوگر کے قاتل پہلوان احسان سحر اپنے الفاظ کی جادوگری کی بدولت چھائے ہوئے تھے۔ احسان بھائی! مبارک باد قبول فرمائیے۔ ہمایوں سعید، ہمیں دیر سے پتا چلا کہ آپ بھی وہ کڑوی گولی نگل بیٹھے ہیں جو شوگر کوٹ تھی۔ سو ہماری جانب سے تعزیت قبول فرمالیں۔ لفظ تعزیت کو شوگر کوٹ کر کے مبارک باد پڑھ لیں۔ محسن علی سوم اس دفعہ خوب بولے۔ سب سے بچکے لیے ہیں۔ شاباش میرے شیر۔ ایسے ہی دھاڑتا رہ۔ ہماری دعائیں اور دوا تمہیں تیرے ساتھ ہیں۔ احمد اقبال صاحب کی شرر بار اچھی کاوش رہی۔ نازیہ نامی خاتون کو یہ جان لینا چاہیے تھا کہ وہ اس مردوں کے معاشرے کی کمزور کردار ہے جسے عورت کہا جاتا ہے۔ بے شک ناکن بن جائے۔ انجام میں پھن کھلا ہی جاتا ہے۔ دوست گئے، رقم گئی، پلاٹ گیا، عزت نیلام ہوئی۔ انجام خودکشی اور موت یعنی کھایا پیا کچھ نہیں۔ گلاس توڑا جرمانہ بارہ آنے۔ گرداب نے

ہمارے اندر کی اس کی کوئی حد تک پورا اور مکمل کر دیا ہے جو موت کے سوداگر کے اختتام سے ہمارے اندر پیدا ہوئی تھی۔ ویلڈن اسکا قادری۔ جواری میں تو فی الحال خوب صورت خوب صورت خواتین کی آمد ہو رہی ہے۔ ان خواتین کا رول بھی فی الحال یہی ہے کہ وہ فرد افراد اور صاحب پر کار ہو رہی ہیں تاوقتیکہ کہانی کوئی رخ اختیار کر سکے۔ ابھی تک تو جواری وہ کشتی ہے جسے سمندر کی سرکش لہریں اپنے ساتھ بہائے جا رہی ہیں۔ کشتی کب سمندر کے سینے کو چرنا شروع کرتی ہے۔ یہ کہانی کا آغاز ہے ابھی تک تو... اکاشف زبیر کی حساب کتاب پڑھی۔ ابھی تک اس کے زیر اثر ہوں۔ عکس لہورنگ آخری رنگ نہ جانے کس جذبے کے تحت لکھا گیا۔ حالانکہ کہانی کا پلاٹ جاندار تھا اور قلم معروف، ہر طرحیز احمد اقبال صاحب کا۔ پھر بھی کہانی میں غلطی۔ بہت ساری باتیں قابل وضاحت تھیں۔ احمد اقبال صاحب نے خود ہی لکھ دیا کہ "شاید کچھ پڑھنے والوں کو اس کہانی کے انجام سے مایوسی ہو" تو محترم احمد اقبال صاحب، تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ عرض ہے کہ "شاید نہیں یقیناً۔"

سحرش افضل کی رقصہ سے پسندنا پسند اس دفعہ جاسوسی کا دیدار 4 دسمبر کو ہوا۔ ٹائٹل گرل عجب بہار دکھا رہی تھی۔ فہرست کا اسٹائل خوب تھا۔ محفل میں گرمی بہت تھی جو سردی کی وجہ سے اچھی لگی۔ اس بار جاسوسی پڑھنے کا آغاز خلاف معمول پہلی کہانی سے کیا۔ گزارہ تھا، بہر حال کہانی نے بور نہیں کیا۔ گرداب توفل ایکشن میں تھی۔ احمد اقبال کی جواری بھی ٹھیک تھی۔ جواری کی تو ہر نئی قسط میں سے ایک نئی کہانی نکل آتی ہے۔ نورین کی کہانی، ریشم کی، چودھری انور کی۔ سلونی کی اور پتا نہیں کتنے لوگوں کی کہانیاں۔ البتہ رنگ دونوں اسٹرائٹ تھے۔ میں باقی چھوٹی کہانیاں نہیں پڑھتی کیونکہ ان کہانیوں میں انگریزوں والے نام ہوتے ہیں جن سے مجھے الجھن ہوتی ہے۔ ہاں اگر مسلمانوں والے نام ہوں اور کہانی اچھی لگ رہی ہو تو پڑھ لیتی ہوں۔ اس لیے ان پر نوٹس۔"

خانہ بدل سے سردار ظفر اقبال وڑائچ کی رائے "دسمبر کا سرورق باپ آف دی ایئر رہا۔ احسان بھر اس مرتبہ چھانکے، مبارک باد تھی۔ اس مرتبہ تمام تبصرہ نگاروں کا تبصرہ کچھ یوں لگا جیسے وہ کوئی کہانی تخلیق کر رہے ہوں۔ ہو سکتا ہے یہ تبصرہ نگار سچی عنقریب رائٹر بن ہی جائیں۔ مجھے یہ کہنے میں عار محسوس نہیں ہوتا کہ اس مرتبہ تمام تبصرہ کرنے والوں کے تبصرے ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ شرر بار اتفاقی اسٹوری لگی۔ خصوصاً لڑکیوں کو لڑائی اکیلے نہیں لڑنی چاہیے ورنہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ عکس لہورنگ بھی بورنگ رہی۔ زرخیز مٹی زبردست رہی۔ پہلی مرتبہ پولیس کو ایکشن میں دکھایا گیا ہے۔ اس طرح کی پکیشن شمالی وزیرستان میں ہمارے ساتھ ایک دن میں کئی مرتبہ ہوتی رہتی ہے۔ جواری نے کوئی خاص مزہ نہیں دیا۔ سو بورنگ رہی۔ گرداب اس مرتبہ انتہائی سنسنی خیز رہی۔ ہمیں اسلم کا انجام دردناک نظر آ رہا ہے اور اب لگتا ہے کہ کہانی کا رخ شہر یار کی طرف مڑنے والا ہے۔ جاتے جاتے تمام دوستوں کو پُر غلوں نیا سال مبارک ہو۔"

لاہور سے آفتاب احمد نصیر اشرفی کے قلم کی چاشنی "ایران اور امریکا کے بارے میں آپ کی خوش گمانی اتنی جلد حقیقت میں بدل جائے گی، ہمیں تو بہت حیرت ہوئی کہ آپ امن کے عالمی چودھریوں کے کتنے نبض شناس ہیں۔ اس ماہ جاسوسی کا سرورق داجبی جبکہ اس کے اشتہارات و کش اور تراش خراش خوب صورت تھی۔ خاص کر محسن مصطفیٰ کی تحقیق پاکستان کے سول اور فوجی اعزاز۔ اس مرتبہ ابتدائی صفحات پر شرر بار بارانی مثال آپ تھی۔ ایک عورت جو مصنف نازک کہلاتی ہے اور جو اپنی عصمت و عفت اور پاکیزگی کے معاملے میں بہت حساس ہوتی ہے کو کوئی ٹھیس پہنچائے تو پھر وہ انتقام کا آتش فشاں بن جاتی ہے جیسے کہ نازیہ نے ایاز نازک کے ساتھ کیا۔ سطر سطر پُر محسوس تحریر نے مصنف کے... لفظوں کو خوب صورت روپ دیا۔ روپ تو شاید حسین صاحب نے نازیہ کے اسٹائل کو بہت خوب صورت دیا اتنا کہ آدمی دیکھ کر مبہوت ہو جائے۔ احمد اقبال صاحب کی جواری خوب جا رہی ہے اور عکس لہورنگ ہر چند کہ دوسرا رنگ تھا لیکن خونی رشتوں کا بھرم رکھتی ہوئی یہ داستان اگر پہلے رنگ پر بھی ہوتی تو کوئی مضائقہ نہ تھا۔ کیونکہ پہلا رنگ زرخیز زمین فتح ابومعینی کی گوکہ بہت اچھی تحریر تھی لیکن فکشن کی زیادتی نے اسے تھوڑا سا گہنا دیا تھا۔ خط کی طوالت پیش نظر ہے اور بلیک لسٹ ہو جانے کا خطرہ لہذا اس سے پہلے کہ کسی شاطر سچی کا خط ہمارے خط کا تعاقب کرے اور ہمارا خط گرداب کے فریب میں کسی دوسرے کی سمجھ بھگ کے ڈھونگ میں آئے اور کوئی شوقیہ سراغ رساں سچی حساب کتاب مانگ لے اور کوئی چکر باز ہمارا فقیرانہ قتل کر دے، ہم آپ سے نئے سال کی مبارک باد کے ساتھ اجازت چاہتے ہیں۔"

شینو پورہ سے محمد شاہان سعید کی شوخی "جاسوسی 6 تاریخ کو ملا۔ سرورق و کش تھا۔ خطوط کی محفل میں اپنے خط کو دیکھ کر خوشی محسوس ہوئی۔ میرا نام غلط لکھا تھا۔ آپ نے شایان لکھا تھا مگر میرا نام شاہان ہے۔ کہانیاں کافی دلچسپ تھیں۔ گرداب کافی اچھا جا رہی ہے۔ سرورق کی کہانیاں بھی اچھی تھیں۔ میں آپ کو مزے کی بات بتاتا ہوں۔ میں نے بک اسٹال سے جاسوسی کے پرانے شمارے طلب کیے تو اس نے میرے سامنے نومبر 1990ء کا شمارہ بھی رکھا۔ یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ جاسوسی اتنا پرانا ہے؟ کہانیاں تو پرانے زمانے ہی کی تھیں مگر ناول "پاکستانی" دل کو چھو گیا۔ خیر دیے جاسوسی کتنے سال پرانا ہے؟" (جاسوسی کا پہلا شمارہ 1971ء میں آیا تھا)

بہاولپور سے بشری افضل کی شمولیت "جاسوسی لیٹ ملا۔ دہشت زدہ مصنف نازک کی آنکھیں خوف سے ہاتھ لگتی ہیں۔ دو دو مصنف مخالف ٹائٹل پر، واہ جی واہ۔ اپنی محفل چینی دان میں پہنچے۔ یہ کیا مابعد دولت کا تبصرہ نہ ہی ویٹنگ لسٹ میں اور نہ ہی محفل میں... کیا آپ کو ملا ہی نہیں؟ (جی ہاں بالکل درست فرمایا، ہمیں ملا ہی نہیں) کری صدارت پر احسان بھر کو موجود پایا، آپ کا تبصرہ اچھا تھا مبارک!۔ اٹکل! اگر میرا تبصرہ نہیں لگا تو تمام ساتھیوں نے ہمیں یاد رکھا، سب کا شکریہ۔ فرید احمد! میں آپ کی رائے سے متفق ہوں بھلے نام بدل لیں انداز تحریر سے پتا لگ ہی جاتا ہے۔ محسن علی سوم! آپ کو اعتراض کیوں ہے؟ صندوق معاویہ! تعریف کا شکریہ۔ عروج ناز! آپ کا بھی تہ دل سے شکریہ۔ حساب کتاب ایک فصاحت آموز کہانی تھی۔ عطا کے ضمیر نے بھی اس کو کچھ کے لگائے مگر مجبوری سب کچھ کروا دیتی ہے۔ ڈھونگ اچھی جامع تحریر تھی۔ دونوں کے ساتھ یہ تو ہونا تھا نا۔ دوسرے خوف میں لپٹی داستان، پہنا ٹرم ایک خطرناک عمل

”ہے اگر آزاد ہونہ کیا جائے تو۔ رقم کے لیے اسنے پاپڑ بیلے ہوت ہی ہاتھ آئی اس عمل سے۔“

کھاریاں سے باربر عباس اور مسز باربر عباس کی ملی جلی باتیں "جاسوسی کا نیا شمارہ جو کہ ماہ دسمبر کی شکل میں 2013ء کا آخری شمارہ ہے، کسی خوب صورت ہیرے کی طرح جھلک رہا ہے۔ ہاتھوں میں سرورق حسب معمول جاسوسی کی مناسبت سے زبردست ہے مگر سرورق پر لکھی خرائٹ جسم کی بوڑھی عورت کچھ پسند نہیں آئی۔ صنف نازک کے معاملے میں ڈاکر صاحب کا ذوق کچھ گرتا جا رہا ہے۔ ڈاکر صاحب کچھ خیال کریں۔ سرجی! آپ نے جتنی بھی باتیں کی ہیں یقیناً میں آپ کی ان تمام باتوں سے اتفاق کرتا ہوں۔ آپ کی تمام باتیں حقیقت پر مبنی ہوتی ہیں اور ہمیں آئینہ دکھاتی ہیں مگر افسوس سر، ہم بے حس قوم ہیں۔ ہم اپنے اندر تہذیبی نہیں چاہتے۔ اس بار کرسی صدارت پر ایک ماہ کے لیے میانوالی سے اپنے جانے مانے احسان عمر صاحب براہمان تھے۔ احسان عمر صاحب! گو کہ خط کچھ خاص نہیں تھا پھر بھی مبارک باد قبول کریں۔ ایف ایم 100 صاحب! آپ کون سے ریڈیو اسٹیشن پر آتی ہیں اور چونکہ یہ آپ کی پہلی شرکت ہے اس لیے ذرا آرام سے دھیرے دھیرے سے۔ زو پائی! ساتویں شرکت مبارک ہو، اب کہیں اس خوشی میں پاگل نہ ہو جائیں۔ ملک سعید صاحب، یہی جمہوریت ہے۔ اگر آپ کسی کی بات سے متفق نہیں تو کھل کر اظہار کر دیں۔ میں بھی آپ کی بات سے متفق نہیں ہوں۔ بشیر احمد خان! ابھی بچے ہو کچھ بڑے ہو جاؤ۔ ارے کھیل کا ٹکڑی! انا معلوم زوجہ جو آپ نے مجھے تصویر بھیجی تھی وہ کس کی تھی؟ واہ جی واہ، اس بار ہمارے پیارے سے آغا فرید احمد خان بھی تشریف لائے ہیں۔ بھایا، میں آپ کو ایک بار پھر محفل میں خوش آمدید کہتا ہوں۔ راجہ اسلم حیات ایہ کیا آپ نے بشری آنٹی کو آپا کہہ دیا؟ اس کا مطلب ہے کہ آپ بشری افضل آنٹی کے ہم عمر ہیں۔ افتخار حسین! احوال! آپ کو عروج کی عمر پر اعتراض ہے یا ساکڑہ پر۔ فہد علی! غلط بیانی مت کریں۔ سرورق کی حسینہ کی شکل کسی فلمی ایکٹریس سے نہیں ملتی تھی بلکہ زویا خان سے ملتی تھی۔ ہمایوں سعید راج پٹا میرا خیال ہے مذاق کو مذاق ہی رہنا چاہیے۔ جو باتیں گزر چکی ہیں ان پر مٹی ڈالو۔ محسن علی سوم! اتنی بھی پھرتیاں ٹھیک نہیں، کہیں کمر میں چک نہ پڑ جائے۔ کاش آپ کا نام موم علی ہوتا، لوڈ شیڈنگ میں تو کام آتے۔ محمد شاہان سعید! اتنی بھی شوخیاں سمجھ نہیں، صحت پر برا اثر پڑتا ہے۔ اے پہاڑوں کے شہزادے، میرا مطلب ہے کبیر عباس بھیا! اور سنائیں کیا حال ہیں؟ پہاڑ تو ٹھیک ہیں نا جن پر آپ اچھل کود کرتے ہیں۔ محمد جاوید بشیر! عرصہ تو آپ نے لکھا ہی نہیں کتنے عرصے کے بعد تشریف لائے ہیں؟ عروج ناز! تبصرہ کریں بوٹکیاں نہ ماریں۔ حافظ شاہد عمران! بیٹا یقین کرو تمہارے لیے اور دیگران تمام قیدیوں کے لیے جو جیل جیسی منحوس جگہوں میں بند ہیں، رہائی کے لیے دل سے پُر خلوص دعائیں نکلتی ہیں۔ خدائے سب کو ان حقوق خاندانوں سے رہائی دلائے، آمین۔ کہانیوں پر حسب معمول سب سے پہلے اسما قادری صاحبہ کی تخلیق گرداب پڑھی۔ اسما قادری کی گرداب پڑھتے ہوئے صبیحہ بانو کی چھلاوہ یاد آ جاتی ہے۔ بہر کیف گرداب ٹھیک ہی جارہی ہے۔ دوسرے نمبر پر جواری پڑھی جس کو عہد حاضر کے ایک نامور رائٹر احمد اقبال صاحب لکھ رہے ہیں۔ کہانی ابھی تک صحیح طرح نکلتی نہیں اور یہ تب ہی ہوگا جب احمد اقبال صاحب فرید کی کہانی کو فلیش بک کریں گے۔ پہلا رنگ صحیح ابویحیٰ کا زرخیز زمین پولیس کی کارکردگی کے عین مطابق تھا۔ زبردست سچ صاحب۔ یقین کریں آپ کے سرورق کے رنگ نے صحیح معنوں میں حق ادا کر دیا۔ دوسرا رنگ احمد اقبال صاحب کا جس میں سرورق کے رنگ کا کوئی ذکر تک نہیں تھا، صرف اپنے ہلکے پھلکے مزاج کی وجہ سے تھوڑا سا اچھا لگا۔ مجموعی طور پر کوئی خاص نہیں تھا۔"

خلع خانیوال سے صفدر معاویہ، حسنین معاویہ کی مشترکہ کاوش ”دسمبر کا شمارہ 6 گول گیا۔ سرورق پر ایسا لگتا ہے کہ ماڈل کے ساتھ بہت قلم ہوا ہے۔ آنکھوں میں دکھ صاف نظر آرہے ہیں۔ ساتھ ہی کبیر عباسی صاحب عینک لگائے موجود ہیں۔ پھر آگے بڑھے، آپ کا ادارہ پڑھا۔ اچھا ہے اللہ تعالیٰ آپ کی تمام باتوں کو شرف قبولیت بخشے اور ہم پیارے وطن پاکستان میں امن سے زندگی کی بہاریں گزار سکیں۔ اپنی محفل میں پہنچے تو وہاں شور مچا ہوا تھا۔ کرسی صدارت پر محترم احسان بھر صاحب الٹی سیدھی باتیں کرتے نظر آئے۔ میانوالی والوں مبارکبادیں۔ چوکی سے ایف ایم 93 نے بہت اچھی باتیں کیں۔ واقعی ہیرو کو مارنا نہیں چاہیے تھا۔ میں تقریباً 2 دن تک ہیرو کے غم میں ٹھیک سے کھانا نہیں کھا سکا تھا۔ آغا فرید احمد خان نے کہا کہ نیازی صاحب کے تیسرے ہمیشہ ہی الگ ہوتے ہیں تو ایسا ہی ہوگا۔ دوستوں میں دو یا تین ماہ بعد آغا فرید کو بتاؤں گا کہ شادی کے بعد بندہ کیسا محسوس کرتا ہے۔ ہمایوں نے سگنی کی اور ہم نے 11 جنوری 2014ء کو شادی کا فیصلہ کر لیا، اپنی خالہ کی بیٹی کے ساتھ پھر بتائیں گے کیا بتاتا ہے۔ (کس کا؟) ہمایوں بھی اس دفعہ کھلے کھلے نظر آرہے ہیں۔ عروج ناز صاحب! آپ کو پارٹ ون کی کامیابی پر مبارکباد اور بیہناں، آپ اپنی عمر نہ بتایا کریں کیونکہ یہ محفل کی عوام سچ کو بھی جھوٹ سمجھتے ہیں، آگے تم خود سمجھ دار ہو۔ کہانیوں میں سب سے پہلے گرداب پڑھی۔ یہ قسط اچھی رہی لیکن ماہ بانو اور اسلم ایک بار پھر سے پھنس گئے اور سلو بھی کہیں غائب ہو گیا اور شہر یار بھی پھنس گیا۔ اب اگلی قسط کا انتظار ہے۔ شرربار میں نازیہ نے بدلے تو لے لیا مگر اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھی۔ زیادہ تر کہانیاں اس دفعہ ترجمہ شدہ ہیں۔ آپ مہربانی کر کے زیادہ اپنے معاشرتی نظام کی کہانیاں سامنے لائیں مہربانی ہوگی۔ باقی کہانیاں ابھی زیرِ مطالعہ ہیں۔“

ڈیرا اسماعیل خان سے سید عبادت کاظمی کی فرمائش ہمیشہ کی طرح جاسوسی 7 تاریخ کو ملا۔ سال کے آخری مہینے کا جاسوسی موسم کی طرح اداس لگا۔ ٹائٹل ہمیشہ کی طرح اچھا تھا۔ شاید ٹائٹل گرل بھی سال کے آخری ماہ کو اداس بھری نظروں سے الوداع کہہ رہی تھی۔ کبریٰ صدارت اس مرتبہ احسان سحر کے حصے میں آئی، بہت مبارک ہو۔ فرید احمد خان! شادی کر کے دیکھ لو کہ بندہ جمو لے جمو لے جھاتا ہے ہا ہا ہا۔۔۔ فہد علی میں کسی ایڈورٹائزنگ ایجنسی سے وابستہ نہیں ہوں۔ ہمایوں سعید صاحب! چلو اچھی بات ہے کہ آپ صنفِ نازک کے مخالف نہیں۔ قیصر اعوان صاحب! مجھے تکلیل صاحب کی پڑوسن اس لیے یاد آگئی کہ شاید وہ انہیں بھول رہے ہیں۔ ابرار وارث! آپ کا تبصرہ اچھا تھا۔ ماہا ایمان ایڈٹورس عباس! آئی مس یو۔ ماہ فروری میں میری ساگر ہے۔ کہانیوں میں ہمیشہ کی طرح پہلے گرداب پڑھی۔ اسماعی، ماہ بانو کی زندگی کی مشکلات دور کریں۔ شہر یار پھر پھنس چکا ہے۔ جواری محذرت کے ساتھ اچھی نہیں لگ رہی۔ رنگ بھی کچھ خاص متاثر نہ کر سکے۔ البتہ ابتدائی کہانی شرر بار اچھی تھی، نازیہ کو غصے پر کنٹرول کرنا چاہیے تھا۔ سلیم انور کی سنجیدہ بہت

سبق آموز تھی۔ بعض اوقات انسان جس کے بارے میں نہیں سوچتا، وہی دھوکا دیتے ہیں۔ کاشف زبیر کی کہانی حساب کتاب بھی اچھی تھی۔ کاشف بھائی! شامی اینڈ تیور کو لے آئیں، باقی رسالہ زیر مطالعہ ہے۔“

فوجی ہستی بہاولپور سے بشیر احمد بھٹی کی تیز رفتاری ”سال کا آخری شمارہ اس دفعہ زبردست چمک دکھ لیے ہوئے ہے۔ ذاکر صاحب کا فن اب ہر ماہ فن پاروں کا شاہکار نمونہ بنا جا رہا ہے۔ ان کی مصوری میں خوب نکھار آرہا ہے۔ سب سے پہلے آخری کہانی احمد اقبال کی عکس لبورنگ پڑھی۔ ان کی ہر کہانی میں مزاح کا رنگ ہوتا ہے۔ ہر فقرے میں طرافت نمایاں ہوتی ہے۔ ایکی اور میری کی نوک جھونک نے سونے پر سہاگا کا کام کیا۔ پھر پہلی سرورق کی کہانی زرخیز زمین شیخ ابوبھٹی صاحب کی زبردست کہانی ہے۔ منظر نامہ کی فقیرانہ نقل مختصر دل ربا تحریر تھی۔ کاشف زبیر نے حساب کتاب کو بڑے انوکھے انجام سے دو چار کر کے مغربی ادب کی طرح حیران کر دیا۔ ایک ٹکی سے پانچ لاکھ کی بچت ہوئی۔ مغربی کہانی پھر باز تین صفحے کی مختصر کہانی اچھی رہی۔ جواری کی چھٹی قسط ہنگامہ خیز رہی۔ احمد اقبال تیزی سے اسے آگے بڑھا رہے ہیں۔ شوقیہ سراغ رساں ایک چلتی مورت کی چترائی کی بجائے چڑھ گیا۔ مغربی ادب کی یہ کہانی بھی اچھی رہی۔ شاطر مغربی ادب کی ایک بہترین کہانی ہے۔ ایک گمشدہ بہن یا محبوبہ کی خاطر ویت نام جیسے خطرناک علاقے میں ایک شاطر کلاڑی کی مدد سے محبوب یا بھائی کی جان بچی۔ گرداب کا مطالعہ جاری ہے۔ کچھ مغربی ادب کی کہانیاں اور پہلی کہانی رہتی ہے۔ تبصرہ جلدی میں لکھا ہے تاکہ خط و وقت پر پہنچے، کیونکہ اس دفعہ میں نے جاسوسی سات دبیر کو خرید لیا ہے۔“

کورنگی کراچی سے شمس الحق کی مجبوری ”سردیوں کی مختصر قی شام میں خلاف توقع 3 تاریخ کو جاسوسی کا گرم شمارہ حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔ کچھ مجبوریوں اور کچھ مصروفیت کی بنا پر پچھلے مہینوں میں محفل دوستان میں شرکت سے قاصر رہے مگر یہ کیا بے انصافی ہے کہ کسی نے پوچھا بھی نہیں کہ زندہ ہو بھی یا۔۔۔ بہر حال ہم نے اپنی مجبوری اور مصروفیت کو پس پشت ڈالا۔ ٹائٹل گرل خوب صورت ہونے کے ساتھ ساتھ دو تین بچوں کی ماں لگ رہی تھی۔ باقی جاسوسی کا ہی ٹائٹل تھا۔ سب سے پہلے تو میں احسان سحر کو مبارکباد دینا چاہوں گا جو ایک مہینے کے لیے سبھی ہمارے صدر تو منتخب ہو گئے، مبارک ہو بھائی۔ کہانیوں میں للکار کے بعد نمبر ون رہ جانے والی گرداب پڑھی۔ اس قسط میں اسما صاحبہ نے یہ کیا ہنگامے کر ڈالے۔ ادھر اسلم کو کچھ شہر یا رکو راکے ہاتھ میں دے دیا۔ کیا ہر ناول میں ہمارے ہیرو بھائیوں کا ایسا ہی انجام ہوتا ہے؟ ویسے پچھلی قسطوں میں اور اس قسط میں کافی کامیابیاں بھی ملی ہیں، ہمارے سپاہیوں اور ہیرو بھائیوں کو۔ جواری پرانے طرز کی ایک نئی کہانی ہے لیکن دیوی یا للکار کا ختم البدل تو بہر حال نہیں ہو سکتی۔ جواری سے میں اس لیے بیزار ہوں کہ اس نے ہمارے طاہر انکل کا نام ہی غائب کر دیا۔ حساب کتاب واقعی پُر اثر، درد انگیز اور سبق آموز تحریر تھی۔ سرورق کا پہلا رنگ واقعی رنگوں سے بھرا ہوا تھا۔ وطن کی محبت کے موضوع پر کہانیاں تو میری پسندیدہ ہی ہوتی ہیں۔ دانش کے کردار نے یہ ثابت بھی کیا لیکن ایسا شاذ ہی ہوتا ہوگا۔ لیکن وطن کی محبت اپنے لوگوں میں ہے ہی اگر تھوڑا سا سسٹم صحیح کر لیا جائے تو اپنی پولیس لندن کی پولیس سے بھی اچھی کارکردگی دکھا سکتی ہے۔ تنویر ریاض کی شاطر بھی اچھی کہانی تھی۔ ویسے جاسوسی میں برا ہوتا ہی کچھ نہیں لیکن کبھی کبھی عکس لبورنگ جیسی کہانی کو سرورق بنانے کے دل توڑ دیتے ہیں۔“

لیہ سے مچی الدین اشفاق کی خوش گمانیاں ”جاسوسی کو دیکھا، دل خوش ہو گیا۔ محفل میں گئے۔ اس بار تو بلیک لسٹ بھی اپنے نام سے خالی تھی۔ سب سے پہلے جواری سے ملے۔ خادو کی تلاش نورین جاری ہے۔ ہر مرحلہ چونکا دینے والا ہے۔ احمد اقبال کی اولین اور آخری کاوشیں زبردست ہیں۔ ایسے مواقع کم کم آتے ہیں۔ گرداب میں ماہ بانو اپنے Baby اور کشور اپنے Baby کے ساتھ پریشان حال ہے۔ انڈیا میں شہر یار کی مستیاں مروج پر ہیں۔ معصنہ کو کافی دیر بعد شہر یار کی سرگرمیوں کے تیز کرنے کا خیال آیا۔ جاسوسی اگلے مہینے میں خوب صورت تر ہو سکتا ہے بشرطیکہ کہ ہمارا خط شامل شمول ہو جائے۔“ (لیجیے ہم بھی چاہتے ہیں کہ جاسوسی میں چار چاند لگ جائیں)

کراچی سے محسن کمال کی ناپسندیدگی ”اس بار جاسوسی نے تو کمال کر دیا حالانکہ مجھے لگتا تھا کہ کمال صرف میں ہی کرتا ہوں۔ عام مہینوں کی نسبت اس بار جاسوسی نے 4 تاریخ کو اپنا دیدار کرایا۔ سب سے پہلے گرداب سے شروعات کی۔ للکار کے بعد اب گرداب نے اپنے سحر میں پوری طرح سے جکڑ لیا ہے، جبکہ للکار کے ہوتے کافی دبی دبی اور بورنگ جا رہی تھی، اب کہانی میں کافی تیزی آگئی ہے۔ احمد اقبال کی جواری، جس سے لوگوں کو خاص طور پر للکار کے چاہنے والوں کو بڑی امید تھی کہ جواری شاید للکار کی جگہ لے سکے گی مگر افسوس کہ جواری للکار کا پاسنگ بھی نہیں، انتہائی بور اور بھکی اسٹوری ہے۔ بے حد طویل اور بے مقصد مکالمہ بازی نے کہانی کو انتہائی بور کر دیا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے اتاری پڑھ رہے ہوں۔ وہی زمینداروں کی آپسی لڑائی۔ اس کے علاوہ معذرت کے ساتھ کہ احمد اقبال کی عکس لبورنگ سمجھ میں ہی نہیں آئی۔ اس میں بھی طویل اور بور مکالمہ بازی۔ کہانی بے ربط رہی۔ ایچ اقبال کی شرابار عمدہ تحریر تھی۔ انکل ایک بات یہ پوچھنی تھی کہ احمد اقبال اور ایچ اقبال ایک ہی رائٹر ہیں یا الگ۔ الگ۔ (الگ الگ ہیں) انتہائی معذرت کے ساتھ کہنا چاہوں گا اس بار ان کی 13 اہم کہانیوں کی وجہ سے ماہ دبیر کا شمارہ انتہائی ناقص اور بور تھا۔ امید ہے کہ اس بار مجھے بلیک لسٹ نہیں کیا جائے گا، اقبال کا ایک شعر یاد آ گیا۔ بچہ ستہ رہ بھر سے امید بہار رکھ۔ دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔“

ضلع لیہ سے محمد متین اشرف کے عزائم ”میری عمر 51 برس ہے۔ 30 سال سے زائد کا عرصہ ہو گیا ہے، باقاعدگی سے جاسوسی اور سسٹمز پڑھ رہا ہوں۔ اگر میں یہ کہوں تو بے جا نہیں ہوگا کہ اب گمراہ، مجاہد، شکاری، ہمداری، تاوان، آدھا چہرہ، زنداں میں پھول، موت کے سوداگر کے معیار کی کوئی کہانی آپ کے کسی رسالے میں نہیں ہے۔ گرداب ایک اچھی کہانی ہے مگر اسے اب چار کہانیوں میں تبدیل کر دیا گیا، کرداروں کی ہمارے۔ گزارش ہے کہ ایک سلسلہ وار کہانی عراق یا افغانستان کی جنگ پر شروع کرائیں۔ نیز یہ کہ ڈائجسٹ میں مجھے تو کہیں بھی مدیر کا نام نظر نہیں آیا۔ کیا مدیر کوئی نہیں ہے؟ اگر مدیر نہیں

ہے تو میرا اہلی کہاں سے آئیں؟ اگر مدیر ہے تو اس کا نام ضرور لکھیں۔ ماہ دسمبر کے جاسوسی میں پہلے صفحات کی کہانی شرر بار بہت اچھی رہی۔ کیا یہ بہتر نہیں تھا کہ نازیہ زندہ رہتی؟ دوسری کہانی نکس لہورنگ جو کہ 36 صفحات پر مشتمل ہے، اس میں مجھے تو کہانی کہیں نظر نہیں آئی۔ گو کہ احمد اقبال ایک اچھے قلم کار ہیں۔ آپ صاحب اقتدار اور صاحب اختیار ہیں اگر آپ نے خط شائع کیا تو آئندہ زندگی میں ایک اور خط لکھنے کی کوشش کروں گا۔“

راجہ اسلم حیات ضلع سرگودھا سے اپنی خواہش کا اظہار کرتے ہیں ”سب سے پہلے تمام دوستوں کو نیا سال مبارک ہو۔ (آپ کو بھی سال نو مبارک ہو) جاسوسی اس دفعہ کافی لیٹ ملا۔ سرورق جاسوسی سے زیادہ سائنسی لگ رہا تھا۔ ٹائٹل گرل ایسے نظر آ رہی تھی جیسے کسی ڈھانچے کو وگ اور کپڑے پہنا دیے گئے ہوں لیکن کوئی بات نہیں، ہمارے کو سار بھیا کو پھر بھی ہمیشہ کی طرح کافی حسین نظر آئے گی۔ فہرست میں جھانکا تو احمد اقبال ہی چھائے ہوئے تھے۔ اس کے بعد پہنچے اپنی پیاری محفل میں جہاں احسان سحر کی ناپسندیدگی ادارے کو سب سے زیادہ پسند آئی۔ اسے کہتے ہیں تنہید برداشت کرتا۔ مس ریڈیو اوہ سوری ایف ایم صاحب آپ نے تبصرہ لکھتے ہوئے اتنے کاغذ ضائع کیے۔ ظاہر ہے جب للکار پڑھتے ہوئے آپ نے آنسوؤں کی ندیاں بہا دیں تو خط لکھتے ہوئے کتنے کاغذ گیلے کیے ہوں گے۔ ملک سعید صاحب! محبت تو ایک جذبہ کا نام ہے جو آنکھوں کے راستے دل و دماغ پر چھا جاتا ہے۔ کاظمی صاحب! اگر آپ عروج ناز کو خواب میں نظر نہیں آسکتے تو اس کا مطلب ہے کہ وہ آیت الکرسی پڑھ کے سوئی ہیں۔ ہمایوں سعید چودہ فروری یعنی ویلنٹائن ڈے پر خود کشی کرنے، میرا مطلب ہے شادی کرنے کا ارادہ ہے۔ قیصر بھیا! اللہ تعالیٰ جلد آپ کو آزاد فضاؤں کی نعمت سے نوازے۔ ویسے میرے ایک دوست اہلکار بھی سرگودھا جیل میں ڈیوٹی سرانجام دے رہے ہیں۔ کبیر عباسی! آپ کا انداز اور کہانیاں پر تبصرہ بہت شاندار تھا۔ عروج ناز صاحب! ہر بار خوش خبری کے ساتھ حاضر ہو رہی ہیں۔ پہلے ساگرہ کی پھر پاس ہونے کی، اب کی بار کون سی خوش خبری دیں گی؟ ابرار صاحب! صندرا آباد والوں کا شوشہ اس دفعہ پورا ہونے جا رہا ہے تھوڑا حوصلہ رکھو۔ گرداب میں لگتا ہے اسلم دلدل کی نذر ہو جائے گا اور مشاہیرم ماہ بانو کو نکال لائے گا جبکہ میری یہ خواہش بھی پوری ہونے جا رہی ہے کہ انڈیا میں سلو اور رادالوں کا ٹاکرا ہو۔ جواری وہیں کی وہیں ہے۔ ابتدائی صفحات پر ایچ اقبال کی شرر بار نے یہ ثابت کر دیا کہ عورت اگر ذہنی ناممکن بن جائے تو اس کا کاٹا ہوا پانی تک نہیں مانگ سکتا۔ پہلے ہی لگ رہا تھا کہ عامر ہی اصل مجرم نکلے گا۔ پہلا رنگ زرخیز مٹی بہت فاسٹ اور زبردست رہا۔ البتہ ایک عام سے پولیس افسر جو زیادہ تعلیم یافتہ بھی نہیں تھا، اس کا اٹھیلی جنس جیسے ادارے اور افسران کو اتنا گائیڈ کرنا کچھ مضحکہ نوا تھا۔ کاشف ذبیحہ صاحب کی حساب کتاب بہت شاندار کہانی تھی جس میں انہوں نے ناجائز منافع خوروں و بچکی چوروں، نکس چوروں اور بھتا خوروں کا حساب کتاب بیان کیا۔“

کراچی سے اور نیس احمد خان کی رپورٹ ”جاسوسی ڈائجسٹ کچھ تاخیر سے ملا۔ ٹائٹل گرل کے چہرے پر خوف کے سائے نظر آرہے ہیں۔ اندرونی صفحات پر ادارے سے مستفیض ہوئے۔ میا نوالی کے احسان سحر کو مبارک باد۔ پھر سب سے پہلے چینی نکتہ چینی میں شریک محفل ہوئے جہاں دوستوں کی محفل جی ہوئی ہے اور اپنے اپنے تازہ بہ تازہ خیالات کا اظہار کر رہے ہیں۔ اس کے بعد جواری کی بساط پر پہنچے جہاں نئے کردار وارد ہو رہے ہیں اور ہر ایک کے ساتھ اس کی ایک کہانی بھی ہے۔ دلچسپی برقرار ہے۔ شرر بار ایچ اقبال کی آج کل کے حالات کی مناسبت سے حقیقت سے قریب تر کہانی تھی۔ حقیقتاً ایسا ہی دور ہے۔ شاطر تنویر ریاض کی کہانی بہتر تھی۔ تعاقب، ڈھونگ، دوسرے، شوقیہ سراغ رساں کے سارے خواب چکنا چور ہو گئے۔ چکر باز، حساب کتاب، فقیرانہ نقل اور آخری صفحات کی دونوں کہانیاں مجموعی طور پر اچھی تھیں۔ بیچ بیچ میں کترنوں نے بھی مزہ دیا۔ اس مہینے بس اتنا ہی۔“

سندھیلیا نوالی سے ابرار وارث کی دل داری ”اس دفعہ کا شمارہ 5 تاریخ کو بروقت مل گیا۔ سرورق کا حصہ بہت پیارا تھا۔ مجموعی طور پر بہت اچھا تاثر لگا۔ ملی جلی حقوق دیکھنے کو ملی۔ بزم یاراں میں احسان سحر کو کرسی صدارت پر بڑی شان سے منتہن دیکھا۔ احسان بھیا! آپ کی اس بات سے میں بھی بالکل متفق ہوں کہ جواری بیکار اور بے ٹائم پاس ہے جبکہ گرداب بہت اچھی اور حب الوطنی کے تاثر پر لکھی ہوئی بہت پیاری ہے۔ ہتھوکی والی باقی نے اتنے مہینوں بعد تابی اور عمران کا ذکر کر کے پھر زخم ہرے کر دیے۔ واقعی ایک انمول تحریر تھی۔ زویا جی نے کسی کو مخاطب کیے بغیر تبصرہ لکھ کر ریکارڈ بنایا۔ سید کھلیل جی! یہ کون سی پنجابی کا مقولہ ہے بھلا اس کی وضاحت کریں، مجھے سمجھ نہیں آئی۔ ہمایوں سعید! مبارک باد کہ آپ کی شادی کی تاریخ نکس ہو گئی۔ ویلنٹائن ڈے پر ویٹ کرو جی! آغا فرید کا تبصرہ بھی زبردست لگا۔ ان کو ابھی تک نہیں پتا ماہا ایمان کون تھی۔ قیصر احوان کا تبصرہ پسند آیا۔ اللہ سے دعا گو ہیں کہ جلد آپ کو اسیری سے رہائی دلائے، آمین۔ محسن علی کی مصوم شرارتیں بھی دلچسپ تھیں ماہا!۔ شیخوپورہ سے شایان سعید بھی آ گیا آپ کا مشاہیرم خان امریکا میں... خوش، اسلم اور ماہ بانو کا اب وہی محافظ رہ گیا ہے وہاں۔ کبیر عباسی بھیا کا شاندار تبصرہ پڑھنے کو ملا۔ پہلی دفعہ دل سے پڑھا۔ بہت اچھا لگا خاص طور پر گریدنگ سسٹم والی بات۔ اب یہ ہر دفعہ آپ نے درجہ بندی کرنی ہے۔ عروج ناز اپنے پاس ہونے کی خوشی میں کافی چمک رہی تھیں مبارک ہو جی۔ بات ہو کہانیوں کی تو جواری پڑھی ہی نہیں کیونکہ اس میں کوئی چارم ہے ہی نہیں۔ جاسوسی ہم گرداب کی وجہ سے پڑھتے ہیں۔ گرداب کی یہ قسط بھی سنسنی خیز ثابت ہوئی۔ اسلم اور ماہ بانو بے چارے پھر پھنس گئے ایک دلدل میں اور دوسری شاید طارق کے ہتھے پھر چڑھ گئی۔ اب مشاہیرم خان کی از حد ضرورت ہے۔ دوسری طرف شہر یار اور سلو ابھی تک کسی بہتر صورت حال سے دو چار نہیں ہوئے۔ ابتدائی صفحات پر ایچ اقبال کی شرر بار پڑھی۔ انجام نے روٹے کھڑے کر دیے۔ نازیہ نے اتنا اندھا انتقام لیا اور خود بھی نہ رہی۔ شاید انتقام کی آگ اُسکی ہی ہے، سب کو جلا کر بھسم کر دیتی ہے۔ کچھ بہتر لگی زیادہ نہیں۔ سب سے اچھی تحریر حساب کتاب کاشف ذبیحہ کی رہی۔ اللہ اپنے بندوں کو آزماتا ہے اور سچ ہے کہ اپنے محبوب بندوں کو گناہ سے بچاتا بھی ہے جیسا کہ عطا کے ساتھ ہوا۔“

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شامل اشاعت نہ ہو سکے۔
سراج الحق چترالی، کراچی۔ محسن علی موم، بالاکوٹ۔ قیصر احوان، سرگودھا۔ مشتاق حسین کھوکھر، اسلام آباد۔ طاہرہ گلزار، پشاور۔ سید اکبر شاہ، اوکی مانسہرہ۔ مظہر سلیم، رحیم یار خان۔ آصف علی، فیصل آباد۔ تصویر العین، اوکاڑہ۔ ایم اے ہاشمی، یونیر۔ صبا گل، بھدر بابا، یونیر۔

ذہن کے نہاں خانوں میں موجود متنی سوچوں پر اگر مثبت رویے غالب نہ آئیں تو انسان سب کچھ پا کر بھی تہی داماں رہتا ہے!

جلاد صفت

کاشفِ زبیر

بدعنوانی کے سمندر میں ڈالے گئے جال کو بڑی مچھلیاں توڑ کر اگر نکل جاتی ہیں تو چھوٹی مچھلیاں بھی بچ بچا کر فرار حاصل کر رہی لیتی ہیں لیکن بددیانتی سے پہنچنے والے نقصانات کے اثرات کبھی انسان کا پیچھا نہیں چھوڑتے... زیست کے سفر میں اکثر کہیں پیچھے لٹ جانے والوں کا مداوا آگے ملنے والی خوشیوں سے ہو ہی جاتا ہے مگر کبھی کبھی تہی داماں رہ جانے کی کسک ہمیشہ دل و دماغ پر قابض رہتی ہے... معاف کر دینا... خوشیوں کی طرف لے جاتا ہے... جبکہ ماضی کی زیادتیوں پر کڑھتے رہنے سے انتقام کی چنگاری کبھی سرد نہیں ہو پاتی۔ اس کی زندگی بھی جہدِ مسلسل سے عبارت تھی اور ثمرات میسر تھے لیکن ماضی... وہ سوچوں میں دبی چنگاری کی طرح زندہ رہا اور جب یہ بھڑکی تو شعلہ بن کر ایسے پھیلی کہ تپش دامنِ دل تک آپہنچی... محبت کی مہک سے دشمن کو بھی خود کردہ جرم کا اعتراف اور کی گئی زیادتیوں کے اظہارِ پشیمانی پر مجبور کیا جاسکتا ہے لیکن نفرت کی چنگاری کو ہوا دینے سے کبھی کبھار وہ خود بھی ان شعلوں میں بھسم ہو کر رہ جاتا ہے جس کی ذات بہت سوں کے لیے قابلِ پرستش ہوتی ہے۔

حالات کو سنگین سے سنگین بنا دینے والے محرکات کے تباہ کن نتائج کا سنسنی خیز احوال

ریاض احمد دفتر جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس کے بیوی بچے ناشتے کی میز پر موجود تھے اور بار بار اسے آوازیں دی جا رہی تھیں۔ وہ شہری انتظامیہ میں ایک اعلیٰ عہدے پر تھا۔ اس کی تنخواہ اور دوسری سہولیات بہت اچھی تھیں لیکن یہ چھ سو گز کا بنگلا اور اس کی بیس لاکھ کی کار اس کی آمدنی سے میل نہیں کھاتے تھے۔ ریاض ناشتے کے دوران میں بیوی بچوں کی فرمائشیں سن رہا۔ بیوی ڈائمنڈ نیگلکس کا مطالبہ کر رہی تھی جس کی قیمت صرف پچھن لاکھ روپے تھی۔ اس کے بڑے بیٹے کو جدید ترین آئی فون چاہیے تھا اور بیٹی اپنی دوستوں کے ساتھ دعائی جانا چاہتی تھی۔ اس نے سب کے مطالبات سنے اور بولا۔ ”بس چند دن رک جاؤ... ایک معاملہ اٹکا ہوا ہے، وہ نکل جائے تو سب ہو جائے گا۔“

”آپ کے پاس کوئی کمی تو نہیں ہے۔“ بیوی نے تنک کر کہا۔ ”اللہ نے اتنا دیا ہوا ہے۔“

ریاض احمد کھسیا گیا۔ وہ جانتا تھا کہ اس نے کیسے کمایا ہے۔ ”بھئی ان معاملات میں اللہ کا نام مت لیا کرو۔“

ناشتا کر کے وہ باہر آیا۔ ڈرائیور کار کے پاس کھڑا اسے صاف کر رہا تھا۔ ریاض کو دیکھ کر اس نے مستعدی سے دروازہ کھول دیا۔ ریاض احمد بریف کیس



PAK
SOCIETY
COM

2014

سنجھالے کار کی طرف بڑھا تھا کہ اسے بے چینی کا احساس ہوا۔ اس بے چینی کا مرکز ماتھا تھا۔ اس کا ہاتھ ماتھے کی طرف گیا تھا کہ اس کے کانوں نے ایک سنسناتی آواز سنی اور اگلے لمحے وہ نیچے گر رہا تھا۔ ڈرائیور پچٹی پچٹی نگاہوں سے اس کے ماتھے کے سوراخ کو دیکھ رہا تھا۔ ماربل کے سفید فرش پر دور تک خون بکھر گیا تھا۔

☆☆☆

محمود ایاز بہت غریب پس منظر سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کا باپ ایاز سبزی کا ٹھیلا لگاتا تھا۔ اس وقت سبزی فروش بچے سبزی فروش ہوتا تھا اور سارا دن سبزی بیچ کر بس اتنا کما تا تھا کہ اپنے اہل خانہ کو دال سبزی کھلا سکے۔ محمود اس کا اکلوتا بیٹا تھا۔ جب وہ صرف سات برس کا تھا تو ماں مر گئی۔ امینہ برسوں سے پچھلے پھڑوں کی مریمہ بھی اور ایاز میں اتنی سکت نہیں تھی کہ اس کا علاج کرا سکتا۔ محمود کے لیے یہ زندگی کا پہلا المیہ تھا ورنہ ماں کے ساتھ تو وہ غربت میں بھی خوش تھا۔ اس کا بس ایک شوق تھا اور وہ تھا تعلیم۔ وہ پڑھنا چاہتا تھا اسی لیے ماں نے اس کے باپ سے منوالیا کہ وہ اسے اپنے ساتھ سبزی کے کام پر نہیں لگائے گا بلکہ پڑھنے کے لیے اسکول بھیجے گا۔ ایاز بیوی کی بات ماننے پر مجبور ہو گیا۔ اس کا خیال تھا کہ محمود نام رکھنے سے اس کا بیٹا بچ بچ محمود نہیں بن جائے گا۔ اس کی قسمت میں باپ کی طرح ایاز بننا ہی لکھا تھا۔ بیوی کے مجبور کرنے پر اس نے محمود کو سرکاری اسکول میں داخل کرادیا۔ پرائیویٹ اسکول کے خرچ وہ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

محمود اس میں بھی خوش تھا۔ اسے پڑھنے کا شوق نہیں جنون تھا۔ اس نے پہلی کلاس میں ہی اساتذہ کو حیران کر دیا۔ اسے جو ایک بار بتایا یا سکھایا جاتا، دوبارہ بتانے یا سکھانے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ پھر وہ رفقا نہیں تھا بلکہ بچ بچ سیکھتا تھا۔ پہلی کلاس کا نصاب اس نے چھ مہینے میں ختم کر دیا۔ یہ دیکھتے ہوئے اسے امتحان سے پہلے دوسری کلاس میں پروموٹ کر دیا گیا اور امتحان تک اس نے دوسری کلاس کا نصاب بھی چاٹ لیا۔ جب امتحان ہوئے تو اس نے ہر مضمون میں سو میں سے سو نمبر لیے۔ واحد ڈرائنگ تھا جس میں اس کے پچانوے نمبر آئے تھے۔ جس دن اس کا نتیجہ آیا، اسی دن امینہ نے اپنی تیس سالہ زندگی کا آخری سانس لیا۔ مبارک باد دینے کے لیے آنے والی نیچرز اس کی میت میں شریک ہوئی تھیں۔

☆☆☆

رفاقت علی سوکراٹھا تو اس کا سر بھاری ہو رہا تھا۔ یہ گزشتہ رات شراب اور شباب سے شغل کا فطری نتیجہ تھا۔ دھسکی کی بوتل خالی تھی اور اس کے برابر میں لیٹی لڑکی بھی خالی بوتل جیسی لگ رہی تھی۔ نشا کال گرل تھی اور یہ فلیٹ اسی کا تھا۔ رفاقت ہفتے میں ایک بار اس کے پاس آتا تھا۔ وہ بہت خوب صورت تھی اسی لیے بہت مہنگی تھی۔ لیکن رفاقت کے لیے پیسا مسئلہ نہیں تھا۔ وہ جس محکمے سے تعلق رکھتا تھا، وہ عوام سے پیسا وصول کرتا تھا۔ اگر محکمہ سارا پیسا وصول کرتا تو حکمرانوں کو کٹکول لے کر در بدر بھیک مانگنے کی مشق نہ کرنی پڑتی۔

رفاقت علی کا ڈیفنس میں شاندار بنگلا تھا جس میں وہ اپنے اہل خانہ کے ساتھ ٹھاٹ سے رہتا تھا۔ کسی میں جرأت نہیں تھی کہ وہ اس کی آمدنی اور طرز زندگی میں فرق تلاش کرتا۔ یہ بنگلا اس کی بیوی کے نام پر تھا۔ ایسے ہی کئی بنگلے اور جائیدادیں اس کے خاندان کے دوسرے افراد کے نام پر تھیں۔ پچیس برس کی رفاقت کے بعد اس کی بیوی اب صرف بچوں کی ماں رہ گئی تھی اس لیے رفاقت کی ہفتے میں ایک رات کلغٹن کے اس فلیٹ میں گزرتی تھی۔ اصل بات یہ تھی کہ وہ اسی شوق کے لیے دولت رکھتا تھا ورنہ شاید وہ بھی شریف آدمی ہوتا۔ گھر والوں کو اتنا معلوم تھا کہ وہ یہ رات اپنے دفتر میں گزارتا ہے تاکہ پورے ہفتے کی آمدنی کا حساب کر کے اپنا حصہ وصول کر سکے کیونکہ اسی حصے کی بنیاد پر اہل خانہ عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتے تھے۔ اگر اس کی بیوی سمیت کسی کو جھک یا علم بھی تھا کہ وہ اس رات کہاں ہوتا ہے تو اس نے بھی اظہار نہیں کیا تھا۔ دولت کی فراوانی ہو تو بہت سارے معاملات خیر و خوبی سے چلتے رہتے ہیں۔

رفاقت نے غسل کیا اور کپڑے زیب تن کیے۔ اسے بھوک لگ رہی تھی اور ناشادہ گھر پر کرنا چاہتا تھا۔ لڑکی کو سوتا چھوڑ کر وہ باہر سڑک پر موجود اپنی گاڑی تک آیا۔ دروازہ کھول کر اندر بیٹھا تھا کہ اسے کار میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا، اس نے مڑ کر دیکھنا چاہا لیکن اسی لمحے اسے دھکا لگا اور وہ اوندھے منہ اسٹیرنگ پر گرا اور ساکت ہو گیا۔ عقب سے چلائی ہوئی گولی اس کے دل میں اتر گئی تھی۔ جہاں چند لمحے پہلے بہت سی خواہشات دھڑک رہی تھیں اب وہاں موت کا سکوت تھا۔

☆☆☆

ایاز، بیوی کے بعد محمود کو اسکول سے اٹھا کر اپنے

ساتھ کام پر لگانا چاہتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ جب تک اس کے بازو کمزور ہوں، محمود کے بازو اتنے مضبوط ہو چکے ہوں کہ وہ ٹھیلے کا بوجھ سنبھال سکے۔ اس نے محمود کی التجاؤں کو بھی اہمیت نہیں دی۔ اس کا خیال تھا کہ سات سالہ محمود اکیلا کیسے رہے گا، وہ اس کے ساتھ ہوگا تو اسے فکر بھی نہیں ہو گی۔ محمود نے دیکھا کہ باپ اس کی ماننے کو تیار نہیں ہے تو اس نے اپنے اسکول کی ہیڈ مسٹریس سے بات کی۔ یہ پرائمری اسکول تھا اور اس کا سارا عملہ خواتین پر مشتمل تھا۔ ہیڈ مسٹریس حیران ہوئی کہ اتنے ذہین بچے کا باپ اسے پڑھانا نہیں چاہتا لیکن جب وہ ایاز سے ملی تو اسے اندازہ ہوا کہ وہ مخصوص ذہن کا شخص ہے جسے تعلیم کی اہمیت کا اندازہ نہیں ہے۔ ہیڈ مسٹریس نے ایاز سے بات کی اور اسے قائل کرنا چاہا کہ وہ محمود کو آگے پڑھنے دے۔

”دیکھیں جی، مجھے پڑھانے پر کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن اس کی چھٹی بارہ بجے ہو جاتی ہے۔ میں صبح چھ بجے کا گھر سے نکلتا ہوں تو شام سات بجے واپس آتا ہوں۔ یہ اتنی دیر گھر میں اکیلا رہے گا۔“

”یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ میں اسے اپنے گھر لے جاؤں گی۔ تم وہاں سے اسے لے سکتے ہو۔ یہ بہت ذہین بچہ ہے، میں اسے گھر میں بھی پڑھاؤں گی۔ تم اسے سبزی کے ٹھیلے میں لگا کر برباد کر دو گے۔“

ہیڈ مسٹریس اچھی عورت تھی۔ محمود کی تعلیم کے لیے اس نے یہ ذمہ داری لے لی۔ یوں محمود اسکول جانے لگا۔ وہاں سے وہ ہیڈ مسٹریس کے ساتھ اس کے گھر چلا جاتا۔ وہ اسے پڑھاتی بھی تھی اور زندگی کے ادب و آداب بھی سکھاتی تھی۔ یہ مدت زیادہ نہیں تھی۔ اسے صرف تین سال ہیڈ مسٹریس سے سیکھنے کا موقع ملا اور اس کے بعد ان کا تبادلہ ہو گیا۔ نئی آنے والی ہیڈ مسٹریس مخصوص سرکاری ٹیچرز والا رویہ اور ذہن رکھتی تھی۔ اسے محمود سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ لیکن اب محمود دس سال کا تھا اور اس کا بل تھا کہ اپنی دیکھ بھال کر سکے۔ اتنی سی عمر میں وہ ساتویں کلاس میں آ گیا تھا۔ پرائمری اسکول اب بدل ہو گیا تھا مگر ہیڈ مسٹریس کے جانے کے بعد محمود کا دل یہاں سے اچاٹ ہو گیا۔ اس نے امتحان کے بعد ایک اچھے سرکاری اسکول میں داخلے کی درخواست دی۔ اس کی قابلیت دیکھتے ہوئے اسے داخلہ دے دیا گیا۔ اس نے میٹرک یہیں سے کیا۔ میٹرک میں اس کا بورڈ میں تیسرا نمبر تھا اور بہت عرصے بعد پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ کسی سرکاری اسکول کی بورڈ میں پوزیشن آئی ہو۔

اس کی پوزیشن اور ذہانت کی وجہ سے اسے شہر کے ایک بہترین کالج میں داخلہ مل گیا تھا۔ تعلیم کے جنون کے باوجود اس نے ابھی تک نہیں سوچا تھا کہ اسے کیا پڑھنا ہے۔ اس نے کالج میں سائنس یا کامرس کے برعکس آرٹس کا انتخاب کیا۔ جب وہ پہلی کلاس لینے پہنچا تو اسے بتایا گیا کہ بورڈ میں پہلی سو پوزیشنز حاصل کرنے والے طلباء میں وہ واحد تھا جس نے آگے تعلیم کے لیے آرٹس کا انتخاب کیا تھا۔ باقی سب نے سائنس یا کامرس کا انتخاب کیا تھا۔

☆☆☆

نور اللہ پٹواری جاگیرداروں کے سامنے عاجزی اور انکساری سے رہتا تھا۔ خود کو ان کا ملازم اور غلام جانتا لیکن اپنے دفتر میں وہ بالکل بدل جاتا تھا۔ یہاں وہ بادشاہ تھا اور کسی کے لیے کوئی حکم بھی دے سکتا تھا۔ البتہ اس کے پاس بادشاہوں والا ظرف نہیں تھا جو بعض اوقات گالی دینے پر بخش دیتے تھے۔ وہ رعایت کا قائل نہیں تھا۔ حالانکہ اس کی بادشاہت بھی نسل در نسل چلی آرہی تھی۔ اس کا دادا پٹواری بنا تھا۔ پھر اس کا باپ پٹواری بنا اور اب وہ پٹواری تھا۔ اس نے اپنے بیٹے کی تربیت شروع کر دی تھی۔ جب اس کی ریٹائرمنٹ کا وقت آتا تو وہ پہلے ہی بیٹے کو تخت پر بٹھا جاتا۔ اپنے علاقے کی زمینیں اسے یوں یاد تھیں جیسے اس کے ہاتھ کی لکیریں ہوں۔ یہی اس کا فن تھا۔ زمینوں کے کھاتے وہ چشمے تھے جن سے پانی کی جگہ دولت نکلتی تھی۔ یہ کھاتے اس کی جنبش قلم کے محتاج ہوتے تھے۔ وہ ان سے ایسی جادوگری دکھاتا کہ صدیوں سے زمینوں کے مالک اچانک بے زمین ہو جاتے تھے۔ یہ وہ بد قسمت ہوتے تھے جن کی چندائیکڑیا اس سے بھی کم زمین ہوتی تھی اور اس کا وارث کوئی عورت یا ایسا فرد بن جاتا تھا جو زمین کی ملکیت کے لیے لڑ نہیں سکتا تھا۔ نہ بازو سے اور نہ عدالت سے۔ پھر کسی دن اچانک پٹواری کے آدمی آکر اسے بتاتے کہ وہ جس زمین کو اپنا سمجھتا تھا، وہ اس کی نہیں ہے۔ اسے بے دخلی کے لیے ایک دو دن کا وقت دیا جاتا اور اس کے بعد بے دخل کر دیا جاتا۔ اس کا حلقہ اگرچہ دیہی تھا لیکن اس کا دفتر شہر میں تھا۔ سائل اس سے یہیں آکر ملتے تھے۔ اس وقت بھی نور اللہ کے دفتر میں ایک بوڑھی عورت اس کے سامنے بیٹھی گڑگڑا رہی تھی۔

”یہ زمین میری ہے۔ میرے سر نے خریدی تھی پھر میرے شوہر کی ملکیت رہی اور اب میری ہے۔“

”تجھے بتایا تو ہے خریداری میں گڑبڑ تھی۔ سرکار نے

ملکیت منسوخ کر دی ہے۔ نور اللہ نے درشت لہجے میں کہا۔ ”خوآنخواہ دماغ نہ کھا... جا کر اپنا کام کر۔“
بوڑھی عورت نے میلے دوپٹے سے آنسو صاف کیے۔
”پٹواری، اللہ سے ڈر جس کا نام تیرے نام کے ساتھ لگا ہوا ہے۔ مجھ بیوہ کی ایک ایکرز زمین لے کر تو کیا کر لے گا۔ تجھے پہلے ہی اللہ نے بہت دے رکھا ہے، پر میرا واحد سہارا یہ زمین ہے۔“

نور اللہ ایسی باتیں بہت سن چکا تھا اور اب اسے ان سے چڑھنے لگی تھی۔ اس نے چہرہ اسی کو بلوا کر عورت کو دفتر سے نکلوا دیا۔ اس کا موڈ خراب ہو گیا تھا جسے ٹھیک کرنے کے لیے اس نے سرحد پار سے اسمگل کی ہوئی اعلیٰ درجے کی شراب کا ایک پیگ بنایا۔ بوتل اس کے دفتر میں موجود ہوتی تھی۔ اکثر بڑے زمیندار یا افسران آجاتے جن کی خاطر تواضع کرنا پڑتی تھی۔ اس نے حقارت سے سوچا۔ ”پاکل بڑھیا مجھے ڈراتی ہے۔“

یہ سوچتے ہوئے اس نے ایک ہی بار میں نصف گلاس حلق سے اتار لیا۔ اس نے گلاس میز پر واپس رکھا اور ساکت ہو گیا۔ دو گھنٹے بعد چہرہ اسی اندر آیا تو وہ اسی طرح بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں ٹھہر گئی تھی اور منہ سے کڑوے باداموں کی بو آرہی تھی۔

☆☆☆

لیکچرار ہال میں طلباء اپنی اپنی باری پر بتا رہے تھے کہ انہوں نے جرنلزم کا انتخاب کیوں کیا۔ آج نئے بیچ کی پہلی کلاس تھی اور پروفیسر اختر شاد تعارف لے رہا تھا۔ تیس سالہ پروفیسر اختر شاد حال ہی میں بیرون ملک سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کر کے واپس آیا تھا۔ وہ اسکالرشپ پر باہر گیا تھا اور تمام تعلیم سرکاری خرچ پر حاصل کی تھی۔ معاہدے کی رو سے وہ سرکاری جامعات میں جاب کا پابند تھا۔ اس کی ذہانت اور اعلیٰ ڈگری کو دیکھتے ہوئے اسے ابتدا میں ہی اچھا عہدہ دیا گیا تھا۔ جب محمود کی باری آئی تو اس نے جواب دیا۔ ”میرا نام محمود ایاز اور میرا باپ سبزی فروش ہے۔ وہ اس وقت بھی گیوں میں اپنی ریزمی پر سبزی بیچ رہا ہوگا۔ وہ ایاز ہے لیکن میں محمود بننا چاہتا ہوں۔ ویسے میں نے قرعہ کر کے اس شعبے کا انتخاب کیا ہے۔“

اس پر ایک قہقہہ لگا اور پروفیسر نے بھی حیرت سے اسے دیکھا۔ ”ریٹلی... تم نے سچ سچ قرعہ ڈالا؟“
”ہاں...“
”وجہ مسٹر محمود ایاز؟“

”کوئی خاص نہیں۔“ اس نے سرسری سے انداز میں جواب دیا۔ ”میں ذہین ہوں اور جس شعبے میں چاہوں کامیاب ہو سکتا ہوں۔“
پروفیسر اختر شاد نے اسی لمحے اسے پسند کر لیا۔ ساتھ ہی اس نے محسوس کیا کہ اس کا کامیابی کا دعویٰ بھی درست تھا۔ اسے کامیاب ہونے سے صرف تقدیر روک سکتی تھی۔

☆☆☆

اعجاز خان اپنے دفتر سے نکلا۔ کچھ دیر بعد عمارت کے اس فلور پر آگ بھڑک اٹھی تھی۔ عمارت میں گیس کمپنی کا صدر دفتر تھا۔ جب تک فائر بریگیڈ اور امدادی عملہ آتا، آگ نے پورے فلور اور اس سے اوپر والے فلور کے کچھ حصے کو بھی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ دو دن بعد آگ بہ مشکل بجھی تو اعجاز خان کے فلور پر کوئی چیز سلامت نہیں بچی تھی۔ یہاں سی این جی اسٹیشنوں کو گیس کی فراہمی سے متعلق ریکارڈ تھا۔ وہ بھی سب راکھ ہو گیا۔ اعجاز خان نے یہ خبر اپنے گھر میں بیوی پر دیکھی تو اس کے چہرے پر طمانیت بھری مسکراہٹ آگئی۔ اس نے بیوی بند کر کے اپنے ملازم کو آواز دی۔ ”ٹمس...!“
”جی صاحب۔“ ٹمس آگیا۔ اعجاز خان کے گھر کا سارا کام وہی کرتا تھا۔ کھانا بھی وہی بناتا تھا۔ اعجاز خان کے اہل خانہ ملک کے شمال میں رہتے تھے۔ وہ خود ملازمت کی وجہ سے یہاں مقیم تھا۔

”آج میں کھانا باہر کھاؤں گا۔“

”ٹھیک ہے صاحب۔“

”شاید دیر سے آؤں۔ تم گیارہ بجے اندر کی کنڈی کھول کر لاک چھوڑ دینا، میں خود آ جاؤں گا۔“

آج اس کے چند واقف کاروں نے باریبی کیو کا انتظام کیا تھا۔ اس کے ساتھ پینے پلانے کا بندوبست بھی تھا۔ اپر کلاس کی چند منتخب خواتین بھی مدعو تھیں اور اگر ان میں سے کوئی اعجاز خان پر مہربان ہو جاتی تو اسے واپسی میں دیر بھی ہو سکتی تھی۔ وہ بہت سرور انداز میں گنگناتا ہوا اس عالی شان اپارٹمنٹ کمپلیکس کی پارکنگ میں آیا۔ یہاں صرف بہت دولت مند لوگ رہ سکتے تھے اور اس سے آج تک کسی نے نہیں پوچھا تھا کہ جب اس کی تنخواہ صرف پچاس ہزار روپے ماہانہ ہے تو وہ ڈھائی کروڑ روپے مالیت کے اپارٹمنٹ میں کیسے رہ رہا ہے۔ پارکنگ میں اس کی صرف دو مہینے پرانی غیر ملکی کار کھڑی تھی، اس کی مالیت تقریباً نصف کروڑ تھی۔ اس نے ریوٹ سے کار کو اُن لاک کیا اور دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پر آیا۔ اس کا ہاتھ انجینشن

آگ تھی۔ اس میں ایک درجن افراد جھلس کر مارے گئے جن میں اکثریت عورتوں اور بچوں کی تھی۔ قبضہ مافیا اس زمین پر قابض ہونا چاہتی تھی جس کے مالکان ملک سے باہر تھے اور اپنی زمینوں کو قبضے سے بچانے کے لیے انہوں نے یہاں غریبوں کو جھونپڑیاں بنانے کی اجازت دی تھی۔

چارمنٹ کی اس ویڈیو نے سنسنی پھیلا دی تھی۔ چینل پر الزامات لگے اور اسے سرکار کی طرف سے ایسی کسی ویڈیو کو نشر کرنے سے روکا گیا۔ اس پر چینل آزادی اظہار کا حق لینے عدالت پہنچ گیا اور اسے وہاں سے پروا نہ آزادی مل گیا۔ اس کشمکش نے اس شخص کو مزید شہرت دی جس نے خود کو منصف کہا تھا۔ اس نے اندھے انصاف کا علامتی ماسک لگا رکھا تھا۔ ویڈیو کے آخر میں اس نے مزید کچھ لوگوں کو سزا دینے کا اعلان کیا جو سزائے موت کے مستحق ہو گئے تھے لیکن قانون ان کو عدالت کے کٹہرے میں نہیں لاسکا تھا۔ ایک ہفتے بعد دوسری ویڈیو ملی۔ اس میں رفاقت علی کے جرائم سے آگاہ کیا گیا۔ اس کا اصل جرم تو رشوت خوری تھا لیکن جو جرم سزا کا باعث بنا، وہ ایک درمیانے درجے کے ایمان دار تاجر کی خودکشی تھی۔ اسے اتنے زیادہ ٹیکس کا نوٹس دیا گیا جو وہ ادا نہیں کر سکتا تھا۔ اس کا قصور یہ تھا کہ وہ رشوت نہیں دے رہا تھا۔ محض چند لاکھ رشوت کے لیے اس پر اتنا زیادہ دباؤ ڈالا گیا کہ اس نے خودکشی کر لی۔

اس ویڈیو نے زیادہ سنسنی پھیلائی کیونکہ منصف نے اعلان کیا کہ وہ معاشرے کے ان لوگوں کو سزائیں دینے کا کام جاری رکھے گا جو ملک اور قوم کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔ اس کے خیال میں ملک میں بگاڑ کے سب سے زیادہ ذمے دار وہ ملازمین ہیں جو اپنے اختیارات کو ذمے داری سے ادا کرنے کے بجائے صرف اپنے مفاد کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔ وہ براہ راست لوگوں کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔ ان بد عنوان افراد کا ایک ہی علاج ہے اور وہ ہے سزائے موت۔ ایک بار پھر چینل پر دباؤ آیا کہ وہ منصف کی کوئی ویڈیو نشر نہیں کرے گا مگر چینل نے اس دباؤ کے آگے جھکنے سے انکار کر دیا۔ اس پر الزام لگایا گیا کہ منصف کے پیچھے اصل میں چینل کی انتظامیہ ہے اور وہ اسے سپورٹ کر رہی ہے۔ لوگ بھی شک میں تھے کہ کہیں یہ مقبولیت حاصل کرنے اور اپنے چینل کی ریٹنگ بڑھانے کا حربہ تو نہیں ہے مگر ساتھ ہی وہ منصف کی حمایت کر رہے تھے۔ رپورٹرز کی اور کسی حد تک سرکاری تفتیش سے بھی واضح تھا کہ مارے جانے والے دونوں افراد ان جرائم میں ملوث تھے جن کا

کی طرف بڑھا۔ وہ آنے والے وقت کے تصور میں گم تھا۔ جیسے ہی اس نے چابی گھمائی، کار کا ڈیش بورڈ سامنے سے پھٹا اور اس سے آگ کا ایک طوفان نمودار ہو گیا۔ اعجاز خان اس طوفان میں گم ہو کر رہ گیا۔

☆☆☆

میڈیا آئے دن نئے نئے تماشے دکھاتا ہے اور اس بے بسی سے حیران ہونے والی قوم کو مزید حیران کرتا ہے۔ وہ ایک طرف ملک کے مسائل کا ذمے دار حکمرانوں کو قرار دیتا ہے اور دوسری طرف انہیں عزت مآب اور عالی جاہ جیسے الفاظ سے یاد کرتا ہے۔ ایک معمولی سی خبر کو اچانک ہی قوم کا بخار بنا دیتا ہے اور پھر اسے یوں بھول جاتا ہے جیسے کبھی کبھو ابھی نہیں تھا۔ معاشرے کے مکروہ کرداروں کو سامنے لاتا ہے اور پھر ان کرداروں کا انجام کبھی لوگوں کے سامنے نہیں لاتا۔ کرپشن کی داستانیں بیان کرتا ہے اور پھر ان داستانوں کے کردار جب اعلیٰ مناصب پر بیٹھ کر ملک و قوم کے لیے فیصلے کرتے ہیں تو ان کی کوریج کرتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں میڈیا آدھا سچ بولتا ہے جو پورے جھوٹ سے زیادہ خطرناک اور مہلک ہوتا ہے۔ اس کے باوجود لوگ شوق سے میڈیا کے تماشے دیکھتے ہیں۔ اگر کسی ٹاک شو میں مہذبانہ گفتگو ہو رہی ہو تو لوگ بور ہو کر چینل بدلتے ہیں اور کسی ایسے پشمارے دار ٹاک شو کی تلاش کرتے ہیں جس میں شرکا، تہذیب اور اخلاق کی حدیں پار کر رہے ہوں۔ اینکر پرسن اپنی مرضی کا کھراچ بولتے ہیں اور کہانیاں لکھنے والے عوام کو آنے والے کل کا احوال سناتے ہیں۔ عوام سنتے ہیں اور اپنے گھروں میں بیٹھ کر ان کو سناتے بھی ہیں لیکن اگلے دن وہ پھر وہی ٹاک شو دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ اس لیے ہمارا آنے والا کل بھی پہلے جیسا ہوتا ہے۔ تہذیبی آتی ہے تو صرف بد سے بدتر کی طرف آتی ہے۔ میڈیا نے لوگوں کو ایسی کشمکش میں ڈال دیا ہے جہاں وہ ہر جھوٹ پر اعتبار کر لیتے ہیں اور ہر سچی خبر پر شک کرتے ہیں۔

اس لیے جب منصف کا کردار میڈیا پر آیا تو لوگوں کا ابتدائی رد عمل یہی تھا کہ یہ بھی کوئی ڈراما ہے۔ اس کا آغاز ایک ویڈیو شیپ سے ہوا جو اس چینل کو کوریئر سے موصول ہوئی۔ ویڈیو میں ایک شخص پس نقاب بتا رہا تھا کہ اس نے ریاض احمد کو کیوں سزا دی۔ اس کا قصور یہ تھا کہ اس نے اس شہر میں بے شمار سرکاری اور نجی زمینوں پر قبضہ کرنے والی مافیاؤں کا ہاتھ مضبوط کیا۔ لیکن وہ قصور جس پر اسے سزا دی گئی، ایک پوش علاقے میں قائم جھونپڑیوں میں لگنے والی

منصف نے الزام لگا کر انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ تیسری ویڈیو نے لوگوں کے شکوک و شبہات اور چینل پر سے الزام صاف کر دیے کیونکہ اس بار ویڈیو ایک دوسرے چینل کو ملی تھی۔ وہ اس چینل کا حریف شمار ہوتا تھا جسے پہلی دو ویڈیوز ملی تھیں۔ منصف نے نور اللہ پٹواری کے جرائم کی داستان سنائی۔ پولیس نے نور اللہ کی موت کو خود کشی قرار دیا تھا لیکن منصف نے کہا کہ اس نے شراب کی بوتل میں سائیکائڈ زہر ملا یا تھا۔ اس نے کہا کہ پولیس نے غلط تفتیش کی ہے۔ اگر اعلیٰ حکام نور اللہ کے دفتر کا جائزہ لیں تو انہیں وہاں شراب میں زہر ملانے کے ثبوت مل جائیں گے۔ اس کے بعد چوتھی ویڈیو نے منصف کو سپر ہیرو بنا دیا جو عوام پر کیے جانے والے مظالم کا بدلہ سرکاری اہل کاروں سے لے رہا تھا۔ اعجاز خان کا قصور یہ تو تھا کہ وہ سی این جی اسٹیشنر کو گیس کی چوری میں مدد دیتا تھا اور اس کے بدلے ان سے بھاری رشوت لیتا تھا لیکن سزائے موت کی وجہ اس کا ایک رہائشی عمارت کے ساتھ قائم کیا ہوا سی این جی اسٹیشن تھا جو اس کے سالے کے نام پر تھا۔ یہاں گیس کے اخراج سے آگ لگی اور اس سے عمارت بھی متاثر ہوئی، کئی افراد اس آگ کی نذر ہو گئے۔ اعجاز خان نے اپنے کرتوت چھپانے کے لیے اپنے دفتر اور ریکارڈ روم میں خود آگ لگائی اس لیے وہ مستحق ہو گیا تھا کہ اسے بھی نذرِ آتش کر دیا جائے۔

☆☆☆

محمود کی آنکھ ٹھیک چھ بجے کھل گئی تھی۔ یہ اس کا برسوں کا معمول تھا۔ وہ چاہے رات تین بجے سوئے لیکن صبح چھ بجے اس کی آنکھ کھل جاتی تھی۔ اس کے بعد وہ رات بارہ بجے تک جاگتا اور مصروف رہتا تھا۔ بارہ بجے سے پہلے اسے بیڈ پر جانے کا موقع نہیں ملتا تھا۔ اس نے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے اور جاگنگ سوٹ پہن کر بیڈ روم سے باہر آیا۔ معصوم علی سروٹ کو ارٹھر میں سو رہا تھا۔ اس نے اس کے دروازے پر دستک دی اور کالج سے باہر آ گیا۔ ساحل سے کچھ دور یہ اعلیٰ درجے کے کالج تھے۔ یہاں صرف دولت مند لوگ رہ سکتے تھے کیونکہ ان کا کالج کی قیمت بہت زیادہ تھی۔ ایک چار دیواری میں تین منزلہ کالج اس طرح بنے ہوئے تھے کہ ہر کالج تین طرف سے کھلا ہوا تھا۔ ہر چھ کالج کے لیے مشترکہ سیزر حیاں تھیں، البتہ گراؤنڈ پر رہنے والوں کا اپنا الگ گیٹ تھا۔ قطار میں بنی عمارتوں کے سامنے گھنے درختوں پر مشتمل گرین بیلٹ تھی جس کے ساتھ کار پارک کی

جگہ تھی۔ کمپلیکس کے وسط میں ایک بڑا پارک تھا جس کے چاروں طرف جاگنگ ٹریک بنا ہوا تھا۔ شام کو وہاں خاصا رش ہوتا تھا لیکن اس وقت صرف چند افراد ہوتے تھے۔ وہ سکون سے جاگنگ کرتا، صبح کی تازہ ہوا اور خنکی سے محفوظ ہوتا۔ آدھے گھنٹے بعد وہ واپس آ کر غسل اور دوسرے لوازمات سے فارغ ہوتا۔ ٹھیک ساڑھے سات بجے معصوم میز پر ناشتا لگا دیتا تھا۔ وہ کک تھا لیکن گھر کی صفائی اور کپڑے دھونے سے لے کر استری کرنے تک تمام ذمے داریاں وہی سنبھالتا تھا۔ ویسے یہ ذمے داریاں بہت معمولی سی تھیں۔ ہفتے میں ایک بار کپڑے دھو کر پریس کرنا ہوتے تھے۔ صفائی دو دن بعد بھی کرتا تو گھر صاف ملتا کیونکہ مکمل طور پر رائز کنڈیشنڈ تھا۔ محمود صبح کا ناشتا کرتا اور اس کے بعد رات کا کھانا کھاتا تھا۔ ناشتے کے بعد اس کا معمول تھا کہ وہ ایک گھنٹائی وی لاؤنج میں اخبارات اور ٹی وی دیکھتا پھر اپنی اسٹڈی میں آ جاتا اور اپنے کام کی تیاری شروع کر دیتا۔

ماسٹر کرنے سے پہلے ہی وہ میڈیا میں اپنی جان پہچان بنا چکا تھا۔ وہ ایک معروف اخبار میں کالم لکھتا تھا اور فاسٹ ایئر کا امتحان دیتے ہی اسے اس اخبار میں ملازمت مل گئی تھی۔ مگر اس کی افتاد طبع نے ملازمت کو ارا نہیں کی اس لیے وہ کالم نگار اور آزاد صحافی بن گیا۔ اگرچہ اس کی وابستگی اسی اخبار سے رہی لیکن اس نے مستقل ملازمت سے ہمیشہ انکار کر دیا تھا۔ جن دنوں وہ فاسٹ کی تیاری کر رہا تھا، ایاز پر اسرار طور پر وفات پا گیا۔۔۔ پڑا اسرار یوں کہ وہ گھر میں تھا اور دروازہ اندر سے بند تھا۔ اس کی لاش چھت سے اسی کے ازار بند کے سہارے لٹکی ہوئی تھی۔ جب محمود یونیورسٹی سے آیا تو ایاز کو مرے ہوئے کئی گھنٹے گزر چکے تھے۔ پولیس نے اسے بھی شامل تفتیش کر لیا۔ بعد میں محلے والوں اور جان پہچان کے لوگوں سے پوچھ گچھ کے بعد پولیس کو پتا چلا کہ محمود کے باپ سے تعلقات اچھے نہیں تھے۔ اس نے تسلیم کیا کہ ایسا ہی تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کا باپ یہ کام چھوڑ دے۔ اس کی عمر نہیں تھی لیکن ایاز سمجھتا تھا کہ محمود سبزی فروش باپ کو اپنے لیے باعثِ شک سمجھنے لگا ہے کیونکہ وہ یونیورسٹی میں پڑھ رہا ہے اور کل کسی دفتر میں باپو بن جائے گا۔

بہر حال پولیس نے محمود کو بے گناہ قرار دے دیا کیونکہ پوسٹ مارٹم کے مطابق جس وقت ایاز کی موت واقع ہوئی، وہ یونیورسٹی میں کلاس میں تھا۔ ماں کی موت کے بعد

یہ اس کے لیے دوسر دھچکا تھا۔ گھران کا اپنا تھا مگر غریبوں کی بستی میں اور چھوٹا سا تھا اس لیے جب محمود نے اسے فروخت کیا تو اسے بس اتنی رقم ملی کہ وہ موٹر سائیکل لینے کے بعد اس دو کمروں کے پورشن کا چھ مہینے کا سیکورٹی ڈیپازٹ اور چھ ہی مہینے کا ایڈوانس کرایہ دے سکے جو اس نے رہائش کے لیے منتخب کیا تھا۔ یہ اچھے پوش علاقے میں تھا۔ وہ صبح سے شام تک محنت کرتا۔ اپنے کالم کے لیے معلومات جمع کرتا۔ اس معلومات کا تجزیہ کرتا اور پھر اس تجزیے کو کالم کی شکل دیتا۔ چھ مہینے بعد اس کی پہلی کتاب شائع ہوئی اور ہاتھوں ہاتھ بک گئی۔ آنے والے ایک سال میں اس کے چھ ایڈیشن نکلے تھے۔ محمود کو نہ صرف اچھا معاوضہ ملا بلکہ کتاب کی رائٹنگ میں بھی اس کا حصہ تھا۔ مختصر عرصے میں وہ سب سے زیادہ پڑھا جانے والا کالم نگار بن گیا۔

دولت اور آسائش آئی تو اس نے اپنی سنان زندگی کو آباد کرنے کا سوچا۔ اس نے شادی کی مگر اس رشتے کا خاتمہ بھی موت پر ہوا۔ شہینہ بھی صحافت کے شعبے سے تعلق رکھتی تھی اور ایک سوشل میگزین سے منسلک تھی۔ شادی کے دو سال بعد وہ دفتر سے واپس آتے ہوئے حادثے کا شکار ہوئی اور اس کی کار ایک ٹرک سے جا ٹکرائی۔ عینی شاہدین کا کہنا تھا کہ کار کی رفتار بہت تیز تھی جیسے وہ ڈرائیور کے قابو سے باہر ہو گئی ہو۔ پولیس کے مطابق کار کے بریک فیل ہو گئے تھے۔ لیکن کسی پر شک نہ کیا جاسکا اور اسے بالآخر حادثہ قرار دے دیا گیا۔ رشتوں کے معاملے میں وہ بد قسمت تھا۔ اولاد کا انہوں نے سوچا نہیں تھا اس لیے یہ خانہ بھی خالی تھا۔ اس کے بعد اس نے شادی کا نہیں سوچا۔ پانچ سال پہلے شہینہ کی موت کے چند مہینے بعد اس نے اپنے اخبار کے نئے نکلنے والے ٹی وی چینل پر ٹاک شو شروع کر دیا اور شہرت کی نئی بلندیوں پر پہنچ گیا۔ اب وہ سب سے زیادہ معاوضہ لینے والا میڈیا مین تھا۔

ناشتے کے بعد وہ چائے کا لگ لے کر ٹی وی کے آگے بیٹھا۔ معصوم نے اخبارات سلیتے سے الگ الگ کر کے شیشے کی میز پر رکھ دیے تھے لیکن پہلے اس نے ٹی وی آن کیا۔ اتفاق سے جو چینل لگایا، نیوز کاسٹر منصف کے بارے میں بات کر رہی تھی۔ ”منصف، میڈیا اور عوام کا موضوع بن گیا ہے۔ اب اس پر پروگرام ہو رہے ہیں۔ اس کی پراسرار شخصیت اور اس کی اتنی صفائی سے کی گئی قتل کی وارداتوں... نیز اس کی حیرت انگیز معلومات کی وجہ سے کہا جا رہا ہے کہ اس کا تعلق بھی کسی ایسے محکمے سے ہے جو

دس تمہارے

ایک رئیس نہایت قیمتی لباس پہن کر ایک فلسفی کے پاس گیا۔ فلسفی نے نیچے سے اوپر تک اسے دیکھا۔ رئیس فلسفی کے اس انہماک پر بہت خوش ہوا اور پوچھا۔ ”اگر آج میں خود کو تمہارے ہاتھ بیچوں تو کیا قیمت ادا کرو گے؟“

فلسفی نے جواب دیا۔ ”چار سو دس روپے۔“
رئیس نے پوچھا۔ ”چار سو دس کس حساب سے؟“

فلسفی نے جواب دیا۔ ”چار سو روپے لباس کے اور دس تمہارے۔“

دوسرے محکموں کے بارے میں معلومات رکھتا ہے اور منصف نے ان لوگوں کو خود سزا دینے کا بیڑا اٹھایا ہے جو قانون سے بچ نکلتے ہیں۔ کچھ لوگ اسے ایجنسیوں کا آدمی قرار دے رہے ہیں اور کچھ اسے مظلوم سمجھ رہے ہیں جو اپنے اور دوسرے کے انتقام کی خاطر اس راہ پر چل نکلا ہے۔“

محمود اس تجزیے سے کسی حد تک متفق تھا۔ منصف کے بارے میں ایسی باتیں گردش کر رہی تھیں۔ بعض جدت پسند اسے ایک دیسی سپر ہیرو قرار دے رہے تھے جو دیسی انداز میں برائیوں سے لڑ رہا تھا۔ اچانک نیوز کاسٹر نے پروفیسر اختر شاد کا نام لیا تو محمود چونک گیا۔ اب پروفیسر اختر شاد جرنلزم ڈیپارٹمنٹ کا ہیڈ تھا۔ محمود سنبھل کر بیٹھ گیا۔ پروفیسر شاد بہت ذہین اور گہری سوچ و نظر رکھنے والا آدمی تھا۔ محمود اگر کسی سے صحیح معنوں میں متاثر تھا تو وہ پروفیسر ہی تھا۔ میڈیا پر بھی وہ اجنبی نام نہیں تھا۔ ایک دانشور اور تجزیہ کار کے طور پر اکثر ٹی وی پر اس کی رائے اور تجزیے نشر کیے جاتے تھے۔ ماسٹرز کرنے کے دوران محمود کے پروفیسر سے اچھے تعلقات بن گئے تھے اور یہ تعلق بعد میں بھی برقرار رہا۔ اب بھی وہ مہینے دو مہینے میں چکر لگاتا تھا اور یونیورسٹی میں پروفیسر کے گھر حاضری دیتا تھا۔ نیوز کاسٹر نے اختر شاد کو کال پر لیا اور اس نے منصف کے بارے میں اس کی رائے مانگی تو اس نے حسب معمول دو ٹوک انداز میں کہا۔

”منصف جو کر رہا ہے، اس کی پسندیدگی یا... ناپسندیدگی سے قطع نظر اس کا رویہ عام فہم زبان میں اتار کی کہلاتا ہے۔“

”آپ اسے اتار کی کیسے کہہ سکتے ہیں؟“ نیوز کاسٹر نے اعتراض کیا۔ ”منصف کا کہنا ہے کہ وہ یہ سب معاشرے کے مفاد میں کر رہا ہے۔“

”اگر وہ سو فیصد خلوص اور ایمان داری سے یہ سب کر رہا ہے تبھی تو اسے اتار کی کہیں گے۔ ورنہ اگر اس میں اس کا کوئی مفاد ہوا تو یہ سراسر دھوکا ہوگا۔“ پروفیسر شاد نے مدلل انداز میں کہا۔ ”دیکھیں، معاشرے اور ملک فرد واحد کی سوچ اور اصولوں کے مطابق نہیں چلتے ہیں۔ اس کے لیے اجتماعی سوچ اور اصول اپنائے جاتے ہیں۔ یہ اصول اور قوانین خاص طریقہ کار سے منتخب کیے جاتے ہیں اور ایک مخصوص میکانزم کے تحت معاشرے اور افراد پر اپلائی کیے جاتے ہیں۔ جیسے قتل کے ملزم کو پولیس پکڑ کر شواہد اور ثبوت کے ساتھ عدالت میں پیش کرتی ہے، جج اسے گرفتار نہیں کر سکتا ہے لیکن وہ ثبوت اور گواہوں کو مد نظر رکھ کر ملزم کو مجرم قرار دے کر سزا سناسکتا ہے مگر وہ اس سزا پر خود عمل درآمد نہیں کر سکتا ہے۔ یہ کام جیل حکام اور جلا د کا ہوتا ہے۔ یوں معاشرے میں ایک قانون اور اس کا نفاذ قائم ہوتا ہے۔ اب اگر ایک شخص اٹھ کر کہے کہ وہ انصاف کے عمل سے مطمئن نہیں ہے اور وہ خود پولیس، جج اور جلا د کا کردار ادا کرے گا، یعنی وہ خود کسی پر فرد جرم عائد کرے گا، ثبوت مہیا کرے گا، خود گواہ ہوگا، خود جج بن کر فیصلہ صادر کرے گا اور خود اس پر عمل درآمد کرے گا تو یہ کیفیت اتار کی ہی کہلائے گی۔۔۔ جس میں اجتماعی قانون اور اس کا نفاذ پس پشت ڈال کر فرد واحد کے قانون پر عمل شروع کر دیا جائے۔ میرے خیال میں اسے کسی صورت سراہا نہیں جاسکتا ہے۔“

”جو چار افراد منصف کا نشانہ بنے، ان کے بارے میں عام تاثر یہی ہے کہ وہ ان جرائم کے مرتکب تھے اس لیے منصف نے انہیں سزائے موت دی۔ آپ کے خیال میں منصف جو کر رہا ہے، وہ ٹھیک نہیں ہے؟“

”بالکل بھی نہیں۔“ پروفیسر نے دو ٹوک انداز میں کہا۔ ”کسی مہذب جمہوری معاشرے میں اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ سزا دینا حکومت اور عدالت کا کام ہے۔ اگر وہ اس میں ناکام ہوتے ہیں تو ملک کا ہر شخص بہ شمول منصف کہیں نہ کہیں اس کو تباہی کا ذمے دار ہے۔“

پروفیسر کی گفتگو سننے کے بعد وہ اخبارات کی طرف متوجہ ہوا۔ تقریباً تمام اخبارات میں منصف کے بارے میں تجزیے تھے۔ مختلف زاویوں سے اس بد روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی تھی لیکن یہ سب ٹامک ٹویاں تھیں۔ محمود جانتا

تھا کہ ان میں سے کسی کو منصف کے بارے میں کچھ نہیں معلوم ہے۔ اس نے خود منصف پر پروگرام کیا تھا اور اس میں سوائے قیاس آرائیوں اور تجزیوں کے اور کچھ نہیں تھا۔ دس بجے تک وہ اخبارات اور وقفے وقفے سے ٹی وی چینلز دیکھتا رہا۔ اب اس کے کام کا وقت آ گیا تھا۔ اسٹڈی میں کمپیوٹر اور انٹرنیٹ سسٹم تھا۔ دوپہر تک وہ ساری دنیا کا میڈیا دیکھتا جو انٹرنیٹ پر موجود تھا۔ دوپہر کو کچھ پھلوں اور کچھ سبزیوں سے بچ نمٹاتا اور اپنے پروگرام اور کالم کی تیاری میں مصروف ہو جاتا۔ چار بجے وہ کلفٹن میں اپنے اسٹوڈیو تک جاتا اور پروگرام پروڈیوسر سرمد بخاری سے مل کر پروگرام طے کرتا۔ مختصر ریہرسل اور ریکارڈنگ کے بعد وہ سات بجے واپس آتا اور ڈنر کر کے دوبارہ اسٹوڈیو چلا جاتا جہاں نو سے دس بجے تک اس کا پروگرام نشر ہوتا تھا۔

”صاحب۔“ معصوم نے ایک کارڈ لا کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ ”باہر یہ صاحب آئے ہیں۔ ان کے ساتھ ایک صاحب اور بھی ہیں۔“

”عبداللہ ہاشم۔“ اس نے زیر لب کہا۔ وہ اسے جانتا تھا۔ عبداللہ ہاشم آئی بی کا ایک قابل اور دیانت دار افسر تھا اس لیے عوام و خواص میں اچھی اہمیت رکھتا تھا لیکن اوپر والوں کا معتبوب تھا۔ وہ آئی بی کے چند ذہین ترین افسران میں سے ایک تھا اور اسی وجہ سے ادارے میں موجود تھا۔ محمود سوچ میں پڑ گیا۔ وہ اس کے گھر کیوں آیا ہے اور وہ بھی صبح کے وقت اور بغیر اطلاع دیے؟ محمود کی چھٹی حس نے اشارہ دیا کہ کوئی گڑبڑ ہے۔ اس نے معصوم سے کہا۔ ”انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ، میں آتا ہوں۔“

محمود گھر کے لباس میں تھا۔ وہ گھر میں آرام دہ پاجامہ اور کڑتہ پہنتا تھا۔ اس نے لباس تبدیل کیا اور ڈرائنگ روم میں آیا۔ وہاں عبداللہ کے ساتھ ایک جونیئر افسر تھا۔ اس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ جونیئر افسر ہے۔ عبداللہ نے اٹھ کر اس سے ہاتھ ملایا اور پھر اپنے ماتحت کا تعارف کرایا۔ ”عزیز انصاری، اس کیس میں میرے معاون ہیں۔“

محمود نے عزیز سے ہاتھ ملایا اور پھر عبداللہ کی طرف متوجہ ہوا۔ ”کون سے کیس میں؟“

”منصف کے کیس میں۔“ عبداللہ ہاشم نے جواب دیا۔ ”حکومت نے آئی بی کو اس معاملے میں انویسٹی گیشن کا حکم دیا ہے۔“

محمود نے انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پھر ان کے منع کرنے کے باوجود معصوم کو چائے لانے کو کہا۔ ”کیس آپ

کے سپرد ہوا ہے؟“

”جی، میں اسی سلسلے میں آیا ہوں۔“

محمود نے نوٹ کیا کہ اس نے حاضر ہونے کا نہیں کہا تھا حالانکہ وہ خوش اخلاق بھی مشہور تھا۔ اس نے کچھ کہنے کے بجائے میز پر رکھا سگریٹ کا بکس اٹھایا۔ یہ خاص آرڈر پر ملتا تھا اور اس میں ترکی کا مخصوص مہک والا تمباکو استعمال ہوتا تھا۔ اس نے پتلا سا سگریٹ نکال کر سلگایا اور پھر چونکا۔

”معاف کیجیے گا، میں نے آپ سے پوچھا نہیں۔“

”آپ شوق کریں، میں اپنا برانڈ پیتا ہوں۔“

عبداللہ نے سر ہلایا۔ عزیز خاموش رہا۔

”میرا خیال ہے کہ آپ دارالحکومت سے ہی آئے ہیں؟“

”میں آج کل وہیں تعینات ہوں۔“ عبداللہ نے کہا۔ ”مجھے خاص اسی کیس کے لیے بھیجا گیا ہے۔ میں کل ہی آیا ہوں۔“

محمود چائے لے آیا اور اس نے بنا کر سب کو سرو کی۔ محمود نے حسب معمول سیاہ چائے لی تھی۔ دس منٹ میں وہ اس مرحلے سے فارغ ہوئے تو محمود نے کسی قدر سرد لہجے میں کہا۔ ”حکومت نے آپ کو انویسٹی گیشن سوچی اور آپ کل اسلام آباد سے یہاں آئے اور آج صبح میرے پاس تشریف لے آئے؟“

عبداللہ نے اس کے لہجے کا اثر نہیں لیا اور مسکرایا۔ ”ہمارا اور آپ کا کام ہی ایسا ہے۔ اکثر آدمی کو وہ کرنا پڑتا ہے جو دوسرے کو اور بعض اوقات خود آپ کو بھی پسند نہیں ہوتا۔“

محمود نے گہری سانس لی۔ ”ٹھیک ہے، میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟“

”مجھے کچھ سوالوں کے جواب درکار ہیں؟“

”ضرور... اگر میری معلومات میں ہوئے۔“

”آپ اپنے ٹی وی پروگرام میں معاشرے اور حکومت کے بدعنوان افراد کے چہروں سے نقاب اٹھاتے رہتے ہیں۔ پچھلے ایک سال کے دوران آپ نے کچھ بدعنوان افراد کے خلاف پروگرام کیے اور ان کی بدعنوانیوں کو سامنے لائے۔“

محمود نے دوسرا سگریٹ سلگایا۔ ”آپ کسی خاص کیس کی بات کر رہے ہیں؟“

”چار خاص کیسز کی۔“ عبداللہ نے کہا اور ایک کاغذ اس کی طرف بڑھایا۔ ”اس پر تاریخوں کے ساتھ نام موجود ہیں۔“

محمود نے دیکھا۔ چھ مہینے کے اندر کی تاریخوں کے ساتھ کاغذ پر چار نام لکھے تھے۔ ریاض احمد، رفاقت علی،

نور اللہ پٹواری اور اعجاز خان۔ تمام نام ان تاریخوں کے آگے تھے جب محمود نے اپنے پروگرام میں ان لوگوں کی... بدعنوانیاں بے نقاب کی تھیں۔ اس نے سر ہلایا اور کاغذ میز پر ڈال دیا۔ ”یہ درست ہے۔“

”بعد میں یہ چاروں منصف کا نشانہ بنے۔“

”یہ بھی درست ہے۔“

”آپ کے خیال میں اس کی کوئی خاص وجہ ہو سکتی ہے؟“ محمود نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں نے آج تک اس زاویے سے نہیں سوچا۔ کئی بات ہے میرے ذہن میں ہی یہ بات نہیں آئی کیونکہ اسی دوران میں میں نے کرپشن اور کرپٹ افراد کے بارے میں سو سے زائد پروگرام کیے۔“

”حالانکہ آپ کی یادداشت بہت اچھی ہے۔ میں آپ کے پروگرام باقاعدگی سے دیکھتا ہوں اور آپ سالوں پرانی باتوں کے حوالے بڑے بے ساختہ اور روانی سے دیتے ہیں۔“

”یہ سب اسکرپٹ کا کمال ہوتا ہے۔ پروگرام طے شدہ ہوتا ہے اور اس میں خود سے کچھ کہنے کی گنجائش کم ہوتی ہے۔“

”آپ عموماً کسی شریک کی بات پر حوالہ دیتے ہیں۔ خیر اسے چھوڑیے۔ میں بھی چند پرانی باتوں کا حوالہ دوں گا جیسے آپ کے والد...“

”یہ بات بہت پرانی ہو گئی ہے۔“

”او کے لیکن آپ کی وائف کی ڈیڑھ تو پرانی بات نہیں ہے۔ اس کے بعد آپ نے اپنے ٹی وی کیریئر کا آغاز کیا۔“

”آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں؟“ کوشش کے باوجود محمود اپنا لہجہ نرم نہیں رکھ سکا۔

عبداللہ نے اس کا سوال سنا ہی نہیں۔ اس نے اپنے بریف کیس سے ایک کتاب نکالی۔ محمود نے دیکھتے ہی شناخت کر لی۔ یہ اس کے کالموں پر مشتمل کتاب تھی۔

عبداللہ نے اسے درمیان سے کھولا، اس نے پہلے ہی نشان لگا رکھا تھا۔ ”آپ نے دو سال پہلے بائیس مارچ کے کالم میں جیک دی رپر کا حوالہ دیا جو طوائفوں کو قتل کرتا تھا کیونکہ وہ انہیں گناہ گار اور دھرتی کا بوجھ سمجھتا تھا۔ اس کالم میں آپ نے مزید لکھا کہ کاش کوئی ایسا کردار ہمارے ہاں بھی ہو جو طوائفوں سے بدتر ان لوگوں کو کیفر کردار تک پہنچائے جو کرپشن کے ذریعے اس ملک کی جڑیں کھوکھلی کر رہے ہیں۔“

”یہ بھی درست ہے۔“ محمود نے خود پر قابو پالیا تھا۔

اس نے پُرسکون لہجے میں کہا۔ ”اگر آپ منصف پر میرے پروگرام کا حوالہ دیں تو وہ بھی درست ہوگا کیونکہ میں نے

اس میں منصف کو ایسا مجرم قرار دیا ہے جو اخلاقی طور پر منصف ہے۔ اگر آپ ان سب عوامل پر کوئی رائے قائم کرنا چاہ رہے ہیں تو آپ اس کے لیے آزاد ہیں۔“

عبداللہ نے کتاب واپس رکھ لی۔ ”میں کوئی رائے قائم نہیں کر رہا ہوں محمود صاحب... میں صرف گفتیش کر رہا ہوں۔ صحافت کا پیشہ اختیار کرنے کے بعد آپ نے سیلف ڈیفنس کی تربیت لی اور آپ آتشیں اسلحہ استعمال کرنا بھی جانتے ہیں؟“

”درست ہے، میں ایک مارشل آرٹ کلب اور ایک شوٹنگ کلب کا سرگرم ممبر ہوں۔ ایک میڈیا مین اور تحقیقی صحافی ہونے کے ناتے مجھے کچھ نہ کچھ خطرات لاحق ہیں۔ میرے پاس خصوصی اجازت نامہ ہے جس کے تحت میں ایک ہتھیار گھر کی حدود سے باہر بھی اپنے پاس رکھ سکتا ہوں۔ اگر آپ مجھ پر کسی قسم کا شک کر رہے ہیں تو میں اس کی ہر ممکن صفائی پیش کرنے کو تیار ہوں اور اگر آپ مجھ سے مدد چاہتے ہیں تو میں آپ کو خوش آمدید کہتا ہوں۔“

”میں اس کے لیے آپ کا شکر گزار ہوں۔“ عبداللہ کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ ”شاید میں آپ کو دوبارہ زحمت دوں۔ میں ایک بار پھر کہوں گا، بہت سے کام جو ہم کرنا نہیں چاہتے ہیں لیکن ہمیں کرنا پڑتے ہیں۔ میں فوراً نہیں پوچھ رہا ہوں لیکن آپ جواب تیار رکھیے گا۔“

”کس سوال کا؟“

”یہ کہ جب ریاض احمد، رفاقت علی، نور اللہ اور اعجاز خان مارے گئے تو آپ کہاں تھے؟“

وہ عبداللہ کے جانے کے بعد سوچ رہا تھا کہ حالات اس کی توقع سے زیادہ خراب ہو رہے ہیں۔ پچھلے کچھ عرصے سے اس پر دباؤ آرہا تھا۔ دیے تو دباؤ ہمیشہ تھا لیکن اس بار یہ کچھ زیادہ ہی تھا کیونکہ وہ کچھ ایسے ایشواٹھار ہا تھا جو بہت سے مقتدر لوگوں کو ناپسند تھے۔ وہ جانتا تھا کہ مقتدر حلقوں نے اپنے مفاد کے لیے اس اہم ترین وفاقی ادارے کو بے پناہ نقصان پہنچایا تھا لیکن اب بھی آئی بی کے پاس بہترین افسران تھے جو کسی بھی جرم کی تہ تک پہنچ سکتے تھے اور عبداللہ ہاشم ان میں سے ایک تھا۔ اس رات اس کا پروگرام تھا لیکن وہ ارتکاز سے اس کی تیاری نہیں کر پا رہا تھا۔ یہ بات اسے پسند نہیں تھی، وہ پوری تیاری سے پروگرام کرتا تھا اور اسے ہر ممکن زاویے سے مکمل کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ وہ چار بجے اسٹوڈیو پہنچا تو سربم آچکا تھا۔ وہ دو سال پہلے اس کے پروگرام کا پروڈیوسر بنا تھا اور نو جوان تھا لیکن محمود اس کی

کارکردگی سے مطمئن تھا۔ پروگرام کی ریہرسل کے بعد وہ باہر آئے تو سربم نے کہا۔

”محمود صاحب! میڈ کوارٹر سے احمر صاحب کی کال آئی تھی۔“

احمر نفیس اس کے چینل کا فینجنگ ڈائریکٹر تھا۔ ”کس سلسلے میں؟“

”کوئی خاتون ہیں صبا ناز... وہ کسی معاملے میں آپ کی مدد چاہتی ہیں۔“

محمود کے احمر سے تعلقات اچھے تھے۔ اسے حیرت ہوئی کہ اس نے براہ راست اسے کہنے کے بجائے سربم سے یہ بات کی تھی۔ ”صبا ناز کون ہے؟“

”کچھ عرصے پہلے اپائنٹ ہوئی ہے اور نیوز کے شعبے میں ہے، میرا خیال ہے رپورٹر ہے۔“

”ٹھیک ہے، احمر صاحب سے کہہ دینا کہ کل اسے اسی وقت یہاں اسٹوڈیو بھیج دیں۔“

☆ ☆ ☆

محمود کا خیال تھا کہ صبا ناز کوئی عورت ہوگی لیکن وہ لڑکی نکلی۔ عمر پچیس کے آس پاس تھی۔ وہ گلابی رنگت، نازک سے نقوش اور چہرے کے جسم کی مالک تھی۔ سادہ نیلے سوٹ میں وہ دلکش لگ رہی تھی۔ اس نے بے تکلفی سے محمود سے ہاتھ ملایا اور بولی۔ ”تھینک یو... آپ نے مجھے وقت دیا۔“

”ویلم۔“ محمود نے مسکرا کر کہا۔ ”میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟“

”آپ کا وقت قیمتی ہے اس لیے میں ٹودی پوائنٹ بات کروں گی۔ میں نے منصف کو اسائنمنٹ کے طور پر لیا ہے اور مجھے اس معاملے میں آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔“

محمود کو حیرت ہوئی۔ منصف کا نام رہ رہ کر اس کے سامنے آرہا تھا۔ پہلے آئی بی کے توسط سے اور اب یہ لڑکی اس سے منصف کے بارے میں مدد چاہتی تھی۔ اس نے کہا۔ ”میں کیا مدد کر سکتا ہوں؟ منصف کے بارے میں جتنا آپ جانتی ہیں تقریباً اتنا ہی میں جانتا ہوں۔“

”محمود صاحب! میں انویسٹی گیشن رپورٹر بننا چاہتی ہوں اور میں نے یہ جانا ہے کہ ہمارے شعبے میں آپ جتنے باخبر افراد کم ہیں۔ مجھے یہ ایڈوائس حاصل ہے کہ ہم دونوں ایک ہی چینل کے لیے کام کرتے ہیں۔“

”مجھے مدد کرنے پر کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن بہتر ہو گا کہ ہم پہلے آپس میں معلومات کا تبادلہ کر لیں۔ اس کے لیے ایک مینٹنگ رکھ لیتے ہیں۔ دو دن بعد میں آف ہو

ہوتے ہیں۔ ہم ان کی صحافت کے لیے رامیٹرل فراہم کرتے ہیں۔“

محمود نے سر ہلایا۔ ”تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ تم نے اب تک کیا کیا ہے؟“

صبا نے فولڈر اس کی طرف بڑھایا۔ ”اس میں سب ہے لیکن مختصراً بتا دوں۔ میں نے تمام رپورٹس جمع کی ہیں اور ان سے ایک نتیجہ نکلا ہے۔ منصف نے آپ کے پروگرام سے اپنے ٹارگٹس چنے ہیں۔“

محمود ہل کر رہ گیا۔ عبداللہ ہاشم کے بعد صبا بھی اسی نتیجے پر پہنچی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ عبداللہ نے اس پر الزام لگایا تھا اور صبا منصف کو ہی الزام دے رہی تھی۔ ”یہ کیسے کہہ سکتی ہوں تم؟“

”آپ نے جس ترتیب سے ان لوگوں کے بارے میں پروگرام کیے، انہیں اسی ترتیب سے مل گیا ہے۔“

”اوکے ایک نکتہ تو تم نے یہ نکالا ہے دوسرا کیا ہے؟“

”منصف کے کچھ مقاصد ہیں۔ آخری مل کے بعد سے وہ بالکل خاموش ہے۔“

”ممکن ہے وہ نئے نشانوں کے لیے ریکی کر رہا ہو۔“

”یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اسی طرح چار پانچ مہینے بعد ترتیب سے چند افراد اور مل کرے اور اسی طرح ویڈیو بنا کر چینل پر چلوادے۔“ صبا نے اعتراف کیا۔ ”لیکن اس طرح سال میں چند افراد کے مرنے سے کیا بد عنوان لوگ سدھر جائیں گے؟“

”ایسا ممکن نہیں ہے۔“ محمود نے سگریٹ نکالا۔ ”کیا مجھے اجازت ہے؟“

”وائے ناٹ سر، میرے والد چمن اسوکر ہیں اور میں زیادہ وقت ان کے پاس رہتی تھی۔“

”تھینک یو۔“ محمود نے سگریٹ سلگایا۔ ”ہمارے ہاں کرپشن کی جڑیں بہت گہری ہو چکی ہیں جیسے کینسر پورے جسم پر قبضہ کر لے اور منصف کی کارروائی میرے نزدیک ایسی ہی ہے جیسے کوئی سوئی چھو کر کینسر کا علاج کرنے کی کوشش کرے۔“

”میں بھی یہی سوچ رکھتی ہوں۔“ صبا خوش ہو گئی۔

”اگر ہم فرض کر لیں کہ منصف خلوص نیت سے یہ کام کر رہا ہے تب اسے پکڑنا بہت مشکل ہے۔“

محمود نے اس کی بات پر غور کیا۔ ”تمہارا مطلب ہے کہ اگر وہ کوئی چکر چلا رہا ہے تو اس کا سراغ لگایا جاسکتا ہے؟“

”بالکل... اگر وہ اپنے کسی مفاد کے لیے یہ سب کر

جاؤں گا اور تین دن کی چھٹی ہوگی۔ اتفاق سے اور کوئی مصروفیت بھی نہیں ہے۔ آپ چاہیں تو یہاں آجائیں۔“

”میں آجاؤں گی... آپ وقت اور دن بتادیں؟“

”پرسوں شام اسی وقت۔“

وہ خوش ہو گئی۔ ”میں آجاؤں گی۔ ایک بار پھر تھینکس۔“

اس کے جانے کے بعد محمود سوچ میں پڑ گیا۔ اسے یہ لڑکی منفرد لگی تھی۔ میڈیا میں آنے والی لڑکیاں اسے شو بزنس سمجھ کر آتی ہیں اور اپنا رویہ بھی ایسا ہی رکھتی ہیں۔ تحقیق تو ایک طرف رہی کسی سخت کام سے بھی ان کی جان جاتی ہے اور ان کی کوشش ہوتی ہے کہ ناز و نخروں سے جاب کر لیں۔ مگر یہ لڑکی منصف پر تحقیقاتی رپورٹ کرنا چاہ رہی تھی جبکہ وہ نئی آئی تھی۔ دوسرے دن پروگرام سے واپسی پر محمود نے تھکے ہونے کے باوجود اسٹڈی کا رخ کیا۔ اس نے کئی گھنٹے صرف کر کے منصف کے بارے میں تمام اخبارات کے تراشے الگ کیے۔ پھر اس نے نیٹ پر اس بارے میں تمام معلومات جمع کیں۔ ان میں وہ چارویڈیوز بھی تھیں جو منصف نے چینلز کو بھیجی تھیں۔ وہ صبح چار بجے تک ان چیزوں کے ساتھ مصروف رہا۔ معصوم اس کے لیے چائے لارہا تھا لیکن دو بجے اس نے اسے منع کر کے سونے کے لیے بھیج دیا۔

وہ اگلے دن چار بجے اسٹوڈیو پہنچا تو وہاں صبا پہلے سے موجود تھی۔ اس کے پاس ایک بڑا سا فائل فولڈر تھا۔ محمود اسے میننگ روم میں لے آیا۔ وہ بے چین ہو رہی تھی۔ شاید اسے اپنا کام دکھانے کی جلدی تھی لیکن محمود نے کہا۔ ”پہلے آپ تعارف کرائیں؟“

”نام تو آپ کو معلوم ہے۔ میرا تعلق ایک تعلیم یافتہ فیملی سے ہے۔ میرے پاپا ایک اخبار کے ایڈیٹر تھے۔ رحیم بختیار... شاید آپ نے نام سنا ہو۔ میرے ایک بھائی احسان رحیم بھی میڈیا کے شعبے سے وابستہ ہیں۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ صحافت میرے لیے فطری چیز ہے۔ جب میں نے ہوش سنبھالا تو گھر میں فرنیچر سے زیادہ اخبار، رسائل اور کتابوں کا ڈھیر ہوتا تھا۔ ایسے میں میرے لیے اور کیا چوائس رہ جاتی تھی۔“

”لیکن انویسٹی گیشن جرنلزم... مشکل کام نہیں ہے؟“

”ہاں، مجھے معلوم ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ اس کا صلہ نہیں ملتا۔ انویسٹی گیشن کرنے والے نمایاں نہیں ہوتے بلکہ جو نمایاں ہوتے ہیں وہ بھی ہماری وجہ سے نمایاں

رہا ہے تو اس کا سامنے آنا لازمی ہے۔“

”کن لوگوں کے سامنے؟“

”جن سے اس کا مفاد ہو سکتا ہے۔“

محمود پہلی بار اس لڑکی سے متاثر ہوا اور اس نے محسوس کیا کہ وہ انتہائی ذہین ہے۔ صرف یہی نہیں، وہ اپنی ذہانت استعمال کرنا بھی جانتی تھی۔ اس نے منصف کو تلاش کرنے کے لیے ایک راہ متعین کر لی تھی۔ اگر اس کا مفروضہ درست تھا تو اسے تلاش کیا جاسکتا تھا۔ محمود نے فولڈر میں اس کی تیار کی ہوئی رپورٹ دیکھی اور پھر کہا۔ ”ایک شخص اس معاملے میں ہماری مدد کر سکتا ہے۔“

”پروفیسر شاد۔“ صبا نے ایک بار پھر اسے حیران کیا۔ ”میں ان سے بات کر چکی ہوں لیکن انہوں نے مجھ سے ملنے سے انکار کر دیا۔“

”اب انکار نہیں کریں گے۔“ محمود نے کہا اور موبائل سے پروفیسر کا نمبر ملایا۔ ”محمود عرض کر رہا ہوں... ایک ضروری معاملے میں آپ کی راہنمائی درکار ہے... آپ کو کسے علم ہوا؟“ کہتے ہوئے محمود کے چہرے پر حیرت نمودار ہوئی تھی پھر اس نے فون بند کرتے ہوئے صبا سے کہا۔ ”آؤ چلیں۔“

صبا نے اپنا فولڈر اور بیگ اٹھایا۔ ”کیا آپ انہیں جانتے ہیں؟“

”وہ جرنلزم میں میرے استاد رہے ہیں اور آج بھی ان سے تعلق ہے۔ میں نے ان جیسا ذہین آدمی نہیں دیکھا ہے۔ اس کا اندازہ اس سے لگا لو کہ میں نے ملنے کو کہا اور وہ جان گئے کہ میں منصف کے سلسلے میں ملنا چاہتا ہوں۔“

”میری بھی خواہش ہے کہ میں ان سے ملوں۔“

”تم منصف کے بارے میں پروفیسر کی رائے سے واقف ہو؟“

”ہاں، میں نے سنی ہے۔“ صبا نے سر ہلایا۔ ”میرا خیال ہے کہ پروفیسر آدم بیزار شخص ہیں۔“

”ہاں... اپنی تنہائی میں خوش رہتے ہیں۔“

پروفیسر کو یونیورسٹی میں گھر ملا ہوا تھا۔ اگرچہ یہ اتنا خوب صورت نہیں تھا، پرانی طرز کا مکان جس پر سرکاری پیلا رنگ تھا۔ سامنے کھلا برآمدہ تھا اور کھڑکیوں پر لوہے کی سلاخیں نصب تھیں۔ کال بیل کے جواب میں پروفیسر نے خود دروازہ کھولا۔ ”آؤ میاں محمود! بہت دنوں بعد خیال آیا...“

”شرمندہ نہ کریں... آپ جانتے تو ہیں اس شہر

میں زندگی کیسے آدمی کو جکڑ لیتی ہے۔“

”کہاں جکڑ لیتی ہے، ہم تو فارغ ہی فارغ ہیں۔“

پروفیسر نے سرد آہ بھری۔ پھر اسے محمود کے عقب میں موجود صبا کا احساس ہوا۔ ”یہ کون ہیں؟“

”صبا ناز۔“ محمود نے تعارف کرایا۔

”اچھا، وہی جرنلسٹ۔“ پروفیسر نے سر ہلایا۔ ”تم نے ملنے کی درخواست کی تھی؟“

”اور آپ نے انکار کر دیا تھا۔“

”ہاں، میں ہر ایک سے نہیں ملتا۔“ پروفیسر نے متانت سے کہا۔ ”مگر اب تم محمود کے ساتھ آئی ہو تو... آؤ

اندر آؤ۔“ اس نے ایک طرف ہوتے ہوئے انہیں راستہ دیا۔ اندر سے مکان بہتر حالت میں تھا۔ دیواروں پر میٹ لفٹس تھا اور کہیں کہیں لکڑی کے پینل بھی لگے ہوئے تھے۔

صبا کے خیال میں اگر کچھ خرچہ باہر کر دیا جاتا تو مکان کہیں بہتر حالت میں نظر آ سکتا تھا۔ مکان میں تین بڑے کمرے تھے۔ ایک پروفیسر کا بیڈ روم تھا، دوسرا اسٹڈی کے طور پر

استعمال ہوتا تھا اور تیسرا نشست گاہ تھی۔ کچن کے ساتھ ہی چھوٹا سا ڈائننگ روم بھی تھا لیکن دونوں چیزیں بیکار تھیں کیونکہ پروفیسر بازار سے منگوا کے کھاتا تھا۔ گھر میں زیادہ

سے زیادہ چائے یا کافی بنا لیتا تھا۔ نشست گاہ میں پرانے طرز کے بھاری لیکن آرام دہ صوفے تھے۔ پروفیسر ان کے منع کرنے کے باوجود چائے بنا کر لے آیا۔ اسے چھڑی کے

سہارے چلنے میں دشواری نہیں ہوتی تھی۔ صبا نے اس کی غیر موجودگی میں محمود سے اس کے بارے میں مختصر سا انٹرویو کر لیا۔ پروفیسر اکیلا رہتا تھا۔ اس نے شادی کی تھی لیکن

بیوی سے علیحدگی ہو گئی۔ بچہ کوئی نہیں تھا، تب سے اکیلا تھا۔

”پروفیسر کے پاؤں میں کوئی مسئلہ ہے؟“

”نہیں، جن دنوں پروفیسر یہاں نئے نئے آئے تھے، یونیورسٹی میں فائرنگ ہوئی اور گولی ان کے گھٹنے سے

گزر گئی۔ تب سے چھڑی کے سہارے کے بغیر چل نہیں پاتے ہیں۔“

اسی اثنا میں پروفیسر صاحب ٹی ٹرائی دکھلتے ہوئے لے آئے۔ ”میرے بارے میں بات ہو رہی ہے؟“

صبا حیران ہوئی لیکن محمود نے آرام سے تصدیق کر دی۔ ”جی ہم آپ کے بارے میں بات کر رہے تھے۔“

”حالانکہ تم لوگ منصف کے بارے میں بات کرنے آئے ہو۔“ پروفیسر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”لایے چائے میں بناؤں۔“ صبا نے ٹرائی اپنی

ان اداروں میں نہیں ہونا چاہیے۔“

”یہ بھی ایک البیہ ہے۔ لوگ وہاں نہیں ہوتے جہاں ان کو ہونا چاہیے۔“ پروفیسر نے سرد آہ بھر کر کہا۔ ”ان سوالوں کے جواب تم مجھ سے چاہتی ہو؟“

”میں نے آپ کا تجزیہ سنا ہے اور مجھے لگتا ہے کہ آپ نے اس شخص کے بارے میں بہت سوچا ہے۔ مجھے امید ہے آپ اس کے بارے میں بہت کچھ بتا سکتے ہیں۔“

”تم ذہین ہو۔“ پروفیسر نے بالآخر اعتراف کر لیا۔ ”تم نے ٹھیک اندازہ لگایا ہے، میں نے اس کے بارے میں بہت کچھ سوچا ہے بلکہ میں نے اس پر کام بھی کیا ہے۔ ایک منٹ...“

پروفیسر اٹھ کر گیا اور چند منٹ بعد ایک نوٹ پیڈ کے ساتھ واپس آیا۔ وہ اس نے صبا کی طرف بڑھا دیا۔ محمود ایک طرف بیٹھا چائے سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ صبا نے نوٹ پیڈ دیکھا۔ اس پر پروفیسر نے پنسل سے لکھا ہوا تھا۔

بہت منظم اور یکسو ذہن کا مالک

ہر کام سوچ سمجھ کر کرنے والا

جسمانی طور پر ایسے کام کرنے کا اہل

معاشرے میں کوئی ممتاز مقام رکھتا ہے

شاید اکیلا ہے

مالی مسئلہ نہیں ہے

شاید منصفی کی آڑ میں کچھ عزائم رکھتا ہے

صبا نے پڑھ کر نوٹ پیڈ محمود کی طرف بڑھا دیا۔ محمود بھی پڑھنے لگا۔ صبا نے پوچھا۔ ”معاشرے میں ممتاز مقام سے کیا مراد ہے؟“

”وہ اپنے آس پاس کے لوگوں سے برتر ہے۔ وہ معاشرے اور اس کی اچھائیوں برائیوں کو بہت اوپر سے دیکھتا ہے۔“

صبا نے اس کی بات پر غور کیا۔ ”آپ کا مطلب ہے وہ معاشرے کا ایسا حصہ نہیں ہے جہاں وہ معاشرے کی اچھائیوں برائیوں میں براہ راست شریک ہو؟“

”بالکل، میں تمہاری ذہانت کا قائل ہو چکا ہوں۔“ ”آپ نے کہا کہ وہ کچھ عزائم رکھتا ہے، اس سے کیا مراد ہے؟“

پروفیسر ہنسی بکچا یا۔ ”میں اس کی وضاحت نہیں کر سکتا، یوں سمجھ لو کہ یہ میرا جدان ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ آج کے دور میں اور ہمارے جیسے منافق معاشرے میں اس طرح کا کوئی سپر ہیرو نہیں ہو سکتا جو صرف خلوص نیت سے تطہیر کا

طرف کھینچ لی۔“ ہم اسی سلسلے میں آپ سے بات کرنے آئے ہیں۔“

”چینی زیرو... دودھ کم۔“ پروفیسر نے ہدایت دی اور محمود کی طرف دیکھا۔ ”اس کے بارے میں کیا بات کرنے آئے ہو؟“

”میں نے آپ کوئی وی پر اس کے بارے میں سنا ہے۔“ صبا نے کہا۔ ”آپ نے منصف کو انارکسٹ کہا... اس کی وجہ؟“

”وجہ میں نے پروگرام میں بتادی تھی۔“ ”ٹھیک ہے لیکن ایک نامعلوم شخص کے بارے میں آپ نے اتنی واضح رائے کیسے قائم کر لی؟“ صبا نے جرح کی۔

”میں نے اس شخص کے بارے میں نہیں، اس کے عمل کے بارے میں رائے قائم کی۔ جس طرح سب اس سے لاعلم ہیں، اسی طرح میں بھی اسے نہیں جانتا لیکن اس کے عزائم اور عمل سب کے سامنے ہے۔ میں نے اسی بنیاد پر اسے انارکسٹ قرار دیا ہے۔ تم اس کے بارے میں کیوں پوچھ رہی ہو؟“

”میں اسے تلاش کرنا چاہتی ہوں۔“ صبا نے سادگی سے کہا تو پروفیسر کا منہ کھلا رہ گیا۔ اس نے محمود کی طرف دیکھا تو اس نے مسکرا کر نظریں پھیر لیں۔ پروفیسر نے ملاحت سے کہا۔

”بی بی! تم کچھ زیادہ ہی بڑا دعویٰ نہیں کر رہی ہو۔ جسے حکومت تلاش کر رہی ہے اور وہ اسے نہیں مل رہا، اسے تم کیسے تلاش کرو گی؟“

”میں کوشش تو کر سکتی ہوں۔“ صبا نے اصرار کیا۔ ”میں جاننے کی کوشش کر رہی ہوں کہ وہ کیسا شخص ہوگا؟ وہ ہمیں کہاں مل سکتا ہے؟ اس کا آئندہ شکار کون ہوگا... اس نے چارٹل کیے ہیں اور مختلف طریقے سے کیے ہیں... اس نے کہاں سے تربیت حاصل کی... وہ معلومات کیسے حاصل کرتا ہے... اس کے آس پاس کا ماحول کیسا ہوگا... اس کا خاندان ہوگا یا وہ اکیلا ہے؟ ان سوالوں کے جوابات سے ہم اس کی شخصیت کا تعین کر سکتے ہیں اور پھر اسے تلاش کیا جا سکتا ہے۔“

اس بار پروفیسر نے حیرت آمیز ستائش سے اسے دیکھا۔ ”بی بی! تم نے حیران کر دیا ہے تمہیں پولیس یا کسی انویسٹی گیشن ایجنسی میں ہونا چاہیے تھا۔“

صبا ہنسی۔ ”وہاں پہلے ہی وہ لوگ بھرے ہیں جنہیں

کام کرے۔“

محمود نے پہلی بار مداخلت کی۔ ”اگر اس کا کوئی مقصد ہے تو اسے بے نقاب کرنا آسان ہوگا۔ ویسے صبا کا خیال بھی یہی ہے کہ وہ خاص مقصد رکھتا ہے۔“

”شاید نہ رکھتا ہو۔“ پروفیسر نے اختلاف کیا۔ ”وہ سب سے چھپا ہوا ہے اور اس کے عزائم صرف اسی کے علم میں ہیں۔ جب تک اس کے اگلے قدم کا علم نہیں ہوگا، اسے بے نقاب کرنا آسان نہیں ہوگا۔“

”اس کا نشانہ تو واضح ہے۔ وہ ایسے افراد کو نشانہ بناتا ہے جو طاقتور ہیں اور ان پر قانون ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔“

صبا کی بات پر پروفیسر نے سر ہلایا۔ ”لیکن نشانہ کون ہوگا... کراچی سے پشاور تک وہ کسی کو بھی نشانہ بنا سکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس کے نشانے کو بھی بس مرتے دم پتا چلتا ہوگا کہ وہ نشانہ بن گیا ہے لیکن کس کا یہ اسے بھی پتا نہیں چلتا ہوگا۔“ پروفیسر نے کہتے ہوئے دیوار پر لگی گھڑی کی طرف دیکھا تو وہ سمجھ گئے۔ صبا نے کہا۔

”آپ کے تعاون کا شکریہ... کیا ضرورت پڑنے پر میں دوبارہ آپ سے رابطہ کر سکتی ہوں؟“

”کیوں نہیں۔“ پروفیسر نے اسے اپنا کارڈ دیا۔ ”بس رات دس بجے کے بعد کال مت کرنا، میں اپنا سیل فون آف کر دیتا ہوں۔ صبح آٹھ سے رات دس بجے تک تم جس وقت چاہے کال کر سکتی ہو۔“

باہر نکل کر روانہ ہوتے ہوئے محمود نے کہا۔ ”تم نے پروفیسر کو بھی متاثر کیا ہے لیکن اب بھی میرا یہی خیال ہے کہ تم سمندر میں ایک خاص مچھلی تلاش کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔“

”شکریہ، میرا بھی یہی خیال ہے لیکن بعض اوقات انسان کو وہاں سے کامیابی مل جاتی ہے جہاں سے اس نے سوچا بھی نہیں ہوتا۔“

”تم کہاں رہتی ہو، میں تمہیں ڈراپ کر دیتا ہوں۔“ صبا کا گھر گلشن کے ایک پرسکون اور صاف ستھرے علاقے میں تھا۔ یہ چھوٹا سے بنگلا تھا جس کی بیرونی دیواروں پر پھول دار بیلٹیں چڑھی ہوئی تھیں اور سامنے والے حصے میں ناریل کے درخت لگے تھے۔ یہاں آتے ہوئے محمود کو جگہ جگہ لگے بیریزز سے واسطہ پڑا تھا۔ اگر صبا گائیڈ نہ کرتی تو وہ بھٹکتا رہ جاتا۔ ”تم لوگوں نے حفاظت کے لیے کچھ زیادہ ہی بیریزز نہیں لگا دیے؟“ صبا مسکرا دی۔

”آئندہ میں یہاں آنا بھی چاہوں تو نہیں آسکوں گا۔“

”تب تو آپ کو میرے گھر ایک کپ چائے پی لینے چاہیے اور میری ماما سے مل لینا چاہیے۔ وہ آپ کا پروگرام شوق سے دیکھتی ہیں۔“

”صرف تمہاری ماما؟“ محمود نے کار ایک طرف روکی۔

”ہاں، پاپا اور بھائی کو فرصت نہیں ملتی۔ وہ اس وقت بھی دفتر میں ہوں گے۔ میں بھی چلی جاتی ہوں تو ماما اکیلی ہوتی ہیں۔ وہ ٹی وی سے دل بہلاتی ہیں۔“

صبا کی ماما مسز رحیم سو بر خاتون تھیں۔ وہ محمود سے مل کر خوش ہوئیں۔ مگر انہیں زیادہ گفتگو کا فن نہیں آتا تھا، وہ ان عورتوں میں سے تھیں جو اپنی محبت اور توجہ کا اظہار اپنے عمل سے کرتی ہیں۔ وہ محمود کے لیے چائے بنا لائیں اور کھانے پر رکنے کا اصرار کرتی رہیں لیکن محمود نے مناسب نہ سمجھا۔ وہ یہ سن کر خوش ہوئی تھیں کہ صبا کچھ عرصے محمود کے ساتھ کام کرے گی۔ ”مجھے یقین ہے کہ یہ تم سے بہت کچھ سیکھے گی۔“

”صبا بہت ذہین ہے اور اسے سیکھنے کے لیے کسی شخصیت کی ضرورت نہیں ہے۔“ محمود نے صبا کی تعریف کی تو وہ مزید خوش ہو گئیں۔ یہ مشکل انہوں نے اسے جانے کی اجازت دی۔ گھر آیا تو ڈنر تیار تھا۔ ڈنر کے بعد اس نے...

انٹرنیٹ سے منصف کی چاروں ویڈیوز ڈاؤن لوڈ کیں۔ یہ چاروں افراد صرف ایک مہینے کے اندر منصف کا شکار بنے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ منصف نے انہیں پہلے سے چن لیا تھا۔ ان کے جن جرائم کا حوالہ دیا گیا تھا، وہ سزا دینے سے مہینوں پہلے سزا دہوئے تھے۔ آخری فرد اعجاز خان کے قتل کو اب ایک مہینہ گزر گیا تھا اور اس کے بعد منصف نے مزید کسی کو سزا نہیں دی تھی۔ البتہ اس نے آخری ویڈیو میں اعلان ضرور کیا تھا کہ عنقریب وہ چند مستحق افراد کو کیفر کردار تک پہنچائے گا۔ اس نے منصف کی آواز غور سے سنی۔ آج سے پہلے اس نے اسے ٹی وی پر سنا تھا، پہلی بار وہ لیپ ٹاپ پر ہینڈ فون لگائے اس کی آواز سن رہا تھا اور یہ آواز بہت واضح تھی۔ محمود بار بار ان ویڈیوز کو دیکھتا اور سنتا رہا۔ پھر اس نے کچھ نوٹس بنائے۔ جب وہ اٹھا تو جسم ٹھکن سے ٹوٹ رہا تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ مسئلہ جسمانی نہیں بلکہ ذہنی ہے۔ وہ جب پریشان ہوتا تو اس کا جسم اسی طرح ٹوٹتا تھا اور نہ بہت زیادہ کام بھی اس پر اثر انداز نہیں ہوتا تھا۔

اگلی صبح اس نے عبداللہ ہاشم کو کال کی۔ ”میں تیار ہوں... آپ جب چاہیں مجھ سے سوالات کے لیے آسکتے ہیں۔“

”میں وقت نکالتا ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”بس یہ خیال رکھیے گا، آپ جو کہیں گے ہم اس کی تصدیق کریں گے۔“

”مجھے معلوم ہے۔“ محمود نے سرد لہجے میں کہا اور کال کاٹ دی۔ اسے غصہ آرہا تھا۔ یہ سارے چکر اس کے معمولات کو متاثر کر رہے تھے۔ آج صبح وہ وقت پر اٹھ گیا لیکن جاگنگ پر نہیں گیا، بس لیٹا ہوا سوچتا رہا۔ اسے اس چکر سے نکلنا تھا۔ ایک طریقہ تو یہ تھا کہ وہ عبداللہ ہاشم اور صبا سے تعاون سے انکار کر دیتا۔ لیکن یہ اس کا صحیح حل نہیں تھا۔ عبداللہ سرکاری آدمی تھا اور وہ انکار سے متاثر نہ ہوتا، اس کے پاس اور بھی طریقے تھے۔ صبا بھی اس سے متاثر نہ ہوتی، وہ اپنے طور پر کام جاری رکھتی اور اگر وہ کامیاب ہو جاتی تو بہت کچھ سامنے آتا۔ اس لیے اس کا اس معاملے میں شامل رہنا بہت ضروری تھا۔ عبداللہ کو کال کر کے اس کا غصہ پھرا بھرا آیا اور وہ اسے قابو کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ توجہ بنانے کے لیے وہ لٹچ کے بعد باہر نکل گیا اور پیدل چلتا ہوا ساحل تک آیا۔ ساحل کا یہ حصہ بندرگاہ اور عام لوگوں کی پہنچ سے دور تھا اس لیے صاف ستھرا اور شفاف پانی کا حامل تھا۔ وہ لہروں میں اتر آیا۔ وہ سوچوں سے پیچھا چھڑانے آیا تھا لیکن یہاں تنہائی اور سناٹے میں سوچیں مزید ابھر آئیں۔ جھنجھلا کر وہ واپس آ گیا۔ وہ موبائل گھر چھوڑ گیا تھا۔ اس پر صبا کی طرف سے کئی مس کالز موجود تھیں۔ اس کے ساتھ اس کا پیغام بھی تھا۔

”آپ شاید مصروف ہیں۔ میں بات کرنا چاہ رہی تھی۔ جب فارغ ہوں تو کال کر لیجیے گا۔“

محمود نے پہلے موبائل واپس رکھ دیا۔ کچھ دیر ٹھہلتا اور سوچتا رہا۔ پھر اس نے موبائل اٹھا کر صبا کو کال کی۔ ”میں باہر تھا اور موبائل گھر میں چھوڑ گیا تھا۔ سوری تمہیں زحمت اٹھانا پڑی۔“

”کوئی بات نہیں۔ میں نے کچھ نئے زاویوں سے منصف کے معاملے پر غور کیا ہے اور کچھ ڈیٹا جمع کیا ہے۔“

”ٹھیک ہے، کل اسٹوڈیو آ جاؤ۔“

”میں آفس سے آسکوں گی۔ پانچ بجے چھٹی ہوتی ہے۔“

”میں پانچ بجے آفس میں موجود ہوں گا۔“ محمود نے جواب دیا۔

اگلے دن وہ ناشتے سے فارغ ہو کر ٹی وی اور اخبارات دیکھ رہا تھا کہ عبداللہ ہاشم آ گیا۔ محمود نے آدھے گھنٹے تک اس کے سوالوں کے جوابات دیے۔ اس بار اس

ایک سردار جی انگلستان تشریف لے گئے۔ کچھ دنوں بعد ان کا دل گرما کھانے کو چاہا۔ اب ان کی سمجھ میں یہ نہ آئے کہ ”گرما“ کی انگریزی کیا ہوگی۔ خوب سوچنے کے بعد آخر کار دکان پر گئے اور دکان دار سے کہا کہ تجھے ”HOTA“ چاہیے۔ دکان دار غریب پریشان کہ ”HOTA“ کیا ہوتا ہے۔ وہ ڈکشنری کھول کر بیٹھ گیا۔ اسی اثنا میں دوسرے سردار صاحب بھی وہاں آ گئے۔ پہلے سردار نے ان سے گرما کے بارے میں پوچھا تو وہ ایک تہقہہ مار کر ہنس پڑے اور بولے۔ ”میں نے ایک سال سے ”COLD“ مانگا ہوا ہے، وہ نہیں ملا تو ”HOTA“ کہاں سے مل جائے گا۔“

(ج۔ احمد۔ پشاور)

نے خود پر قابو رکھا اور سکون سے جواب دیتا رہا۔ عبداللہ نے تمام پوائنٹس نوٹ کیے اور جاتے ہوئے اسے ایک بار پھر خبردار کیا کہ وہ ان جوابات کو چیک کرے گا۔ وہ عام طور سے انہی دنوں اسٹوڈیو جاتا تھا جب اس کا پروگرام ریکارڈ ہوتا تھا۔ اسٹوڈیو ایک چھوٹے بنگلے میں تھا اور اسے چینل کی طرف سے اسی مقصد کے لیے کرائے پر حاصل کیا گیا تھا۔ اگرچہ چینل کے اپنے پاس بھی اسٹوڈیوز تھے لیکن محمود نے اپنے پروگرام کے لیے اسٹوڈیو الگ رکھا تھا۔ وہ شام کو اس طرف جاتے ہوئے صبا کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ دیکھنے میں سادہ سی تھی لیکن اس کی ذہانت میں اب کوئی شبہ نہیں رہا تھا۔ اسی طرح اس کی نسوانی دلکشی بھی غیر محسوس انداز میں اثر کرتی تھی۔ وہ چونکا تو نہیں تھی، رفتہ رفتہ اپنا آپ منوانے والی خوب صورتی تھی۔ اسے پتا نہیں چلا کہ وہ کب اسٹوڈیو کے سامنے پہنچ گیا ہے، اسے تعجب ہوا۔

”کیا یہ لڑکی اتنی اثر انگیز ہے؟“

بیس سال کی عمر میں اس کا خیال تھا کہ اس نے منصف نازک سے متاثر ہونا اور ان کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیا ہے۔ لیکن آج وہ بہت دیر تک صبا کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس نے خود سے سوال کیا۔ کیا وہ اس لیے سوچتا رہا کہ صبا منصف پر کام کر رہی ہے؟ جواب نفی میں تھا۔ وہ اس لیے صبا کے بارے میں سوچتا رہا کہ وہ دلکش اور ذہین تھی۔ بالکل ویسی عورت جیسی اسے پسند تھی۔ ثمنہ حسین تھی، اگر اس لحاظ سے دیکھا جائے تو وہ صبا سے کہیں زیادہ حسین تھی لیکن وہ ذہین نہیں تھی۔ ثمنہ ذہین تھی لیکن عام معنوں میں۔ خود

محمود جتنا ذہین تھا، ثمنینہ اس کے معیار پر پورا نہیں اترتی تھی۔ اس نے بھی یہ بات ثمنینہ سے کہی یا جتنی نہیں۔ صبا وقت سے ذرا پہلے آگئی۔ وہ اس وقت بھی اس کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ چینل کی پک اینڈ ڈراپ وین اسے اسٹوڈیو تک چھوڑنے آئی تھی۔ محمود نے اس سے پوچھا۔

”اب تم گھر کیسے جاؤ گی؟“

”یہاں سے رکشہ مل جاتا ہے۔“ وہ بیگ رکھتے ہوئے بولی۔ ”آج میں بہت تھک گئی ہوں۔“

”منصف کے علاوہ بھی تم کسی کیس پر کام کر رہی ہو؟“

”ہاں، کچھ رپورٹس ہیں، ان کو مرتب کرنا ہے۔ دو دن سے اسی میں لگی ہوئی ہوں۔“

”منصف آفیشل جاب نہیں ہے؟“

صبا مسکرائی۔ ”آپ جانتے ہیں، اس قسم کی انویسٹیشن ان لوگوں کے نزدیک وقت ضائع کرنے والی بات ہے۔ وہ تو چٹ پٹے موضوعات چاہتے ہیں جن سے دیکھنے والوں کو متوجہ کیا جاسکے۔“

”کل رات سے میں منصف کی ویڈیوز سن اور دیکھ رہا ہوں۔ مجھے لگا جیسے میں اس لب و لہجے کو پہلے بھی سن چکا ہوں۔“ صبا چونکی پھر پرجوش ہو گئی۔ ”ریٹکی... اگر ایسا ہے تو پلیز یاد کریں وہ کون ہو سکتا ہے؟“

”میں کوشش کر رہا ہوں لیکن یاد نہیں آرہا۔“ محمود نے کہا۔ ”تم کیا کہنا چاہتی تھیں؟“

”میں نے آپ کے مزید کچھ پروگرام پوائنٹ آؤٹ کیے ہیں جن میں آپ نے کرپشن کے کچھ بڑے کیس بے نقاب کیے ہیں اور ان میں جو لوگ ملوث ہیں، وہ اسی شہر میں ہوتے ہیں۔ منصف کے دیگر چار شکاروں کی طرح۔“

محمود نے سر ہلایا۔ ”یہ تو طے ہے کہ وہ اسی شہر سے تعلق رکھتا ہے اور اس نے نشانہ بھی ان لوگوں کو بنایا جو ہمیں موجود تھے۔ حد یہ کہ نور اللہ کا دفتر بھی شہری حدود میں آتا تھا۔“

”یہ تمہیں نام ہیں۔“ صبا نے ایک کاغذ اس کی طرف بڑھایا۔ ”اس پر ان کے بارے میں تفصیل بھی ہے۔“

محمود نے نام دیکھے۔ پہلا نام منیر الدین نامی شخص کا تھا۔ یہ تعمیر و ترقی کے ایک سرکاری ادارے میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھا اور ایک پل کی تعمیر کا ذمے دار تھا جو بنانے کے ایک مہینے کے اندر اچانک گر گیا اور اس حادثے میں ایک درجن سے زیادہ لوگ مارے گئے تھے۔ سرکار نے اسے معطل کر کے ایک نام نہاد سی انکوائری شروع کرائی تھی جس کی تحقیق کے بارے میں کسی کو علم نہیں تھا۔ اب منیر الدین

گھر بیٹھے تنخواہ لے رہا تھا۔ پل کی تعمیر میں نہایت ناقص تعمیراتی سامان استعمال ہوا تھا۔ محمود نے پروگرام میں اس کیس کو کھل کر بیان کیا تھا۔ دوسرا نام ڈاکٹر راشد نورانی کا تھا۔ یہ صوبائی محکمہ صحت میں کام کرتا تھا اور اس نے بچوں کی بیماریوں کی ویکسین کی خریداری میں بڑے پیمانے پر کمیشن لیا تھا اور خریدی جانے والی ویکسین ناکارہ ثابت ہوئی۔ بعد میں درجنوں بچے بیماریوں سے مر گئے۔ یہ بھی معطل تھا اور انکوائری کا کچھ پتا نہیں تھا۔ تیسرا فرد شفقت اللہ صوبائی محکمہ خوراک کا ایک اعلیٰ افسر تھا۔ اس نے سیلاب میں گھرے ایک سرکاری گودام میں موجود گندم کے ذخائر بچانے یا انہیں غریبوں میں تقسیم کرنے کے بجائے ایسے ہی پڑے رہنے دیا۔ پانی نے پورا ذخیرہ برباد کر دیا جبکہ اسی دوران میں علاقے میں لوگ بھوک سے ہلاک ہو رہے تھے۔ محمود نے ان تینوں افراد کو بیوتوں کے ساتھ بھج م قرار دیا تھا اور حکومت سے مطالبہ کیا تھا کہ ان کے خلاف قتل کے مقدمے بنائے جائیں۔ کیونکہ انہوں نے صرف بد عنوانی نہیں کی تھی بلکہ یہ بے گناہ لوگوں کی جان لینے کا سبب بھی بنے تھے۔ محمود نے صبا کی طرف دیکھا۔

”تمہارا خیال ہے، یہ تینوں منصف کا اگلا نشانہ ہو سکتے ہیں؟“

”میرا یہی خیال ہے۔“

”اس صورت میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟“ محمود نے سوال کیا۔ ”ان سے رابطہ یا پولیس کو خبردار کیا جائے؟“

”اس کے بجائے ہم خود ان کی نگرانی نہیں کر سکتے؟“ محمود مسکرایا۔ ”جاسوسی... لیکن ہم جاسوس نہیں ہیں۔“

”آج کل جاسوسی بہت آسان ہو گئی ہے۔“ صبا نے اصرار کیا۔ ”ہم آلات کی مدد لے سکتے ہیں۔“

محمود سوچ میں پڑ گیا۔ صبا اس کی طرف متوقع نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد اس نے سر ہلایا۔ ”ٹھیک ہے لیکن اس کے لیے ایک ماہر آدمی کی ضرورت پڑے گی جو قابل اعتماد بھی ہو۔“

”میں جانتی ہوں، میرا کزن ہے۔ باہر سے انجینئرنگ کر کے آیا ہے اور الیکٹرانکس کا ماہر ہے۔“ صبا نے فخر سے بتایا۔

”ٹھیک ہے لیکن یہ سب کریں گے کیسے؟“

”محمود صاحب! پہلے ان لوگوں تک رسائی حاصل کرنا ہوگی۔ آج کل جیسے حالات ہیں، وہ آسانی سے کسی پر اعتماد نہیں کریں گے اور نہ کسی کو اپنے گھر آسانی سے آنے

دیں گے۔ اس صورت میں آپ کو آگے آنا ہوگا۔“
”مجھے؟“

”آپ مشہور شخصیت ہیں۔ اگر ان سے ملنے کو کہیں گے اور اسی حوالے سے ملنے کو کہیں گے تو وہ انکار نہیں کریں گے۔“
محمود سمجھ گیا۔ ”لیکن کیا اس صورت میں خطرہ محسوس کرتے ہی وہ پولیس کی طرف نہیں دوڑیں گے؟“
”مشکل ہے کیونکہ وہ سب بھی مجرم ہیں اور ڈرے ہوئے ہیں۔ اگر کوئی پولیس کے پاس گیا، تب بھی ہماری پولیس اتنی اچھی نہیں ہے کہ ان کی حفاظت کے لیے کچھ کرے۔“

محمود نے سوچا اور پھر گہری سانس لے کر کہا۔ ”آئی بی مجھ سے تفتیش کر رہی ہے کیونکہ وہ بھی اسی نتیجے پر پہنچے ہیں کہ منصف نے اپنے نشانے میرے پروگرام سے منتخب کیے ہیں۔“
صبا چونکی۔ ”کیا وہ آپ پر شک کر رہے ہیں؟“

محمود نے سر ہلایا۔ ”لگتا کچھ ایسا ہی ہے۔ مجھ سے کہا گیا کہ میں ان اوقات کی مصروفیت بیان کروں جب یہ چاروں افراد قتل ہوئے تھے۔ کل میں نے بیٹھ کر یہ کام کیا اور آج ان کے افسر کے سوالوں کے جوابات دیے۔“

صبا نے سوچ کر کہا۔ ”اس صورت میں اگر آپ ان لوگوں سے رابطہ کریں گے اور یہ بات آئی بی تک پہنچے گی تو آپ کے لیے مشکل ہو سکتی ہے۔ لیکن اب یہ ضروری ہو گیا ہے کہ آپ اس معاملے میں خود کچھ کریں تاکہ آپ پر سے شک ہٹ سکے۔“

”میں بھی یہی محسوس کر رہا ہوں۔“ محمود نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”میں تیار ہوں لیکن پہلے مجھے اپنے کزن سے ملناؤ۔ ہمیں طریقہ کار طے کرنا ہوگا کہ کام کیسے کرنا ہے اور کسے کام کرنا ہوگا۔“

”میں کل اسے لے آؤں گی۔“ صبا نے کہا پھر اسے خیال آیا۔ ”کل آپ کو فرصت ہوگی؟“
”ہاں، اگلا پروگرام پرسوں ہے اور دیے بھی اس کے لیے وقت نکالنا ہے۔“

☆☆☆

فاخر شہر یار نو جوان تھا۔ عمر ستائیس برس سے زیادہ نہیں تھی۔ متوسط قد و قامت لیکن جسم میں چستی تھی۔ بہت خوش رو اور دلکش چہرہ تھا اس نے محمود سے ہاتھ ملایا تو وہ چاہنے کے باوجود مسکرا نہیں سکا تھا۔ جبکہ فاخر کا پورا وجود مسکرا رہا تھا۔ ”آپ سے مل کر بہت خوش ہو رہی ہے سر۔“

”نوسر۔“ محمود نے کہا۔ ”کالی می محمود۔“
”یہ اچھا ہے۔ مجھے بھی بے تکلفی اچھی لگتی ہے لیکن

اعداد و شمار کے ماہر جناب جی ایم نوشاہی نے ایک مرتبہ اپنے دوستوں کو بتایا کہ اوسط درجے کا ہر آدمی روزانہ پچیس ہزار الفاظ بولتا ہے جبکہ اوسط درجے کی عورت روزانہ تیس ہزار الفاظ بولتی ہے۔
پھر آہ بھر کر انہوں نے کہا۔ ”بد قسمتی سے شام کو جب میں دفتر سے اپنے گھر پہنچتا ہوں تو اپنے پچیس ہزار الفاظ استعمال کر چکا ہوتا ہوں جبکہ میری بیوی اپنے تیس ہزار الفاظ بولنے کا آغاز کرتی ہے۔“

☆☆☆

گڈ میاں بیمار پڑے۔ ڈاکٹر آیا۔ اس نے اسٹیتھ اسکوپ لگا کر سینے کا معائنہ کیا۔
”ڈاکٹر صاحب۔“ گڈ میاں نے پوچھا۔ ”کیا آپ میرے جراثیم کو فون کر رہے ہیں؟“

☆☆☆

امریکا کے مشہور ماہر معاشیات برن اسٹائن کا کہنا ہے۔ ”دنیا کی موجودہ رفتار کو دیکھ کر پیش گوئی کرنے کو دل چاہتا ہے کہ جلد ہی عرب کے لوگ ایک سے ایک بڑھ کر کیڑیلاک پر دندنا تے پھر رہے ہوں گے اور ہم امریکی ادنیوں کی سواری سے لطف اندوز ہو رہے ہوں گے۔“

☆☆☆

استانی نے کلاس میں پوچھا۔ ”کسی ایسے جانور کا نام بتاؤ جو بہت تیزی سے بڑھتا ہے؟“
ایک بچے نے کھڑے ہو کر کہا۔ ”مچھلی، مس!“
”شاباش۔“ استانی نے کہا۔ ”کیا تم اس کے بڑھنے کی رفتار بتا سکتے ہو؟“

”جی ہاں مس۔“ بچہ بولا۔ ”مچھلی ہفتے ابو جان نے جو مچھلی پکڑی تھی اس کا ذکر کرتے ہوئے وہ روزانہ دو تین انچ کا اضافہ کر دیتے ہیں اور ابھی تک اسی رفتار سے اضافہ جاری ہے۔“

☆☆☆

مچھلی کے شکار پر جاتے ہوئے تم اپنی بیوی کو گھر کیوں چھوڑ جاتے ہو؟“
”اس کی ایک بہت اہم وجہ ہے۔“

”وہ وجہ مجھے نہیں بتاؤ گے؟“

”وجہ یہ ہے کہ مچھلیوں پر میری بیوی کی موجودگی کا اچھا اثر نہیں پڑے گا۔“
”کیوں؟“

”کیونکہ وہ یہ دیکھ کر میرے جال میں پھنسنے کے لیے تیار نہیں ہوں گی کہ میں خود کتنی بری طرح اس عورت کے جال میں پھنسا ہوا ہوں۔“

میں آپ کا احترام کرتا ہوں۔“
 ”پھر جیسے تمہاری مرضی۔“ محمود نے کہا اور صبا کی طرف دیکھا۔ ”اس نے تمہیں بتا دیا ہوگا۔“
 ”بتا دیا۔“ قاخر نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔ ”اس نے میرا سر پلپلا کر دیا۔“

”جھوٹ مت بولو، تم بھول جاتے ہو اس لیے میں نے تفصیل سے بتایا۔“ صبا بولی اسی لمحے محمود نے محسوس کر لیا کہ ان دونوں کے درمیان کچھ تعلق تھا۔ اس کا اظہار ان کے لہجے سے ہوا تھا۔ صبا نے محمود کی طرف دیکھا۔ ”میں نے ایک منصوبہ سوچا ہے۔“

وہ سب اسٹوڈیو میں تھے۔ وہاں کا چوکیدار ان کے لیے چائے بنا کر لے آیا۔ ”کیسا منصوبہ؟“
 ”پہلے قاخر آپ کو ڈیوائس دکھا دے، اس کے بعد بتاتی ہوں۔“

قاخر کے پاس ایک چھوٹا سا دھاتی بریف کیس تھا۔ اس نے بریف کیس کھولا اور اس کے اندر سے ایک چھوٹی اور کوٹ کے بٹن کے سائز و شکل کی چیز نکالی۔ ”یہ جدید ترین مائکروفون ہے۔ سونے کے دائرے میں یہ خوبی کام کرتا ہے۔ اسے کسی پاور کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بس کسی ایسی سطح پر لگا دیں جہاں سے اسے ارتعاش ملتا رہے۔“ پھر اس نے ایک سگریٹ کی ڈبیا کے سائز کا آلہ نکالا۔ ”یہ اس کا ریسور ہے اگر چاہیں تو اس سے براہ راست سن سکتے ہیں۔ دوسری صورت میں اسے ریکارڈنگ پر لگا دیا جاتا ہے۔ اس کی میموری میں اتنی گنجائش ہے کہ چوبیس گھنٹے کی ریکارڈنگ آسانی سے ہو سکتی ہے۔ اس صورت میں اسے مائیک سے سونے کے اندر رکھیں لگانا ہوگا۔“

”اچھی چیز ہے۔“ محمود متاثر ہوا۔ ”اس سے تو کسی کی جاسوسی بہت آسان ہو جائے گی۔“

”یہ میں نے ایک افغان سے خریدا ہے، اصل میں بہت ہائی ٹیک ہے اور مٹری انٹیلی جنس کی چیز ہے۔ اب آپ کو اس سے بہتر چیز دکھاتا ہوں۔“ اس نے کمرے کے لینس جیسی ایک چیز نکالی۔ یہ مشکل سے ایک انچ قطر کی اور ایک ہی انچ لمبی تھی۔ ”یہ اسپاکی کیمرہ ہے۔ فی سیکنڈ ایک تصویر لیتا ہے اور تین دن لگا تار کام کر سکتا ہے۔ اس کی بیٹری اور میموری تین دن چلتی ہے۔ اسے کہیں بھی لگا دیں۔ اس کا لینس ایک سو اتنی درجے زاویے پر کام کرتا ہے۔ یوں سمجھ لیں کہ اگر میں اسے اس کمرے کے کونے پر لگا دوں تو یہ تقریباً پورے کمرے کو کور کرے گا۔“

”یہ دو ڈیوائس ایک زیرو زیرو سیون کے برابر کام کریں گی۔“ صبا نے کہا۔ ”اب مسئلہ انہیں استعمال کرنے کا ہے۔ یعنی ان تین افراد کے گھروں میں لگانے کا۔“
 ”تمہارا منصوبہ کیا ہے؟“

”آپ ان سے رابطہ کریں اور ان سے منصف کے حوالے سے بات کریں۔ آپ ان سے کہیں کہ آپ کو اطلاع ملی ہے کہ منصف نے ان سے رابطہ کیا ہے اور ان سے مطالبہ کیا ہے۔“

”بلف۔“ محمود نے زیر لب کہا۔ ”کیسا مطالبہ؟“
 ”ہاں۔“ صبا بولی۔ ”ظاہر ہے یہ نکلے ہوگا، اگر آگے سے سوال کیا جائے تو ٹالنا آپ کو آتا ہے۔“
 ”میں سمجھ گیا۔ اب تم یہ کام مجھ پر چھوڑ دو۔“ محمود نے کہا اور قاخر کی طرف دیکھا۔ ”مجھے ان ڈیوائسز کا استعمال سمجھا دو۔“

☆☆☆

ڈاکٹر راشد کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ اسے محمود کی بات پر بالکل یقین نہیں آیا ہے۔ محمود نے یہ مشکل اسے اس ملاقات کے لیے آمادہ کیا تھا۔ بلف نے کام نہیں کیا تھا اس لیے محمود کو بات بنانی پڑی۔ اس نے کہا کہ اسے اپنے ذرائع سے پتا چلا ہے کہ منصف کا اگلا نشانہ وہ ہوگا۔ تب ڈاکٹر راشد اس سے ملنے پر راضی ہوا۔ صبح دس بجے وہ مشکل سے بیدار ہوا تھا اور محمود کو آدھے گھنٹے نشست گاہ میں انتظار کرنا پڑا اور یہ انتظار اس لحاظ سے سودمند رہا تھا کہ اسے مائیک اور کیمرہ لگانے کا موقع مل گیا تھا۔ ایک طرف دیوار گیر کتابوں کی الماری تھی۔ محمود نے اس کے سب سے اوپر والے حصے میں کیمرہ دو کتابوں کے درمیان اس طرح لگایا کہ جب تک اسے بالکل پاس سے نہ دیکھا جائے تو نظر نہیں آتا۔ مائیک اس نے ٹیلی فون کے دھاتی اسٹینڈ کے نیچے لگا دیا تھا۔ اسے بھی جب تک الٹا کر کے نہ دیکھا جاتا، یہ نظر نہیں آتا۔

ڈاکٹر راشد تقریباً پچاس برس کا سیاہی مائل رنگ اور چھوٹے قد کا موٹا آدمی تھا۔ اس کی پتلی آنکھوں میں مکاری اور ہوس نمایاں تھی۔ وہ جیسا اندر سے تھا، ویسا ہی باہر سے تھا۔ اس نے رسماً بھی محمود سے کسی چیز کا نہیں پوچھا اور بدتمیزی سے بولا۔ ”اب کیوں آئے ہو؟ میرا بیڑا غرق تو کر دیا ہے۔“

”بیڑا غرق تم نے خود کیا ہے۔“ محمود نے بھی اخلاق بالائے طاق رکھ کر کہا پھر اس نے بتایا کہ وہ کیوں آیا ہے۔

”بکواس... یہ جھوٹ ہے۔ منصف کوئی سرکاری آدمی ہے۔“

”تم اسی خوش فہمی میں مر جاؤ گے۔ یہ حقیقت نہیں ہے... سرکار اس طرح کے کام نہیں کرتی۔ میرے ذرائع نے بتایا کہ منصف جلد حرکت میں آنے والا ہے اور تم اس کا ایک ممکنہ نشانہ ہو۔ اسی طرح چند افراد اور ہیں۔“

”مجھے کچھ نہیں ہوگا۔“ ڈاکٹر راشد نے یقین سے کہا۔ ”یہ معاملہ بھی جلد ختم ہو جائے گا اور میں بحال ہو جاؤں گا۔“ محمود کھڑا ہو گیا۔ ”میں تمہاری کرپشن کے خلاف ہوں لیکن کوئی تمہیں اس وجہ سے قتل کر دے، میں اس کے حق میں نہیں ہوں۔ سزا دینا عدالت کا کام ہے۔“

”زحمت کا شکریہ۔“ ڈاکٹر راشد نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ”اس مہربانی کی ضرورت نہیں تھی۔ جو تم کر چکے ہو وہی کافی ہے۔“

محمود باہر آیا تو صبا اور فاخر ایک کار میں کچھ دور موجود تھے۔ وہ ان کے پاس سے گزرا تو وہ بھی اس کے پیچھے آنے لگے۔ ایک جگہ محمود نے گاڑی روک دی۔ فاخر کی گاڑی آکر رکی اور وہ نیچے اتر آئے۔ صبا نے پوچھا۔ ”کام ہو گیا ہے، آپ دونوں کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔“

”ڈیو افس کہاں لگائی؟“ ”کچھ دور ایک بنگلے کے ساتھ درخت پر چڑھ کر شاخ سے باندھ دی۔“ فاخر ہنسا۔ ”بچپن کی یاد تازہ ہو گئی۔“ ”اسے پانی یا کسی اور چیز سے تو نقصان نہیں ہوگا؟“ ”نہیں، یہ واٹر پروف ہے۔ مضبوطی سے باندھ کر آیا ہوں۔ گرنے کا امکان بھی نہیں ہے۔“

”کل منیر الدین کو نمٹانا ہے۔“ محمود نے کہا۔ ”ویسے ڈاکٹر راشد کے انداز سے لگ رہا ہے کہ وہ مطمئن ہے۔“ ”اس کے اطمینان کے پیچھے کوئی وجہ ہے۔“ صبا جلدی سے بولی۔ ”ورنہ اسے خود بھی احساس ہوگا کہ وہ منصف کی طرف سے خطرے میں ہے۔“

”مجھے بھی یہی لگ رہا ہے۔ اب دیکھنا ہے کہ باقی دو افراد کا رویہ کیا ہوتا ہے۔ اگر وہ بھی ڈاکٹر راشد کی طرح مطمئن ہوئے تو اس کا مطلب ہوگا کہ دال میں کچھ زیادہ ہی کالا ہے۔“

فاخر کو ان باتوں سے دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے کہا۔ ”باقی دو کو بھی آج ہی نہ نمٹالیا جائے؟“ ”میں نے ابھی ان سے بات نہیں کی۔“ محمود نے جواب دیا۔

چال

چال ستاروں کی ہو یا انسانوں کی اگر..... کامیاب ہو جائے تو سمجھو کہ کچھ نہ کچھ انوکھا ہونے والا ہے..... آخری صفحات پر **عبدالرب بھٹس** کی پراثر تحریر

آخری شمع

ماضی کے اوراق سے ایک اور یادگار انتخاب **الیاس سیٹاپوری** کے قلم کی روانی

پس زنداں

پردیس میں مانوس چہرے اپنے دیس کی محبت دلوں میں بڑھادیے ہیں..... **طاہر جاوید مغل** کا ایک خوب صورت تحفہ اپنے قارئین کے لیے

ماروی

روپ بدلتے چہرے..... مخالف سوچوں کا تلاطم اور معصوم کرداروں کے حوصلوں سے گندمی ایک دلفریب داستان..... **محی الدین نواب** کا شاہکار سلسلہ

فروری 2014ء گلابی موسم کی سوغات

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ
سپینس ڈائجسٹ
ماہنامہ

مزید

خطوط کی محفل، محفل شعر و سخن
ملک صغیر حیات کی عرق ریزی

’کاشفِ زبیر‘ مریم کے خان، ڈاکٹر شیر شاہ سید، تنویر ریاض،
سلیم انور اور امجد رئیس کی کاوشیں صرف آپ کے لیے۔

اس کی علامت

”تب مجھے اجازت دیں... میں کل آ جاؤں گا۔“
 ”مجھے دفتر چھوڑ دینا۔“ صبا نے کہا۔
 ”یار! آؤٹ آف روٹ پڑتا ہے... خیر بیٹھو۔“
 ”میں بھی اسی طرف جا رہا ہوں۔“ محمود نے غیر ارادی طور پر کہا۔ ”مجھے وہاں کام ہے۔“
 ”یہ تو اچھا ہے۔“ قاخر خوش ہو کر بولا۔ ”محمود صاحب کے ساتھ چلی جاؤ۔“

صبا اس کی کار میں آگئی۔ ”آپ دفتر بہت کم آتے ہیں؟“
 ”ہاں جب کام ہوتا ہے، تب ہی جاتا ہوں۔“ محمود نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ ”تمہارا کزن اچھا آدمی ہے۔“
 ”میرے چچا کا بیٹا ہے۔ ایک ایسی کوری کمپنی میں جاب کر رہا ہے۔“

”گویا یہ اس کا شعبہ ہے؟“ محمود چونکا۔ ”شادی شدہ ہے؟“
 ”نہیں۔“ صبا نے کسی قدر تعجب سے جواب دیا جیسے اسے محمود سے اس سوال کی توقع نہ ہو۔
 ”بینڈ سم ہے، لڑکیاں اس کی طرف متوجہ ضرور ہوتی ہوں گی۔“

”ہاں ہوتی تو ہیں۔“ صبا نے کسی قدر بے چینی سے کہا۔ ”لیکن یہ کسی کو لفٹ نہیں کراتا۔“

”اچھا۔“ محمود نے شک سے کہا۔ ”آج کل کے نوجوان اتنے سیدھے تو نہیں ہیں، خاص طور سے صنفِ نازک کے معاملے میں۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں لیکن قاخر ایسا نہیں ہے، میں اسے جانتی ہوں۔“

محمود نے جھوٹ کہا تھا۔ اسے دفتر میں کوئی کام نہیں تھا۔ اس جھوٹ کو نبھانے کے لیے وہ اندر ایم ڈی سے مل کر واپس آ گیا۔

☆☆☆

منیر الدین زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوا۔ وہ بے پردا اور خود میں مگن رہنے والا شخص تھا۔ اس نے محمود کے لیے چائے منگوائی اور اپنے لیے جام بنایا۔ اس نے معذرت کی۔
 ”چائے میرے معدے کے لیے ٹھیک نہیں ہے۔“

”اور یہ ٹھیک ہے؟“ محمود نے گلاس کی طرف اشارہ کیا۔

”یہ... ارے یہ تو پانی ہے میرے لیے۔“
 منیر الدین کھل کر کھانے اور جینے والا شخص تھا۔ اس نے کلفٹن میں شاندار ہنگامہ بنوایا تھا اور یہ اسی کے نام پر تھا۔

”اصل میں محمود صاحب بات یہ ہے کہ میں کسی سے ڈرتا نہیں ہوں جو ہوتا ہے وہ ہوگا اس لیے ڈر ڈر کر جینے سے بہتر ہے آدمی کھل کر جیے اور اپنی مرضی کی زندگی گزارے۔“
 ”پھر آپ کو منصف کا خوف بھی نہیں ہوگا؟“

اس بار اس کے چہرے پر فکر دکھائی دی لیکن یہ بھی لمحاتی تھی۔ دوسرے لمحے وہ پھر بے فکر نظر آنے لگا۔ ”وہ بھی کیا کرے گا؟ مار دے گا... آدمی کو ایک دن مرنا تو ہوتا ہے۔“

”لیکن اتنا کما کر آدمی اچانک دنیا سے رخصت ہو جائے اور جو کمایا ہے وہ سب یہیں رہ جائے تو ملاں کی بات تو ہوگی۔“

”اوہ نہیں جی... ملاں کیسا؟ اپنے بعد اپنی اولاد کے کام آئے گا۔“

”ایسی دولت پا کر اور جب باپ سر پر نہ ہو اولاد کن راہوں پر چلتی ہے؟ آپ اس سے بے خبر تو نہیں ہوں گے۔ پھر سب آپ جتنے خوش نصیب تو نہیں ہوتے ہیں۔“

اس بار منیر الدین کچھ بے آرام ہو گیا۔ ”محمود صاحب! آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟“

”میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آپ کنفرم منصف کی ہٹ لسٹ پر ہیں۔“

اس نے بے یقینی سے دیکھا۔ ”میں کیوں؟“
 ”کیونکہ آپ اس گرجانے والے پل کی تعمیر کے ذمے دار ہیں جس کے نیچے دب کر ایک درجن لوگ مارے گئے۔“

”میں کیوں جی... ان کی تضا آئی تھی۔“

”یہ تو آپ کی سوچ ہے۔ باقیوں کی سوچ اس سے مختلف ہے اور وہ سب آپ کو قصور وار قرار دے رہے ہیں۔ بد قسمتی سے مجھے پتا چلا ہے کہ منصف میرے پروگرام کی مدد سے اپنے نشانے چن رہا ہے۔ مارے جانے والے چاروں افراد کی کرپشن میں نے بے نقاب کی تھی اور آپ کے بارے میں رپورٹ بھی میں نے دی تھی۔“

”مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“

”شاید آپ سرکار کی بات کر رہے ہیں لیکن منصف کا معاملہ مختلف ہے۔ وہ اپنے نشانے خود منتخب کرتا ہے اور خود انہیں کیفر کردار تک پہنچاتا ہے۔“

منیر الدین کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر مسکرایا۔ ”مجھے اس سے بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ بہر حال آپ کی فکر مندی کا شکریہ۔“

”تم نے بھی اس پر ہوم ورک کیا ہے؟“

”نہیں، اتفاق سے اس کا انٹرویو ہاتھ لگ گیا، اس میں اس نے اپنے بارے میں بہت کچھ بتایا ہے۔ آپ کے اپارٹمنٹ سے کچھ دور اس کی کوٹھی ہے۔“

”میں جانتا ہوں، سیاسی خاندان ہے۔ اس کے گھر کے تین چار لوگ ہمہ وقت اسمبلیوں میں ہوتے ہیں اس لیے اسے فرق نہیں پڑتا کہ ملک اور صوبے میں کس کی حکومت ہے۔ نہایت بد مزاج آدمی ہے۔“

”پتا نہیں وہ آپ سے ملنے کے لیے تیار بھی ہوتا ہے یا نہیں۔“

”میں کوشش کرتا ہوں۔“

لیکن محمود کی کوشش ناکام رہی۔ جب اس نے شفقت اللہ سے فون پر ملنے کی خواہش ظاہر کی تو اس نے جواب دیا۔ ”سائیں، آج کل میں اپنے کتوں سے مل رہا ہوں۔ آپ کو پتا ہے مجھے کتوں کا شوق ہے۔ بہت دنوں سے نہیں ملا تھا۔ ان کے بعد آپ سے بھی مل لوں گا۔“

جواب واضح تھا۔ محمود نے شکریہ ادا کر کے فون بند کر دیا۔ اس نے صبا کو بتایا تو وہ بولی۔ ”میں کوشش کرتی ہوں، مجھے امید ہے وہ مجھے انکار نہیں کرے گا۔“

”تمہیں تو کوئی انکار نہیں کر سکتا۔“ محمود نے سادگی سے کہا لیکن صبا کا رنگ سرخ ہو گیا۔ ”لیکن تم اس سے کیا کہو گی؟“

”کیا خیال ہے، کتوں کے آرٹیکل کے بہانے اس سے ملوں؟“

”خیال اچھا ہے لیکن تمہیں اس کے ڈاگ ہاؤس کا دورہ کرنا پڑے گا اور فوٹو گرافر بھی لے جانا پڑے گا۔“

”مجھے کتوں سے ڈر لگتا ہے۔“ صبا نے جھرجھری لی۔

”اور فوٹو گرافر ہے نا۔“

”فاخر تمہاری کوئی بات ٹال نہیں سکتا۔“

”ہاں۔“ صبا نے آنکھیں چرائیں۔ ”ہم بچپن سے

ساتھ ساتھ رہے ہیں اور بہت اچھے دوست ہیں۔“

”بہت اچھی دوستیاں ہی پائیدار رشتوں میں بدل جاتی ہیں۔“ محمود نے کہا اور موضوع بدل دیا۔ ”تین دن بعد کیمرے اور مائک تم کو ہی نکالنے ہیں۔ اس کے لیے سوچا ہے؟“

”ہاں، اپنا صحافتی کور استعمال کر کے پہنچ جاؤں گی

اور آپ نے ہی تو کہا ہے مجھے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔“

محمود مسکرایا۔ ”یہ سچ ہے۔“

اسے اب تک کیمرہ یا مائک لگانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ ”جیسے آپ کی مرضی۔ ویسے آپ کا مکان بہت خوب صورت ہے میں نے عالی شان بنگلے تو بے شمار دیکھے ہیں لیکن ان میں خوب صورتی سے زیادہ دولت مندی کا اظہار جھلکتا ہے۔ آپ کا بنگلا بے حد خوب صورت لگتا ہے۔“

منیر الدین خوش ہو گیا۔ ”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں اسے میری بیگم نے ڈیزائن کیا ہے۔ وہ ماہر آرکیٹیکٹ ہے۔ آئیے میں آپ کو بنگلا دکھاتا ہوں۔“

منیر الدین اسے بنگلا دکھانے لگا۔ وہ ایک ایک چیز کے بارے میں جوش و خروش سے بتا رہا تھا۔ وہ جہاں بیٹھے تھے، یہ چھوٹی نشست گاہ تھی۔ منیر الدین اندر بڑی نشست گاہ میں لایا۔ وہ اسے بتا رہا تھا کہ فلاں شوپیں اس نے کہاں سے منگوا یا تھا اور فلاں صوفہ سیٹ کس ڈیزائنر سے تیار کرایا تھا۔ اچانک اس کے موبائل نے بیل دی۔ جب اسے محمود آیا تھا، کوئی چھٹی ساتویں بار بیل بجی تھی اور ہر بار اس نے دیکھ کر کال کاٹ دی لیکن اس بار اس نے ریسیو کرنے کا فیصلہ کیا اور محمود سے معذرت کرتا ہوا باہر چلا گیا۔ یہ موقع تھا، وہ تیزی سے حرکت میں آیا۔ کیمرے کے لیے اس نے ایک کونے میں رکھے گوریلے کے لائف سائز مجسمے کا انتخاب کیا۔ کیمرہ اس کے کھلے منہ میں آسانی سے فٹ ہو گیا اور مائک ایک صوفے کے عقب میں دیوار سے چپکا دیا۔ جیسے ہی اس نے کام نمٹایا، منیر الدین آگیا۔

”سوری محمود صاحب! میں آپ کو مزید وقت دیتا لیکن مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔“

”کوئی بات نہیں، آپ نے پہلے ہی مجھے خاصا وقت دیا ہے۔“ محمود نے کہا اور باہر آگیا۔ اس بار فاخر کو مائک کا ریسیور چھپانے میں خاصی کوشش کرنا پڑی تھی۔ اس نے کوٹھی کی دیوار پر ریسیور لگا دیا۔ اس پر خاردار تاریں لگی تھیں اس لیے کسی کے چڑھ کر دیکھ لینے کی امید نہیں تھی۔ خطرہ فاخر کو تھا کہ ریسیور لگاتے ہوئے کوئی اسے نہ دیکھ لے۔ فاخر کی گاڑی میں مسئلہ تھا اس لیے وہ یہاں تک محمود کے ساتھ آئے تھے اور اب اسی کے ساتھ واپس جا رہے تھے۔

”یہ بھی نمٹ گیا۔“ محمود نے کہا۔ ”اب صرف

شفقت اللہ رہ گیا ہے۔“

”وہ خطرناک ہے۔“ صبا نے خبردار کیا۔ ”اس کا

تعلق ایک وڈیرا خاندان سے ہے اور یہاں بھی وہ وڈیروں

کے انداز میں رہتا ہے۔“

صبا نے شفقت اللہ سے بات کی اور وہ راضی ہو گیا۔ ایک تو صبا لڑکی تھی اور عورتوں کے بارے میں وہ مخصوص ذہنیت رکھتا تھا۔ دوسرے صبا نے کتوں کے حوالے سے بات کی تھی اس لیے وہ دل و جان سے راضی ہو گیا۔ صبا اور فاخر اس کی کوٹھی پہنچے اور دو گھنٹے وہاں رہے۔ اس دوران میں انہیں کیمرا اور مائیک چھپانے کا موقع آرام سے مل گیا۔ کوٹھی بہت بڑی تھی اس لیے فاخر نے ریسور بھی اندر ہی چھپا دیا۔ باہر ممکن تھا وہ مائیک کو کچھ نہ کر پاتا۔ مشن جاسوسی مکمل ہو گیا تھا۔ اب انہیں اس کا نتیجہ چیک کرنا تھا۔ اس کے بعد وہ منصف کو بے نقاب کرنے کی طرف پیش رفت کر سکتے تھے۔

☆☆☆

شام محمود کا پروگرام تھا اس لیے صبا اور فاخر ڈاکٹر راشد کے گھر سے کیمرا اور مائیک و ریسور نکال کر سیدھے محمود کے گھر پہنچے۔ وہ بارہ بجے آگئے تھے اس لیے ان کے پاس چار گھنٹے تھے۔ فاخر اپنا چھوٹا سالیپ ٹاپ ساتھ لایا تھا، یہ اسی کام کے لیے مخصوص تھا۔ اس نے وائس ریکارڈنگ اور کیمرے کی ویڈیو لیب ٹاپ میں منتقل کر کے انہیں کچھ مخصوص سافٹ ویئر کی مدد سے ریفرنس کیا اور پھر پہلے وائس ریکارڈنگ چلائی۔ ”اس کا مخصوص پلیئر درمیان میں سنانے والی جگہوں کو نظر انداز کر کے صرف وہ حصے سنانے گا جس میں کوئی آواز ریکارڈ ہوئی ہو۔“ فاخر نے بتایا۔

”یہ اچھا ہے ورنہ تین دن کی ریکارڈنگ بہت طویل ہوتی۔“ محمود نے اطمینان کا سانس لیا۔ لیکن ریکارڈ شدہ آوازوں کا دورانیہ بھی کم نہیں تھا۔ یہ تقریباً تین گھنٹے پر مشتمل تھیں اور ان میں کام کی صرف ایک چیز نکلی تھی اور وہ ڈاکٹر راشد کی کسی شخص سے موبائل پر کی جانے والی گفتگو تھی۔ اس کا آغاز موبائل کی گھنٹی سے ہوا اور ڈاکٹر راشد نے کال ریسپونڈ کی۔

”ہیلو کون ہے... تم... اب تم کیا چاہتے ہو... میں تمہیں پہلے ہی ایک کروڑ دے چکا ہوں... تم فراڈ ہو... اس طرح میری جان کبھی نہیں چھوڑو گے... میں اب ایک پیسا نہیں دے سکتا... میں پہلے ہی مشکل میں پھنسا ہوں... میرے خلاف اٹکواڑی چل رہی ہے... وہ بھی آیا تھا... میں محمود ایاز کی بات کر رہا ہوں... اسی نے مجھے مروایا ہے... تم نے اسی کے پروگرام سے اپنے نشانے چنے ہیں... ہاں وہ بھی یہی خبردار کرنے آیا تھا... میں بتا چکا ہوں میں نہیں دے سکتا... دیکھو دھمکیاں مت دو۔“

ڈاکٹر راشد کے لہجے میں گھبراہٹ نمودار ہوئی۔ ”میں کیا کروں؟ کہاں سے لاؤں...“ وہ کہتے ہوئے چیخ اٹھا اور آواز رونے والی ہو گئی۔ ”پہلے تم نے ایک کروڑ مانگا اور اب دو کروڑ... اچھا... اچھا... میں کوشش کرتا ہوں... دو دن میں نہیں ہو سکتے... ہیلو، میری بات سنو... میری بات سنو...“ شاید کال کٹ گئی تھی اور ڈاکٹر راشد اضطراب کے عالم میں مادر پدر آزاد گالیاں دینے لگا تھا۔ صبا جھینپ گئی اور فاخر نے ریکارڈنگ کا یہ حصہ ذرا آگے کیا۔ لیکن محمود نے اسے روک دیا اور پھر ہیڈ فون لگا کر یہ حصہ بھی سنا مگر اس حصے میں گالیاں ہی تھیں۔ باقی ریکارڈنگ بھی کام کی نہیں تھی۔

”کچھ اندازہ ہے کہ یہ کس وقت کی ریکارڈنگ ہے؟“ فاخر نے پلیئر پر وقت دیکھا اور بولا۔ ”اندازاً کل رات ایک بجے کی۔“

”یعنی اب سے کوئی تیرہ گھنٹے پہلے۔“ محمود نے۔۔۔ بڑخیال انداز میں کہا۔ ”یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ منصف ایک بلیک میلر ہے۔ اس نے پہلے چار افراد کو قتل کیا اور اب باقی لوگوں سے رقم وصول کر رہا ہے۔“

”اس نے ڈاکٹر کو دو دن کی مہلت دی ہے۔ اگر ڈاکٹر نے اسے رقم نہیں دی تو وہ اسے مار دے گا۔“ صبا کی بات پر محمود کو ایک خیال آیا۔ ”شاید وہ اسے مارنا ہی چاہ رہا ہے۔“ ”کیا مطلب؟“

”اگر وہ دو کروڑ روپے دے گا تو منصف اگلی بار چار کروڑ مانگے گا اور اس سے اگلی بار آٹھ کروڑ... سوال یہ ہے کہ وہ کب تک دے گا؟“

”ایک دو بار اور...“ صبا نے جواب دیا۔ ”اس کے بعد وہ انکار کرے گا اور منصف اسے بھی قتل کر کے اگلوں کے لیے نمونہ عبرت بنا دے گا۔“ ”بالکل۔“ صبا پُر جوش ہو گئی۔ ”یہ تو آم کے آم اور مٹھلیوں کے دام ہوں گے۔“

”ہر قتل بلیک میل ہونے والوں پر دباؤ بڑھائے گا۔ مجھے یقین ہے باقی افراد بھی اسے رقم دے چکے ہوں گے اسی لیے اب تک زندہ ہیں۔“ ”اب منصف تک پہنچنا اور ضروری ہو گیا ہے۔ وہ تو قاتل ثابت ہوا ہے۔“

”ہم اسے خالص قاتل بھی نہیں کہہ سکتے۔ ہو سکتا ہے وہ اس طرح سے ایسے لوگوں کو ڈہری سزا دے رہا ہو۔ پہلے وہ ان سے رقم وصول کرے گا اور جب انہیں قتل کرے گا تو

بچانا ہے اور میں دوبارہ اسی لیے تمہارے پاس آیا ہوں۔
میں منصف کو بے نقاب کر کے قانون کے حوالے کرنا چاہتا
ہوں اور تم میری مدد کرو گے۔“
”میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ اس نے
مجھے ہمیشہ نئے نمبر سے کال کی۔“
”مجھے وہ نمبر درکار ہیں۔“

”نہیں۔“ اس کا چہرہ مزید زرد پڑ گیا۔ ”وہ بہت
خطرناک آدمی ہے۔ مجھے اس کو دو کروڑ روپے دینے
ہوں گے۔“

”تم بے وقوف بن رہے ہو۔ تم دو کروڑ دو گے تو اگلی
بار وہ چار کروڑ کا مطالبہ کرے گا۔ اس سے اگلی بار آٹھ کروڑ
کا۔ تم کب تک دو گے؟ جب انکار کرو گے، وہ تمہیں بھی
نمونہ عبرت بنادے گا۔ وہ تم لوگوں کی صحیح سزا ہے۔ تم سے
دولت بھی حاصل کر رہا ہے اور جب دولت نہیں دو گے تو
جان لے لے گا۔“

”تم لوگوں؟“ ڈاکٹر راشد چونکا۔ ”اور لوگ بھی ہیں؟“
”دیکھا جائے تو منصف کے لیے شکار کی کوئی کمی
نہیں ہے۔ یہاں جو جتنے بڑے عہدے پر ہے، اتنا
زیادہ بدعنوان ہے۔ لاکھوں عہدے دار ہیں اور لاکھوں
ہی بدعنوان ہیں۔ میں چند ایک کو جانتا ہوں، کچھ کے
بارے میں شبہ ہے لیکن بہت بڑی تعداد ایسی ہے جن
سے میں لاعلم ہوں۔“
”میں نمبر نہیں دے سکتا۔“

”اس صورت میں یہ ویڈیو نامعلوم شخص کی طرف
سے کسی ٹی وی چینل کو بھیج دی جائے گی۔“
”نہیں، تم ایسا نہیں کر سکتے۔“ ڈاکٹر کا چہرہ مزید زرد
پڑ گیا۔

”میں ایسا ہی کروں گا۔“ محمود بولا۔ ”تمہارے
پاس ایک منٹ ہے فیصلہ کرنے کے لیے۔“
”سنو، تم اس کا پتا چلانے کی کوشش کرو گے اور وہ
جان جائے گا کہ میں نے اس کے بارے میں بتایا ہے پھر وہ
مجھے نہیں چھوڑے گا۔“ ڈاکٹر راشد ہانپنے لگا۔
”اگر یہ ویڈیو چینل پر آئی تب بھی وہ تمہیں نہیں
چھوڑے گا۔ وہ اسے بھی تمہاری حرکت سمجھے گا۔“

”یعنی ہر طرح سے میں پھنس رہا ہوں۔“ ڈاکٹر نے
اپنے رہے سہے بال منہ میں جکڑ لیے۔
”نہیں، اگر تم مجھے نمبر دو گے تو منصف کا شک مشکل
سے تم پر جائے گا کیونکہ وہ انہی نمبروں سے دوسروں کو بھی

یقیناً انہیں زیادہ اذیت ہوگی۔“

صبا نے یقین سے کہا۔ ”آپ لکھ کر رکھ لیں، وہ
بہت خطرناک مجرم ذہن کا مالک ہے۔ اس نے یہ سب
ایک پلان کے تحت کیا ہے۔ معاشرے کا سدھار بھی اس
کا مقصد نہیں رہا۔“
”دیکھتے ہیں۔“ محمود نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ”ابھی
تو آغاز ہے۔“

انہوں نے ویڈیو دیکھی۔ اس کا بھی مخصوص پلیئر تھا
جو عام ویڈیو کو تیزی سے آگے کر کے صرف وہ حصہ دکھا رہا
تھا جس میں کیمرے کے آگے کوئی چیز حرکت کر رہی تھی۔
ویڈیو میں کام کی کوئی چیز نہیں تھی سوائے اس حصے کے
جب ڈاکٹر راشد منصف سے بات کر رہا تھا۔ فاخر نے
کہا۔ ”میں آڈیو اور ویڈیو میں سے دونوں حصے الگ
کر کے انہیں ایک کر دوں گا۔“

”پہلی فرصت میں ایسا کر لو، یہ کام کی چیز ہے۔“ محمود
نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”ہمیں مہلت ختم ہونے سے پہلے
منصف تک پہنچنا ہے ورنہ وہ اسے قتل کر دے گا۔“
”لیکن ہم کیسے پہنچ سکتے ہیں؟“

”ڈاکٹر ہماری راہنمائی کرے گا۔“
”آپ کوشش کر لیں۔“ صبا نے کہا۔ ”لیکن مجھے
امید نہیں ہے کہ اس جیسے شاطر آدمی نے کسی کو خود تک پہنچنے کا
ذرا بھی راستہ دیا ہوگا۔ وہ ایسے رابطہ کرتا ہوگا کہ اسے پکڑا
نہ جا سکے۔“

محمود بھی یہی محسوس کر رہا تھا لیکن اس کے خیال میں
کوشش کرنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ کام مکمل ہو گیا تھا اور
اس کے اسٹوڈیو جانے کا وقت ہو رہا تھا اس لیے صبا اور فاخر
بھی رخصت ہو گئے۔ فاخر نے کہا تھا کہ وہ آڈیو ویڈیو حصے ملا
کری ڈی میں کر کے اسے اسٹوڈیو دے جائے گا۔ محمود نے
اس سے جلد یہ کام کرنے کو کہا تھا۔ اسے حیرت ہوتی کہ فاخر
کو جب بلاؤ، آنے کو تیار ہو جاتا ہے اور جو کہو وہ کرنے کو تیار
ہو جاتا ہے۔ یہ سب وہ یقیناً صبا کی وجہ سے کر رہا تھا۔ ایک
سوال محمود کے ذہن میں اور تھا کہ وہ جب ہر وقت ان کے
لیے دستیاب ہوتا ہے تو دفتر کب جاتا ہے؟

☆☆☆

جب ریکارڈنگ ختم ہوئی تو ڈاکٹر راشد کا سیاہی مائل
پر گوشت چہرہ پسینے میں ڈوب گیا۔ اس نے پھنسی پھنسی آواز
میں کہا۔ ”دھوکا... تم نے دھوکا دیا۔ کیمرا تم نے لگا یا تھا۔“
”ہاں لیکن میرا مقصد تمہیں نقصان پہنچانا نہیں بلکہ

کال کرتا ہوگا۔ صرف تم پر شک نہیں کیا جاسکتا۔“
ڈاکٹر نے غور کیا۔ ”لیکن اس کا کیا ثبوت ہے کہ وہ دوسروں کو بھی کال کرتا ہے؟“

”تمہارا کیا خیال ہے، وہ سچ مچ معاشرہ سدھارتا چاہتا ہے؟ نہیں! وہ اس طرح سے دولت کمار ہا ہے۔“

بالآخر ڈاکٹر راشد منصف کے نمبرز دینے کو تیار ہو گیا۔ یہ چار نمبرز تھے اور چاروں مختلف موبائل کمپنیوں کے تھے۔ اس نے پندرہ دن پہلے منصف کو ایک کروڑ روپے دیے تھے۔ یہ رقم اس نے پانچ ہزار کے نوٹوں کی بیس گڈیوں کی صورت میں دیے تھے۔ گڈیاں ایک اخبار میں لپیٹ کر ان کا بنڈل بنایا تھا اور اس بنڈل کو شیپ اور ڈوری سے مضبوط کیا تھا۔ بنڈل اس نے سفاری پارک کے بتائے ہوئے ڈسٹ بن میں ڈال دیا تھا۔ پہلے اسے سفاری پارک آنے کو کہا گیا، وہاں وہ رقم لے کر ایک کھنڈہ پھلتا رہا اور پھر منصف نے اسے کال کر کے بنڈل ڈسٹ بن میں ڈالنے کو کہا۔ اس نے حکم دیا تھا کہ وہ بنڈل ڈالتے ہی وہاں سے روانہ ہو جائے۔ ڈاکٹر نے اس کی ہدایات پر عمل کیا۔

”تم نے کیسے یقین کیا کہ وہی منصف تھا؟“
”اس کا لہجہ... بالکل وہی لہجہ تھا جوٹی وی پر دکھائی ویڈیوز میں تھا۔“

”وہ منصف ہی ہوگا کیونکہ اس نے یہ سارا کھیل اسی لیے شروع کیا ہے۔ مگر تم سے دو کروڑ کے مطالبے سے واضح ہو گیا ہے کہ وہ تم لوگوں کو معاف نہیں کرے گا۔ اب تمہاری عافیت اسی میں ہے کہ مجھ سے تعاون کرتے رہو۔“
”تم نے مجھے پریشان کر دیا ہے۔“ ڈاکٹر راشد بولا۔ ”اسے دو کروڑ دینے سے بہتر ہے میں یہاں سے چلا جاؤں۔“

”کہاں جاؤ گے؟ ملک میں کسی جگہ تم اس سے محفوظ نہیں ہو گے اور ملک سے باہر تم جان نہیں سکتے۔“
”میں روپوش تو ہو سکتا ہوں۔“

”تم بھول رہے ہو، تمہارے بیوی بچے اور پورا خاندان ہے۔ کیا تم سب کو لے کر روپوش ہو جاؤ گے؟“
”ہاں، بیوی بچوں کو لے کر روپوش ہو سکتا ہوں۔“
ڈاکٹر نے جواب دیا۔ باقیوں کی اسے پروا نہیں تھی۔

”تب تم ایسا ہی کرو۔“ محمود نے لیپ ٹاپ سے سی ڈی نکالی اور کھڑا ہو گیا۔ ”اگر وہ جلد پکڑا گیا تو تم جلد واپس آ سکو گے لیکن اگر وہ نہ پکڑا گیا تو...“ محمود نے جان بوجھ کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ ڈاکٹر راشد کے تاثرات بتا رہے تھے

کہ اسے اندر سے ہول اٹھ رہے تھے۔ وہ اسٹوڈیو سے سیدھا ڈاکٹر کے پاس آیا تھا۔ اس کے خیال میں وقت کم رہ گیا تھا۔ اگر وہ ایک دن کی تاخیر سے ملتا تو شاید ڈاکٹر مارا جاتا یا پھر غائب ہو جاتا... اور بعد کے واقعات نے ثابت کیا کہ وہ بروقت اس سے ملا تھا۔

☆☆☆

منیر الدین بھی منصف کے ہاتھوں بلیک میل ہو رہا تھا لیکن شفقت اللہ کے گھر مانگ اور کسرا لگانے کا فائدہ نہیں ہوا تھا یعنی ایسی کوئی ریکارڈنگ حاصل نہیں ہوئی تھی جس سے وہ فائدہ اٹھا سکتے۔ اس کے باوجود محمود اور صبا کو یقین تھا کہ وہ منصف کے ہاتھوں بلیک میل ہو رہا ہے۔ تینوں افراد نے ادائیگیاں کی تھیں۔ ان کے علاوہ بھی دوسرے ہوں گے۔ وہ حیران تھے کہ منصف نے یہ چکر چلا کر کتنی دولت سمیٹ لی ہوگی۔ دوسرے دن پروگرام کے بعد وہ منیر الدین کے گھر پہنچ گیا۔ اس کی بیوی بچوں سمیت میکے گئی ہوئی تھی اس لیے وہ گھر میں کھل کھلا کر پی رہا تھا، وہ اس وقت بھی بوتل لیے بیٹھا تھا لیکن جب محمود نے اسے اس کی کال کی ریکارڈنگ سنوائی (یہ منظر کمرے میں نہیں آ سکتا تھا) تو اس کا نشہ ہرن ہو گیا۔

”یہ... یہ تم تک کیسے پہنچی؟“ پھر خود بات سمجھ میں آئی تو وہ مشتعل ہو گیا۔ ”تم میری جاسوسی کر رہے تھے؟“
”ہاں، منصف تک پہنچنے کا یہی ایک طریقہ سمجھ میں آیا کہ اس کے شکاروں کی جاسوسی کی جائے۔“ محمود نے اعتراف کیا۔ ”کیا تم اسے دو کروڑ روپے دو گے؟“
اس پر منیر الدین نے نہایت واہیات بات کی۔
”میں اسے... دوں گا۔“

”اس صورت میں تم مارے جاؤ گے۔“
”میں اس کا کھیل سمجھ گیا ہوں۔ وہ مطالبے پر مطالبے کرتا جائے گا اور جہاں میں نے انکار کیا، وہ مجھے قتل کر دے گا۔“ منیر الدین نے کہا تو محمود اس کی ذہانت کا قائل ہو گیا۔

”تم نے ٹھیک کہا۔ میں بھی اسی نتیجے پر پہنچا ہوں۔ وہ بہت چالاک آدمی ہے۔ اس نے پہلے مجھے استعمال کیا۔ اپنے شکار میری مدد سے منتخب کیے اور پھر جو باقی بچے ان سے وہ مال کما رہا ہے لیکن میں تم سے متفق ہوں۔ وہ چھوڑے گا کسی کو نہیں۔ یہ ایک تیر سے دو شکار والی بات ہے۔ وہ جہاں تک ممکن ہوا اپنے شکار کو نچوڑے گا اور پھر اسے ٹھکانے لگا دے گا۔“

ہو جاتی ہیں، جب تک کوئی خاص وجہ نہ ہو جیسے غربت، آگے تعلیم یا مناسب رشتہ نہ ملنا۔۔۔ لڑکی گھر نہیں بیٹھی رہتی ہے۔ میرا خیال ہے تمہارے ساتھ ان تینوں میں کوئی مسئلہ نہیں ہے پھر شادی نہ ہونے کی وجہ؟“

صبا نے گہری سانس لی۔ اس نے کچھ دیر بعد کہا۔
”میری نسبت طے ہے۔“

”فاخر سے؟“ محمود نے بے ساختہ پوچھا۔

صباحیران ہوئی۔ ”آپ کو کیسے پتا چلا؟“

”بس چل گیا۔“ محمود نے آہستہ سے کہا۔ ”فاخر کی

وجہ سے دیر ہو رہی ہے؟“

”ہاں... اس کی خواہش ہے پہلے وہ ایک گھر لے،

ذاتی گھر... بے شک چھوٹا سا ہو پھر مجھے لے جائے۔“

کہتے ہوئے صبا کے لہجے میں خواب سا آ گیا۔ ”وہ اس کے

لیے کوشش اور محنت کر رہا ہے۔ اس کی ڈیوٹی آٹھ گھنٹے کی

ہوتی ہے لیکن وہ اس کے علاوہ بھی کام کرتا ہے۔“

”لیکن تم جب اسے بلاتی ہو، وہ آ جاتا ہے۔“

”ہاں، اس کا کام زیادہ تر آؤٹ ڈور ہے اس لیے

وہ میرے لیے سینک کر لیتا ہے۔“ کہتے ہوئے صبا

شرمائی۔ ”وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔“

”اور تم؟“

”ظاہر ہے میں بھی۔“ صبا نے کہا اور ہاتھ روک لیا۔

”اور لو۔“

”نہیں، بہت کھا لیا ہے۔ آج رات کھانے کی چھٹی

کرنا پڑے گی اور ماما سے ڈانٹ پڑے گی۔ ان کا خیال

ہے کہ میں اتنا نہیں کھاتی جتنا کھانا چاہیے۔“

”ماما کا خیال ٹھیک ہے۔“ محمود نے سر ہلایا۔

”تمہاری صحت ٹھیک ہے لیکن تم کمزور ہو۔ تمہیں اس کا

خیال رکھنا چاہیے۔“

مزید کام نہیں تھا اس لیے وہ لاونج میں آ گئے۔ معصوم

قبوہ لے آیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ عربی پرائیویٹ کے بعد عربی

قبوہ پینا چاہیے، یہ اس سے ہضم ہو جاتا ہے۔ صبا نے موضوع

بدل دیا اور دوبارہ منصف پر آ گئی۔ ”آپ نے کوئی لائن

سوچی جس پر چل کر اس تک پہنچا جاسکے؟“

”ایک طریقہ تو یہ ہے کہ ہم ان تین میں سے کسی کی

مدد حاصل کریں اور اس کی مدد سے منصف کو ٹریپ کریں۔

لیکن یہ کام اب مشکل ہے۔ اول تو وہ راضی نہیں ہوں گے

اور میرا اندازہ ہے کہ منصف اس بار پہلے کی طرح رقم حاصل

نہیں کرے گا۔ وہ کوئی ایسا طریقہ اختیار کرے گا جس سے

”میں اسے اتنی آسانی سے کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔“ منیر الدین نے اسے گھورا۔ ”مجھے تو تم بھی اس کے ایجنٹ لگتے ہو۔“

”اگر ایسا ہوتا تو میں تمہارے سامنے نہ آتا۔

میں وہ فون نمبر نہ چاہتا ہوں جن سے منصف تمہیں کال

کرتا رہا ہے۔“

منیر الدین نے کسی قدر مزاحمت کی اور نمبرز دے

دیے۔ اس نے بھی ایک کروڑ روپے ادا کیے تھے اور طریقہ

کاروبار ہی تھا جو ڈاکٹر راشد کے ساتھ تھا۔ فرق صرف اتنا تھا

کہ اسے ایک نجی تفریحی پارک میں بلایا گیا تھا۔ منیر الدین

سے ملاقات کے اگلے دن صبا اور فاخر دوبارہ شفقت اللہ

کے گھر گئے۔ بہانہ کچھ رہ جانے والے کتوں کی دوبارہ

تصاویر لینا تھا۔ انہوں نے وہاں سے کیرا اور مائیک نکال لیا مگر

اس سے کچھ ملا نہیں۔ صبا نے کہا۔ ”اب اس سے کوئی فرق

نہیں پڑتا۔ منصف کی اصلیت سامنے آگئی ہے۔ وہ

بدعنوانوں کو سزا دینے کے بہانے ان سے دولت حاصل کر

رہا ہے۔“

محمود نے سر ہلایا۔ ”یہاں سے اصل مرحلہ شروع ہوتا

ہے، یعنی اس کی تلاش کا۔ اس کی پلاننگ کا اندازہ اس بات

سے کیا جاسکتا ہے کہ اس نے ایک مخصوص لہجہ اپنایا جس کی

کالی کرنا مشکل ہے اور جب اس نے اسی لہجے میں لوگوں کو

کال کی تو انہیں فوراً یقین آ گیا کہ وہ منصف ہی ہے اور

انہوں نے بے چون و چرا کیے اس کا مطالبہ پورا کر دیا۔“

”آپ کو اب تک یاد نہیں آیا کہ اس لہجے کا حامل

شخص کون ہو سکتا ہے؟“

فاخر کو دفتر جانا تھا اس لیے وہ اپنا کام کر کے روانہ ہو

گیا البتہ صبارک گئی تھی۔ لٹچ کا وقت تھا۔ محمود نے معصوم سے

کچھ تیار کرنے کو کہا۔ صبا نے باقاعدہ کھانے سے انکار کر

دیا۔ ”میں بھی دوپہر میں ہلکا پھلکا لیتی ہوں۔“

معصوم نے عربی پرائیویٹ اور اس کے ساتھ خاص

چینی بنائی تھی۔ صبا کو پسند آئی۔ کھانے کی میز پر موضوع

بدل گیا۔ محمود صبا سے اس کے بارے میں پوچھتا رہا اور

وہ بتاتی رہی۔ آج محمود نے بھی بد پرہیزی کر لی تھی اور وہ

اس کے ساتھ لٹچ میں شریک تھا۔ ”ایک سوال کروں...“

اگر تم فیل نہ کرو؟“

صبا نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ ”آپ کو کسی سوال

کے لیے مجھ سے پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”تمہاری عمر تک کی لڑکیاں عام طور سے شادی شدہ

وہ خود نہ پکڑا جاسکے۔“

”اگر یہ معاملہ آئی بی کے حوالے کر دیا جائے؟“

محمود نے نفی میں سر ہلایا۔ ”ہم نے اپنے مقصد کے لیے ان کی جاسوسی کی ہے۔ ہم انہیں اس طرح استعمال نہیں کر سکتے۔ یہ پیشہ ورانہ اخلاقیات کے خلاف ہوگا۔ دوسرے آئی بی والے جب اپنا کام شروع کریں گے تو منصف ہوشیار ہو سکتا ہے اور وہ محدود ہو جائے گا۔ یوں سمجھ لو چو ہائل میں گھس جائے گا جہاں سے اسے نکالنا دشوار ہوگا۔“

”پھر ہمیں کریڈٹ نہیں ملے گا۔“ صبا نے اپنی تجویز خود مسترد کر دی۔

محمود مسکرایا۔ ”یہ بھی ایک نکتہ ہے۔ اتنی محنت ہم کر رہے ہیں اور فائدہ سرکار کے حوالے کر دیں۔ اصل میں تو یہ پروجیکٹ تمہارا ہے۔“

”لیکن اب تک جو پروگریس ہوئی ہے، اس میں آپ شامل ہیں۔“ صبا نے سنجیدگی سے کہا اور کھڑی ہو گئی۔ ”اب میں چلتی ہوں۔“

”پھر کب آؤ گی؟“ محمود نے پوچھا۔ صبا نے اس کی طرف دیکھا تو وہ ذرا گڑبڑایا۔ ”میرا مطلب ہے کام کے سلسلے میں؟“

”ابھی میں کچھ غور کروں گی اور کوئی واضح پلان ذہن میں آیا تو آپ سے رابطہ کروں گی۔“

اس کے جانے کے بعد محمود کو لگا جیسے اس کا گھر اچانک خالی ہو گیا ہو۔ جب صبا نے اپنی منگنی... کا بتایا تب اس نے کچھ خاص محسوس نہیں کیا۔ کیونکہ وہ پہلے ہی صبا اور فاخر کی آپس میں پسندیدگی بھانپ چکا تھا لیکن اب اسے لگ رہا تھا جیسے اس کا بہت بڑا ذاتی نقصان ہو گیا ہو۔

☆☆☆

ڈاکٹر راشد اپنے بیوی بچوں کے ساتھ اس خوب صورت ساحلی کینج میں تھا۔ یہ اس کی رہائش گاہ سے چند میل کے فاصلے پر تھا لیکن اس کے بارے میں کسی کو نہیں معلوم تھا، سوائے اس کے اہل خانہ کے۔ بیوی بچے حیران تھے کہ وہ اچانک گھر چھوڑ کر انہیں یہاں کیوں لے آیا۔ اس کے دونوں جوان بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ بیٹے ارشد اور مرشد اٹھارہ اور سولہ سال کے تھے جبکہ بیٹی ریبا چودہ سال کی تھی۔ وہ لوگ حیران تھے اور بار بار پوچھ رہے تھے کہ وہ یہاں کیوں آیا ہے؟ ڈاکٹر نے ان کے سوالوں کا جواب مبہم انداز میں دیا۔ وہ اپنے ساتھ گزارے کے لیے ڈھیر سا سامان بھی لایا تھا تاہم کسی چیز کے لیے باہر نہ جانا پڑے۔ کینج

پوری طرح فرنش تھا اور وہاں بجلی اور گیس سمیت تمام سہولیات تھیں۔ ڈش ٹی وی سسٹم لگا ہوا تھا۔ کمپیوٹر اور... انٹرنیٹ کی سہولت تھی۔ یہاں موبائل کے سگنل بھی تھے اس لیے اسے امید تھی کہ اس کے بیوی بچے بور نہیں ہوں گے لیکن اس نے سب کو سختی سے منع کر دیا تھا کہ اس جگہ کے بارے میں کسی کو ہرگز نہ بتائیں اور اگر کسی سے رابطہ ہو تو یہی کہیں کہ وہ شہر سے باہر ہیں۔

جس وقت وہ اپنے بچوں کو منع کر رہا تھا عین اسی وقت اس کی بیٹی ریبا اپنی ایک فیس بک فرینڈ سے بات کر رہی تھی۔ یہ لڑکی کچھ عرصے پہلے اس کی دوست بنی تھی۔ وہ ریبا سے پوچھ رہی تھی کہ وہ کہاں ہے۔ ریبا اسے بتا رہی تھی کہ وہ گھر پر نہیں ہیں بلکہ اس کے پاپا سب گھروالوں کو ساحلی کینج میں لے آئے ہیں۔ ریبا کی دوست نے پوچھا کہ کینج کہاں ہے۔ کسی قدر ہچکچاہٹ کے ساتھ ریبا نے اسے لوکیشن بتا دی۔ ریبا اس سے کبھی نہیں ملی تھی، بس فیس بک پر ملاقات ہوتی تھی اس لیے اس کے خیال میں اسے بتا دینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ ڈاکٹر راشد کو انجانا کی تکلیف تھی۔ اسے رات کھانے سے پہلے لازمی واک کا کہا گیا تھا اس لیے وہ باہر نکل آیا۔ ساحل کچھ دور تھا۔ وہ ٹہلتا ہوا ساحل کی طرف آیا۔ بیوی بچے کینج میں ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ اس نے سوچا کہ جب تک منصف کا چکر ختم نہیں ہوتا، وہ منظر عام پر نہیں آئے گا اور اگر یہ خطرہ بڑھا تو وہ بیوی بچوں کے ساتھ دہلی چلا جائے گا۔ اس کی فیملی کے پاس امارات کا رہائشی ویزا تھا۔ وہ سوچوں میں گم تھا کہ کسی نے اسے پاس سے آواز دی۔ وہ بھڑک اٹھا تھا کچھ دور ایک شخص کھڑا تھا۔ تاریکی کی وجہ سے اس کے خدو خال واضح نہیں تھے۔

”کون... کون ہو تم؟“

”منصف۔“ اس نے مخصوص لہجے میں کہا تو ڈاکٹر کے منہ سے چیخ نکل گئی اور وہ کینج کی طرف بھاگا لیکن اسے چند قدم سے زیادہ اٹھانے کا موقع نہیں ملا۔ عقب سے قاتر ہوا اور گولی اس کی پشت میں اتر گئی۔ کینج کی ٹی وی کی تیز آواز میں کسی کو پتا نہیں چلا۔

☆☆☆

صبح ناشتے کے بعد محمود ٹی وی کے سامنے آیا۔ اس نے جو پہلا نیوز چینل لگایا، اس پر ڈاکٹر راشد کے قتل کی خبر آرہی تھی۔ اس کی لاش اٹھا کر ایسوی۔ایف میں رکھی جا رہی تھی۔ ایک منظر میں اس کی بیوی، بچے رو رہے تھے۔ محمود نے ٹی وی دیکھتے ہوئے صبا کا نمبر ملایا۔ اس نے کال ملے

محمود نے کہا۔ ”آپ محدود ہو جائیں... میرا خیال ہے منصف آپ لوگوں کی نگرانی کر رہا ہے، اسی وجہ سے وہ ڈاکٹر راشد تک پہنچنے میں کامیاب ہوا۔“

”یعنی فرار بھی مسئلے کا حل نہیں ہے؟“

”میرا خیال ہے، نہیں۔“ محمود نے جواب دیا اور کال کاٹ دی۔ وہ خبر دیکھتا رہا پھر اسٹڈی میں آیا اور منصف سے متعلق مواد نکال کر دیکھتا رہا، کئی بار اس کی ویڈیوز دیکھیں۔ مووی میں ایک نقاب پوش شخص تھا۔ اس نے سادہ سفید اور گرے لائنوں والی پوری آستین کی شرٹ پہنی ہوئی تھی اور ویڈیو میں اس کے جسم کا کوئی حصہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ محمود نے دوپہر میں دوبارہ صبا کو کال کی۔ ”مجھے لگ رہا ہے کہ اس شخص کا میرے ماضی سے کوئی تعلق رہا ہے۔ میں نے بہت غور کیا لیکن مجھے اپنی حالیہ زندگی میں ایسا کوئی شخص یاد نہیں جس کا ایسا لہجہ ہو۔“

”ماضی سے کیا مراد ہے؟“

”شاید زمانہ طالب علمی... کیونکہ اسی وقت انسان سب سے زیادہ لوگوں سے ملتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں ایک بار پھر پروفیسر سے ملنا ہوگا۔ تم چلنا چاہتی ہو تو میں تمہیں چینل سے پک کر لوں گا۔“

”میں چار بجے تک فارغ ہو جاؤں گی۔“

”میں پروفیسر سے وقت لے کر تمہیں بتاتا ہوں۔“

☆☆☆

وہ یونیورسٹی پہنچے تو پروفیسر ابھی گھر نہیں پہنچا تھا۔ وہ وہیں برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئے۔ صبا نے آس پاس دیکھا۔ ”یہاں ماحول کتنا پرسکون ہے، دل چاہتا ہے آدمی گھر لے کر یہیں رہ جائے۔“

”ہاں، یہ تو ہے۔“ محمود نے ارد گرد دیکھا۔ یہاں بے شمار تناور درخت تھے اور زمین پر بے شمار خشک پتے بکھرے ہوئے تھے۔ مکان کے چاروں طرف کیاری تھی لیکن اس میں لگے پودے کب کے خشک ہو چکے تھے۔ پروفیسر کو باغبانی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ چند منٹ بعد پروفیسر کی کار نمودار ہوئی اور وہ بڑی مشکل سے کار سے نکلا اور اسٹک کا سہارا لیتا ہوا ان کی طرف آیا۔ ان سے علیک سلیک کے بعد اس نے کہا۔

”کم بخت ذرا سی ڈرائیونگ سے یہ ٹانگ اکڑ جاتی ہے۔“

”میں پھر زحمت دینے پر معذرت خواہ ہوں۔“

”نو نو... تم میرے پسندیدہ افراد میں سے ایک

ہی کہا۔“ آپ نے خبر دیکھ لی؟“

”ہاں، ابھی دیکھی ہے اور تمہیں کال کی ہے۔“

”منصف توقع سے زیادہ خطرناک ثابت ہو رہا

ہے۔ اب تو مجھے خوف آ رہا ہے۔“

”میرا خیال ہے کہ وہ ڈاکٹر اور باقی دو پر نظر رکھے ہوئے ہے۔“

”اس کا مطلب ہے کہ وہ اکیلا نہیں ہے۔ اس کے ساتھ کچھ لوگ اور بھی ہیں۔“

”بالکل... اور یہ مشکل نہیں ہے۔ آج کل لوگ چند ہزار کی خاطر قتل کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں، یہ تو پھر بھی نگرانی کا کام ہے۔ منصف کسی کے سامنے آئے بغیر قتل کرا سکتا ہے۔“

”اگر وہ نگرانی کر رہا ہوگا تو اس کے علم میں آ گیا ہوگا کہ ہم ان لوگوں سے ملے ہیں۔“

محمود فکر مند ہو گیا۔ ”بالکل، یہ قتل اسی وجہ سے ہوا ہے اور اب منیر الدین بھی خطرے میں ہے۔“

”شاید شفقت اللہ بھی کیونکہ میں ڈاکٹر اور منیر الدین سے بھی ملی ہوں اور پھر شفقت اللہ کے گھر بھی گئی تھی۔“

”میں منیر الدین کو خبردار کر دوں۔“ محمود نے کہا اور کال کاٹ کر منیر الدین کا نمبر ملا یا لیکن وہ کال ریسیو نہیں کر رہا تھا۔ اتنی صبح امکان تھا کہ وہ پڑا سو رہا ہوگا۔ محمود وقفے وقفے سے اسے کال کرتا رہا۔ بالآخر اس نے کال ریسیو کی۔

”اب کیا ہے محمود صاحب؟“ اس نے پُر خمار لہجے میں کہا۔ ”صبح پانچ بجے سویا اور آپ نے تیل دے دے کر نیند کا ستیاناس کر دیا۔“

”میں نے سوچا اس سے پہلے کہ ہمیشہ کی نیند آجائے، آپ کو خبردار کر دوں۔“

”کیا مطلب؟“ اس بار منیر الدین کا لہجہ بدلا ہوا تھا۔

”ٹی وی لگا کر دیکھیں۔ ڈاکٹر راشد کو قتل کر دیا گیا ہے۔“

”کون ڈاکٹر راشد؟“

”محکمہ صحت کا ایک افسر اور منصف کا شکار اس نے بھی ایک کرڈ دیے تھے اور دو کرڈ کا مطالبہ مسترد کر دیا تھا۔ وہ گھر چھوڑ کر روپوش ہوا تھا لیکن منصف نے وہاں پہنچ کر اسے قتل کر دیا۔“

اس دوران میں منیر الدین ٹی وی لگا چکا تھا۔ ”لیکن خبر میں تو نامعلوم قاتل کا ذکر ہے۔“

”یہ بات میں جانتا ہوں یا اب آپ جانتے ہیں۔“

ہو۔“ پروفیسر نے دروازے کی طرف جاتے ہوئے کہا اور اس کا لاک کھولتے ہوئے بولا۔ ”اس گھر کے دروازے تم پر ہمیشہ کھلے ہوں گے۔“

وہ اندر آئے، آج پروفیسر زیادہ ہی تھکا ہوا تھا۔ اس نے صوفے پر گرتے ہوئے صبا سے کہا۔ ”لڑکی، تمہیں چائے بنانی آتی ہے؟“

”جی بالکل۔“

”تب کچن میں جاؤ۔۔۔ سارا سامان سامنے رکھا ہو گا۔ جلدی سے چائے بنا لاؤ۔“

صبا کچن کی طرف چلی گئی اور محمود نے پروفیسر سے کہا۔ ”مجھے لگ رہا ہے کہ مجھے اس معاملے میں آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔“

”کیسی مدد۔۔۔ میں جتنا جانتا تھا، تمہیں بتا چکا ہوں۔ اس کے بعد مجھے موقع نہیں ملا کیونکہ سمسٹر قریب ہے اور مصروفیت بہت زیادہ ہے۔“

محمود نے اپنے موبائل فون پر ویڈیو چلائی اور ونڈ فری منسلک کرتے ہوئے پروفیسر سے کہا۔ ”اسے کان سے لگا کر سنیں۔“

پروفیسر نے ونڈ فری لگالی اور غور سے سن رہا۔ جب ویڈیو ختم ہو گئی تو اس نے سوالیہ نظروں سے محمود کی طرف دیکھا۔ اس نے کہا۔ ”مجھے یاد آتا ہے کہ میں نے اس لہجے کو پہلے بھی سنا ہے۔ یہ شاید زمانہ طالب علمی کی بات ہے اور اسی یونیورسٹی میں سنا ہے لیکن مجھے قطعی یاد نہیں آ رہا کہ ایسا شخص کون ہو سکتا ہے۔ کیونکہ آپ پندرہ سال سے یونیورسٹی سے وابستہ ہیں اس لیے شاید آپ کچھ مدد کر سکیں۔“

پروفیسر کی پیشانی پر شکنیں آ گئیں جو اس بات کا اشارہ تھیں کہ وہ سوچ رہا ہے۔ محمود نے دوبارہ اسے نہیں چھیڑا۔ صبا چائے بنا کر لے آئی تھی۔ اس نے سب کو سرد کیا اور کچھ کہنا چاہا لیکن محمود نے اشارے سے منع کر دیا۔

پروفیسر چائے نوشی کے دوران میں بھی سوچتا رہا۔ بالآخر اس نے کپ رکھا اور بولا۔ ”تمہاری بات سے مجھے بھی کچھ یاد آ رہا ہے۔ جب تم یونیورسٹی آئے تھے تو یہاں ایک لیکچرار تھا

شاہد ظفر۔۔۔“

محمود تقریباً اچھل پڑا۔ اس نے جوش سے کہا۔ ”وی۔ وی۔ وی۔ میرے خدا بالکل وہی لہجہ۔۔۔ میرا اندازہ درست تھا کہ وہ یونیورسٹی سے تعلق رکھتا ہے اور میں اس سے ملتا رہا ہوں۔“

”یہ شاہد ظفر کون ہے؟“ صبا نے اضطرابی لہجے میں

پوچھا۔

”یہاں یونیورسٹی میں ایک لیکچرار تھا۔“ محمود نے بتایا۔ ”اپنے انتہا پسندانہ نظریات کی وجہ سے مشہور تھا اسی وجہ سے وہ ملازمت سے نکالا گیا۔“

”وہ صحیح معنوں میں انارکسٹ تھا۔“ پروفیسر نے تائید کی۔ ”کسی سے ڈرتا بھی نہیں تھا۔ اسے کئی بار تنبیہ کی گئی لیکن وہ اپنے خیالات کا پرچار کرنے سے باز نہیں آیا۔“

”کیسے خیالات؟“ صبا نے پوچھا۔

”یہی جو منصف کے ہیں۔ یعنی معاشرے کے ناسوروں کو خود کیفر کردار تک پہنچاؤ۔“

”لیکن منصف۔۔۔“ صبا کہتے کہتے رک گئی کیونکہ محمود نے خفیف سے اشارے سے اسے منع کر دیا تھا۔

”لیکن۔۔۔؟“ پروفیسر نے غور سے اسے دیکھا۔

صبا نے بات بدل دی ورنہ وہ پروفیسر کو منصف کی اصلیت بتانے جا رہی تھی۔ اگر محمود اشارے سے منع نہ کرتا تو اس کے منہ سے نکل جاتا۔ ”مجھے منصف کا کردار مشکوک لگتا ہے۔“

”یہ بات تو میں تم سے پہلے کہہ چکا ہوں۔“ پروفیسر نے سر ہلایا۔ ”لیکن میں بھی ٹھیک طرح سے سمجھ نہیں پایا ہوں۔“

”پروفیسر شاہد ظفر کو یونیورسٹی چھوڑے گیارہ سال ہو گئے ہیں۔ اب اسے کیسے تلاش کیا جائے؟“

پروفیسر نے شانے اچکائے۔ ”تمہیں مطلوبہ ڈیپارٹمنٹ میں جا کر تلاش کرنا ہوگا۔“

محمود نے گہرا سانس لیا۔ ”لیکن میں کیا تو یہ بات سارے زمانے میں مشہور ہو جائے گی۔“

”یہ کام میں کروں گی۔“ صبا نے کہا۔ ”لڑکی ہونے کی وجہ سے مجھے آسانی رہے گی۔“

”ہاں، یہ آسانی سے تلاش کر لے گی۔“ پروفیسر نے کہا۔ ”مجھے کچھ اور بھی یاد آ رہا ہے۔ اسی ڈیپارٹمنٹ میں اسسٹنٹ پروفیسر غفران سے شاہد ظفر کے اچھے تعلقات تھے۔ ممکن ہے اسے اس کے بارے میں پتا ہو۔“

محمود نے سوچ کر کہا۔ ”اگر یہ تعلقات اب بھی ہوئے تو وہ اسے خبردار کر سکتا ہے۔“

”تب میں براہ راست اس کے بارے میں نہیں پوچھوں گی۔“ صبا نے کہا۔ ”اپنا صحافتی کور استعمال کروں گی۔“

جلالہ صفت

چھوڑ جائیں۔ جیسے ہی پروفیسر صاحب نے رابطہ کیا، میں آپ کے بارے میں بتا دوں گا۔“

”اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں دو مہینے بعد آ جاؤں گی۔“ صبا انکار کر کے باہر آئی اور اس نے آسان طریقہ اختیار کیا۔ وہ اس کے ڈیپارٹمنٹ میں آئی اور وہاں طلباء سے شاہد ظفر کے بارے میں پوچھنے لگی۔ بالآخر ایک لڑکی نے اسے نمبر دے دیا۔

”اگر آپ واقف کار نہیں ہیں تو وہ مشکل سے کال ریسیو کریں گے۔“

”کوئی بات نہیں، میں کوشش کروں گی۔“

”اگر کوئی ضروری بات ہے تو میرے نمبر سے کر لیں وہ میرا نمبر اٹھا لیتے ہیں۔“ لڑکی نے پیشکش کی۔

”نہیں، اس کی ضرورت نہیں ہے۔ اصل میں یہ ایک سرپرائز ہے۔“ صبا نے جلدی سے کہا۔ ”پلیز... آپ انہیں مت بتائیے گا۔“

جواب میں لڑکی معنی خیز انداز میں مسکرائی تو صبا

غفران معمر شخص تھا۔ کھر درے نقوش اور تاثرات سخت تھے لیکن اس کے برعکس وہ نرم مزاج اور خوش اخلاق آدمی ثابت ہوا۔ صبا نے بتایا کہ وہ یونیورسٹی کے اساتذہ پر پروگرام کر رہی ہے خاص طور سے ایسے اساتذہ پر جو طلباء میں اپنے نظریات کی وجہ سے مقبول تھے۔ صبا نے بہت مہارت سے اپنی گفتگو کا رخ پرانے اساتذہ کی طرف موڑا اور غفران نے خود شاہد ظفر کا نام لے لیا۔

”وہ بہت عجیب آدمی تھا۔ کھر کے کپڑے پہنتا تھا۔ پاؤں میں اسٹینج کی چپل پہن کر آتا تھا۔ بہت ذہین اور قابل شخص تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ تمام مسائل کی جڑ بیوروکریسی اور ایلیٹ کلاس ہے۔ ان لوگوں کو کیفر کردار تک پہنچائے بغیر اس ملک کا غریب سکون سے نہیں رہ سکتا۔ وہ طلباء سے کہتا تھا کہ اگر قانون ایسے لوگوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تو اپنا قانون خود بناؤ اور انہیں سزا دو۔“

”یہ تو بہت دلچسپ آدمی لگتے ہیں۔ آج کل ہمارے معاشرے میں اس طرح کے سچ بولنے والے کہاں ہوتے ہیں۔ کیا ان سے ملاقات ہو سکتی ہے؟“

”میرا دو سال سے رابطہ نہیں ہے۔“ غفران نے کہا۔ ”آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ ہم متافق معاشرے کے لوگ ہیں، سچائی سے منہ چھپاتے ہیں۔ اس سے بھی لوگ ملنا پسند نہیں کرتے تھے۔ بس میں اور ایک دو افراد تھے جو اس سے ملتے تھے لیکن طلباء میں وہ بہت مقبول تھا۔“

”دو سال پہلے وہ کہاں تھے؟“

”ایک نجی یونیورسٹی میں پڑھا رہا تھا، اب پتا نہیں کہاں ہے۔“ غفران نے اسے یونیورسٹی کا نام بتایا۔

”کوئی ایڈریس؟“

”نہیں، اس نے کبھی مجھے اپنے گھر نہیں بلایا اور نہ ہی یہ بتایا کہ وہ کہاں رہتا ہے۔ اصل میں وہ بہت گوشہ نشین آدمی تھا۔“

کام ادھورا ہوا تھا لیکن صبا نے یہ جان کر اطمینان کا سانس لیا کہ غفران کا شاہد ظفر سے رابطہ نہیں تھا۔ یعنی وہ اسے خبردار نہیں کر سکتا تھا۔ صبا کے پاس وقت تھا اس لیے وہ یونیورسٹی سے اس نجی یونیورسٹی پہنچ گئی، یہ زیادہ دور نہیں تھی۔ وہاں اسے پتا چلا کہ شاہد ظفر یہیں جاب پر ہے لیکن اس وقت نہیں مل سکتا تھا کیونکہ اس نے دو مہینے سے چھٹیاں لی ہوئی تھیں۔ ایڈمن آفیسر نے اس کا فون نمبر یا گھر کا پتا دینے سے انکار کر دیا۔ ”سوری مس... دراصل پروفیسر کی طرف سے منع کیا گیا ہے۔ اگر آپ ملنا چاہتی ہیں تو اپنا کوئی ٹیکٹ نمبر

بناؤ اللہ تعالیٰ مقدر ہے

Alternative & Integrated Medicine

===== کمزوری و بائجھ پن =====

ہر طرح کی جسمانی۔ اعصابی۔ نفسیاتی۔ ازدواجی کمزوری و بائجھ پن (بے اولادی) کے مریض کلینک کے نئے اوقات کار نوٹ فرمائیں۔

روزانہ دو سہرے نماز ظہر تا نماز مغرب چھٹی بروز جمعہ المبارک

دوسرے شہروں میں رہنے والے مریض اب بذریعہ ٹیلی فون۔ ای میل۔ ایس ایم ایس۔ گھر بیٹھے (B 2 C Online) ادویات منگوا سکتے ہیں

ڈاکٹر محمد لطیف شاہین

معالجہ نفسیاتی۔ ازدواجی امراض و بائجھ پن

ایم بی بی ایس (بی ایس سی آنرز) نزدیکیوں کے کراسنگ کوچر و راولپنڈی صدر

03457601156 03216528001

email: dr.muhammadlatifshaheen@gmail.com

جھینپ گئی۔ وہ نہ جانے کیا سمجھ رہی تھی۔ اس نے یونیورسٹی سے محمود کو کال کی۔ ”میں نے فون نمبر کی حد تک شاہد ظفر کو تلاش کر لیا ہے۔“

”یہ کام کیا ہے ماتم نے۔“ محمود خوش ہو گیا۔ ”نمبر بتاؤ۔“ محمود نے نمبر اپنے ایک واقف کار کو دیا جو ٹیلی کام اتھارٹی میں کام کرتا تھا۔ اس نے ایک گھنٹے میں محمود کو بتا دیا کہ سم پوسٹ پیڈ ہے اور بل کا پتا موجود ہے۔ پتالے کر محمود نے اس کا شکر یہ ادا کیا اور صبا کو کال کی۔ ”میں نے پتالے لیا ہے۔ تم یونیورسٹی میں رکو، میں وہیں آ رہا ہوں۔ وہ ایف بی ایریا میں کہیں رہتا ہے۔“

آدھے گھنٹے میں محمود وہاں پہنچ گیا۔ اس نے صبا کو لیا اور مذکورہ پتے پر روانہ ہو گیا۔ صبا نے کار میں بیٹھتے ہی پوچھا۔ ”اگر یہی منصف نکلا تو ہم کیا کریں گے؟“

”اسے گرفتار کر لیں گے۔“ محمود نے سادگی سے کہا۔ ”اور ہم کیا کر سکتے ہیں؟“

”لیکن اس کے خلاف ثبوت؟“

”یہ مشکل ہے۔“ محمود نے سر ہلایا۔ ”ہماری پولیس یا ایجنسیاں ایسے معاملات میں اطلاع ملتے ہی کارروائی کرتی ہیں اور ثبوت جمع نہیں کرتیں۔ اس سے مجرموں کو عدالت سے بری کر دیا جاتا ہے جبکہ دوسرے ملکوں میں پولیس پہلے مجرموں کے گرد گھیرا تنگ کرتی ہے اور جب اتنے ثبوت مل جائیں کہ انہیں سزا ہو سکے تو گرفتار کرتی ہے۔“

”میرا تو خیال ہے کہ ہم دور سے جائزہ لیتے ہیں۔“ صبا نے تجویز پیش کی۔ ”آپ جانے پہچانے ہیں، وہ چونک سکتا ہے۔“

”پہلے گھر تو دیکھ لیں۔“

شاہد ظفر کا مکان پرانے علاقے میں تھا، یہاں زیادہ تر بڑے مکانات تھے۔ کچھ نئے سرے سے بنے تھے لیکن اکثر ری نیو کیے گئے تھے اور بعض اب تک پرانے ڈیزائن کے تھے۔ شاہد ظفر کا مکان بھی پرانے ڈیزائن کا اور کسی قدر خستہ حال تھا۔ یہاں بھی صبا کو آگے جانا پڑا اور اس نے جا کر کال بیل بجائی۔ اس دوران میں محمود گلی کے کونے پر کار میں موجود رہا تھا۔ کال بیل کا جواب نہیں ملا تو صبا نے دروازہ بجایا۔ اس بار بھی جواب نہیں ملا۔ ایک آدمی جو برابر والے مکان سے نکلا تھا، صبا نے اس سے پوچھا۔ ”یہ شاہد صاحب کا گھر ہے؟“

”ہاں لیکن وہ گھر پر نہیں ہیں۔“ آدمی نے جواب دیا۔ ”کہیں گئے ہوئے ہیں؟“

”میرا خیال ہے کہ ایک مہینے سے اوپر ہو گیا وہ کہیں گیا ہوا ہے۔ ویسے بھی کسی سے ملتا جلتا نہیں ہے اس لیے اس کے بارے میں کسی کو پتا بھی نہیں ہوتا۔ آپ کون ہیں؟“

”میں ان کی اسٹوڈنٹ ہوں۔ ٹوئس کے معاملے میں مدد لیتی تھی لیکن یہ دو مہینے سے یونیورسٹی بھی نہیں آرہے ہیں۔“

”اللہ جانے کوئی مسئلہ نہ ہو گیا ہو۔“ پڑوسی فکر مند ہو گیا۔ ”اکیلا آدمی ہے سر مرا گیا تو پولیس دوسروں کو بلا وجہ تنگ کرے گی۔“

”آپ نے پولیس کو اطلاع دی؟“

”نہ بی بی پولیس کے چکر میں کون پڑتا ہے... اپنی مٹی پلید کراتی ہے؟“ پڑوسی نے جواب دیا اور واپس اندر چلا گیا۔ صبا کا رنگ آبی اور اندر بیٹھ کر بتایا۔ ”وہ گھر سے بھی غائب ہے۔“

”حفظ ما تقدم۔“ محمود نے پُر خیال انداز میں کہا۔

”میں تو کہہ رہی ہوں، یہ اچھا موقع ہے۔“ صبا نے مکان کی طرف اشارہ کیا۔ ”وہ نہیں ہے اور مکان خالی پڑا ہے۔ ہم اندر جا کر دیکھ سکتے ہیں۔“

”تمہارا مطلب ہے ٹریس پاس؟“ محمود نے اس کی بات پر غور کیا۔

”ہاں، اسی طرح سے ہم تصدیق کر سکتے ہیں کہ وہ منصف ہے یا نہیں۔“

”لیکن مجھے اس قسم کے کاموں کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔“

”دیکھیں، مکان کی چار دیواری چھوٹی ہے اور میرا اندازہ ہے کہ اس کے پیچھے بھی چھوٹی گندی گلی ہوگی۔ اگر ہم پیچھے سے دیوار پھلانگ کر اندر جائیں تو کسی کو پتا نہیں چلے گا۔“

”اگر پتا چل گیا تو تم نے سوچا ہے کہ کیا ہوگا؟“

”بحث کے لیے یہ جگہ مناسب نہیں ہے۔“ صبا نے توجہ دلائی کیونکہ آتے جاتے کچھ لوگ انہیں گھورتے ہوئے گئے تھے۔ محمود نے کار آگے بڑھائی۔ وہ کچھ دور واقع ایک ریسٹوران تک آئے۔ یہاں محمود نے ایک کونے کی میز منتخب کی جہاں تاریکی تھی اور اسے امید تھی کہ کوئی اسے دیکھ کر شناخت نہیں کرے گا۔ لچ کا وقت قریب تھا۔ اس نے صبا سے پوچھ کر لچ کا آرڈر کیا اور ویٹر کے جانے کے بعد کہا۔

”میرے خیال میں یہ تجویز مناسب نہیں ہے۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں لیکن دوسری صورت میں

عقب میں دونوں بند تھے۔ سامنے والے دروازے پر تالا لگا ہوا تھا۔ محمود اپنے ساتھ ایک چھوٹی سی لیکن بہت اچھی قسم کی اسٹیل کاٹنے والی آری بھی لایا تھا۔ وہ تالے پر آری آزمانے لگا۔ اس سے آواز تو پیدا ہو رہی تھی لیکن یہ بہت معمولی سی تھی۔ صبا نے گیٹ تک جا کر اطمینان کیا، وہاں تک بھی بہت معمولی سی آواز آرہی تھی۔

مگر تالا بہت مضبوط تھا۔ پندرہ منٹ بعد محمود نے آری پر دوسری پتري لگائی کیونکہ پہلی والی کھس کرنا کارہ ہو گئی تھی۔ آدھے گھنٹے بعد تالا کٹ گیا تو وہ پسینے میں شرابور تھا اور سانس بھی تیز چل رہا تھا۔ مگر اس سے زیادہ تیز سانس صبا کا تھا۔ تالا کھلتے ہی وہ اندر آ گئے۔ صبا لائٹ جلانے جا رہی تھی لیکن محمود نے اسے روک دیا۔ ”یہ کیا کر رہی ہو؟ اگر کسی نے باہر سے دیکھ لیا تو ہم مشکل میں پڑ سکتے ہیں۔“

”اتنی سی ٹارچ کی روشنی میں کیا نظر آئے گا؟“

”فکر نہ کرو، کام کی چیز اس سے بھی نظر آ جائے گی۔“

محمود نے آس پاس روشنی لہراتے ہوئے کہا۔ یہ نشست گاہ تھی لیکن یہاں گھسا پٹا فرنیچر پڑا تھا۔ دوسرا کمرہ فرنیچر سے خالی تھا لیکن وہاں کتابوں کا بہت بڑا انبار پڑا ہوا تھا۔ کمرہ بیڈروم ثابت ہوا۔ فرنیچر یہاں بھی معمولی سا تھا لیکن ایک بڑی سی مقفل الماری موجود تھی۔ اسے کھولنے کے لیے محمود نے ایک اوزار اور برآمد کیا، یہ چھوٹی سی فولادی سلاخ تھی۔ اس کی نوک الماری کے پٹ میں پھنسا کر اس نے زور لگایا تو تالا ٹوٹ گیا۔ اس دوران میں صبا بیڈروم کا دوسرا سامان الٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی۔ محمود نے اسے آواز دی۔ ”وقت ضائع مت کرو، اصل سامان یہاں ہے۔“

ایک خانے میں منصف کا نقاب اور نوٹوں کی چند گڈیاں رکھی تھیں۔ صبا نے ان کا معائنہ کیا اور آہستہ سے بولی۔ ”تو اب ثابت ہو گیا کہ شاہد ظفر ہی منصف ہے۔“

”ہاں لیکن وہ خود کہاں ہے؟“

”وہ یقیناً اپنے مشن پر نکلا ہوا ہے۔“ صبا نے الماری کی تلاشی شروع کی۔ اس میں ایک جدید ڈیجیٹل کیمرہ جو مووی بھی بنا سکتا تھا اور وہ شرٹ بھی نگلی جسے پہن کر منصف ویڈیو تیار کرتا تھا۔ اس کے ساتھ ایک عدد پستول بھی تھا۔ صبا نے رومال سے پکڑ کر اس کی نال سوکھی۔ ”اس سے حال ہی میں قاتل کیا گیا ہے۔ بارود کی تیز بو آرہی ہے۔ ہمیں فوراً پولیس کو اطلاع کرنا ہوگی۔“

”مگر وہ یہاں چھاپا مار کر کس کو پکڑیں گے؟“ محمود نے نفی میں سر ہلایا۔ ”جب تک شاہد ظفر سامنے نہیں آتا،

ہمیں شاہد ظفر کی واپسی کا انتظار کرنا پڑے گا۔ وہ نہ جانے کہاں گیا ہے اور کب واپس آئے اور ممکن ہے اس دوران میں منیر الدین کا کام بھی تمام ہو جائے۔“

اس بات نے محمود کو سوچنے پر مجبور کر دیا۔ اگر شاہد ظفر ہی منصف تھا تو منیر الدین کی جان بھی خطرے میں تھی۔ لٹچ کے دوران میں وہ سوچتا رہا۔ کھانے کے بعد چائے پیتے ہوئے اس نے کہا۔ ”ٹھیک ہے لیکن دن میں یہ کام خطرناک ہوگا۔“

”تو پھر کب کریں گے؟“

”میں پروگرام کر کے آتا ہوں اور پھر ہم کوشش کریں گے لیکن لازمی نہیں ہے ہم اندر داخل ہوں... اگر خطرہ ہوا تو ہم واپس آجائیں گے۔“

”ٹھیک ہے۔“ صبا خوش ہو گئی۔

”کام کی مناسبت سے سیاہ لباس پہن لینا اور ہو سکے تو کوئی نقاب جیسی چیز بھی لے لینا تاکہ فرار کا موقع آئے تو لوگ ہمارے چہرے نہ دیکھ سکیں۔“

☆☆☆

محمود نے آس پاس دیکھا اور اچک کر صرف ساڑھے چار فٹ اونچی چار دیواری پر ہاتھ جمائے اور ایک سوراخ میں جوتے کی نوک پھنساتے ہوئے خود کو اوپر اٹھایا۔ دیوار پر چڑھ کر اس نے ہاتھ بڑھایا اور صبا کا ہاتھ تھام کر اسے بھی اوپر کھینچ لیا۔ پھر وہ اندر اتر آ اور سہارا دے کر صبا کو بھی اندر اتار لیا تھا۔ وہ کچھ خوفزدہ تھی حالانکہ یہ اسی کی تجویز تھی، اس کے مقابلے میں محمود پُر سکون تھا۔ صبا نے اندر آنے کے بعد سرگوشی میں کہا۔ ”اگر وہ اندر ہوا تو...؟“

”تب ہمیں فرار ہونا پڑے گا۔ لیکن وہ ہے نہیں، تم نے دیکھا باہر دروازے پر تالا ہے اور اندر کی تمام روشنیاں بند ہیں۔“

صبا عبایا پہن کر آئی تھی جس کے نیچے اس نے سیاہ پورے آستین کی ٹی شرٹ اور نیوی بلوٹراؤزر پہن رکھا تھا۔ عبایا اس نے گاڑی میں اتار دیا۔ محمود بھی گہرے رنگ کے لباس میں تھا۔ وہ اپنی ایک گرم ٹوپی لایا تھا جو کھینچ کر پورے چہرے پر آسکتی تھی۔ اس نے اس میں آنکھوں کی جگہ سوراخ کر لیے تھے۔ صبا اپنا ایک اسکارف لائی تھی جس سے چہرہ بھی چھپایا جاسکتا تھا۔ محمود نے ایک چھوٹی ٹارچ روشن کی اور وہ مکان کی طرف بڑھے۔ مکان چاروں اطراف سے کھلا ہوا تھا۔ یعنی چار دیواری سے الگ تھا مگر اندر جانے کے دروازے صرف دو تھے ایک سامنے کی طرف اور ایک

پولیس کو اطلاع دینا بیکار ہے۔ وہ فرار ہو جائے گا۔“
 ”واپس آنے کی صورت میں وہ ٹوٹے تالے اور کھلی
 ہوئی الماری دیکھ کر بھی سمجھ جائے گا اور اس صورت میں بھی
 فرار ہو جائے گا۔“

”نہیں، وہ اسے کسی چور کی کارستانی سمجھے گا۔“ محمود
 نے تمام چیزیں سمیٹ لیں۔ اس نے خیال رکھا تھا کہ ان پر
 سے فکر پرٹ صاف نہ ہونے پائیں۔ ”آؤ چلیں۔“
 ”لیکن...“ صبا نے کہنا چاہا مگر محمود نے اس کا ہاتھ
 پکڑ کر کھینچ لیا۔

”بحث کرنے کا وقت نہیں ہے۔ اگر وہ آگیا تو
 ہمارے لیے بچنے کا امکان بھی کم ہو جائے گا۔“

وہ دروازہ بند کر کے عقبی دیوار تک آئے اور اسے
 پھلانگ کر باہر نکل آئے۔ جب وہ کار میں بیٹھے تو صبا نے
 گہری سانس لے کر کہا۔ ”شکر ہے کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی۔“
 محمود سوچ میں گم تھا۔ ”لیکن منصف یعنی شاہد ظفر
 کہاں ہے؟“

”آپ نے کہا تو ہے کہ وہ منیر الدین کے پیچھے گیا
 ہوگا۔“

”نہیں، تم بھول رہی ہو اس کا پڑوسی کہہ رہا تھا کہ وہ
 تقریباً ایک مہینے سے بھی پہلے سے گھر سے غائب ہے۔“
 ”ممکن ہے وہ خاموشی سے آتا ہو اور اس کے
 پڑوسیوں کو پتا بھی نہ چلتا ہو۔ یقین کریں، پستول ایک دن
 پہلے ہی یہاں رکھا گیا ہے۔“

”اگر وہ مستقل یہاں نہیں رہتا تو پھر کہاں ہوتا
 ہوگا؟“

”اس کا پتا چل سکتا ہے اگر ہم یہاں بھی کیمرے اور
 مانٹک لگا دیں۔“ صبا نے تجویز دی۔

”یہی ایک طریقہ ہے۔“ محمود نے اس سے اتفاق
 کیا۔ ”فاخر کو کال کرو کہ وہ دونوں چیزیں مجھے پہنچا دے اور
 تم گھر جاؤ۔“

”آپ اکیلے یہ کام کریں گے؟“
 ”ہاں کام کے لیے ایک آدمی کافی ہے پھر دو افراد
 خطرہ کیوں مول لیں۔“

محمود نے صبا کو اس کے گھر کے پاس ایک جگہ اتار
 دیا اور وہ رکشالے کر چلی گئی لیکن جانے سے پہلے اس
 نے فاخر کو کال کر دی تھی۔ وہ آدھے گھنٹے بعد آیا اور اس
 نے کیمرا اور مانٹک محمود کے حوالے کر دیا۔ وہ واپس شاہد
 ظفر کے مکان تک آیا۔ رات گہری ہو رہی تھی، اسی

تناسب سے وہاں مزید سناٹا ہو گیا تھا۔ وہ آرام سے کود کر
 اندر آیا اور اپنا کام کر کے باہر نکل گیا۔ اسے دس منٹ
 سے زیادہ نہیں لگے تھے۔

☆☆☆

اگلی صبح منصف نے ڈاکٹر راشد کے قتل کا اعتراف کر
 لیا تھا۔ اس کی ویڈیو ایک چینل کو ملی تھی جو اسے مسلسل دکھا رہا
 تھا۔ ابھی وہ خبر دیکھ رہا تھا کہ منیر الدین کی کال آگئی۔ وہ بھی
 خبر دیکھ چکا تھا اور اس بار ڈرا ہوا تھا۔ محمود نے کہا۔ ”میرا
 خیال ہے کہ اب آپ کو میری بات کا مکمل یقین آگیا ہوگا؟“
 ”یقین تو مجھے پہلے بھی تھا۔“ منیر الدین نے کہا۔
 ”آپ ایمان دار آدمی ہیں ورنہ میری کرپشن نشر کرنے
 کے بجائے مجھ سے معاملہ کر لیتے جیسے دیگر بہت سے لوگ
 کرتے ہیں۔“

”اب آپ کو بہت زیادہ محتاط رہنا ہوگا۔ ڈاکٹر راشد
 چھپا تھا اس کے باوجود اس نے اسے تلاش کر لیا اور موت
 کے گھاٹ اتار دیا۔“

”لیکن میں کب تک احتیاط کروں گا؟“ منیر الدین
 کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ ”مجھے باہر تو نکلنا ہوگا اور باہر موت میری
 منتظر ہوگی۔“

”منصف نے دوبارہ رابطہ کیا؟“

”ہاں، اسی نے کال کر کے مجھے ڈاکٹر راشد کے
 انجام کی اطلاع دی ہے۔ میں انجان بنا رہا۔“

”یہ آپ نے اچھا کیا کیونکہ ایسے وقت اسے پتا چل
 گیا تو وہ محتاط ہو جائے گا۔ اس نے اپنا مطالبہ ہرایا ہوگا؟“

”ہاں، اس نے مجھے چوبیس گھنٹے کی مزید مہلت دی
 ہے۔ اس کے بعد وہ مجھے قتل کر دے گا، چاہے میں کہیں چلا
 جاؤں یا کسی تجوری میں گھس کر بیٹھ جاؤں۔“

”آپ نے کیا جواب دیا؟“

”میں نے صاف انکار کر دیا۔“

”یہ آپ نے اچھا نہیں کیا۔ بہر حال، اب بھی آپ
 کوشش کریں تو اس کے خلاف جال بچھایا جاسکتا ہے۔“
 ”وہ کیسے؟“

”اب وہ آپ کو کال کرے تو آپ رقم دینے پر آمادگی
 ظاہر کریں۔“

”رقم۔“ منیر الدین بدکا۔ ”میں اسے ایک روپيا نہیں
 دوں گا۔“

”میں بھی آپ کو رقم دینے کا مشورہ نہیں دے رہا
 ہوں۔ آپ صرف اسے دھوکا دیں گے۔“

واضح ثبوت حاصل کرنے میں کامیاب رہے تو پھر معاملہ ان کے سپرد بھی کیا جاسکتا ہے۔“

صبا نے گہری سانس لی۔ ”ٹھیک ہے، میں آپ کے ساتھ ہوں بلکہ دیکھا جائے تو آپ میرے ساتھ ہیں اور میں اس کے لیے آپ کی شکر گزار ہوں۔“

”اس کی ضرورت نہیں ہے۔ دنیا میں کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کے لیے انسان کسی بھی صلے کی تمنا کے بغیر بہت کچھ کرتا ہے۔ میرے لیے تم بھی ان میں سے ایک ہو۔“

صبا مسکرائی۔ ”تب میں اس کے لیے بھی شکر گزار ہوں۔ اب ہمیں کیا کرنا ہے؟“

”آدمی میرے پاس ہیں، بس مجھے منیر الدین کی طرف سے کال کا انتظار ہے۔ جب منصف اس سے رابطہ کرے گا، وہ مجھے بتائے گا۔ ہم حرکت میں آجائیں گے۔“

”آپ اسے شاہد ظفر کیوں نہیں کہہ رہے؟“

”کیونکہ ابھی تک اس کا حتمی ثبوت نہیں ملا ہے کہ وہی منصف ہے۔“

صبا نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ”جو اس کے گھر سے ملا ہے، کیا وہ کافی نہیں ہے؟“

”کافی ہے، حتمی نہیں ہے۔ حتمی ثبوت خود شاہد ظفر کے گرفت میں آنے سے ملے گا۔“

”اچھا، آپ مجھے ساتھ رکھیں گے؟“

محمود ہچکچایا۔ ”اس میں خطرہ ہے اور میں تمہیں خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا۔“

”میں خود اس خطرے میں پڑی ہوں۔“ صبا نے اصرار کیا۔ ”پھر میرے ساتھ فاجر بھی ہوگا۔“

”او کے لیکن ابھی طے تو ہو جائے کہ منصف کو ٹریپ کیسے کرنا ہے۔ اسے دیکھ کر تمہاری گنجائش بھی نکالتے ہیں۔“

محمود کے پاس ایک اعلیٰ درجے کا کیمرا مین اور فوٹو گرافر تھا اسے ہنگامی حالات میں کیمرا استعمال کرنے کا فن آتا تھا۔ ایک وہ ہوتا اور دوسرا خود محمود ہوتا۔ اس کے خیال میں دو افراد کافی تھے، بھیڑ سے کام بگڑ سکتا تھا مگر صبا کا اصرار تھا کہ اسے بھی شامل کیا جائے۔ اگلے دن منیر الدین کی کال آئی۔ ”منصف نے پھر مجھے کال کی تھی اور میں مان گیا ہوں۔“

”گڈ، اس نے کیا کہا ہے؟“

”یہی کہ دو کروڑ روپے پانچ ہزار کے نوٹوں پر مشتمل گڈیوں کی صورت میں تیار رکھوں اور جیسے ہی وہ کہے اس کی

”اس پر وہ مجھے بخش دے گا؟“

”بخشنے کا تو وہ دیے بھی نہیں... میں نے آپ کو بتایا تھا، وہ رقم وصول کر کے بھی آپ سب کو قتل کرے گا۔ ڈاکٹر راشد کا انجام سامنے ہے۔“

”تب میں کیسے بچ سکوں گا؟“

”اس کی ایک ہی صورت ہے... آپ ہم سے تعاون کریں۔“

”ہم کون؟“

”ہم سے مراد میری میڈیا ٹیم ہے۔“ محمود نے جواب دیا۔ ”جب وہ رقم حاصل کرنے کی کوشش کرے تو ہم اسے رگٹے ہاتھوں گرفتار کر سکتے ہیں یا کیمروں کی مدد سے اس کے خلاف ناقابل تردید ثبوت لے سکتے ہیں۔“

”تب ٹھیک ہے مگر وہ آزاد رہ کر بھی میرے لیے خطرہ تو رہے گا۔“

”دیکھیں، وہ ایک بار بے نقاب ہو گیا تو کھل کر کوئی کارروائی نہیں کر سکے گا بلکہ فرار کی اور چھپنے کی کوشش کرے گا۔ ابھی اس کی طاقت اس کے پوشیدہ رہنے میں ہے۔“

”میں تیار ہوں۔“ منیر الدین نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ”لیکن شرط یہ ہے کہ میرے دوسرے معاملات کو نہ اچھالا جائے۔ آپ سمجھ رہے ہیں نا؟ میں منصف سے بچ کر

کرپشن کے چکر میں نہیں پھنسا چاہتا۔“

”آپ بے فکر رہیں۔ اگر مجھے بلیک میل کرنا ہوتا تو آپ کی ویڈیو ہی کافی تھی۔ مگر میں کسی شخص کو ایک حد سے زیادہ مجبور کرنے کا قائل نہیں ہوں۔ آپ بے فکر رہیں اگر آپ تعاون کریں گے تو کرپشن کیس کو نہیں اچھالا جائے گا۔ ہاں اگر حکومت یا کسی سرکاری ادارے کی طرف سے ایکشن لیا گیا تو اس کی ذمہ داری میڈیا پر نہیں ہوگی۔“

”مجھے اس کی فکر نہیں ہے۔ ان سے میں نمٹنا جانتا ہوں، بس میڈیا سے ڈر لگتا ہے۔“

☆☆☆

صبا، محمود کا پلان سن کر متفکر ہو گئی۔ اس نے کچھ دیر سوچنے کے بعد سوال کیا۔ ”کیا یہ مناسب ہوگا کہ ہم خود کارروائی کریں؟ شاہد ظفر خطرناک آدمی ہے۔ اس سے پولیس یا ایجنسی والے ہی نمٹ سکتے ہیں۔“

”مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن اس صورت میں کیس بھی ان کے ہاتھ میں چلا جائے گا اور تمہیں کریڈٹ نہیں ملے گا۔“ محمود نے اسے یاد دلایا۔ ”آئی بی والے اپنے طریقے سے کام کرتے ہیں۔ اگر ہم شاہد ظفر کے خلاف

ہدایت پر عمل کروں۔“

محمود متفکر ہو گیا۔ ”اس صورت میں ٹریپ لگانا ذرا دشوار ہوگا۔ مجھے اور میرے آدمیوں کو ہمہ وقت تیار رہنا ہوگا۔ کیا اس نے کوئی وقت بتایا ہے؟“

”نہیں، اس کا کہنا ہے کہ میں رقم تیار رکھوں، وہ کسی وقت بھی مجھے کال کر کے بتائے گا کہ رقم کہاں اور کیسے پہنچانی ہے۔ اس نے کہا ہے کہ مدت ایک گھنٹے سے لے کر ایک ہفتے تک کچھ بھی ہو سکتی ہے۔“

”وہ بہت چالاک آدمی ہے۔ اس طرح سے کسی ممکنہ ٹریپ کو ناکام بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔ لیکن میرا اندازہ ہے کہ وہ زیادہ تاخیر نہیں کرے گا۔ شاید چوبیس گھنٹے کے اندر آپ سے رابطہ کر لے گا۔“

”اب سب کچھ آپ کے ہاتھ میں ہے، اگر آپ ناکام رہے اور وہ پکڑا نہ گیا تو میں مارا جاؤں گا۔“

محمود نے اسے تسلی دی اور پھر کیمرا مین فیصل سے رابطہ کیا۔ وہ فری لانسر تھا اور مختلف چیتل اور لوگوں کے لیے کام کرتا تھا۔ فون پر بتانے کے بجائے محمود نے اسے طلب کر لیا۔ وہ چونک گیا۔ ”ایسی کیا بات ہے محمود صاحب جو آپ فون پر نہیں بتا رہے؟“

”معاملہ بہت اہم ہے، یوں سمجھ لو کہ ٹاپ سیکرٹ ہے اور کسی قدر خطرناک بھی ہے۔ تم جیسا شخص ہی یہ کام کر سکتا ہے۔“

”میں آتا ہوں۔“

”ایسا کرو، مجھ سے اسٹوڈیو میں ملو۔ نو بجے آ جانا، اس وقت تک پروگرام ختم ہو جاتا ہے۔“

”میں آ جاؤں گا۔“

فیصل ذرا دیر سے آیا تھا۔ اس نے آتے ہی معذرت کی۔ ”میری بایک کا پیپا پتھر ہو گیا تھا اس لیے ذرا دیر ہو گئی ورنہ وقت سے پہلے نکل گیا تھا۔“

”کوئی بات نہیں۔“ محمود اسے اندر لے گیا۔ اس

وقت تک سرد سمیت سب جا چکے تھے۔ ”اچھا ہوا تم ذرا دیر سے آئے ہو اب ہم آرام سے بات کریں گے۔ معاملہ انتہائی رازداری کا ہے۔ تم نے منصف کا نام سنا ہے...؟“

جب محمود نے اسے بتایا کہ اسے کیا کرنا ہے تو اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اس نے گھبرا کر کہا۔ ”اسے کیمرے سے شوٹ کرنا ہے اور اس نے گن سے شوٹنگ شروع کر دی تو...“

”ایسا نہیں ہوگا، ہر کام بہت دیکھ بھال کر کرنا ہو

گا۔ تم اس جگہ سے دور ہو کے اور وہیں سے منظر شوٹ کرو گے۔“

”ایسا بہت مشکل ہے۔“ فیصل نے نفی میں سر ہلایا۔ ”مجھے لوکیشن کا پہلے سے پتا ہونا چاہیے تب ہی میں صحیح کام کر سکوں گا۔“

”صحیح لوکیشن کا عین موقع پر پتا چلے گا، میں تمہیں پہلے سے کیسے بتا دوں گا؟“

”تب اگر صحیح شوٹ نہ ہو تو مجھے الزام مت دیجیے گا۔“

”ایسی صورت میں تم پر کوئی الزام نہیں ہوگا لیکن تمہیں اپنی سی بہترین کوشش کرنا ہوگی۔“

”وہ تو میں کروں گا۔“

”بس تو تم چوبیس گھنٹے میرے ڈسپوزل پر ہو۔ تم آدھے گھنٹے کے نوٹس پر کہیں پہنچنے کے لیے تیار رہنا کیونکہ شاید اس سے زیادہ وقت نہ ملے۔“

”ٹھیک ہے۔“

محمود نے اسے دو ہزار دیے۔ ”یہ پیشگی ہے، باقی معاوضے کا انحصار تمہاری پرفارمنس پر ہوگا۔“

فیصل خوش ہو گیا۔ ”یہ بات ہے تو آپ دیکھیے گا۔“

”اپنی بایک کو بھی تیار رکھنا کہیں عین موقع پر وہ گزیر نہ کر جائے۔“

”اس رقم سے اس کی حالت ٹھیک کرالوں گا۔“ فیصل

نے نوٹ جیب میں رکھ لیے۔ ابھی فیصل نکلا تھا کہ صبا کا فون آ گیا۔

”معاملہ کہاں تک پہنچا؟“

”منیر الدین نے چار اڈال دیا ہے، اب دیکھو وہ رقم کے لیے کب اور کہاں آنے کو کہتا ہے۔ میں نے ایک کیمرا مین ہائر کر لیا ہے۔“

”میں بھی ساتھ چلوں گی۔“

”نہیں، تم اور فاخر ایک کام کرو۔ چھ گھنٹے بعد شاہد ظفر کے مکان سے کیمرا اور مائیک نکال لو۔“

”یہ الگ کام ہے۔“

”ایک ہی ہوگا۔ تین دن کی مدت آج صبح پانچ بجے ختم ہو جائے گی۔ تم دونوں جاؤ گے۔ میری چھٹی حس کہہ رہی ہے کہ منصف آج رات یا کل صبح کسی وقت منیر الدین سے

رقم لانے کو کہے گا۔“

”اتنی جلدی؟“

”اسے بے وقوف مت سمجھو۔ اس نے اپنے شکاروں پر نظر رکھی ہوگی اور اسے اندازہ ہو گیا ہوگا کہ کچھ لوگ اس

کے پیچھے ہیں اس لیے وہ جلد از جلد ان لوگوں سے جان چھڑانے کی کوشش کرے گا۔“
”یعنی منیر الدین اور شفقت اللہ دونوں خطرے میں ہیں؟“

”یعنی بات ہے۔ منصف ان کو بھی مار کر نمبر اسکور کر لے گا۔ اسے مزید مقبولیت اور بد عنوان لوگوں میں مزید دہشت مل جائے گی۔ دونوں چیزیں آگے اس کے کام آئیں گی۔“

”ٹھیک ہے، میں فاخر سے کہتی ہوں۔ ہم صبح سے پہلے کیمرا اور مائک شاہد ظفر کے مکان سے نکال لیں گے۔“

☆☆☆

شفقت اللہ اپنی کارڈ رائیو کر رہا تھا۔ وہ چہرے سے بارعب آدمی لگتا تھا لیکن اس وقت اس کا چہرہ خوف کا آئینہ دار بنا ہوا تھا۔ وہ سی ویو کے آخری حصے میں ایک ویران مقام پر ڈرائیو کر رہا تھا۔ رات کے دو بجے تھے اور اس وقت یہاں مکمل سناٹا تھا۔ یعنی کوئی انسانی آواز نہیں تھی۔ صرف سمندر کا شور تھا اور اس میں کسی قدر گاڑی کے انجن کا شور تھا۔ شفقت اللہ کے برابر والی سیٹ پر ایک بڑا بیگ رکھا ہوا تھا۔ وہ ست رفتاری سے ڈرائیو کر رہا تھا۔ اچانک اس کے موبائل کی بیل بجی۔ وہ اچھل پڑا۔ گاڑی ایک لمحے کو لہرائی۔ اس نے گاڑی قابو کرتے ہوئے بریک لگایا اور موبائل نکال کر دیکھا، ایک اجنبی نمبر آ رہا تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ یہ منصف کی کال ہوگی۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے کال ریسیو کی اور بولا۔ ”میں سی ویو کے آخری حصے تک آ گیا ہوں لیکن ابھی تک کسی نے مجھے نہیں روکا ہے۔“

”میں اپنا اطمینان کر رہا تھا کہ تم کسی کو ساتھ لگا کر تو نہیں لے آئے ہو۔ اب گاڑی کا انجن بند کر دو اور باہر آ جاؤ۔ گاڑی کے چاروں دروازے کھول دو اور ڈکی میں خود لیٹ کر دکھاؤ۔“

”تم یہ سب کیوں کر رہے ہو؟“ شفقت اللہ جھنجھلا گیا۔ ”میں رقم لے آیا ہوں وہ لو اور میری جان چھوڑو۔“
”اتنی آسانی سے نہیں۔“ منصف مخصوص لہجے میں بولا۔ ”میں جو کہہ رہا ہوں وہ کرو ورنہ تمہاری کھوپڑی میں ایک سوراخ ہو جائے گا۔“

شفقت اللہ نے جلدی سے انجن بند کیا اور نیچے اتر آیا۔ اس نے کار کے چاروں دروازے کھول دیے اور پھر ڈکی کی طرف آیا۔ یہ نئے ماڈل کی گٹھری کار تھی جس کی ڈکی میں خاصی گنجائش ہوتی ہے لیکن وہ بھاری جسم کا آدمی تھا،

اس میں مشکل سے آتا۔ اس نے منصف سے فریاد کی۔ ”کیا یہ ضروری ہے؟ میں مشکل سے اندر آؤں گا۔“
”بہت ضروری ہے، تمہارے لیے بھی اور میرے لیے بھی۔“

شفقت اللہ نے آس پاس دیکھا۔ ساحل کے مخالف سمت کہیں کہیں جھاڑیاں تھیں اور بعض جگہوں پر زمین اونچی تھی۔ وہاں مکمل تاریکی تھی اور اگر منصف وہاں تھا تو شفقت اللہ اسے ہرگز تلاش نہیں کر سکتا تھا۔ یہ مشکل وہ ڈکی میں کھسا اور جب اس میں پوری طرح سما گیا تو منصف کی آواز آئی۔ ”ٹھیک ہے، اب باہر نکل آؤ۔“

موبائل شفقت اللہ کے کان سے لگا ہوا تھا اس لیے اسے پہلے لگا کہ آواز موبائل سے آئی ہے لیکن جب وہ باہر نکلا تو کچھ فاصلے پر ایک سیاہ ہیولے کو دیکھ کر اس کی کھلی بندھ گئی۔ وہ کب گاڑی تک آیا، اسے خبر نہیں ہوئی تھی۔ شاید اس وقت جب وہ ڈکی میں گھسنے کی کوشش کر رہا تھا۔ آنے والا سر سے پاؤں تک سیاہ لباس میں تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک لمبا سا پستول دکھائی دے رہا تھا۔ شفقت اللہ نے۔۔۔ یہ مشکل کہا۔ ”سائیں، میں نے آپ کا مطالبہ پورا کر دیا ہے۔ دو کروڑ روپے لے آیا ہوں۔“

”بیگ کھولو۔“ منصف نے اسے حکم دیا۔ اس کی شناخت اس کی آواز تھی۔ شفقت اللہ حکم سنتے ہی تیزی سے حرکت میں آیا۔ اس نے فرنٹ سیٹ پر رکھا بیگ اٹھایا اور اسے زمین پر رکھ کر اس کی زپ کھول دی۔ اندر نوٹوں کی گڈیاں بھری ہوئی تھیں پھر شفقت اللہ اسے گن کر دکھانے لگا۔ پانچ ہزار کے نوٹوں کی چالیس گڈیاں تھیں۔ منصف نے اسے ایک پیرا شوٹ بیگ دیا۔ ”ساری رقم اس میں ڈال دو۔“

شفقت اللہ نے اس حکم کی بھی تعمیل کی۔ بیگ کی ڈوری کھینچ کر اسے بند کیا اور منصف کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے بیگ لے کر شانے پر ٹانگ لیا اور بولا۔ ”شفقت اللہ۔۔۔ تم نے بد عنوانی کر کے اس سے کہیں زیادہ کمایا ہے۔“

”کہاں سائیں۔۔۔ آج کل اس طرح کمانا بھی مشکل ہو گیا ہے۔ ہر بندہ کھانے لگا ہے۔“

”تمہارا مطلب ہے کہ کھانے والے کم ہوں تو نی آدمی حصہ بڑھ جاتا ہے؟“
”بالکل سائیں۔“

”تب میں ایک بندہ کم کر دیتا ہوں۔ امید ہے اس

میرے ساتھ ہوتے ہیں۔ میں آدھے گھنٹے میں آرہا ہوں۔“
محمود نے اٹھ کر منہ دھویا اور کپڑے بدلے پھر اس نے الماری کھولی اور اس کے نچلے حصے میں رکھا جدید قسم کا پستول اور اس کے اضافی میگزین نکال لیے۔ پستول اس نے بیلٹ کے ساتھ کمر میں لگا لیا اور میگزین جیب میں رکھ لیے۔ پھر وہ کچن میں آیا اور اپنے لیے چائے تیار کی۔ محصوم سو رہا تھا، اسے جگانا مناسب نہیں تھا۔ چائے لے کر وہ لاؤنج میں آیا اور صبا کو کال کی۔ ”تم دونوں کہاں ہو؟“

”شاہد ظفر کے گھر کے پاس۔“

”منصف نے منیر الدین کو رقم سمیت بلالیا ہے۔“

”کہاں؟“

”سی ویو پر۔“

”ٹھیک ہے، ہم بھی وہیں آ رہے ہیں۔“

”نہیں، زیادہ لوگ ہوں گے تو کام خراب ہو سکتا ہے۔“

صبا فکر مند ہو گئی۔ ”محمود صاحب... وہ خطرناک آدمی ہے۔“

”تم فکر مت کرو، میرے پاس پستول ہے اور مجھے چلانا بھی آتا ہے۔ بیس فٹ کے فاصلے سے کولڈ ڈرنک کاٹن اڑا سکتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے، تب آپ مجھے بتاتے رہے گا۔“

”کوشش کروں گا۔“

انٹرکام پر اپارٹمنٹس کی گیٹ سکیورٹی نے رابطہ کیا اور فیصل کے بارے میں تصدیق چاہی۔ محمود نے اسے اندر بھیجنے کو کہا۔ ایک منٹ بعد وہ اس کے سامنے تھا۔ وہ ایک بڑا

سابیگ اٹھائے ہوئے تھا۔ ”کب تک لگتا ہے؟“

”بیس منٹ بعد۔“ محمود نے گھڑی کی طرف دیکھا۔

”تم چائے پیو گے؟“

”تیار ہے تو دے دیں ورنہ ضرورت نہیں ہے۔“

کیٹلی میں کچھ بچ گئی تھی، محمود نے اسے چائے دی۔

وہ اپنے آلات چیک کر رہا تھا۔ اس کے پاس ہائی پاور زوم کے ساتھ جدید ترین ڈیجیٹل کیمرہ تھا۔ یہ ٹھپ اندھیرے میں بھی ریکارڈنگ کر سکتا تھا اور نصف کلومیٹر کی دوری سے

انسان کا چہرہ صاف ریکارڈ کر سکتا تھا۔ وہ اس کی دو اضافی بیٹریاں بھی لایا تھا۔ ”یہ سپر ڈی وی ڈی کوالٹی کی ریکارڈنگ کرتا ہے۔ کسی بھی مووی کو براہ راست مونیٹر پر دکھا سکتا ہے۔“

بیس منٹ بعد وہ باہر نکلے۔ فیصل کی بائیک وہیں چھوڑ

سے کھانے والوں کا حصہ بڑھ جائے گا۔“

شفقت اللہ سمجھا نہیں لیکن جب منصف کے بے آواز

پستول سے شعلہ نکل کر اس کے سینے میں اتر ا اور وہ ایک جھٹکے

سے پیچھے اپنی کار سے نکل آیا تو اس کی سمجھ میں آ گیا لیکن تب

تک دیر ہو گئی تھی۔ گولی ٹھیک دل میں لگی تھی اور اسے مرنے

میں چند سیکنڈ لگے تھے۔ منصف نے جھک کر اس کی نبض

دیکھی اور پھر مطمئن ہو کر کار کے دروازے بند کیے اور

شفقت اللہ کا لایا ہوا خالی بیگ بھی اٹھا لیا۔ پھر اس نے جیب

سے ایک چھوٹا ڈیجیٹل کیمرہ نکال کر اس کی چند تصاویر

لیں اور پلٹ کر جھاڑیوں کی طرف چل پڑا۔ شفقت اللہ کی

لاش وہیں پڑی تھی۔ صبح سے پہلے اس کے دریافت ہونے کا

کوئی امکان نہیں تھا۔

☆☆☆

محمود سونے کی کوشش کر رہا تھا لیکن نیند اس کی

آنکھوں سے غائب تھی۔ صبح چار بجے موبائل کی بیل بجی، اس

نے اٹھا کر دیکھا۔ منیر الدین اسے کال کر رہا تھا۔ اس نے

کال ریسیو کی۔ منیر الدین ہیجان میں جھلا تھا۔ اس نے تیز

تیز لہجے میں کہا۔ ”ابھی اس کی کال آئی ہے، اس نے مجھے

ایک گھنٹے میں سی ویو پہنچنے کو کہا ہے۔“

”سی ویو کہاں پر؟“

”جگہ نہیں بتائی، بس اتنا کہا ہے کہ میں اس سڑک پر

سفر کرتا رہوں وہ خود مجھے کہیں روک لے گا۔“

”وہ بہت چالاک آدمی ہے۔ اس وقت سی ویو بالکل

ویران ہوتا ہے، غیر متعلقہ آدمی دور سے نظر آ جائے گا۔“

یہ بھی شکر تھا کہ منصف نے اسے آج ہی بلایا تھا۔

ورنہ دو دن بعد نئے سال کا آغاز ہونے والا تھا... ہر

نوجوان نیو ایئر ٹائٹ پر ساحل سمندر پر ضرور جاتا ہے۔

”مجھے بتائیں میں کیا کروں؟“ منیر الدین سخت

گھبرایا ہوا تھا۔

”آپ نے بیگ تیار کر لیا ہے؟“

”ہاں لیکن اس میں رقم نہیں ہے۔“

”ظاہر ہے۔ آپ ذرا لیٹ نکلیں اور اگر وہ دوبارہ

کال کرے تو گاڑی میں مسئلے کا بہانہ کر دیجیے گا۔“

”ٹھیک ہے، میں پانچ بجے نکلوں گا۔“

اس سے بات کرتے ہی محمود نے فیصل کو کال کی اور

اسے اپنے گھر آنے کو کہا۔ ”آدھے گھنٹے کے اندر پہنچ جاؤ اور

اپنے سارے آلات لانا... ٹیلی فون کی ضرورت ہوگی۔“

”آپ فکر نہ کریں، میرے سارے ایکویپمنٹ

دی تھی۔ محمود نے اپنی کار نکالی۔ باہر آتے ہی اس نے منیر الدین کو کال کی۔ ”آپ کہاں ہیں؟“

”میں بھی نکل رہا ہوں۔“

منیر الدین کو کلفٹن کی طرف سے آنا تھا۔ محمود نے اسے جگہ بتائی کہ وہ اسے کہاں مل سکتا ہے۔ اسے ملنے کے لیے محمود کو کچھ دور مخالف سمت میں جانا پڑتا۔ وہ ساحل سینٹرل ایونیو پر آپس میں ملتے۔ اس کے بعد وہ آگے پیچھے سفر کر سکتے تھے۔ محمود نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ فاصلے سے منیر الدین کی نگرانی کریں گے۔ اگر وہ خطرے میں ہوا تو محمود حرکت میں آجائے گا۔ سواپانچ بجے دونوں مطلوبہ مقام پر پہنچ گئے۔ منیر الدین نے کار اس کی گاڑی کے پاس روکی اور اتر کر نیچے آیا۔ ”میں یہاں تک آ گیا ہوں لیکن آگے میں اکیلا نہیں جاؤں گا۔“

”آپ فکر نہ کریں، ہم بھی ہیں۔“ محمود نے کہا۔

”آپ صرف دو ہیں اور وہ سب ہو گا۔۔۔ اگر اس نے مجھے گولی مار دی تو آپ کیا کر لیں گے؟“

”میرے پاس پستول ہے اور میں آپ کی حفاظت کر سکتا ہوں۔“ محمود نے اسے پستول دکھایا تو وہ کسی قدر مطمئن نظر آنے لگا۔

☆☆☆

صبا گاڑی میں موجود تھی۔ اس کی جاب کی نوعیت کی وجہ سے اسے بھی بھی رات کے وقت بھی جانا پڑتا تھا۔ اس صورت میں اسے قاخر لے کر جاتا تھا۔ صبا کے ماں باپ کی طرف سے اس کی اجازت تھی۔ اسی وجہ سے وہ آج بھی آسانی سے نکل آئی تھی۔ قاخر نے اسے وہیں رکھنے کو کہا اور خود اتر کر شاہ ظفر کے مکان کی طرف چلا گیا۔ محمود نے اسے لوکیشن بتا دی تھی جہاں اس نے کیمرے چھپائے تھے۔ اسے تجربہ نہیں تھا اس لیے ذرا مشکل سے اندر گیا اور تاریکی کی وجہ سے کیمرہ اور مائک تلاش کرنے میں بھی وقت لگا۔ وہ پون گھنٹے بعد آیا۔ جب تک صبا کا تشویش سے برا حال ہو گیا تھا۔ قاخر نے موبائل بھی آف کر دیا تھا اس لیے وہ اسے کال بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اس وقت ساڑھے پانچ بج رہے تھے۔ قاخر کے کار میں بیٹھتے ہی وہ اس پر برس پڑی۔ ”کیا سو گئے تھے اندر جا کر؟“

”شکر کرو واپس آ گیا۔ چیزوں سے ٹکرا کر حشر ہو گیا ہے۔ ایک تو روشنی کرنے پر پابندی تھی دوسرے کیمرہ اور مائک نہیں مل رہا تھا۔ بڑی مشکل سے دونوں چیزیں ملی ہیں۔“

”مجھے دو۔“ صبا نے کیمرہ اور مائک لے کر ان کا ڈیٹا لیپ ٹاپ میں منتقل کیا اور پھر پلیئر سے چلا کر دیکھنے لگی۔ پہلے اس نے کیمرے کی ریکارڈنگ چیک کی۔ دس منٹ بعد ایک سین دیکھ کر وہ اچھل پڑی۔ اس نے اسے بیک کر کے دیکھا اور پھر بے تابی سے محمود کو کال کرنے لگی۔

☆☆☆

منیر الدین ڈرا ہوا تھا لیکن محمود کے حوصلہ دلانے پر وہ آگے چلنے کے لیے تیار ہوا۔ ساحل سینٹرل ایونیو کا علاقہ سمندر کی زمین پر ڈیولپ کیا گیا ہے اس لیے یہاں سی ویو روڈ ساحل سے دور ہٹ گئی تھی۔ البتہ آگے جا کر یہ دوبارہ ساحل سے مل جاتی۔ یہ سارا علاقہ فی الحال غیر آباد تھا۔ کہیں کہیں اکاؤنٹا گھر تھے لیکن اکثر پورے پورے بلاک خالی پڑے تھے اور وہاں پر صرف جھاڑیاں تھیں۔ محمود نے منیر سے کہا کہ وہ رفتار میں کمی کر رکھے۔ وہ خود اس سے تقریباً دو سو گز دور تھا۔ اس نے احتیاطاً گاڑی کی ہیڈ لائٹس آف کر دیں۔ یہاں تاریکی تھی۔ کچھ دیر بعد سڑک دوبارہ ساحل کے پاس آ گئی۔ یہاں کہیں کہیں فوڈ اسپاٹ تھے لیکن اس وقت وہ بھی بند تھے۔ فیصل نے کیمرہ سنبھال لیا اور زوم کر کے منیر الدین کی کار کو فوکس کیے ہوئے تھا۔ اچانک اس نے کہا۔

”اسے کال آئی ہے، وہ موبائل کان سے لگائے ہوئے ہے۔“

منیر الدین نے کار روک دی۔ محمود نے بھی بریک لگائے لیکن انجن اسٹارٹ رہنے دیا۔ فیصل کیمرے کی آنکھ سے دیکھتے ہوئے رنگ کنٹری کر رہا تھا۔ ”وہ اب تک موبائل پر بات کر رہا ہے اور اب ہاتھ نیچے کر لیا ہے۔“

اچانک محمود کے موبائل کی بیل بجی۔ منیر الدین اسے کال کر رہا تھا۔ ”اس کی کال آئی ہے، اس نے مجھے یہیں اترنے اور شمال مشرق کی طرف جانے کو کہا ہے۔“

”ٹھیک ہے، تم چلو ہم تمہارے پیچھے ہیں۔“

”میں نے آپ کو کال ملائی ہے لیکن اس نے کال کی تو۔۔۔“

”تمہارے پاس کوئی دوسرا موبائل نہیں ہے؟“

”ہاں ہے۔“

”اس سے مجھے کال کرو اور موبائل جیب میں رکھ لو۔“

”میں تمہارے بارے میں باخبر رہوں گا۔“

منیر الدین نے ایسا ہی کیا اور محمود نے موبائل سے وینڈ فری لگا کر اسے جیب میں رکھ لیا اور فیصل سے کہا۔

نہیں آرہا۔“

☆☆☆

صبا نے موبائل واپس رکھ دیا اور قاخر سے بولی۔
”سی وی کی طرف چلو۔“

”اتنی دور۔“ وہ کراہا۔ ”اب کیا مصیبت آگئی؟“
”قاخر پلیز وقت ضائع مت کرو۔ محمود صاحب کی
زندگی خطرے میں ہے اور ان کے ساتھ دو افراد اور ہیں۔“
قاخر نے گاڑی کی رفتار تیز کی۔ ”لیکن ہوا کیا ہے؟“

قارئین متوجہ ہوں

پرچا
نہیں ملتا

کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں
کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔
ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش
ہے کہ پرچانہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون
کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ بک اسٹال کا نام جہاں پرچا دستیاب نہ ہو۔
☆ شہر اور علاقے کا نام۔
☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCL یا موبائل فون نمبر

رابطے اور مزید معلومات کے لیے

نصر عباس

03012454188

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

سینس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگشت

C-63 فیئر 11 ایکسپنشن ڈسٹری بیوٹرز اخباری بین کورنگی روڈ، کراچی

ممبروں کی فہرستیں

35802552-35386783-35804200

ای میل: jdpgroup@hotmail.com

”ایکشن کا وقت آگیا ہے برخوردار۔“

”خدا خیر کرے... میرے پاس شوٹنگ کے لیے
صرف کیمرہ ہے۔“

”فکر مت کرو۔“ محمود نے اسے پستول نکال کر
دکھایا۔ ”یہ بھی اچھی شوٹنگ کر سکتا ہے۔“

منیر الدین اپنی کار سے اتر گیا اس نے وہ پارسل
اٹھالیا جس میں ”رقم“ تھی۔ محمود نے اس پر نظر رکھی ہوئی
تھی۔ جیسے ہی وہ سڑک سے اترآ، یہ دونوں بھی حرکت میں
آگئے۔ فیصل نے کیمرہ ٹائٹ موڈ پر کیا ہوا تھا اور وہ دیکھ کر
محمود کو بتا رہا تھا کہ اب منیر الدین کہاں ہے۔ محمود نے اس
سے کہا۔ ”اسے نظر میں رکھو، ہمیں اس سے تقریباً سو گز دور
رہنا ہے۔“

اس طرف جھاڑیاں تھیں۔ منیر الدین ان سے بچتا
ہوا چل رہا تھا، اب تک کسی اور کی موجودگی کا اتنا پتا نہیں تھا
لیکن منصف یقیناً کہیں آس پاس تھا، تبھی اس نے منیر
الدین کی کار دیکھ کر اسے کال کی تھی۔ منیر الدین نے آہستہ
سے کہا۔ ”اگر اس نے آپ کو بھی دیکھ لیا تو...؟“

”تم فکر مت کرو۔ ہم تم سے دور ہیں۔ اس کی نظر
میں آنے کا امکان کم ہے اور اگر اس نے دیکھ بھی لیا تو
ضروری نہیں ہے کہ ہمیں تمہارے ساتھ ہی سمجھے۔“

”آپ مجھے کیسے دیکھ رہے ہیں؟“

”ہمارے پاس ٹائٹ ویژن ہے۔“

”اگر اس کے پاس بھی ہوئی تو؟“ منیر الدین کے
اس سوال نے محمود کو سوچنے پر مجبور کر دیا۔ واقعی اگر منصف
کے پاس بھی ٹائٹ ویژن ہوئی تو وہ اب تک انہیں بھی دیکھ
چکا ہوگا۔ ٹائٹ ویژن سے تو انہیں جھاڑیوں میں بھی دیکھا
جاسکتا تھا۔

”فیصل! آس پاس دیکھو، کوئی اور نظر آرہا ہے؟“

فیصل اب تک منیر الدین پر نظر رکھے ہوئے تھا۔
اس نے آس پاس کیمرہ گھما کر دیکھا لیکن اسے کہیں اور کوئی
روشن ہیولا نظر نہیں آیا۔ ”نہیں جناب اور کوئی نہیں ہے۔“

”منیر الدین اب کہاں ہے؟“

فیصل نے کیمرہ اس طرف کیا جہاں منیر الدین تھا
لیکن اب وہ وہاں نہیں تھا۔ فیصل نے آس پاس ہر جگہ
دیکھ لیا۔ اب کیمرہ خالی ماحول دکھا رہا تھا۔ ”وہ تو یہاں
نہیں ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ وہ غائب ہو گیا ہے... کیمرے میں

”یہ دیکھو۔“ صبا نے اسے ویڈیو کا مخصوص حصہ دکھایا اور پھر اسے بتایا کہ کیا ہوا تھا۔ فاخر سمجھ گیا اور اس نے توجہ سے ڈرائیونگ شروع کر دی۔ وہ صبا سے متفق تھا۔ صبا پھر محمود کو کال کرنے لگی مگر پہلے کی طرح اس کا نمبر انگیج جا رہا تھا۔ اس نے مضطرب لہجے میں کہا۔ ”پتا نہیں کیا بات ہے۔۔۔ فون کیوں انگیج کیا ہوا ہے؟“

”شاید کسی سے ضروری بات کر رہے ہوں۔“
”نہیں، میری چھٹی حس کہہ رہی ہے کڑ بڑ ہے۔“

☆☆☆

اچانک ہی منیر الدین کے سینے سے پستول کی ٹال لگی تھی۔ سیاہ پوش اتنی تیزی سے آیا کہ وہ کچھ کر ہی نہیں سکا۔ اس نے آرام سے منیر الدین کا موبائل نکال کر لائن کاٹ دی اور موبائل ایک طرف اچھال دیا۔ اس نے سر سے پاؤں تک سیاہ لباس پہنا ہوا تھا۔ چہرے پر نقاب تھا اور آنکھوں پر عجیب سے عینک تھی جس سے سرخی مائل روشنی سی جھلک رہی تھی۔ وہ سرگوشی میں بولا۔ ”آگے چلو۔“

منیر الدین نے بے چون و چرا حکم کی تعمیل کی۔ البتہ اس نے منصف کو مطلع کیا۔ ”میں رقم لایا ہوں۔“

منصف نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اسے لے کر تقریباً دوڑنے کے انداز میں جا رہا تھا۔ ہر قدم کے ساتھ وہ منیر الدین کو بھی دھکا دیتا تھا۔ ایک منٹ سے بھی پہلے وہ اس جگہ سے نکل گئے تھے۔ یہ اس ویران بلاک کا اندرونی علاقہ تھا۔ کچھ دیر بعد وہ ایک کھنڈر کے سامنے تھے۔ اتنی دیر میں منیر الدین محسوس کر چکا تھا کہ منصف ان کے پلان سے باخبر ہے، ابھی اس نے پہلے موبائل لیا تھا۔ اس کا خوف سے برا حال تھا۔ جب منصف نے اسے کھنڈر میں چلنے کو کہا تو اس نے گھٹکیا کر کہا۔ ”یہ سب محمود ایاز کی سازش ہے، اسی نے مجھے مجبور کیا تھا۔“

”میں جانتا ہوں۔“ منصف نے سرد لہجے میں کہا اور اپنا حکم دہرایا۔ ”اندر چلو۔“

منیر الدین لرزتے قدموں سے اس نیم تعمیر شدہ مکان میں داخل ہوا۔ بنانے والے نے آر سی سی اسٹرکچر کھڑا کر دیا تھا پھر شاید رقم نہیں رہی تو تعمیر کا کام بھی ادھورا رہ گیا۔ اس میں چار دیواری، کھڑکیاں، دروازے اور گیٹ تک نہیں تھا البتہ جا بے جا لمبا پڑا ہوا تھا۔ منصف اسے اندر کے کمرے میں لایا۔ یہاں ایمر جنسی لائٹ روشن تھی اور اس روشنی میں وہاں ایک شخص نظر آیا۔ منصف نے اندر آتے ہی عجیب و غریب کی عینک اتار دی تھی۔ منیر الدین نے

ایک بار پھر اسے رضا کارانہ مطلع کیا۔ ”محمود اور اس کا ایک ساتھی میرے پیچھے تھے۔“

”جانتا ہوں۔“ منصف نے اسے دھکا دیا۔ ”کچھ دیر میں وہ بھی یہیں ہوں گے۔“

دھکے سے منیر الدین زمین پر جا گرا۔ یہاں بجری پڑی تھی اس لیے اسے چوٹ نہیں آئی۔ دوسرا شخص پاس تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے اور منہ بھی ٹیپ لگا کر بند کیا ہوا تھا۔ منصف نے منیر الدین کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا اور ایک منٹ میں اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر منہ پر ٹیپ لگا دیا۔ ”اب تم آرام کرو، میں ان سے منٹ کر آتا ہوں۔“

اس نے ایمر جنسی لائٹ بند کی اور وہاں سے چلا گیا۔ اب وہاں گھپ اندھیرا تھا۔ منیر الدین کو لگا کہ اس کا آخری وقت آ گیا ہے۔ یہ سوچ کر ہی اس کا دم کھٹنے لگا۔

☆☆☆

”ٹریپ۔“ محمود نے فکر مندی سے کہا۔

”کیا مطلب؟“ فیصل گھبرا کر بولا۔

”اس نے ہمارا جوتا ہمارے سر پر مارا ہے۔ وہ بھی ٹائٹ ویژن رکھتا ہے اور اس نے ہمیں دیکھ لیا ہے۔ جب تم اسے آس پاس تلاش کر رہے تھے تو وہ منیر الدین کو لے گیا۔“

”کہاں؟“

”اسے دیکھنا ہوگا۔“ محمود نے کہا۔ ”تم کار کی طرف واپس جاؤ، میں اسے تلاش کرتا ہوں۔ اگر میں آدھے گھنٹے تک واپس نہ آؤں تو تم پولیس کو کال کر دینا۔“
”وہ تو مجھے لے جائے گی۔“ فیصل گھبرا کر بولا۔

”اچھا، یہ نمبر یاد کر لو۔ عبداللہ نامی آئی بی آفیسر ہے، تم اسے سب بتا سکتے ہو۔“ محمود نے کہا اور نمبر اس کے موبائل میں فیڈ کر دیا۔ وہ پہلے ہی دیکھ چکا تھا کہ کال کاٹی جا چکی ہے۔ اسی سے اسے اندازہ ہوا کہ منیر الدین ٹریپ ہو گیا ہے۔ یقیناً منصف ان کے بارے میں بھی جان گیا تھا۔ فیصل واپس کار کی طرف چلا گیا اور محمود محتاط انداز میں آگے بڑھا۔ اس نے وہ سمت ذہن میں رکھی جس سمت میں منیر الدین جا رہا تھا اور وہ اسی طرف غائب ہوا تھا۔ اس کے ذہن میں خدشہ تھا کہ منصف کے پاس ٹائٹ ویژن ہے اور وہ گھپ اندھیرے میں بھی اسے دیکھ سکتا ہے لیکن وہ اسے نہیں دیکھ سکے گا، اس کے باوجود وہ آگے بڑھتا رہا۔ اسے احساس تھا کہ اس کی وجہ سے منیر الدین کی جان خطرے میں پڑ گئی تھی۔ وہ ایک جگہ جھاڑیوں سے نکلا تو

اسے کچھ دور ایک نامکمل مکان کا کھنڈر دکھائی دیا۔ تاریکی میں اس کا ہیولا اور بھی بھیا تک لگ رہا تھا۔

☆☆☆

منصف باہر آیا۔ اس کا رخ سڑک کی طرف تھا۔ اس نے عینک دوبارہ لگائی تھی۔ یہ ٹائٹ ویژن بھی اور اس کی مدد سے وہ گھب اندھیرے میں بھی اچھی طرح دیکھ سکتا تھا مگر یہ اتنی طاقتور نہیں تھی کہ جھاڑیوں اور رکاوٹوں کے عقب میں بھی دکھا سکتی۔ وہ سڑک تک آیا۔ اسے دوسری کار میں ایک روشن ہیولا دکھائی دیا لیکن دوسرا آدمی نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ جھاڑیوں کی آڑ لیتے ہوئے کار کی طرف بڑھا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا اور وہ قار کرنے کے لیے تیار تھا۔ رفتہ رفتہ وہ کار کے نزدیک ہوتا جا رہا تھا۔ اب اندر بیٹھا ہوا آدمی صاف دکھائی دے رہا تھا، وہ محمود نہیں بلکہ اس کا ساتھی تھا۔ منصف رک گیا۔ وہ کچھ دیر ساکت رہا پھر اس کا پستول والا ہاتھ بلند ہوا۔ وہ فیصل کو شوٹ کرنے جا رہا تھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ قار کرتا، سڑک پر روشنی لہرائی۔ کوئی گاڑی اس طرف آرہی تھی۔ منصف تیزی سے پیچھے گیا اور جھاڑیوں میں ہو گیا۔ ایک لمحے کی تاخیر سے فیصل بچ گیا اگر روشنی ایک لمحے بعد لہرائی تو منصف اسے شوٹ کر چکا ہوتا۔ کار نزدیک آئی اور پھر محمود کی کار کے پاس رک گئی۔

کار سے صبا اور فاخر اترے۔ صبا تیزی سے محمود کی کار کے پاس آئی۔ فیصل کو دیکھ کر اس نے پوچھا۔ ”محمود صاحب کہاں ہیں؟“

”آپ کون ہیں؟“

”میرا نام صبا ہے اور میں محمود صاحب کے ساتھ کام کرتی ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ یہاں منصف کی تلاش میں آئے ہیں۔“

”ہمارے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔“ فیصل نے جلدی سے کہا۔ ”منصف جانتا تھا کہ منیر الدین کے پیچھے ہم ہیں۔ وہ اسے لے گیا اور محمود صاحب اس کے پیچھے گئے ہیں۔“ ”دھوکا تو بہت بڑا ہوا ہے۔“ صبا پریشان ہو گئی۔ ”وہ کس طرف گئے ہیں؟“

”اس طرف۔“ فیصل نے سمت بتائی۔ ”انہوں نے کہا تھا کہ اگر وہ آدھے گھنٹے تک واپس نہ آئیں تو میں پولیس یا آئی بی کو کال کر دوں۔“

”تم ایسا ہی کرو گے۔“ صبا نے کہا اور فاخر کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”پلیز... میری مدد کرو۔“

”میں تمہارے ساتھ ہوں۔“ فاخر نے محبت سے

کہا۔ ”لیکن ہم نہیں ہیں اور وہ مسلح ہوگا۔“ ”میں جانتی ہوں لیکن میں محمود صاحب کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتی۔“

”اور میں، تمہیں خطرے میں نہیں دیکھ سکتا۔“ فاخر نے کہا۔ ”تم یہیں رکو میں جا کر محمود صاحب کو تلاش کرتا ہوں۔“

”نہیں، میں بھی چلوں گی۔“ ”تم کچھ نہیں کر سکو گی۔“ فاخر نے اسے سمجھایا۔ ”بہتر ہے تم یہاں رکو بلکہ میرا مشورہ ہے کہ وقت کا انتظار مت کرو، ابھی آئی بی آفیسر کو کال کر دو۔ اگر پولیس وقت پر آگئی تو سب بچ جائیں گے اور منصف پکڑا جائے گا۔“ صبا نے سوچا اور سر ہلایا پھر جذباتی لہجے میں بولی۔ ”اپنا خیال رکھنا۔“

فاخر نے سر ہلایا اور سڑک پار کر کے جھاڑیوں میں غائب ہو گیا۔ صبا نے فیصل سے لے کر عبداللہ کا نمبر ملا یا۔ اس نے مناسب سمجھا کہ پولیس کے بجائے اسے کال کر لے۔ خاصی دیر بعد عبداللہ نے کال ریسیو کی اور جھنجھلا کر بولا۔ ”کون ہے؟“

”میں صبا ہوں، محمود صاحب کے ریفرنس سے بات کر رہی ہوں۔ ہم نے منصف کو تلاش کر لیا ہے۔ میں آپ کو پتا سمجھاتی ہوں۔ آپ فوراً آجائیں...“

☆☆☆

محمود ٹھٹک گیا تھا۔ مکان تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا اور کہیں روشنی کی ہلکی سی رمت بھی نہیں تھی لیکن اس کا دل کہہ رہا تھا کہ مکان خالی نہیں ہے۔ وہ محتاط قدموں سے اندر کی طرف بڑھا۔ پستول اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ مکان کے کھنڈر میں داخل ہوا تو اسے لگا جیسے کوئی ہلکی سی آواز نکال رہا ہو۔ آواز ایسی تھی جیسے بچہ غوں غاں کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ تذبذب میں پڑ گیا کیونکہ ایسی آوازیں ہوا سے بھی پیدا ہو سکتی تھیں۔ ٹھٹک کی وجہ صرف ایک تھی کہ کھلی فضا میں یہ آواز نہیں تھی اور اس نے صرف اندر آنے پر محسوس کی تھی۔ وہ اندازے سے ایک طرف بڑھا۔ جیسے جیسے وہ آگے بڑھ رہا تھا، آواز تیز ہو رہی تھی اور اب یہ واضح طور پر کسی انسان کی نکالی ہوئی آواز لگ رہی تھی لیکن وہ اتنا ٹھٹ کر کیوں بول رہا تھا؟ یہاں فرش کچا تھا اور جا بہ جا پتھر اور بجری کے ڈھیر پڑے تھے۔ اسے منہ بھل کر چلنا پڑ رہا تھا۔ ایک جگہ اسے آواز صاف سنائی دی اور اس نے آہستہ سے پوچھا۔

”یہاں کوئی ہے؟“

فوراً ہی آواز آئی اور وہ اس کے مخرج کی طرف بڑھا۔ اس کے پیر کی شخص سے کمرائے اس نے جھک کر ٹٹولا اور آدمی کے منہ سے بندھا ہوا ٹیپ آزاد کر دیا۔ وہ منیر الدین تھا، اس نے فوراً کہا۔ ”محمود صاحب! منصف یہاں ہے۔ اسی نے مجھے لا کر باندھا ہے۔ پلیز مجھے کھولیں، اس سے پہلے کہ وہ آجائے۔“

محمود تاریکی میں گرہیں ٹٹول رہا تھا۔ یہ نائلون کی رسی تھی اور گرہوں پر اس کی انگلیاں پھسل رہی تھیں۔ منیر الدین نے کہا۔ ”یہاں ایک ایمر جنسی لاسٹ ہے... اور ہاں ایک شخص اور ہے وہ بھی بندھا ہوا ہے۔“

محمود دوسرے شخص کی اطلاع پر چونکا۔ مگر فی الحال اسے منیر الدین کی زیادہ فکرت تھی وہ جلد از جلد اسے آزاد کرا کے یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ اب اسے افسوس ہو رہا تھا کہ اس نے فوری عبد اللہ ہاشم کو کال کیوں نہیں کی۔ رازداری کے چکر میں اس نے خود سمیت سب کو خطرے میں ڈال دیا تھا۔ بڑی مشکل سے اس نے منیر الدین کے ہاتھوں کی رسی کھولی اور کہا۔ ”اب تم پاؤں کی رسی خود کھولو، میں ذرا باہر دیکھتا ہوں... نہیں وہ آنے جائے۔“

وہ دیوار ٹٹولا ہوا باہر کی طرف بڑھا۔ رسی کھولتے ہوئے اس نے پستول جیب میں رکھ لیا تھا۔ دروازے تک آتے ہی جب اسے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا تو اس کا ہاتھ بے ساختہ جیب کی طرف گیا لیکن اس سے پہلے کوئی چیز اس کے جڑے پر آ کر لگی۔ ضرب شدید تھی۔ وہ الٹ کر کمرے میں آگرا۔ خیریت رہی کہ زمین کے بجائے بندھے ہوئے دوسرے شخص پر گرا تھا اس نے ناک سے آواز نکالی۔ چہرے پر لگنے والی چیز گھونسا تھا۔ محمود اٹھ رہا تھا کہ اس نے منصف کی آواز سنی۔ ”بس محمود ایاز... آرام سے لیٹے رہو۔ تم مجھے بالکل واضح نظر آ رہے ہو... اب اگر تم نے پستول نکالنے کی کوشش کی تو میں تمہیں شوٹ کر دوں گا جبکہ میں تمہیں شوٹ کرنا نہیں چاہتا۔“

”پھر تم کیا چاہتے ہو؟“ محمود نے سرک کر سیدھا بیٹھنے کی کوشش کی۔

”تمہیں جلد ہٹا چل جائے گا۔“

اتنی دیر میں محمود کی نظریں تاریکی سے کسی قدر مانوس ہو گئی تھیں۔ اس نے دروازے پر ایک ہیولا دیکھا۔ اس کی آنکھیں سرخی مائل انداز میں چمک رہی تھیں۔ محمود سمجھ گیا کہ اس نے ٹائٹ ویژن پہن رکھا تھا۔ محمود بدستور

پیچھے سرک رہا تھا لیکن اس انداز میں جیسے بیٹھنا چاہ رہا ہو۔ ”تم نے ڈاکٹر راشد کو بھی قتل کیا اور اب ان دونوں کو بھی مارنا چاہتے ہو...“

”میں شفقت اللہ کو بھی ٹھکانے لگا چکا ہوں۔ اس کی لاش یہاں سے کچھ دور موجود ہے۔ اب صرف منیر الدین بچا ہے، اسے بھی مار دوں گا۔“

”نہیں۔“ منیر الدین چیخ اٹھا۔

”خاموش۔“ منصف غرایا۔ ”تم لوگ معاشرے کے ناسور ہو۔“

”تم نے ان ناسوروں سے کروڑوں روپے وصول کر لیے ہیں۔“ محمود نے کسی قدر طنز سے کہا۔ اسی لمحے اسے کوئی چیز کمر میں چبھتی محسوس ہوئی۔ وہ اسے ٹٹولنے لگا۔

”یہ ان کی سزا ہے۔“ منصف نے کہا۔ ”میں اسے بھی مار دوں گا اور آج رات منصف کا قصہ بھی ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا۔“

”ایسا نہیں ہوگا شاہد ظفر... مجھ سمیت کئی افراد جان چکے ہیں کہ منصف تم ہو۔“

وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہوا پھر اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ ”اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ مجھے جو کرنا ہے وہ تو میں کروں گا۔“ منصف نے کہتے ہوئے اچانک فائر کیا اور گولی منیر الدین کے سر میں لگی۔ ایک لمحے کو شعلہ چمکا تو محمود نے بس اتنا دیکھا تھا۔ وہ چلا یا۔

”یہ کیا، کیا تم نے؟“

”وہی جو میں تمہارے ساتھ کرنے والا ہوں۔“ منصف نے کہا اور محمود کو اپنے روٹے کھڑے ہوتے محسوس ہوئے اسی لمحے تاریکی میں دوسرا شعلہ چمکا۔

☆☆☆

فاخر جھاڑیوں کے درمیان بھٹک رہا تھا اور اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ محمود کو کہاں تلاش کرے۔ آواز دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کیونکہ منصف بھی اس پاس تھا۔ صبا نے اسے منصف کے بارے میں جو بتایا تھا، وہ حیران کن تھا۔ وہ ایک جگہ جھاڑیوں سے لگلا تو اسے کچھ دور کی مکان کا اسٹرکچر دکھائی دیا۔ اس پورے علاقے میں یہی ایک اسٹرکچر تھا، باقی ساری زمین خالی تھی یا جھاڑیوں سے بھری ہوئی تھی۔ فاخر اس کی طرف بڑھا۔ وہ کھنڈر تک آیا تو اسے محسوس ہوا کہ کئی افراد آپس میں بات کر رہے ہیں لیکن آوازیں اتنی مبہم تھیں کہ انہیں ہوا کی سرسراہٹ بھی سمجھا جاسکتا تھا۔ مگر جب وہ کھنڈر میں داخل ہوا تو آوازیں واضح ہو گئیں۔ صبح کی

روشنی باہر تیز ہو رہی تھی لیکن اندر ہنوز تاریکی تھی۔

آوازوں نے اس کی راہنمائی کی۔ اچانک اس نے ہلکی سی شخص کی آواز سنی اور پھر اس نے محمود کی آواز سنی۔ وہ کسی سے کچھ کرنے کی وجہ پوچھ رہا تھا۔ پھر منصف کی آواز سنائی دی، وہ محمود کو کہہ رہا تھا کہ وہ اس کے ساتھ بھی ایسا ہی کرے گا۔ فاخر کو خطرے کا احساس ہوا۔ اس نے زمین پر بیٹھتے ہوئے ٹٹول کر ایک پتھر تلاش کیا اور اسے لے کر دے قدموں کمرے کی طرف بڑھا۔ اب اسے کسی قدر دکھائی دے رہا تھا۔ کمرے کے دروازے پر سیاہ پوش کھڑا تھا۔ فاخر نے پاس جاتے ہی پتھر اندازے سے اس کے سر پر مارا لیکن نشانہ چوک گیا۔ پتھر منصف کے شانے پر لگا تھا اور چلائی گئی گولی کہیں اور گئی۔ اس نے بے ساختہ بڑبڑا کر کچھ کہا اور ہاتھ گھمایا۔ پستول فاخر کی کٹپٹی پر لگا۔ ضرب شدید تھی، وہ پلٹ کر پیچھے آیا اور چکرا کر گر پڑا۔ منصف نے دوبارہ پستول کا رخ محمود کی طرف کر دیا۔

☆☆☆

صبا کار کے پاس کھڑی تھی۔ اس کا اضطراب سے بُرا حال تھا۔ فاخر کو گئے ہوئے دس منٹ ہونے کو آئے تھے۔ وہ بار بار جھاڑیوں کی طرف دیکھ رہی تھی کہ شاید وہاں سے کوئی نمودار ہو لیکن جب کوئی نہیں آیا تو اس نے فیصل سے کہا۔ ”تم یہاں روکو، میں اندر جا رہی ہوں۔“ فیصل پریشان ہو گیا۔ ”یہ ٹھیک نہیں ہے، آپ یہیں رکھیں۔“ ”نہیں، میں جا رہی ہوں۔“ ”تب میں بھی چلتا ہوں۔“ ”کسی کا یہاں رکنا ضروری ہے۔“ صبا بولی۔ ”میری آئی بی کے آفیسر سے بات ہوئی ہے۔ وہ پولیس کے ہمراہ یہاں آ رہا ہے انہیں گائیڈ کرنے کے لیے کسی کی یہاں موجودگی ضروری ہے۔“

مجبوراً فیصل کو اس کی بات ماننا پڑی۔ صبا دل کڑا کر کے جھاڑیوں کی طرف بڑھی۔ وہ بزدل نہیں تھی ورنہ اس پیشے میں نہ آتی لیکن ان دیران جھاڑیوں میں ایک قاتل بھی موجود تھا اور ایسے میں اچھے اچھے بہادر مرد وہاں جانے سے کتراتے۔ اگر فاخر نہ گیا ہوتا تو شاید صبا بھی جانے کی ہمت نہ کرتی۔ وہ دھڑکتے دل کے ساتھ جھاڑیوں میں داخل ہوئی۔ اب صبح کی روشنی اتنی ہو گئی تھی کہ راستے صاف دکھائی دے رہے تھے۔ جو راستہ محمود اور فاخر نے کئی منٹ میں طے کیا تھا، وہ صبا نے ایک منٹ میں طے کر لیا اور کھنڈر مکان کے سامنے جا نکلی۔ یہاں اور کچھ نہیں تھا اس

لیے وہ اس کھنڈر کی طرف بڑھی۔ ابھی وہ کچھ دور تھی کہ اندر سے فار کی آواز آئی۔ وہ بے ساختہ مکان کی طرف بھاگی۔

☆☆☆

محمود نے شعلہ چمکتے دیکھ کر آنکھیں بند کر لیں لیکن اسے منصف کی کراہ سنائی دی اور پھر وہ کسی اور لہجے میں بڑبڑایا تو محمود چونک گیا۔ اسی لمحے اس کی آنکھوں نے کمر میں چھپنے والی چیز کو ٹٹول لیا۔ یہ ایک چھوٹی ایمرجنسی لائٹ تھی محمود نے محسوس کیا کہ گولی اسے نہیں لگی ہے۔ پھر اسے کسی کے گرنے اور چیخ کی آواز آئی۔ اس نے ہاتھ آگے کیا۔ منصف کا ہیولا اس کی طرف پلٹ رہا تھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ اس پر فار کرتا، محمود نے ایمرجنسی لائٹ کو سرچ لائٹ موڈ پر آن کر دیا۔ بہت تیز روشنی بالکل سامنے سے منصف کی آنکھوں پر ٹپی جس نے لائٹ ویژن پہن رکھا تھا۔ اس کے لیے یہ روشنی ایسی تھی جیسے کسی کو عین دوپہر میں سورج دیکھنا پڑ جائے۔ منصف کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ اس کے ہاتھ بے ساختہ چہرے کی طرف گئے اور اس نے عینک اتار دی۔ مگر روشنی کا اثر تھا اور اسے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ عینک اتار کر وہ ویسے ہی اندھا ہو گیا تھا۔ محمود نے لائٹ بند کر دی اور ایک طرف سرکتے ہوئے جیب سے پستول نکالنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ ایسے زاویے سے گرا تھا کہ پستول جیب میں پھنس کر رہ گیا تھا۔ اس نے پہلو بدلا اور اسی چیز نے اسے بچا لیا۔ منصف نے نظر نہ آنے کے باوجود اس پر اندازے سے فار کیا اور گولی ٹھیک اس جگہ لگی جہاں وہ ایک لمحے پہلے تھا۔ محمود دھل کر رہ گیا۔ اس نے پستول نکالنے کی جدوجہد تیز کر دی۔ منصف پستول والا ہاتھ گھما رہا تھا اور اب اپنے اصل لہجے میں بول رہا تھا۔ ”محمود! تم مجھے شکست نہیں دے سکتے... میں تم سے سپر ہوں۔“

محمود خاموش رہا۔ وہ بولتا تو منصف کو اندازہ ہو جاتا کہ وہ کہاں ہے۔ اسی اثنا میں منصف نے مزید دو فار کیے لیکن دونوں گولیاں دور گئیں، البتہ ایک گولی نے دوسرے بندھے ہوئے شخص کی پنڈلی میں سوراخ کر دیا۔ وہ تڑپ کر رہ گیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اسے اب نظر آ رہا تھا اور اس نے دوبارہ عینک پہن لی تھی۔ فوراً ہی اسے محمود نظر آ گیا۔ اس نے پستول کا رخ اس کی طرف کیا لیکن اس سے پہلے محمود نے فار کر دیا، اس نے بہ مشکل پستول نکال لیا تھا۔ گولی منصف کے سینے میں لگی اور وہ جھٹکے سے پیچھے گیا۔ اس کے ساتھ ہی محمود نے دوبارہ ایمرجنسی لائٹ آن کر دی۔ وہ اٹھا اور دیوار کے ساتھ لگ کر آگے بڑھا۔ اس نے دروازے سے جھانک کر دیکھا تو

منصف نیچے گرا دکھائی دیا۔ وہ دیوار سے ٹکا ہوا تھا اور اپنے سینے سے اچلتے خون کو روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کا پستول ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ روشنی سے بچنے کے لیے اس نے دوبارہ ٹائٹ ویژن اتار دی تھی۔ محمود نے آگے بڑھ کر پستول مال سے پکڑ کر اٹھایا اور اپنی جیب میں رکھ لیا۔ اسی لمحے دوڑتے قدموں کی آواز آئی۔

”فاخر۔“ صبا نے چلا کر پکارا۔ فاخر جو اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا، اس کی آواز سن کر تڑپ اٹھا۔

”صبا... میں یہاں ہوں۔“

صبا دوڑتی ہوئی آئی اور اس سے لپٹ گئی۔ وہ رو رہی تھی اور فاخر کو ٹٹول کر دیکھ رہی تھی کہ اسے چوٹ تو نہیں آئی۔ محمود نے چند لمحے کے لیے اسے اور اس کی بے تابی کو دیکھا اور پھر پلٹ کر منصف کی طرف آیا۔ روشنی بہتر ہوتی جا رہی تھی۔ منصف گہرے سانس لے رہا تھا اور ہوش میں تھا۔ محمود نے دھکی لہجے میں پوچھا۔

”آپ نے یہ سب کیوں کیا؟“

”مجھے یہی کرنا تھا۔“ وہ زہریلے لہجے میں بولا۔

”اس معاشرے... ملک نے مجھے کیا دیا... میرے ٹیلنٹ کی کیا قدر کی... مجھ سے کہیں کمتر لوگ اعلیٰ عہدوں پر کام کر رہے ہیں۔“

”لیکن یہ سب...“

منصف نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ”میں نے یہ سب دولت اور انتقام کے لیے کیا۔“

فاخر کی طرف سے اطمینان کے بعد صبا اس کی طرف آئی۔ ”تم ٹھیک ہونا... فاخر ٹھیک ہے؟“

”میں بہتر ہوں۔“ فاخر نے سر کا ابھار دباتے ہوئے کہا اور منصف کی طرف دیکھا۔ وہ بدستور نقاب میں تھا لیکن یہ منصف والا نہیں بلکہ سادہ سیاہ نقاب تھا۔

”یہ پروفیسر ہے۔“ صبا نے انکشاف کیا۔ ”شاہد ظفر کے مکان میں اصل میں یہی سب رکھ رہا تھا۔ گہرے نے اس کی ویڈیو بنالی تھی۔“

”میں جانتا ہوں۔“ محمود نے آہستہ سے کہا۔ وہ صبا کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہا تھا۔ ”یہ اپنی اصل آواز میں بول رہے ہیں۔“

”آپ ٹھیک ہیں۔“ اب صبا کو اس کا خیال آیا۔

”ہاں، میں ٹھیک ہوں۔ تم نے پولیس یا ایٹمی جنس والوں کو کال کی؟“

”میں نے عبداللہ ہاشم کو کال کر دی ہے۔ وہ پولیس

کے ساتھ آرہا ہے۔“

”ایمبولینس کے لیے بھی کال کرو۔ اور ہاں، اندر دیکھو... ایک شخص بندھا پڑا ہے۔“

”وہ کون ہے؟“ صبا نے اندر جھانکا اور منیر الدین کی لاش دیکھ لی۔ ”میرے خدا... اسے بھی مار دیا۔“

”ہاں اور میرا خیال ہے کہ بندھا ہوا شخص شاہد ظفر ہے۔“

”ہاں، وہ شاہد ظفر ہے۔“ پروفیسر نے کھانس کر کہا۔ اس نے نقاب اتار دیا تھا۔ ”تم نے ایمبولینس بیکار میں بلائی ہے، میں بچوں کا نہیں۔“

محمود اس کے زخم کا جائزہ لے رہا تھا۔ ”زخم زیادہ خطرناک نہیں ہے۔ میرا خیال ہے آپ بچ جائیں گے۔“

پروفیسر ذرا سرک کر دیوار سے ٹک گیا اور عجیب سے لہجے میں بولا۔ ”خیال ہے تمہارا۔“

پروفیسر کی حالت کے پیش نظر محمود نے ایمبولینس کا کہا تھا... پروفیسر اس کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ ”میں جانتا ہوں تم بہت ذہین ہو اور میری طرح علم کی پیاس رکھتے ہو۔ پوچھو کیا پوچھنا ہے۔ میں مرنے سے پہلے تمہارے ہر سوال کا جواب دوں گا۔“

”آپ کو یہ خیال کب آیا؟“

”ایک سال پہلے جب ٹی وی پر تمہارا پروگرام دیکھا۔“

”آپ نے سارے شکار میرے پروگرام کے توسط سے چنے؟“

”ہاں، تم نے تحقیق کر کے میرا کام آسان کر دیا۔“

”لیکن آپ کے پاؤں میں تو کمزوری ہے اور آپ ٹھیک طرح چل نہیں پاتے؟“

پروفیسر نے ایک گہری سانس لی۔ ”اسی زخم نے تو مجھے اندر سے بدل دیا۔ میں نے تب ہی سوچ لیا تھا کہ اس معاشرے کو اس کے سکوں میں ادائیگی کروں گا۔ گولی چلانے والا ایک با اثر ہو کر ریٹ کا بیٹا تھا اس لیے صاف بچ گیا۔ پولیس نے اسے کیس سے نکال دیا۔ تم جانتے ہو وہ کس کا بیٹا تھا؟“

محمود نے سر ہلایا۔ ”ریاض احمد جو پہلے نشانہ بنا۔“

”بالکل، میں نے اسے سزا دی۔“

”کتنے لوگوں سے رقم وصول کی؟“

”بارہ افراد سے تقریباً تیس کروڑ روپے۔“ پروفیسر نے انکشاف کیا۔ ”لیکن کسی کو نہیں معلوم کہ یہ رقم کہاں

ہے۔ میرے مرنے کے بعد بھی وہ رقم کسی کو نہیں ملے گی۔“
 ”شاہد ظفر کو اس معاملے میں ملوث کرنے کی وجہ؟“
 محمود نے پوچھا۔

”میں اسے قربانی کا بکرا بنانا چاہتا تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ میرا الدین کا کام تمام کر کے شاہد ظفر کو پولیس کے سامنے ڈال جاؤں گا۔ اس کے خلاف ثبوت میں پہلے ہی اس کے گھر میں رکھ چکا ہوں۔ یہ پھنس جاتا اور میں صاف نکل جاتا۔ آج میں کامیاب ہوتا تو ایک مہینے بعد کسی دوسرے ملک میں ہوتا۔ میں نے اپنا استعفا بھی تیار کر لیا تھا۔ میں کروڑ بہت تھے۔ میں باقی عمر مزے سے گزارتا۔“ یہ کہتے ہوئے وہ عجیب سے رونے کے انداز میں ہنسا۔

محمود نے نظر جما کر اسے دیکھا۔ ”صرف شاہد ظفر نہیں، آپ ہم سب کو بھی ختم کرنے کا سوچ چکے تھے؟“
 ”تم سچ سچ ذہین ہو۔ میں نے ایسا ہی سوچا تھا لیکن ایسا ہوا نہیں۔“

”شاہد ظفر کے انتخاب کی وجہ؟“

”وہ اتنا ذہین نہیں ہے جتنا میں ہوں لیکن وہ اتنا ہی صاف گو ہے جتنا میں کوشش کے باوجود نہ بن سکا۔ میں ہر اس شخص سے نفرت کرتا ہوں جو مجھ سے آگے نکلنے کی کوشش کرتا یا آگے نکل جاتا ہے۔“

”مجھے کیوں اس معاملے میں ملوث کیا؟“

پروفیسر نے نظر جما کر اسے دیکھا۔ ”کئی وجوہات تھیں۔ ایک میں نے صحیح معنوں میں کسی کو ذہین پایا تو وہ تم ہو۔ جب میں تمہیں پڑھاتا تھا، تب بھی تم سے نفرت کرتا تھا حالانکہ میں تمہیں پسند بھی کرتا تھا۔ پھر تم چند سالوں میں اتنا آگے نکل گئے اور مقبول ہو گئے پھر تم نے دولت بھی کمالی، میں وہیں کا وہیں رہا۔ تمہارا استاد میں تھا مگر مجھے کچھ نہیں ملا۔“

”پروفیسر... کیا آپ تقدیر پر یقین نہیں رکھتے ہیں؟“

”تقدیر۔“ اس نے تلخی سے کہا۔ ”تقدیر کچھ نہیں ہوتی۔“

محمود نے اسے یاد دلایا۔ ”اگر تدبیر سب کچھ ہوتی تو اس وقت یہاں چند لاشیں اور پڑی ہوئیں اور آپ جا چکے ہوتے۔“

”میں نے کوشش کی اور ناکام رہا۔“ وہ کھانس کر بولا۔ ”شاید میری پلاننگ میں کوئی کمی رہ گئی تھی۔“

”پلاننگ میں نہیں، لک میں کمی رہ گئی۔“ محمود نے کہا

پھر چونکا۔ دور کہیں پولیس سائرن سنائی دے رہا تھا۔
 ”اب تم گرفتار ہو کر جیل جاؤ گے اور اپنے کیے کی سزا بھگتو گے۔“ صبا نے نفرت سے کہا۔

”ایسا نہیں ہوگا۔“ پروفیسر نے کہا۔ ان لوگوں کو پتا نہیں چلا کہ اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور اچانک ہاتھ نکال کر کوئی چیز منہ میں ڈال لی۔ اس سے پہلے کہ وہ اسے روکتے، اس نے وہ چیز چبا کر حلق سے اتار لی۔
 ”یہ کیا کھایا ہے آپ نے؟“ محمود مضطرب لہجے میں بولا۔

”سانڈ۔“ اس نے کہا۔ اسے ہلکا سا جھٹکا لگا اور پھر جس پہلو بیٹھا تھا اسی پہلو ڈھے گیا۔ محمود ذرا آگے ہوا تو اسے پروفیسر کے کھلے منہ سے سانڈ کی مخصوص بو آئی۔ اس کی طبیعت مالش کرنے لگی اور وہ بے اختیار باہر آ گیا۔ کھلی فضا میں آتے ہی اس نے الٹی کر دی۔ صبا اس کے پیچھے آئی۔ وہ اس کی پشت سہلا رہی تھی۔ محمود نے گہری سانس لیتے ہوئے اسے روکا۔

”میں ٹھیک ہوں۔“

اسی لمحے ایک پولیس موبائل اور ایک کار آ کر وہاں رکی۔ کار سے عبداللہ ہاشم اتر اٹھا۔ وہ محمود کی طرف آیا۔
 ”کیا ہوا ہے؟“

”خونی کھیل کا اختتام ہو گیا ہے۔“ محمود نے پلٹ کر کھنڈر کی طرف دیکھا۔ ”وہ اندر ہے اور مر چکا ہے۔“
 عبداللہ چونکا۔ ”مر گیا... کیسے؟“

”میری گولی سے زخمی ہوا پھر اس نے زہر کھالیا۔“
 ایک گھنٹے میں لاشوں اور واحد زخمی یعنی شاہد ظفر کو اسپتال روانہ کر دیا گیا۔ پولیس اور انٹیلی جنس کے آدمی جائے وقوعہ کا جائزہ لے رہے تھے۔ صبا فخر کے ساتھ جا چکی تھی۔ اب وہاں محمود تھا اور وہ عبداللہ کو بتا رہا تھا۔ ساتھ ہی وہ سوچ رہا تھا کہ اس کے پاس کرنے کے لیے آج ایک زبردست پروگرام تھا۔ اس نے عبداللہ کو بس اتنا بتایا، جتنا ضروری تھا۔ عبداللہ یہ جان کر حیران ہوا کہ منصف اصل میں پروفیسر شاد تھا جس کے جاننے والے اسے معذور اور کمزور سمجھتے تھے۔ جو یونیورسٹی میں اپنے شعبے کا سربراہ تھا۔ محمود کو ایک گھنٹے بعد جانے کی اجازت ملی۔ اس نے اپنے پروڈیوسر سے رابطہ کیا اور اسے آج کے ایجنڈا پر وگرام کے بارے میں بتایا۔ وہ شام بلکہ پروگرام کے وقت تک بہت مصروف رہا۔ اس دوران میں اس کا چینل مسلسل پروگرام کی تشہیر کرتا رہا اور کیونکہ یہ منصف کے حوالے سے تھی اس

لیے پورا ملک بے چینی سے پروگرام کا انتظار کر رہا تھا۔ انتظامیہ کی طرف سے منصف کی ہلاکت اور شناخت ہونے کا اعلان کر دیا گیا تھا۔

نوبے اس کا پروگرام شروع ہوا تو تقریباً ہر ٹی وی پر اسے ہی دیکھا جا رہا تھا۔ محمود نے پروفیسر شاد کا نفسیاتی تعارف کرایا۔ وہ بہت غریب پس منظر سے اوپر آیا تھا اور اپنی خداداد ذہانت کی وجہ سے کسی میدان میں آگے نکلا تھا۔ ہر کلاس میں ٹاپ کیا۔ پھر کالج اور یونیورسٹی میں ٹاپ کیا آخر میں اسے ایک غیر ملکی یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کے لیے مشروط اسکالرشپ ملی۔ واپسی پر اسے جاب مل گئی لیکن ساتھ ہی سازشوں اور نا اہلوں سے بھرا ہوا ماحول بھی ملا۔ یہاں نا اہل آگے رہنے کے لیے اہل لوگوں کو پیچھے دھکیلتے تھے۔ ہر شخص کسی نہ کسی گروپ سے منسلک تھا اور جو کسی گروپ سے منسلک نہیں تھا، وہ مشکلات کا شکار رہتا تھا۔ پروفیسر کے ساتھ بھی یہی ہوا۔

ایک جھگڑے میں جان بوجھ کر اسے گولی کا نشانہ بنایا گیا اور گولی چلانے والے کو پولیس نے ایف آئی آر سے نکال دیا۔ پروفیسر کو علاج کا خرچ تک نہیں ملا۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی اچھے نجی ادارے میں پڑھائے جہاں اچھا مشاہرہ مل سکتا تھا لیکن اسے اجازت نہیں ملی۔ اس نے شادی کی جو ناکام رہی۔ ان ناکامیوں نے پروفیسر کو بخ کر دیا۔ اس کا المیہ اس کی ذہانت تھی۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ نا اہل اور نکلے لوگ آگے ہیں اور اس کے اندر تلخیوں کا غبار بھرتا رہا۔ محمود نے پروگرام میں صبا کے ساتھ چند ایسے افراد کو مدعو کیا تھا جو پروفیسر کو جانتے تھے۔ اس نے ایک ماہر نفسیات کو بھی بلایا جس نے پروفیسر کے کردار پر اس حوالے سے روشنی ڈالی۔ صبا نے تفصیل سے بتایا کہ اس نے منصف کو سامنے لانے کے لیے کتنی کوشش کی۔ محمود نے اسے سمجھادیا تھا کہ کن باتوں کا ذکر کرنے سے گریز کرنا ہے۔ صبا نے ان کو مد نظر رکھتے ہوئے تفصیلات دی تھیں۔ آخر میں محمود نے پروگرام ختم کرتے ہوئے کہا۔

”جب کم تر اور نا اہل لوگ اعلیٰ و اہم عہدوں پر بیٹھ کر ملک و قوم کے فیصلے کرنے لگیں تو پروفیسر شاد جیسے ذہین لوگوں کے پاس اپنی ذہانت آزمانے کے لیے منصف بننے کے سوا کوئی راستہ نہیں رہ جاتا۔ اس نے اپنی ذہانت ثابت کر دی لیکن قسمت سے نہیں لڑ سکا۔“

محمود پروگرام کر کے اسٹوڈیو سے باہر آیا تو اس کا حالانکہ وہ ملکی ٹی وی کی تاریخ کا کامیاب ترین پروگرام

کر کے آیا تھا۔ اس کے عملے نے اسے مبارک دی مگر اسے خوشی نہیں ہوئی۔ اپنا کام کر کے صبا باہر آگئی تھی۔ اس نے مبارک باد دی تو اس نے گہری سانس لی۔ ”مجھے سب اچھا نہیں لگ رہا ہے۔ پروفیسر نے غلط راستہ اختیار کیا لیکن مجھے اس کی موت پر افسوس ہو رہا ہے۔“

”اب مجھے بھی افسوس ہو رہا ہے۔ اس وقت فاخر کی حالت دیکھ کر مجھے اس پر غصہ آ رہا تھا۔“

محمود نے اس کی طرف دیکھا۔ ”فاخر خوش قسمت ہے کہ اسے تمہاری محبت ملی ہے۔“

صبا نے نظریں چرا کیں۔ ”میں بھی خوش قسمت ہوں۔ مجھے آپ کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا اور میں نے آپ سے بہت کچھ سیکھا ہے۔“

”تم آگے جاؤ گی۔“ محمود نے کہا۔ ”میری نیک تمنا میں تمہارے ساتھ ہیں۔“

صبا مسکرائی۔ ”میں پروگرام کر کے باہر آئی ہوں، صرف دس منٹ میں مجھے دو مختلف چینلز کی طرف سے آفرز آچکی ہیں۔“

”جلدی میں کوئی فیصلہ مت کرنا۔ اچھی طرح دیکھ بھال کر آفر قبول کرنا۔“ محمود اسے اپنے دفتر میں لے آیا۔

”میں نے بھی یہی سوچا ہے۔“ صبا نے کہا پھر جھجکتے ہوئے بولی۔ ”آپ اکیلے ہیں، میں چاہتی ہوں آپ اکیلے نہ رہیں۔“

”چاہتا تو میں بھی یہی تھا۔“ محمود نے آہستہ سے کہا۔ ”میں پروفیسر کے برعکس تقدیر کا قائل ہوں۔ میری تقدیر میں شاید تنہائی لکھی ہے۔“

صبا نے سر جھکا لیا۔ ”آئی ایم سوری...“

”خیر... تمہیں معذرت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میری قسمت میں نہیں تھا۔“ محمود نے جلدی سے کہا۔

”اب میں چلوں گی۔“ صبا کھڑی ہو گئی۔ ”دیر ہو رہی ہے۔“

”میں تمہیں ڈراپ کر دوں گا۔“ محمود نے چابیاں اٹھاتے ہوئے کہا۔

آدھے گھنٹے بعد وہ واپس اپنے گھر کی طرف آ رہا تھا تو اس نے خود کو بچ بچ بہت اکیلا محسوس کیا۔ اس نے ٹھیک کہا تھا، بعض لوگوں کی قسمت میں تنہائی ہوتی ہے۔ قدرت انہیں سب کچھ دے دیتی ہے... بس کسی کا ساتھ نہیں دیتی۔





ان جان لیوا لمحات کی اذیتیں جب سانپ کا زہر بھی تریاق بن جاتا ہے...

ہیرو

آصف ملک

مسرت اور غم... آنسو اور قہقہے... توانائی اور کمزوری جیسے لوازمات کے ساتھ ہی زندگی کی گاڑی دوڑتی... بھاگتی چلی جاتی ہے... غم و آلام اور گہما گہمی کی ہلچل میں نہ جانے کتنا پانی پلوں کے نیچے سے گزر جاتا ہے... زندگی کے بیت جانے کا احساس ہوتا ہے تو اس وقت جب اختتام کی گھڑیاں دموں پر ہوں... محاذِ جنگ پر یک وقت نہا مشکلات سے دو چار ہو جانے والے ایک ایسے ہی شخص کی تیز رفتار کہانی... جسے اپنے مطلوبہ ہیرو کی تلاش تھی...

”پاپا! ہم فرانس کیوں جا رہے ہیں؟“ جیری نے

سوال کیا۔

”ہاں پاپا! ہم ہوائی بھی تو جاسکتے ہیں۔“ میری سترہ سالہ بیٹی گلوریا نے جوش سے کہا۔ اسے غسلِ آفتابی کا شوق تھا۔ ستر کی دہائی میں امریکا میں غسلِ آفتابی کا بخار عروج پر تھا۔ گلوریا اور کسی حد تک ماریا بھی غسلِ آفتابی کی شوقین تھیں۔ ماریا میری بیوی ہے۔ ہم امریکا کی نہایت شمالی ریاست مینے میں رہتے ہیں اور درحقیقت کینیڈا کی سرحد سے صرف

چند میل دور تھے۔ اس سے آگے شمال میں امریکی سرزمین صرف الاسکا کی تھی۔ ہماری نہایت خوب صورت ریاست ہے۔ یہاں سال کے چھ مہینے برف پڑتی ہے اور چھ مہینے موسم کسی قدر خوشگوار ہوتا ہے لیکن اس دوران میں بھی بیشتر وقت بادل چھائے رہتے ہیں اور ایسے میں غسلِ آفتابی کا شوق پورا کرنا مشکل تھا۔

ریاست میں بہت گھنے اور اعلیٰ لکڑی والے جنگل ہیں اور میرا کام ہی لکڑی کا ہے۔ میں ایک کارپینٹر ہوں اور لکڑی سے گھریلو استعمال کی بے شمار اشیاء تیار کرتا ہوں۔ میں ہمیشہ بہت اعلیٰ اور مہنگی چیز بناتا ہوں۔ ایک وقت میں ایک ہی کام کرتا ہوں۔ اس کے باوجود میرے پاس کام کی کمی نہیں ہے۔ مجھ سے کام کرانے کے متمنی انتظار کر لیتے ہیں لیکن کسی دوسرے کے پاس نہیں جاتے۔ میری آمدنی مناسب ہے یعنی میں اپنا گھر اچھے طریقے سے چلا سکتا ہوں۔ گھر اور ورکشاپ ساتھ ساتھ ہے۔ مکان کے سامنے بہت خوب صورت لان اور باغ ہے۔ گزشتہ دس سال سے ہم ہر موسم گرما میں تفریح کے لیے ملک میں اور بعض اوقات ملک سے باہر بھی جاتے ہیں۔ ہم کیوبا، جمیکا اور کینیڈا جاکے تھے۔ اس بار میں نے فرانس جانے کا فیصلہ کیا تو بچے معترض ہوئے۔ ماریا کو بھی حیرت ہوئی۔

”ڈیر! ہم فرانس کیوں جا رہے ہیں؟ ہم برطانیہ بھی تو جاسکتے ہیں۔“

برطانیہ میرا آبائی وطن ہے لیکن میں انگریز نہیں بلکہ آئرش ہوں اور انگریزوں نے میری قوم کو غلام بنایا ہوا ہے۔ میں فیصلہ کر کے نکلا تھا کہ دوبارہ وہاں نہیں جاؤں گا۔ اگرچہ میں نے بھی ماریا کو اس بارے میں نہیں بتایا تھا لیکن وہ جب مجھ سے برطانیہ جانے کا کہتی، میں اسے ٹال جاتا۔ ویسے بھی وہاں اب میرا کوئی قریبی رشتہ دار نہیں تھا۔ میرے دو بھائی کینیڈا کی شہریت لے چکے تھے جبکہ میری اکلوتی بہن مینے میں ہی تھی۔ میں یہاں آتے ہوئے اسے ساتھ لے آیا تھا۔ اس نے امریکا میں تعلیم مکمل کی اور اب شادی کر کے اپنے شوہر اور تین بچوں کے ساتھ خوش و خرم زندگی گزار رہی تھی۔ اس لیے برطانیہ جانا ضروری نہیں تھا۔ اس بار بھی میں نے انکار کر دیا۔ ”میں وہیں پیدا ہوا اور پلا بڑھا ہوں، وہاں تم لوگوں کے لیے دیکھنے کو کچھ نہیں ہے اور جہاں تک فرانس کا تعلق ہے تو اس کے جنوب مشرقی ساحل غسلِ آفتابی کے لحاظ سے بہترین ہیں۔“

”رہنمائی پا پا۔“ مگور یا خوش ہو گئی۔

”ہاں۔“ میں نے پُر خیال انداز میں کہا۔ بچے خوش ہو گئے لیکن ماریا کھٹک گئی۔ آخر وہ بیوی تھی۔ اس نے رات کو بیڈروم میں آتے ہی مجھے پکڑ لیا۔

”کرس! صبح صبح بتاؤ تم نے فرانس جانے کا کیوں کہا ہے؟“

ماریا میری بیوی تھی اور گزشتہ اٹھارہ سال سے میرے ساتھ تھی۔ ہمارے درمیان بہت اچھی ہم آہنگی تھی۔ وہ مجھے بہت اچھی طرح جانتی تھی۔ وہ سمجھ گئی کہ میں صرف گھومنے پھرنے کے لیے فرانس نہیں جانا چاہ رہا اور یہ بچ بھی تھا۔ ماریا میری سابق زندگی سے اتنا ضرور واقف تھی کہ اسے علم تھا۔۔۔ میں دوسری جنگِ عظیم میں برطانوی فوج کی طرف سے فرانس میں نازی جرمنوں سے لڑ چکا ہوں۔ درحقیقت میری فوجی زندگی کا بڑا حصہ فرانس میں گزرا تھا۔ میں نے ماریا کو ٹالنے کی کوشش کی۔

”میں نے فرانس میں خاصا وقت گزارا ہے۔ میں ایک بار پھر وہاں جانا چاہتا ہوں۔“

”کسی خاص جگہ؟“ ماریا نے جرح کی۔

”گرینویل۔“ میں نے ٹھنڈی سانس لی۔

”جہاں تم جنگ کے زمانے میں ہوتے تھے۔“ ماریا نے جرح جاری رکھی۔

”نہیں، یہ جگہ مارسیلز سے صرف سو میل کے فاصلے پر ہے اور جنگ وہاں نہیں ہوئی تھی۔ میں تمہیں اور بچوں کو وہاں چھوڑ کر صرف ایک یا دو دن کے لیے جاؤں گا۔“

”تم اکیلے کیوں جاؤ گے؟“

”کیونکہ میں وہاں کسی کو تلاش کرنا چاہتا ہوں۔“ میں رفتہ رفتہ ماریا کے جال میں پھنس رہا تھا۔ جیسے مکھابا لا آخر لکڑی کے جال میں پھنس جاتا ہے۔

”کس کو؟“

میں نے گہری سانس لی۔ ”میرا خیال ہے کہ میں تمہیں پوری کہانی سنا دوں۔“

”تو یہ کام تمہیں پہلے کر لینا چاہیے تھا۔“ ماریا غصے سے بولی۔ ”میں سوچ بھی نہیں سکتی کہ شادی کے اٹھارہ سال بعد بھی تم مجھ سے باتیں چھپاتے ہو۔“

☆☆☆

ابھی میں صرف بیس سال کا تھا اور اکیڈمی سے نکلا تھا کہ مجھے ایک برطانوی دستے کے ساتھ فرانس روانگی کا حکم ملا۔ میرا فوج میں جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا بلکہ میں تو اپنا آبائی پیشہ اپنانا چاہتا تھا۔ ہمارا خاندان دس نسلوں سے

مقابلہ کرنے کے بجائے وہ اپنی وردی ترک کر کے عام فرانسیسی بن جائیں اور پھر منظم ہونے والی مزاحمتی تحریک کے پلیٹ فارم سے جرمنوں کا مقابلہ کریں مگر اس وقت فرانسیسی کمانڈر کرنل بیلکون کچھ زیادہ ہی جوش میں آگیا تھا۔ اس نے اپنی محدود فوج کے ساتھ میٹز کے ارد گرد دفاعی لائن بنانا شروع کر دی۔ حالانکہ جرمن اس سے کہیں بڑی اور لاکھوں فوج پر مشتمل دفاعی لائنیں بس چند دنوں میں نہیں نہیں کر چکے تھے۔ یہ چند ہزار فرانسیسی اور برطانوی فوجی حملہ آور جرمنوں کا کیا باگاڑ لیتے۔ جو سیلاب کی طرح بڑھے چلے آ رہے تھے۔

میٹز پر نازی قبضے کی اطلاع ہمیں صبح میں ناشتے پر ملی۔ یہ خبر سننے ہی فرانسیسی سپاہیوں کے منہ لٹک گئے اور۔۔۔ برطانوی فوجیوں کی ہوائیاں اڑنے لگیں کیونکہ ہاتھ لگنے والے ہر برطانوی فوجی کو فوری طور پر جرمنی کے وسط میں ان خاص فوجی کیپوں کی طرف روانہ کر دیا جاتا تھا جو خاص طور سے برطانوی فوج کے لیے تیار کیے گئے تھے۔ وہاں زندگی جہنم سے کم نہیں تھی اور سننے میں آیا تھا کہ وہاں قیدیوں کو خاص سائنسی اور کیمیائی تجربات کا نشانہ بنایا جاتا تھا اس لیے میٹز پر جرمن قبضے کی خبر ہمارے لیے خاص طور سے فکر انگیز تھی۔ فوری طور پر برطانوی افسران نے اس خبر کے سلسلے میں میننگ کی اور اس میں طے ہوا کہ برطانوی فوجی فوری طور پر اپنے ساز و سامان کے ساتھ ڈنکرک کی طرف پسا ہوں گے۔ تاخیر کی صورت میں جرمن اس کی طرف جانے والے راستے بھی بند کر دیں گے۔

جرمن، میٹز پر قبضے کے بعد بڑی چالاکي سے گھیرا تنگ کر رہے تھے۔ ان کی حکمت عملی حیران کن تھی۔ پہلے انہوں نے شیروں کی سی دلیری سے حملہ کیا اور تعداد میں گنتی گنا زیادہ اور سرح برطانوی و فرانسیسی فوج کو بدحواس کر کے پسا ہونے پر مجبور کر دیا۔ اس کے بعد وہ اب چھوٹے چھوٹے دستوں سے براہ راست ڈنکرک کے بجائے انہیں دباؤ میں لا کر ہتھیار ڈالنے پر مجبور کرنے کی پالیسی پر عمل پیرا تھے تاکہ کم سے کم جانی نقصان ہو۔ چھوٹے دستوں سے لڑائی میں زیادہ جانی نقصان ہوتا ہے اور جرمن اس سے فائدہ اٹھا رہے تھے۔ یہ ان کی چالاکي تھی کیونکہ جیسے جیسے جرمن دوسرے ممالک پر قابض ہو رہے تھے، انہیں زیادہ افرادی قوت کی ضرورت پڑ رہی تھی تاکہ مقبوضہ ممالک پر اپنی گرفت مضبوط رکھ سکیں۔ مگر ساتھ ہی وہ فرانس کے اہم شہروں اور مقامات پر قبضے میں تاخیر بھی نہیں کر رہے تھے۔

بڑھتی چلا آ رہا تھا۔ میرے ایک پردادا بکھنگم پبلش میں کام کر چکے تھے مگر ہائی اسکول پاس کرتے ہی میں جبری بھرتی کی زد میں آگیا۔ 1938ء میں ہی ہٹلر کے عزائم واضح ہو گئے تھے اور برطانیہ اپنے دیرینہ دشمن یعنی فرانس سے جرمنی کے خلاف اتحاد کر چکا تھا۔ فرانس اور برطانیہ مل کر جرمنی کے خلاف دفاعی لائن بنارہے تھے۔ میں اس دفاعی لائن کا ایک حصہ تھا۔ میرا دستہ شمال مشرقی فرانس میں جرمنی کی سرحد سے صرف تیس میل دور میٹز میں تعینات تھا۔ یہ ہموار میدانی علاقہ تھا اور یہاں فرانس کی چند اہم ترین دفاعی تنصیبات تھیں۔ برطانوی اور فرانسیسی دستے مل کر یہاں فضائی حملے سے بچاؤ کی مشقیں کر رہے تھے۔ میرے دستے میں سارے نو آموز تھے اور ہمیں یہاں بھی تربیت ہی دی جا رہی تھی۔

مگر 1939ء کے آغاز کے ساتھ ہی صورت حال بدل گئی۔ جرمن فوجوں نے پہلے مشرقی یورپ پر چڑھائی کی اور دیکھتے ہی دیکھتے پولینڈ، آسٹریا اور ہنگری فتح کر لیے۔ اس کے بعد جرمن فرانس، سیلیمیم۔۔۔ اور لکسمبرگ کی طرف متوجہ ہوئے۔ فوراً فرانس میں اتحادی افواج کو ہنگامی جنگی مشقوں کا حکم ملا اور ہم جنگ کی تیاری کرنے لگے۔ مگر جب جرمن، فرانس پر چڑھ دوڑے تو یہ ساری تیاریاں دھری رہ گئیں۔ مئی کے آغاز میں جرمن، فرانس میں داخل ہوئے اور وسط جون تک وہ پیرس پر قابض ہو چکے تھے۔ اس کے ساتھ ہی فرانسیسی فوجوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ برطانیہ کے بڑے دستے پہلے ہی ڈنکرک کی طرف سے پسا ہو چکے تھے اور ان کے ساتھ تقریباً گیارہ ڈویژن فرانسیسی فوج بھی ان کے ساتھ برطانیہ چلی گئی تھی۔ مگر اس سے کہیں زیادہ تعداد میں فرانسیسی فوج جرمنوں کی قید میں چلی گئی ان کی تعداد بیس لاکھ کے قریب تھی اور انہیں جرمنی منتقل کیا گیا تھا۔ کچھ قیدی اٹلی کے قید خانوں میں بھی منتقل کیے گئے تھے۔

جرمنوں کی پیش قدمی کے آغاز کے وقت ہی اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے ہمارے ساتھ موجود فرانسیسی کمانڈر نے فیصلہ کیا کہ وہ ہتھیار نہیں ڈالیں گے اور آگے بڑھنے والی جرمن فوج کے خلاف مزاحمت کریں گے۔ دوسری طرف برطانوی حکومت طے کر چکی تھی کہ اس کے سپاہی کسی صورت دشمن کی قید میں نہیں جائیں گے اور انہیں پسپائی کا حکم دے دیا گیا تھا۔ مئی کے دوسرے ہفتے کے آغاز میں جب ہم پسپائی کی تیاری کر رہے تھے، میرے دستے کے کمانڈر کرنل بیگرنے فرانسیسیوں کو خبردار کیا کہ جرمنوں کا

کرنل بیکر اور دوسرے برطانوی افسران نے اپنے سپاہیوں کو تیاری کا حکم دیا اور وہ روانگی کی تیاری کرنے لگے۔

میرے دستے میں کل بارہ فوجی تھے۔ ہمارا کمانڈر لیفٹیننٹ پال ایڈمر تھا۔ ہمارے پاس دو چھوٹی توپیں اور ان کا ایمونیشن اور ذاتی سامان تھا لیکن اسے ڈھونڈنے کے لیے ہمارے پاس کوئی گاڑی نہیں تھی۔ لیفٹیننٹ پال نے افسران کو اس امر سے آگاہ کیا تو ان کی طرف سے حکم آیا کہ روانگی سے پہلے توپیں تباہ کر دی جائیں۔ ایسے ہی احکامات دوسرے دستوں کو بھی دیے جا رہے تھے۔ یہ بات بھی یقینی تھی کہ اس طویل سفر میں بھاری اسلحہ لے جانا ممکن نہیں تھا۔

انگلینڈ سے روانگی ہو رہی تھی کہ جرمن طیاروں نے حملہ کیا اور بے شمار سپاہی اس حملے کا شکار ہوئے۔ یہ ہمارے لیے غیر متوقع تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ جرمنوں نے بہت تیزی سے فرانسیسی سرحد کے پاس اپنے ناکارہ ہونے والے ائربیس قابل استعمال بنا لیے تھے۔ ان ائربیسز کو رائل برٹش ائرب فورس نے خاص طور سے نشانہ بنایا تھا تا کہ پسپا ہوتی فوج کے خلاف استعمال نہ ہو سکیں۔ اب ایک خدشہ اور پیدا ہو گیا تھا۔ فضائی استعداد حاصل کرنے کے بعد جرمن ڈنکرک جانے والے راستوں پر اپنے زمینی دستے اتار سکتے تھے۔ حملہ ختم ہونے کے بعد سب کو دوبارہ جمع کیا گیا اور نقصان کا اندازہ لگا کر دوبارہ سے روانگی کے لیے تیاری کی گئی۔ حملے میں زیادہ تر گاڑیاں نشانہ بنی تھیں اس لیے اب بہت سارے سپاہی پیدل سفر کرنے پر مجبور تھے۔ یہی جرمن چاہتے تھے۔ وہ سپاہی کا برطانوی منصوبہ بھانپ گئے تھے اور اب اس میں روڑے لگانے کی ہر ممکن کوشش کر رہے تھے۔ گاڑیاں تباہ ہونے کے بعد لازمی ہو گیا تھا کہ مزید سامان یہاں چھوڑا جائے۔ سپاہی اور نچلے درجے کے افسران کا خیال تھا کہ سامان کو چھوڑ کر اور تمام گاڑیوں میں افراد کو سوار کر کے ہر ممکن تیزی سے ڈنکرک کی طرف روانہ ہوا جائے۔ مگر اعلیٰ افسران کو سامان کی پڑی تھی۔ یہاں کل دوسو ستر برطانوی آدمی تھے اور ہمارے پاس بارہ گاڑیاں تھیں جن میں چھ بڑے ٹرک تھے۔ اس کے علاوہ دو جیپیں اور چار درمیانے ٹرک تھے۔ اگر سامان ہٹا دیا جاتا تو یہ تمام افراد آرام سے ان گاڑیوں میں آسکتے تھے۔

توقع کے عین مطابق ہمارے دستے کو پیدل مارچ کا حکم دیا گیا۔ دو سو فرانسیسیوں پر مشتمل ایک دستے نے ہمارا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا اور ہم نومی کے دن ڈنکرک کی طرف روانہ ہوئے۔ مشینی ٹرانسپورٹ سے یہ صرف ایک دن کا سفر

تھا اور اگر حالات ٹھیک ہوتے تو ہم پانچ سے چھ دن میں پیدل چل کر ڈنکرک پہنچ جاتے مگر یہاں تو جنگ چھڑی ہوئی تھی۔ جرمن زمینی دستے ہم سے دور تھے لیکن ان کے طیارے ہم پر منڈلاتے رہتے تھے۔ پہلے ہی دن کئی بار ہمیں جرمن طیاروں سے واسطہ پڑا۔ فضائی حملے سے بچنے کے لیے ہم سڑکوں سے ہٹ کر کھیتوں اور جنگلوں میں سفر کر رہے تھے۔ طیارے کی آواز سنتے ہی سب زمین پر لیٹ جاتے۔ ہماری وردیوں اور بیگز کے رنگ ایسے تھے جو زمین سے مل جاتے تھے اور اوپر سے دیکھنا مشکل تھا۔ ایک دن میں اتنی بار جرمن طیاروں کو دیکھنے کے بعد سب نے خدا کا شکر ادا کیا کہ ہم گاڑیوں میں نہیں تھے ورنہ اب تک لازمی جرمن حملوں کا نشانہ بن چکے ہوتے۔ ہمارے سامنے ہی جرمن طیارے دور سڑکوں پر سفر کرتی گاڑیوں پر حملے کر رہے تھے اور ہر حملے کے بعد کئی تباہ شدہ گاڑیوں سے اٹھتا دھواں کئی میل دور سے بھی صاف دکھائی دیتا تھا۔

میں اور میرا دوست جان انگرام ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ رات کا وقت قریب تھا اور ہمارے کمانڈر نے فیصلہ کیا تھا کہ رات میں سفر کیا جائے گا کیونکہ رات کی تاریکی ہی ہمیں اوپر منڈلاتے جرمن طیاروں سے یقینی تحفظ دے سکتی تھی۔ سارے دن کے سفر کے بعد رات میں بھی سفر کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں تھا مگر سپاہیوں کو ایسے حالات سے گزرنا پڑتا ہے۔ ہمیں تربیت ہی اسی چیز کی دی جاتی ہے۔ میں اور جان ایک سگریٹ شیئر کر رہے تھے اور یہ ہمارے آج کے کوٹے کی آخری سگریٹ تھی۔ اب ہمیں صبح ناشتے تک صبر کرنا تھا کیونکہ ناشتے میں ہمیں سگریٹ کا کوٹا ملتا تھا۔ اچانک عقب سے ایک فرانسیسی آیا۔ اس نے بے تکلفی اور واجبی سی انگریزی میں کہا۔ ”ہائے، ایک سگریٹ مل سکتی ہے؟“

”سوری، یہ آخری ہے۔“ میں نے بچ جانے والا سگریٹ اس کی طرف بڑھادیا۔ ”تم چندش لے سکتے ہو۔“ ”چندش ہی سہی۔“ اس نے کہا اور ایک کش لے کر دھواں اندر روک لیا پھر آہستگی سے خارج کرتے ہوئے بولا۔ ”مجھے پلوئی ہیری کہتے ہیں۔“

”کرس۔“ میں نے اپنا تعارف کرایا اور پھر جان کی طرف اشارہ کیا۔ ”جان۔۔۔“

”تم دونوں سے مل کر خوشی ہوئی۔“ پلوئی نے کہا۔ اندھیرا ہو چکا تھا اور اب ہم تاروں کی روشنی میں سفر کر رہے تھے۔ ”کیا ہم ڈنکرک تک پہنچ سکیں گے؟“

میں نے شانے اچکائے۔ ”کیا کہہ سکتے ہیں؟ ممکن

ہے جرمن ہمیں موقع دیں اور ممکن ہے اس سے پہلے ہمارا صفایا ہو جائے۔“

جان نے اوپر جاتے طیاروں کی طرف اشارہ کیا۔
”انہیں دیکھ رہے ہو، یہ ہمیں روکنے کے لیے جا رہے ہیں اور مجھے شک ہے جب ہم ڈنکرک کے ساحل پر پہنچیں گے تو ہمیں لے جانے کے لیے کوئی بحری جہاز منتظر ہوگا۔“

یہی خدشہ مجھے بھی تھا۔ ہم جس بری طرح پسپا ہو رہے تھے عملاً سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ رہے تھے۔ اس سے ہم جرمنوں کے لیے آسان شکار بن گئے تھے۔ اس وقت فرانس میں برطانوی فوجیوں کی تعداد چھ لاکھ سے زیادہ تھی لیکن بچ کر واپس پہنچنے والوں کی تعداد پونے چار لاکھ سے زیادہ نہیں تھی۔ اس پسپائی میں سوا دو لاکھ برطانوی فوجی مارے گئے تھے مگر دوسری طرف بچ جانے والے پونے چار لاکھ فوجیوں نے بعد میں جنگ کا پانسہ پلٹنے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ اس کے باوجود اگر بہتر حکمت عملی سے پسپائی اختیار کی جاتی تو اتنا زیادہ نقصان نہ ہوتا۔ اگر میں تباہ ہونے سے زمینی دستے جرمنوں کے رحم و کرم پر رہ گئے تھے۔ اس وقت برطانوی کچھ بدحواس ہو گئے تھے اور ان کے اعصاب پر جرمنوں کا کچھ زیادہ ہی خوف سوار تھا۔

پلونی نے سرد آہ بھری۔ ”تم انگریز خوش قسمت ہو کہ تمہارا ملک آزاد ہے۔ ہم فرانسیسی غلام بننے والے ہیں۔“
”سوائے ان فرانسیسیوں کے جو ہمارے ساتھ جا رہے ہیں۔“ جان نے لقمہ دیا۔

”وہ آزاد ہوں گے لیکن اپنی سرزمین پر تو نہیں ہوں گے۔“ پلونی نے سگریٹ کا ٹوٹا ایک طرف اچھال دیا۔
جان نے اسے گھورا۔

”تم نے اسے بچھا دیا تھا؟“
”بچھ گیا ہوگا، اب اس میں بچا ہی کیا تھا۔“ پلونی نے بے پروائی سے کہا اور آگے بڑھ گیا۔ جان نے تلاش کر کے اس ٹوٹے کو بچھایا۔ اتفاق سے وہ خشک گھاس پر گرنا تھا اور عین ممکن تھا اگر جان اسے نہ بچھاتا تو وہاں آگ لگ جاتی۔ جان نے خفگی سے کہا۔

”یہ اچھا آدمی نہیں ہے۔ یہ خود غرض اور سفاک ہے۔“

مجھے پلونی بے پروا لگا تھا لیکن خود غرض اور سفاک زیادہ سخت الفاظ تھے۔ ہم صبح روشنی ہونے تک سفر کرتے رہے اور اس کے بعد ایک جنگل میں قیام کیا۔ سب کا تھکن سے برا حال تھا۔ اس لیے ناشتا کرتے ہی سب پڑ کر سو

گئے۔ سارا دن آرام کے بعد شام کے وقت ہم دوبارہ سفر کے لیے تیار ہوئے۔ کچھ فوجی نزدیک کے گاؤں سے انڈے اور مرغیاں لے آئے تھے۔ اب ان سے ڈنکرک ہو رہا تھا۔ سب مخصوص خوراکیں کھا کر تنگ آ چکے تھے۔ اس لیے انڈے اور چکن کے خیال سے خوش تھے۔ ڈنکرک فوری بعد روانگی ہوئی۔ اس صبح تک ہم ریمس کے قریب تھے اور ڈنکرک یہاں سے سوا سو میل کے فاصلے پر تھا۔ اس وقت ہمیں علم ہوا کہ ریمس میں جرمن فضائی دستے اتر چکے ہیں اور شہر پر قبضے کے لیے جنگ جاری ہے۔ اب شہر کی طرف جانا خطرے سے خالی نہیں تھا اس لیے ہم اس سے کترا کر ایک ویرانے میں رک گئے۔

میری آنکھ دھماکوں اور بے پناہ روشنی سے کھلی تھی۔ میں اور جان پاس پاس لیٹے ہوئے تھے۔ ہم ہڑبڑا کر اٹھے تو چاروں طرف بم پھٹ رہے تھے۔ جرمن طیاروں نے روشنی کے اتنے گرینیڈ پھینکے تھے کہ دن جیسی روشنی ہو رہی تھی اور اس روشنی میں جرمن آرام سے ہمارا شکار کر رہے تھے۔ درجن بھر جرمن طیارے بمباری میں مصروف تھے۔ یقیناً جرمنوں کو اطلاع مل گئی تھی کہ یہاں دشمن کے دستے موجود ہیں۔ انہوں نے اچانک دھاوا بولا تھا۔ جب ہم اٹھے تو چاروں طرف تباہی اور بربادی نظر آرہی تھی۔ جان نے چلا کر کہا۔ ”یہاں سے نکلو۔“

ہم نے اپنے بیگز اور رائفلیں لیں اور اٹھ کر دوڑے۔ جاہ جالائیں بکھری ہوئی تھیں۔ بموں نے پُر امن جنگل کو بھی اجاڑ دیا تھا۔ درخت تنوں سے اکھڑ گئے تھے اور بچ جانے والے لوگ ان کے نیچے پناہ لے رہے تھے۔ میرے اور جان کے ساتھ بے شمار دوسرے لوگ بھی جانیں بچانے کے لیے بھاگ رہے تھے۔ اچانک کوئی مجھ سے ٹکرایا اور ہم ایک ساتھ گرے۔ میں نے دیکھا، وہ پلونی تھا۔ وہ مجھے نہیں دیکھ سکا تھا۔ اس نے میری خیریت دریافت کرنے میں وقت ضائع نہیں کیا اور اٹھ کر بھاگ نکلا۔ ہمارے چاروں طرف بم پھٹ رہے تھے لیکن اس روز ہماری قضا نہیں آئی تھی اس لیے ہم بال بال بچتے رہے۔ جب طیاروں کے بم ختم ہو گئے تو انہوں نے اپنی مشین گنوں کا استعمال شروع کیا اور بھاگتے لوگوں پر گولیاں برسائے گئے۔

یہ ایک اور قیامت تھی۔ طیاروں کی مشین گن آدمی کا کیا حشر کرتی ہے، یہ میں نے اس روز دیکھا۔ لوگ گولیاں کھا کر گر رہے تھے۔ ان کے سراور ہاتھ پیر جسم سے الگ ہو رہے تھے۔ بعض کے دھڑ دھڑکنے میں تقسیم ہو گئے تھے۔

میں اور جان اندھا دھند بھاگتے رہے۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ اب ہمارے چاروں طرف تاریکی اور خاموشی تھی، سوائے ہماری بے قابو سانسوں کے اور کوئی آواز نہیں تھی۔ ہم دور نکل آئے تھے۔ پھر ہم زمین پر ڈھیر ہو گئے اور پلٹ کر دیکھا، دور آسمان روشن تھا۔ ہم ایک گھنے جنگل میں تھے۔ جان نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ”ہم دور نکل آئے ہیں۔“

”یہ جگہ بھی محفوظ نہیں ہے کیونکہ اب جرمن زمین سے کارروائی کریں گے اور بچ جانے والے افراد کو قتل کریں گے۔“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”میں یہاں سے دور نکلنا ہوگا۔“

”کس طرف؟“ جان نے ہراساں ہو کر پوچھا۔

”آگے کی طرف... پیچھے جانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ جو بچے گا وہ آگے ہی جائے گا۔“

جان نے مجھ سے اتفاق کیا اور میں سینئر تھا اس لیے اب مجھے فیصلہ کرنا تھا۔ ہم کچھ دور گئے ہوں گے کہ دو برطانوی اور مل گئے۔ ایک سارجنٹ شان پول تھا، دوسرا سپاہی جوزف بکل تھا۔ وہ میرے دستے سے تعلق رکھتے تھے اور وہ بھی بچ کر اس جنگل تک آئے تھے۔ انہوں نے زیادہ تفصیل سے بتایا کہ دستے کے اکثر افراد مر چکے تھے یا شدید زخمی تھے۔ بچ کر نکلنے والوں کی تعداد بہت کم تھی۔ شان بھی معمولی زخمی تھا، اس کے بازو پر بم کا ٹکڑا لگا تھا اور اندر ہی پھنس گیا تھا۔ مختصر سرجری کر کے جان نے یہ ٹکڑا نکال دیا۔ اس نے طبی امداد کا کورس کیا ہوا تھا۔ روانگی کے کچھ دیر تک تو ہم تیزی سے سفر کرتے رہے۔ سب کے ذہنوں میں جرمن کا خوف تھا۔ اگر ہم ان کے ہاتھ آجاتے تو اس بات کی کوئی ضمانت نہیں تھی کہ وہ ہمیں زندہ گرفتار کریں گے یا مار دیں گے۔ صبح کی روشنی نمودار ہوئی تو ہم رک گئے۔ بھوک تو سب کی مری ہوئی تھی لیکن پیاس سے بُرا حال تھا۔ میرے اور شان کے پاس پانی کی چھالکیں تھیں۔ سب نے انہی سے پیاس بجھائی۔ میرے پاس کچھ چاکلیٹ، بسکٹ اور سادہ ڈبل روٹی تھی۔ باقی سب کے پاس بھی کھانے کو کچھ نہ کچھ تھا مگر پانی کم تھا۔ شان نے کہا۔

”ہمیں پانی تلاش کرنا ہوگا۔“

”کہاں پر... یہ جنگل ہے اور یہاں صرف چشموں اور ندی نالوں سے پانی مل سکتا ہے۔“ جان نے کہا۔ میں نے جھک کر مٹی کو دیکھا۔

”شاید ایک ہفتے سے بارش نہیں ہوئی ہے اس لیے کہیں پانی کی موجودگی مشکل ہوگی۔“

”ہمیں چلتے رہنا چاہیے۔“ جوزف نے کہا۔ ”اسی صورت میں ہمیں پانی ملے گا۔ دوسرے ہمیں اب جلد از جلد ڈنکرک پہنچنا چاہیے۔ جرمنوں کا حملہ ظاہر کر رہا ہے کہ وہ کتنی تیزی سے پیش قدمی کر رہے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ وہ ہم سے پہلے ڈنکرک پہنچ جائیں۔“

سب نے جوزف سے اتفاق کیا اور تھکے ماندے ہونے کے باوجود ہم چل پڑے۔ ہم کھانے کے لیے بھی نہیں رکے تھے جس کو بھوک لگتی، وہ اپنے پاس موجود چیز نکال کر کھا لیتا تھا۔ دوپہر تک سفر کے باوجود ہمیں پانی نہیں ملا اور نہ ہی کوئی آبادی ملی ہم بہت گھنے اور وسیع جنگل میں تھے۔ اس کے بعض مقامات پر راستے تک نہیں تھے اور ہمیں بہت دشوار جگہوں سے گزرتا پڑا تھا۔ ہمارے پاس پانی ختم ہو گیا تھا۔ موسم بہت گرم تھا اور ہمیں بار بار پیاس لگ رہی تھی۔ شام تک سب کا پیاس سے بُرا حال ہو گیا۔ شروع میں ہمیں یہ جنگل اچھا لگ رہا تھا کیونکہ اس نے ہمیں پناہ دی تھی مگر اب سب بے چین تھے کہ یہ جنگل ختم ہو اور ہم کسی آبادی تک پہنچیں اور پانی حاصل کر سکیں۔ شان کا زیادہ بُرا حال تھا۔ وہ زخمی بھی تھا۔ اس نے جھنجھلا کر کہا۔ ”یہ لختی جنگل کب ختم ہوگا؟“

”ہم بھی انتظار کر رہے ہیں۔“ میں نے کہا۔ اسی لمحے جان نے سب کو رکنے کا اشارہ کیا اور ہم سب چو کنا ہو گئے۔ جان کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ کان لگا کر کچھ سن رہا ہے۔ پھر اس نے ایک طرف بہت سرسبز جھاڑیوں کی طرف اشارہ کیا اور ہم سب نے پھیل کر اپنی رائفلوں کا رخ اس طرف کر دیا۔ مناسب آڑ میں ہونے کے بعد میں نے چلا کر کہا۔ ”جھاڑیوں میں جو ہے وہ باہر آ جائے ورنہ ہم قاتل کھول دیں گے۔“

”نہیں پلیز۔“ جھاڑیوں سے کسی نے چلا کر کہا اور ایک شخص تیزی سے ہاتھ اٹھائے برآمد ہوا۔ اس نے فرانسیسی وردی پہن رکھی تھی اور وہ پلوٹی تھا۔ ہم سب کی رائفلیں جھک گئیں اور ہم سامنے آ گئے۔ پلوٹی سخت گھبرایا ہوا تھا۔ اس نے گھکیا کر کہا۔ ”مجھے مت مارنا۔“

”غور سے دیکھو، ہم برلش ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”تم مجھے بھول گئے؟“

اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ ”اوہ تم، کرس... میں بوکھلا گیا تھا۔“

پلوٹی کی رائفل غائب تھی لیکن اس کے پہلو میں پانی کی چھال لٹک رہی تھی۔ جان نے پوچھا۔ ”اس میں پانی ہے؟“

وہ بار میں بیٹھا کافی دیر سے مارٹنی پیے جا رہا تھا۔ بار کے مالک نے نوٹ کیا کہ ہر بار نئے پیگ کا آرڈر دینے سے پہلے وہ اپنی قمیص کی جیب میں لمحہ بھر کے لیے جھانکتا پھر ویٹرس کو بلا کر آرڈر دے دیتا۔

آٹھویں بار وہی تماشا دیکھنے کے بعد بار کے مالک سے نہ رہا گیا اور وہ بلا نوش کے قریب جا پہنچا۔ نرم لہجے میں معذرت کرتے ہوئے اس نے اپنے گاہک سے اس معصے کے بارے میں سوال کیا تو وہ مخمور آواز میں ہنسا پھر بولا۔ ”میری جیب میں چڑیل کی تصویر ہے... سمجھتے ہو نا کہ چڑیل کون ہے... میری بیوی، میری بیوی... جو نکمی اس کی تصویر مجھے اچھی لگے گی، میں سمجھ لوں گا کہ میرا کونا پورا ہو چکا ہے اور میں نئے پیگ کا آرڈر دیے بغیر گھر چل دوں گا۔“

(سرگودھا سے ملک امین کے عزائم)

ہے۔“ جان نے کہا۔

مستقل سفر نے ہمیں تھکا دیا تھا اس لیے ہم نے فیصلہ کیا کہ کچھ گھنٹے آرام کر لیا جائے اور پھر رات کے آخری پہر سفر کا آغاز کیا جائے۔ ہم بس اتنی دیر رکنا چاہتے تھے کہ ہمارے تھکے ہوئے جسم کچھ توانائی جمع کر لیں۔ یہاں جرمنوں کا خطرہ نہیں تھا اس لیے سب بے فکر ہو کر سو گئے۔ پھر میری آنکھ کھلی تو مشرق سے روشنی جھلک رہی تھی۔ ہم زیادہ ہی سو لیے تھے۔ میں نے جھنجھوڑ کر سب کو بیدار کیا۔ سب اٹھے، منہ ہاتھ دھو کر چشمے سے پانی پیا اور آگے روانہ ہو گئے۔ نقشے کے مطابق ہم ڈنکرک سے ابھی ساٹھ بائیس میل کے فاصلے پر تھے، میں نے کہا۔

”اگر ہم تیز رفتاری سے سفر کریں تو یہ فاصلہ شام تک طے کر سکتے ہیں۔“

”ہمیں بہر صورت آج رات تک وہاں پہنچنا ہے۔“ جان نے سر ہلایا۔ ”آبادیوں سے بچنا ہوگا کیونکہ جرمن نہ جانے کہاں پہنچ چکے ہیں۔“

ہم روانہ ہوئے۔ پلوئی میرے ساتھ چل رہا تھا۔ جان اسے پسند نہیں کرتا تھا اور جوزف و شان کا رویہ بھی اس سے سرد تھا۔ البتہ میں ٹھیک سے بات کرتا تھا اس لیے وہ میرے ساتھ لگا ہوا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ”تم کہاں کے رہنے والے ہو؟“

”ہاں۔“ اس نے ہچکچا کر کہا۔ ”لیکن زیادہ نہیں ہے۔“ ”کوئی بات نہیں، ہمارا گزارہ ہو جائے گا۔“ جوزف نے چھاگل اتار لی اور ایک گھونٹ لے کر بوتل جان کی طرف بڑھا دی۔ سب باری باری اس سے پانی پی رہے تھے۔ چھاگل میں کچھ زیادہ پانی نہیں تھا، جلد ختم ہو گیا لیکن ہماری نشئی میں کمی آئی تھی۔ میں نے پلوئی سے پوچھا۔ ”تم یہاں کیا کر رہے ہو اور پانی ملے گا کہیں؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”میں رات سے بھاگ رہا ہوں۔ یہاں سے کچھ آگے چند پہاڑیاں ہیں، پانی ان کے دامن میں ملے گا۔“

”یہاں سے کتنی دور ہیں وہ پہاڑیاں؟“ پلوئی نے ایک نقشہ نکال کر ہمیں دکھایا۔ ”یہ نیچرل پارک ہے، اسی میں پہاڑیاں ہیں۔“

میں نے غور کیا۔ ”یہ جگہ کہاں ہے جہاں ہم ہیں؟“ ”یہ ہرسن کے قریب ہے لیکن ہرسن پر جرمنوں کا قبضہ ہو چکا ہے۔ میں پہلے اسی طرف گیا تھا لیکن وہاں جرمن مشینیں دستے شہر میں داخل ہو رہے تھے اس لیے میں وہیں سے واپس آ گیا۔“

”یعنی ہم پانی سے شاید چار پانچ میل کے فاصلے پر ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”ہمیں فوری روانہ ہو جانا چاہیے۔ ویسے بھی پانی ہمیں راستے میں ملے گا۔“

نیچرل پارک ہونے کی وجہ سے جرمنوں سے مذہبیٹر کا امکان کم تھا۔ تیز قدموں سے چلتے ہوئے ہم ڈیڑھ گھنٹے میں وہاں پہنچ گئے اور پلوئی کے دعوے کے مطابق وہاں پانی کے چشمے موجود تھے اور ان میں کچھ پانی بھی تھا... کیونکہ یہ خشک موسم تھا اس لیے چشمے اور ندی نالے بھی خشک ہو رہے تھے۔ بہر حال ہمیں پانی مل گیا۔ ہم نے جی بھر کر پانی پیا اور اپنی چھاگلوں میں بھی بھر لیا۔ ہم نے اپنے منہ ہاتھ اور لباس صاف کیے۔ پلوئی ہمارے ساتھ تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ”اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟“

”میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔“ اس نے کہا۔ ”جن فرانسیسی فوجیوں نے ہتھیار ڈالے ہیں، انہیں گرفتار کر کے جرمنی منتقل کیا جا رہا ہے۔ اگر میں ان کے ہاتھ آیا تو مجھے بھی کسی جرمن عقوبت خانے میں بھیج دیا جائے گا۔ میں دہری مشکل میں ہوں گا کیونکہ ماں کی طرف سے یہودی بھی ہوں۔ اگر یہ بات کھل گئی تو پھر موت ہی میرا مقدر بنے گی۔ میری عافیت اسی میں ہے کہ میں تمہارے ساتھ برطانیہ چلا جاؤں۔“

”مجھے برطانیہ کی عافیت بھی خطرے میں لگ رہی

”گرینویل۔“ اس نے جواب دیا۔ ”یہ لیون کے جنوب مشرق میں ایک چھوٹا سا شہر ہے۔ وہاں میری بیوی اور دو بچے ہیں۔“

”میرا خیال ہے کہ ابھی جرمن وہاں نہیں پہنچے ہیں۔“

”اگر نہیں پہنچے تو جلد پہنچ جائیں گے۔“ پلوئی نے مایوسی سے کہا۔

”جرمن ان علاقوں پر قبضہ کر سکتے ہیں لیکن وہ اسے ہمیشہ کے لیے برقرار نہیں رکھ سکتے۔ جب امریکا اور روس اس جنگ میں شامل ہوئے، اسی دن سے ہٹلر کا زوال شروع ہو جائے گا۔“

”مجھے تو لگ رہا ہے کہ امریکا اور روس مل کر بھی جرمنی کی جنگی مشین کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔“

میں نے بحث نہیں کی کچھ دیر بعد ہم کاؤڈرے نامی شہر کے پاس سے گزرے اور ایک گھنٹے بعد کیمبرائی آگیا۔ یہ ظاہر یہاں جرمن ابھی نہیں پہنچے تھے لیکن وہاں جانے کا فائدہ بھی نہیں تھا۔ ہمیں جانا تو ڈنکرک تھا، کسی آبادی میں جانے سے صرف وقت ضائع ہوتا اور میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ سڑک یا ریل سے سفر نہیں کرنا ہے کیونکہ دونوں جرمن فضائیہ کے نشانے پر تھے۔ ویرانے اور جنگل سب سے بہترین اور محفوظ تھے۔ کیمبرائی کے بعد آبادی کم ہو گئی اور دوبارہ ویرانے اور جنگل شروع ہو گئے۔ دوپہر تک ہم کارون پہنچ گئے اور یہاں ایک اندوہناک انکشاف ہوا کہ جرمن یہاں پہنچ گئے تھے۔ ان کے دستے ریل سے اتر کر شہر میں پھیل رہے تھے۔ فائرنگ اور دھماکوں کی آوازیں شہر کے باہر تک آرہی تھیں۔ ڈنکرک یہاں سے چالیس میل دور رہ گیا تھا۔ میں نے کہا۔

”دوستو... اب وقت نہیں رہا ہے اس لیے ہمیں بھاگنا ہوگا۔ اگر دیر کی تو پھر نکلنے کا یہ واحد راستہ بھی بند ہو جائے گا۔“

سب نے دل و جان سے میرے فیصلے پر عمل کیا اور ہم نے بھاگنا شروع کر دیا۔ رفتار قائم رکھنے کے لیے ہم نے تمام اضافی سامان پھینک دیا تھا۔ صرف پانی اور ہتھیار رکھے تھے۔ خوراک ہم تقریباً کھا چکے تھے اور اب اس کی ضرورت بھی نہیں تھی کیونکہ ہم ڈنکرک تک پہنچتے یا نہیں، دونوں صورتوں میں ہم خوراک کی فکر سے بے نیاز ہو جاتے۔ ابھی ہمیں بھاگتے ہوئے ایک گھنٹا ہوا تھا اور میرے اندازے کے مطابق ہم آٹھ نو میل کا فاصلہ طے کر چکے تھے کہ اچانک آسمان پر جرمن طیارے نمودار ہوئے۔ وہ

ڈنکرک کی طرف جارہے تھے۔ یہ بڑے ٹرانسپورٹ طیارے تھے۔ انہیں دیکھ کر میرا دل بیٹھ گیا اور کچھ دیر بعد میرا اندازہ درست ثابت ہوا، جب طیاروں سے جرمن پیراٹروپرز نے کودنا شروع کیا۔ درجنوں طیاروں سے ہزاروں کی تعداد میں پیراٹروپرز کود رہے تھے۔ آسمان پر چھتریاں ہی چھتریاں دکھائی دے رہی تھیں۔

”مارے گئے۔“ پلوئی کراہا۔ ”اب بچنا مشکل ہے۔ یہ فرار ہونے والے فوجیوں کو روکنے کے لیے اتارے گئے ہیں۔“

”یہ تو ظاہر ہے۔“ جان نے تلخی سے کہا۔ ”فرار ہونے والوں کے لیے سوائے موت کے اور کیا ہو سکتا ہے۔“

”ہمیں رفتار تیز کرنی ہوگی۔“ میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ”یہ فی الحال سڑکیں اور ریل روڈ بلاک کریں گے۔ ویران علاقوں اور جنگلوں کی طرف یہ بعد میں آئیں گے۔“

اس علاقے میں بڑا شہر للی تھا اور وہی سڑکوں اور ریلوے جنکشن تھا۔ چھاتا بردار یقیناً للی پر قبضے کے لیے اتارے جارہے تھے۔ میں نے پلوئی والا نقشہ دیکھا اور للی سے پہلے انگلی رکھی۔ ”ہمیں اس جگہ سے گزرنا ہوگا۔۔۔ اور اس میں بہت خطرہ ہے کیونکہ کچھ جرمن ٹروپرز شہر کے باہر بھی اتریں گے۔“

ہمیں کارون اور للی کے درمیان سے گزرنا تھا۔ دس منٹ سے پہلے تمام پیراٹروپرز اتر چکے تھے اور طیارے واپس جا چکے تھے۔ چند منٹ بعد دوسرے طیارے کی کھپ نمودار ہوئی اور انہوں نے گاڑیاں، توپیں اور دوسرے بھاری جنگی آلات اتارنا شروع کیے۔ ابھی اترنے والی فوج ان میں اور مدافعت کے لیے آنے والی فرانسیسی فوج میں مصروف رہتی، تب تک ہمیں نکلنے کا موقع ملا۔ یہاں کچھ چھوٹی پہاڑیاں اور نیلے بھی تھے، ہم ان کی آڑ لے کر اس علاقے سے نکلنے میں کامیاب رہے۔ اب ہم دوبارہ شمال مغرب کی طرف سڑک ڈنکرک کی طرف جارہے تھے۔ مسلسل دوڑنے سے ہمارا برا حال ہو گیا تھا مگر رکنے کا مطلب تھا جرمنوں کی قید یا براہ راست موت کے منہ میں جانا اس لیے ہم گرتے پڑتے بھاگ رہے تھے۔ ڈنکرک اب بھی بیس میل دور تھا۔ آگے سفر کرنے کی ہمت نہیں تھی اس لیے یہ رات ہم نے ایک کسان کے فارم میں گزاری۔ وہ خوش اخلاق فرانسیسی تھا۔ اس نے دے دے کے گوشت اور اپنی بہترین دائن سے ہماری تواضع کی تھی۔

ہم صبح چار بجے اس کے فارم ہاؤس سے نکلے، ابھی

یہ سمجھ کر کہ مزاحمت کرنے والے مارے گئے، آڑ سے نکل آیا اور میں نے اسے شوٹ کر دیا۔ وہ گرا تو میں اٹھ کر جان کی طرف دوڑا۔ وہ زندہ تھا مگر بم نے اس کی ٹانگ اڑا دی تھی۔ میں نے جلدی سے اس کی ران پر ڈوری کس کر باندھی تاکہ خون رکے۔ جان کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ میں نے اسے اٹھانا چاہا تو اس نے منع کر دیا۔

”تم مجھے نہیں لے جا سکتے، یہاں سے نکلنے کی کرو۔۔۔“ مجھے چھوڑ دو۔“

ہمارے حملے کے بعد پیچھے آنے والی گاڑیاں رک گئی تھیں لیکن جرمنوں کے چلانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ اب پیدل آگے آرہے تھے۔ جان نے کہا۔ ”مجھے ایک گرینڈ دے دو۔۔۔ میں انہیں روکتا ہوں، تب تک تم لوگ دور نکل جاؤ۔“

میں نے تسلیم کر لیا کہ ہم جان کو نہیں لے جا سکتے۔ نم آنکھوں کے ساتھ میں اس سے رخصت ہوا۔ ہمارا چھ سال کا ساتھ تھا۔ جوزف اور شان جرمنوں کو روک رہے تھے اور پلونی غائب تھا۔ میں نے آس پاس دیکھا اور جب وہ نظر نہیں آیا تو اسے ذہن سے جھٹک کر ہم تینوں تیزی سے پسا ہونے لگے۔ جرمن عقب سے بے پناہ فائرنگ کر رہے تھے۔ خود کار رائفلوں اور مشین گنوں کے دہانے کھلے ہوئے تھے۔ گولیاں ہمارے آس پاس سے گزر رہی تھیں اور خوش قسمتی تھی جواب تک ہم بچے ہوئے تھے۔ پلونی کے بارے میں میرا خیال تھا کہ وہ ہم سے جدا ہو کر فائرنگ کا نشانہ بن گیا تھا اور اب اس کی لاش کہیں پڑی ہوگی اس لیے جب وہ اچانک سامنے سے نمودار ہوا تو ہم حیران ہو گئے۔ میں تیزی سے اس کے پاس پہنچا۔ ”تم کہاں غائب ہو گئے تھے؟“

”میں راستہ تلاش کر رہا تھا۔“ وہ بولا۔ ”تم لوگوں کو اس طرف جانا ہوگا۔“ اس نے ایک سمت اشارہ کیا۔ ”آگے ایک نالا ہے، اس سے ہو کر تم لوگ کسی محفوظ جگہ نکل سکتے ہو۔“

”اور تم۔۔۔ تم ساتھ نہیں چلو گے؟“ میں نے چلا کر کہا کیونکہ فائرنگ کا شور بے پناہ ہو گیا تھا۔

”میں انہیں روکوں گا۔“ اس نے کہا۔ ”مجھے ایک گرینڈ دے دو۔“

”کیسے روکو گے؟“ میں نے حیران ہو کر کہا کیونکہ پلونی کے بارے میں میرا خیال تھا کہ وہ کسی کے لیے جان دینے والا شخص نہیں ہے۔

”یہ میرا کام ہے۔ تم لوگ دیر مت کرو، ایک بار نالے تک پہنچ گئے تو تم بچ جاؤ گے۔ اب نکلو جلدی۔“

سورج طلوع ہونے میں کچھ وقت تھا۔ ہم چاہتے تھے کہ روشنی ہونے سے پہلے ڈنکر تک پہنچ جائیں ہم بیہوشی کی سرحد کے ساتھ ساتھ جنگل میں سفر کرنے لگے۔ یہاں آبادیاں بہت کم تھیں، زیادہ تر جنگل اور ویرانہ تھا۔ ڈیڑھ گھنٹے میں ہم دس میل کا فاصلہ طے کر چکے تھے اور اب ڈنکر صرف دس میل دور رہ گیا تھا۔ پہلی بار ہمیں ایک اور برطانوی فوجی ٹولی دکھائی دی۔ شروع میں ہم ایک دوسرے کو دیکھ کر بھڑک گئے مگر پھر شناخت کے بعد ذرا پرسکون ہوئے۔ یہ آٹھ افراد تھے جو ہائی وے کی طرف جا رہے تھے۔ میں نے انہیں خبردار کیا۔ ”سڑکوں پر جرمنوں کا خطرہ ہے۔“ ”جرمن اس علاقے سے دور ہیں۔“ ان کے کمانڈر نے بے پروائی سے کہا اور وہ ہائی وے کی طرف چلے گئے اور ابھی انہیں گئے ہوئے چند منٹ ہوئے تھے کہ فائرنگ کی بہت تیز آواز آئی۔ ہم نے دیکھا کم سے کم دو درجن جرمن فوجی ہائی وے پر تھے اور انہوں نے برطانوی فوجیوں کو شوٹ کر دیا تھا۔ اس کے بعد جرمن جنگل کی طرف آنے لگے اور ہم وہاں سے بھاگے۔ یقیناً جرمنوں نے پیدل فرار ہونے والوں پر بھی نظر رکھی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ اس سارے خطے پر مکمل حاوی ہو چکے تھے۔ جرمنوں سے بچنے کے لیے ہم پانگوں کی طرح بھاگ رہے تھے۔ مگر یہ بھول گئے کہ وہ گاڑیوں پر تھے۔ کچھ دیر بعد ہمارے پیچھے مشین انجنوں کی غراہٹیں سنائی دینے لگیں۔ میرے اندازے کے مطابق ڈنکر اب چھ سیات میل دور رہ گیا تھا اور یہ دو چار ہاتھ لب بام والی بات تھی۔ جرمن جس طرح پیچھے آرہے تھے، ایسا لگ رہا تھا کہ وہ ہمارے بارے میں جان گئے ہیں۔ ایک جیب خاصی قریب آگئی تھی۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو رکنے کا اشارہ کیا۔ پھر ان کو پھیل کر گھات کا اشارہ کیا۔ انہوں نے خاموشی سے حکم کی تعمیل کی۔ پلونی میرے پاس دبکا ہوا تھا۔ اس نے رو دینے والے لہجے میں کہا۔ ”یہ کیا کر رہے ہو؟ نکلو یہاں سے۔۔۔“

میں نے اسے کھوڑا تو وہ خاموش ہو گیا۔ جیسے ہی جیب ہماری زد پر آئی، میں نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا اور انہوں نے فائر کھول دیا۔ سامنے بیٹھے دونوں جرمن لمحوں میں چھلنی ہو گئے۔ ان کے پیچھے بیٹھے دو زخمی ہوئے لیکن بچ گئے اور چلتی جیب سے نیچے کود گئے۔ ایک اور کو جان نے شوٹ کر دیا مگر دوسرا ایک درخت کی آڑ میں ہو گیا اور اس نے وہاں سے ایک دستی بم پھینکا جو جان کے پاس گر کر پھٹا اور اس کی چیخ سنائی دی میرا دل بیٹھ گیا۔ مگر جان کی چیخ سے جرمن سپاہی

جرمن قریب آگئے تھے اور واقعی اب وقت نہیں تھا۔ میں نے پلونی کو ایک گرینڈ دیا اور پھر اسے سینے سے لگایا۔ جان کی مجبوری تھی، وہ شدید زخمی تھا پھر وہ میرا دوست بھی تھا اور ہم وطن بھی۔ لیکن پلونی ٹھیک ٹھاک تھا، وہ ہم وطن بھی نہیں تھا اور اس سے رفاقت بھی کچھ دیر کے لیے تھی۔ اس کے باوجود وہ ہمارے لیے قربانی دینے کو تیار ہو گیا تھا۔ پلونی نے غلٹ میں کہا۔ ”بس اب جاؤ۔“

میں، جوزف اور شان اس طرف بڑھے۔ وہاں سچ سچ ایک برساتی نالا تھا جو اس وقت خشک پڑا ہوا تھا۔ ہم اس میں داخل ہو کر عقب سے ہونے والی اندھا دھند فائرنگ سے محفوظ ہو گئے تھے۔ کئی میل طویل یہ نالا ڈنکرک کے پاس ایک جگہ ختم ہوا۔ ابھی ہم نالے میں زیادہ دور نہیں گئے تھے کہ عقب میں ایک دھماکا سنائی دیا۔ ایک لمحے کو ہم رکے اور دوبارہ چل پڑے۔ جرمن بدستور شور مچاتے ہوئے فائرنگ کر رہے تھے مگر ہم نالے کے اندر ان سے محفوظ تھے۔ ایک گھنٹے تک مسلسل بھاگنے کے بعد ہم اس نالے سے نکلے تو خود کو ایک وسیع میدان میں پایا۔ یہاں ہوا میں سمندر کی نمی محسوس کی جاسکتی تھی۔ جوزف نے جوش سے کہا۔ ”ہم ساحل کے پاس ہیں۔“

”ایسا صرف اس لیے ہوا کہ ایک فرانسیسی نے ہمیں نکلنے کا موقع دیا۔“ میں نے افسردگی سے کہا۔ کچھ دیر کے لیے ہم سب خاموش ہو گئے۔ پھر ساحل کی طرف چل پڑے۔ کچھ دیر بعد ہم ساحل کے ساتھ تھے اور وہاں بے شمار کشتیاں جمع ہونے والے برطانوی اور فرانسیسی سپاہیوں کو بحری جہازوں پر منتقل کر رہی تھیں۔ ہم نے برطانیہ کا بیس میل کا سفر کیسے طے کیا، اب سوچتا ہوں تو وہ بہت ڈراؤنا خواب لگتا ہے کیونکہ اوپر سے مسلسل جرمن طیارے حملے کر رہے تھے اور انہیں روکنے کے لیے برطانوی طیارے بھی آگئے تھے۔ بے شمار کشتیاں راستے میں ڈوب گئیں۔ کئی بحری جہاز بمباری کا نشانہ بنے لیکن ہم جس بحری جہاز میں تھے، وہ باحفاظت برطانیہ کے ساحل تک پہنچنے میں کامیاب رہا۔ اس سفر کے دوران ہی میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر میں بچ گیا تو دوبارہ اس جنگ میں شامل نہیں ہوں گا۔

اس لیے جب مجھے چھٹی پر گھر بھیجا گیا تو میں نے وہیں سے امریکا جانے والے ایک مال بردار بحری جہاز پر ملازمت کر لی۔ میں نے تنخواہ نہیں مانگی تھی صرف امریکا تک سفر کا کہا تھا اس لیے کپتان نے بہ خوشی مجھے ملازم رکھ لیا۔ چند ہفتے بعد میں نیو فاؤنڈ لینڈ کی ایک بندرگاہ پر اترا۔ دو سال

تک میں تقریباً روپوش رہا کیونکہ جنگ کے دوران امریکا کی شہریت حاصل کرنے کی کوشش کرتا تو امکان تھا مجھے بھگوزا ہونے کی وجہ سے واپس برطانیہ بھیج دیا جاتا اور دوران جنگ بھگوزا ہونے کی سزا بہت سخت ہوتی ہے۔ جب مجھے اطمینان ہو گیا کہ اب مجھے واپس نہیں بھیجا جائے گا تو میں نے امریکی شہریت کے لیے درخواست دے دی اور کچھ عرصے بعد مجھے یہاں کی شہریت مل گئی۔ شہریت ملنے کے بعد میں نے اپنا کام شروع کیا اور ماریا سے شادی کر لی۔

☆☆☆

ماریا نے گہری سانس لی۔ ”تو تم اس لیے وہاں جانا چاہتے ہو؟“

میں نے سر ہلایا۔ ”میں وہاں پلونی ہیری کے گھر والوں کو تلاش کروں گا اور ان کا شکریہ ادا کروں گا۔“

”صرف شکریہ ادا کرو گے؟“ ماریا نے پھر بیوی ہونے کا ثبوت دیا۔ میں نے ہچکچا کر کہا۔ ”نہیں، میں نے سوچا تھا کہ اگر میری حیثیت ہوئی تو میں انہیں کچھ رقم بھی دوں گا۔ میرے پاس دس ہزار ڈالرز ہیں۔“

خلاف توقع ماریا نے تائید کی۔ ”یہ تو اچھی بات ہے۔ ممکن ہے انہیں اس کی ضرورت نہ ہو لیکن ہو سکتا ہے کہ وہ ضرورت مند ہوں۔“

”بس میں اسی مقصد کے تحت جا رہا ہوں اور مجھے امید ہے کہ میں ایک دو دن میں لوٹ آؤں گا۔ تب تک تم لوگ ماریٹلز میں ساحل اور دھوپ کے مزے لینا۔“

ماریا مسکراتے لگی یعنی وہ میرے پروگرام سے متفق ہو گئی تھی۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ ایک ہفتے بعد ہم فرانس کے لیے روانہ ہو رہے تھے۔ یورپ سے امریکا تک کا جو سفر میں نے دو ہفتے میں طے کیا تھا، جیٹ طیارے سے اس سے زیادہ سفر صرف سات گھنٹے میں طے کر لیا۔ ہم پیرس اترے۔ یہ یورپ کا واحد بڑا شہر تھا جو اس جنگ کے دوران کسی بھی تباہی سے مکمل محفوظ رہا تھا اور جب جرمن پیرس کے پاس پہنچے تو فرانسیسیوں نے اسی شرط پر پیرس جرمنوں کے حوالے کر دیا کہ اسے نقصان نہ ہو۔ دو دن پیرس میں رک کر بذریعہ سڑک ہم ماریٹلز کی طرف روانہ ہوئے۔ ماریٹلز کا شمار چند حسین ترین ساحلوں میں ہوتا ہے۔ سارے یورپ اور یورپ کے باہر سے بھی سیاح یہاں آتے ہیں۔ فرانس کے انتہائی جنوب اور افریقا سے صرف تین سو کلومیٹرز کے فاصلے پر ہونے کی وجہ سے یہاں سال کے بیشتر حصے موسم خوشگوار رہتا ہے اور صرف چند مہینے شدید سرد ہوتے ہیں۔ ماریا اور

بچوں کو مارسیلز کے ایک اعلیٰ درجے کے ساحلی ہوٹل چھوڑ کر
میں ایک کرائے کی کار میں گرینوبل کی طرف روانہ ہوا۔ یہ
مارسیلز سے صرف دو گھنٹے کی ڈرائیو پر ہے۔

میرے پاس صرف ایک نام تھا، پلوئی ہیری اور مجھے
اسی کی مدد سے اس کے اہل خانہ کو تلاش کرنا تھا۔ پلوئی نے
بتایا تھا کہ اس کی بیوی اور دو بچے ہیں لیکن مجھے عورت کا نام
اور بچوں کے بارے میں کچھ نہیں پتا تھا۔ وہ کتنی عمر کے تھے
اور لڑکیاں تھیں یا لڑکے تھے؟ میں نے مارسیلز سے گرینوبل
کے بارے میں معلوم کیا یہ زیادہ بڑا شہر نہیں۔ اس کی آبادی
مشکل سے ایک لاکھ تھی لیکن کسی ایک فرد کو تلاش کرنے کے
لیے یہ آبادی خاصی بڑی تھی۔ میرے پاس کچھ طریقے تھے
جن کی مدد سے میں اسے تلاش کر سکتا تھا۔ میں صبح سویرے
روانہ ہوا تھا اور سب سے پہلے میں فوج کے دفتر گیا۔ وہاں
میں نے پلوئی ہیری کے بارے میں معلوم کیا اور پھر اس کے
بارے میں تفصیل سے بتایا۔ اس وقت پلوئی شاید پچیس یا
تھیس برس کا تھا۔ دفتر میں موجود خوش اخلاق ریکارڈ کیپر
نے سارا ریکارڈ دیکھ لیا لیکن اس میں کہیں پلوئی ہیری کا ذکر
نہیں تھا۔ اس میں سات عدد پلوئی تھے مگر ان کی تصاویر اس
پلوئی ہیری سے بالکل مختلف تھیں جو ہمیں ملا تھا۔

”سوری مسٹر کرس۔“ خاتون نے معذرت کی۔ ”اگر
اس نام کا کوئی فوجی تھا تو اس کا تعلق گرینوبل سے نہیں تھا۔“
”اس کا تعلق گرینوبل سے ہی تھا۔“ میں نے یقین
سے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ تمہارے ریکارڈ میں کچھ غلطی
ہوئی ہے۔“

”ہو سکتا ہے۔“ اس نے تسلیم کیا۔ ”جنگ عظیم کے
بعد یہ دفتر دوبارہ سے بنا تھا اور بہت سا ریکارڈ یہاں سے
غائب تھا۔“

اب میرے پاس دوسرا طریقہ پیدا کس اور موت کا
دفتر تھا۔ وہاں گرینوبل میں موجود ہر فرد کی پیدائش اور موت
کا ڈھائی سو سالہ ریکارڈ موجود تھا۔ یہ بات مجھے دفتر کے
انچارج مسٹر گریوری نے بتائی۔ جب میں نے اسے مختصر
بتایا کہ میں کیوں پلوئی ہیری کو تلاش کر رہا ہوں تو وہ فوراً
میری مدد پر آمادہ ہو گیا۔ اس نے بڑی محنت سے ریکارڈ نکالا
اور تقریباً دو گھنٹے بعد وہ پلوئی ہیری کو تلاش کرنے میں
کامیاب رہا۔ وہ 1914ء میں پیدا ہوا تھا۔ اس کا مطلب
تھا کہ وہ پلوئی ہیری ہو سکتا تھا۔ مسٹر گریوری نے مجھے اس کا
پتا نکال کر دیا۔ ”مسٹر کرس! ایک مسئلہ ہے۔ ہمارے پاس
پلوئی ہیری کی موت کا ریکارڈ نہیں ہے۔ اس کا مطلب ہے

کہ وہ زندہ ہے۔“

”نہیں، وہ یقینی طور پر مر چکا ہے۔ ممکن ہے اس کی
لاش بھی نہ ملی ہو یا اس کے لواحقین نے اس معاملے میں
غفلت دکھائی ہو۔“

”ایسا ممکن ہے کیونکہ تدفین کے لیے اس دفتر کا جاری
کیا ہوا سرٹیفکیٹ لازمی ہوتا ہے۔“

پتا ایک نواحی علاقے کا تھا اور یہ یقیناً غریبوں کی بستی
تھی۔ وہاں کے مکانات اور سڑکوں گلیوں میں چلتے پھرتے
لوگوں کی حالت سے اندازہ ہو رہا تھا۔ مذکورہ پتا ایک بہت
خستہ حال مکان کا ثابت ہوا۔ ایک چار دیواری کے اندر
شاید دو کمروں کا یہ مکان رنگ سے محروم تھا۔ صحن میں لگنی پر
چند کپڑے لٹکے ہوئے تھے اور ایک عورت کونے میں زمین
پر لگی سبز یوں سے پتے صاف کر رہی تھی۔ مشکل سے تین
فٹ اونچی لکڑی کی باڑھ سے سب نظر آ رہا تھا۔ عورت شاید
پچاس کی تھی لیکن اس کے سارے بال سفید ہو گئے تھے اور
وہ ساٹھ سے بھی اوپر کی لگ رہی تھی۔ کمزور اور معمولی لباس
میں اس کی عسرت عیاں تھی۔ میں دروازے تک آیا تو اس
نے میرا نوٹس لیا اور کھڑے ہوتے ہوئے سوالیہ نظروں سے
میری طرف دیکھا۔ میں نے ہیٹ اتارتے ہوئے دریافت
کیا۔ ”مسز ہیری...؟ پلوئی ہیری۔“

عورت نے سر ہلایا۔ ”ہاں، میں ہی ہوں۔“
”میں کرس ایورٹن ہوں۔“ میں نے تعارف کرایا۔
”میں امریکا سے آیا ہوں تم سے ملنے کے لیے۔“
عورت کو یقین نہیں آیا کہ کوئی اس سے امریکا سے
ملنے کے لیے آ سکتا ہے۔ جب اسے یقین آیا تو اس نے
پوچھا۔ ”کیوں؟“
”پلوئی ہیری کے سلسلے میں۔“

”میرے خدا! اس کے معاملات امریکا تک پہنچے
ہوئے ہیں۔“ عورت نے زیر لب کہا تو میں نے جلدی سے
وضاحت کی۔

”میری پلوئی سے دوسری جنگ عظیم میں ملاقات
ہوئی تھی جب جرمن فرانس پر قبضہ کر رہے تھے... صرف
دو تین دن کے لیے۔“
عورت نے مشکوک لہجے میں کہا۔ ”تم کوئی دعویٰ لے
کر تو نہیں آئے ہو؟“

”ہرگز نہیں... بلکہ میں تمہارے اور تمہارے بچوں
کے لیے ایک تحفہ لایا ہوں۔ یوں سمجھ لو کہ میں پلوئی ہیری کا
مقروض ہوں۔“

عورت نے ایک بار پھر خود کلامی کی۔ ”میرے خدا! کیا قیامت قریب ہے؟ کوئی پلوئی منحوس کا مقروض بھی ہو سکتا ہے۔“

اس عورت کے خیالات اپنے شوہر کے بارے میں اچھے نہیں تھے۔ حالانکہ اسے دنیا سے گزرے ہوئے اٹھائیس برس سے زیادہ عرصہ گزر چکا تھا مگر اس نے ابھی تک پلوئی کو معاف نہیں کیا تھا۔ میں منتظر تھا کہ وہ مجھے اندر آنے کی دعوت دے اور بالآخر اسے اس کا خیال آ گیا۔ وہ مجھے اندر لائی۔ ایک کمرے کے ساتھ لاؤنج تھا جس میں دو سیٹ والا خستہ چال صوفہ تھا۔ مختصر سے کچن میں چار افراد والی کھانے کی میز تھی۔ یہاں ہر چیز پرانی اور خستہ حال تھی۔ میز پوش بھی گھسا پٹا تھا۔ عورت ہچکچاتی کہ مجھے کہاں بٹھائے کیونکہ صوفے سے اسپرنگ جھانک رہے تھے۔ بالآخر اس نے کھانے کی میز کا انتخاب کیا اور مجھے بٹھا کر چائے کا پانی رکھ دیا۔ پھر خود میرے سامنے آ بیٹھی۔ ”موسیو ایورٹن... تم کس معاملے میں پلوئی کے مقروض ہو؟“

”جسہیں اندازہ ہو گیا ہو گا کہ یہ جنگ عظیم کی بات ہے۔“

”اور تم اٹھائیس سال بعد آئے ہو؟“

”ہاں کیونکہ میں وہ قرض اتارنے کے لیے رقم جمع کر رہا تھا۔“ میں نے کہا اور اس پاس دیکھا۔ ”لگتا ہے تم اور بچے بہت سخت وقت گزارتے آئے ہو۔“

”میں نے پلوئی سے شادی کے بعد کبھی اچھا وقت نہیں دیکھا۔“ اس نے سچی سے کہا۔ ”اور جہاں تک بچوں کی بات ہے، وہ اس جہنم سے نجات حاصل کر چکے ہیں۔ میرا بیٹا رونی فرانس کی بحریہ میں کام کرتا ہے جبکہ بیٹی پیرس کے ایک آرٹ اسکول میں پینٹر ہے۔ وہ میری پروا نہیں کرتے اور نہ ملنے آتے ہیں کیونکہ ان کی رگوں میں پلوئی جیسے خود غرض شخص کا خون ہے۔ اس کے باوجود میں خوش ہوں کہ وہ اس جہنم سے آزاد ہو گئے ہیں اور اپنی زندگی میں خوش ہیں۔“

مجھے عجیب سا احساس ہوا۔ میں جس شخص کا احسان مند تھا، اس کی اپنی بیوی اس کے بارے میں بہت منفی خیالات رکھتی تھی اور یقیناً اس نے پلوئی کے ساتھ اچھا وقت نہیں گزارا تھا، ابھی وہ اتنی سچ ہو رہی تھی۔ اٹھائیس سال کا طویل عرصہ بھی اس کی تلخی کم نہیں کر سکا تھا۔ چائے کا پانی کھول گیا تھا، اس نے اس میں پتی ڈالی اور دو پیالیوں میں چائے اندیل کر لے آئی۔ اس نے شکر دان اور دودھ کی پیالی میرے سامنے رکھی۔ میں نے کپ میں شکر اور دودھ

ملا یا۔ ایک گھونٹ لیا اور تعریف کی۔ ”اچھی چائے ہے مسز ہیری... کیا تم اب بھی مسز ہیری کہلاتی ہو؟“

”ظاہر ہے۔“ اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ ”اگر میں مسز ہیری نہیں تو پھر کیا کہلو اوں گی؟“

مجھے حیرت ہوئی، اس نے پلوئی ہیری کے بعد شادی سے گریز کیا تھا، حالانکہ وہ اس وقت جوان ہو گی۔ ایک طرف کچن کی دیوار پر اس خاندان کی تصاویر لگی تھیں اور یہ پرانی اور نئی دونوں تصاویر پر مشتمل تھیں۔ مسز پلوئی ہیری جوانی میں خاصی حسین خاتون ہوا کرتی تھی مگر حالات کی سختی اور عمر اس کے حسن کو کھا گئی تھی۔ مسز پلوئی کے بچوں کی کم عمری، لڑکپن اور جوانی کی تصاویر بھی تھیں خود مسز پلوئی کی جوانی، ادھیڑ عمری کی اور ایک تصویر شاید چند سال پرانی تھی۔ مگر پلوئی ہیری کی آخری تصویر یقیناً جنگ سے پہلے کی تھی۔ اس میں وہ اپنے بیٹے کو گود میں لیے ہوئے تھا اور بیٹی مسز پلوئی کی گود میں تھی۔ اس کے بعد پلوئی ہیری دنیا میں نہیں رہا تو اس کی تصویر کہاں سے آتی۔ میں نے پوچھا۔ ”تمہارا گزارہ کیسے ہوتا ہے مسز پلوئی... معاف کرنا یہ ایک غیر متعلقہ سوال ہے لیکن اگر تم برانہ مانو تو...“

”میں نے برا نہیں مانا۔“ وہ میری بات کاٹ کر بولی۔

”جنگ عظیم اور کے اس کے بعد کا کچھ عرصہ بہت سخت تھا مجھے اور میرے بچوں کو فاقے بھی کرنا پڑے۔ ایک بار اتحادیوں کی بمباری کے دوران ایک بم اس مکان کے پاس گرا اور یہ تقریباً گرنے والا ہو گیا تھا۔ ہمارے پاس اس کے سوا سر چھپانے کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ پھر ہم نے بڑی کوشش کر کے اسے ٹھیک کیا۔ اب بھی دراڑیں ہیں جو وال پیپر کے پیچھے چھپی ہیں۔ جنگ کے دوران روزگار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں احاطے میں سبزیاں لگاتی تھی، اس سے کچھ مل جاتا تھا۔ کبھی کبھی کوئی عارضی کام مل جاتا تھا۔ چیزیں بھی غائب تھیں، رقم ہوتی تو کھانے کا اور دوسرا سامان نہیں ملتا تھا۔ جنگ کا وقت بہت مشکل سے گزرا۔ پھر جنگ کے بعد بھی تنگی برقرار رہی۔ دو سال بعد جا کر کچھ آسانی ہوئی۔ یہاں ایک فیکٹری لگی اور مجھے بھی اس میں ملازمت مل گئی۔ اسی ملازمت سے میں نے اپنا گھر چلایا، بچوں کو پالا۔ میں اب بھی ملازمت کرتی ہوں۔ آج اتفاق سے میری شام کی شفٹ ہو گئی ورنہ اس وقت میں کام پر ہوتی ہوں۔“

مجھے اس عورت سے ہمدردی ہونے لگی۔ پلوئی ہیری جیسا شوہر بھی تھا، اس کے بعد اس نے بہت مشکلات سہی تھیں۔ اب اس کے بچے بھی اسے چھوڑ گئے تھے۔ عورت

اسی پسپائی کے دوران ہمیں پلوئی ہیری ملا تھا۔
 ”پسپائی۔“ وہ تعجب سے بولی۔ ”پلوئی وہاں کیا کر رہا تھا؟“

”وہ فرانسیسی فوج میں تھا۔“ میں نے کہا تو مسز پلوئی زور سے بے ساختہ ہنسی اور پھر ہنستی چلی گئی۔ یہ مشکل اس نے اپنی ہنسی کو بریک لگایا۔

”فوج؟“ وہ پوچھتی ہوئی سانس کے درمیان بولی۔ ”پلوئی نے کبھی فوجی اکیڈمی کی شکل نہیں دیکھی، وہ فوج میں کہاں سے ہو گیا تھا؟“

میں دم بہ خود رہ گیا۔ ”وہ فوج میں تھا۔۔۔ پسپائی کے دوران ہمیں ملا تھا۔ اس نے فرانسیسی فوج کی وردی پہن رکھی تھی۔“

مسز پلوئی سنجیدہ ہو گئی۔ ”ان دنوں وہ مجھے چھوڑ کر بھاگا تھا کیونکہ میں اس کے فراڈ برواشت کرنے کو تیار نہیں تھی۔ آئے دن کوئی نہ کوئی رقم کے لیے ہمارے دروازے پر کھڑا ہوتا تھا۔ فرانس پر جرمن حملے سے صرف دو مہینے پہلے وہ اسی مکان میں پڑا ہوا تھا۔“

”لیکن وہ فرانسیسی فوجی وردی...“
 ”ایک منٹ... کیا تم نے اس کی وردی پر نشانات دیکھے تھے؟ اس کا رینک کیا تھا؟“
 ”میں نے غور نہیں کیا۔“

”اس کے پاس کوئی دستاویز تھی؟“
 ”نہیں، اس کا موقع نہیں تھا۔“
 ”تم نے اس کے پاس کوئی فوجی ہتھیار دیکھا؟“

”نہیں۔“ میں نے سوچنے کے بعد اعتراف کیا۔
 ”تب تمہیں میری بات کا یقین آ جانا چاہیے۔“
 مسز پلوئی نے رسائیت سے کہا۔ ”اس نے تمہیں بے وقوف بنایا تھا۔“

”اوکے... میں مان لیتا ہوں کہ وہ فوجی نہیں تھا لیکن اس نے مجھے کوئی دھوکا نہیں دیا۔“

”موسیو ایورٹن میں یہ بات مان ہی نہیں سکتی کیونکہ پلوئی کا خمیر ہی دھوکے کی مٹی سے اٹھا ہے۔ اس کا کوئی کام دھوکے سے خالی نہیں ہوتا۔“

میں نے اس عورت سے بحث سے گریز کیا کیونکہ یہ بات اس کے ذہن میں بیٹھ چکی تھی۔ ”میں نے کہا نا، ایک موقع پر جرمن ہمارے پاس آچکے تھے اور بچنے کی راہ نہیں تھی۔ ایسے میں پلوئی نے ہمیں فرار کا راستہ دکھایا اور خود جرمنوں کو روکنے کے لیے وہیں رہ گیا۔“

اور گھر کی حالت بتا رہی تھی کہ وہ اسے کچھ نہیں بھیجتے اور اس کا گزارہ بہت تنگی ترشی سے ہو رہا تھا۔ وہ یقیناً دس ہزار ڈالر کی سب سے زیادہ حق دار تھی۔ اس وقت دس ہزار ڈالر خاصی بڑی رقم تھی۔ یہ میری چار مہینے کی آمدنی کے برابر تھی۔ مجھے سو فیصد یقین ہو گیا تھا کہ وہ پلوئی ہیری کی بیوہ ہے اور وہی اس کی وارث ہے۔ میں نے کوٹ کی جیب سے لفافہ نکالا جس میں دس ہزار ڈالر کے نوٹوں کی گڈی تھی اور وہ مسز پلوئی کے سامنے رکھ دیا۔ ”مسز پلوئی! مجھے افسوس ہے میں تاخیر سے آیا۔۔۔ وجہ میں تمہیں بتا چکا ہوں۔ مگر مجھے امید ہے کہ دس ہزار ڈالر سے تم اپنی زندگی میں آسانی لاسکو گی۔“

وہ دم بہ خود رہ گئی۔ ”دس ہزار ڈالر۔۔۔“
 ”ہاں... تم چاہو تو دیکھ کر تسلی کر لو۔“
 ”مگر کس لیے... پلوئی ایسا شخص نہیں تھا جو کسی کو دس فرانک بھی دے سکتا۔ اس کے پاس ہوتے تب بھی نہ دیتا۔ وہ کسی کو کچھ دینے والا شخص ہی نہیں ہے۔ دس ہزار ڈالر... میرے خدا...“

”معاملہ رقم کا نہیں ہے۔“ میں نے نرمی سے کہا۔
 ”تم نے ٹھیک کہا، پلوئی نے مجھے کچھ نہیں دیا تھا۔ اس نے تو سگریٹ بھی مجھ سے مانگ کر لی تھی۔“

”پھر یہ رقم...“ اس نے لفافہ فوراً سا کھول کر دیکھا۔
 ”میں بتاتا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”پلوئی نے مجھ پر اپنی زندگی کا قرض چھوڑا تھا۔ ایک موقع تھا جب جرمن ہمارے تعاقب میں تھے اور ایسا لگ رہا تھا کہ وہ ہم تک پہنچ جائیں گے۔ ہمارا ایک ساتھی مارا جا چکا تھا اور ہم نے بھی چار جرمن مار دیے تھے۔ اگر ہم ان کے ہاتھ آ جاتے تو تم سوچ سکتی ہو کہ وہ ہمارے ساتھ کیا کرتے۔“

”بہت برا۔“ اس نے جھرجھری لی۔ ”میں نے پلوئی کے بعد اس زمین پر جو بدترین لوگ دیکھے تھے، وہ جرمن تھے۔“

”موت ہمارے سامنے تھی، ایسے میں پلوئی نے ہماری مدد کی۔ اس نے ہمیں فرار کا راستہ دکھایا اور خود جرمنوں کے سامنے ڈٹ گیا۔“

”ایک منٹ... ایک منٹ۔“ مسز پلوئی نے مجھے روکا۔ ”یہ تم کہاں کی بات کر رہے ہو... پلوئی تمہیں کہاں مل گیا؟“

”میری کمپنی شمال مشرقی فرانس میں تھی۔ وہیں پلوئی سے ملاقات ہوئی تھی، جب برطانوی فوج پسپا ہو رہی تھی۔“

”وہیں رہ گیا... وہ کیوں؟“

میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ”مسز پلوئی... وہ جرمینوں کو روکنے کے لیے وہاں رک گیا تھا۔“

مسز پلوئی بڑی مشکل سے اپنی ہنسی روک رہی تھی۔

”پلوئی جیسا بزدل شخص... مسلح خونخوار جرمینوں کو روکنے کے لیے سینہ سپر ہو گیا؟“

اس بار میرا موڈ ذرا بدل گیا اور میں نے کسی قدر تلخی سے کہا۔ ”مسز پلوئی! ٹھیک ہے... وہ تمہارے لیے اچھا شوہر اور تمہارے بچوں کے لیے اچھا باپ ثابت نہیں ہوا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس میں دنیا جہان کی برائیاں تھیں۔ آخر وقت میں وہ بہادر ثابت ہوا اور اس نے ہمارے لیے اپنی جان قربان کر دی۔“

مسز پلوئی اپنے کپ سے چائے کا آخری گھونٹ لے رہی تھی۔ میری بات پر کپ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر گیا۔ وہ اتنی حیرت زدہ تھی کہ اس نے کپ کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ ”تت... تمہارا مطلب ہے اس نے جان کی بازی لگائی؟“

”ہاں، اس نے ہماری خاطر جرمینوں کو روکا۔ اس نے ہم سے ایک گرینڈ لیا تھا اور اس کے دھماکے میں یقیناً وہ بھی مارا گیا تھا۔ اگر اس سے بچ گیا تھا تو جرمینوں نے اسے کہاں چھوڑا ہوگا؟“

مسز پلوئی بڑی دیر تک نفی میں سر ہلاتی رہی، بالآخر اس نے کہا۔ ”موسیو ایورٹن! تمہیں شدید غلط فہمی ہوئی ہے۔ پلوئی ایسے کسی مقابلے میں نہیں مارا گیا۔“

میں دنگ رہ گیا۔ ”تب اس کی موت کیسے ہوئی؟“

اس بار مسز پلوئی جیسے پھٹ پڑی۔ ”کس نے کہا ہے کہ وہ کمینہ مر گیا ہے... وہ منہوں شخص میرا خون چوسنے کے لیے زندہ ہے۔ ابھی آدھے گھنٹے پہلے وہ میرے پرس سے رقم چرا کر شراب لینے گیا تھا اور آنے والا ہوگا۔“

ابھی مسز پلوئی کے الفاظ منہ میں تھے کہ دروازہ کھلا اور پلوئی ہیری اندر آیا۔ میں ذرا ایک طرف تھا اس لیے اس نے دیکھا نہیں اور سیدھا فریج کی طرف گیا اور اسے کھولتے ہوئے اپنی بیوی سے کہا۔ ”کسی بد بخت نے اپنی گاڑی عین ہمارے گھر کے سامنے لگا دی ہے۔“

میں اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے پیچھے آیا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”وہ بد بخت اس وقت تمہارے گھر میں موجود ہے۔“

پلوئی اچھل پڑا اور اس نے مڑ کر مجھے دیکھا تو اس کا منہ

کھلا رہ گیا۔ پھر اس نے اچانک بھاگنے کی کوشش کی لیکن میں اس کے لیے تیار تھا۔ میں نے اسے گریبان سے پکڑا اور ایک گھونسا مار کر اسے میز تک پہنچا دیا۔ وہ فوراً کرسی پر بیٹھ گیا اور ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ”پلیز... ہم بیٹھ کر بھی بات کر سکتے ہیں۔“

”ذلیل آدمی۔“ میں نے دانت چس کر کہا۔ ”اس سے پہلے کہ میں گھونے مار مار کر تمہارا حلیہ بگاڑ دوں، فوراً سے بیستر بچ اگل دو۔“

پلوئی ہیری نے بھی سمجھ لیا تھا کہ اس نے سچ نہ بولا تو میں ایسا ہی کروں گا۔ اس نے اعتراف کر لیا کہ اس نے ہمارے ساتھ دھوکا کیا تھا۔ اس نے فراڈ کے لیے فرانسیسی فوجی وردی پہنی ہوئی تھی اور وہ جرمینوں سے بچنے کے لیے جنگل میں ایک متروک سیوریج لائن میں چھپا ہوا تھا، جب ہم وہاں پہنچ گئے۔ اسے خطرہ محسوس ہوا کہ ہمارے پیچھے آنے والے جرمن سیوریج لائن دیکھ لیں گے اور اسے پکڑ لیں گے۔ البتہ سیوریج لائن کا دہانہ تباہ ہو جاتا تو جرمن اس کے پیچھے نہیں جاسکتے تھے۔ اس نے ہماری مدد کے بہانے ہم سے گرینڈ لیا اور اس سے سیوریج لائن کا دہانہ بند کر دیا۔ ہماری خوش قسمتی کہ ہم اس کی بتائی ہوئی سمت میں فرار ہو کر جان بچانے میں کامیاب رہے تھے۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں گھونے مار کر سچ اس کا حلیہ بگاڑ دوں لیکن اس کی بیوی کی بے چارگی دیکھ کر میں ایسا نہ کر سکا۔ اس لیے میں نے مناسب سمجھا کہ وہاں سے رخصت ہو جاؤں۔ میں باہر آیا تو مسز پلوئی میرے پیچھے آئی اور اس نے لفافہ میری طرف بڑھایا۔

”موسیو ایورٹن! تم جان گئے ہو گے کہ پلوئی یا میں اس کے مستحق نہیں ہیں۔“

میں نے اس عورت کو دیکھا جس نے اپنی نصف صدی کی زندگی میں بس تکلیفیں اور عسرت دیکھی تھی، میں نے آہستہ سے کہا۔ ”مسز پلوئی! یہ رقم اب تمہاری ہے۔ اسے اس شخص سے بچا کر رکھنا۔ مجھے یقین ہے کہ یہ تمہارے کام آئے گی۔“

میں وہاں سے روانہ ہوا تو مسز پلوئی آنکھوں میں آنسو لیے ہاتھ ہلا رہی تھی۔ واپسی کے سفر کے دوران میں نے سوچ لیا تھا کہ ماریا اور بچوں کو پلوئی ہیری کی اصلیت بتانا ضروری نہیں ہے۔ مجھے اس بد بخت سے کوئی ہمدردی نہیں تھی۔ ہاں، اصلیت جان کر ماریا اور بچوں کی نظر میں میرا تاثر مجروح ہوتا اس لیے ان کی نظر میں پلوئی ہیری کا بدستور ہیرور ہنا ہی مناسب ہوتا۔





چشمِ دید

سکندر سلیم

محتاط رویے کبھی بڑے نقصان کا سبب بن جاتے ہیں... ایک احتیاط پسند... کم سخن کا ماجر... وہ لوگوں سے فاصلے کا قائل تھا... وہ اپنے مقررہ ہدف کو عبور کرنا چاہتا تھا مگر اس کی تمام تر احتیاطوں کے باوجود ایک چشم دید پیدا ہو گیا۔

باریک بینی سے ماحول میں پیدا ہونے والے التئیر کا غیر معمولی اہم

ڈاکٹر چارلس ہیریسن بے چینی سے کرسی پر بیٹھا پہلو بدل رہا تھا۔ بھی سراغ رساں وینڈر کمرے میں داخل ہوا اور گرم جوشی سے مصافحہ کرنے کے بعد ڈاکٹر کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے جیب سے نوٹ بک نکالی اور مسکراتے ہوئے بولا۔ ”میں تم سے کچھ سوالات کرنا چاہوں گا۔“

چارلس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا کیونکہ اسے زندگی میں پہلی بار اس طرح کی صورت حال کا سامنا کرنا پڑا

تھا۔ یہ بھی غصہ تھا کہ پولیس نے اسے ہیڈ کوارٹر بلانے کے بجائے اس کی فیکٹری میں ہی تفتیش کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس نے بے دلی سے گردن ہلائی تو وینڈر کی مسکراہٹ اور گہری ہو گئی۔

اس نے پوچھا۔ ”گزشتہ روز تم کتنے بجے چلے گئے تھے؟“

”ساڑھے تین بجے۔“

”کیا تم ہمیشہ اسی وقت جاتے ہو؟“

”نہیں، میرے جلدی جانے کی وجہ کچھ اور تھی۔ دراصل مارشل گیس کٹ کمپنی کو کیڑوں کی وجہ سے ہزاروں ڈالر کا نقصان ہو رہا ہے۔“

”کیڑے؟“

”ہاں، پتنگے... یہی وجہ تھی کہ میں گزشتہ شب فیکٹری واپس آیا۔“

سراخ رساں وینڈر پیچھے کی جانب جھکتے ہوئے بولا۔

”مجھے ان پتنگوں کے بارے میں بتاؤ؟“

چارلس نے رد مال سے ماتھے کا پسینا بونجھا اور اس کے ذہن میں گزرے ہوئے واقعات کی قلم چلنے لگی۔

☆☆☆

سوموار کے روز وہ مارشل گیس کٹ کمپنی کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے ہانپ رہا تھا۔ بہت زیادہ وزنی ہونے کی وجہ سے اس کے گھٹنے اتنا بوجھ برداشت کرنے سے قاصر تھے۔ دفتر میں داخل ہوتے ہی اس کی نظر ایلس فوریس پر گئی جو اپنی استقبال میز کا سہارا لیے کافی کا گنگ پکڑے کھڑی تھی۔ اس نے سر سے پاؤں تک چارلس کا جائزہ لیا اور طنز یہ انداز میں بولی۔ ”کیا یہ قمیص نئی ہے؟“

”ہاں۔“ چارلس نے مختصر جواب دیتے ہوئے کہا۔

”کتنا پیارا رنگ ہے۔“ وہ بولی۔ ”یہ تمہاری سیاہ رنگت پر خوب چمک رہا ہے۔ ویسے تمہارے سائز کے اچھے کپڑے مشکل سے ہی ملتے ہوں گے۔“

وہ دفتر میں بمشکل پانچ منٹ کے لیے آیا تھا لیکن اتنی سی دیر میں ہی ایلس نے اسے اس کی اوقات یاد دلادی۔ اگر وہ بھی گوری چمڑی والا ہوتا تو ایلس کو طنز کرنے کا موقع نہیں مل سکتا تھا۔

”تھوڑی سی ورزش سے تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔“ ایلس نے اپنی ایک ٹانگ اوپر اٹھائی اور بولی۔

”میں اپنے جسم کو متناسب اور دبلا رکھنے کے لیے باقاعدگی سے چہل قدمی کرتی ہوں۔“

چارلس اس کے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔

”میرے پاس باتیں کرنے کے لیے وقت نہیں ہے۔“ یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اس نے اپنا کمپیوٹر آن کیا اور میز پر رکھی چیزوں کو ترتیب دینے لگا۔ اسے شدت سے کافی کی طلب ہو رہی تھی چنانچہ وہ بریک روم میں آ گیا۔ اس نے اپنے گنگ میں کافی بھری اور میز پر بیٹھ گیا۔

چند لمحے بعد پال تھامسن آیا اور اپنے گنگ میں کافی بھرتے ہوئے بولا۔ ”ہم نے تمہارے کہنے کے مطابق گودام کی تمام کھڑکیوں اور روشن دانوں پر باریک جالی لگوا دی ہے۔ اس کے باوجود پتنگے آرہے ہیں۔“ وہ بسکٹ کا ٹکڑا منہ میں رکھتے ہوئے بولا۔ ”ان جالیوں کی خریداری پر خاصی رقم خرچ ہو گئی اور ان کے لگانے پر جو خرچ ہوا، وہ الگ ہے لیکن اس سے بھی کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ مجھے ڈر ہے کہ مارشل اس پر خوش نہیں ہوگا۔“ پھر اس نے ایک پلاسٹک کا تھیلا اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”ان گیس کٹ کا جتنی جلد ممکن ہو سکے، ٹیسٹ کروالو۔“

اس کے جانے کے بعد چارلس بھی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ راستے میں اس کی ملاقات کمپنی کے مالک مسٹر مارشل سے ہوئی جو اپنے کمرے سے باہر آ رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی وہ بولا۔ ”میں نے سنا ہے کہ کیڑے واپس آ گئے ہیں۔ میں تمہاری رپورٹ کا انتظار کر رہا ہوں۔ کوئی بات معلوم ہو تو مجھے سیل پر فون کر دینا۔“

چارلس نے لیبارٹری کا رخ کیا اور جیسے ہی اس نے دروازہ کھولا، وہ ایک اجنبی شخص سے ٹکرا گیا۔

”مسٹر ہیرسن... یہ ہمارا نیا ٹرینی ٹونی گلبرٹ ہے۔“ لیبارٹری مینیجر جو لیو نے اس کا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔

”ڈاکٹر چارلس ہیرسن۔“ چارلس نے نوجوان ٹونی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

نئے لوگوں کو تربیت دینا اس کی ذمہ داری تھی لیکن اس روز خلاف معمول اس نے لفافہ جو لیو کو پکڑاتے ہوئے کہا۔ ”تم جلدی سے انہیں ٹیسٹ کرو۔ میں ٹونی کو فیکٹری دکھاتا ہوں۔“

”میں نے کبھی کوئی فیکٹری نہیں دیکھی۔“ ٹونی نے کہا۔ ”تم گیس کٹ کس طرح تیار کرتے ہو؟“

”ہم اس جگہ سے شروع کریں گے جہاں خام مال رکھا جاتا ہے۔“

وہ ٹونی کو گودام میں سے گزارتے ہوئے لے گیا جہاں ملازمین گہرے نیلے ایپرن پہنے کام میں مصروف

تھی۔ پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ پروانے ٹینک میں داخل ہوئے اور خام مال کو نقصان پہنچایا۔ دن کے اجالے میں انہیں دیکھنا مشکل تھا البتہ رات کی تاریکی میں وہ بہ آسانی دیکھے جاسکتے تھے۔

اس کے بعد چارلس نے اسے فیکٹری کے مختلف حصے دکھائے اور بتایا کہ کس طرح خام مال سے گیس کٹ تیار کی جاتی ہیں۔ جب وہ فیکٹری کا چکر لگا کر واپس لیبارٹری میں آئے تو جولیو نے ٹونی کو ایک لیب کوٹ دیتے ہوئے کہا۔
”اس کو پہن لینے سے تمہارے کپڑے محفوظ رہیں گے۔“
”یہ میرا ہے؟“ ٹونی نے حیرت اور خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

”ہاں، جب تک تم یہاں کام کر رہے ہو۔“
ٹونی نے چند بے ربط جملے بولے جو انگریزی سے بالکل مختلف تھے۔ ایسی زبان عام طور پر شہری لڑکے لفظوں کو بگاڑ کر بولتے ہیں لہذا چارلس نے ضروری سمجھا کہ شروع میں ہی ٹونی کی طبیعت صاف کر دی جائے۔ اس نے محتاط انداز میں کہا۔
”جب تم جیسا سفید قام شخص کسی سیاہ قام کا مضحکہ اڑائے تو اسے تہذیب کے خلاف سمجھا جاتا ہے۔“
ٹونی پلکیں جھپکاتے ہوئے بولا۔ ”ڈاکٹر ہیرلسن...“

”میں بھی تمہارے جیسا سیاہ قام ہوں۔“
”معاف کرنا... مجھے تو ایسی کوئی مماثلت نظر نہیں آئی۔“
”ہاں۔“ ٹونی نے اپنا بازو کوٹ کی آستین میں ڈالتے ہوئے کہا۔ ”بعض اوقات جو دکھائی دیتا ہے، حقیقت اس سے مختلف ہوتی ہے۔“

☆☆☆

چارلس نے سراغ رساں سے گفتگو کے دوران میں بہت سی غیر اہم باتیں حذف کر دیں۔ اس کی یہ کوشش سراغ رساں وینڈر کی نگاہوں سے پوشیدہ نہ رہ سکی۔ اس نے کاغذ پر ایک دائرہ بناتے ہوئے کہا۔ ”گویا تم نے نئے ملازم کو پوری فیکٹری دکھا دی۔ کیا یہ معمول کا حصہ ہے؟“

”ہاں، میں اس سے اتفاق کرتا ہوں۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔“

”لگتا ہے کہ مسٹر گلبرٹ کو بیج سسٹم کے بارے میں زیادہ دلچسپی ہے؟“ وینڈر نے پینل سے کاغذ پر ایک اور دائرہ بناتے ہوئے کہا۔

”میں نے اسے سارا طریقہ سمجھا دیا۔“ چارلس نے کہا۔ ”میں یہ نہیں کہوں گا کہ اس نے اس بارے میں کسی غیر معمولی دلچسپی کا اظہار کیا تھا۔“

”تمہیں عمارت سے باہر نکلنے کے بعد اپنا بیج دیوار سے رگڑنا ہوگا۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنی قمیص میں لٹکا ہوا بیج علیحدہ کیا اور اسے عمارت کی دیوار میں لگے بیج ریڈر کے ساتھ بیچ دیا۔ اس کے ساتھ ہی دروازے کا تالا کھل گیا اور وہ عمارت سے باہر آ گئے۔

”اگر ہمارے پاس بیج نہ ہو تو کیا ہوگا؟“ ٹونی نے پوچھا۔

”تب تم دروازے کا تالا نہیں کھول سکتے۔“
”آگ لگ جانے کی صورت میں کیا ہوگا؟“

چارلس نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”اگر تمہارا بیج گم ہو گیا ہو اور تمہارے ساتھ کوئی ہنگامی صورت حال پیش آجائے تو تم دیوار میں لگا ہوا بیج دباؤ گے۔ ایک الارم بجے گا اور فائر اسٹیشن اپنی کارروائی شروع کر دے گا۔“ چارلس اسٹور بیج ٹینک کی قطار کے ساتھ چلتا ہوا آگے بڑھا جن میں سے ہر ایک کے ساتھ اوپر جانے کے لیے ایک سیڑھی لگی ہوئی تھی۔

”ٹینکرز کے ذریعے جو خام مال آتا ہے، وہ انہی ٹینکوں میں اسٹور کیا جاتا ہے۔“

ٹونی حیرت سے ان اونچے اونچے سلنڈر نما ٹینکوں کو دیکھ رہا تھا جیسے کوئی دیہاتی پہلی بار کسی بڑے شہر میں آیا ہو۔ چارلس نے ایک ٹینک کے نچلے حصے میں لگا ہوا ہینڈل گھمایا تو ایک کھڑکی نما دروازہ کھل گیا۔ ٹونی نے پرتحس انداز میں اندر قدم رکھا۔ اس کے پیچھے پیچھے چارلس بھی ٹینک میں چلا گیا۔ اس کی چھت اتنی اونچی تھی کہ بمشکل ایک آدمی سیدھا کھڑا ہو سکے۔

چارلس نے ٹینک کے اندر ٹونی جیسے کا بغور جائزہ لیا تاکہ کیڑوں کے اندر آنے کا راستہ معلوم کر سکے لیکن اسے یقین ہو گیا کہ ٹینک میں ایسا کوئی خلا نہیں جہاں سے پتنگے اندر داخل ہو سکیں۔ اس کی یہ مکمل طور پر سیل تھی جبکہ اوپری حصے میں جالی لگا دی گئی تھی۔

”میری سمجھ میں یہ سسٹم نہیں آیا۔“ ٹونی نے کہا۔
”کوئی بھی شخص بیج کی مدد سے اندر داخل ہو سکتا ہے۔“

”یہ بیج صرف کمپنی کے مخصوص ملازمین کے پاس ہیں اور جو کوئی بھی اس کی مدد سے دروازہ کھولتا ہے تو کمپیوٹر میں اس کی انٹری ہو جاتی ہے۔“ چارلس نے اسے بتایا۔

ابھی تک فیکٹری میں چوری کا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا تھا اور نہ ہی کسی غیر متعلقہ شخص نے اندر آنے کی کوشش کی

”تم یقیناً بہتر سمجھ سکتے ہو۔“ سراغ رساں بولا۔
”اس کے بعد کیا ہوا؟“

چارلس نے ایک بار پھر اپنی یادداشت کو کھنگالنا شروع کیا۔ یہاں کے دیے ہوئے نمونوں میں پتنگوں کی موجودگی کا انکشاف ہوا تھا جبکہ ٹینک میں ان کے جانے کا کوئی راستہ بظاہر نظر نہیں آ رہا تھا۔ چارلس نے فون پر لیبارٹری میں بات کرنے کی کوشش کی لیکن دوسری طرف سے کسی نے جواب نہیں دیا۔

وہ استقبالیہ کاؤنٹر کے سامنے سے گزرا تو اس نے دیکھا کہ ایلس بڑی بے چینی سے اپنا پرس ٹٹول رہی تھی۔ چارلس کو دیکھتے ہی وہ بولی۔ ”کیا تم نے میرا بیج دیکھا ہے؟“
”نہیں۔“ اس نے جواب دیا۔

”میں صرف ایک منٹ کے لیے یہاں سے ہٹی اور میرا بیج غائب ہو گیا۔“ اس نے چارلس کو ایسی نظروں سے دیکھا جیسے وہی مجرم ہو۔ ”میری چیزیں ہمیشہ اسی طرح پڑی رہتی ہیں لیکن کبھی ایسا نہیں ہوا۔“

چارلس نے وہاں سے کھسک جانا مناسب سمجھا۔ اب اس کا رخ بریک روم کی طرف تھا جہاں جولیو اور ٹونی بیٹھے ہوئے تھے۔ چارلس نے بھی اپنا بیج باکس نکالا اور ان کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ ٹونی کے سامنے پیزا کی پلیٹ اور سوڈے کا ٹن رکھا ہوا تھا۔ اسی اثنا میں ایلس آندھی طوفان کی طرح بریک روم میں داخل ہوئی اور وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں کا جائزہ لینے لگی پھر اس نے وہاں بیٹھی ہوئی مینڈی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”مینڈی! ہمیں وقت کی پابندی کرنی چاہیے۔ میں جب بھی یہاں سے گزرتی ہوں، تمہیں یہیں بیٹھا ہوا دیکھتی ہوں۔“

مینڈی نے اپنا سراو پر اٹھایا اور ایلس کو خونی نظروں سے دیکھنے لگی جیسے اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں کھا جائے گی۔ ایلس اس کی نظروں کی تاب نہ لا سکی اور بولی۔ ”اگر آنکھوں سے کسی کو قتل کرنا ممکن ہوتا تو مجھے یقین ہے کہ میں ابھی اور اسی وقت مر جاتی۔“

مینڈی اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی اور ایلس سے بولی۔ ”تم نے ہی مارشل کو بتایا تھا کہ میں کام پر دیر سے آتی ہوں۔“

”میں نے؟“ ایلس نے معصوم بننے کی ناکام کوشش کی۔

”مجھے تنہا چھوڑ دو۔“ مینڈی نے اپنے آنسو روکنے کی

کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے تنہا چھوڑ دو ورنہ...“
”ورنہ کیا؟“ ایلس نے پوچھا۔

”تمہارے ساتھ وہی ہوگا جس کی تم مستحق ہو۔“ مینڈی نے کہا اور باہر چلی گئی۔

”جانے دو ایلس۔“ جولیو بولا۔ ”مینڈی کے یہاں بچہ ہوا ہے، وہ جلد ہی نارمل ہو جائے گی۔“

”چند منٹ دیر سے آنا کوئی بڑی بات نہیں۔“ نیکا نے کہا۔ ”رات کی شفٹ میں زیادہ کام ہوتا ہے۔“

”اس سے تمہارا کیا مطلب ہے؟“ ایلس دلچسپی لیتے ہوئے بولی۔

”تمہیں دوسرے لوگوں کی فکر کیوں رہتی ہے؟“ نیکا نے خالی ڈباؤسٹ بن میں پھینکتے ہوئے کہا۔ ”اپنے لیے بھی کوئی تلاش کر لو۔“

ایلس نے لمحہ بھر کے لیے نیکا کو دیکھا پھر اس کی توجہ چارلس اور ٹونی کے کھانے پر مرکوز ہو گئی اور وہ بولی۔ ”اوہ میرے خدا، دو آدمیوں کے لیے اتنا زیادہ کھانا۔“ پھر اس نے فریج سے اپنا بیج باکس نکالا اور بولی۔ ”میں تو ہر روز تھوڑی سی سلا دیتی ہوں۔“

جولیو کو لڈو رنگ لینا چاہ رہا تھا۔ اس نے اپنا پرس نکالا اور بولا۔ ”کسی کے پاس بیس ڈالر کا چینج ہے؟“

”میں اپنا پرس میز کی دراز میں رکھ کر آئی ہوں۔“ ایلس نے کہا۔ ”کسی نے آج صبح میرا بیج چدالیا ہے۔ اب تو کوئی بھی جگہ محفوظ نہیں رہی۔“

”ممکن ہے کہ تم سے ہی گم ہو گیا ہو۔“ جولیو بولا۔
”میں ڈھونڈ لوں گا۔“

”بعض اوقات بڑھاپے میں لوگوں کو بھولنے کی عادت ہو جاتی ہے۔“ ٹونی بولا۔ ”ممکن ہے تمہیں یاد نہ رہا ہو کہ بیج کہاں رکھا تھا۔“

ایلس کے گال غصے سے سرخ ہو گئے۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی سخت جملہ کہتی، چارلس نے بات نبھانے کے لیے کہا۔ ”مجھے یقین ہے کہ ٹونی کا مطلب ہرگز یہ نہیں تھا۔“

”بوڑھا ہونا کوئی بری بات نہیں۔“ ٹونی بولا۔ ”بلکہ بڑھاپے میں ہر جگہ رعایت ملتی ہے اور بوڑھے لوگوں کو کبھی کسی چیز کی پوری قیمت نہیں ادا کرنا پڑتی۔“

ایلس کا پارا چڑھ گیا اور وہ چلاتے ہوئے بولی۔ ”اگر میں تمہاری شکایت کر دوں تو تم اس کمپنی میں نہیں رہ سکتے۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنا بیج باکس واپس فریج میں رکھ دیا اور دندناتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی۔

ڈائری دیکھ رہی تھی۔“

”تم میری نیچر نہیں ہو اور بہتر ہوگا کہ یہ بات ہمیشہ ذہن میں رکھنا۔“

”میں تمہاری مدد کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔“

ایلس بولی۔ ”تمہاری ملازمت پہلے کی طرح محفوظ نہیں ہے اور میرا خیال ہے کہ تم بھی یہ بات جانتے ہو۔“

”مجھے دھمکی مت دو۔“ چارلس نے کہا۔

”میں تمہیں صرف یہ یقین دلانا چاہتی ہوں کہ مارشل اپنے ملازمین کی کتنی قدر کرتا ہے۔“

”تم لوگوں کی نوکریوں سے کھیل رہی ہو۔“ چارلس نے غصے سے کہا۔ ”یہ کھیل تمہیں بہت مہنگا پڑے گا اور ایک دن تم اس کی وجہ سے نقصان اٹھاؤ گی۔“

یہ کہہ کر اس نے چابیاں اٹھائیں اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ کار میں سوار ہوتے وقت اس کے پیٹ میں

ایٹشن ہو رہی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اگر اس نے اپنے آپ کو مصروف نہ رکھا تو دن کا بقیہ حصہ گزارنا مشکل ہو جائے گا

چنانچہ اس نے کار کا رخ گرانٹ میوزیم آف فائن آرٹ کی جانب موڑ دیا۔

استقبالیہ پر بیٹھی ہوئی عورت کو چارلس نے اپنا کارڈ دکھایا تو وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ”گڈ آفٹر نوون، مسٹر ہیریسن۔۔۔ عام طور پر تم اتنی جلدی بھی نہیں آتے۔“

مہمانوں کو خوش آمدید کہنا اس عورت کے فرائض میں شامل تھا لیکن اس کے لہجے کی مٹھاس چارلس کے دل میں اتر گئی اور وہ مسکراتے ہوئے گیلری کی جانب بڑھ گیا۔ وہ

بڑے انہماک سے تصویریں دیکھ رہا تھا۔ اچانک اسے دروازے پر کچھ شور سا محسوس ہوا۔ ایک عورت وہیل چیئر کے سہارے گیلری کی طرف آرہی تھی۔ اس نے چارلس

کے قریب آ کر کہا۔ ”آج کا دن بہت طویل ہے۔“

چارلس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ اس کی بات کا جواب دے چنانچہ اس نے کہا۔ ”کیا میں تمہارا نام جان سکتا ہوں؟“

عورت نے اپنا ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”رشونا سیلیا۔“

چارلس نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور بولا۔ ”بہت خوب صورت نام ہے۔ مجھے چارلس ہیریسن کہتے ہیں۔“

چارلس جس تصویر کو دیکھ رہا تھا، وہ اس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ”اس تصویر میں تمہیں کیا خاص بات نظر آئی؟“

جولیو نے ٹوٹی کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولا۔

”اچھا ہوا تم اسے جان گئے۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ ٹوٹی نے پوچھا۔ ”تمہارا کیا خیال ہے کہ وہ مجھ سے پیچھا چھڑا سکتی ہے۔ وہ کمپنی کی مالک تو نہیں۔“

”اگر وہ چاہے تو تمہاری چھٹی ہو جائے گی۔“ جولیو نے کہا۔

ٹوٹی کا چہرہ مرجھا گیا اور وہ بولا۔ ”ابھی تو مجھے یہاں آئے آدھا دن ہی ہوا ہے۔“

”میں تمہاری سفارش کر دوں گا۔“ چارلس نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

”میں دیکھ چکا ہوں کہ وہ تمہارے ساتھ کیسا سلوک کرتی ہے۔“ ٹوٹی نے طنزاً کہا۔

چارلس کو اپنے کام کے سلسلے میں بار بار ایلس کے سامنے سے گزرنا پڑتا اور وہ ہر مرتبہ اسے عجیب سی نظروں سے دیکھتی لہذا چارلس نے مزید کسی بد مزگی سے بچنے کے

لیے جلد جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اسے معلوم تھا کہ سورج غروب ہونے میں کئی گھنٹے باقی تھے اور چارلس کو پتنگے دیکھنے کے

لیے مکمل اندھیرے کی ضرورت تھی۔ جیسے ہی چارلس نے اپنا کمپیوٹر بند کیا، وہ راہداری میں آ کر کھڑی ہو گئی اور بولی۔

”تم جلدی جا رہے ہو؟“

چارلس اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہ رہا تھا لیکن اس نے اسٹینڈ لینے کا فیصلہ کیا اور بولا۔ ”تمہارا مشاہدہ بہت تیز ہے۔“

ایلس نے اپنے دونوں بازو سینے پر باندھتے ہوئے کہا۔ ”کیا تم نے مارشل کو بتا دیا؟“

”میں اپنے وقت کا استعمال جانتا ہوں اور مسٹر مارشل کو یہ بات اچھی طرح معلوم ہے۔“ دفتر سے باہر نکلنے

کے بعد چارلس کو محسوس ہوا کہ وہ کوئی اہم کام ادھورا چھوڑ آیا ہے۔ وہ اپنی گاڑی کی چابی میز پر چھوڑ آیا تھا۔ وہ الٹے

قدموں واپس ہولیا۔ ایلس اس کے دفتر میں کھڑی تھی اور اس کی پشت دروازے کی طرف تھی۔ چارلس نے دیکھا کہ

وہ اس کی ڈائری کے صفحات پلٹ رہی تھی۔

”تم یہاں کیا کر رہی ہو؟“ چارلس نے پوچھا۔

ایلس نے پلٹ کر دیکھا۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی گھبراہٹ نمودار ہوئی لیکن اس نے فوراً ہی اپنے آپ پر قابو

پالیا اور بولی۔ ”اگر مارشل تمہارے بارے میں پوچھے تو میں اسے بتا سکوں کہ تم کہاں گئے ہو۔ اسی لیے میں تمہاری

”یہ خاصی چونکا دینے والی ہے اور کوئی بھی شخص اسے دیکھے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا۔“

وہ دونوں مختلف تصویریں دیکھتے اور ان پر تبصرہ کرتے رہے اور انہیں وقت گزرنے کا احساس بھی نہیں ہوا۔ جب وہ واپس جانے کے ارادے سے داخلی دروازے پر پہنچے تو سورج پہاڑوں کے پیچھے غروب ہو رہا تھا۔

”کتنی جلدی وقت گزر گیا۔“ چارلس نے کہا۔ ”میں دفتر میں ایک ایسے پروجیکٹ پر کام کر رہا ہوں جس کے لیے مکمل تاریکی درکار ہے۔“

”بڑا دلچسپ پروجیکٹ ہے، کاش میں تمہارے ساتھ شامل ہو سکتی۔“

”پتنگوں سے زیادہ دلچسپ وہ نمائش ہوگی جو اگلے ماہ منعقد ہونے والی ہے۔“ چارلس نے کہا۔ ”شاید اس کی اختتامی تقریب میں ہم ایک ساتھ شرکت کر سکیں۔“

”یہ تو بہت اچھی بات ہوگی۔“ رشونا چبکتے ہوئے بولی۔

☆☆☆

کمپنی کی عمارت سے سفید روشنی باہر آرہی تھی۔ یہاں ہفتے کے سات دن اور روزانہ چوبیس گھنٹے کام ہوتا تھا۔ اس نے اپنا بیج مرکزی دروازے پر لگے ریڈر میں ڈالا اور اندر داخل ہو گیا۔ ٹونی ایک میز پر بیٹھا کچھ پڑھ رہا تھا۔ ”تم ابھی تک یہیں ہو؟“ چارلس نے پوچھا۔

ٹونی اسے دیکھ کر کھڑا ہو گیا اور بولا۔ ”جولیو نے کہا تھا کہ میں یہ پوری کتاب پڑھ ڈالوں۔ ایس نے مجھے دفتر سے باہر نکال دیا۔ شاید وہ ڈر رہی تھی کہ میں کوئی چیز نہ چروالوں لہذا میں یہاں آ گیا۔ میں چاہتا ہوں کہ نکالے جانے سے پہلے زیادہ سے زیادہ سیکھ لوں۔“

”کسی چونکا لے میں کچھ وقت لگتا ہے۔“ چارلس نے کہا۔ ”مجھے یقین ہے کہ تم مزید کچھ دن یہاں گزار سکو گے۔“

”تم واپس کیوں آ گئے؟“ ٹونی نے پوچھا۔

”یہ دیکھنے کے لیے کہ پتنگے رات میں کس راستے سے اندر داخل ہو سکتے ہیں۔“

”کیا میں تمہارے ساتھ اندر جاسکتا ہوں؟“ ٹونی نے پوچھا۔

”نہیں، یہاں کام کرنے کے اوقات مقرر ہیں اور تم تو پہلے سے ہی مشکل میں ہو۔“

یہ کہہ کر چارلس اپنا سامان اکٹھا کرنے لگا۔ اس نے

ایک چھوٹے تھیلے میں پلاسٹک کے دستانے، چمچی اور کچھ دوسری چیزیں ڈالیں۔ جب وہ ٹینک میں داخل ہوا تو توقع کے مطابق وہاں لاتعداد پتنگے موجود تھے جو ٹینک کے دروازے پر لگے ہوئے بلب کے گرد منڈلا رہے تھے۔ چارلس چاروں طرف نظریں گھما کے ان کے اندر آنے کا راستہ تلاش کر رہا تھا کہ اسے دوسرے ٹینک سے ایک آواز سنائی دی۔ پہلے تو وہ سمجھا کہ کوئی چوہا ہے لیکن پھر ایک جانی پہچانی آواز گونجی جسے سن کر چارلس چونک گیا۔ وہ مارشل تھا جو یہ آواز بلند کسی سے کچھ کہہ رہا تھا۔ چارلس کو جستجو ہوئی کہ مارشل اس وقت یہاں کیا کر رہا ہے۔ وہ لکڑی کی چوکیوں کے ڈھیر کے پیچھے چھپ کر ٹینک کی جانب دیکھنے لگا۔ اسے دوسرے سیڑھی کی جانب جاتے ہوئے دکھائی دیے۔ ان میں ایک مارشل اور دوسری کوئی عورت تھی۔ چارلس کو نیکا کے الفاظ یاد آ گئے جو اس نے بیچ کے دوران میں ادا کیے تھے کہ اصل سرگرمی تورات کی شفٹ میں ہوتی ہے۔

مارشل اور عورت سیڑھی کے آخری سرے پر پہنچ کر غائب ہو گئے پھر اس نے ٹینک پر لگی ہوئی جالی کو زمین پر گرتے دیکھا۔ کافی وقت گزر جانے کے بعد وہ دونوں سیڑھی سے نیچے آتے دکھائی دیے۔ وہ خاموشی سے دم سادھے بیٹھا رہا۔ مارشل نے پہلے اس عورت کو اندر بھیجا اور سگریٹ جلا کر احاطے کا جائزہ لینے لگا۔

چارلس کو وہاں چھپے ہوئے بہت دیر ہو چکی تھی۔ اس سے کچھ فاصلے پر ایک فورک لفٹر آ کر رکا جس پر گرہیں اور گیس کا سلنڈر رکھا ہوا تھا۔ اس کی ناگوار مہک سے چارلس کا سر چکرانے لگا۔ پتنگوں کی آمد کی وجہ کسی حد تک اس کی سمجھ میں آ گئی تھی لیکن وہ کسی کے سامنے اس کا اظہار نہیں کر سکتا تھا ورنہ اس کی ملازمت فوراً ختم ہو جاتی۔

بالآخر مارشل نے اپنا سگریٹ ختم کیا۔ بیج نکال کر ریڈر میں ڈالا اور عمارت میں داخل ہو گیا۔ چارلس نے لیبارٹری میں جانے کے لیے وہ راستہ اختیار کیا جو بہت کم استعمال میں رہتا تھا۔ لیبارٹری میں پہنچ کر اس نے سکون کا سانس لیا۔ اس کی محنت رانگاں نہیں گئی تھی۔ وہ اس رات ایک قیمتی راز معلوم کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

☆☆☆

”کیا مسٹر مارشل اور اس عورت نے تمہیں دیکھ لیا تھا؟“ سراغ رساں وینڈر نے پوچھا۔

”نہیں، میں نے اپنے آپ کو ان کی نظروں سے اوجھل رکھا۔“

”آج کا دن سکون سے گزرے گا۔“ ٹونی نے کہا۔

مینڈی نے دروازہ کھول کر جھانکا اور جب اس نے چارلس اور ٹونی کو ایلس کی میز کے پاس کھڑا دیکھا تو اندر چلی آئی اور بولی۔ ”کیا ہو رہا ہے؟“

”ایلس آج صبح کام پر نہیں آئی۔“ چارلس نے کہا۔
”میں اسے آ کر فون کرتی ہوں۔“ مینڈی نے کہا۔
”ضرور کوئی گڑبڑ ہے۔“

چارلس نے مارشل کو بھیجنے کے لیے اپنی رپورٹ تیار کی لیکن اس میں یہ ذکر نہیں کیا کہ وہ اسے ٹینک کی چھت پر ایک عورت کے ساتھ دیکھ چکا ہے جو یقیناً اس کی بیوی نہیں تھی۔ اس نے رپورٹ مکمل کرنے کے بعد قدرے ہچکچاہٹ کے بعد اسے میل کر دیا کیونکہ وہ خلوص دل سے سمجھ رہا تھا کہ اس واقعے کا ذکر کیے بغیر یہ رپورٹ نامکمل تھی۔

ٹونی اس کے کمرے میں داخل ہوا اور کہنے لگا۔
”جولیو نے کہا ہے کہ تم سے مل لوں۔ جب تک سیمپل ٹیسٹ نہیں ہو جاتے، میرے پاس کوئی کام نہیں ہے۔“
”میں تمہیں بتاؤں گا کہ ہم کس طرح خام مال کے نمونے اکٹھا کرتے ہیں۔“ چارلس نے کہا۔

ٹونی یہ سنتے ہی مستعد ہو گیا۔ وہ ان لڑکوں میں سے تھا جو مستقبل میں عظیم سائنس دان بن سکتے تھے بشرطیکہ ایلس جیسی کوئی ہستی اس کے راستے میں رکاوٹ نہ ڈالے۔ ٹونی نے مطلوبہ سامان اکٹھا کیا اور ایک چھوٹے تھیلے میں رکھ کر اس پر اپنا نام جلی حروف سے لکھ دیا۔

”ایک فالتو جوڑی دستانوں کی بھی اپنی جیب میں رکھ لو۔“ چارلس نے اسے مشورہ دیا۔ اس کے بعد وہ اسی راستے پر روانہ ہو گئے جس پر چارلس گزشتہ شب گیا تھا۔
”ایک ایک اے کی آہٹ محسوس ہوئی۔“
اس نے چونک کر ٹونی کی طرف دیکھا تو وہ بولا۔
”شاید کوئی لمبی ہے۔“

چارلس اس جواب سے مطمئن نہیں ہوا اور آواز کی جانب لپکا۔ ٹونی بھی اس کے پیچھے تھا۔ انہوں نے دیکھا کہ نیکا ایک سنئیر کے سامنے زور زور سے ہاتھ ہلا کر ہسٹریائی انداز میں چلا رہی تھی لیکن روسی زبان بولنے کی وجہ سے اس کی بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔

”نیکا۔“ چارلس نے اپنا تھیلہ زمین پر رکھتے ہوئے کہا۔ ”کیا ہوا؟“

وہ روسی زبان میں بیان کرنے لگی۔ اس کی چیخ پکار سن کر بہت سے کارکن اس جانب دوڑے۔ چارلس نے

”تم کیوں چھپ گئے تھے؟“

”میں اسے چھپنا نہیں کہوں گا تاہم میں وہاں پر اپنی موجودگی ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مسٹر مارشل کمپنی کے مالک ہیں۔۔۔ اگر انہیں معلوم ہو جاتا کہ میں سب کچھ دیکھ چکا ہوں تو میری ملازمت اسی وقت ختم ہو جاتی۔“

سراغ رساں نے پرنٹ آؤٹ پر نظر دوڑائی۔ چارلس جانتا تھا کہ گزشتہ چوری کے واقعے کے بعد کمپنی کے آئی ٹی ڈیپارٹمنٹ نے لوگوں کی آمد و رفت کا ریکارڈ رکھنا شروع کر دیا تھا کہ کون کس وقت آیا اور کب گیا۔

”تم فیکٹری سے نکلنے کے بعد کہاں گئے تھے؟“
سراغ رساں نے پوچھا۔
”گھر۔“

”گھر پر تمہارے علاوہ اور کون ہے؟“
”میں اکیلا رہتا ہوں۔“ چارلس نے جواب دیا۔
”اور میرے پاس ایسا کوئی گواہ نہیں جو بتا سکے کہ میں نے گھر آنے کے بعد ٹی وی پر فلم دیکھی اور سو گیا۔“
☆☆☆

دوسرے روز چارلس دیر سے دفتر پہنچا۔ چند لمحے دروازے کے باہر رک کر اس نے اپنے آپ کو ایلس کی ممکنہ جرح کے لیے تیار کیا اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ ایلس اپنی جگہ پر موجود نہیں تھی۔ وہ جلدی سے اپنے دفتر میں گھس گیا اور روزمرہ کے معمول کے مطابق اپنا کام شروع کر دیا۔ اچانک ہی ایک خیال اس کے ذہن میں آیا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ اس کی شکایت کرنے اسے آردالوں کے پاس چلی گئی ہو؟

ٹونی اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولا۔
”گڈ مارنگ ڈاکٹر ہیرسین۔۔۔ لگتا ہے کہ آج وہ بڑھیا کام پر نہیں آئی۔“

”ممکن ہے کہ وہ بریک روم میں بیٹھی دوسری عورتوں سے باتیں کر رہی ہو۔“ چارلس نے خیال ظاہر کیا۔

”اس کی جیکٹ کرسی پر نہیں ہے۔“ ٹونی نے کہا۔
”اور اس کا کمپیوٹر بھی بند ہے۔“

چارلس اپنی جگہ سے اٹھا تا کہ ٹونی کی بات کی تصدیق کر سکے۔ واقعی ایلس کا کمپیوٹر بند تھا اور ایسی کوئی علامت نظر نہیں آرہی تھی جس سے معلوم ہوتا کہ وہ کام پر آئی ہوئی ہے۔ چارلس نے کہا۔ ”گزشتہ چھ ماہ میں اس نے ایک دن بھی چھٹی نہیں کی ہے اس لیے اس کی غیر حاضری خلاف معمول ہے۔“

اس کا کندھا ہلاتے ہوئے کہا۔ ”نیکا۔۔۔ ہوش میں آؤ، تم ٹھیک تو ہو؟“

نیکا نے کنٹینر کی جانب دیکھا۔ چارلس کی نظریں بھی اسی جانب گھوم گئیں۔ کنٹینر کے نچلے حصے سے ایک انسانی پاؤں باہر نکلا ہوا تھا۔

”پائپ بند ہو گیا تھا۔“ نیکا نے انگریزی میں کہا۔ ”میں یہی دیکھنے آئی تھی کہ کیا خرابی ہے تو میری نظر اس پر پڑی۔۔۔“

چارلس نے کارڈ بورڈ کا ڈھکنا اٹھا کر اندر جھانکا۔ ایلس پلاسٹک کے تختوں پر ایک بے جان گڑیا کی طرح لیٹی ہوئی تھی۔ خون کے دھبے سفید پلاسٹک کے تختوں پر پھیلے ہوئے تھے۔ اس کے چہرے کا آدھا حصہ کچل گیا تھا۔ چارلس نے آہستہ سے ڈھکنا برابر کر دیا۔

”سب لوگ پیچھے ہٹ جائیں۔“ ٹونی نے کہا۔ ”کوئی کسی چیز کو ہاتھ نہ لگائے۔“

سفید کوٹ میں وہ خاصا بارعب نظر آ رہا تھا۔ اس نے ایک ہاتھ سے لوگوں کو آگے بڑھنے سے روکا، دوسرے ہاتھ سے سیل فون نکال کر نمبر ڈائل کرنے لگا۔

جولیو مجمع کو چیرتا ہوا آگے بڑھا اور بولا۔ ”کیا کسی نے نو گیارہ کو فون کیا ہے؟“

”ہاں، میرا رابطہ ڈسپچر سے ہو گیا ہے۔“ ٹونی نے کہا۔

”ہمیں اسے یہاں سے ہٹا دینا چاہیے۔“ جولیو نے کہا۔

”یہ مرچکی ہے۔“ چارلس بولا۔ ”پولیس کے آنے تک ہم اسے ہاتھ نہیں لگا سکتے۔“

جب مارشل کو اطلاع ملی تو وہ دوڑتا ہوا آیا۔ اسے ایلس کی موت سے زیادہ یہ فکر تھی کہ اس واقعے سے کام کی رفتار متاثر ہو رہی ہے اور خون کے چھینٹے پڑنے سے کئی گیس کٹ بے کار ہو گئی ہیں۔ چارلس کو یہ سن کر غصہ آ گیا اور وہ بولا۔ ”ایک عورت مر گئی ہے۔ وہ عورت جو یہاں کئی سالوں سے کام کر رہی تھی۔“

”وہ واقعی مرچکی ہے۔“ مارشل نے اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”اسے اس حال میں دیکھ کر افسوس ہوا لیکن مجھے اپنا بزنس بھی تو چلانا ہے۔“

کچھ دیر بعد پولیس والے اور دوسرا عملہ وہاں پہنچ گیا۔ ٹونی نے چارلس کو اشارہ کیا اور اسے ایک کونے میں لے جا کر بولا۔ ”جب پولیس تم سے پوچھ گچھ کرے تو زیادہ

تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں بس ہاں یا نہ میں جواب دینا اور نہ وہ تم پر شک کر سکتے ہیں۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ چارلس نے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ ”میں قصور وار نہیں ہوں۔“

”تم نے گزشتہ روز ایلس کو دھمکی دی تھی جس کی وجہ سے تم مکمل طور پر بے گناہ نہیں سمجھے جاسکتے۔“

☆☆☆

سراغ رساں وینڈر نے ہاتھ سے لکھے ہوئے کاغذات پر نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔ ”ایلس نے ٹونی کو نوکری سے نکالنے کی دھمکی دی تھی؟“

”اس نے محض ڈرانے کے لیے ایسا کہا تھا۔“

”اس نے اپنی دھمکی پر عمل کیا یا نہیں؟“ وینڈر نے پوچھا۔

چارلس نے اپنی ٹائی کی ٹاٹ درست کرتے ہوئے کہا۔ ”جو تم سمجھ رہے ہو، ویسا نہیں ہے۔ ٹونی کو یہاں کام کرتے ہوئے چند گھنٹے ہی ہوئے ہیں۔ اتنی کم مدت میں

ایلس کی ناراضی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

”کیا وہ اتنی زیادہ ناراض ہوئی تھی کہ رد عمل کے طور پر اسے قتل کر دیا جاتا؟ تم نے بھی تو اسے خطرناک نتائج کی دھمکی دی تھی۔“

”میں یقیناً اس سے ناراض نہیں تھا اور نہ ہی ٹونی۔ تمہیں مشتبہ شخص کو کہیں اور تلاش کرنا چاہیے۔ تم ٹونی پر اپنی توجہ کیوں مرکوز کیے ہوئے ہو؟ محض اس لیے کہ وہ سیاہ فام ہے۔“

”کیا مسٹر گلبرٹ سیاہ فام ہیں؟“ یہ کہہ کر وینڈر نے اپنی نوٹ بک پر کچھ لکھا۔ چارلس نے محسوس کیا کہ پسینے سے اس کی گردن بھیگ رہی ہے۔

”کیا تم ایلس کے شوہر مسٹر فوربس کو جانتے ہو؟“ وینڈر نے پوچھا۔

”ہاں، میں اس سے مل چکا ہوں۔“

”اس کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟“

”ایک کمپنی فنکشن کے دوران میں اس کی برابر والی نشست پر بیٹھا تھا۔ وہ خاموش طبع شخص ہے اس لیے ہمارے درمیان زیادہ بات نہیں ہوئی۔“

”اس کے علاوہ کوئی اور بات محسوس کی؟“

”کسی شخص کو جاننے کے لیے ایک گھنٹے کی پارٹی ناکافی ہے۔“

اس کے بعد چارلس سے سوالات کا سلسلہ ختم ہو گیا

اور اسے جانے کی اجازت دے دی گئی۔ اس کے بعد ایک پولیس آفیسر ٹونی کو لے کر رہداری میں آیا۔

ٹونی نے چارلس کو ایک چھوٹا سا کاغذ کا پرزہ پکڑا دیا جس پر اس کے گھر کا نمبر درج تھا۔ اس نے چپکے سے چارلس کے کان میں کہا۔ ”اگر ان لوگوں نے مجھے نہ جانے دیا تو تم میرے والدین کو فون کر کے بتا دینا۔“

”بے فکر رہو۔“ چارلس نے کہا۔ ”اگر تم بے قصور ہو تو پولیس تمہیں گرفتار نہیں کرے گی۔“

اس تحقیقات کی وجہ سے فیکٹری میں کچھ دیر کے لیے کام بند ہو گیا تھا۔ اگر کوئی اور غائب ہوتا تو وہ تمام ملازمین کی چھٹی کر دیتا لیکن مارشل کا خیال تھا کہ وہ پولیس کے جاتے ہی کام دوبارہ شروع کر دے گا اور ملازمین سے کچھ زائد گھنٹے کام لے کر اپنا نقصان پورا کرے گا۔ لوگ فارغ ہونے کی وجہ سے ادھر ادھر ٹولیوں میں بٹ کر اس قتل کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے اور یہ جاننے کی کوشش کر رہے تھے کہ وہ کیا محرکات تھے جن کی بنا پر ایلس کو قتل کر دیا گیا۔

سب سے زیادہ شبہ چارلس پر ظاہر کیا جا رہا تھا جو کمپیوٹر پر بیٹھا خود سمیت مشتبہ افراد کی فہرست تیار کر رہا تھا۔ اس میں پہلا نام اسی کا تھا کیونکہ اس نے شیرل اور ٹونی کی موجودگی میں ایلس سے غصے سے بات کی تھی۔ دوسرا مشتبہ شخص ٹونی تھا جسے ایلس نے بہت سے لوگوں کی موجودگی میں نوکری سے نکالنے کی دھمکی دی تھی۔ تیسرا نام مینڈی کا تھا جس کی ایلس نے دیر سے آنے پر شکایت لگائی تھی اور مینڈی نے اسے سنگین نتائج کی دھمکی دی تھی۔

ٹونی نے چارلس کے کمرے میں جھانکا۔ اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا اور آنکھیں خوف کی وجہ سے پھیل گئی تھیں۔ چارلس نے اسے دیکھ کر کہا۔ ”میں نے کہا تھا نا کہ تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔“

”سراغ رساں کو میرے تھیلے میں سے ایلس کا بیج ملا ہے اور اب مجھے وضاحت کرنی ہے کہ یہ بیج میرے تھیلے میں کیسے آیا۔“

چارلس نے فوراً ہی ٹونی کے نام کے آگے یہ چھوٹا سا ثبوت پیش کر لیا اور بولا۔ ”تم نے یہ بیج نہیں چھپایا تھا؟“

”مجھے کسی نے پھنسانے کی کوشش کی ہے ڈاکٹر ہیریسن۔“ ٹونی روہانسی آواز میں بولا۔ ”میں نے یہ بیج نہیں چھپایا۔“

”مجھے یقین ہے کہ اس بیج کا ایلس کی موت سے گہرا تعلق ہے۔ اس کی تمہارے تھیلے میں موجودگی مشکلات پیدا

کر سکتی ہے۔“ چارلس نے کہا۔

”وہ سراغ رساں بھی یہی سمجھ رہا ہے کہ میں نے ہی یہ بیج چھپایا تھا۔“ ٹونی پریشانی کے عالم میں بولا۔

”در اصل یہ سب کچھ غلط فہمی کی وجہ سے ہوا ہے۔ اگر تم آج سے کام شروع کر دیتے تو تم پر کوئی شبہ نہ کرتا۔“

”ہاں واقعی، یہ بڑی دلچسپ بات ہے۔ لگتا ہے کہ کوئی مجھ جیسے سیاہ فام لڑکے کا انتظار کر رہا تھا کہ اس کا الزام مجھ پر ڈالا جائے۔“

”تمہیں پھنسیا جا رہا ہے۔“ چارلس نے کہا۔

”یہ پہلا موقع نہیں ہوگا کہ کوئی بے گناہ سیاہ فام کسی دوسرے کے جرم کے بدلے جیل جائے۔“

ٹونی کرسی کھینٹ کر چارلس کی میز کے سامنے بیٹھ گیا اور بولا۔ ”مجھے کچھ کرنا ہوگا ورنہ وہ سارا ملبا مجھ پر ڈال دیں گے۔“ پھر اس نے ایک نظر کمپیوٹر اسکرین پر ڈالی اور بولا۔

”مجھے خوشی ہے کہ تم نے اپنا نام بھی مشتبہ لوگوں کی فہرست میں شامل کر لیا ہے۔ بہتر ہوگا کہ اس میں نیکا کا نام بھی ڈال دو۔ اسی نے ایلس کو رات میں ہونے والی سرگرمیوں کے بارے میں بتایا تھا۔“

”میرا نہیں خیال کہ نیکا کا اس قتل سے کوئی تعلق ہے۔“ چارلس نے کہا۔ ”تم نے دیکھا نہیں کہ لاش ملنے پر اس کا ردعمل کیا تھا۔“

”ایلس کے شوہر کے بارے میں کیا خیال ہے؟“ ٹونی نے پوچھا۔

”مجھے یقین ہے کہ سراغ رساں وینڈراس سے ضرور پوچھ چکے کمرے گا۔“

”ممکن ہے کہ ایلس کا شوہر اس کا سامان لینے آئے۔“

”پولیس نے پہلے ہی اس کی ساری چیزیں اپنی تحویل میں لے لی ہیں۔“ چارلس میز پر انگلیاں بجاتے ہوئے بولا۔ ”البتہ میرا خیال ہے کہ انہوں نے اس کا بیج باکس نہیں دیکھا ہوگا۔“

”پھر تو وہ باکس فریج میں ہوگا، چلو چل کر دیکھتے ہیں۔“

چارلس اور ٹونی بریک روم کی طرف چل دیے۔ وہ جب راہداری میں پہنچے تو وہاں کوئی نہ تھا۔ چارلس نے ٹونی کو وہیں رکنے کا اشارہ کیا اور خود بریک روم میں جھانکنے لگا۔

ٹونی نے ادھر ادھر دیکھا اور سرگوشی کرتے ہوئے بولا۔ ”مسٹر مارشل کے کمرے کا دروازہ آدھا کھلا ہوا ہے، ضرور کوئی گڑبڑ ہے۔“

”میرا مارشل کے کمرے کا دروازہ آدھا کھلا ہوا ہے، ضرور کوئی گڑبڑ ہے۔“

”میرا مارشل کے کمرے کا دروازہ آدھا کھلا ہوا ہے، ضرور کوئی گڑبڑ ہے۔“

”میرا مارشل کے کمرے کا دروازہ آدھا کھلا ہوا ہے، ضرور کوئی گڑبڑ ہے۔“

”ٹوٹی! یہ کیا کر رہے ہو؟ تم باس کے کمرے میں نہیں جاسکتے۔“ چارلس نے کہا۔

لیکن وہ نہیں مانا۔ چارلس بھی اس کے پیچھے چل دیا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ ٹوٹی نے کمرے میں داخل ہو کر ادھر ادھر دیکھا، وہاں کوئی نہیں تھا۔ البتہ کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ ٹوٹی نے جھانک کر دیکھا مارشل اپنی سرخ اسپورٹس کار کے پاس کھڑا ہوا پال سے باتیں کر رہا تھا۔ اس کے کندھے پر گالف بیگ لٹکا ہوا تھا۔

”وہ ایک چیز یہاں بھول گیا ہے۔“ ٹوٹی نے گالف کھیلنے والی چھڑی کی طرف اشارہ کیا جو مارشل کی میز اور دیوار کے درمیان پڑی ہوئی تھی۔

جیسے ہی وہ اسے اٹھانے کے لیے جھکا تو چارلس بولا۔ ”ٹھہرو۔“ پھر اس نے اپنی جیب سے دستا نکل کر ٹوٹی کو دیے اور بولا۔ ”انہیں پکمن لو تا کہ چھڑی پر تمہاری انگلیوں کے نشانات نہ آئیں۔“

ٹوٹی نے ہاتھوں پر دستا نچڑھائے اور اس تنگ جگہ میں سے چھڑی کو نکال لیا۔ چارلس نے دونوں ہاتھ پیچھے باندھ کر چھڑی کا بغور معائنہ کیا اور بولا۔ ”اس پر خون کے دھبے نظر نہیں آ رہے۔ ممکن ہے اس نے انہیں صاف کر دیا ہو۔“

”تم کس بارے میں بات کر رہے ہو؟“ ٹوٹی نے چھڑی میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

”مجھے یقین ہے کہ سراغ رساں وینڈر نے مارشل کو شامل تفتیش نہیں کیا جبکہ میں اسے گزشتہ شب گودام میں عمارت میں داخل ہوتے دیکھ چکا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ اسی نے ایلس کا بیج چرایا ہو۔ وہ جانتا ہے کہ آئی ٹی ڈپارٹمنٹ تمام ملازمین کے آنے اور جانے کا ریکارڈ رکھتا ہے۔ اس طرح مارشل نے وہاں اپنی موجودگی پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہوگی۔“

”اگر تمہاری بات مان لی جائے تب بھی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس نے ایلس کو کیوں قتل کیا؟“

”اس نے مارشل کو فیکٹری میں کام کرنے والی ایک عورت کے ساتھ رنگے ہاتھوں پکڑ لیا تھا۔ سمجھیں یا وہ ہے کہ نیکا نے ایلس سے کہا تھا کہ ساری سرگرمیاں رات کی شفٹ میں ہوتی ہیں۔ ایلس کو نوہ لینے کی عادت تھی اور اس کا خیمہ ازہ اسے بھگتنا پڑ گیا۔ مارشل نے وہ بیج تمہارے تھیلے میں ڈال دیا تا کہ یہ ظاہر ہو کہ یہ قتل تم نے کیا ہے۔ ممکن ہے کہ اس نے ایلس کو مارنے کے لیے یہ چھڑی استعمال نہ کی ہو لیکن شاید

اس نے گالف بیگ میں سے اس لیے نکال دیا ہو کہ اس کی جگہ وہ سلاخ رکھ لے جس سے اس نے ایلس کے سر پر ضرب لگائی تھی۔“

دونوں نے ایک بار پھر کھڑکی سے باہر دیکھا۔ مارشل اپنی کار کی پیچھلی سیٹ پر گالف بیگ رکھ رہا تھا۔ ٹوٹی نے چارلس کو ایک طرف دھکیلا اور کمرے سے باہر جانے لگا۔

”تم کہاں جا رہے ہو؟“ چارلس نے پوچھا۔

”وہ مرد دوثبوت ضائع کرنے جا رہا ہے۔ مجھے اس کا پیچھا کرنا ہو گا ورنہ اس کے جرم کی سزا میں بھگتوں گا۔“

”میں نہیں سمجھتا کہ یہ صحیح طریقہ ہے۔“ چارلس اس کے پیچھے جاتے ہوئے بولا۔ ”ہمیں پولیس کو اطلاع دینی چاہیے۔“

”انہیں آنے میں دیر ہو سکتی ہے، ہمیں اسے روکنا ہوگا۔“

ٹوٹی دوڑتا ہوا ایک کنورٹبل کی طرف بڑھا اور ڈرائیونگ سیٹ والا دروازہ کھول کر اس میں بیٹھ گیا۔ چارلس نے بھی اس کی تقلید کی اور جب وہ برابر والی سیٹ پر بیٹھ گیا تو ٹوٹی نے پوچھا۔ ”تم نے دیکھا، وہ کس طرف گیا ہے؟“

”ہاں، بائیں جانب۔ اس کا رخ لیون پارک کی طرف ہے۔“

”کیا تمہارے پاس سیل فون ہے؟“ ٹوٹی نے پوچھا۔

”ہاں۔“ چارلس نے اپنی جیب سے فون نکالا اور بولا۔ ”تم ٹھیک کہہ رہے ہو، مجھے پولیس کو اطلاع کر دینی چاہیے۔“

”نہیں، میرا مطلب ہے کہ اس میں کیمرہ ہے؟“

”میں اس بارے میں زیادہ نہیں جانتا۔“ پھر وہ ایک نمبر ملاتے ہوئے بولا۔ ”ہیلو، کیا میں سراغ رساں وینڈر سے بات کر سکتا ہوں؟“

”ہمیں تصویروں کی ضرورت ہوگی۔“ ٹوٹی بولا۔

”اگر ہم ویڈیو بناسکیں تو اور بھی اچھا ہے۔ اگر ہم نے اسے آگے قتل پھینکتے ہوئے دیکھ لیا تو اس کی تصویر یا ویڈیو ثبوت کے طور پر پیش کی جاسکتی ہے ورنہ پولیس ایک امیر گوری چیز والے کے مقابلے میں ایک غریب سیاہ فام کی بات کا یقین کیوں کرے گی۔“

”ہم اس کی نگرانی نہیں کر سکتے۔“ چارلس نے

اعتراض کرتے ہوئے کہا۔ ”بہتر ہوگا کہ پولیس کو ہی اس سے نمٹنے دو۔“

ٹونی نے سنی آن سنی کر کے کار کی رفتار بڑھادی۔ تھوڑی دیر بعد اسے مارشل کی کار نظر آگئی لیکن دوسرے ہی لمحے وہ ایک موٹر کاٹے ہوئے نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ پارک کے قریب جا کر سڑک تنگ ہوگئی تھی۔ مارشل نے اپنی کار کچے راستے پر اتار دی اور پہاڑی کی جانب بڑھنے لگا۔ اسی وقت سیل فون پر سراغ رساں وینڈر کی کال آئی۔ ڈاکٹر چارلس ہیریسن نے اسے بتایا کہ وہ اور ٹونی لیون پارک کے قریب مارشل کا تعاقب کر رہے ہیں کیونکہ انہیں شبہ ہے کہ وہ آلہ قتل پھینکنے جا رہا ہے۔

”ڈاکٹر ہیریسن! میں چاہتا ہوں کہ تم دونوں فوراً وہاں سے واپس آ جاؤ۔“

چارلس نے فون اپنے سینے سے لگایا اور بولا۔ ”ٹونی... سراغ رساں وینڈر چاہتا ہے کہ ہم اس کا تعاقب نہ کریں۔“

”کیونکہ اسے مجھ پر شک ہے۔ میں کسی قیمت پر بھی نہیں رک سکتا جب تک آلہ قتل نہ برآمد کر لوں۔“

مارشل کو بیک ویو مر میں ٹونی کی گاڑی نظر آگئی تھی۔ اس نے گردن گھما کر پیچھے دیکھا تو ٹونی بولا۔ ”مسٹر مارشل نے ہمیں دیکھ لیا ہے۔ وہ سمجھ گیا ہوگا کہ ہم اس کا تعاقب کر رہے ہیں۔“

چارلس نے فون پر وینڈر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”مارشل کی گاڑی پارکنگ لاٹ میں داخل ہوگئی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ہم اس کا پیچھا کر رہے ہیں۔“

”تم لوگ اس علاقے سے نکل جاؤ۔“ وینڈر نے کہا۔ ”پولیس وہاں پہنچ رہی ہے۔“

مارشل نے اپنی گاڑی پارکنگ لاٹ کے آخری سرے پر کھڑی کی پھر اس نے گاڑی کو نصف دائرے میں اس طرح گھمایا کہ وہ دوسری کاروں کے پیچھے چھپ جائے۔ ٹونی نے ایک جھٹکے سے اپنی کار روکی اور پارکنگ لاٹ کے خارجی دروازے پر کھڑی کردی۔ اس طرح اس نے مارشل کی گاڑی کے باہر نکلنے کا راستہ مسدود کر دیا اور قاتحانہ انداز میں بولا۔

”وہ جانتا ہے کہ پھنس چکا ہے اس لیے باہر نہیں نکل رہا۔“

لیکن ٹونی کا خیال غلط نکلا۔ چند لمحوں بعد ہی مارشل کی کار کا دروازہ کھلا اور وہ باہر نکل کر چارلس کی طرف بڑھنے

چشم دید

لگا۔ کار کے پاس آ کر اس نے کھلی ہوئی کھڑکی پر ہاتھ رکھا اور چارلس سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ”تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ تمہیں تو پتہ لگوں کے بارے میں رپورٹ تیار کرنا تھی۔“

چارلس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا جواب دے۔ وہ اس امید پر خاموش رہا کہ شاید تھوڑی دیر میں پولیس وہاں آجائے۔ اس کے بجائے ٹونی بولا۔ ”پہلے تم میرے سوال کا جواب دو کہ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“

مارشل اس کی جانب انگلی اٹھاتے ہوئے بولا۔ ”جتنی آسانی سے آئے ہو اتنی آسانی سے جا بھی سکتے ہو۔ میں چاہوں تو نہیں ایک منٹ میں ملازمت سے فارغ کر سکتا ہوں۔“ پھر اس نے چارلس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔ ”تم نے میرا راستہ کیوں روک رکھا ہے؟ اگر تم چاہو تو یہ آسانی کلب کے ممبر بن سکتے ہو مگر اس کے بجائے تم اپنے جونیئر کے ساتھ میرا تعاقب کر رہے ہو۔“

”اگر تمہارا اشارہ رات کی شفٹ میں ہونے والی سرگرمیوں کی طرف ہے تو مجھے معاف ہی رکھو۔“

مارشل کا منہ ایک لمحے کے لیے کھلا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ اسے چارلس کی گودام میں موجودگی کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ غصے سے بولا۔ ”تم وہاں نگرانی کر رہے تھے؟“

”میں بمشکل دیکھ پایا کہ وہاں کیا ہو رہا تھا البتہ میں نے وہاں لگی ہوئی جالی کوزمین پر گرتے ضرور دیکھا اور اگر تم زیادہ احتیاط کرتے تو مجھے تمہارے کرتوتوں کا علم نہ ہوتا۔“

”تم اپنے آپ کو ملازمت سے برطرف سمجھو۔“ مارشل یہ کہہ کر ایڈیوں کے بل گھوما اور اپنی کار کی طرف چل دیا۔ اس نے گاڑی ریورس گیر میں ڈالی اور کئی گز پیچھے چلا گیا پھر اس نے اپنی کار کا رخ ان کی جانب کر لیا۔

”ٹونی... وہ ہماری طرف آرہا ہے۔ ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔“

ٹونی نے انجین اشارت کیا لیکن اتنی دیر میں مارشل کی گاڑی نزدیک آچکی تھی۔ اس نے سائڈ سے ٹونی کی کار کو ٹکرا ماری جو اتنی شدید تھی کہ چارلس اپنی سیٹ پر اچھل پڑا اور اس کا سٹرکار کی چھت سے ٹکرا گیا۔ مارشل کی کار کو بھی نقصان پہنچا۔ اس کی سامنے کی ایک لائٹ ٹوٹ گئی اور بمپر کو بھی نقصان پہنچا۔

مارشل نے گاڑی ریورس کی اور دوبارہ ان کی جانب

بڑھا، ٹوٹی چلایا۔ ”مسٹر ہیرس! کار سے باہر نکلو۔“
چارلس نے اپنی طرف کا دروازہ کھولنے کی کوشش کی
لیکن وہ جام ہو چکا تھا۔ ٹوٹی جلدی سے گاڑی سے اتر اور
دوسری طرف جا کر پنجر سیٹ والا دروازہ باہر سے کھولنے لگا
لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ چارلس کو مارشل کی کار کے انجن کی
آواز بالکل قریب سے آئی محسوس ہوئی۔ اس نے ٹوٹی سے
کہا۔ ”بھاگ جاؤ۔“

”میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔“
”وہ تمہیں کچل دے گا۔“ چارلس نے کہا۔ ”مجھے کچھ
نہیں ہوگا، تم یہاں سے بھاگ جاؤ جلدی۔“
جیسے ہی ٹوٹی وہاں سے ہٹا مارشل کی کار ایک بار پھر
اس کی گاڑی سے ٹکرائی۔ اس بار کنورٹبل کا پچھلا حصہ اوپر
اٹھا اور اسپورٹس کار اس کے نیچے دب گئی۔ چارلس کی
دائیں ٹانگ میں درد کی شدید لہر ابھری اور پھر اسے کچھ
ہوش نہیں رہا۔ چند لمحوں بعد ہی پولیس کار کے سائرن کی
آواز سنائی دی۔ ٹوٹی نے مارشل کی کار کے گرد ایک چکر لگایا
اور بولا۔

”میرا خیال ہے کہ مسٹر مارشل مر چکے ہیں۔“
مارشل گیس کٹ کمپنی کا مالک اسٹیرنگ پر جھکا ہوا
تھا۔ اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ ٹوٹی نے جھانک کر
دیکھا۔ کار کی پچھلی سیٹ پر رکھا ہوا بیگ نکل گیا تھا اور اس
میں ایک بائپ رکھا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اسی لمحے مارشل کراہا اور
اس نے اٹھنے کی کوشش کی۔
تین پولیس والوں نے اس کی تباہ شدہ کار کو گھیرے
میں لے لیا۔ انہیں دیکھ کر چارلس نے اپنا ایک ہاتھ اوپر
اٹھایا جبکہ دوسرا ہاتھ پوری طرح کام نہیں کر رہا تھا۔ اس کی
آنکھوں کے سامنے تارے جھمکانے لگے اور پھر اس کا ذہن
تاریکی میں ڈوب گیا۔

وہ اسپتال کے بستر پر لیٹا اپنے جسم کے مختلف حصوں کو
حرکت دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ ڈاکٹر نے اسے یقین دلایا
تھا کہ اس کے زخم بھرنے میں کچھ وقت لگے گا۔ ٹوٹی اس
سے ملنے آیا تو اس کے ساتھ رشونا بھی وہیل چیئر پر بیٹھی
دکھائی دی۔

ٹوٹی نے شوخ لہجے میں کہا۔ ”تمہیں یقیناً اس کے
آنے کی امید نہیں ہوگی؟“

رشونا نے اپنی کرسی اس کے بستر کے قریب کی۔ اس
کی ٹانگ پر چڑھے ہوئے پلاستر کو دیکھا اور مسکراتے ہوئے
بولی۔ ”مجھے تمہاری بہادری پر فخر ہے۔“

”یہ سب ٹوٹی کا کیا دھرا ہے۔“ چارلس نے کہا۔
”میں تو وینڈر کے کہنے پر عمل کرنے والا تھا۔“
”سارا ملبا مجھ پر مت ڈالو۔“ ٹوٹی بولا۔ ”سراغ
رساں وینڈر نے ہم دونوں پر پولیس کے کام میں مداخلت
کرنے کا الزام عائد کیا ہے۔“

رشونا نے کندھے جھٹکتے ہوئے کہا۔ ”میں نے مارشل
اور اس کی بیوی کو میوزیم میں دیکھا ہے۔ اس کے پاس سب
کچھ تھا پھر اس نے ایس کوئل کیوں کیا؟“
”ہماری مرحومہ ساتھی کو ڈھنڈورا پیٹنے کی عادت
تھی۔“ چارلس نے کہا۔ ”اگر وہ مارشل سے خاموش رہنے کا
وعدہ کر لیتی تب بھی اسے یقین نہ آتا۔ وہ جانتا تھا کہ بالآخر
وہ اس کا بھانڈا پھوڑ دے گی۔“
”اس نے یہ کیسے سوچ لیا کہ وہ اپنے جرم کو چھپا سکے
گا؟“ رشونا نے پوچھا۔

”کیونکہ پولیس دوسرے لوگوں پر شبہ ظاہر کر رہی
تھی۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ مارشل کے پاس اسے قتل
کرنے کی کوئی وجہ ہو سکتی ہے۔“
”لیکن تم یہ بات جانتے تھے۔“ ٹوٹی نے کہا۔

”میرا خیال تھا کہ پولیس بالآخر اس کا سراغ
لگا لے گی۔“

”ناممکن۔“ ٹوٹی نے کہا۔ ”مسٹر مارشل نے ایس کا
بیج میرے تھیلے میں رکھ کر مجھے پھنسانے کی کوشش کی۔ اگر ہم
اس کا تعاقب نہ کرتے تو وہ آلہ قتل کہیں پھینک دیتا۔“
”مجھے مارشل کا پیچھا کرنے پر کوئی پچھتاوا نہیں ہے
البتہ ایک بات کا افسوس ہے۔“ وہ رشونا کی آنکھوں میں
جھانکتے ہوئے بولا۔ ”میں آئندہ مہینے تصویروں کی نمائش
کی افتتاحی تقریب میں نہیں جاسکوں گا۔“

”یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟“ ٹوٹی نے کہا۔ ”کیا تم سمجھتے
ہو کہ میں تمہاری وہیل چیئر گھسیٹ کر نہیں لے جاسکتا؟“

”میں نے تمہاری ڈرائیونگ دیکھی ہے۔“ چارلس
نے ٹوٹی سے کہا لیکن اس کی نظریں بدستور رشونا پر تھیں جو ان
دونوں کی نوک جھونک سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔

”بے فکر رہو، میں احتیاط کروں گا۔“ ٹوٹی نے کہا اور
رشونا کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”میں تمہاری خوشی کی
خاطر سب کچھ کرنے کے لیے تیار ہوں۔“

رشونا اس کا اشارہ سمجھ کر جھینپ گئی اور اس نے اپنے
تاثرات چھپانے کے لیے منہ دوسری جانب موڑ لیا۔

پر جھکا ہوا تھا۔ موسم پریشان کن تھا۔ تاہم روشن دنوں میں
بھی قبرستان کو خوشگوار جگہوں میں شمار نہیں کیا جاسکتا۔
انسانی ذہن جرم کی راہ پر چل پڑے تو نت نئے
منصوبے بناتا ہے۔ ولسن کا انداز بھی انوکھا تھا۔ قبرستان اس
کی شکارگاہ تھے۔

اپنی تریسٹھ سالہ زندگی میں وہ چالیس بیویوں کو
آسودہ خاک کر چکا تھا۔ وہ قبرستان کا کھلاڑی تھا۔ وقت

سیاہ گہرے بادلوں نے آسمان کو ڈھانپ لیا تھا۔ اس
روز طلوع سحر کے وقت بھی بارش ہوئی تھی۔ محسوس ہوتا تھا کہ
بادل زمین سے آن ملیں گے۔ فضا میں حد درجے خشکی تھی۔
مختلف ڈیزائن کے پھولوں کے ہار بیشتر قبروں پر
سے بکھر چکے تھے۔

دسمن کے گہرے رنگ کے ٹاپ کوٹ کے کالر کھڑے تھے۔
سیاہ ہیٹ کا کنارہ سردی کے خلاف مزاحمت کے لیے پیشانی

شکارگاہ

جمال دستی

وہ ایک تجربہ کار شکاری تھا۔۔۔ اس کا ریکارڈ بے داغ تھا۔۔۔ شکار اس کا
شوق نہیں بلکہ حصول زر کا ذریعہ تھا۔۔۔ شکاری مہم نے اسے ایک دل
ریا کا اسیر بنا دیا۔۔۔ اور اس کی رفاقت نے مجبور کر دیا کہ وہ اپنی زندگی کا
ڈھب تبدیل کر دے۔۔۔ مگر اس کے فیصلے سے پہلے قسمت اپنا فیصلہ سننا
چکی تھی۔۔۔

ہم پیشہ۔۔۔ ہم خیال جوڑے کی ہمراہی میں زینہ بزمین عبور کرتے جرم کے مراحل



کے ساتھ اس کی مہارت میں اضافہ ہی ہوا تھا۔

بھیلو سے پرے ماؤنٹ کیلوری، سینٹ لوئیس اوک، گروو، سان ڈیاگو، ال کمپو اور مزید کئی درجن قبرستان اس کے مجرمانہ کھیل کے میدان تھے۔

یہ اس کا کاروبار تھا۔ جس سے اس نے ناقابل یقین حد تک ہمیشہ مثبت نتائج حاصل کیے تھے۔ ولسن قاتل ہونے کے باوجود بے حس نہیں تھا۔ یہ کچھ عجیب اور ناقابل وضاحت سی بات ہے۔

ہاتھوں میں داستانوں کے ساتھ آنہوسی واکنگ اسٹک... اسٹک کا بالائی بیضوی سرا چاندی کا تھا۔ ممکن ہے چاندی نہ ہو محض چاندی جیسا ہو۔ بہر حال یہ چھڑی اس کے وجود کا جزو لاینفک تھا۔ جیسے کوئی تیسرا ہاتھ ہو۔ یہ تیسرا ہاتھ 30 برس سے اس کے وجود کا حصہ تھا۔ اس فقر کی سردالی چھڑی کے بغیر وہ باہر نہیں نکلتا تھا۔ چھڑی اکثر اس کے ہاتھ میں دائرے کی شکل میں گردش کرتی نظر آتی تھی۔ شاید اسے مزہ آتا تھا یا اس کی عادت تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ چھڑی کو بطور سہارا استعمال کرنے کے بجائے کسی زیور کی طرح ساتھ رکھتا ہے۔

☆☆☆

وہ قبرستان کی پختہ روشوں پر پرسکون انداز میں متحرک تھا۔ کبھی کسی قبر کے نزدیک احترام سے کھڑا ہو جاتا لیکن اس کی نگاہ بدستور اس عورت کا جائزہ لے رہی تھی جو ایک تازہ قبر کے پاس موجود تھی۔ اس کی عمر چالیس برس کے لگ بھگ تھی۔ قد پانچ فٹ دو انچ ہوگا اور وزن 130 پونڈ سے زیادہ نہیں تھا۔ اس کے گیسو طویل اور سیاہ رنگ کے تھے۔ کہیں سفید تار سیاہ بادلوں میں بجلی کی طرح چمکتا نظر آ جاتا تھا۔

پچاس گز کے فاصلے سے بھی ولسن بخوبی تمام تر جزئیات کا مشاہدہ کر سکتا تھا۔ اس عمر میں بھی وہ ایک تیز نگاہ شخص تھا۔ آنہوسی چھڑی غیر اضطراری طور پر اس وقت بھی اس کے پہلو کے خلا میں عمودی دائرے بنا رہی تھی۔

وہ عورت اس ہفتے چوتھی بار وہاں نظر آئی تھی۔ وہ ہمیشہ اکیلی آتی تھی۔ اس کے وہاں آنے کا مقصد ابھی تک غیر واضح تھا۔ کبھی وہ کسی قبر کے قریب ایستادہ ہو جاتی اور جسم کا وزن ایک ٹانگ سے دوسری ٹانگ پر منتقل کرتی رہتی۔ کبھی گھٹنوں کے بل بیٹھ کر مردہ گھاس پھوس کو جڑ سے اکھاڑنے لگتی۔

ولسن نے جب اسے دوسری بار وہاں دیکھا۔ تو وہ

اس وقت تک انتظار کرتا رہا جب تک وہ رخصت نہ ہو گئی۔ بعد ازاں وہ اس قبر تک گیا جہاں وہ کھڑی رہی تھی۔ وہ قبر ابھی تک بے نام و نشان تھی۔ ولسن کو یقین تھا کہ عورت کا شوہر وہیں مدفون ہے۔ ولسن نے عورت کی کئی حرکتیں نوٹ کیں جو اس کے سوگوار پن کے ساتھ اس کی پریشانی کو بھی ظاہر کرتی تھیں۔

شوہر کے انتقال نے یقیناً اس کی زندگی میں خلا پیدا کر دیا تھا۔ ورنہ اس نے ایسی بیوہ خواتین بھی دیکھی تھیں جو ایک آدھ بار سے زیادہ قبر پر نہیں آتی تھیں۔ عموماً ایسی عورتیں بے اولاد ہوتی تھیں اور شوہر سے جان چھوٹنے پر مطمئن نظر آتی تھیں۔ وجہ کچھ بھی رہی ہو ولسن کو ایسی خواتین سے کوئی دلچسپی نہیں تھی نہ ہی وہ قبرستان آنے والی کم عمر عورتوں کو دیکھتا تھا۔

ولسن برسوں سے جس منصوبے پر عمل پیرا تھا اس کے لیے یہ چالیس سالہ خاتون بالکل فٹ نظر آرہی تھی۔ جو سات دنوں میں چوتھی بار وہاں آئی تھی۔

ولسن بھی اپنی تھیوری کی صحت پر سو فیصد پر یقین نہیں رہا تھا لیکن اتنا ضرور جانتا تھا کہ ایسی تھیوری نے نہ صرف اسے دولت مند بنادیا تھا بلکہ وہ کبھی فیل بھی نہیں ہوا تھا۔ یہی بات اسے مطمئن کرنے کے لیے کافی تھی۔ اتنے عرصے میں وہ بہت زیادہ رواں ہو گیا تھا۔ اس کے اندازے ننانوے فیصد ٹھیک نکلتے تھے۔

وہ پُر اعتماد تھا اور اپنا کام صبر و سکون سے کرتا تھا۔ عجلت پسندی اور جلد بازی سے جیسے الفاظ اس کی لغت میں نہیں تھے۔

چالیس سال پہلے اس نے جب پہلا قتل کیا تھا تو اخبارات کے اشتہارات سے استفادہ کیا تھا۔ جلد ہی اس نے یہ طریقہ کار ترک کر دیا۔ اس میں خطرہ بھی تھا اور دیگر جرائم پیشہ افراد سے مقابلہ بھی درپیش تھا جو رسالوں اور اخبارات کے ذریعے اپنا شکار ڈھونڈتے تھے۔

چنانچہ ولسن نے کوئی دوسرا راستہ نکالنے کے لیے سوچ بچار شروع کر دی۔ اس کا دوسرا طریقہ کار اتفاقاً قاتلی اسے مل گیا جب وہ ایک تربیتی اجتماع میں شریک تھا۔ وہ جس گھر میں کرائے پر مقیم تھا وہاں سے چرچ بھی نزدیک تھا۔ ایک ماہ کی مدت میں اس کا تعارف نصف درجن کے قریب بیوہ عورتوں سے ہوا اور اس سے دگنی تعداد ایسی عمر رسیدہ عورتوں کی تھی جو اب تک غیر شادی شدہ تھیں۔ وہ خود غیر شدہ مرد کی حیثیت سے سامنے آیا تھا۔ اسے محض اتنا کرنا تھا کہ ان

عورتوں میں سے کس کا انتخاب کیا جائے۔

ولسن کو دولت مند عورت منتخب کرنی تھی یا ایسی بیوہ عورت جس نے شوہر کا انشورنس وصول کر لیا ہو اور انشورنس کی رقم خرچ نہ کی ہو۔ ولسن اپنی منتخب کردہ عورت سے بڑی ہوشیاری سے شادی کرتا اور اس کی بھی انشورنس کروا دیتا۔ اسے ہر دفعہ نیا نام استعمال کرنا پڑتا تھا کلیم وصول کرنے کے لیے۔ تاہم جیسے جیسے الیکٹرونکس اور کمپیوٹرز کا عمل دخل بڑھ رہا تھا ویسے ویسے بار بار کام اور علاقہ تبدیل کرنا خطرناک ہوتا جا رہا تھا۔

اس نے چرچ پر انحصار کرنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ اس کا میدان عمل یا شکار گاہ قبرستان تک محدود تھے۔

اس کے ذہن نے ایک نئی اختراع تلاش کی جس کی بنیاد لالچ یا شارٹ کٹ سے احتراز تھا۔ عموماً وہ جن عورتوں کو رجحان کر شادی کرتا تھا، ان میں سے بیشتر کی اپنی انشورنس ہوتی تھی۔ ولسن اپنی دیانت داری، الفت اور خود انحصاری کا یقین دلانے کے لیے پہلا کام یہ کرتا کہ نئی بیوی کو قائل کر لیتا کہ وہ اپنی انشورنس کسی خیراتی ادارے کے نام کر دے یا پھر کسی قریبی ضرورت مند رشتے دار کے نام۔ اس طرح وہ نہایت آسانی سے قتل کے بعد شکوک و شبہات سے صاف بیچ لگتا۔ باقی کی تمام جائداد، اسٹاکس یا کیش وہ سب اس کی جیب میں جاتا۔ وہ اپنی اس پالیسی سے خوش تھا۔

☆☆☆

وہ عورت قبر کے نزدیک موجود تھی۔ اس کے شانے سیدھے تھے۔ ونڈ بیگ پر گرفت مضبوط تھی۔ ولسن متحیر تھا کہ وہ آخر کتنی دیر وہاں کھڑی رہے گی جبکہ ٹھنڈ ولسن کی ہڈیوں میں اتر چکی۔ آسودگی اور محتاط لائف اسٹاکل کے باعث اس کی صحت اچھی تھی۔ اسے دیکھ کر لگتا نہیں تھا کہ وہ تریسٹھ سال کا ہوگا۔

آج اس نے پہلا قدم اٹھانے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ جیسے ہی رخ بدل کر اجنبی عورت کی جانب چلا عین اسی وقت اس نے بھی رخ بدلا۔ ولسن نے اندازہ لگایا کہ باہر جانے کے لیے ان دونوں کو جس کراستگ سے گزرتا ہے... دونوں قریب قریب ایک ساتھ ہی وہاں پہنچیں گے یعنی مڈ بھیڑ کا وقت آن پہنچا تھا۔

عورت، ولسن کو قریب دیکھ کر حیرت زدہ دکھائی دی۔ اس نے ایک اچھٹی سی نظر ولسن پر ڈالی اور بہ عجلت اس سے دور ہونے کی کوشش کی۔

”محترمہ! آپ کو خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں

ہے۔“ اس کی آواز میں مخصوص مٹھاس اور نرمی تھی۔ جس میں شائستگی کا عنصر گہرا تھا۔ اس کی آواز عورتوں کو پرسکون کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتی تھی۔

”میں اپنی مرحومہ بیوی کی وجہ سے یہاں آیا تھا۔“ عورت نے کچھ کہے بغیر سر ہلایا تاہم اس نے اپنی رفتار بڑھانے کی کوشش ترک کر دی تھی۔ وہ بیرونی گیٹ تک پہنچے تو اس نے دھیسے لہجے میں کہا۔ ”میرا خاوند یہاں مدفون ہے۔“ یہ کہہ کر وہ باہر نکلتی چلی گئی۔

ولسن اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ وہ مطمئن تھا کہ پہلی مڈ بھیڑ اس کے حساب سے ٹھیک رہی تھی۔ صرف ایک چیز غیر معمولی تھی وہ عورت ولسن کی توقع سے کہیں زیادہ پرکشش تھی۔ طویل عرصے بعد کسی عورت نے اسے اپنی کشش اور دلکش نقوش سے متاثر کیا تھا۔ دوسری اہم چیز عورت کا لباس، کوٹ، جوتے اور ونڈ بیگ تھا۔ یہ اشیائیں قیمت برائڈ سے تعلق رکھتی تھیں۔

اگرچہ ولسن نے اس کے ملبوسات کی نفاست اور قیمت کو دوسرے دن ہی دور سے محسوس کر لیا تھا تاہم قریب سے اس نے زیادہ بہتر تخمینہ لگایا۔ ولسن کے تجربہ کار خیالات بتا رہے تھے کہ عورت بیوگی سے بیشتر پُر آسائش زندگی کی عادی تھی اور یہ معیار بیوگی کے تجربے سے گزرنے کے بعد بھی برقرار تھا۔

یعنی دو ہی باتیں ممکن تھیں کہ وہ کسی اچھی ملازمت سے وابستہ تھی یا پھر مرحوم خاوند کی انشورنس سے معیار زندگی کو برقرار رکھا ہوا تھا۔

اگلے روز ولسن نے چند اور الفاظ کا تبادلہ کیا جس میں دونوں کے نام بھی شامل تھے۔ وہ مسز الزبتھ آئر تھی اور اس کے شوہر کا انتقال ایک ماہ قبل ہوا تھا۔ ولسن کا حساب کتاب ٹھیک جا رہا تھا۔

ایک ہفتے کے اندر ہمیشہ کی طرح وہ الزبتھ سے راہ و رسم بڑھانے میں کامیاب ہو گیا۔ علاوہ ازیں اس نے بس اور ٹیکسی کو ترک کر کے اپنی ذاتی خوب صورت سیدان پر سفر شروع کر دیا۔ عام طور پر وہ اپنی کار سامنے نہیں لاتا تھا۔

آخر ایک روز اس نے الزبتھ کو لالچ پر مدعو کر ڈالا۔ حسب توقع الزبتھ نے اس کی پیشکش قبول کر لی۔ بعد ازاں ولسن کی کار کردگی میں تیزی آتی چلی گئی۔ وہ بہت پُر اعتماد تھا۔

دونوں اب مسٹر ولسن تھے نہ مسز آئر بلکہ ان کی شناخت دل اور لارا تھی۔ اس سے پہلے ولسن کا واسطہ ایسی

سحر انگیز عورت سے نہیں پڑا تھا۔ اس کی گفتگو، چال ڈھال اور ناز و انداز سب کچھ ولسن کو زیادہ سے زیادہ متاثر کرنے کے لیے تھے۔

جس دن ولسن نے اس کا نرم ہاتھ پکڑ کر کہا۔ ”لارا، میں تم سے شدید پیار کرتا ہوں اور خود کو یہ کہنے سے روک نہیں سکتا کہ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“ اس کے کہے گئے ہر لفظ سے چاہت اور سچائی کا بھرپور اظہار ہو رہا تھا۔ ماضی میں ہمیشہ ہی ایسا ہوتا آیا تھا اس معاملے میں وہ چوٹی کا ادا کار تھا۔

دونوں ہی اکیلے تھے۔ نہ دوست، نہ کوئی رشتے دار محض چند شناسا تھے۔ برسوں سے کھیلے جانے والا محبت بھرا خونی ڈراما ایک بار پھر تیاری کے مراحل میں داخل ہو چکا تھا۔

ولسن کی تکنیک اپنی جگہ لیکن بہر حال وہ قسمت کا بھی دشمن تھا۔ دونوں باتوں نے مل کر اسے ایک ماہر شکاری کے روپ میں ڈھال دیا تھا۔

شادی میں تاخیر کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ نہ لارا نے ایسی کوئی تجویز دی البتہ ولسن نے علاقے کی تبدیلی کی خواہش ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ اس طرح وہ اپنے ماضی کو پیچھے چھوڑ کر ایک نئی زندگی کا آغاز کریں گے اور ہنی مون بھی نئے گھر میں بنائیں گے۔

”بیوی کی جگہ وہ ہے جہاں اس کا شوہر چاہتا ہے۔“ لارا نے جواب کے ساتھ چاہت سے ولسن کو چوما۔

☆☆☆

ولسن کے لیے ہنی مون کی گھڑیاں نشاط انگیز ثابت ہوئیں۔ اس نے قیام کے لیے ایک نواحی علاقہ چنا تھا۔ وہ کسی تربیت یافتہ میڈیکل ایگزامنز کا محمل نہیں ہو سکتا تھا۔ ایسا کوئی بھی میڈیکل ایگزامنز مخصوص زہر خورانی سے ہونے والے مہلک حملہ قلب کی وجہ سے دریافت کر سکتا تھا۔

اگرچہ بعض اوقات اسے ماہر میڈیکل ایگزامنز کا سامنا کرنا پڑ جاتا تھا۔ تاہم ایسے علاقوں میں وہ طریقہ واردات بدل دیتا تھا اور نہایت احتیاط سے قتل کو حادثے کا روپ دینے کے لیے اسے خاصی محنت درکار ہوتی تھی۔

اس مرتبہ اپنے شکار کے ساتھ جو جسمانی اور ذہنی وقت گزر رہا تھا وہ آئیڈیل تھا۔ پہلی بار اسے تدفین کے بجائے بیوی کا خیال آیا۔ لارا میں ہر وہ خوبی تھی جس کی آرزو کوئی مرد کر سکتا تھا۔ کھانا تیار کرنے میں وہ کسی شیف کی طرح تھی۔ قیام گاہ کو وہ جتنا صاف ستھرا رکھتی اتنا ہی خیال وہ

ولسن اور اپنا رکھتی تھی۔ شب ب سری میں اس کی خود سپردگی ولسن پر جادو کی طرح اثر انداز ہوتی۔ وہ کسی بات پر ولسن سے اختلاف نہیں کرتی تھی۔

ولسن کو خیال آتا کہ وہ تریسٹھ سال سے تجاوز کر چکا ہے۔ اس کے پاس خوشگوار زندگی گزارنے کے تمام لوازمات موجود ہیں۔ سوائے ایک آئیڈیل ہم سفر کے۔ وہ لارا کی ہمراہی میں جو مسرت محسوس کرتا، اس سے آدھی خوشی بھی اسے اگر اپنی پہلی بیوی سے ملی ہوتی تو آج وہ ایک نارمل آدمی کی طرح گھریلو زندگی بسر کر رہا ہوتا۔

دو ماہ گزر گئے تھے اور ولسن کے خیالات میں تبدیلی جڑ پکڑ رہی تھی۔ تیسرا مہینہ بھی گزر گیا۔ وہ ایک نئے فیصلے کے قریب پہنچتا جا رہا تھا۔

لارا نے اس کی زندگی میں ایک انقلابی تبدیلی پیدا کر دی تھی۔ ایسی باوقار شوہر پرست بیوی کسی بھی صورت میں قبرستان پہنچائے جانے کی سزاوار نہیں تھی۔ وہ دل میں بسائے جانے کے قابل تھی۔ اس کے شب و روز کا ہر لمحہ ولسن کے آرام اور دل جوئی کا خیال رکھنے میں صرف ہو رہا تھا۔ ولسن سوچ رہا تھا کہ لارا کے ساتھ وہ اپنی بقیہ زندگی بہت آرام و سکون سے گزار سکے گا۔ کسی نئی تدفین کا بندوبست کیے بغیر۔

حسب معمول ایک رات گارجن گھر سے باہر رکھنے کے لیے وہ احتیاط سے عقبی سیڑھیاں اتر رہا تھا۔ نیم اندھیرا تھا۔ اس کا دھیان اپنی خوابیدہ چاہت کی طرف تھا کہ کہیں وہ بیدار نہ ہو جائے۔ اس نے آخری سیڑھی طے کی تو اس کا قدم وہاں رکھے بچوں کے رولر اسکیٹ پر پڑا۔ رولر اسکیٹ کس نے رکھا، کہاں سے آیا؟ بہر حال وہ بری طرح پھسلا۔ قدموں کا رشتہ زمین سے منقطع ہو گیا۔ کچرے کا ڈبا ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ بازو اطراف میں پھیل گئے وہ پیچھے کی جانب دھڑام سے گرا سر کنکریٹ کے پختہ قدمچے سے ٹکرایا اور اس کی درد میں ڈوبی ہوئی چیخ بلند ہونے سے پہلے ہی حلق میں دم توڑ گئی۔ سوچنے سمجھنے کا ایک لمحہ بھی اس کے ہاتھ نہ آیا۔

☆☆☆

لارا، ولسن کی قبر پر اُداس کھڑی تھی۔ اسے قبرستانوں سے نفرت تھی پھر بھی اسے وہاں آنا پڑتا تھا کیونکہ اٹھارہ سال سے قبرستان اس کے لیے شکار گاہ کا کام دے رہے تھے۔ اس دوران میں وہ پندرہ شوہروں کو زیر خاک پہنچا چکی تھی۔ قبرستانوں سے نفرت کے باوجود اسے وہاں آنا پڑتا تھا۔





بد معاملہ

بشری امجد

معمول سے ہٹ کے کام کی انجام دہی کے لیے غیر معمولی دلیری کی ضرورت ہوتی ہے... اس نے بھی ٹھان لیا تھا کہ ہر صورت اسے اختتام تک پہنچانا ہے... تو انائی... ہمت اور ارادے کو ناقابل تسخیر سمجھنے والے شخص کا المیہ... ایک ہی ضرب نے اس کے تمام اقدامات کو مسمار کر دیا...

مخلص دوستوں کی سگت... جو نسیاتی گروہوں کو سلجھانے کا ہنر رکھتے تھے...

پرنندوں کی طرح ٹکڑیوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ان کی آنکھیں روشن اور چمکیلی تھیں۔ جن میں سوال اور تجسس تھا۔ مجھے لگا کہ اکثریت نے گوری یا کی موت کو ذہنی طور پر قبول نہیں کیا۔ ان کی نہ ختم ہونے والی گفتگو اور سرگوشیاں، ناقابل فہم پرنندوں کی آوازوں کی طرح بھنسنار ہی تھیں۔ وہ نہ صرف تجسس تھے بلکہ ان کا انداز تنقیدی تھا۔ اس انداز نے انڈسٹری کے بعض آفیشلوں کو متعجب بھی کیا۔

☆☆☆

تدفین کے بعد میں نے ضروری معاملات نمٹائے۔ وکیل کے دیے ہوئے کچھ کاغذات پر دستخط کرنے کے بعد روانہ ہو گیا۔ گوری یا کے معاملات اور تعلقات میری توقع سے بڑھ کر ٹکے تھے۔ اس نے انڈسٹری میں وسیع پیمانے پر ماہرانہ انداز میں سرمایہ کاری کی ہوئی تھی۔ جبکہ میرے اپنے

موت بھی رنگ بدل بدل کر آتی ہے۔ کب، کہاں اور کیسے... کچھ پتا نہیں۔ تاہم کسی نہ کسی بہانے ساتھ لے لی جاتی ہے... یہ ایک اٹل حقیقت ہے جس سے کسی ذی روح کو مفر نہیں۔ نہ عمر کی کوئی قید ہے۔ تدفین کا عمل ایک ناخوشگوار مرحلہ ہے... تاہم یہ مرحلہ بھی بڑے میکانگی اور پُر جوش انداز میں مکمل ہو جاتا ہے... چہرے سوگوار دکھائی دیتے ہیں لیکن حقیقی غم بہت کم چہروں پر ہوتا ہے۔ گوری یا کی موت بھی عجیب اور اچانک تھی۔

میرے چہرے پر بھی رنج کی گہری لکیریں تھیں۔ کیونکہ میں گوری یا کا شوہر جو ٹھہرا۔ قبرستان میں، نیلی ویرن انڈسٹری کے افراد میری توقعات سے بڑھ کر شریک ہوئے تھے۔ اچھا خاصا ہجوم جو لاس اینجلس کے علاقے سے وارد ہوا تھا۔ ان کا لباس موقع کی مناسبت سے تھا۔ تاہم وہ

مالی معاملات واجبی حالت میں تھے۔ برنارڈ نے کوئی دسویں مرتبہ مجھ سے اظہار تعزیت کیا۔ میں نے بے ہاؤس بند کیا اور جزائر کی جانب پرواز کر گیا۔

ہیلن نے پرتیاک انداز میں محبت سے میرا استقبال کیا۔ وہ ایک اوسط قد کی سادہ سی عورت تھی، مجھ سے عمر میں دو سال بڑی تھی۔ تاہم خاصی دولت مند تھی۔

گلوریا کی ناگہانی موت اور تدفین کے ہنگامے کے دوران میں وہ آرام کرتی رہی تھی۔ سادہ اور بڑی ہونے کے باوجود اس کا جسم متناسب تھا۔ ہماری ملاقاتیں کئی ہفتے سے جاری تھیں۔ اسی دوران میں اس نے کئی بار ہچکچاتے ہوئے مجھے شادی کے اشارے دیے تھے۔ لیکن گلوریا کی وسیع جائیداد کی وجہ سے میں ہیلن کے معاملے میں شادی کا فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔

☆☆☆

ہم دونوں کی لاس اینجلس واپسی ایک دوسرے کی ہمراہی میں ہوئی۔ وہاں ہوٹل میں متصل کمروں میں مقیم ہوئے اور چند روز بعد گرم جوشی کے ساتھ ایک دوسرے سے رخصت ہو گئے۔ وہ نیویارک چلی گئی جہاں اسے اپنی جائیداد کے معاملات دیکھنے تھے اور بچوں سے ملنا تھا پھر اسے سان فرانسسکو واپس آنا تھا تا کہ مجھ سے زیادہ فاصلے پر نہ رہے۔ میں واپس بے ہاؤس چلا آیا اور ایک اچھے بروکر سے رابطہ کیا۔ یہ ایک قیمتی اور شاندار مکان تھا جو چٹانوں کی بلندی پر تعمیر تھا۔

مکان میں مکمل سناٹا تھا۔ تنہائی کے باعث میں یہاں تا معلوم سی بے کلی محسوس کر رہا تھا۔ میں کشادہ اسٹوڈیو میں آ گیا جو بھی گلوریا اور میں نے مل کر ڈیزائن کیا تھا۔

میں نے پانچ دن وہاں تنہائی میں گزارے... گلوریا کی یاد نے مجھے پرسکون نیند سے یکسر محروم کر دیا تھا۔ پانچ دن بعد ایک پستہ قد، گنداسا اجنبی، دوپہر کے وقت وہاں پہنچا۔ وہ جس گاڑی میں آیا تھا وہ بھی اسی کی طرح مجھول سی تھی۔

”مسٹر فلچر؟“ اس نے استنبہامی نظر سے مجھے دیکھا۔ ”جی فرمائیے۔“ میں نے جواب دیا اور اسے پہچاننے کی ناکام کوشش کی۔

”مسٹر فلچر! مجھے ایک چھوٹا سا کام کرنا ہے۔“ وہ بولا۔ میں نے دیکھا کہ اس کے ایک ہاتھ میں فیلا اینوکپ ہے۔ اس کے پاس سے پسینے کی بو بھی آرہی تھی۔ اس کی حرکات و سکنات سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ مجھے کچھ دکھانا چاہتا ہے۔ اس کا رویہ معقول تھا، تاہم وہ کچھ نروس لگ رہا تھا۔ اچانک اس

نے چہرے پر مسکراہٹ سجائی لیکن یہ کوئی معمول کی خوشگوار مسکراہٹ نہیں تھی۔ مجھے یہ مسکراہٹ کافی بد نما لگی۔

معا مجھے خطرے کا نامعلوم احساس ہوا اور ذہن میں گھٹی بجنے لگی۔ میں ہچکچاہٹ کے عالم میں اسے اسٹوڈیو میں لے آیا۔ میں خاموش تھا۔

وہ دوبارہ گویا ہوا۔ ”ہم دونوں مل کر یہ آسانی یہ کام کر سکتے ہیں۔ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ امید ہے آپ میرے بارے میں منفی اندازے نہیں لگائیں گے۔ ہم دونوں اس مسئلے کو ہمیشہ کے لیے ختم کر سکتے ہیں۔“

اس قسم اور اس سے ملتی جلتی صورت حال سے متعلق اپنے حصے کے ڈراؤنے خواب میں پہلے ہی کافی دیکھ چکا تھا۔ میں نے جب زبان کھولی تو مجھے اپنی ہی آواز اجنبی لگی۔ ”میں بالکل نہیں جانتا کہ تم کیا کہنا چاہ رہے ہو... اور کیا بات کر رہے ہو؟“

اس نے ہاتھ میں موجود لفافہ میز پر رکھ دیا۔ یہ لفافہ عام لفافوں کی نسبت بڑے سائز کا تھا اور شروع سے میری آنکھ میں کانٹے کی طرح کھٹک رہا تھا۔

”میں اسسٹنٹ منیجر ہوں، تھرفٹی کوئیک۔“ اس نے کھٹنا شروع کیا۔ میرا بہنوئی ڈاکٹر ہے۔ اس کا گھر زیادہ دور نہیں ہے۔ وہ ادھر سامنے کی جانب۔“ اس نے انگلی سے اشارہ کیا۔ میری دھڑکنوں کی رفتار اعتدال سے بڑھنے لگی۔ میں میز پر پڑے لفافے سے نگاہیں جڑا رہا تھا۔

”کہر کی وجہ سے آج وہ گھر تمہیں نظر نہیں آئے گا۔ میں اپریل میں یہاں آیا تھا اور اپنی بہن کے گھر ٹھہر گیا۔ وہ مجھے خطی کہتے ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ مجھے نوٹوگرانی کا جنون ہے... اس لت نے مجھے مالی بد حالی میں مبتلا کر دیا ہے۔ یہ ایک مہنگا شوق ہے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہونا؟“ تھرفٹی کوئیک نے سوال کیا۔

میں اضطرابی کیفیت سے دو چار تھا اور سمجھ رہا تھا کہ آگے وہ کیا بات کرنے والا ہے لیکن میں نے بددلی سے نفی میں سر ہلایا۔ اس نے اپنی بات جاری رکھی۔

”مسٹر فلچر اس وقت میں نیکون (NIKON) سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ میرے پاس ٹرائی پوڈ اور مختلف اڈاپٹرز... نیز 35 ملی میٹر کے دور مار عدسوں کے لوازمات بھی ہیں۔ مجھے اس وقت F22 اور 1600 ملی میٹر کی ضرورت تھی اور میں ٹرائی ایکس (TRI-X) استعمال کر رہا تھا۔ یقیناً آپ کے لیے یہ ٹیکنیکل امور بے معنی ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”وہ دس اپریل کی ایک خوشگوار اور شفاف سحر تھی۔“

بڑھاؤں گا۔ مرحومہ... نن... نہیں، میرا مطلب ہے کہ "مقتولہ" ریکارڈ پر یہاں اکیلی تھی..."

"کیا بکواس کر رہے ہو؟" میری آواز بلند تھی لیکن اپنی آواز کا کھوکھلا پن میں نے بھی محسوس کیا اور ایک اچنتی نظر میز پر پڑے لفافے پر ڈالی۔

"پلیز مسٹر فلچر!" اس نے ہاتھ اٹھایا۔ "سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ مجھے بات مکمل کرنے دیں۔"

میں خاموش رہا۔ وہ پھر گویا ہوا۔ "ہم ایک دوسرے کو سمجھ لیں گے تو ہم دونوں کی مشکل آسان ہو جائے گی۔"

اس نے دوبارہ بولنا شروع کیا۔ "میں کہہ رہا تھا کہ آپ کی بیگم یہاں اکیلی تھیں اور آپ نے اپنی حاضری کہیں اور ثابت کی تھی جبکہ ایسا نہیں تھا اور آپ بھی یہیں تھے۔" اس نے توقف کیا۔ میں نے اشتعال محسوس کیا لیکن ضبط کر گیا۔

"پھر مجھے اچانک خیال آیا کہ کسی متحرک چیز کو دور سے فوکس کرنے کا تجربہ کروں۔" اس نے اطمینان سے کہا۔

میں نے دل ہی دل میں ایک وزنی گالی اس کی نذر کی...

"پھر میری متلاشی نظروں نے ایک عجیب منظر ڈھونڈ نکالا..." میں دنگ رہ گیا بلکہ خوف زدہ ہو گیا۔ "وہ کہہ رہا تھا۔"

میں نے جبرے بچھنچ کر ایک اور گالی اس کی شان میں تخلیق کی۔ ساتھ ہی اپنی قسمت کو بھی کوسا۔

"یہ دیکھیں، میں آپ کو کچھ دکھانا چاہتا ہوں۔" اس نے لفافے میں سے ایک تصویر منتخب کی۔ "کتنا صاف پرنٹ ہے لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ کم از کم اس تصویر کے لیے مجھے آپ سے معذرت کرنی چاہیے۔ یہ 16 بائی 20 (16x20) ہے اور 35 ملی میٹر کے حساب سے، غیر موزوں سائز ہے..." جبکہ فضا میں ہلکی دھند بھی موجود ہے... پھر بھی اس کی کوالٹی ملاحظہ کیجیے۔"

میں تصویر کے بجائے براہ راست اسے گھور رہا تھا۔ میرا احساس جرم مجھے تصویر دیکھنے سے روک رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ تصویر میں کیا ہوگا۔ ملی تھیلے سے باہر آگئی تھی۔ بس دم باقی تھی۔

دھند میری آنکھوں میں اترنے لگی۔

"پلیز، مسٹر فلچر! دیکھیں میں پہلے ہی معذرت کر چکا ہوں، یہ محض ایک اتفاق تھا۔ آپ تصویر کا معیار تو دیکھیں۔"

میں نے دھندلی نظر بلیک اینڈ وائٹ پرنٹ پر ڈالی۔ جہاں میں رینگ سے نیچے گھور یا کو گہرائی میں چٹانوں کی جانب گرتے دیکھ رہا تھا... اس خبیث نے وہ نازک اور مختصر لمحہ کامیابی سے بچ کر لیا تھا۔ گھور یا سر کے بل

ہوا بھی خاصی دھیمی تھی۔ تیز ہوا عددوں کے لیے ٹھیک نہیں ہوتی۔ ایسی صورت میں تصویر دھندلا جاتی ہے۔ میرے اندر کا فوٹو گرافر چل رہا تھا۔ میں کیمرے اور عددوں کی مدد سے نئے تجربات کرنا چاہتا تھا۔ "وہ بولتا رہا۔ میں نے پسینے کی نمی گردن پر محسوس کی۔"

میں بیٹھ گیا۔ مجھے لگا کہ میں کسی فلم کا اسکرپٹ سن رہا ہوں۔ میں سمجھ گیا کہ یہ چوہا، حادثاتی طور پر واردات میں "شاہد" کی حیثیت سے لوٹ ہو چکا ہے اور بہت جلد رقم کا مطالبہ کرنے والا ہے۔ میں جان گیا تھا کہ میز پر پڑے لفافے میں کیا ہو سکتا ہے۔ میرے لیے مثبت پہلو یہی تھا کہ وہ ابھی پولیس تک نہیں پہنچا تھا۔ اس کے انداز گفتگو سے یہی ظاہر ہوتا تھا۔ اس نے اپنی معاشی بد حالی کا ذمہ معنی اشارہ بھی قصداً دیا ہوگا۔ میں نے قطعیت کے ساتھ سوچا۔ ظاہر ہے ایسے لوگ پولیس کے بجائے اپنے شکار کی طرف جاتے ہیں۔

اب میں اس کی بات سننے سے زیادہ اپنے امکانات کا جائزہ لے رہا تھا۔ میرے پاس دو ہی امکان تھے۔ پہلا، رقم سے اس کا منہ بند کر دوں۔ دوسرا، گلا دبا کر اس کی آنکھ بند کر دوں۔ دوسرا آپشن تو میں نے فوراً ہی مسترد کر دیا۔ ایسا سوچنا اپنے پاؤں پر کلہاڑی چلانے والی بات تھی۔ اس کا اطمینان بتا رہا تھا کہ وہ تصویر کشی کا کوئی جنونی نہیں بلکہ پیشہ ور بلیک میلر تھا جو یقیناً پوری منصوبہ بندی سے آیا تھا۔ اس کو ختم کرنے کا مطلب، میری کہانی بھی فی الفور ختم ہو جاتی۔

میں یہ بھی سمجھتا تھا کہ پہلا آپشن استعمال کرنے کی صورت میں بھی مجھے صرف عارضی مہلت ملے گی۔ اس کا آنا جانا لگا رہے گا۔ تاہم عارضی مہلت بھی غنیمت تھی اور اسی مہلت کے دوران میں مجھے مستقل حل تلاش کرنا تھا۔

"مسٹر فلچر! آپ سن رہے ہیں؟" کوئیک نے سوال کیا۔

"ہاں، میں سن رہا ہوں۔" میں نے خیالات کے گرداب سے نکل کر دل ہی دل میں اس پر لعنت بھیجی۔

"ہاں... تو میں کافی فاصلے پر اپنے مطلوبہ منظر کو تلاش کر کے فوکس کر رہا تھا۔ اس دوران میں نے کئی شاٹ بھی لیے۔ میں ایکسپوژر ٹائم ساتھ ہی نوٹ کرتا جا رہا تھا۔ شاید آپ جانتے ہوں کہ یہ کتنا ضروری ہے۔"

"ہاں نہیں۔" میں نے بیزاری ظاہر کی۔

"خیر، کوئی بات نہیں۔" کوئیک نے کہا۔ اگرچہ وہ شاٹنگل کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ تاہم حرص کی چمک اس کی آنکھوں میں واضح تھی۔

"مسٹر فلچر! میں معذرت کے ساتھ بات آگے

جاسوسی ڈائجسٹ 93 جنوری 2014ء

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

نیچے جارہی تھی... اس کا لباس اور زلفیں بکھری ہوئی تھیں۔ تصویر میری دھندلی نگاہ کے سامنے جھللا رہی تھی۔ ایسی صورت میں، میں خود کو یا گلوریا کو نہیں پہچان سکتا تھا۔ نہ پہچاننے کی ضرورت تھی کیونکہ اس حالت میں بھی ”بے ہاؤس“ کی عقی سنگی دیوار کا انوکھا ڈیزائن قطعی واضح دکھائی دے رہا تھا۔ ویسے بھی میں تصویر سے زیادہ اس لمحے کی یادوں میں کھویا ہوا تھا... مگر جب گرتی ہوئی گلوریا کی آنکھوں میں حیرت کے ساتھ ان گنت سوال تاج رہے تھے، وہی سوالات مجسم ہو کر عجیب عجیب شکلوں کی صورت میں دوبارہ نمودار ہو گئے۔ وہ تصویر اور میری دھندلی نظروں کے مابین حائل تھے۔

تصویر یہ بات ثابت کرنے کے لیے کافی تھی کہ گلوریا کے ساتھ کوئی حادثہ پیش نہیں آیا تھا اور نہ وہ خود سے کودی تھی۔ نیز اس وقت نہ صرف میں عمارت میں موجود تھا بلکہ... اس سے آگے میں نے سوچنا بند کر دیا۔ کوئی ایک نے تصویر واپس لفافے میں رکھ دی۔ میں نے محسوس کیا کہ لفافے میں اور بھی تصاویر ہیں۔

میں نے رومال کی مدد سے آنکھوں کی دھند صاف کی اور براہ راست کوئی ایک کی آنکھوں میں جھانکا۔ وہ فوراً بولا۔ ”میں نے نیگیٹو ایک خط کے ساتھ محفوظ جگہ پر رکھ دیے ہیں۔“ ”ظاہر ہے۔ ورنہ میں تمہیں بھی اب تک اٹھا کر گہرائی میں پھینک چکا ہوتا۔“ میں نے زہر خند مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ”اب کیا چاہتے ہو؟“

”میں نے بتایا تھا نا کہ اس علت نما شوق نے میری حالت کافی بوسیدہ کر دی ہے...“ ”بس... بس...“ میں نے اسے روکا۔ ”مطلب کی بات کرو۔“

”آپ شاید مجھے بلیک میلر سمجھ رہے ہیں۔ ایسا ہوتا تو میں زیادہ سے زیادہ رقم بٹورنے کی کوشش کرتا جبکہ میں تو صرف زندگی کو ذرا اہل کرنا چاہتا ہوں۔“

”تصاویر کے بدلے تمہیں کیا چاہیے؟“ میں نے پھر اس کی بات کاٹ دی۔ میرا اعتماد واپس آ رہا تھا۔ اگرچہ میں جانتا تھا کہ بعد ازاں مجھے اس نئے مسئلے کا کوئی مستقل اور شافی حل تلاش کرنا پڑے گا۔

”مسٹر فلچر!“ اس نے بولنا شروع کیا۔ میں نے سوچ کر ایسا حل نکالا ہے کہ ہم دونوں کی مشکل آسان ہو جائے گی۔ میں کوئی لاپٹی شخص نہیں ہوں۔ میں آپ پر زیادہ بوجھ نہیں ڈالوں گا۔ بس مجھے تھوڑی سہولت درکار ہے۔ مجھے

ایک بہتر اپارٹمنٹ کی ضرورت ہے... کچھ عرصے اور کیمرے کے لوازمات خریدنے ہیں۔ میں نیگیٹو نہیں بیچنا چاہتا... مجھے خرچ کرنے کا سلیقہ نہیں ہے لہذا میں نے فیصلہ کیا کہ چاہے تھوڑی رقم ملے لیکن دفعہ دفعہ سے ملتی رہے۔ جیسے آدمی ریٹائر ہونے کے بعد پنشن لیتا ہے۔ مجھ پر کچھ قرض بھی ہے۔ فوری طور پر شاید آپ یقین نہ کریں، صرف ایک ہزار ڈالر زرد کار ہیں... پھر اگلے دو مہینے میں محض ہزار ڈالر۔ اسی طرح ہم دونوں مل کر کوئی مناسب ڈیل ملے کر لیں گے... آپ قطعی بوجھ محسوس نہیں کریں گے۔“ اس نے بات ختم کی۔

”خوب، بہت خوب...“ میں نے اس کے ذہن رسا کی داد دی۔ ”گویا یہ ایک ہمیشہ کا درد سر ہوا۔ یعنی جب تک ہم میں سے کوئی ایک زندہ ہے، یہ سلسلہ چلتا رہے گا۔“

”نہیں، نہیں۔“ اس نے تردید کی۔ ”آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ چند مہینے میں ہم کسی مناسب معاہدے تک پہنچ جائیں گے۔ میرا یقین کیجیے۔ آپ کو زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ دو سال تک میری شکل نظر آئے گی۔“ اس کا انداز ملتجیانہ تھا۔ میں کافی حد تک اعصاب پر قابو پا چکا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ کچھ خوف زدہ بھی ہے۔ میرے ذہن میں ہیلن سے شادی کا تصور پھر اجاگر ہونے لگا۔

اجنبی، مسٹر کوئی ایک... بلیک میلر تھا یا ضرورت مند... بہر حال مجھے اس کی بات فی الحال تو ماننی ہی تھی... وہ جو پروگرام بنا کر لایا تھا اس میں وقت کا عنصر میرے لیے اہم تھا۔ اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر میں اطمینان اور سکون سے سوچ سکتا تھا کہ اس سے کس طرح نجات حاصل کی جائے۔ اگر وہ واقعی کوئی عادی بلیک میلر نہیں تھا تو چند مہینے میں اس کا رویہ اور مطالبات اس کے بارے میں میرا ذہن صاف کر سکتے تھے۔ فی الوقت ہزار ڈالر کی کوئی اہمیت نہیں تھی... ملے ہوا کہ مجھے کب، کہاں اسے دس اور بیس کے نوٹوں کی شکل میں ہزار ڈالر ادا کرنے ہیں۔

☆☆☆

اس کے جانے کے بعد میں نے دو جام چڑھائے اور خود کو بہتر محسوس کرنے لگا۔ گلوریا سے چھٹکارا پانے کے مقابلے میں، اس بلیک میلر سے نمٹنا قدرے آسان معلوم ہو رہا تھا۔

دو دن بعد میں اس کی بتائی ہوئی جگہ پر پہنچ گیا۔ یہ ایک بار تھا۔ وہ بتائے ہوئے وقت کے مطابق وہاں موجود تھا۔

میں نے رقم کا لفافہ اس کے حوالے کیا۔ میں وہاں رکا نہیں اور جلدی اٹھ کھڑا ہوا۔

ابھی میں بیرونی دروازے کی جانب چند قدم ہی بڑھا تھا کہ دو بڑے کٹے افراد نے مجھے دائیں بائیں سے قابو کیا۔ لمبے بھر میں میرے دونوں ہاتھوں میں ہتھکڑی لگ چکی تھی۔ مجھے جیسے بجلی کا جھٹکا لگا۔ میں نے پلٹ کر کوئیک نامی بلیک میلر کو دیکھنا چاہا لیکن دونوں پولیس اہلکاروں نے اس کا موقع نہیں دیا۔ ہتھکڑی اعلان کر رہی تھی کہ میں پولیس کی گرفت میں ہوں، مجھے فوراً ہی باہر موجود سرکاری سیاہ سیڈان میں منتقل کر دیا گیا۔ میرا دماغ ماؤف ہو چکا تھا۔

مجھے نہیں پتا مجھے کہاں لے جایا گیا۔ بہر حال میں تنہا اور حالت اسیری میں تھا۔ میں کب اور کیسے سویا، مجھے نہیں پتا۔ اگلے دن دوپہر کے وقت میری مسٹر کوئیک، یعنی بلیک میلر سے ملاقات کرائی گئی۔ میرے منہ پر جیسے قفل لگ چکا تھا۔ کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔

وہ کسی رخ سے مجھول اور بوسیدہ بلیک میلر نہیں لگ رہا تھا۔ نہ وہ آواز تھی، نہ وہ حلیہ اور چال ڈھال... پولیس کے دو افراد اس کے ہمراہ تھے۔

اس کی آنکھوں کی چمک اور لباس کی نفاست، ٹی وی انڈسٹری کے گلوں یا کے دوستوں سے ملتی جلتی تھی۔ چہرے پر سنگ دلی کے آثار تھے۔

”فلچر بے بی! میری اداکاری اور محنت کی تعریف نہیں کرو گے؟“ کوئیک زہریلے انداز میں مسکرایا۔ مجھے کرسی پر بٹھا دیا گیا۔ میرا بدن سن تھا، بیٹھتا نہیں تو شاید گر ہی پڑتا۔

”تم شاید سمجھ نہیں پا رہے ہو کہ ہوا کیا؟“ وہ بولا۔

”در اصل مجھے سمیت گلوں یا کے دوستوں کو یقین تھا کہ گلوں یا کو قتل کیا گیا ہے۔ تم نے جائے واردات سے اپنی غیر موجودگی تو ثابت کر دی تھی لیکن ہم گلوں یا کو اچھی طرح جانتے تھے۔ شاید اس کے شوہر سے زیادہ مگر ہم بے بس تھے، ہمیں کوئی سرا نہیں مل رہا تھا محض شک تھا۔ ہم نے ایک رضا کار ٹیم تشکیل دی، جس کا ایک فرد تمہاری نگرانی پر مامور تھا۔ اس نے تمہاری اور ہیلن کی ملاقات کا احوال تو ہم تک پہنچا دیا۔ تاہم اس کا صرف اتنا فائدہ ہوا کہ ہمارا شک پختہ ہو گیا۔ فلچر بے بی، تم سن رہے ہونا؟“ وہ رک گیا۔

میں سکتے کے عالم میں تھا۔ خاموش... کم صدم... ”تم پریشان ہو شاید۔“ اس کا چہرہ پتھر ایا ہوا لگ رہا تھا۔ ”خیر... ہم گلوں یا کو واپس نہیں لاسکتے تھے۔ لیکن تمہیں اس کے پاس پہنچانے کی کوشش ضرور کر سکتے تھے اور اس کے

لیے ہمیں ٹھوس ثبوت درکار تھا۔ کیونکہ تم پریشان لگ رہے ہو اس لیے میں تفصیل میں جانے سے گریز کروں گا۔“ اس کے چہرے پر بے نیازی اور بیگانگی کا تاثر گہرا ہو گیا۔ ”ہم نے ایک منصوبہ ترتیب دیا۔ اسے قابل عمل بنانے کے لیے ہمیں کافی تنگ و دو کرنی پڑی۔ تدفین کے بعد تمہاری عارضی غیر موجودگی نے ہمیں کچھ سہولت فراہم کر دی تھی... ہماری ٹیم نے ماہر نفسیات سے بھی مشورہ کیا۔ ”بے ہاؤس“ میں شوٹنگ کے لیے ہمیں قانون کی مدد بھی حاصل کرنی پڑی... کامیابی کا دار و مدار میری اداکاری اور مجرم کی نفسیات کے ایک تاگزیر پہلو یعنی ”احساسِ جرم“ پر تھا۔ تم جیسے مجرم اور عادی یا پیشہ ور مجرم کی نفسیات میں ”احساسِ جرم“ کے معاملے میں کچھ فرق ہوتا ہے۔ ہم نے اس پر کافی کام کیا لیکن میں بات کو مختصر کروں گا... ہماری ٹیم کو انڈسٹری سے کچھ رضا کار بھی مل گئے۔ گلوں یا کا رول ”نینا“ نے ادا کیا۔ نینا کو بچانے کے لیے ایک حفاظتی جال ہمیں لازمی چاہیے تھا۔ کافی مشکل پیش آئی لیکن ہم کسی نہ کسی طرح اپنے مطلب کی ایک تصویر حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ الیکٹرونکس میں جس تیزی سے تبدیلیاں آرہی ہیں... وہ دن دور نہیں جب رنگین عکس بندی کا آغاز ہو جائے گا۔ تمہاری بد قسمتی اور ہماری خوش قسمتی کہ ابھی بلیک اینڈ وہاٹس ہی چل رہا ہے۔ لفافے میں تمام تصاویر غیر متعلق تھیں۔ یہی ایک تصویر تھی جسے دیکھنے سے پہلے ہی میں فضا قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا کہ تصویر تم نے محض رسمی انداز میں دیکھی۔ اگر تم عادی مجرم ہوتے تو اتنی جلدی نہ ٹوٹتے اور تصویر لازماً غور سے دیکھتے پھر بلیک اینڈ وہاٹس عکاسی کے باوجود ہمارا منصوبہ فلاپ ہو جاتا... مختصر تم سیدھے ہمارے بچھائے ہوئے جال میں آن پھنسے اور رقم لے کر پھینچ گئے۔ جیسے ہی تم نے رقم ادا کی، ہمارا کام ختم ہو گیا۔ تم نے حماقت کا ثبوت دیا مسٹر فلچر... آخری بات یہ کہ میں اسسٹنٹ منیجر نہیں بلکہ ٹی وی آرٹسٹ ہوں... اب میں چلتا ہوں، تم گلوں یا سے ملنے کی تیاری کرو۔“

وہ کھڑا ہو گیا۔ اس نے ایک تضحیک آمیز نظر مجھ پر ڈالی جس میں نفرت کی جھلک نمایاں تھی۔ وہ گنگناتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

اس کے قدموں کی چاپ میں موت کی آہٹ تھی۔ کسی نے اسے کچھ کہا، اس کے ہنسنے کی آواز آئی۔

قدموں کی چاپ دور ہوتی چلی گئی لیکن موت کی آہٹ نزدیک سے نزدیک تر...





اسماقادی

ہمارے سماج میں قانون کتابوں میں
لکھا ہوا ہے جب اس کی باگ ٹور با اثر سماج کے
روایتی نظام تک پہنچتی ہے تو اس کے معنی ہی بدل کے رہ
جاتے ہیں مختلف طبقات میں تقسیم اس نظام قانون کے بھی کئی رخ
ہیں، بالآخر طبقہ کی خوشنودی ہی قانون کی اصل تعریف و تشریح
ٹھہرتی ہے یہ تشریح کتابوں میں نہیں، روایتوں میں تحریر ہوتی ہے... ایسی
روایتیں جس میں قانون سب کے لیے ایک جیسا نہیں بلکہ سمندر اور جال کا سا ہے
جہاں طاقتور مچھلی جال کو توڑ کر اور کمزور مچھلی بیچ کر نکل جاتی ہے۔
پھنستا وہی ہے جو درمیانے طبقہ سے ہو۔ محبت نہ تو روایتوں کو مانتی ہے نہ طبقوں
میں تقسیم معاشرے کا تجزیہ کر کے محبوب کا انتخاب کرتی ہے، یہ تو بس ہو جاتی
ہے۔ دل طبقوں کی پروا کرتا ہے اور نہ ہی طاقت اس کا راستہ روک سکتی ہے البتہ
اسے آزمائشوں سے ضرور گزرنا پڑتا ہے۔ زندگی کی بساط اور وقت کے
دھارے سب قسمت کی باتیں اور مقدر کی چالیں ہیں... کبھی بازی پلٹ
بھی جاتی ہے۔ بیٹا وقت لوٹ تو نہیں سکتا مگر مقدر ساتھ دے جاتا ہے
... اس وقت تک پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر چکا ہوتا
ہے۔ جرم، افسر شاہی، جاگیرداری اور پیار کے محور
کے گرد گھومتا آزمائشوں کا ایک ایسا ہی
لامتناہی سلسلہ

تحریر کی فہم کری

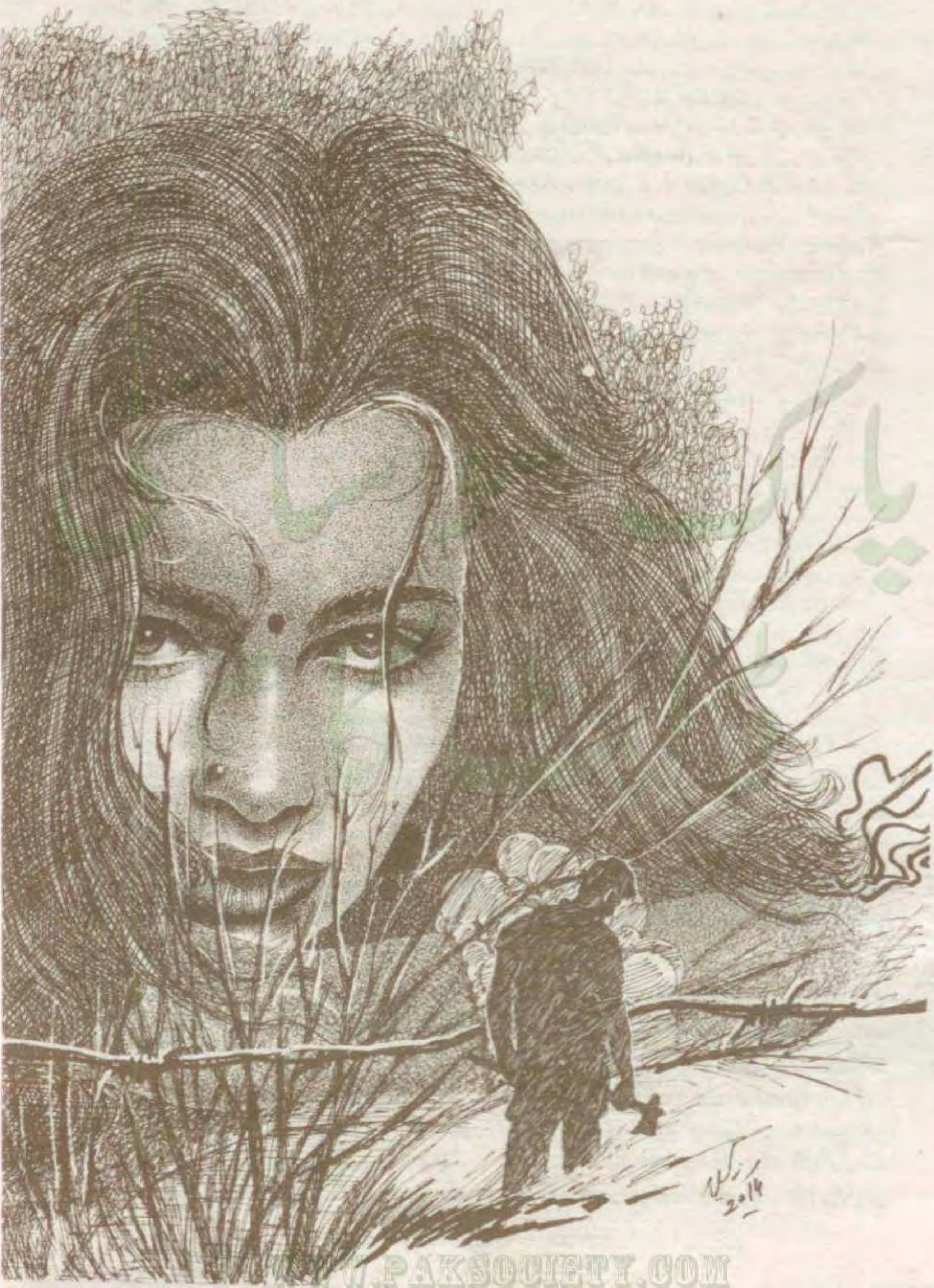
قسمت کی چاب ڈی

مقدر کا میل

پچھڑ جانے والوں کی کہانی

قسط 55





WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

بارسوخ خاندان سے تعلق رکھنے والا شہر یار عادل ایک پُر جوش جوان جس کی بطور اسسٹنٹ کمشنر پہلی پوسٹنگ ہوتی ہے۔ اس کے زیر نگیں ضلع کے ایک گاؤں پیر آباد کا چودھری افتخار عالم شاہ ایک روایتی جاگیردار ہے جو شہر یار کو اپنے ڈھب پر چلانے میں کامیاب نہیں ہوتا اور دونوں کے درمیان خاصیت کا آغاز ہو جاتا ہے۔ چودھری کی بیٹی کشور، آفتاب سے خفیہ نکاح کر لیتی ہے۔ ماہ بانو کا خلیق بھی پیر آباد سے ہے۔ چودھری افتخار جب ماہ بانو کو دیکھتا ہے تو اس پر اس کا دل آ جاتا ہے اور وہ ماہ بانو کی عزت پامال کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ چودھری کے چنگل سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ گورا جس کا نام ڈیوڈ ہے، اصل میں موساد کا ایجنٹ ہے۔ وہ چودھری کو ماہ بانو کا لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لیتا ہے۔ ادھر کشور آفتاب کے کہنے پر حویلی چھوڑ دیتی ہے۔ اسلم اور ماہ بانو شادی کے بندھن میں بندھ جاتے ہیں۔ ماریا، کرنل توحید کو رہانے کی کوشش میں پکڑی جاتی ہے تاہم راستے میں را کے ایجنٹوں کی فائرنگ سے گاڑی میں آگ لگنے کے سبب ماریا بری طرح جھلس جاتی ہے اور اسپتال میں دم توڑ دیتی ہے۔ ماریا کی ماں سنتھیا جوزف ورماسے انتقامی کارروائی کرنے کا مطالبہ کرتی ہے۔ شہر یار اللہ آباد اور نور پور دورے کے لیے نکلتا ہے۔ اس کی گاڑی کو بم سے اڑا دیا جاتا ہے لیکن وہ محفوظ رہتا ہے۔ شہر یار کو کرنل توحید اپنی فورس میں شامل ہونے کا کہتے ہیں۔ شہر یار فورس میں شامل ہونے کا فیصلہ کر لیتا ہے۔ شہر یار کی شناخت چھپانے اور فورس میں آزادانہ کام کرنے کے لیے شہر یار کے فرضی ایکسٹنٹ کی افواہ پھیلا دی جاتی ہے۔ شہر یار، ماہ بانو اور اسلم کو امریکا بھجوا دیتا ہے۔ اور خود انڈیا گراؤنڈ ہو جاتا ہے۔ اس کی ٹریننگ اور حلیے میں تبدیلی کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ کشور اور آفتاب بھی نیو یارک پہنچ جاتے ہیں مگر وہاں ایک شاپنگ سینٹر میں ان کی ملاقات مراد شاہ سے ہو جاتی ہے۔ مراد شاہ، کشور اور آفتاب کو کھانے پر گھر بلاتا ہے۔ وہاں اچانک چودھری سے ٹکراؤ ہو جاتا ہے۔ چودھری کشور اور آفتاب کو ٹھکانے لگانے کے لیے کرائے کے آدمیوں کا سہارا لیتا ہے۔ تاہم وہ بچ جاتے ہیں۔ شہر یار کو بھارت ایک اہم مشن پر بھیجے کا فیصلہ ہوتا ہے جہاں سے اسے ڈاکٹر فرحان کو رہا کرانے کا مشن سونپا جاتا ہے۔ سلو کو سی ایف پی والے جنرل سے نکال کر اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ سلو کو شہر یار کے پاس پہنچا دیا جاتا ہے۔ سلو اور شہر یار دھلی پہنچ جاتے ہیں۔ وہاں ان کے مددگار ان کے حلیے میں تھوڑی بہت تبدیلی کرتے ہیں۔ جاوید علی، رائے چند سے حاصل شدہ معلومات کے مطابق ایک مساجد سینٹر میں پہنچتا ہے۔ وہاں اسے عالیہ نامی عورت ملتی ہے جو مبینہ را کی ایجنٹ ہوتی ہے۔ جاوید علی کے ساتھی وہاں آپریشن کرتے ہیں اور اس عورت کو اٹھا لاتے ہیں۔ ادھر سلو اور شہر یار کو گرفتار کر لیا جاتا ہے اور انہیں را کے ایک ٹھکانے پر پہنچا دیا جاتا ہے۔ تاہم جب پوچھ گچھ کا وقت آتا ہے تو سلو اور شہر یار اند اور اس کے اہلکاروں پر قابو پا لیتے ہیں۔ وہاں متحدہ افراد کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد وہ را کے ٹھکانے کو تباہ کر دیتے ہیں۔ ادھر ماہ بانو چیک اپ کے لیے اسپتال جاتی ہے مگر واپس گھر نہیں پہنچتی۔ اسلم اپنے طور پر ماہ بانو کی تلاش کا کام کرتا ہے۔ شہر یار، سلو کو بھائی جی کے آدمی گھیر لیتے ہیں تاہم عبدال سے واقفیت کی بنا پر انہیں رعایت دی جاتی ہے اور انہیں بھائی جی کے پاس پہنچا دیا جاتا ہے۔ شہر یار اور سلو ڈاکٹر فرحان کو را کے ٹھکانے سے نکلنے کے لیے اس کا میاں ہو جاتے ہیں تاہم انہیں عارضی طور پر عائشہ نامی عورت کے گھر پناہ لینی پڑتی ہے۔ اسلم، ماہ بانو کو قید کرنے والوں کے خفیہ ٹھکانے تک پہنچ جاتا ہے اور وہ بھی ماہ بانو کے ساتھ قید کر لیا جاتا ہے۔ تاہم وہ ایڈی کی مدد سے قید سے نکل جاتا ہے اور مارک اور دیگر افراد پر قابو پا کے ماہ بانو کو وہاں سے نکال لاتا ہے۔ شہر یار، سلو اور ڈاکٹر فرحان ممبئی پہنچ جاتے ہیں اور بھائی جی کے ٹھکانے پر پہنچ جاتے ہیں اور اشوک کو مارنے کا پروگرام بناتے ہیں اور اسے ختم کر دیتے ہیں۔ ادھر میجر ذیشان، مشاہد خان کو آر لینڈ بھیجتا ہے تاکہ وہ ماہ بانو اور اسلم کو بازیا ب کرا سکے۔ جاوید علی اور سلمان بھارتی حدود میں جا کر فروٹ فارم پر موجود اسلم کو تباہ کر دیتے ہیں۔ اسلم جنگل میں سفر کے دوران پروفیسر ہنری کی بانیٹ کی آواز سن کر اس کا تعاقب کرتا ہے اور دونوں لڑائی کے دوران دلدل میں گر جاتے ہیں۔ ماہ بانو اس کی مدد کرنے پہنچتی ہے مگر اس کے سر پر کوئی شے لگتی ہے اور وہ بے ہوش ہو جاتی ہے۔ ادھر شہر یار، سلو، اشوک کو ٹھکانے لگانے کے بعد بھائی جی کے ہوٹل میں قیام کرتے ہیں تاہم شہر یار وہاں سے کہیں اور جانے کی خواہش کا اظہار کرتا ہے۔ جب وہ نکل رہے ہوتے ہیں تو انہیں وہاں سلو کا ٹریز بھینا نظر آتا ہے۔ وہ ایک جنگلے میں ٹھہرتے ہیں۔ اس رات بھینا گر جنگلے پر حملہ کر دیتا ہے اور شہر یار کو قابو کر لیتا ہے۔ وہ سلو کے بارے میں استفسار کرتا ہے تاہم شہر یار بھی نہیں جانتا کہ سلو کہاں ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

سفر کی رفتار کم ہو گئی تھی لیکن اس کے باوجود ان لوگوں نے اسے وہاں بے یار و مددگار چھوڑنا مناسب نہیں سمجھا۔ اسے یاد تھا کہ وہ ایک رات ماہ بانو کے کمرے میں بُرے ارادے سے گیا تھا۔ یہ اور بات کہ اسے اپنے ارادے میں کامیابی نہیں ہو سکی تھی لیکن بہر حال اس کی نیت تو واضح تھی۔ اس کے باوجود ماہ بانو نے بھی اپنے شوہر سے اسے وہاں چھوڑ جانے کو نہیں کہا تھا۔ ان لوگوں کی اس اعلیٰ ظرفی نے اس کے دل کو اسیر کر لیا تھا اور حقیقتاً وہ ایک محصوم بچے کی ہی

ماہ بانو، ایڈی کو وہیں ٹھہرنے کا کہہ کر خود اسلم کے پیچھے گئی تھی لیکن ایڈی کو لگا کہ وہاں رکنے کے بجائے ان دونوں کے پیچھے جانا زیادہ مناسب ہوگا۔ اس طرح ایک تو وہ حالات سے باخبر رہتا، دوسرے ضرورت پڑنے پر ان کے کام بھی آسکتا تھا۔ اسے وہ دونوں میاں بیوی بہت اچھے لگے تھے خصوصاً اسلم... جس بے غرضی سے اسے اپنے شانے پر لاد کر سفر کرتا رہا تھا، اس چیز نے اسے بہت متاثر کیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اسے اٹھا کر چلنے کی وجہ سے ان کے

گرداب

کوشش سے ایڈی اس تک رسائی حاصل کر سکتا تھا۔ اس نے ایک نظر طارق پر ڈالی۔ وہ اپنے اطراف سے مطمئن نظر آ رہا تھا اور اس کی حرکات و سکنات میں ایسی کوئی بات نظر نہیں آرہی تھی جس سے یہ اندازہ ہو سکے کہ اسے کسی طرف سے خود پر حملے کا خدشہ ہو۔ یہاں تک کہ اس کے پاس کوئی ہتھیار بھی موجود نہیں تھا اور اس کی ساری توجہ صرف اس بات کی طرف مبذول تھی کہ کسی طرح بے ہوش ماہ بانو کو اپنے ساتھ بانک پر بٹھا سکے۔ اس مقصد کے لیے وہ رستی کا استعمال کر رہا تھا۔ رستی سے باندھنے کی صورت میں ماہ بانو کے چلتی بانک سے گرنے کا اندیشہ ختم ہو جاتا۔

ایڈی نے اس کی اس مصروفیت کو دیکھا اور احتیاط سے پسٹل کی طرف بڑھا۔ اس کے حرکت کرنے کی وجہ سے زمین پر پڑے سوکھے پتے ذرا سے چمرائے لیکن خوش قسمتی سے ایک ہرن عین اسی وقت دوڑتا ہوا سامنے سے گزرا اور درختوں کے جھنڈ میں غائب ہو گیا۔ چہ مراہٹ کی آواز پر ذرا سا چونکنے والا طارق مطمئن ہو گیا کہ اس کی وجہ ہرن تھا۔ یوں ایڈی نے نہایت آسانی سے پسٹل تک رسائی حاصل کر لی اور بہت خاموشی سے طارق کی طرف بڑھا۔ اس جگہ چونکہ زمین صاف تھی اس لیے آوازیں پیدا نہیں ہو رہی تھیں۔ طارق اس زاویے سے کھڑا تھا کہ اس کی ایڈی کی طرف پشت تھی۔ ایڈی اس کی پشت پر پہنچا تو عین اسی وقت وہ بانک پر سوار ہو کر اسے گل لگانے لگا۔ ایڈی بھی اچک کر اس کے پیچھے سوار ہو گیا۔ طارق نے اس کا بیٹھنا محسوس کر لیا اور بُری طرح بدک کر پیچھے دیکھا۔ ایڈی کو پسٹل اٹھائے اپنے سامنے دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں لیکن پھر اس نے تیزی سے خود پر قابو پالیا اور مسکرانے کی کوشش کرتا ہوا بولا۔

”ہیلو ایڈی! مجھے امید تھی کہ یہاں تم سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔“

”پروفیسر اور اس لڑکی کا شوہر کہاں ہیں؟“ طارق کی خوش اخلاقی کو نظر انداز کرتے ہوئے اس نے سرد لہجے میں پوچھا۔

”وہ دونوں لڑتے لڑتے اس دلدل میں جا گرے تھے۔“ طارق نے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے ایڈی کی توجہ بٹانے کی کوشش کی لیکن اس کی توقع کے برعکس ایڈی نے نہ تو اس پر سے نظریں ہٹائیں اور نہ ہی اس کی پسٹل پر گرفت کمزور ہوئی۔ طارق مایوس سا ہو گیا۔ وہ جانتا تھا کہ بظاہر کمزور نظر آنے والا ایڈی ذہانت کے اعتبار سے بہت

طرح ان سے انسیت و محبت محسوس کر رہا تھا۔ اس کے سات سالہ وجود میں تخلیق کیا گیا جوان آدمی کا دماغ بھی اسے یہ راہ دکھا رہا تھا کہ اسے اب ان لوگوں کا ہی وقادار رہنا ہے جو بُرے وقت میں اس کا سہارا بنے ہیں۔

اپنی اس سوچ کی وجہ سے اس نے ہمت کی اور زخمی ہونے کے باوجود دست روی سے آگے بڑھنے لگا۔ اس طرح حرکت کرنے سے اس کی زخمی ٹانگ میں بہت تکلیف ہو رہی تھی، اس کے باوجود وہ ہونٹ بیچنے مسلسل آگے بڑھتا رہا۔ ماہ بانو کی طرح اس نے بھی اسلم کی جانب سے فائر کی آواز سنی اور تشویش میں مبتلا ہو گیا۔ وہ اسی سمت میں سفر کر رہا تھا جہاں اسلم اور ماہ بانو گئے تھے لیکن اس کے سفر کی رفتار بہت سست تھی۔ اسے یہ بھی اندازہ نہیں تھا کہ آگے کیا صورت حال ہے۔ کچھ اور وقت گزرا تو اس نے ماہ بانو کی بلند چیخ سنی اور مزید مضطرب ہو گیا۔ اس نے کوشش کی کہ اس کی رفتار میں اضافہ ہو جائے۔ اس کوشش میں اس کی ٹانگ کے زخم سے خون رسنے لگا اور تکلیف میں بھی اضافہ ہو گیا لیکن اس نے آگے بڑھنا بند نہیں کیا۔ آخر وہ اس مقام پر پہنچ گیا جہاں سے صورت حال کا جائزہ لے سکتا تھا۔ اس کے سامنے جو منظر تھا، اس میں صرف ماہ بانو اور ڈاکٹر طارق نظر آ رہے تھے۔ ہنری یا اسلم کا کوئی نام و نشان نہیں تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ ماہ بانو بے ہوش ہے اور طارق اس کے بے ہوش وجود کو اٹھا کر اپنی بانیک پر لادنے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہ منظر ایسا تھا جسے دیکھ کر وہ سمجھ گیا کہ بازی ماہ بانو اور اسلم کے بجائے ان کے مخالفین کے ہاتھ میں رہی تھی۔ البتہ ہنری کا غیاب اس کے لیے الجھن کا باعث تھا۔ اگر وہ لوگ حاوی رہے تھے تو اس وقت ہنری کو بھی طارق کے ساتھ ہی نظر آنا چاہیے تھا لیکن وہاں اس کی پچھر ہو کر گری ہوئی بانک کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اپنی اس الجھن کو فی الحال اس نے پس پشت ڈالا اور ماہ بانو کو بچانے کی تدبیر سوچنے لگا۔ ہتھیار کے نام پر اس کے پاس صرف ایک پھل کاٹنے والی چھری تھی جس سے وہ اتنی دور سے طارق کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔

بے شک وہ ذہین اور پھرتیلا تھا لیکن اپنے مختصر اور زخمی وجود کی وجہ سے دوید و طارق جیسے بھرپور جوان آدمی سے مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن وہ اس خبیث کو ماہ بانو کو لے جاتا ہوا بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ یہی سب سوچتے ہوئے اس کی نظر چند فٹ کے فاصلے پر پڑے ماہ بانو کے پسٹل پر پڑی۔ یہ پسٹل اس کے ہاتھ سے چھوٹ کے گرا تھا۔ تھوڑی سی

آگے ہے اور اسے اتنی آسانی سے زیر نہیں کیا جاسکتا۔ چنانچہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”جس وقت گولی چلی تھی، میں اپنی بانٹک سمیت ان درختوں میں گھس گیا تھا۔“ اس نے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے درختوں کے بارے میں بتایا۔ ایڈی نے اس بار بھی اس کے اشارے پر نگاہ غلط نہ ڈالی۔

”مجھے شک تھا کہ فائر کرنے والے کا کوئی ساتھی بھی ضرور آس پاس موجود ہوگا اس لیے خاموشی سے انتظار کرتا رہا اور ان دونوں کے جھگڑے میں ٹانگ نہیں اڑاؤں۔ جب وہ دونوں لڑتے ہوئے دلدل میں گرے تو یہ بھاگتی ہوئی چیخ کر باہر نکلی اور میں نے اسے بے ہوش کر دیا۔ اسے میں اپنے ساتھ لے کر شہر جانا چاہتا تھا لیکن تم درمیان میں آگئے۔ اب تم بتاؤ کہ کیا چاہتے ہو؟ اصولاً تو تم ہمارے کیمپ کا حصہ ہو اس لیے تمہیں میرا ساتھ دینا چاہیے۔“ اپنی بات ختم کر کے طارق نے اس کے تاثرات کا جائزہ لینے کی کوشش کی۔

”ٹھیک ہے، شہر چلو۔“ ایڈی نے مختصر الفاظ میں اپنا فیصلہ سنایا۔ اس کا لہجہ ایسا تھا جس سے دشمنی اور دوستی میں سے کسی بات کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا تھا تاہم مسلسل خود پر تھے ہوئے پٹیل نے طارق کو اس بات کا احساس ضرور دلایا کہ فی الحال اسے اس کے ہر حکم کی تعمیل کرنی ہوگی۔ یوں بھی جنگل میں جس تیزی سے آگ پھیل رہی تھی، وہ مزید وہاں نہیں رک سکتے تھے۔ آگ پر تو شاید محکمہ جنگلات کسی طرح قابو پالیتا لیکن وہ کسی کا سامنا کر کے اس کے سوالات کے جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ اسے کوشش کرنی تھی کہ شہر پہنچ کر کسی ایسے فرد سے رابطہ کر سکے جو اس معاملے کو منڈل کر لے۔ اپنے چہرے کا رخ سامنے کی طرف کرتے ہوئے اس نے بانٹک اسٹارٹ کر دی اور آگے کی طرف سفر شروع ہو گیا۔ وہ تینوں بانٹک پر اس ترتیب میں تھے کہ سب سے آگے طارق خود تھا۔ اس کے پیچھے سی سے بندھی ماہ بانو کا وجود بانٹک کے دونوں طرف جھول رہا تھا اور سب سے پیچھے ایڈی بیٹھا ہوا تھا۔ وہ مختصر الوجود تھا اس لیے پیچھے بچنے والی ٹانگ جگہ میں بھی سما گیا۔ طارق کی پشت سے لگی اس کے پٹیل کی ٹال مسلسل اس بات کا اعلان کر رہی تھی کہ وہ اس کی طرف سے غافل نہیں ہے۔ طارق نے بھی دل میں سوچا کہ پہلے یہاں سے نکل جائے، اس کے بعد اس چھوٹی سی بلا سے بھی نمٹ لیا جائے گا۔ وہ تیزی سے جنگل سے باہر جانے والے راستے پر سفر کرتا رہا۔ آخر کار جنگل کے نیم

تاریک ماحول نے ان کا پیچھا چھوڑ دیا اور وہ ایسے مقام پر پہنچ گئے جہاں درخت اور جھاڑیاں بہت محدود تعداد میں رہ گئے تھے اور اس بات کا اندازہ ہو رہا تھا کہ جنگل کی حدود ختم ہی ہوا چاہتی ہیں۔

”ہم شہر پہنچنے والے ہیں۔“ طارق کے اعلان نے اس کے اندازے کی تصدیق کر دی لیکن اس نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ درحقیقت اس وقت اس کی توجہ طارق سے زیادہ ماہ بانو کی طرف تھی جو ہولے ہولے کراہ رہی تھی اور اس کا کراہنا اس بات کی نشاندہی تھی کہ وہ ہوش میں آرہی ہے۔ ”بانٹک روک دو۔“ آخر کار اس نے طارق کو حکم دیا اور اس کے قتل کرنے کے بعد خود بانٹک سے اتر کر اتنے فاصلے پر جا کھڑا ہوا کہ طارق اس کے نشانے کی زد پر تو رہے لیکن پلٹ کر اس پر حملہ نہ کر سکے۔

”اسے نیچے اتار دو اور اس کی رسیاں کھول دو۔“ دوسرا حکم صادر کرتے ہوئے اسے اندازہ نہیں تھا کہ طارق کیا کر سکتا ہے۔ اس نے ماہ بانو کو بانٹکوں میں تھام کر بانٹک سے اتارا اور یکدم ہی اس کے وجود کو اپنی ڈھال بناتا ہوا بولا۔ ”پٹیل پھینک دو ورنہ میں اس کی گردن توڑ دوں گا۔“ اس صورت حال پر ایڈی لمحہ بھر کے لیے گھبرایا لیکن فوراً ہی خود پر قابو پا کر منہ بناتا ہوا بولا۔

”بے شک توڑ دو۔ یہ میری محبوبہ نہیں ہے جو میں اس کی جان کی فکر میں ہلکان ہوں۔“ اس کے اس جواب نے طارق کو مایوس کر دیا۔ اس کا ریوالبغلی ہولسٹر میں تھا جس پر ایڈی نے بانٹک چلتے ہی قبضہ کر لیا تھا اس لیے فی الحال وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ ایک ننھی سی مخلوق کے ہاتھوں اپنے اس طرح بے بس ہو جانے پر اس نے دانت کچکچائے اور اس کے حکم کی تعمیل میں مصروف ہو گیا۔ سی کی بندشیں کھلیں تو ماہ بانو کے وجود میں کچھ جان آئی۔ ہوش اسے پہلے ہی آ گیا تھا لیکن جس حالت میں وہ سفر کر رہی تھی، سوائے کراہنے کے کوئی آواز نہیں نکال پارہی تھی۔

”ہم تمہیں یہاں چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ تھوڑی سی کوشش کر کے یہاں سے آگے بڑھو گی تو سڑک پر کسی نہ کسی سے لفت مل جائے گی۔“ ایڈی نے سپاٹ لہجے میں اس سے کہا تو وہ سسک پڑی۔

”اسلم... اسلم کہاں ہے؟“ ”بہتر ہے کہ فی الحال تم صرف اپنی فکر کرو۔“ ایڈی نے اسے کوئی واضح جواب نہیں دیا اور طارق کو ایک بار پھر بانٹک پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اس کا مقصد نہ سمجھتے ہوئے

طارق نے اس کے حکم کی تعمیل کی۔ شاید وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ ماہ بانو کو یہاں بے یار و مددگار چھوڑ کر وہ دونوں شہر جانے والے ہیں۔

”یہ پانی کی بوتل رکھ لو۔“ ایڈی خود بھی اچک کر طارق کے پیچھے بیٹھ گیا اور بانک سے لٹکتی پانی کی بوتل نکال کر ماہ بانو کی طرف اچھالی۔ چھوٹے سے وجود میں بڑا دماغ رکھنے والا وہ لڑکا اپنے دماغ کی وجہ سے ہی بھرپور قوت ارادی کا مظاہرہ کر رہا تھا ورنہ اس کی جسمانی حالت جتنی دگرگوں تھی، یہ وہی جانتا تھا۔ زخم سے مسلسل رسنے والے خون نے اسے بے حد کمزوری میں مبتلا کر دیا تھا اور اسے بار بار اپنی بصارت کے دھندلا جانے کا احساس ہو رہا تھا۔ اس احساس سے وہ بار بار سر جھٹک کر نجات حاصل کر رہا تھا کیونکہ اپنے کام کی تکمیل سے پہلے اپنے حواس کا ساتھ چھوڑ دینا برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

”واپس جنگل کی طرف چلو۔“ طارق نے بانک اشارت کی تو اس کے حکم کو سن کر وہ ششدر رہ گیا۔

”ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟“ وہ ایک جھٹکے سے اس کی طرف مڑا۔

”اگر ایسا نہیں کرو گے تو میں یہیں تمہارا دی اینڈ کر دوں گا۔“ ایڈی نے پستل کی نال کو پوری قوت سے اس کی پشت پر چبھوتے ہوئے دھمکی دی تو اسے اس کے حکم کی تعمیل کرنی پڑی۔

”یہ تم صحیح نہیں کر رہے ہو۔“ تعمیل حکم کے باوجود طارق نے اسے احساس دلانا ضروری سمجھا۔

”میں کیا کر رہا ہوں، بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔“ ایڈی نے سرد مہری سے جواب دیا۔

”اپنے اس عمل پر تمہیں پچھتانا پڑے گا۔“

”میں جانتا ہوں کہ ایسا نہیں ہوگا۔“ طارق کی گیدڑ جھکی کا جواب دیتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر بڑی پراسرار سی مسکراہٹ تھی۔ طارق یہ مسکراہٹ نہ دیکھ سکا بلکہ پھر اس کے دیکھنے کے لیے کچھ بھی باقی نہ بچا کہ ایڈی کے پستل کی نال نے بڑی پھرتی سے اس کی پشت سے سر تک کا سفر طے کیا اور انگلی کی جنبش نے طارق کا کاسٹہ سر توڑ کر اس کے شیطانی دماغ کو ہمیشہ کے لیے تاریکی میں ڈوب جانے پر مجبور کر دیا۔ گولی چلنے کی آواز سے جنگل میں پرندوں نے کہرام مچا دیا۔ بانک کا کنٹرول سنبھالے طارق کا زندگی سے رشتہ منقطع ہوا تو بانک بھی آؤٹ آف کنٹرول ہو گئی اور پیچھے بیٹھا ایڈی بانک کے ایک درخت سے ٹکرانے سے قبل

ہی اڑتا ہوا دور جاگرا۔ گرنے کے نتیجے میں کتنی ہڈیاں ٹوٹیں اور کہاں کہاں درد نے اپنے پنچے گاڑے، یہ حساب لگانے کے لیے اسے مہلت نہیں ملی اور طمانیت کے گہرے احساس کے تحت اس نے آنکھیں موند لیں۔ اس جنگل کی زمین کے نیچے حالت قید میں برسوں پرورش پاتا اس کا وجود اگرچہ یہیں اپنے انجام کو پہنچ رہا تھا لیکن یہ اطمینان تو تھا کہ وہ قیدی کے بجائے آزاد انسان ہے اور بے شک اس کی دنیا میں آمد اس کی مرضی سے نہیں ہوئی تھی لیکن وہ یہاں سے جاتا تو اپنی مرضی سے رہا تھا۔۔۔ اور یہاں سے جانے کا فیصلہ اس نے اس لیے کیا تھا کہ وہ جانتا تھا کہ عام انسانوں کی دنیا میں اس کا وجود بالکل مس فٹ ہے۔ مس فٹ کی حیثیت سے جیتے رہنے کے مقابلے میں یہ کہیں بہتر تھا کہ وہ خود کو فنا کر لیتا۔۔۔ سو اس نے کر لیا تھا۔

☆☆☆

شاہد کے بازو پر سر رکھ کر سوئی ہوئی چاندنی کی آنکھ بالکل اچانک کھلی لیکن کمرے میں چھائے گھپ اندھیرے کی وجہ سے وہ کچھ بھی دیکھنے سے قاصر رہی۔ یکبارگی اسے شدید خوف کا احساس ہوا اور دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ اندازہ لگا چکی تھی کہ وہ لوگ کسی غیر معمولی صورت حال سے دو چار ہو چکے ہیں۔ نیند کے خمار سے نکلنے ہی اسے دو باتوں کا ادراک ہوا تھا۔ اول یہ کہ اس کی آنکھ کسی کھٹکے کے سبب کھلی تھی۔ دوم کمرے میں جلتا زیرو کا بلب خود بخود بند نہیں ہوا تھا بلکہ کسی نے بند کیا تھا۔ خوف کے اس عالم میں اسے کچھ بھائی نہ دیا تو برابر میں سوئے شاہد کو جگانے کا ارادہ کیا لیکن اس سے قبل کہ وہ اپنے اس ارادے پر عمل کر پاتی، ایک آہنی ہاتھ نے اس کے منہ کو دبوج لیا۔ اس نے اضطرابی طور پر خود کو آزاد کروانے کی کوشش کی لیکن پھر فوراً ہی اس کا ذہن تاریکی میں ڈوب گیا۔ حملہ آور نے اسے بے ہوشی کی کوئی دوا سنگھائی تھی۔ بالکل یہی عمل شاہد کے ساتھ بھی کیا گیا تھا۔

دوبارہ ان دونوں کی آنکھ کھلی تو انہوں نے خود کو کاٹھ کباڑ سے بھرے ایک سیلن زدہ کمرے میں ننگے فرش پر بندشوں میں جکڑا ہوا پایا۔

”یہ ہم کہاں ہیں شاہد؟“ اس نے خوف زدہ لہجے میں اپنے شوہر سے پوچھا۔

”مجھے نہیں معلوم۔ میں تو اپنے بستر پر گہری نیند سو رہا ہوا تھا۔ اب آنکھ کھلی ہے تو یہاں ہوں۔“ شاہد اس سے زیادہ الجھا ہوا تھا۔

”مجھے لگتا ہے کہ ہمیں چودھری یا بانی جی کے غنڈوں میں سے کسی نے اغوا کیا ہے۔“ چاندنی نے سہمے ہوئے انداز میں قیاس آرائی کی۔

”تیرا اندازہ بالکل ٹھیک ہے کڑیے۔“ اچانک ہی کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک کیم کیم آدمی پھلتا ہوا اندر داخل ہوا۔ اس آدمی کی شکل ان کے لیے اجنبی تھی لیکن تیور دیکھ کر وہ سمجھ سکتے تھے کہ وہ کس قماش کا آدمی ہے۔ کوٹھے پر گزرے ماہ و سال نے انہیں اتنا تجربہ تو ضرور عطا کیا تھا کہ وہ جان سکیں کہ اس قسم کے غنڈے کسی نہ کسی پیسے والے کے پالتو ہوتے ہیں اور اپنے مالک کے حکم پر دوسرے لوگوں کی ہڈی پہلی توڑنے سے لے کر جان لینے تک ہر کام کر گزرتے ہیں۔

”تم ہم سے کیا چاہتے ہو؟“ آخر کار چاندنی نے ہی ہمت کر کے اس سے دریافت کیا۔

”میں نہیں، میرے آقا چاہتے ہیں کہ تم ان کی راہ سے ہٹ جاؤ۔ اگر تم سیدھی طرح سے اس کے لیے راضی نہیں ہوتے تو میں دو منٹ میں تمہیں ان کی راہ سے ہٹا سکتا ہوں۔“ بولتے بولتے اس کے تیور جارحانہ ہو گئے۔ چاندنی اور شاہد میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ اس کی بات کے جواب میں کچھ کہہ سکتے۔

”پچھلی داری تو ہمارے سگلی انجانے میں چوٹ کھا گئے تھے لیکن اب تم نے دیکھ لیا تا کہ ہم کتنے آرام نال تمہیں تمہارے ٹھکانے سے اٹھالائے ہیں۔ تمہارا وہ چمچر پہرے دار ادھر ہی پڑا سردی کھا رہا ہوگا۔ ہو اگر ہوش آگیا تو دیکھ لے گا کہ ہم کیسے اس دی ناک دے نچے (نیچے) سے تم دونوں کو اٹھالائے ہیں۔“ اس نے اپنی بات سے واضح کر دیا کہ وہ لوگ نہ صرف اس بات سے واقف ہو گئے ہیں کہ ان کی نگرانی کی جارہی ہے بلکہ نگرانی کرنے والے کو ناک آؤٹ کر کے انہوں نے اپنی برتری بھی ثابت کر دی تھی۔

”اب تسی دسو کہ اگر میں تم دونوں کو مار کر تمہاری لاشیں ادھر ہی گاڑ دوں تو کون تمہاری مدد واسطے آئے گا۔ تمہارے پچھلوں کو تو کانوں کان خبر نہیں ہوگی کہ راتوں رات تسی کتنے غائب ہو گئے ہو۔“ وہ اچھی طرح انہیں خوف زدہ کرنے کا فریضہ انجام دے رہا تھا۔

”آخر تم ہم سے چاہتے کیا ہو؟ اگر مارنا ہے تو مار ڈالو، اتنی لمبی تقریر کرنے کی کیا ضرورت ہے؟“ آخر کار شاہد کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور اس نے جھنجھلائے ہوئے لہجے میں کہا لیکن الفاظ کے برعکس اس کے لہجے سے ظاہر تھا

کہ موت کے خیال سے اس کے اعصاب کشیدہ ہو رہے ہیں اور وہ زیادہ دباؤ برداشت کرنے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

”نہ سوچئے نہ۔ اتنی سوہنی جوڑی ہے تساں دی۔ میرا جی نہیں مانتا کہ بھری جوانی میں تمہیں موت دے دوں۔ تمہیں تو ابھی بہت لمبی حیاتی جینا چاہیے۔“ ان سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے وہ خاصا مضحکہ خیز لگ رہا تھا کیونکہ اس کے سخت تاثرات کے ساتھ یہ نرم باتیں کسی طور لگا نہیں کھا رہی تھیں۔

”اگر ہمارے بچنے کی کوئی راہ ہے تو بتاؤ۔“ ذہین چاندنی نے اندازہ لگا لیا کہ انہیں اس طرح اغوا کر کے یہاں لانے اور پھر مذاکرات کرنے کا مقصد یہ نہیں ہے کہ وہ انہیں قتل کرنا چاہتا ہے اس لیے اس کا اصل مقصد جاننے کی کوشش کی۔

”یہ کی ہے نا تو نے عقل مندوں والی گل... تو سن، زندہ رہنے کے لیے تجھے بس اتنا کرنا ہوگا کہ چودھری صاحب اور بانی جی کے خلاف جو پرچہ کٹوایا ہے اسے واپس لے لو اور عدالت سے مافی مانگ لو کہ لوگوں کی چڑھائی میں آ کر تم نے بیکار میں قنون (قانون) کا وقت برباد کیا ہے۔“ وہ فوراً مطلب کی بات پر آگیا جسے سن کر شاہد کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور وہ چبھتے ہوئے لہجے میں بولا۔

”تم چاہتے ہو کہ میں اپنی معصوم بہن کو اذیت ناک موت کا شکار بنانے والوں کو معاف کر دوں؟“

”تو اس کے سوا تیرے پاس چارہ کیا ہے۔ نہیں مانتا میری گل تو نہ مان۔ میں ابھی تم دونوں کا کام تمام کر دیتا ہوں۔ آگے سارا قصہ آپوں آپ ہی ختم ہو جائے گا۔“ وہ فوراً تیور بدل کر درخشنگی سے بولا تو چاندنی نے جلدی سے درمیان میں مداخلت کی۔

”تم ہمیں تھوڑی دیر کی مہلت دے دو بھائی۔ میں اسے سمجھانے کی کوشش کرتی ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔ میں آدھا گھنٹا دے رہا ہوں، دونوں چھٹی کوئی فیصلہ کر لو۔“ وہ شاہد کو قہر بار نظروں سے گھورتا ہوا باہر نکل گیا۔

”کیا تم اپنی جان بچانے کے لیے میری بہن کا خون معاف کر دینا چاہتی ہو چاندنی؟“ شاہد نے درد بھرے لہجے میں اپنی جیون ساتھی سے دریافت کیا۔

”ہمارے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے شاہد۔ اگر ہم نے ان کی بات نہیں مانی تو اپنی جان دینے کے سوا کچھ نہیں کر سکیں گے۔ تمہاری بہن کے قاتل پھر بھی

آزاد گھومتے رہیں گے۔“

”لیکن اس صورت میں میرا ضمیر تو مطمئن رہے گا کہ میں نے اپنی بہن کے خون کا سودا نہیں کیا۔“ چاندنی کی دلیل کے جواب میں وہ جذباتیت سے بولا۔

”جذباتی مت بنو شاہد۔ ایسے ڈائلاگ فلموں اور ڈراموں میں تو اچھے لگتے ہیں لیکن حقیقی زندگی میں بالکل بیکار ہوتے ہیں۔ اتنے سال کوٹھے پر گزارنے کے بعد بھی اگر تم زندگی کی تلخ حقیقتوں کو نہ سمجھ سکے تو اور کب سمجھو گے؟“ چاندنی کا لہجہ خاصا تلخ تھا۔

”آخر تم مجھ سے چاہتی کیا ہو؟“ اس نے بے بسی سے پوچھا۔

”میں تمہارے ساتھ بہت لمبی زندگی جینا چاہتی ہوں۔“ اس نے فوراً لہجے میں نرمی سمولی اور شاہد کا ہاتھ اپنے نرم و گداز ہاتھ میں تھام لیا۔ بندھے ہونے کے باوجود وہ ایک دوسرے کے قریب قریب ہی موجود تھے اس لیے اس عمل میں اسے زیادہ مشکل پیش نہیں آئی۔

”چاہتا تو میں بھی یہی ہوں لیکن اپنی بہن کی درونک موت کا خیال میرے دل سے نہیں نکل سکتا۔“ اس نے اپنی بے بسی کا اظہار کیا۔

”تو میں کب کہہ رہی ہوں کہ تم اس بات کو اپنے دل سے نکال دو لیکن وقت کا تقاضا یہ ہے کہ سب سے پہلے ہم اپنی زندگیوں کو محفوظ کرنے کی کوشش کریں۔ چند سال بعد جب یہ قصہ پرانا ہو جائے گا اور سب کے ذہنوں سے شاہد اور چاندنی کا خیال نکل جائے گا، تب تم کسی تدبیر سے اپنی بہن کے قاتلوں سے بدلہ لے لینا۔“ وہ بہت لگاؤ سے اسے جو سمجھا رہی تھی، موجودہ صورت حال میں سمجھانا زیادہ مشکل بھی نہیں تھا۔

”دیکھو شاہد! کیا تمہیں اچھا نہیں لگے گا کہ ہم یہاں سے کہیں دور ایک دوسرے کے سنگ اچھی اور پرسکون زندگی گزاریں۔ ہمارا ایک چھوٹا سا گھر ہو جس کے آگن میں ہمارے پیارے پیارے بچے کھیلیں اور ہم انہیں زندگی کی وہ ساری خوشیاں دیں جن سے ہم اپنے بچپن میں محروم رہے۔“ مصلحتوں کے بعد خوابوں کے سلسلے نے زبردست کام کیا اور نیم دلی سے دشمن کی بات مان لینے پر غور کرنے والا شاہد کھلی آنکھوں سے دیکھے جانے والے خوابوں کے سنگ چلنے پر پوری طرح رضامند ہو گیا۔

دل میں بہن کے لیے جو ایک کلک سی تھی، اسے بھی یہ سوچ کر دبا دیا کہ وقت آنے پر میں اس کا بدلہ ضرور لوں

گا۔ ادھر اس کے فیصلے پر شاداں و فرحان چاندنی کو یقین تھا کہ ایسا کوئی وقت کبھی نہیں آئے گا اور جب وہ اپنے خوابوں کی دنیا بسا چکے ہوں گے تو شاہد کبھی خود میں اتنا حوصلہ نہیں پائے گا کہ صرف ایک انتقام کی خاطر ان نعمتوں کو ٹھوکر مار کر جاسکے۔ یوں اس رات عدل و انصاف کے لیے کی جانے والی ہر کوشش اس سیلن زدہ کمرے میں فقط اس لیے دم توڑ گئی کہ غریب کی بزدلی اور خود غرضی میں اتنا حوصلہ ہی نہیں تھا کہ اپنے حق کے لیے ڈٹ سکے... اور جہاں حوصلہ نہ ہو، وہاں نظام انصاف قائم ہونا بھی مشکل بلکہ تقریباً ناممکن ہی ہوتا ہے۔

☆☆☆

شہر یار اس حالت میں چھت سے الٹا لٹکا ہوا تھا کہ ایک انڈرویئر کے علاوہ اس کے جسم پر کوئی لباس نہیں تھا اور اس کی نظروں کے عین سامنے بھٹنا گر ایک کرسی پر پاؤں پر پاؤں رکھے بظاہر بہت پرسکون بیٹھا ہوا تھا۔

”میں تم سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں اور پھر کہہ رہا ہوں کہ اپنے جرائم کا اعتراف کرنے کے ساتھ ساتھ سلو کے بارے میں بتا دو تو تمہاری مشکل خاصی آسان ہو سکتی ہے۔“ اس نے بہت دھیمے لہجے میں اپنا وہ مطالبہ دہرایا جو اس سے قبل بھی کئی بار کر چکا تھا۔ بھائی جی والے بنگلے سے اسے گرفتار کرنے سے لے کر اپنے اس ٹھکانے پر لانے تک وہ اسی طرح دھیمے لہجے میں یہ مطالبہ کرتا رہا تھا لیکن اب جو صورت حال تھی، اس سے شہر یار کو بخوبی اندازہ ہو چکا تھا کہ اس کی طرف سے مطلوبہ جواب نہ پا کر وہ اور اس کے ساتھی اسے تختہ مشق بنا کر خوب ستم ڈھائیں گے۔ وہ ذہنی طور پر خود کو اس کے لیے اچھی طرح تیار کر چکا تھا چنانچہ بھٹنا گر ہی کی طرح پرسکون لہجے میں بولا۔

”میں تمہیں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ میں نے کوئی جرم نہیں کیا ہے اس لیے اعتراف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ رہی میرے ساتھی کی بات تو اس کے بارے میں، میں خود کچھ نہیں جانتا تو تمہیں کیسے کچھ بتاؤں۔“

”ٹھیک ہے۔ تم اگر خود اپنے آپ سے ہمدردی نہیں رکھتے ہو تو پھر میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں۔“ بھٹنا گر نے شانے اچکا کر یوں کہا جیسے اسے اس کی بے وقوفی پر افسوس ہو۔ ”او کے تو پھر میں چلتا ہوں کیونکہ میرا یہاں رکنا بیکار ہی ہے۔“ وہ کرسی سے اٹھا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ شہر یار انتظار کرنے لگا کہ دیکھو اب کیا ظہور میں آتا ہے۔ اتنا تو اسے اندازہ تھا کہ بھٹنا گر اپنے اس رویے سے

اس کے اعصاب کشیدہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس کو گرفتار کرنے سے لے کر اب تک کسی نے اس کے ساتھ روایتی مار پیٹ نہیں کی تھی لیکن اس طرح چھت سے الٹا لٹکا کر واضح کر دیا تھا کہ شرافت سے تعاون نہ کرنے کے نتیجے میں اس کا کیا حشر ہو سکتا تھا۔ وہ اپنے اس حشر کے لیے تیار تھا لیکن ان کا مطالبہ نہیں مان سکتا تھا۔ بھٹنا گر کے باہر جانے کے تقریباً دو منٹ بعد ایک لمبا تڑنگا پہلوان نما آدمی اندر داخل ہوا۔ اس پہلوان نے بھی ایک انڈرویئر کے علاوہ کوئی لباس نہیں پہن رکھا تھا اس لیے اس کے مضبوط مسلز کی خوب نمائش ہو رہی تھی۔ ریسلرز کی طرح اس نے اپنے پورے جسم پر تیل نما کوئی ایسی شے لگا رکھی تھی کہ روشنی میں اس کا جسم خوب چمک رہا تھا۔ اس کا سر بھی بالوں سے محروم تھا اور جسم کی طرح ہی چمک رہا تھا۔ چہرے پر داڑھی موچھیں نام کی کوئی شے نہیں تھی، البتہ بھوس خوب گھنی اور چوڑی چوڑی تھیں۔ مجموعی طور پر وہ ایسی شخصیت کا مالک تھا کہ عام آدمی اسے دیکھ کر خواخوہی رعب میں آجائے اور اپنے دل میں فیصلہ کر لے کہ اس پہلوان سے کسی طور نہیں بگاڑنی ہے۔ لیکن شہریار اس سے قطعی متاثر نہیں ہوا۔ یہاں تک کہ اس کے ہاتھ میں موجود خاردار کوڑے کو دیکھ کر بھی اس نے اپنے چہرے کے تاثرات میں کوئی تبدیلی نہیں آنے دی اور یونہی آنکھیں کھولے اسے دیکھتا رہا۔

پہلوان نے بھی زبان سے کچھ نہیں کہا اور اسے ایسی تولنے والی نگاہوں سے دیکھتا رہا جیسے قصائی ذبح کے لیے پیش کیے جانے والے جانور کو دیکھتا ہے۔ چند سیکنڈ تک اچھی طرح شہریار کا جائزہ لینے کے بعد اس کے پتلے پتلے ہونٹوں پر سفاکانہ مسکراہٹ دوڑی اور وہ دھیرے سے بولا۔

”مرغا جان دار ہے۔ مزہ آئے گا۔“ بولنے کے ساتھ ہی اس نے اپنے کوڑے والے ہاتھ کو تیزی سے حرکت دی اور خاردار کوڑا بجلی کی تیزی سے لپکتا ہوا شہریار کے جسم پر آکر لگا۔ کوڑے کی ایک ضرب ہی ایسی تھی کہ شہریار کے جسم میں مرچیں سی بھر گئیں اور وہ جان گیا کہ خاردار دھاتی کوڑے نے اس کے پہلو کی کھال ادھیڑ ڈالی ہے۔ اپنی چیخ پر قابو پانے کے لیے اسے ہونٹوں کو مضبوطی سے بھینچنا پڑا۔ اس کے بعد تو گویا اس پر قیامت ہی ٹوٹ پڑی۔ تابڑ توڑ جسم پر پڑنے والے کوڑوں نے بازو، پیٹ، پیٹھ، پیٹ، سینہ... جسم کا کوئی حصہ نہیں چھوڑا اور لمحوں میں اس کا پورا جسم دھکتے ہوئے انگاروں کی طرح ہو گیا۔ اتنی شدید تکلیف کو برداشت کرنے کے لیے اسے خود پر خاصا جبر

کرنا پڑا تھا۔ چیخوں پر قابو رکھنے کے لیے اس نے ہونٹوں کو اتنی بڑی طرح بھینچا تھا کہ نچلا ہونٹ اپنے ہی دانتوں کی زد میں آکر زخمی ہو گیا تھا اور اس سے خون رسنے لگا تھا۔ خون تو جسم کے باقی حصوں سے بھی رس رہا تھا کہ خاردار کوڑے نے اس کے پورے جسم کو ہی بڑی طرح ادھیڑ ڈالا تھا۔

”بہت جان ہے تجھ میں۔ ابھی پتا چل جائے گا کہ کتنے پانی میں ہے۔“ پہلوان نے اس کے بالوں کو مٹھی میں بھینچ کر زور سے جھٹکا دیا اور نفرت بھرے لہجے میں بولتا ہوا ایک شیلف پر پڑا ڈبا اٹھانے لگا۔ شہریار کی نظروں نے جہاں تک کام کیا تھا، اس سے یہی اندازہ ہوا تھا کہ یہ کمرابطور خاص عقوبت گاہ کے طور پر ہی استعمال ہوتا ہوگا۔ وہاں دیواروں پر ایسے کئی خونناک ہتھیار لٹکے ہوئے تھے جو موجودہ زمانے میں تو متروک ہو چکے تھے، البتہ ماضی میں کئی ظالم و جابر بادشاہوں اور راجاؤں کے ہاں ان کے استعمال کی مثالیں ملتی تھیں۔ وہاں دیوار گیر الماریاں بھی تھیں اور جانے ان میں کون کون سے آلات ستم بھرے ہوئے تھے۔ فی الحال تو وہ پہلوان کو درمیانے سائز کا وہ ڈبا کھولتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ ڈبے کا ڈھکن ہٹا کر وہ اس کے قریب آیا اور ہاتھ اندر ڈال کر ڈبے میں موجود شے باہر نکالی۔ اگلے ہی لمحے شہریار کے زخموں میں آگ سی لگ چکی تھی۔ پہلوان نے ڈبے میں سے سرخ پسپی ہوئی مرچوں اور نمک کا سفوف نکال کر اس کے زخموں پر ملنا شروع کر دیا تھا۔ ضبط کے باوجود شہریار کے لبوں سے ایک سسکاری نکل گئی جس پر پہلوان قہقہہ لگا کر ہنسا اور مٹھیاں بھر بھر کر سفوف اس کے جسم پر ملنے کا عمل جاری رکھتے ہوئے بولا۔

”صاحب کو روست کیا ہوا بکرا بہت پسند ہے۔ پہلے تجھے اچھی طرح مرچ مسالا لگا دوں پھر روست بھی کر دوں گا۔“ اپنی اس بات پر اس نے اس طرح عمل کیا کہ نمک مرچ کا مکھر اچھی طرح اس کے جسم پر ملنے کے بعد ایک الماری کھول کر اس میں سے انگلیٹھی نکالی۔ انگلیٹھی ربر کے پائپ کے ساتھ ایک گیس سیلنڈر سے منسلک تھی۔ بے حد برداشت رکھنے کے باوجود شہریار ایک لمحے کو تھرا سا گیا۔ پہلوان سچ مچ اسے روست کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ کمال یہ تھا کہ تشدد کے اس عمل کے دوران اس نے ایک بار بھی اس سے کوئی سوال نہیں کیا تھا اور یوں لگتا تھا کہ اسے کچھ جاننے سے زیادہ اس بات میں دلچسپی ہے کہ ہاتھ آئے شکار کو کس طرح زیادہ سے زیادہ اذیت دے سکتا ہے۔

شہریار جس تکلیف سے گزر رہا تھا، اس کی شدت کو

شہریار کے سر کے نیچے سے ہٹا کر بچا دی۔

”چل بھئی، تو تھوڑی دیر اور جی لے۔ میں ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد آ کر پھر اپنا کام کرتا ہوں۔ صاحب کو بج پر گرما گرم تازہ روسٹ ملے، یہ بہت ضروری ہے ورنہ وہ میرا ہی روسٹ بنا کر رکھ دیں گے۔“ انگلیٹھی اور سیلنڈر ایک طرف ہٹا کر رکھتے ہوئے پہلوان نے اس سے کہا اور پھر اپنے ساتھی سمیت باہر نکل گیا۔

چھت سے اٹھنے لگے شہریار نے بے اختیار سکون کی ایک سانس لی۔ تکلیف جسم کے ہر مسام میں سے ابل رہی تھی لیکن عین سر کے نیچے جلتی آگ کے ہٹنے سے اذیت میں کچھ کمی ہو گئی تھی۔ اس آگ نے تو اس کے جسم کا سارا پانی پسینے کی صورت میں بہا ڈالا تھا اور وہ شدید پیاس محسوس کر رہا تھا لیکن جانتا تھا کہ یہاں کسی سے ایک گھونٹ پانی کا سوال ان کے مظالم کو اور بڑھا دے گا۔ وہ فی الحال اسے جان سے نہیں مار سکتے تھے کہ اس کی زبان سے بہت کچھ سننے کے خواہش مند تھے لیکن ان حربوں سے اس کے اعصاب کو توڑ دینا چاہتے تھے۔ اعصاب کی اس جنگ میں وہ کب تک ان کے سامنے ٹھہر سکتا تھا، اسے خود بھی نہیں معلوم تھا۔ لیکن پہلے مرحلے سے کامیابی سے گزر جانے پر دل میں اللہ کا شکر گزار ضرور ہوا تھا۔ شکر گزار وہ اس بات پر بھی تھا کہ درپیش مہم کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے اس نے اپنی اہم چیزیں اپنے پاس نہیں رکھی تھیں اور اشوک کے قتل کے لیے نکلنے سے قبل سب کچھ امانتاً ڈاکٹر فرحان کے پاس رکھوا دیا تھا اور ڈاکٹر فرحان فی الحال بھائی جی کی پناہ میں حفاظت سے تھے۔ اسے معلوم تھا کہ جو کچھ اس پر گزری ہے، آگے اس سے بھی کڑے مراحل سے گزرنا ہوگا۔ ان مراحل کے لیے اللہ سے ہمت اور استقامت کی دعا مانگتے ہوئے وہ کب مد ہوش ہوا، اسے خبر نہیں ہو سکی۔ جتنی تکلیف سے وہ گزرا تھا اصولاً تو اسے بہت پہلے ہی بے ہوش ہو جانا چاہیے تھا لیکن مضبوط قوت ارادی نے یہ عیاشی بھی مشکل سے عطا کی تھی۔ اس اذیت ناک صورت حال میں بے ہوش ہو جانا بھی عیاشی ہی کے زمرے میں آتا تھا۔

☆☆☆

”تم سے مل کر خوشی ہوئی مسٹر پانڈے۔“ ڈیوڈ نے بہت تپاک سے اپنے استقبال کے لیے کھڑے پانڈے سے ہاتھ ملایا۔

”مجھے بھی...“ پانڈے نے مسکراتے ہوئے اسے جواب دیا لیکن اس کی آنکھوں میں موجود الجھن اور حیرت

خود ہی جانتا تھا۔ اس کے جسم کا ایک ایک مسام دہائی دے رہا تھا اور وہ کسی کے سامنے فریاد نہیں کر سکتا تھا کیونکہ فریاد کرنے کا مطلب تھا، اپنی ہار تسلیم کر لینا اور وہ سب بتانے پر رضامندی ظاہر کرنا جو بہر حال وہ اپنی جان کی قیمت پر بھی نہیں بتا سکتا تھا۔

زندگی کے اس پہلے بدترین تشدد سے گزرتے ہوئے اس کے مساموں سے پسینا پھوٹ پڑا تھا۔ پسینا پسینے کی رفتار میں اس وقت مزید اضافہ ہو گیا جب پہلوان نے انگلیٹھی جلا کر عین اس کے سر کے نیچے رکھ دی۔ انگلیٹھی اور اس کے سر کے درمیان ایک فٹ سے زیادہ فاصلہ نہیں تھا۔ اگر آج تیز ہوتی تو اس کے بالوں کو اپنی گرفت میں لے سکتی تھی لیکن فی الحال پہلوان نے آج دھیمی رکھی تھی اور وہ اپنے سر پر اس کی حدت محسوس کر رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں اس کا چہرہ اور سر کے بال حدت کی وجہ سے پسینے سے تر ہو گئے اور پسینے کے قطرے چھن چھن کرتے آگ پر جا کر گرنے لگے۔

”صاحب کو دھیمی آج پر تیار کیا روسٹ بہت پسند ہے۔“ پہلوان نے ایک اور بھیا تک قہقہہ لگا کر اسے یوں اطلاع دی جیسے واقعی وہ اس کے صاحب کی پسند و ناپسند جاننے میں دلچسپی رکھتا ہو۔ حالانکہ وہ تو اس اذیت کو برداشت کرنے کی جدوجہد کر رہا تھا جو اس کی بصارت کو بار بار دھندلائے دے رہی تھی لیکن وہ جانتا تھا کہ یہ اذیت ایسی ہے جو اسے بے ہوش بھی نہیں ہونے دے گی اور اسے شاید اپنی آخری سانس تک رگ رگ میں اتر جانے والی اس تکلیف کو سہنا ہوگا۔

”یہ کیا کر رہے ہو یار؟“ اس کی کھوپڑی کے اندر دماغ گویا ابلنے لگا تھا جب اس نے کسی کی حیرت زدہ آواز سنی اور آواز کی سمت میں دیکھنا چاہا لیکن بے تحاشا تکلیف اور مسلسل آنکھوں پر بہہ کر آتے پسینے کی وجہ سے دھندلا جانے والی بصارت کے باعث ایک ہیولے کے سوا کچھ نہیں دیکھ سکا۔ اسے تو یہ بھی پتا نہیں چلا تھا کہ یہ شخص کب اندر آیا ہے۔

”صاحب کے لیے روسٹ تیار کر رہا ہوں۔“ پہلوان نے نہایت سنجیدگی سے نودارد کو جواب دیا۔

”تو بھی نامونی بدھی کا ہے پہلوان۔“ لٹچ نامم ہونے میں ابھی بہت دیر ہے۔ ابھی سے روسٹ بنا کر رکھ دے گا تو ٹھنڈا ہو جائے گا نا۔“

”اچھا تو پھر تھوڑے سے کے لیے رک جاتا ہوں۔“ پہلوان گویا اپنے ساتھی کی دلیل سے قائل ہو گیا اور انگلیٹھی

کی تحریر ڈیوڈ بخوبی محسوس کر سکتا تھا۔ را کے اس مقامی سربراہ کے لیے یقیناً یہ پیغام حیران کن رہا ہوگا کہ موساد کا کوئی اہم ذمہ دار اس سے ملاقات کرنا چاہتا ہے۔ بہر حال اس نے ملاقات پر رضامندی ظاہر کر کے ملاقات کی جگہ کا تعین کر دیا تھا۔ اس ملاقات میں پانڈے کی حیثیت میزبان کی تھی، چنانچہ وہ فائیو اسٹار ہوٹل کے اس شاندار سوئٹ میں طے شدہ وقت سے پہلے پہنچ گیا تھا اور ڈیوڈ کا سوئٹ کے دروازے پر استقبال کیا تھا۔ یہ دونوں ملاقات تھی اس لیے سوئٹ میں پانڈے کے ہمراہ اس کا کوئی ساتھی موجود نہیں تھا۔ البتہ اس کے یہاں پہنچنے سے قبل دو ماہرین نے سوئٹ کا ہر طرح سے جائزہ لینے کے بعد اسے سکیورٹی کے اعتبار سے کلیئر قرار دینے کے ساتھ ساتھ اس بات کی بھی یقین دہانی کروادی تھی کہ وہاں ہونے والی گفتگو کے لیک ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ اب بھی اس کے نصف درجن کے قریب ماتحت سوئٹ کے آس پاس اور ہوٹل کے داخلی و خارجی راستوں پر موجود تھے اور ہر شے پر بھرپور نظر رکھے ہوئے تھے۔

بظاہر ڈیوڈ وہاں اکیلا آیا تھا لیکن قیاس کیا جاسکتا تھا کہ اس کی حفاظت کے لیے بھی وہاں کچھ آدمی خفیہ طور پر موجود ہوں گے۔ ان دونوں گروہوں کو ایک دوسرے سے کوئی خطرہ نہیں تھا لیکن پاکستان کو نہایت حقیر جاننے کے باوجود وہ اس کی خفیہ ایجنسیوں سے خوف زدہ تھے اور اس خوف کے سبب ہی انہوں نے اس ملاقات کے موقع پر اپنی اپنی حفاظت کا انتظام کر رکھا تھا۔

”آپ کی میزبانی کا آرزو پا کر مجھے بہت خوشی ہو رہی ہے اور اس خوشی کو دوبالا کرنے کے لیے میں نے اس بہت پرانی اور قیمتی وائن کا انتظام کیا ہے۔“ مصافحے کے بعد پانڈے اسے اپنے ساتھ اندر لے آیا اور وہ دونوں دبیز اور بیش قیمت صوفوں پر ایک دوسرے کے روبرو بیٹھ چکے تو پانڈے نے کرشل کے نازک جام میں اس کے لیے وائن نکالتے ہوئے خوشامدی لہجے میں کہا۔

اسے معلوم تھا کہ موساد جیسی تنظیم کی طرف سے ملنے والا ملاقات کا پیغام خالی از علت نہیں ہے اور وہ ملاقات کے لیے آنے والے نمائندے کو زیادہ سے زیادہ خوش کر کے شیشے میں اتار لینا چاہتا تھا۔ یوں بھی ان دنوں حالات ان کے لیے بالکل بھی سازگار نہیں تھے۔ پچھلے کافی عرصے سے را، پاکستان میں اپنے کسی بھی اہم مشن میں کامیاب نہیں ہو سکی تھی اور الٹا انہیں ہی اپنے کئی اہم ساتھیوں سے ہاتھ دھونا پڑا تھا۔ ان ساتھیوں میں درما، سنٹھیا اور ڈاکٹر ماریہ

قابل ذکر تھے اور سنٹھیا کی موت کے بعد سے تو وہ خود کو زیادہ ہی تنہا محسوس کرنے لگا تھا کیونکہ اب ساری ذمے داری اس کے شانوں پر ہی آگئی تھی اور حالات اتنے خراب تھے کہ وہ اپنے اہم ساتھیوں کے ساتھ ساتھ کئی اہم ٹھکانوں سے بھی محروم ہو گئے تھے۔ خواجہ سراؤں والا سیٹ اپ بھی بگڑ گیا تھا اور ان مشکل حالات میں انہیں یہاں اپنی کارروائیاں جاری رکھنے میں دشواری کا سامنا تھا۔

”لاجواب۔“ ڈیوڈ نے اس کی پیش کردہ وائن کا پہلا گھونٹ لیا اور بے ساختہ انداز میں تعریف کی۔ اس تعریف پر پانڈے کا چہرہ کھل اٹھا۔

”ٹائم کم ہے اس لیے کام کی بات بھی ساتھ ساتھ کرتے جاتے ہیں۔“ ڈیوڈ بہت تیزی سے مطلب کی بات پر آگیا۔

”شیور۔“ پانڈے کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔

”میں اور میری تنظیم کا ہر فرد جانتا ہے کہ آج کل را کو پاکستان میں کن مشکلات کا سامنا ہے۔ پچھلے عرصے میں تم لوگوں کو قریب قریب ہر مشن میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا ہے اور اپنے کئی اہم ساتھیوں کو بھی کھونا پڑا ہے۔ میں زیادہ تفصیل میں نہیں جانا چاہتا اس لیے صرف ایک حالیہ ناکامی کا ذکر کروں گا۔ بھارت کے اشوک اور یہاں کے چودھری افتخار کے ذریعے اسلحہ اور بارود کی ایک اہم ڈیل کی گئی تھی اور ڈیلیوری ہونے ہی والی تھی کہ پاکستان کی خفیہ ایجنسیاں اس معاملے میں کود پڑیں۔ نتیجے میں بھارت کو یہ زوردار طمانچہ کھانا پڑا کہ وہ اسلحہ و بارود بھارت کی حدود میں ہی تباہ کر دیا گیا اور بھارتی حکام ایسا کوئی ٹھوس ثبوت بھی حاصل کرنے میں ناکام رہے کہ الزام پاکستان کے سر رکھ سکیں۔“

ڈیوڈ کی معلومات پانڈے کو حیران کر رہی تھیں کیونکہ جس واقعے کا اس نے حوالہ دیا تھا، اس کو گزرے پورے چوبیس گھنٹے بھی نہیں گزرے تھے اور خود ان کی اپنی تحقیقات بھی ادھوری تھیں۔ اسے کیا معلوم تھا کہ موساد ہمیشہ سے ڈیل گیم کھیل رہی تھی اور بظاہر جس ڈیل کا تعلق ان سے تھا، اس کی اصل ڈوریاں تو موساد کے ہاتھ میں ہی تھیں۔ اشوک اور چودھری دونوں موساد ہی کے تو مہرے تھے لیکن اشوک کے ذریعے را کو اس غلط فہمی میں مبتلا کیا گیا تھا کہ اس نے عیاشی کی غرض سے بھارت آئے ہوئے پاکستانی وڈیرے کو اپنے جال میں پھانس کر اس ڈیل کے لیے رضامند کر لیا ہے۔

”میرا مقصد تمہیں بے عزت کرنا نہیں ہے۔ اصل

گرداب

مدارس اور مدرس موجود ہیں لیکن جمال پورہ میں ہماری دلچسپی کا سبب یہ ہے کہ اس گاؤں سے پاکستان کا ایک اہم ارباب بہت قریب ہے اور ہم وہاں کارروائی کرنا چاہتے ہیں۔

ڈیوڈ کا ارادہ جان کر پہلے تو پانڈے کا منہ حیرت سے کھلا لیکن اگلے ہی پل آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔ وہ سمجھ سکتا تھا کہ ارباب پر ڈیوڈ کیا کارروائی کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اگر وہ اپنے ارادے میں کامیاب ہو جاتا تو وہ واقعی پاکستان کو ایک کاری ضرب لگانے میں کامیاب ہو جاتے۔

”اس مشن میں ہمارے اور تمہارے منتخب کمانڈوز حصہ لیں گے۔ ساری معلومات اور مشن میں کام آنے والا ساز و سامان ہماری طرف سے مہیا کیا جائے گا اور تمہارا اصل کام یہ ہوگا کہ ہمیں مدرسے کے ذریعے کور فراہم کرتے رہو۔ اس کے لیے سب سے پہلا قدم تو یہ اٹھانا ہوگا کہ مدرسے کا منتظم اعلان کرے کہ کچھ خیر حضرات کے تعاون سے مدرسے کی توسیع کا فیصلہ کیا گیا ہے اور اس توسیعی منصوبے کے فوری آغاز کے لیے ہمیں مع ساز و سامان کے جمال پورہ آرہی ہیں۔ اس طرح ہم اپنے مطلب کے بندے اور سامان آسانی سے وہاں پہنچا دیں گے۔“ ڈیوڈ نے اپنا منصوبہ واضح کیا تو پانڈے کی آنکھوں کی چمک مزید بڑھ گئی اور وقتی طور پر وہ یہ تک فراموش کر بیٹھا کہ ڈیوڈ کی اپنے بارے میں معلومات نے اسے کتنا کبیدہ خاطر کیا تھا۔

”اس منصوبے پر کب عمل کیا جائے گا؟“ اس نے اشتیاق سے پوچھا۔

”فائل ڈیٹ میں فی الحال نہیں دے سکتا۔ تم ہفتہ آٹھ دن کا عرصہ سمجھ لو لیکن اپنی تیاری ایسے کرو جیسے چار دن بعد ہی ایکشن لینا ہو۔ ہمارا ہوم ورک مکمل ہے اور میرے کمانڈوز چند گھنٹے کے نوٹس پر بھی ایکشن لے سکتے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے جب تک پلان کا وہ حصہ مکمل نہیں ہو جاتا جس کا تعلق تم لوگوں سے ہے، ہم آگے نہیں بڑھ سکتے۔“ ڈیوڈ نے اس پر صورت حال واضح کی۔

”یہ ایک اچھا منصوبہ ہے لیکن ظاہر ہے میں اوپر والوں سے ڈسکس کیے بغیر آپ کو کوئی فائل جواب نہیں دے سکتا۔“ پانڈے جانتا تھا کہ موجودہ حالات میں یہ پکا پکایا منصوبہ ان کے لیے کتنا خوش کن ہے لیکن اس موڑ پر آ کر جہاں اسے اس منصوبے میں را کی کلیدی حیثیت کا احساس ہو گیا تھا، وہ ایک دم پینتر ابدل کیا اور اپنی فوری رضامندی کا اظہار کرنے سے گریز کیا۔

”میرے خیال میں مسٹر پانڈے، تم اس معاملے کو

میں ہم ایک ہی کشتی کے سوار ہیں اور پچھلے عرصے میں ہمیں بھی یہاں کچھ ناکامیوں کا منہ دیکھنا پڑا ہے۔“ یہ اعتراف کرتے ہوئے ڈیوڈ کے دل میں ماریا اور سنجھیا کی موت کا کرب تھا۔ بظاہر اس کے ساتھ کام کرنے والی یہ دونوں ماں بیٹیاں اصل میں تو ان کی ہی مخلص ساتھی تھیں۔

”اوہ...“ پانڈے نے اس کے اعتراف پر تبصرہ کرنے کے بجائے ہونٹ سیڑ کر محض اپنے تعجب کا اظہار کیا۔ ”یہ سچ ہے اور اسی لیے فیصلہ کیا گیا ہے کہ اپنی اپنی ناکامیوں کا بدلہ لینے کے لیے اہم اکٹھے ہو کر پاکستان کو ایسا بھرپور جواب دیں کہ اس کے حکمران اور عوام برسوں بلبلاتے رہیں۔“ ڈیوڈ کی آنکھوں میں یہ عزم ظاہر کرتے ہوئے بلا کی سفاکی اور نفرت تھی۔

”کیا میں آپ کے پلان کے بارے میں کچھ جان سکتا ہوں؟“ پانڈے الرٹ ہو کر بیٹھ گیا۔

”بالکل... کیونکہ ہم نے جو پلان تیار کیا ہے، اس میں ایک خاص سبب سے تمہارے ادارے کا ہی رول ہوگا۔“

”اچھا، وہ کیسے؟“ ڈیوڈ کی بات سن کر اس نے اشتیاق کا اظہار کیا۔

”ہماری انفارمیشن کے مطابق ایک نواحی گاؤں جمال پورہ میں تمہارا ایک مدرسہ کام کر رہا ہے اور اس مدرسے کی انتظامیہ کا جمال پورہ کے علاوہ ارد گرد کے دوسرے دیہاتوں میں بھی اتنا اثر رسوخ ہے کہ مدرسے کے منتظم کی طرف سے کیے جانے والے کسی اعلان یا کارروائی پر کوئی شخص ذرا بھی اعتراض نہیں کرتا اور مدرسے کے عملے کے ساتھ وہاں آنے والے مہمانوں کو بھی لائق احترام سمجھا جاتا ہے۔“ ڈیوڈ کی زبانی یہ سب سن کر پانڈے کے چہرے پر ایک رنگ سادوڑ گیا۔ یہ ایسی معلومات نہیں تھیں جو ہر کس و ناکس کے علم میں ہوتیں۔ مرکز کے علاوہ یہاں کام کرنے والے را کے مقامی عہدے داروں میں سے بس کتنی کے چند بڑوں کو ہی اس راز کا علم تھا اور ڈیوڈ کی زبانی یہ سب سن کر اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ موساد نے ان کی تنظیم میں بہت اوپر تک جگہ بنا رکھی ہے۔ موساد کے اس کردار پر تشویش اور ناگواری محسوس کرنے کے باوجود اس نے اپنے جذبات کا اظہار نہیں کیا اور کچھ خفت زدہ سا سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

”ہمیں معلوم ہے کہ جمال پورہ کے علاوہ بھی بہت سے گاؤں دیہاتوں میں چھوٹے بڑے پیمانے پر تمہارے

صحیح طور پر سمجھے نہیں ہو۔ میں تم سے ملاقات کے لیے آیا ہوں تو صرف اس لیے کہ تم مقامی انچارج ہونے کی حیثیت سے یہاں کے معاملات میں مجھ سے کوآپریٹ کر سکتے ہو ورنہ ظاہر ہے کہ اصل منظوری تو ہم تمہارے بڑوں کے ساتھ ڈسکس کر کے حاصل کر چکے ہیں۔“ ڈیوڈ نے سرد لہجے میں کہتے ہوئے ایک منٹ میں اسے اس کی اوقات یاد دلادی اور پانڈے کو فوری طور پر یاد آگیا کہ اوپر سے اسے موساد کے نمائندے سے بھرپور تعاون کی ہدایت کی گئی تھی۔

”اوکے، میں ہر طرح کی خدمت کے لیے حاضر ہوں۔“ وہ بالکل سیدھا ہو گیا۔

”ابھی اپنے کمانڈوز کو تیار کرو۔ باقی ہدایات بھی وقتاً فوقتاً تمہیں ملتی رہیں گی اور ساتھ ساتھ ہمارے درمیان منصوبے کی جزئیات بھی طے ہوتی رہیں گی۔ میں ضرورت پڑنے پر خود تم سے رابطہ کرتا رہوں گا۔“ ڈیوڈ یکدم ہی وہاں سے روانگی کے لیے کھڑا ہو گیا۔ پانڈے نے بھی ہڑبڑا کر اس کی تقلید کی۔

”اوکے، سی یو۔“ نپے تلے انداز میں یہ الفاظ کہتے ہوئے اس نے پانڈے سے الوداعی مصافحہ کیا تو انداز میں واضح احساس برتری تھا۔ پانڈے کو اندازہ ہو گیا کہ اس معاملے میں بہت اچھی پوزیشن پر ہونے کے باوجود وہ اسے اپنے زیر اثر لانے میں ناکام رہا ہے اور اس ناکامی پر فی الحال وہ مٹھیاں بھینچے اسے جاتا ہوا دیکھنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

☆☆☆

ماہ بانو کی حالت بہت خراب تھی۔ اس کے لیے قدم اٹھانا دشوار ہو رہا تھا پھر بھی وہ اپنے وجود میں سانس لیتی تھی جان کے لیے ہمت کر رہی تھی۔ ذہنی، قلبی اور جسمانی تینوں اعتبار سے اسے شدید تکلیف سے گزرنا پڑ رہا تھا۔ اپنے اغوا سے لے کر لیبارٹری کے پریش کرے میں قیام اور پھر وہاں سے فرار کے مراحل میں وہ جس اعصابی دباؤ کا شکار رہی تھی، اس سے خود ہی واقف تھی۔ اسلم کے ہنری سمیت دلدل میں گرنے کا منظر رہ رہ کر اس کی آنکھوں کے سامنے آ رہا تھا اور دل میں تکلیف کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ اسے یاد آ رہا تھا کہ اسلم اس کے ماں بننے کی خبر سن کر کتنا خوش ہوا تھا اور بالکل چھوٹی موٹی کی طرح اس کی حفاظت کرتا تھا۔ اس کی خواہش ہوتی تھی کہ ماہ بانو کو ذرا بھی تکلیف نہ اٹھانی پڑے لیکن اس کی یہ خواہش پوری نہیں ہو سکی تھی۔ دکھ اور جسمانی تکلیف دونوں سے لڑتی ماہ بانو اس وقت بالکل تنہا

زندگی کی تلاش میں سرگرداں تھی۔

اسے یہ زندگی اپنے لیے نہیں بلکہ اسلم کی محبت کی نشانی بچانے کے لیے درکار تھی اور اسی لگن میں وہ اپنے پھوڑے کی طرح دکتے جسم کو کسی نہ کسی طرح گھسیٹ رہی تھی۔ پاؤں کی موج کی وجہ سے یہ عمل اور بھی زیادہ تکلیف دہ ہو گیا تھا پھر بھی اس نے اپنی کوشش ترک نہیں کی تھی۔ جنگل میں سفر کرتے ہوئے اس کے ہاتھ پیروں اور چہرے پر کئی خراشیں آئی تھیں اور کہیں کہیں سے لباس بھی پھٹ گیا تھا۔ اس کے پیروں میں جوتے نہیں تھے اور بالوں میں خاک اڑ رہی تھی۔ رہی سہی کسر ان آنسوؤں نے پوری کر دی تھی جس کے مسلسل بہنے پر اس کا کوئی زور نہیں تھا۔ بس وہ اتنا کرتی تھی کہ جب ان آنسوؤں کے سبب آنکھیں بالکل دھندلا جاتی تھیں اور سامنے کا منظر نظر آنا بند ہو جاتا تھا تو وہ ہاتھوں کی پشت سے بیدردی سے اپنی آنکھیں رگڑ ڈالتی تھی۔

وہ اب جنگل کے قریب سے گزرتی سڑک تک پہنچ چکی تھی اور دل میں یہ امید پیدا ہو گئی تھی کہ کوئی نہ کوئی انسانی مدد مل جائے گی لیکن بہر حال اسے ان آنسوؤں پر اب بھی کوئی قابو نہیں تھا جو اس کی بصارت کو دھندلائے دے رہے تھے۔ دھند کی اس چادر کو اپنے سامنے سے ہٹانے کے لیے اس نے ایک بار پھر ہتھیلی کی پشت سے رگڑا تو اسے سڑک کے کنارے کھڑی ایک گاڑی نظر آگئی۔ وہ گاڑی اس سے خاصے فاصلے پر تھی لیکن جتنا سفر وہ طے کر چکی تھی اس کے مقابلے میں یہ راستہ کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ میکانیکی انداز میں اس طرف بڑھنے لگی۔ چند قدم مزید آگے چلنے پر اسے وہ آدمی نظر آگیا جو کار سے کچھ فاصلے پر اپنی آنکھوں سے کیمرا لگائے کھٹاکٹ تصویریں کھینچ رہا تھا۔

آرلینڈو کی خوب صورتی میں کوئی کلام نہیں تھا۔ یہاں پائے جانے والے قدرتی مناظر نئے آنے والوں کے قدم باندھ لیتے تھے۔ وہ بھی یقیناً کوئی نووارد تھا جو دنیا و مافیہا سے بے خبر تصویر کشی میں مصروف تھا۔ ماہ بانو نے دیکھا کہ وہ ایک درخت کی شاخ پر بیٹھے ایسے پیچھے کی تصویر لینے کی کوشش کر رہا ہے جو اپنے سر پر موجود تاج اور قوس قزح کے رنگوں جیسے پروں کے باعث کسی ریاست کے شہزادے جیسی تمکنت رکھتا ہے۔ اس پرندے کی تصویر لینے کے لیے صحیح زاویہ بنانے کی خاطر اس نے دو قدم پیچھے ہٹ کر پنجنوں کے بل بیٹھنے کی کوشش کی تو ایک ناگہانی سے دو چار ہو گیا۔ وہ ایک سیاہ رنگ کا چمکتا ہوا سانپ تھا جو مزے سے وہیں سڑک پر محو استراحت تھا۔ آدمی کے پیچھے ہٹنے پر اس کا پیر سانپ کی

گرداب

”مجھے لگتا ہے کہ میں بہتر ہوں لیکن مجھے آپ کی حالت ٹھیک نہیں لگ رہی۔ ہم کسی اسپتال چلتے ہیں۔ وہاں مجھے اور آپ کو بہتر ٹریٹمنٹ مل سکتا ہے۔“ اجنبی جو اس دوران میں اس کی ناگفتہ بہ حالت کا جائزہ لے چکا تھا، نرم اور ہمدردانہ لہجے میں بولا لیکن اس کی اس پیشکش نے ماہ بانو کو متوحش کر دیا۔ جو حالات اس کے سامنے آئے تھے، ان سے کچھ کچھ اندازہ ہو گیا تھا کہ اس قسم کی تجربہ گاہ حکومت کی سرپرستی کے بغیر قائم ہونا مشکل تھا اور اگر وہ کسی اسپتال جاتی تو تجربہ گاہ کی تباہی اور جنگل کی آگ کے سلسلے میں تحقیقات کرنے والے بہ آسانی اس تک رسائی حاصل کر سکتے تھے۔ چنانچہ خود کو طبی امداد کی شدید ضرورت محسوس کرنے کے باوجود وہ اسپتال جانے سے گریزاں تھی۔

”کیا بات ہے، آپ اتنی خوف زدہ کیوں نظر آرہی ہیں؟“ اس کے چہرے کے بدلتے تاثرات کو محسوس کر کے اجنبی نے پوچھا۔

”میں کچھ وجوہات کی بنا پر اسپتال نہیں جاسکتی البتہ اگر آپ مجھے میرے دوستوں تک پہنچا دیں اور اس بات کا کسی سے ذکر نہ کریں تو آپ کا مجھ پر یہ بہت بڑا احسان ہو گا۔“ اس نے نہایت لجاجت سے اس سے درخواست کی تو وہ حیرت زدہ سا اسے دیکھ کر رہ گیا۔ وہ جس حالت میں نظر آرہی تھی، یہ صاف ظاہر تھا کہ اسے فوری طور پر طبی امداد کی ضرورت ہے لیکن وہ اسپتال جانے سے گریزاں تھی۔

اس نے غور سے ایک بار پھر اس کا جائزہ لیا۔ عموماً کسی جرم میں ملوث افراد اسپتال جانے سے گریز کرتے ہیں کہ پولیس کے گھیرے میں نہ آجائیں لیکن ماہ بانو کے چہرے کی ملاحظت اور معصومیت اسے کسی طرح مجرم ظاہر نہیں کر رہی تھی بلکہ اپنی ابتر حالت اور چہرے پر موجود مسلسل گریہ کے آثار سے تو وہ اسے کوئی مصیبت زدہ معلوم ہوتی تھی۔

”اوکے، جہاں آپ چاہیں میں آپ کو وہاں چھوڑ دیتا ہوں۔“ اس نے یکدم ہی ماہ بانو کی مدد کا فیصلہ کر لیا اور اسے سہارا دے کر اپنی گاڑی میں بٹھایا۔۔۔ کیونکہ اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس کی زندگی بچانے کی کوشش کرنے والی خود کہیں زیادہ تکلیف میں ہے۔ گاڑی میں بیٹھ جانے کے بعد ماہ بانو نے اسے آفتاب اور کشور کے گھر کا پتا بتایا۔ مصطفیٰ خان کے گھر نہ جانے کا فیصلہ اس نے جان بوجھ کر کیا تھا کیونکہ اسے ڈر تھا کہ اگر اس کی تلاش کا سلسلہ شروع ہو تو تلاش کرنے والے سب سے پہلے وہیں کا رخ کریں گے۔

”دم پر جا پڑا اور رد عمل میں سانپ نے بجلی کی طرح تڑپ کر اس کی پنڈلی پر ڈس لیا۔ آدمی بری طرح بدکا اور سانپ کو تیزی سے جھاڑیوں میں گم ہوتا دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ یہ پورا واقعہ بہت تیزی سے پیش آیا تھا اور ایک چشم دید گواہ کی حیثیت سے ماہ بانو بھی پل بھر کے لیے بھوچکی رہ گئی تھی۔ لیکن اگلے ہی لمحے اس کے اندر کی وہ ماہ بانو جاگ اٹھی جو سارے جہاں کا درد اپنے دل میں لیے حتی المقدور دوسروں کے کام آنے کی کوشش کرتی تھی۔

ان لمحات میں اسے اپنے سارے دکھ اور تکلیفیں بھول گئی تھیں اور وہ اس شخص کی مدد کرنے کی خواہاں تھی۔ چنانچہ اس نے اپنی تکلیف اور جسم میں اٹھتی ٹیسوں کو نظر انداز کر کے تیزی سے درمیانی فاصلہ طے کیا اور اس شخص کے قریب جا پہنچی جس نے اس دوران فوری شاک سے سنبھل کر اپنے متاثرہ پاؤں کا جوتا اتار لیا تھا اور پتلون کے پانچے چڑھائے پنڈلی پر موجود سانپ کے دانتوں کا نشان دیکھ رہا تھا۔

”جلدی سے اپنی ٹائی کھولے۔“ ماہ بانو نے چیخ کر اسے ہدایت دی تو پہلی بار وہ اس کی وہاں موجودگی سے واقف ہوا تاہم ابھی سب سے زیادہ اہم اس صورت حال سے نمٹنا تھا جس سے وہ دو چار ہو چکا تھا۔ ماہ بانو کی ہدایت کا مقصد سمجھ کر اس نے اپنے گلے سے ٹائی نکالی اور زخم سے تھوڑا اوپر مضبوطی سے باندھ دی۔ اسی اثنا میں ماہ بانو اپنی انگلی میں موجود بھدی سی انگوٹھی اتار چکی تھی۔ انگوٹھی اس نے عین اس جگہ رکھ دی جہاں سانپ نے کاٹا تھا۔

”یہ آپ کیا کر رہی ہیں؟“ اجنبی نے حیرت کا اظہار کیا۔

”یہ زہر مہرہ پتھر کی بنی انگوٹھی ہے اور اس پتھر کی یہ خصوصیت ہے کہ یہ زہر کو چوس لیتا ہے۔“ اس نے اجنبی کو وہ معلومات فراہم کیں جن سے اسے مشاہیرم خان کی کزن گل مینا نے انگوٹھی تحفے میں دیے ہوئے آگاہ کیا تھا۔ وہ سچے سنورنے کی بہت زیادہ شوقین نہیں تھی اور پھر حالات بھی ایسے رہے تھے کہ ایسے کسی شوق کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ اس کے باوجود وہ بلتستان کے چھوٹے سے گاؤں میں رہنے والی پُر خلوص گل مینا کے محبت سے دیے گئے اس تحفے کو خود سے جدا نہیں کر سکی تھی۔ اس عرصے میں اس کی زندگی میں کتنی تبدیلیاں آئی تھیں لیکن انگوٹھی کبھی اس کی انگلی سے جدا نہیں ہوئی تھی اور آج ایک اجنبی کی زندگی بچانے کے کام آرہی تھی۔

مصطفیٰ خان کے بعد پورے آر لینڈ میں آفتاب اور کشور ہی تھے جن سے وہ مدد کی توقع رکھ سکتی تھی۔ ان کے گھر کا پتا بتانے کے بعد اس نے سیٹ کی پشت گاہ سے فیک لگالی اور اپنے وجود میں لہریں لیتے بے پناہ درد کو برداشت کرنے کی سعی کرنے لگی۔ اپنی اس کیفیت میں اسے یہ بھی معلوم نہ ہو سکا تھا کہ اس کے بتائے پتے کو سن کر اجنبی کی آنکھوں میں ڈھیروں ڈھیر حیرت اتر آئی تھی۔ اپنے جسمانی اور قلبی کرب سے لڑتے ہوئے اسے اندازہ بھی نہیں ہو سکا کہ فاصلہ کس طرح طے ہوا۔ ذہنی طور پر تو وہ جنگل میں ہی تھی جہاں اس نے اسلم کو ایک دلدل میں گرتا ہوا دیکھا تھا لیکن دل کو یقین دلانا مشکل تھا کہ اسے بے تحاشا چاہنے والا شخص ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس سے بچھڑ گیا ہے۔

دل کا یہ درد آنسو بن کر اس کی آنکھوں سے بہہ رہا تھا اور چہرے کے ساتھ اس کا گریبان بھی تر ہو گیا تھا۔ وہ بغیر آہوں اور سسکیوں کے بہت خاموشی سے اس شخص کے لیے رو رہی تھی جس کے چلے جانے سے اسے بھری دنیا میں اپنا آپ بالکل تنہا محسوس ہو رہا تھا۔

”آپ کی منزل آگئی۔“ درد کی داستان سناتے اس کے خاموش آنسوؤں سے راستے بھر بے چین ہوتے اجنبی نے ایک گھر کے سامنے گاڑی روک کر دھیرے سے اسے اطلاع دی اور پھر خود نیچے اتر کر کال بیل کا بٹن دبایا۔ چند لمحوں کے بعد گیٹ کھل گیا اور کشور کا چہرہ نظر آیا۔

”السلام علیکم لالہ۔“ وہ جو ڈور آئی سے پہلے ہی بھائی کو دیکھ چکی تھی، دروازہ کھولتے ہی بولی۔ مراد شاہ کیونکہ پہلے ہی ٹیلی فون پر اسے کسی روز اپنی آر لینڈ آمد کی اطلاع دے چکا تھا اس لیے اس کا اس وقت اپنے دروازے پر موجود ہونا کشور کے لیے زیادہ حیرت کا سبب نہیں بنا۔

”گیٹ پورا کھول دو۔ میں گاڑی اندر لاؤں گا۔“ اشارے سے بہن کے سلام کا جواب دے کر اس نے بہ عجلت حکم دیا تو اسی وقت کشور کی نظر پنجر سیٹ پر موجود ماہ بانو پر جا پڑی۔

”ارے، یہ تو ماہ بانو ہے۔ یہ آپ کو کہاں سے ملی اور اسے کیا ہوا ہے؟“ حیرت کے باعث اس کی زبان پر ایک ساتھ بہت سے سوالات آگئے لیکن مراد شاہ کسی ایک کا بھی جواب دیے بغیر دوبارہ ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا تھا۔ کشور نے جلدی سے پورا گیٹ وا کیا۔ مراد شاہ گاڑی کو گیٹ سے گزار کر گھر کے مختصر پورچ میں لے آیا۔ کشور گیٹ بند کر کے تیزی سے گاڑی کی طرف پکی اور دروازہ کھول کر اترتی

ماہ بانو کو سہارا دیا۔ اس کا سہارا پا کر ماہ بانو جواب تک خود کو نہ جانے کس طرح سنبھالے ہوئے تھی، ڈھسے سی گئی۔ تنہا کشور کے لیے اس کے وجود کو سنبھالنا مشکل ہونے لگا۔ مراد شاہ جو خود بھی گاڑی سے باہر آچکا تھا، اس بات کو محسوس کر کے لپک کر ان دونوں کے قریب پہنچا اور ماہ بانو کو سنبھالنے میں اس کی مدد کرنے لگا۔

وہ دونوں اسے لے کر اندر داخل ہوئے تو آفتاب بھی اپنے کام کو چھوڑ کر لاؤنج میں آچکا تھا۔ کال بیل کی آواز اس نے بھی سنی تھی اور جانتا تھا کہ کشور خود ہی دیکھ لے گی لیکن جب اس نے کسی گاڑی کے اپنے گھر میں داخل ہونے کی آواز سنی تو معاملہ جاننے کے لیے اٹھ گیا۔ ان کی اپنی زندگی اتنے غیر یقینی حالات میں گزر رہی تھی کہ ذرا بھی غیر معمولی پن چونکا دیتا تھا۔

”انہیں اندر بیڈروم میں لے چلو۔“ یہ ایک دوسرے سے سلام دعا یا حال احوال معلوم کرنے کا موقع نہیں تھا چنانچہ آفتاب کو دیکھ لینے کے باوجود کوئی رد عمل ظاہر کیے بغیر کشور سے بولا۔ چند لمحوں میں وہ بیڈ پر لیٹی تھی۔ مراد شاہ نے مختصر اُبتایا کہ وہ اسے کہاں ملی تھی اور وہ کیوں اسے ان کے گھر تک لایا ہے۔ اپنے سانپ سے ڈسے جانے کا قصہ البتہ وہ گول کر گیا تھا۔

”میں مصطفیٰ خان کو اطلاع دیتا ہوں۔ اس دوران میں آپ لوگ اسے تھوڑی بہت فرسٹ ایڈ دینے کی کوشش کیجیے۔“ اس کی زبانی سب جان کر آفتاب نے کہا اور خود تیزی سے گھر سے باہر نکل گیا۔ حالات کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے اس نے اپنے گھر کا ٹیلی فون استعمال نہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا اور کسی پبلک بوتھ سے مصطفیٰ خان سے رابطہ کرنا چاہتا تھا کیونکہ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ ماہ بانو کی حالت اتنی خراب ہے کہ اسے گھر پر مکمل طبی امداد نہیں دی جا سکتی اور ان حالات میں مصطفیٰ خان جیسا اثر رسوخ والا بندہ ہی زیادہ بہتر مدد کر سکتا تھا۔

ادھر کشور اور مراد شاہ اسے فرسٹ ایڈ دینے کی کوشش کر رہے تھے۔ پورے جسم پر موجود زخموں میں سے کوئی بھی بہت زیادہ گہرا یا تشویش ناک نہیں تھا لیکن تشویش کی بات یہ تھی کہ وہ حاملہ تھی اور نہ جانے کن کن صعبوتوں سے گزر کر آرہی تھی کہ آخر میں ہمت ہار کر بے ہوش ہی ہو گئی تھی۔ مراد شاہ کی مدد سے اس کے زخموں کو صاف کر کے ان پر مرہم لگانے کے ساتھ ساتھ کشور اسے ہوش میں لانے کی کوشش بھی کرتی رہی تھی۔ اس کے لیے

اس وقت سب سے اچھی بات یہ تھی کہ امید سوری تھی اور کوئی ڈسٹرب کرنے والا نہیں تھا۔

”میں باہر جاتا ہوں۔ تم کوشش کر کے اس کا لباس تبدیل کروادو۔“ مرادشاہ نے کشور سے کہا اور خود باہر نکل گیا۔ کشور نے اپنی وارڈروب میں شلوار قمیص کا ایک ڈھیلا ڈھالا جوڑا نکالا اور سخت جدوجہد کے بعد اسے تبدیل کروانے میں کامیاب ہو گئی۔ لباس کی تبدیلی کے دوران ماہ بانو کو قدرے ہوش آ گیا اور وہ بڑے درد بھرے لہجے میں اسلم کو پکارنے لگی۔ اس کی اس پکار نے کشور کا دل تڑپا دیا۔ اسے اسلم کے حالات سے واقفیت نہیں تھی اور اس کے بارے میں بس اتنا ہی جانتی تھی کہ وہ ماہ بانو کی تلاش میں نکلا ہوا ہے اور اب ادھر ماہ بانو اسے پکار رہی تھی۔ یعنی ان دونوں ہی کے دل میں ایک دوسرے کے لیے شدید تڑپ تھی۔ محبت سے آشنا کشور نے اس تڑپ کو پوری شدت سے محسوس کیا اور دل میں ان دو دیوانوں کے مل جانے کی دعا مانگتی ہوئی کچن میں چلی گئی۔ گلاس میں نیم گرم دودھ لے کر وہ واپس کمرے میں آئی تو ماہ بانو کی آنکھیں بدستور بند تھیں لیکن وہ مسلسل کچھ بڑبڑا رہی تھی۔

”ماہ بانو! آنکھیں کھولو ماہ بانو۔“ اس کے رخساروں کو آہستہ آہستہ تھپتھپاتے ہوئے کشور نے اسے مسلسل آوازیں دیں تو اس نے ذرا سی آنکھیں کھولیں۔

”آنکھیں کھولو۔ اٹھو شاہاش، تھوڑی سی ہمت کرو۔“ کشور نے بڑی مشکل سے اسے سہارا دے کر تکیوں کی مدد سے نیم درازی کی حالت میں بٹھایا اور دودھ کا گلاس اس کے ہونٹوں سے لگایا۔

”پلیز، تھوڑا سا دودھ پی لو۔ تمہیں اس کی ضرورت ہے۔“ اس کی طرف سے کوئی رد عمل نہ پا کر کشور نے اسے سمجھایا تو اس نے ایک چھوٹا سا گھونٹ بھرا۔

”تھوڑا سا اور...“ کشور نے کسی چھوٹے سے بچے کی طرح اسے پکارا۔ یہ کشور کی محبت کا اثر تھا یا ماہ بانو کی ذہنی پختگی کہ اس نے دل نہ چاہتے ہوئے بھی تھوڑا سا دودھ اور پی لیا لیکن اگلے ہی لمحے وہ درد کی زوردار لہر سے تڑپ اٹھی۔ کشور نے اسے سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے تشویش بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ اسے معلوم تھا کہ ابھی ماہ بانو کے دن پورے نہیں ہوئے ہیں لیکن اپنے تجربے کی روشنی میں وہ سمجھ رہی تھی کہ وہ دروازہ سے گزر رہی ہے۔ اسی وقت اسے آفتاب کی واپسی کے آثار محسوس ہوئے۔ وہ بہ عجلت کمرے سے باہر نکلی۔

گرداب

”میری مصطفیٰ خان سے بات ہو گئی ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ کچھ دیر میں یہاں ایبوسینس پہنچ جائے گی۔“ آفتاب نے ایک اچھی خبر سنائی۔

”اللہ کا شکر ہے۔“ اس نے بے ساختہ اطمینان کا اظہار کیا اور بولی۔ ”ماہ بانو کی حالت بہت خراب ہے اور میرا اندازہ ہے کہ اسے لیبر چین شروع ہو گئے ہیں اس لیے اس کا جلد از جلد کسی اسپتال تک پہنچنا بہت ضروری ہے۔“ ”ہم انتظار اور دعا کے سوا کیا کر سکتے ہیں۔ آپ جائیں اور اس کا خیال رکھیں۔“ آفتاب نے اس سے کہا تو وہ پلٹ کر دوبارہ اپنے بیڈروم میں چلی گئی جبکہ آفتاب صوفے پر خاموش بیٹھے مرادشاہ کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔

”آپ ٹھیک تو ہیں مراد بھائی؟“ قریب بیٹھنے پر اسے کچھ غیر معمولی پن کا احساس ہوا تو ذرا تشویش سے پوچھنے لگا۔

”ہوں۔“ مرادشاہ نے اس کے سوال کا مختصر جواب دیا۔ اسی وقت آفتاب کی نظر اس کی پتلون کے اٹے ہوئے پانچے اور پنڈلی سے ذرا اوپر بندھی نائی پر پڑی۔

”یہ کیا ہوا ہے؟“ اس نے چونکتے ہوئے پوچھا۔ ”مجھے سانپ نے ڈسا ہے۔“ مرادشاہ نے آہستہ سے اعتراف کیا اور پھر تفصیل سے بتایا کہ کس طرح سانپ نے اسے ڈسا اور ماہ بانو نے اس کی مدد کی۔

”زہر مہرہ پتھر کی اس تاثیر کے بارے میں، میں نے بھی سنا ہے... لیکن کیا آپ کو یقین ہے کہ آپ کے جسم سے سانپ کا زہر نکل چکا ہے؟“ اس کی پنڈلی پر موجود سانپ کے ڈسنے کے نشان اور ارد گرد کی ہلکی سی نیلاہٹ کو دیکھتے ہوئے اس نے فکر مندی سے پوچھا۔

”مجھے لگتا ہے کہ اس پتھر کی وجہ سے خاصا فائدہ ہوا ہے ورنہ اتنے عرصے میں تو زہر میرے پورے جسم میں پھیل کر اپنا اثر دکھانا شروع کر چکا ہوتا... لیکن میں خود کو بہت معمولی سامتاڑ محسوس کر رہا ہوں۔“ مرادشاہ نے جواب دیا۔

”پھر بھی آپ کو فوری ٹریٹمنٹ ملنا چاہیے۔ اتنا وقت یہاں ضائع کرنے کے بجائے آپ کو سیدھے اسپتال چلے جانا چاہیے تھا۔“ وہ بدستور تشویش میں مبتلا تھا۔

”میں اس لڑکی کی وجہ سے نہیں جاسکا۔ مجھے لگا کہ میرے اسپتال جانے کی صورت میں وہ کسی بڑی مشکل میں پھنس جائے گی۔“ بیڈروم کے دروازے پر نظر ڈالتے ہوئے اس نے وجہ بتائی۔

”پھر بھی مراد بھائی! کم از کم اب تو آپ اسپتال چلے جائیں۔ چلیں انھیں، میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔“ آفتاب نے اس کا بازو پکڑ کر اسے کھڑا کرنے کی کوشش کی۔ ”نہیں آفتاب! یہ مناسب نہیں ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ کشور کو خاتون کے ساتھ اسپتال جانا پڑے گا۔ ایسے میں تمہارا گھر پر ہنگی کے پاس رکنا ضروری ہے۔“ مراد شاہ نے اسے سمجھایا۔

”لیکن آپ...“ آفتاب ذہنی طور پر اس کے یونہی بیٹھے رہنے کے لیے راضی نہیں تھا۔

”ابھی ایسولینس آئے گی تو میں بھی ساتھ ہی چلا جاؤں گا۔ یو ڈونٹ وری۔ ذرا سی تاخیر سے میرا کچھ نہیں بگڑے گا۔“ مراد شاہ نے اسے تسلی دی تو آفتاب اس کی شکل دیکھ کر رہ گیا۔

وہ اپنے باپ سے کتنا زیادہ مختلف تھا۔ اس کا باپ وہ شخص تھا جس کی بدقسمتی کی وجہ سے ماہ بانو کی بد قسمتی کی داستان کا آغاز ہوا تھا اور وہ ایک گرداب میں پھنس کر رہ گئی تھی جبکہ وہ اپنے باپ کے برعکس ماہ بانو کے اپنے لیے اجنبی ہونے کے باوجود اس کے مفادات کے لیے فکر مند تھا۔ شاید وہ شیطان کے گھر پیدا ہونے والا ولی تھا۔ زندگی کے اس لمحے میں پہلی بار آفتاب کو مکمل طور پر اس بات پر اعتبار آیا کہ مراد شاہ اس سے اور کشور سے مختلف ہے اور وہ اب تک جن تکلیفوں سے گزر رہے ہیں، ان میں مراد شاہ کا ذرا بھی دخل نہیں رہا ہے کیونکہ جو شخص ایک اجنبی لڑکی کے لیے اپنی زندگی داؤ پر لگا سکتا تھا، بھلا وہ اپنی بہن کی زندگی اور خوشیوں کا دشمن کیسے ہو سکتا تھا؟

☆☆☆

دہلی آرپورٹ پر قدم رکھتے ہی چودھری نے یوں سکون کی سانس لی جیسے اب تک کوئی اس کے پیچھے لگا ہوا تھا اور اب جا کر اسے یہ اطمینان ہوا تھا کہ پیچھا کرنے والے اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔ بھارت سے پاکستان واپس جانے کا فیصلہ وہ پہلے ہی کر چکا تھا اور جب یہ اطلاع ملی کہ اسلحے کی وہ کھیپ جس کی اس نے اشوک سے ڈیل کی تھی اور جسے پاکستان میں اس کے آدمیوں کو وصول کرنا تھا، بھارتی حدود میں ہی تباہ کر دی گئی ہے تو وہ دم دبا کر دہلی کی طرف بھاگا کہ پاکستان میں قدم رکھنے کی فی الحال اس میں ہمت نہیں تھی۔ البتہ بھارت سے روانگی سے قبل منشی نے اسے ایک اچھی خبر سنا دی تھی کہ چاندنی اور شاہد کو کیس واپس لینے پر مجبور کیا جا چکا ہے اور واپسی کی صورت میں اسے کم از کم

اس معاملے میں کوئی پریشانی نہیں اٹھانی پڑے گی۔ منشی سے اسے ایسی کوئی اطلاع نہیں ملی تھی جس سے یہ اندازہ ہوتا کہ اسلحے والے معاملے میں اس کے خلاف کوئی انگواڑی ہو رہی ہے۔ پھر بھی احتیاطاً اس نے ادھر کا رخ نہیں کیا تھا اور دہلی کے مزے لوٹنے پہنچ گیا تھا۔ دہلی کی شان کا اندازہ اس کے آرپورٹ سے ہی ہو جاتا تھا۔ چکا چوندروشنیوں سے رات کو بھی دن کا سما لیے یہ آرپورٹ دنیا کے چند بڑے اور جدید ترین آرپورٹس میں شمار ہوتا تھا۔ چودھری اپنے سوٹ کیس کے ساتھ باہر نکلا تو یہی خیال تھا کہ پرائیویٹ کار یا ٹیکسی کے ذریعے کسی ہوٹل کا رخ کرے گا لیکن باہر نکلتے ہی ایک حیرت اس کے استقبال کے لیے موجود تھی۔

”لنڈا... تم یہاں؟“ فور جذبات سے اس کے لیے بولنا مشکل ہو گیا۔ اس نے کافی وقفے کے بعد لنڈا کو دیکھا تھا اور دیکھتے ہی یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اس درمیانی عرصے میں پہلے سے زیادہ خوب صورت ہو چکی ہے اور اپنے حسن کی جولانی سے اس پر بجلیاں گرا رہی ہے۔ اس پر اس نے لباس بھی ایسا پہن رکھا تھا کہ ہر چند کہیں کہے مگر نہیں ہے کی تفسیر بنا ہوا تھا۔ سیولیس بلاؤز کا گریبان اتنا کشادہ تھا کہ دیکھنے والی نگاہوں کو دور دور تک کا جائزہ لینے کے لیے کسی خاص جدوجہد کی ضرورت نہیں تھی۔ بلاؤز اور منی اسکرٹ کے درمیان سے جھانکتی پتلی کمر کا نظارہ بھی کم ہوش رہا نہیں تھا اور پھر گھٹنوں سے بہت اوپر ختم ہو جانے والے منی اسکرٹ سے جھانکتی دلکش وسڈول ٹانگیں تھیں جن سے نظر الجھتی تو پھر پلٹنا مشکل ہو جاتا۔

”اتنے حیران کیوں ہو چودھری... کیا میرا دہلی آنا منع ہے؟“ اس کی حیرت کو دیکھ کر لنڈا نے حواس کو جھٹل کر دینے والی مسکراہٹ کے ساتھ دریافت کیا۔

”نہیں، میں تو بس اپنی خوش نصیبی پر حیران ہو رہا ہوں کہ یہاں تم میرے استقبال کے لیے موجود ہو۔“ چودھری نے گرم جوشی سے معافہ کرتے ہوئے اپنی حیرانی کی وضاحت دی۔

”میں کسی کام سے یہاں آئی ہوئی تھی۔ تم نے فون پر بتایا کہ لنڈا سے دہلی آرہے ہو تو میں نے سوچا تم سے مل کر پچھلے دنوں کی یاد ہی تازہ کر لوں۔“ اس کا سوٹ کیس ڈکی میں رکھنے کے بعد وہ اسے لے کر کار میں بیٹھ گئی اور انجن اشارت کرتے ہوئے ایسا جواب دیا کہ اس کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ لنڈا کی سحر انگیز قربت ایسی نہیں تھی کہ وہ اسے

گلے میں ہو خراش، آئے ورم یا آواز بیٹھ جائے

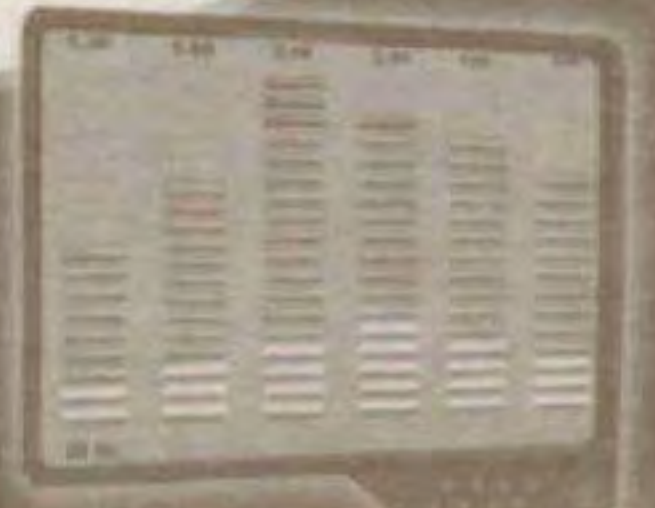
شریت توت سیاہ



سر دی آتے اور جاتے وقت گلے کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے ایسے میں
گلے میں خراش، ورم آنے یا آواز بیٹھ جانے
کی شکایات عام ہوتی ہیں۔ ہمدرد شریت توت سیاہ کی چند خوراکیں گلے کی
ان شکایات کا فوری خاتمہ کرتی ہیں۔ اب سر دی آئے یا جائے۔ آپ
کے گلے کو کیا گلہ۔ کیونکہ آپ کو تو ہے ہمدرد شریت توت سیاہ ملا۔

ہمدرد

بولو کھل کھلا دے!



فراموش کر سکتا۔ اس پر ان دنوں کو یاد کر کے ہی نشہ ساٹاری ہونے لگا تھا چنانچہ لہک کر بولا۔

”اوہ لنڈا مانی ڈار لنگ! تم نے تو میرا دل ہی خوش کر دیا۔ پلیز، اپنی گاڑی ڈاؤن ٹاؤن کی طرف لے لو۔ میں تمہارے ساتھ ہوئل جمیرہ میں ٹھہرنا چاہتا ہوں۔“

”لیکن اس سے پہلے میں تمہیں کہیں لے جانا چاہتی ہوں۔“ لنڈا مردوں کے خود پر اس طرح ٹار ہونے کی عادی تھی۔ اسے اپنی زبردست قوتِ تسخیر کا اچھی طرح علم تھا اس لیے چودھری کی حالت دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولی۔

”کہیں اور کہاں...؟“ اس کی بات سن کر چودھری کے کان کھڑے ہوئے اور وہ چوکنے پن سے پوچھنے لگا۔ ویسے بھی اس کا تجربہ اسے بتاتا تھا کہ عقل کو ضبط کر دینے والی لنڈا جب بھی اس سے ملاقات کرتی تھی، اس کے پیچھے کوئی نہ کوئی خاص وجہ موجود ہوتی تھی۔

”یہ سر پرانز ہے۔“ لنڈا نے اسے خوب صورتی سے ٹال دیا اور بے حد اصرار پر بھی کچھ نہیں بتایا۔ موضوع گفتگو ہی اس طرح بدل ڈالا کہ چودھری کو احساس بھی نہ ہو سکا اور حسب معمول وہ لنڈا کی عقل کو ضبط کر دینے والی قوتِ تسخیر کے تابع ہو کر وہاں جا پہنچا جہاں وہ اسے لے جانا چاہتی تھی۔ یہ ایک اپارٹمنٹ بلڈنگ کی ساتویں منزل پر موجود لکڑی اپارٹمنٹ تھا جس کے ایک کمرے میں چودھری کی ناپسندیدہ ہستی پہلے ہی ان کے استقبال کے لیے موجود تھی۔

”تمہیں یہاں دیکھ کر حیرت ہوئی مسٹر الفا!“ اس نے داستوں کو چباتے ہوئے الفا سے مصافحہ کیا۔

”لیکن ظاہر ہے مجھے نہیں ہوئی کیونکہ تم میری ہی فرمائش پر یہاں موجود ہو۔“ صوفے پر دوبارہ بیٹھتے ہوئے الفا نے دل جلانے والے انداز میں کہا تو چودھری اپنی جگہ بل کھا کر رہ گیا لیکن اظہار نہ کر سکا۔

”خیریت... تم مجھ سے ملاقات کے لیے اتنے بے چین کیوں تھے؟“ اس نے کوشش کی کہ اس کا لہجہ ہموار ہی رہے کیونکہ اسے تجربہ تھا کہ اس کی طرف سے سخت ردِ عمل پر الفا کا مزاج بگڑ جاتا تھا اور وہ چونکہ اس سے بہتر پوزیشن میں تھا، اس لیے آسانی سے اسے نقصان بھی پہنچا دیتا تھا۔

چودھری اس کے مزاج کی برہمی کو ملنے والے کثیر معاوضے میں کمی کی صورت ایک بار بھگت چکا تھا اور اب ایسا کوئی نقصان برداشت نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اپنے علاقے میں وہ کتنا ہی جابر و ظالم اور مطلق العنان حاکم سہی لیکن ایک بین الاقوامی طرز کی جرائم پیشہ تنظیم کے آگے اس کے ذاتی

اثرِ سوخ کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ وہ اتنے طاقتور لوگ تھے کہ جب چاہتے اسے چیونٹی کی طرح مسل کر رکھ سکتے تھے۔ ”تم سے کچھ کاروباری معاملات طے کرنے تھے لیکن بہتر ہوگا کہ پہلے ہم ایک ایک ڈرنک لے لیں۔ تم سفر سے آئے ہو“ تھکے ہوئے ہو گئے۔ ڈرنک لینے سے تم پر اچھا اثر پڑے گا۔“ خلاف معمول الفا کالب و لہجہ نرم تھا۔ ایک اچھے میزبان کی طرح اسے ڈرنک کی پیشکش کرنے کے بعد وہ لنڈا سے مخاطب ہوا۔

”ہنی! کیا تم ہم لوگوں کے لیے ڈرنک تیار کر دو گی؟“

”کیوں نہیں۔“ اس نے مسکرا کر جواب دیا اور صوفے سے اٹھ کر ٹل کھاتی ہوئی اس کیبنٹ تک گئی جہاں بہت سی بوتلیں سجی ہوئی نظر آرہی تھیں۔ وہاں سے ایک بوتل منتخب کرنے کے بعد وہ جملہ لوازمات کے ساتھ چودھری کے پہلو میں آ بیٹھی۔ تین جام تیار کرنے کے بعد اس نے سب سے پہلا جام چودھری کو دیا۔ دوسرا الفا کو اور تیسرا اپنے ہاتھ میں تمام کر چودھری سے مزید قریب ہو بیٹھی۔ چودھری دہرے نشے میں مبتلا ہونے لگا۔ ہاتھ میں موجود بلوریں جام اگر آتشیں سیال کو معدے میں انڈیل کر اندر آگ لگا رہا تھا تو بھری بوتل جیسا خمار آلود وجود رکھنے والی لنڈا اپنے لمس سے اس کے تن من کو دہکا رہی تھی اور اس کو خود پر قابو پائے رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔ الفا کے نزدیک شاید یہی گفتگو کا سب سے مناسب وقت تھا چنانچہ وہ کھٹکھٹاتے ہوئے بولنا شروع ہوا۔

”تم جانتے ہو کہ تنظیم تمہیں تمہاری شمولیت اور تعاون کے بدلے میں شروع ہی سے بہت بھاری معاوضہ ادا کرتی چلی آرہی ہے... کیونکہ ہمارا خیال تھا کہ اپنے علاقے کے ایک بارسوخ جاگیردار کی حیثیت سے تم ہمارے لیے بہت مفید ثابت ہو گے۔“

”تو کیا ایسا نہیں ہے؟ میں نے ہر لمحے تم لوگوں کا پورا پورا ساتھ دیا اور مجھے جو بھی ذمے داری سونپی گئی، اسے اچھی طرح ادا کرنے کی کوشش کی۔“ چودھری نے اس کی بات درمیان میں ہی کاٹ کر اپنی خدمات گنوانا شروع کر دیں۔

”کوشش اور کامیاب کوشش میں فرق ہوتا ہے مسٹر چودھری۔ تمہاری کامیابی کا تناسب بہت کم رہا ہے۔ تم نہ تو وہ کارخانہ بچا سکے جہاں ہم نے اپنے مال کی تیاری کے لیے کثیر سرمایہ کاری کی تھی اور نہ ہی مقامی منڈی میں مال

کو اچھلنے پر مجبور کر دیا لیکن وہ اس کی کیفیت سے بے نیاز اپنی ہی بولتا چلا گیا۔ ”سنا ہے تمہاری حویلی میں ایک بہت بڑا تہ خانہ ہے۔ اس تہ خانے میں ہم اپنا ہیروئن سازی کا سیٹ اپ لگا سکتے ہیں۔ ماہرین ہمارے اپنے بندے ہوں گے، باقی کاموں کے لیے تم آدمی فراہم کر دینا۔“ وہ جیسے سب کچھ طے کر کے آیا تھا۔

”یہ نہیں ہو سکتا۔ میں حویلی کو ایسے کسی کام کے لیے استعمال کرنا بالکل پسند نہیں کروں گا۔“ چودھری نے لرزتی ہوئی آواز میں انکار کیا۔

”اسی پوائنٹ نے تو ہمیں حویلی کے انتخاب پر مجبور کیا ہے۔ مخالفین کی بھی یہی سوچ ہوگی کہ تم حویلی کو ایسے کسی کام کے لیے استعمال نہیں کر سکتے اس لیے وہ جگہ بالکل محفوظ ہے۔“ الفا کے اطمینان میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

”میں نے کہا تھا کہ یہ ممکن نہیں ہے۔“ اس بار چودھری نے ذرا بلند آواز میں انکار کیا جس پر لنڈا نے فوراً ہی اس کا بازو زور سے دباتے ہوئے اسے ریلیکس رہنے کی خاموش درخواست کی۔

”ہماری دنیا میں کچھ بھی ناممکن نہیں ہوتا۔ ہم اپنے لیے کام کرنے والوں کو آرڈر دینے اور جواب میں ان کا ”یس“ سننے کے عادی ہیں۔ ”نو“ کا آپشن ہمارے کسی ورکر کے پاس نہیں ہوتا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ یہ لفظ استعمال کر کے وہ اپنے لیے موت کا انتخاب کر رہا ہے۔“ الفا نے سرد مہری سے اسے اس کی پوزیشن سے آگاہ کیا۔

”تم مجھے دھمکی دے رہے ہو؟“ چودھری کا جاگیردارانہ لبو یکدم ہی جوش مارنے لگا۔

”یہ دھمکی نہیں ہمارا اصول ہے جس سے میں نے تمہیں آگاہ کر دیا ہے۔ اس وقت تم جوش سے کام لے رہے ہو، بہتر ہے کہ پہلے اچھی طرح سوچ سمجھ لو پھر مجھے جواب دینا۔“ اسی سرد سے لہجے میں کہتے ہوئے الفا نے اپنی جگہ اچانک ہی چھوڑ دی اور لنڈا سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

”اس خطی آدمی کو سمجھاؤ لنڈا! ہمارے ساتھ ضد کر کے یہ اپنا نقصان کرنے کے سوا کچھ نہیں کرے گا۔“

”آپ بے فکر رہیں مسٹر الفا! چودھری صاحب میری بات ضرور سمجھ جائیں گے۔“ لنڈا نے اپنی لوج دار آواز میں الفا کو یقین دہانی کروائی اور اس کے رخصت ہونے کے بعد چودھری کی طرف متوجہ ہو گئی۔

”تمہیں کیا ہو گیا ہے ڈارلنگ! کیوں سوچے سمجھے بغیر اس آدمی سے بھڑ رہے تھے۔ وہ تمہارے اندازے

کے پھیلاؤ کے لیے کچھ خاص کارکردگی دکھائی، اس لیے میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ ہمارے لیے تمہاری افادیت ہمارے اندازے سے بہت کم رہی ہے۔“ الفا نے بغیر لاگ لپیٹ کے اس کے سامنے اپنے خیالات کا اظہار کر دیا۔

”چلو یونہی سہی۔ تم یہ بتاؤ کہ تم نے مجھ جیسے ناکارہ آدمی کو ملاقات کے لیے کیوں بلایا ہے؟“ اس کا تبصرہ سن کر چودھری کے غصے میں اضافہ ہو گیا۔ لنڈا نے فوراً اس کا بازو اپنے نازک ہاتھ سے یوں دبایا جیسے اس کے غصے کو کنٹرول کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔ اس کی یہ کوشش کسی حد تک کامیاب بھی رہی اور غصے کی شدت سے بے قابو ہوتی چودھری کی سانسیں قابو میں آنے لگیں۔

”مسٹر الفا کا مقصد آپ کو بے عزت کرنا نہیں ہے چودھری صاحب۔ آپ ذرا تحمل سے ان کی بات سنیں۔ ظاہر ہے یہ آپ کو ماہانہ اتنی خطیر رقم ادا کر رہے ہیں تو جواب میں آپ سے بھی تو کچھ نہ کچھ چاہیں گے نا۔۔۔“ چودھری کا بازو سہلاتے ہوئے وہ اسے بڑے رसान سے سمجھانے لگی تو چودھری کو اثبات میں سر کو جنبش دینی پڑی کہ یہ حقیقت اپنی جگہ تھی کہ واقعی وہ اکثر مقامات پر ناکام ہی رہا تھا۔

”ہم جانتے ہیں کہ تم پاکستان کے خفیہ اداروں کی نظر میں آ چکے ہو اور تمہاری فیکٹریوں سمیت تمام کاروباری مراکز کی نگرانی بھی کی جا رہی ہوگی اس لیے ہم اب ان جگہوں میں سے کہیں بھی اپنا ہیروئن سازی کا کام انجام نہیں دے سکتے اور موجودہ حالات میں ہمیں ایسی کسی جگہ کی اشد ضرورت ہے جہاں ہیروئن تیار کرنے کے بعد ہم آسانی سے منتقل کر سکیں۔ ایسی جگہ دستیاب ہونے سے ہمارے وقت اور لاگت دونوں کی بچت ہوگی اور ہمیں فی الحال تم سے ایسی ہی جگہ درکار ہے۔“ چودھری کو لائن پر آمادہ دیکھ کر الفا نے ایک بار پھر گفتگو کا آغاز کیا۔

”تم خود ہی کہہ رہے ہو کہ میری ذات مشکوک ہے پھر میں تمہیں ایسی کوئی جگہ کیسے مہیا کر سکتا ہوں؟“ اس بار چودھری نے بہت سادگی سے اس کی بات کا جواب دیا۔

”ایک ایسی جگہ تمہارے پاس ہے جس کے بارے میں کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ تم وہاں کوئی غیر قانونی کام انجام دے سکتے ہو۔“ الفا نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا تو چودھری الجھ گیا۔

”ایسی کون سی جگہ ہے میرے پاس؟“

”تمہاری حویلی۔“ الفا کے اس جواب نے چودھری

سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔“

”میں اس کا مطالبہ نہیں مان سکتا۔ وہ ہمارے پُرکھوں کی حویلی ہے اور میں برداشت نہیں کر سکتا کہ پُرکھوں کی اس عزت پر کوئی آنچ آئے۔“

”ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ تم خواجواہ پریشان ہو رہے ہو۔ یہ بات تم بھی جانتے ہو اور ہم بھی کہ حویلی کی طرف کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا۔ القابہت ذہین آدمی ہے۔ اس نے سوچ سمجھ کر ہی حویلی کا انتخاب کیا ہے۔ اسے اچھی طرح اندازہ ہوگا کہ حویلی کا کوئی راز وہاں سے باہر نہیں نکل سکتا۔ وہاں کے سارے ملازمین تمہارے وفادار ہیں۔ مزید احتیاط کے طور پر ہم یہ کریں گے کہ کام کو اس طرح انجام دیں کہ کسی کو کانوں کان خبر ہی نہ ہو سکے۔ مشینری اور ماہرین کو تہ خانے تک پہنچانے کے لیے باہر سے سرنگ لگائی جاسکتی ہے۔ حویلی کے پیچھے جو تمہارا خاندانی قبرستان ہے، وہاں سے تہ خانے تک سرنگ بنانا زیادہ مشکل نہیں ہوگا۔ جس عرصے میں یہ کام ہو تم لوگوں پر یہ ظاہر کر سکتے ہو کہ تم اپنے بزرگوں کی قبروں کی مرمت وغیرہ کر رہے ہو۔“ اسے اپنی قربت سے نوازی وہ بہت سجاؤ سے مشورے اور تجاویز پیش کر رہی تھی اور ظاہر ہے ایک سیمیں بدن کے غنچہ دہن سے نکلی باتیں چودھری کی عقل کو ضبط کر کے اسے انکار سے نیم رضا مندی کی طرف لے جا رہی تھیں۔

”ٹھیک ہے، یہ سب ہو جائے گا لیکن بعد میں جب مال لایا لے جایا جائے گا تو کسی کی نظر پڑ سکتی ہے۔“ اس نے اپنے دل میں موجود ایک اور اندیشہ بیان کیا۔

”کسی کی نظر نہیں پڑے گی۔ میں گاؤں کی زندگی کے معمولات سے واقف ہوں۔ وہاں لوگ رات کو بہت جلدی سو جاتے ہیں اس لیے کام کرنے والے بندوں کے سوا کسی کو کچھ پتا نہیں چلے گا۔ مزید احتیاط کے طور پر ہم یہ کر سکتے ہیں کہ جس رات مال سپلائی ہونا ہو، اطراف میں پہرا لگا کر اس بات کو یقینی بنالیں کہ کوئی غیر متعلقہ شخص قبرستان کے قریب نہ آ سکے۔“ اب اس نے اپنا سر چودھری کے سینے پر رکھ دیا تھا اور بڑی مہارت سے اس کے خدشات دور کر رہی تھی۔

”اور مال کو علاقے سے باہر کیسے نکالو گے؟ تمہیں معلوم ہوگا کہ پولیس باہر جانے والی گاڑیوں کی راستے میں تلاشی لیتی ہے؟“

”اوہو چودھری صاحب! آپ تو بہت ہی زیادہ فکر مند ہو رہے ہیں۔ میرے خیال میں وہ جو پچھلا اسے سی

شہر یار عادل تھا، اس کا خوف ابھی تک آپ کے دل سے نہیں نکلا۔ اس نے آپ کو بہت زیادہ ڈرا دیا ہے۔“

”اب ایسا بھی نہیں ہے۔“ لندا کے طعنے پر وہ کھسیا گیا۔

”ایسا نہیں ہے تو پھر آپ کو ایسی باتیں بھی نہیں کرنی چاہئیں۔ آخر ہم وہاں سے جنگل میں کاشت کی جانے والی اینون بھی تو نکال ہی رہے ہیں نا۔۔۔ تو تیار شدہ ہیروئن نکالنے میں کیا مسئلہ ہوگا؟ آپ کے جوڑک پھل اور سبزیاں لے کر جاتے ہیں، ان میں سے دو چار بیٹیوں میں ہیروئن چھپا کر نکال دی جائے گی تو کسے خبر ہوگی۔ یہ کوئی لکڑی اور جانوروں کی کھال کی اسمگلنگ کا معاملہ تو ہے نہیں کہ ذرا سی تلاشی پر مال سامنے آجائے۔ ذہانت اور احتیاط سے کام لیا جائے گا تو معمول کی چیکنگ کرنے والوں کے فرشتوں کو بھی بھٹک نہیں ملے گی۔ ویسے بھی اب وہاں شہر یار عادل کے دور جیسی چیکنگ نہیں ہوتی۔“

وہ اپنی نرم دناڑک انگلیوں کا جادو چودھری کے بدن میں منتقل کرتی مستقل اس کی برین واشنگ بھی کرتی جا رہی تھی۔ بالآخر چودھری کو اس کی اداؤں اور ولائل کے سامنے ہتھیار ڈالنے ہی پڑے اور وہ قائل ہو گیا کہ موجودہ حالات میں ہیروئن سازی کی تیاری کے لیے حویلی سے زیادہ مناسب مقام کوئی نہیں ہے۔ اپنی اس شکست کے بدلے اس نے ایک پوری رات کے لیے لندا کو جیت لیا اور اس کے نزدیک یہ سودا برا نہیں تھا۔

☆☆☆

شہر یار کو اندازہ نہیں تھا کہ وہ کتنی دیر بے ہوش رہا۔ بس وہ تکلیف کا احساس تھا جو اسے ہوش میں لایا تھا۔ اسے یوں لگا تھا کہ اس کے پورے جسم میں سوئیاں سی چبھ رہی ہوں۔ لاشعوری طور پر اس نے ان سوئیوں کو اپنے جسم سے علیحدہ کرنے کی خواہش میں بازو میں ایک جگہ محسوس ہوتی چھین کے مقام سے سوئی نکال کر پھینکنے کی کوشش کی تو اس کی انگلیوں نے کسی نرم اور بھلجی سی شے کا لمس محسوس کیا۔ اس نے پوری آنکھیں کھول کر ملجی روشنی میں اس شے کو دیکھنے کی کوشش کی اور یہ دیکھ کر ایک جھرجھری سی لے کر رہ گیا کہ وہ ایک جونک ہے جس کا لچلچا جسم اس کے خون سے بھر چکا ہے۔ اس نے ہاتھ میں موجود جونک کو دور اٹھا کر پھینکا اور پھر دیوانوں کی طرح اپنے جسم کے مختلف مقامات پر چسکی خون چوستی جونکوں کو نوچ نوچ کر دور پھینکنے لگا۔ ان جونکوں کی تعداد ایک درجن سے زیادہ تھی جنہیں اپنے جسم پر موجود

تھا لیکن اپنے انسٹرکٹر عمر فاروق کی تربیت نے اس کے اندر اتنی قوت برداشت پیدا کر دی تھی کہ وہ نہ صرف اس وار کو سہہ گیا بلکہ پلٹ کر بھٹنا گر کے سینے پر اپنے سر کی زوردار ٹکر مار دی۔ بھٹنا گر ٹکر کھا کر ذرا پیچھے ہٹا اور لات گھما کر اس کے پہلو میں رسید کی۔ اس کے بعد فوراً ہی اس نے ایک مکا شہریار کے جڑے پر جڑ دیا۔

شہریار نے بھی ہمت نہیں ہاری اور جواب میں اس کی پیٹھ پر ایک لات رسید کی حالانکہ وہ دیکھ رہا تھا کہ اس مقابلے کا اسے کوئی فائدہ نہیں ہوگا اور اگر وہ بھٹنا گر کو شکست دینے میں کامیاب بھی رہا تو اس کے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا کیونکہ کمرے کے ہر کونے میں جدید اسلحے سے لیس بھٹنا گر کے ساتھی آکھڑے ہوئے تھے۔ البتہ انہوں نے اس لڑائی میں دخل اس لیے نہیں دیا تھا کہ بھٹنا گر نے انہیں خود دخل اندازی سے روک دیا تھا۔

”تو یہاں سک سک کر پاگل کتے کی موت مرے گا اور مرنے سے پہلے میں تیرے اندر سے سب کچھ نکال لوں گا۔“ ہاتھ پیروں کے ساتھ بھٹنا گر کی زبان کو بھی سکون نہیں تھا۔ پتا نہیں کیوں وہ اپنے الفاظ سے اسے مشتعل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”میں جیسی بھی موت مروں لیکن آج تو اپنے آدمیوں کے سامنے میرے ہاتھوں ذلیل ہو کر رہے گا۔“

شہریار نے اسے جواب دیا اور یکدم ہی دونوں ہاتھوں سے اس دیوار کی طرف اچھال دیا جہاں اس کا گن بردار ساتھی کھڑا ہوا تھا۔ بھٹنا گر کو اس پر اچھالنے کا مقصد یہ تھا کہ اگر دھکا کھانے سے اس کے آدمی کے ہاتھوں سے گن نکل گئی اور وہ اس تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب رہا تو بازی پلٹ سکتی ہے۔ چنانچہ بھٹنا گر کو اچھالتے ہی خود بھی اس طرف چھلانگ لگائی۔ اس کی حسب توقع گن مین دھکا لگنے سے گر گیا تھا اور اس کے ہاتھ سے گن نکل کر دور جا گری تھی لیکن اس موقع پر بھٹنا گر نے حیرت انگیز پھرتی کا مظاہرہ کیا اور لیٹے لیٹے ہی اس کی راہ میں اس طرح ٹانگ اڑائی کہ وہ گن تک پہنچنے سے قبل ہی گر گیا۔ یہ بات محسوس کر کے کہ وہ گن تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے، مختلف کونوں میں کھڑے دوسرے گن مین بھی حرکت میں آ گئے تھے۔ انہوں نے اس کے سنبھل کر اٹھنے سے قبل ہی اپنے گھیرے میں لے لیا۔

”فرار کا پتا من سے نکال دو مسٹر! یہاں صرف وہ آتے ہیں جنہیں ہم لائیں اور واپس کوئی نہیں جاتا۔“ اس

یا کر اسے گھن سی محسوس ہو رہی تھی۔ ان جونکوں کو خود سے الگ کرنے کے بعد اس نے سکون کا سانس لیا ہی تھا کہ کمرے میں روشنی پھیل گئی۔ اچانک ہونے والی اس روشنی نے اس کی آنکھیں چندھیا دیں۔ جب وہ اس تیز روشنی میں دیکھنے کے قابل ہوا تو اس نے بھٹنا گر کو اپنے سامنے پایا۔

”کیا خیال ہے مسٹر! تم اپنے اور سلو کے بارے میں کچھ بتانے کو تیار ہو یا نہیں؟“ بھٹنا گر نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سرد لہجے میں پوچھا۔ جواب میں وہ خاموش رہا۔

”یہ خاموشی تمہیں مشکل میں ڈال دے گی۔ جو کچھ تم نے سہا ہے، وہ صرف ٹریلر تھا۔ آگے ہمارے پاس تمہیں دکھانے کے لیے بہت کچھ ہے۔“ شہریار ایک بار پھر خاموش رہا۔

”اس طرح خاموش بیٹھ کر اگر تم خود کو گونگا بہرا ثابت کرنا چاہ رہے ہو تو یہ کوشش بیکار ہوگی کیونکہ اس جگہ آ کر تو پتھر بھی بولنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔“

”لیکن میری مجبوری یہ ہے کہ میرے پاس تمہارے کسی سوال کا جواب نہیں ہے۔“ بھٹنا گر کی دسمکی کا اس نے بے نیازی سے جواب دیا۔

”کچھ نہیں تو یہی بتا دو کہ سلو اس بنگلے سے فرار ہو کر کہاں گیا ہوگا؟“ ظاہر ہے بھٹنا گر اس کے انکار پر سوال کرنا نہیں چھوڑ سکتا تھا۔

”تم یقین نہیں کرو گے لیکن میں سچ سچ نہیں جانتا کہ وہ کہاں گیا ہوگا۔“ اس سوال کا جواب سچائی سے دینے میں کوئی عار نہیں تھا چنانچہ اس نے دے دیا۔

”گندی نالی کے کیڑے... کی اولاد... تو اپنی زبان سے نہیں اگلے گا تو میں... سے سب اگلا لوں گا۔ تیرے جیسے پاکستانی کتے کی دم سیدھی کرنے کے لیے میرے پاس بہت طریقے ہیں۔“ بھٹنا گر نے اچانک ہی اسے مغلظات بکنا شروع کر دیں اور اس پر پل پڑا۔ وہ بیک وقت ہاتھوں اور پیروں کا استعمال کر رہا تھا۔ شہریار نے چار چھ ضربیں تو اپنے جسم پر کھالیں لیکن پھر اسے احساس ہوا کہ وہ بندھا ہوا نہیں ہے اور بھٹنا گر کو اس کی اس جسارت کا جواب دے سکتا ہے چنانچہ خود بھی اس پر جوابی حملہ کر دیا۔ اس کی کھڑی ہتھیلی کا وار بھٹنا گر کے شانے پر پڑا تو وہ بلبلا اٹھا لیکن فوراً ہی جواب میں اس کی ناف کے پاس اپنا گھٹنا دے مارا۔ بھوک، تشدد اور خون کے اخراج کی وجہ سے کمزور پڑ جانے والے شہریار کے لیے یہ وار بہت زوردار

دوران میں خود کو سنبھال کر کھڑے ہو جانے والے بھٹناگر نے اس کے پہلو میں ایک زوردار لات رسید کی اور نفرت زدہ لہجے میں بولا۔

”ہتھیاروں کے زور پر مجھے زیر کر کے خود پر اترانے کے بجائے ہمت ہے تو اپنے زور بازو پر مجھ سے جیت کر دکھاؤ۔“ شہریار نے اپنی سمت اٹھی گنوں کو دیکھتے ہوئے اسے چیلنج کیا۔ اتنا تو وہ بھی سمجھتا تھا کہ ان جدید گنوں کی موجودگی میں حرکت کرنا جذباتی حماقت کے سوا کچھ نہ ہوگا۔

”یہ کوئی فائننگ ونک نہیں ہے جو میں اس طرح کے چیلنج قبول کرنے کی حماقت کروں۔ نہ ہی مجھے خود کو سوراخ ثابت کرنے کا شوق ہے۔ تم میرے دلش کے دشمن ہو اور میں دشمن کے ساتھ ہر طرح کا برتاؤ کرنے کو جائز سمجھتا ہوں کیونکہ مجھے اپنے دشمنوں سے بہادری کا سرٹیفکیٹ نہیں بلکہ اپنے سوالوں کے جواب چاہیے ہوتے ہیں۔“

اس کے چیلنج کے جواب میں بھٹناگر سردمہری سے بولا اور اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا تو ان میں سے ایک نے اسے زوردار ٹھوکر لگائی اور سخت لہجے میں بولا۔ ”چل اٹھ۔“ شہریار اپنے دکتے ہوئے جسم کو سمیٹ کر کھڑا ہو گیا۔ اسے معلوم تھا کہ تاخیر کی صورت میں مزید مار کھانا پڑے گی۔ دیے ان لوگوں کے پاس اس کے لیے اذیت رسانی کے سوا کچھ تھا بھی نہیں۔ اسے ان کی قید میں کئی گھنٹے گزر گئے تھے اور کچھ کھلانا تو دور کی بات، انہوں نے اسے پانی تک نہیں پلایا تھا۔

اب تک وہ جتنی اذیت سے گزر چکا تھا، اس کے باعث خاصی کمزوری محسوس کر رہا تھا اور اپنی زائل ہوتی توانائی کو بحال کرنے کے لیے اسے کم از کم ایک گلاس پانی پینے کی شدید خواہش تھی لیکن اپنی اس خواہش کو زبان پر لا کر وہ انہیں اپنی کمزوری کا احساس نہیں دلانا چاہتا تھا۔ اس کی زندگی جس ڈگر پر چل پڑی تھی، وہ اس کی کٹھنائیوں سے خوب واقف تھا۔ اسے معلوم تھا کہ دشمنوں کی گرفت میں آجانے والے سیکرٹ ایجنٹ کے نصیب میں اذیتوں کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ ان اذیتوں سے یا تو موت نجات دلاتی ہے یا پھر حب الوطنی اور خمیر کے سودے سے تھوڑی آسانی حاصل کی جاسکتی ہے۔ آزادی اور رہائی کسی ایک آدھ خوش نصیب کے حصے میں ہی آتی ہے اور اسے اپنے بارے میں علم نہیں تھا کہ ایسے خوش نصیبوں میں اس کا شمار ہے یا نہیں۔ فی الحال تو وہ اپنی قوت برداشت کا امتحان دینے اور دیتے

رہنے کے لیے تیار تھا، یہاں تک کہ اس قید خانے یا زندگی سے رہائی نصیب ہو جائے۔ سودے بازی بہر حال اسے کسی صورت منظور نہیں تھی۔

”یہ چکر دیکھ رہے ہونا؟ جب یہ چلنا شروع ہوگا تو پہلے تم اپنے شریر کو کسی تنے ہوئے تار کی طرح محسوس کرو گے اور دھیرے دھیرے یہ تناؤ اتنا بڑھے گا کہ تمہارے شریر کا جوڑ جوڑ کھٹنے لگے گا۔ تمہاری ساری ہڈیاں جھج جائیں گی اور ماس ریشہ ریشہ ہو جائے گا۔“ گن مین اسے دھکیل کر لکڑی کی ایک میز تک لے گئے تھے اور اسے میز پر لٹانے کے بعد اس کے ہاتھوں پیروں کو ایسے آہنی شکنجوں میں کس دیا گیا تھا جن کے ساتھ لوہے کی زنجیریں منسلک تھیں اور ان زنجیروں کے سرے چرخوں کے ساتھ جڑے ہوئے تھے۔ راوا لوں نے اپنے دشمنوں سے راز اگلوانے کے لیے ٹھیک ٹھاک قسم کا عقوبت خانہ بنا رکھا تھا جہاں اذیت رسانی کے جدید و قدیم ہر طرح کے آلات موجود تھے۔ اس وقت اسے ایک قدیم طرز کے اذیت رسانی کے طریقے سے گزارا جانے والا تھا۔ چرخیاں دیکھ کر وہ خود بھی کافی کچھ سمجھ گیا تھا، باقی وضاحت بھٹناگر نے کر دی۔ شاید وہ جسمانی اذیت دینے سے قبل اسے اعصابی طور پر توڑ پھوڑ دینا چاہتا تھا لیکن اسے اندازہ نہیں تھا کہ مد مقابل کو ایمان کی حرارت اور را کے دہشت گردوں کے لیے سخت نفرت نے اتنا سخت جان بنا دیا تھا کہ وہ اس کے جسم کو تو توڑ پھوڑ سکتے تھے لیکن اس کے اعصاب پر حاوی ہونا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔

”اسٹارٹ۔“ بھٹناگر نے اس کے چہرے پر خوف و دہشت کا کوئی تاثر نہیں دیکھا تو دانت کچکچاتے ہوئے اپنے ماتحت کو حکم دے دیا۔ فوراً ہی دونوں جانب نصب چرخیاں حرکت کرنے لگیں، ان کی حرکت بہت دھیمی تھی۔ شاید اس لیے کہ اذیت رسانی کا شکار ہونے والا ہمت ہار کر زبان کھولنے کی ہامی بھر لے تو فوراً ہی اس سلسلے کو روک کر اسے بولنے کی مہلت دے دی جائے ورنہ چرخوں کے تیز چلنے کی صورت میں تو بہت تیزی سے بندہ اپنے انجام کو پہنچ سکتا تھا۔

”ہیلو۔“ ابھی زنجیروں کے کھینچنے کی وجہ سے شہریار کے جسم میں تناؤ پیدا ہونا شروع ہوا ہی تھا کہ بھٹناگر نے اپنے موبائل پر کسی کی کال ریسیو کی۔

”یہ تو مجھے بھی معلوم ہے کہ اس نے بنگلے سے بھاگنے کے بعد بھائی جی سے کانٹیکٹ نہیں کیا۔ تو مجھے کوئی نئی انفارمیشن دے۔“ دوسری طرف موجود شخص کی بات سننے

گرداب

اذیت کا یہ سلسلہ رکا تو ٹھہرا حال سا شہر پار ہانپنے کے انداز میں گہری گہری سانسیں لینے لگا۔ بھٹاگر نے اپنے ایک ماتحت کو اشارہ کیا تو اس نے شہر پار کے منہ میں پانی کے چند قطرے پٹکائے۔ شہر پار نے پانی کے ان قطروں کو بے تابی سے اپنے حلق سے نیچے اتارا۔

”تو پھر تم میرے سوالوں کے جواب دینے کو تیار ہو؟“ بھٹاگر نے اس کے قریب آ کر بڑے زعم سے پوچھا۔ گویا اب اس کی طرف سے انکار ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

”تم میرے جسم کا ریشہ ریشہ الگ کر سکتے ہو۔ جسم سے میری روح نکال سکتے ہو لیکن چند چھٹانک کی اس زبان سے وہ نہیں نکلوا سکتے جو تم سننا چاہتے ہو۔“ شہر پار نے نہایت نفرت سے اس کی بات کا جواب دیا تو ذلت کے احساس سے بھٹاگر کا چہرہ سرخ ہو گیا اور وہ چیخ کر بولا۔

”پھر چلاؤ اور اب اس وقت تک نہیں روکنا جب تک اس کی آتما اس کے شریر کا ساتھ نہ چھوڑ دے۔“ اس کا حکم صادر ہوتے ہی شہر پار پر قیامت ٹوٹ پڑی اور ایک وقت ایسا آیا کہ وہ خود بھی اپنی بھیانک چیخیں سننے سے محروم ہو گیا۔

☆☆☆

”چودھری افتخار بھارت سے دعویٰ پہنچ گیا ہے۔“

”بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔ آخر کار اسے لوٹ کر یہاں آنا ہی ہے۔“ ذیشان کی دی ہوئی اطلاع پر جاوید علی نے دانت کچکچا کر تبصرہ کیا۔

”واپس تو خیر وہ ضرور آئے گا۔ ہمارے پاس اس کے خلاف کون سے ٹھوس ثبوت ہیں جو وہ ڈر کر یہاں کا رخ نہ کرے۔“ ذیشان نے حقیقت بیان کی تو جاوید سوچ میں پڑ گیا اور پوچھا۔

”طوائف کے قتل والے کیس کا کیا ہوا؟ اس میں تو چودھری چندا بابائی کے ساتھ نامزد مجرم تھا نا؟“

”میری عمیر سے اس سلسلے میں بات ہوئی تھی۔ اس کیس کے دونوں اہم گواہ اور مدعی چاندنی اور شاہد اس کے ہاتھ سے نکل گئے ہیں۔ انہوں نے چودھری اور چندا بابائی کے خلاف کیس واپس لینے کی درخواست دائر کر دی ہے۔“

”اوہ نوہ۔۔۔“ ذیشان کی دی ہوئی اطلاع نے اسے صدمہ پہنچایا۔ ”عمیر نے اس سلسلے میں معلومات تو کی ہوں گی۔ کیا ان دونوں کو ذرا دھمکا کر کیس واپس لینے پر مجبور کیا گیا ہے؟“

”امکان تو یہی ہے لیکن وہ دونوں اس سلسلے میں

کے بعد اس نے نہایت بدتمیزی سے اس سے کہا اور لمحہ بھر کے توقف کے بعد پھر بولا۔

”دیکھ ہیرا۔۔۔ تجھے نہیں پتا کہ وہ کیسی بلا ہے۔ میں نے اسے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے اس لیے میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ اگر ہم اس کو پکڑنے میں ناکام رہے تو وہ ہمیں کتنی مشکل میں ڈال دے گا۔ چپے چپے پر اپنے آدمی پھیلا کر انہیں اس کی تلاش میں لگا دو۔ ہمارے ریکارڈ میں اس کے بہت سارے فوٹو گرافس ہیں۔ ان کے اور پرنٹس نکلواؤ اور سب میں بانٹ دو۔۔۔ اور کچھ چاہیے تو وہ بھی بولویں گے اسے پکڑ دو۔ مجھے وہ زندہ یا مردہ ہر حال میں اپنے پاس چاہیے۔“ چیخ چیخ کر بولتا وہ خود کتنی اعصابی کشیدگی کا شکار ہے، یہ اس کے انداز سے ظاہر تھا۔

شہر پار نے بھی اس گفتگو کا ہر لفظ سنا اور سمجھ گیا کہ ہنوز وہ لوگ سلوک کی تلاش میں ناکام ہیں۔

”میرے آدمی اسے نہیں ڈھونڈ سکے تو تو سالہا گلے گا کہ وہ کہاں چھپا ہوا ہے۔“ فون سے فارغ ہو کر بھٹاگر اس کی طرف متوجہ ہوا اور اس کے تنے ہوئے جسم پر ایک لات رسید کر دی۔ اب معلوم نہیں کہ اس نے قوت زیادہ لگائی تھی یا زخم زخم وجود کے ساتھ تھی ہوئی حالت میں شہر پار کو اس کی شدت زیادہ محسوس ہوئی اور اسے اپنی چیخ کو روکنے کے لیے باقاعدہ نچلے ہونٹ کو دانتوں میں بھینچ کر اپنا منہ بند رکھنا پڑا۔

بھٹاگر نے دوسری لات اس کے بجائے اسٹریچر نما لکڑی کی اس میز پر ماری جس پر وہ لیٹا ہوا تھا۔ پاپوں میں نصب پیہوں کی وجہ سے میز فوراً ہی حرکت کرتی ہوئی اس کے نیچے سے نکل گئی اور اس کا جسم ہوا میں معلق ہو گیا۔ لمحہ لمحہ بڑھتے تناؤ کے ساتھ معلق حالت میں رہنا بہت تکلیف دہ تھا۔ اس کے چہرے پر اذیت کے آثار نمودار ہونے لگے اور مساموں سے پسینا پھوٹ پڑا۔ چرخی دھیمی رفتار سے مستقل چلتی رہی اور جسم میں تناؤ کی کیفیت میں بھی اسی حساب سے اضافہ ہوتا رہا۔ یہاں تک اسے محسوس ہوا کہ اس دو طرفہ کھنچاؤ کی وجہ سے یا تو اس کے جسم کے سارے جوڑ کھل جائیں گے یا وہ دو حصوں میں منقسم ہو جائے گا۔ اذیت اس انتہا کی تھی کہ اس کی قوت ارادی جواب دے گئی اور حلق سے چیخیں برآمد ہونے لگیں۔ کتنے ہی مضبوط اعصاب کا مالک سہی لیکن بہر حال وہ تھا تو گوشت پوست کا بنا انسان جس کی برداشت کی بہر حال ایک حد ہوتی ہے۔ اس کی چیخیں نکلتی دیکھ کر بھٹاگر کے تنے ہوئے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی اور اس نے ہاتھ اٹھا کر چرخی روکنے کا اشارہ کیا۔

زبان نہیں کھول رہے ہیں۔ عمیر نے جگو کے ذریعے صورت حال جاننے کی کوشش کی تھی لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ بس دونوں میاں بیوی کی ایک ہی رٹ ہے کہ اب وہ یہ کیس نہیں لڑنا چاہتے۔“ ذیشان نے اسے بتایا تو وہ افسردہ ہو گیا۔
”یہ بہت برا ہوا۔ قتل کے کیس سے چودھری نے اتنی آسانی سے اپنی جان چھڑالی۔“

”اس جیسے جاگیر داؤں کے لیے ایسے کیسز کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ وہ ان سے اپنی جان چھڑانے کے طریقے اچھی طرح جانتے ہیں اسی لیے تو مزے سے انسانی جانوں سے کھیلنے رہتے ہیں۔ ایک طوائف کی کیا حیثیت ہے۔ چودھری کے اعمال نامے میں تو نہ جانے کتنے معصوم اور بے گناہ انسانوں کا خون ناحق لکھا ہوا ہے لیکن ہر بار وہ ثبوت اور گواہ نہ ہونے کی وجہ سے بچ نکلتا ہے۔ شہر یار کے دور میں اس نے اساتذہ کے رہائشی مکان میں آگ لگوا دی تھی جس کے نتیجے میں ایک نوجوان استاد غیب جل کر مر گیا تھا لیکن چودھری کا کچھ نہیں بگڑا۔ گاؤں والوں میں سے کسی نے چودھری یا اس کے کارندوں کے خلاف گواہی دینے کی زحمت نہیں کی۔“ ذیشان حقائق بیان کرتے ہوئے خود بھی خاصا تلخ ہو گیا۔

”ہمارا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ ہم ظلم کے خلاف آواز اٹھانے کی جرأت نہیں رکھتے اور اپنی بزدلی سے ظالم کو مزید ظالم بناتے جاتے ہیں۔“ جاوید علی نے تبصرہ کیا اور خیال آنے پر پوچھا۔ ”آپ چودھری کی ٹیلی فون کالز بھی تو ٹیپ کروانے والے تھے، اس کام کا کیا ہوا؟“
”کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔“ ذیشان نے شانے اچکائے۔
”حویلی کی لینڈ لائن سمیت چودھری اور اس کے خاص ملازمین کے موبائل فونز تک کی کالز چیک کی جارہی ہیں لیکن کہیں سے کوئی کلیو نہیں مل رہا۔ ہمارے پاس کالز کی جو ریکارڈنگ پہنچ رہی ہے، ان میں چودھری کی کسی غیر قانونی سرگرمی کا نام و نشان بھی نہیں ہے۔“

”اس کا مطلب ہے کہ وہ پوری طرح چوکنا ہے اور اسے اندازہ ہے کہ فون پر کی جانے والی گفتگو اس کے لیے پریشانی کا باعث بن سکتی ہے اس لیے وہ احتیاط کر رہا ہے۔“
ذیشان کا جواب سن کر اس نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

”ایسا ہی لگتا ہے لیکن مجھے تعجب اس بات پر ہے کہ پھر چودھری اپنے یہاں کے کام کیسے چلا رہا ہے۔ اسے کسی نہ کسی طرح اپنے آدمیوں کو ہدایات تو دینی پڑتی ہوں گی۔ ملازمین بھی اسے یہاں کی اطلاعات دیتے ہوں گے لیکن جو

ریکارڈنگز ہمارے پاس آتی ہیں، ان میں کوئی سن گن نہیں ہے۔ تم شاہد اور چاندنی والے معاملے کو ہی لے لو۔ اگر چودھری کے کارندوں نے اپنے طور پر بھی ان کے خلاف کارروائی کی تھی تو اس کا رٹنا سے کو چودھری کے سامنے بیان تو کرنا چاہیے تھا لیکن بالکل خاموشی ہے۔ کیا تم یقین کر سکتے ہو کہ پیر آباد سے دور ہونے کے باوجود چودھری یہاں کے معاملات سے بے خبر ہو سکتا ہے؟“ ذیشان نے ایک اہم سوال اٹھایا۔

”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چودھری کے لیے پیر آباد کی اہمیت مسلم ہے۔ وہ دنیا میں کہیں بھی آوارہ گردی کرتا پھرے لیکن لوٹ کر اسے ہر حال میں پیر آباد ہی آنا ہے۔ اس کا اصل راج پاٹ تو وہیں ہے۔“ جاوید علی نے بڑی بے ساختگی سے حقیقت پر مبنی جواب دیا۔

”بس مجھے یہی تشویش ہے کہ وہ رابطے کا کون سا ذریعہ استعمال کر رہا ہے؟“ اس کی تائید ملتے ہی ذیشان پر جوش ہو گیا۔ ہم نیٹ سے لے کر فیکس اور ٹیلی گرام تک رابطے کے کسی بھی ذریعے سے غافل نہیں ہیں پھر بھی اندھیرے میں ہیں تو اس کی کوئی توجہ ہوگی۔ بس وہ وجہ ہی معلوم نہیں ہو رہی ہے، البتہ چودھری کا منشی اللہ رکھا جس موبائل کمپنی کی سم استعمال کرتا ہے، اس نے یہ عجیب و غریب بات بتائی ہے کہ بعض اوقات منشی کے موبائل فون کی گھنٹی بجتی ہے لیکن جیسے ہی ریکارڈنگ مشین کام کرتا شروع کرے، کال کٹ جاتی ہے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ایسی کسی کال کا کھوج بھی نہیں ملتا کہ یہ کس نمبر اور علاقے سے کی جارہی تھی۔“

”یہ تو واقعی بہت عجیب بات ہے سر۔“ ذیشان کی بات سن کر وہ بے چین ہو گیا۔ ”یہ ٹیکنالوجی کا دور ہے اور چودھری جن لوگوں کا آلہ کار بنا ہوا ہے، وہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں ہم سے بہت آگے ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ انہوں نے چودھری کو کوئی ایسی ڈیوائس دے رکھی ہو جس کی وجہ سے ہم اس کی کالز تک نہیں پہنچ پارہے۔“ جاوید علی بالکل درست سمت میں سوچ رہا تھا لیکن ان کی مجبوری تھی کہ ان کے پاس اس کا کوئی توڑ نہیں تھا۔

”ٹھیک ہے۔ دشمنوں کو اپنی چالیں چلنے دو۔ ایک نہ ایک دن تو ہم انہیں انجام تک پہنچا کر رہیں گے۔“ ذیشان نے اپنے عزم کا اظہار کیا تو جاوید علی فوراً ”انشاء اللہ“ کہہ اٹھا۔

”تمہیں معلوم ہے جاوید، تم میرے سب سے قابل ماتحت ہو اسی لیے میں تم سے بہت کچھ شیئر کر لیتا ہوں۔ آج کل مجھے بھارت میں کام کرنے والے اپنے انٹیل ایجنٹ

نہیں ہے۔ مختلف قدرتی عوامل کی وجہ سے ایسا ہوتا رہتا ہے لیکن پریشانی کی بات یہ ہے کہ یہ آگ لگ بھگ اسی جگہ پر لگی ہوئی ہے جہاں لیب کی موجودگی کا امکان ہے۔“ اس نے بتایا تو مشاہیرم خان کے چہرے پر پریشانی دوڑ گئی۔
”اب ہم کیا کریں فہم۔۔۔ ہمیں تو جانا ہی لیب کی طرف تھا؟“

”ہمارے پاس آگے بڑھنے کی گنجائش نہیں ہے۔ جنگل میں آگ بہت تیزی سے پھیلتی ہے۔ آگے بڑھنا خودکشی کے مترادف ہوگا۔ ہمارے پاس واپسی کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔“ فہم نے حقیقت پر مبنی جواب دیا۔
”لیکن ہم اس طرح ناکام کیسے واپس لوٹ سکتے ہیں؟ مصطفیٰ صاحب کو پورا یقین تھا کہ ماہ بانو کو اس لیب میں رکھا گیا ہے۔ اگر لیب جل رہی ہے تو ماہ بانو کی زندگی کو بھی تو خطرہ ہوگا۔ ہمیں اسے بچانے کے لیے کچھ کرنا چاہیے۔“ مشاہیرم خان بے چین ہو گیا۔

”تمہارا خدشہ غلط نہیں ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ اگر اپنی زندگیاں خطرے میں ڈال کر اس لڑکی کو بچا لینے کا امکان ہوتا تو میں بھی انکار نہیں کرتا۔ لیکن سچ یہ ہے کہ اگر وہ اس وقت لیب میں موجود ہے تو دنیا کی کوئی طاقت اسے نہیں بچا سکتی۔ ہم بھی اس کی زندگی کے لیے کسی معجزے کی دعا کرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے۔“ وہ بہت حقیقت پسندی سے کام لے رہا تھا۔ مشاہیرم خان کو بھی قائل ہونا پڑا کیونکہ بہت زیادہ فاصلہ ہونے کے باوجود اندازہ ہو رہا تھا کہ آگ کی شدت بہت زیادہ ہے اور کسی ذی روح کے بچنے کا امکان نہیں لیکن پھر بھی اس کا دل وہاں سے واپسی کے لیے آمادہ نہیں ہو رہا تھا۔

ماہ بانو کوئی عام لڑکی نہیں تھی۔ وہ شہریار عادل کی ایسی محبت تھی جس کا اس نے کبھی زبان سے اعتراف یا اظہار نہیں کیا تھا لیکن اس کے ہر عمل سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اس لڑکی کو دنیا کا ہر سکھ اور خوشی دینے کا خواہش مند ہے۔ شہریار جب حادثے کا شکار ہوا اور نامعلوم مدت کے لیے کومے کی حالت میں اسپتال کے بستر پر لیٹ گیا تو اس وقت وہ اس کے ساتھ نہیں تھا۔ اسے ہر وقت یہ دکھ کھائے جاتا تھا کہ اگر میں اسے ہی صاحب کے ساتھ ہوتا تو اپنی جان وار کر بھی انہیں بچا لیتا لیکن قسمت نے اسے موقع نہیں دیا تھا۔ اب اسے موقع ملا تھا کہ شہریار نہ سہی، اس کی محبت کو بچالے تو ساری راہیں مسدود ہو گئی تھیں۔

”کیا سوچ رہے ہو یار۔۔۔ واپس چلو۔ یہاں آگ

عادل خان کی بہت فکر ہے۔ مجھے اس کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں مل رہی ہے اور ڈر رہا ہوں کہ وہ کہیں پھنس نہ گیا ہو۔“ یہ ان کے اصولوں کے خلاف تھا لیکن ذیشان دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس کے سامنے اپنی پریشانی بیان کر بیٹھا۔
”یہ عادل خان وہی تو نہیں ہیں سر جنہوں نے کراچی میں میرے ساتھ کام کیا تھا؟ وہ بہت ذہین اور بہادر آدمی ہیں اور میری خواہش ہے کہ مجھے پھر بھی دوبارہ ان کے ساتھ کام کرنے کا موقع مل سکے۔“

”ہاں، میں اسی عادل خان کی بات کر رہا ہوں۔“
”تو پھر مجھے یقین ہے کہ بھارتی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔ وہ اگر ان کی گرفت میں آ بھی گئے تو زیادہ دن قابو میں نہیں رہیں گے۔ ان جیسے بہادروں کو زیر کرنا بھارتی چوہوں کے بس کی بات نہیں ہے۔“ اس نے بڑے یقین سے ذیشان کو امید دلائی۔

”اللہ کرے تمہارا یہ گمان سچ ثابت ہو۔ میں بھی اس کے لیے کچھ ایسا ہی سوچتا ہوں۔“ جاوید علی کو یہ مختصر جواب دے کر وہ بظاہر اپنے کام میں مصروف ہو گیا لیکن ذہن بہت سی فکروں میں الجھا ہوا تھا۔ ان فکرات میں شہریار کی سلامتی کے علاوہ ماہ بانو کی فکر بھی شامل تھی۔ اسے مشاہیرم خان کے آرلینڈ وینچنے کی خبر مل گئی تھی لیکن اس کے بعد ابھی تک ہنوز خاموشی تھی اور وہ نہیں جانتا تھا کہ مشاہیرم خان وہاں مصطفیٰ خان کی معاونت سے کیا کچھ کر رہا ہے۔ وہ تو اس دن سے بھی خوف زدہ تھا جب شہریار سے سامنا ہوتا اور وہ اسے ماہ بانو سے متعلق کوئی اچھی خبر دینے سے معذور ہوتا۔

☆☆☆

مشاہیرم خان جنگل میں تھا۔ اس کا ساتھ دینے کے لیے مصطفیٰ خان نے ایک آدمی کو بھی ساتھ کر دیا تھا۔ وہ دونوں تمام ضروری سامان سے لیس تھے اس لیے انہیں جنگل میں سفر کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آرہی تھی اور وہ تیزی سے اپنی منزل کی طرف بڑھتے جا رہے تھے۔ مصطفیٰ خان نے انہیں لیب کی لوکیشن سے کافی حد تک آگاہ کر دیا تھا اس لیے ان کا سفر ایک مخصوص سمت میں جاری تھا۔

”جنگل میں تو آگ لگی ہوئی ہے۔“ مشاہیرم خان کے ساتھی نے بہت دور اٹھتے آگ کے شعلوں کو دیکھ کر اسے بلند آواز میں آگاہ کیا۔

”واقعی... لیکن یہ آگ لگی کیسے؟“ مشاہیرم خان نے بھی اس جانب دیکھا اور حیرت کا اظہار کیا۔

”یہاں جنگلوں میں آگ لگنا کوئی غیر معمولی بات

بجھانے کی کوششیں شروع ہوئیں تو ہم کسی کی نظروں میں آجائیں گے اور جواب دی کرنی پڑے گی کہ ہم بغیر پرمٹ کے جنگل میں کیا کر رہے ہیں۔“ اسے سوچوں میں گھرا دیکھ کر فہد نے اسے ٹوکا۔

”تم واپس چلے جاؤ فہد... میں ماہ بانو کو لیے بغیر واپس نہیں جاسکتا۔“ آخر کار اس نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

”احتمالاً باتیں مت کرو۔ اس وقت تم اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتے۔ میرے ساتھ واپس چلو۔ ہمیں واپس جا کر سر سے حالات کے مطابق نئی ہدایات لینی ہوں گی۔“ فہد نے جھنجھلاتے ہوئے اسے سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ فہد نے بے بسی سے اس کی جانب دیکھا اور کچھ کہنے کے لیے لب کھولے لیکن پھر وہ دونوں ہی چونک گئے۔ بلاشبہ وہ فائر کی ہی آواز تھی جو انہیں سنائی دی تھی۔ وہ دونوں ہی اسلحہ شناس تھے اس لیے آواز سن کر بھی اندازہ لگا سکتے تھے کہ فائر رائل یا شارٹ گن کے بجائے پستل سے کیا گیا ہے اور ظاہر ہے شکاری حضرات پستل کا استعمال نہیں کرتے۔

”آؤ دیکھتے ہیں۔“ مشاہرم خان فوراً ہی آواز کی سمت دوڑا۔ فہد نے بھی اس کی پیروی کی۔ ایک فائر کے بعد انہیں کوئی دوسری آواز سنائی نہیں دی تھی۔ بس وہ اندازے سے ہی ایک سمت بڑھتے جا رہے تھے۔ بھاگتے ہوئے انہیں اس بات کا خیال رکھنا پڑ رہا تھا کہ ان کے قدموں تلے سوکھے پتے آکر نہ چمرائیں کیونکہ انہیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ آگے کیا صورت حال ہے اور انہیں دوست دشمن یا غیر جانب دار میں سے کس کا سامنا کرنا ہے۔

”وہ دیکھو، وہ کیا ہے؟“ اچانک ہی فہد نے ایک سمت اشارہ کرتے ہوئے کہا تو مشاہرم خان نے بھی اس طرف نظر ڈالی۔ وہ ایک موٹر سائیکل تھی جو بری طرح ٹوٹ پھوٹ چکی تھی۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ اسے کوئی حادثہ پیش آیا ہے۔ موٹر سائیکل سے کچھ فاصلے پر انہیں آڑی ترچھی حالت میں پڑی ایک آدمی کی لاش بھی دکھائی دے گئی۔ لاش کی کھوپڑی ٹوٹی ہوئی تھی جس سے بھیجا باہر آ گیا تھا۔ انہوں نے فوراً ہی اندازہ قائم کر لیا کہ گولی کا نشانہ بننے والا شخص یہی ہے لیکن گولی چلانے والے کا کچھ اتنا پتا نہیں تھا اسی لیے وہ سامنے آتے ہوئے بھی احتیاط کر رہے تھے کہ کہیں وہ چھپا ہوا آدمی انہیں ہی نشانہ نہ بنالے۔ درختوں کی آڑ سے چپکے چپکے جائزہ لیتے ہوئے پہلے مشاہرم خان کی نظر ایڈی پر پڑی۔

”وہ دیکھو، وہاں ایک بچہ پڑا ہوا ہے۔ وہ شدید زخمی ہے لیکن میرا اندازہ ہے کہ وہ ابھی زندہ ہے۔ اس کا سینہ حرکت کر رہا ہے۔“ زخمی ایڈی کو دیکھ کر وہ پرجوش ہو گیا۔

”میں جا کر اسے دیکھتا ہوں۔ تم یہیں رک کر مجھے کور دو اور ارد گرد پر نظر رکھو۔“ اب اس کے لیے اپنی جگہ پر رکنے رہنا ممکن نہیں تھا۔ ایک سات آٹھ سالہ بچے کو جنگل میں زخمی حالت میں بے یار و مددگار پڑا دیکھتے رہنا کسی بھی انسان دوست کے لیے ممکن نہیں ہوتا۔ فہد کی طرف سے کوئی جواب ملنے سے قبل ہی وہ درخت کے پیچھے سے نکل کر بچے کی طرف بڑھ چکا تھا۔ اس کے قریب پہنچ کر اس نے سب سے پہلے اس کی نبض چیک کی۔ نبض بہت آہستہ چل رہی تھی اور اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ اگر اسے فوری طبی امداد نہیں ملی تو وہ زندہ نہیں بچ پائے گا لیکن اس جنگل سے اسپتال تک پہنچنا بھی اتنا آسان نہیں تھا۔ وہ پیدل تھے اور انہیں جنگل کے قریب ڈراپ کر کے جانے والا ان کا ساتھی واپس لوٹ چکا تھا۔ ایڈی کا سر ذرا سا اوپر اٹھا کر اس نے پہلے اپنے پاس موجود پانی کی بوتل سے اس کے چہرے پر چھیننے دیے پھر بوتل اس کے ہونٹوں سے لگا دی۔ بہت تھوڑا سا پانی اس کے منہ کے اندر گیا اور زیادہ تر باچھوں سے بہہ گیا پھر بھی مشاہرم خان نے اپنی کوشش ترک نہیں کی اور اس کی ہتھیلیاں اور ٹکڑے سہلا کر اسے ہوش میں لانے کی تدبیر کرتا رہا۔ اس عمل کے دوران اسے احساس ہوا کہ بچہ اس کے اندازے سے زیادہ زخمی ہے۔ اس کی بہت سی ہڈیاں ٹوٹ چکی تھیں اور کچھ بعید نہ تھا کہ اندرونی اعضا کو بھی نقصان پہنچا ہو پھر بھی وہ اپنی سی کوشش کر لینا چاہتا تھا۔ لیکن حقیقتاً اسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ اسے کس طرح فرسٹ ایڈ دے۔ اس کا جسم بری طرح لہو لہان ہو رہا تھا اور لباس کی رنگت پر خون کی سرخی غالب آگئی تھی۔ اس حالت میں یہ سمجھنا ہی مشکل تھا کہ اسے کہاں کہاں چوٹیں آئی ہیں۔ بس ایک اچھی بات یہ تھی کہ اس کا سر خاصی حد تک محفوظ تھا اور سر اور چہرے پر چند معمولی سی خراشوں کے علاوہ کوئی چوٹ نہیں آئی تھی۔

”آہ... آہ۔“ آخر کار اس کی کوششیں رنگ لائیں اور بچے کے منہ سے کراہیں نکلیں لیکن اس کی آنکھیں اب بھی بند تھیں اور پونے یوں حرکت کر رہے تھے جیسے وہ انہیں کھولنے کی کوشش کر رہا ہو۔

”اے بچے اٹھو... آنکھیں کھولو اور بتاؤ کہ تمہیں کیا ہوا ہے؟“ مشاہرم خان نے اس کے گال تھپتھپائے تو وہ آنکھیں کھولنے میں کامیاب ہو گیا لیکن ان آنکھوں میں

گرداب

بتا دیا کہ کیسے اسلم ان لوگوں کو لے کر لیب سے نکلا اور پھر پروفیسر سے ٹکراؤ کے نتیجے میں اس کے ساتھ ہی ایک دلدل میں جا گرا۔ اس نے ماہ بانو کو یہاں سے نکالنے اور پھر طارق کو گولی مار دینے تک کے سارے ضروری واقعات بیان کر دیے لیکن اس کی آواز اتنی دھیمی تھی کہ مشاہرم خان کو باقاعدہ اپنا کان اس کے ہونٹوں کے نزدیک لے جانا پڑا تھا۔

ایڈی کی زبانی اسلم کی موت اور ماہ بانو کے زندہ بچ نکلنے کی اطلاع نے اسے بیک وقت افسوس اور خوشی کے جذبات سے ہمکنار کر دیا تھا اور وہ پہاڑوں کا بیٹا ہونے کے باوجود آنکھوں سے آنسو بہا رہا تھا۔ ان میں سے بہت سے آنسو ایڈی سے اظہار عقیدت کے لیے بھی تھے جس نے اپنے نحیف دُزار وجود کے ساتھ ماہ بانو کو طارق جیسے شیطان کے چنگل سے نکال دیا تھا۔

”ہم تمہیں اسپتال لے جاتے ہیں۔ وہاں تمہیں بہتر ٹریٹمنٹ ملے گا تو تم بچ جاؤ گے۔“ اسے احساس ہو رہا تھا کہ ایڈی کی نبض پہلے کے مقابلے میں مزیدست ہو چکی ہے پھر بھی اسے امید دلانے لگا۔

”نہیں، مجھے مزید گنی پک بن کر زندہ رہنا منظور نہیں۔ ویسے بھی اب میرا وقت پورا ہو گیا ہے۔ تم ہمت کر سکو تو یہ داستان دنیا کے سامنے لے آنا۔“ ایڈی نے اپنی آنکھوں کی بجھتی روشنی میں امید کا دیا جلاتے ہوئے اس سے کہا تو اسے یقین دلانے کے لیے مشاہرم خان نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

”میں تم سے وعدہ کرتا ہوں دوست کہ ایک دن یہ راز دنیا کے سامنے لا کر دنیا کی سب سے مہذب قوم ہونے کا دعویٰ کرنے والوں کی اخلاقی پستی اور مجرمانہ ذہنیت کو ضرور عریاں کروں گا کیونکہ تم میرے محسن ہو اور تم نے جس لڑکی کی جان بچائی ہے، وہ مجھے اپنی سگی بہن کی طرح عزیز ہے۔“ ایڈی سے وعدہ کرتے ہوئے مشاہرم خان جذباتی ہو گیا۔

”اب مجھے اطمینان ہو گیا لیکن یاد رکھنا کہ سب سے پہلے اپنی بہن کی حفاظت کا بندوبست کرنا ہے تمہیں۔ وہ اس جنگل سے نکل جانے کے باوجود پوری طرح محفوظ نہیں ہے۔ اپنے جرم پر پردہ ڈالنے کے لیے یہ لوگ ضرور اس تک پہنچنے کی کوشش کریں گے۔“ اس نے کسی سمجھ دار آدمی کی طرح مشاہرم خان کو نصیحت کی پھر اس سے تھوڑا سا پانی پلانے کی درخواست کر بیٹھا۔

مشاہرم خان نے بوتل کا ڈھکن کھول کر اس کے ہونٹوں سے لگائی۔ ایڈی نے ایک گھونٹ حلق سے نیچے

شدید نقاہت تھی۔ حقیقتاً اس کا اتنا زیادہ خون بہہ چکا تھا کہ آنکھیں کھول لینا بھی ایک معجزہ ہی تھا۔ وہ صرف حالیہ حادثے میں ہی زخمی نہیں ہوا تھا بلکہ اس سے قبل اسے ٹانگ میں گولی بھی لگ چکی تھی۔ گولی کا وہ زخم بھی اس حالیہ بھاگ دوڑ میں کھل گیا تھا اور خون کا بہاؤ دگنا ہو گیا تھا۔

”بیٹا! تم کون ہو اور یہاں اس جنگل میں کیسے پہنچے؟“ مشاہرم خان نے محبت اور ہمدردی سے اسے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ایک گائیڈ اور پھر افسران کے ڈرائیور کی حیثیت سے کام کرنے کی وجہ سے اس کی انگریزی کی استعداد اچھی تھی اس لیے وہ اس معاملے میں کسی دشواری کا شکار نہیں تھا۔

”میں تو پیدا ہی اس جنگل میں ہوا ہوں۔“ مشاہرم خان کے سوال کے جواب میں یہ جملہ کہہ کر ایڈی نے مسکرا نے کی کوشش کی لیکن تکلیف کے باعث بس ہونٹ کھینچ کر رہ گئے۔

”کیا مطلب؟“ مشاہرم خان حیران ہوا۔

”تم پتا نہیں کون ہو لیکن میری زندگی ختم ہونے والی ہے، اس لیے میں تمہیں سب کچھ بتا دیتا ہوں، اس امید پر کہ شاید تمہارے ذریعے یہ داستان باہر کی دنیا تک پہنچ جائے۔“ اس کا انداز گفتگو مشاہرم خان کو حیران کر رہا تھا۔ اس نے آج تک کسی بچے کو اس انداز میں بولتے ہوئے نہیں دیکھا تھا لیکن وہ تو ایڈی تھا۔ پروفیسر ہنری کی تحقیق اور تجربات کا نتیجہ جو اپنے آٹھ سالہ وجود میں جوان آدمی کا دماغ اور جذبات رکھتا تھا۔

”اس جنگل میں زیر زمین ایک تجربہ گاہ ہے جہاں نوزائیدہ بچوں اور حاملہ خواتین کو تجربات سے گزارا جاتا تھا۔ اس لیب کا انچارج پروفیسر ہنری تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ ایک ایسا بچہ ”ایجاد“ کر سکے جو دیکھنے میں تو بچہ ہی لگے لیکن اس کی کھوپڑی میں بڑے آدمی کا دماغ ہو۔ اس کی اس خواہش کے پیچھے کیا مقصد تھا یہ تو مجھے نہیں معلوم لیکن یہ جانتا ہوں کہ اس چکر میں اس نے بڑا ظلم کیا اور انسان کے بچوں کو گنی پک کی طرح اپنے تجربات کی نذر کر دیا۔ اس کے ظلم و ستم کا یہ سلسلہ پتا نہیں کب تک جاری رہتا لیکن خدا کی قدرت سے وہ ماہ بانو نامی ایک ایسی حاملہ عورت کو اپنی تجربہ گاہ میں لانے کی غلطی کر بیٹھا جس کا شوہر اس سے دیوانہ وار محبت کرتا تھا۔“ ماہ بانو کا نام سن کر مشاہرم خان بری طرح چونکا لیکن ایڈی کو ٹوکنا مناسب نہیں سمجھا اور تسلی سے اس کے اختصار سے بیان کیے واقعات سناتا رہا۔ ایڈی نے اسے

اتار اور پھر ایک زوردار ہچکی لے کر آنکھیں موند لیں۔ باقی کا پانی اس کی باجھوں سے بہہ گیا۔ مشاہد خان بوجل رکھ کر اسے دیوانہ وار ٹٹولنے لگا لیکن اس کے چھوٹے سے وجود میں کہیں زندگی کی کوئی رمت موجود نہیں تھی۔

”ہمیں یہاں سے چلنا ہو گا خان۔“ فہد جونہ جانے کب اس کے پیچھے آکھڑا ہوا تھا، اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولا تو وہ ہوش میں آیا اور ایڈی کا سر آہستگی سے واپس زمین پر رکھ دیا۔ اس معصوم و مظلوم وجود کو یوں چھوڑ کر جانا اس پر گراں گزر رہا تھا لیکن وہ مجبور تھا۔ ایڈی کی وصیت پر عمل کرنے اور ماہ بانو کی سلامتی کا انتظام کرنے کے لیے ان کا جلد از جلد یہاں سے نکل جانا ہی بہتر تھا ورنہ تاخیر کی صورت میں وہ خود بھی پھنس سکتے تھے۔ وہ فہد کے ساتھ واپسی کی راہ پر گامزن ہوا تو دل بری طرح بوجھل تھا۔

☆☆☆

”کیا خبر ہے ڈاکٹر؟“ کلینک کی انتظار گاہ میں بیٹھی کشور نے ڈاکٹر کی شکل دیکھتے ہی سوال کیا تو ڈاکٹر تسلی آمیز انداز میں دھیرے سے مسکرایا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

”آپ کے دونوں مریض خطرے سے باہر ہیں۔ خاتون سے ملاقات میں تو فی الحال کچھ وقت لگے گا لیکن آپ چاہیں تو مسٹر شاہ سے مل سکتی ہیں۔“

”مسٹر شاہ...“ کشور جو مراد شاہ کے سانپ سے ڈسے جانے کے واقعے سے لاعلم تھی، حیران ہوئی۔ ”انہیں کیا ہوا ہے؟“

”آپ کو نہیں معلوم؟ انہیں نہایت خطرناک سانپ نے ڈسا تھا لیکن یہاں آنے سے پہلے اچھی فرسٹ ایڈ مل گئی تھی اس لیے زہر زیادہ پھیل نہیں سکا۔“ ڈاکٹر کے انکشاف پر کشور کی آنکھیں پھیل گئیں۔ یہاں آتے وقت اس کی پوری توجہ ماہ بانو کو سنبھالنے پر مرکوز رہی تھی اس لیے اسے مراد شاہ کی حالت کا بالکل بھی اندازہ نہیں ہو سکا تھا اور اسے ایبوی لینس میں ڈرائیور کے برابر والی سیٹ پر بیٹھا دیکھ کر وہ یہی سمجھی تھی کہ وہ ان کے تنہا ہونے کے خیال سے ساتھ جا رہا ہے کیونکہ آفتاب تو امید کی وجہ سے گھر پر رہنے پر مجبور تھا لیکن اب اسے یاد آ رہا تھا کہ ان کے ایبوی لینس میں سوار ہوتے وقت آفتاب نے ایبوی لینس کے ڈرائیور سے کچھ گفتگو کی تھی جو یقیناً مراد شاہ کے متعلق ہی ہوگی۔

”میں مسٹر شاہ سے ملنا چاہتی ہوں۔“ اس نے کانپتی ہوئی آواز میں ڈاکٹر سے فرمائش کی۔

”کیوں نہیں۔ وہ روم نمبر تین میں موجود ہیں۔“

ڈاکٹر نے اسے بتایا تو وہ مزید کوئی بات کیے بغیر کلینک کے اس حصے کی طرف بڑھ گئی جہاں مریضوں کے لیے کمرے بنے ہوئے تھے۔ یہ ایک پرائیویٹ کلینک تھا جسے انڈونیشیا سے تعلق رکھنے والا ایک ڈاکٹر اپنے معاونین کی مدد سے چلا رہا تھا۔ مصطفیٰ کے اس ڈاکٹر سے گھرے مراسم کی ایک وجہ تو یہ نظر آتی تھی کہ مذہبی طور پر ڈاکٹر بھی مسلمان ہی تھا البتہ اندازہ کیا جاسکتا تھا کہ اس ایک ظاہری وجہ کے علاوہ بھی کوئی ایسی وجہ ہوگی کہ مصطفیٰ خان نے ان حالات میں اس پر مکمل اعتماد کا اظہار کرتے ہوئے ماہ بانو کو یہاں بھجوا دیا تھا۔

”اب کیسی طبیعت ہے آپ کی لالہ؟ آپ نے مجھے بتایا نہیں کہ آپ کو سانپ نے ڈسا ہے؟“ بیڈ پر نیم دراز مراد شاہ کو دیکھتے ہی اس نے بھرائی ہوئی آواز میں بولنا شروع کر دیا۔ ڈاکٹر کی زبانی سنی خبر اس کے لیے تو ایک صدمہ ہی ثابت ہوئی تھی ورنہ تو اسے یہ بھی خیال نہیں آیا تھا کہ کلینک پہنچ کر مراد شاہ کہاں غائب ہو گیا ہے۔

”ریلیکس بہنا! میں بالکل ٹھیک ہوں اور اسی لیے تمہیں کچھ نہیں بتایا تھا کہ خواجہ تمہاری پریشانی میں اضافہ ہو جائے گا۔“ مراد شاہ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے تسلی دی۔

”لیکن یہ ہوا کیسے؟ یہاں ایسے واقعات اتنے عام تو نہیں ہیں۔“ وہ ساری تفصیل جانا چاہتی تھی۔ جواب میں مراد شاہ نے اپنے سانپ سے ڈسے جانے اور ماہ بانو کی مدد سے لے کر ان کے گھر تک پہنچنے کی ساری کتھا سنا ڈالی جسے سن کر کشور کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

”اگر آج اباجی میرے سامنے ہوتے تو انہیں ضرور احساس دلاتی کہ وہ لڑکی جس کی زندگی برباد کرنے میں آپ نے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی، آج آپ کے بیٹے کی زندگی بچانے کا وسیلہ بن گئی۔“

”کیا مطلب؟“ اس بار حیران ہونے کی باری مراد شاہ کی تھی۔

”یہ اباجی کے ظلم کی بڑی شرمناک داستان ہے جسے آپ کے سامنے بیان کرتے ہوئے مجھے بالکل اچھا نہیں لگے گا۔“

”پھر بھی کچھ تو بتاؤ۔“ کشور کے گریز نے مراد شاہ کے تجسس میں مزید اضافہ کر دیا۔ اس کے اصرار پر کشور نے مختصر مناسب الفاظ میں ماہ بانو کی داستان حیات سنا ڈالی۔

”یہ تو واقعی بہت ظلم کیا اباجی نے۔ کتنی پاک اور

لگا لیے۔

”ان کے ہاں کیا ہوا ہے، بیٹا یا بیٹی؟“ کشور نے تجسس سے پوچھا۔
”بیٹا ہے لیکن ابھی اسے ہم نے انڈر آبزرویشن رکھا ہوا ہے۔“ نرس نے اسے اطلاع دی۔

”اس کی جان کو کوئی خطرہ تو نہیں ہے نا؟ اصل میں، میں اس لیے پوچھ رہی ہوں کہ پری میچور بچے عام طور پر بہت کمزور ہوتے ہیں اور ان کا سروائیو کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔“ سوال کرنے کے ساتھ ہی اس نے وضاحت بھی پیش کی۔ ماہ بانوان کی گفتگو سے بے نیاز بے خبر سوئی ہوئی تھی اور یقیناً ایسا مسکن دواؤں کے استعمال کی وجہ سے تھا۔

”ارے نہیں، صحت کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ عمومی پری میچور بچوں کے مقابلے میں اس کی صحت بہت اچھی ہے اور وزن کے اعتبار سے وہ بالکل نارمل بچوں جیسا ہے۔ لیکن اس کا بابا یاں ہاتھ نارمل سائز کا نہیں ہے اور اندیشہ ہے کہ وہ مستقبل میں اپنے اس ہاتھ کو استعمال کرنے سے قاصر رہے گا۔ ڈاکٹرز جائزہ لے رہے ہیں کہ اس میں کوئی اور کمی یا پیچیدگی تو نہیں ہے۔“ نرس نے پروفیشنل انداز میں آگاہ کیا تو کشور افسردہ ہو گئی اور اسے دکھ ہونے لگا کہ اتنی تکلیفوں کے بعد ماہ بانو کو ملنے والی یہ خوشی بھی ادھوری سی ہے۔ اسی وقت دروازہ ٹاک کر کے بقیس اندر داخل ہوئیں۔

”کیسی ہے مہرین؟“ انہوں نے ماہ بانو کا وہ نام لے کر پوچھا جو اس کے پاسپورٹ پر درج تھا۔ چونکہ ان کی مخاطب کشور تھی، اس لیے اس نے انہیں تمام تفصیلات سے آگاہ کر دیا۔

”اوہ مائی گاڈ! میرے پاس بھی اس کے لیے کوئی اچھی خبر نہیں ہے۔“ انہوں نے افسوس سے کہا اور بتانے لگیں۔ ”مصطفیٰ کو اطلاع ملی ہے کہ اسلم کی ڈیٹھ ہو گئی ہے۔ وہ ایک دلدل میں گر گیا تھا جہاں سے اسے نکالا نہیں جا سکا۔“ ان کی دی اس اطلاع نے کشور کو لرزاکر رکھ دیا۔

”میرے اللہ...! یہ لڑکی آخر اتنے صدے ایک ساتھ کیسے برداشت کرے گی؟“ وہ سخت متفکر تھی۔

”ہمیں اسے حوصلہ دینا ہوگا۔ یوں بھی یہ بہت باہمت لڑکی ہے، جلد یا بدیر اللہ کی رضا میں راضی ہو جائے گی۔ وہ مالک اپنے بندوں کو آزمائش میں ضرور ڈالتا ہے لیکن ان پر ظلم نہیں کرتا۔ مجھے یقین ہے کہ اس اتنی پیاری لڑکی کے لیے ان دکھوں کے بعد کوئی بہت اچھا صلہ رکھا ہوگا اس نے۔“

شفاف لڑکی ہے وہ۔ اسے تو ایک نظر دیکھ کر اس کا احترام کرنے کو دل چاہتا ہے اور اباجی نہ جانے کیسے تین تین بیٹیوں کے باپ ہوتے ہوئے بھی اتنی معصوم اور کم سن لڑکی کے لیے ناپاک عزائم رکھتے تھے۔“ اپنے باپ کے کردار سے آگاہ ہونے کے باوجود اسے دلی رنج ہوا۔

”لالہ! اللہ کے بعد آپ پر ماہ بانو کا احسان ہے کہ اس وقت آپ صحیح سلامت بیٹھے ہوئے ہیں اس لیے میں آپ سے درخواست کروں گی کہ آپ اس کے لیے ضرور کچھ کیجیے گا۔ اباجی کی اولاد میں سے واحد آپ ہی ہیں جو ان کے مقابل کھڑے ہو سکتے ہیں اور وارث کی حیثیت سے آپ کا فرض بھی بنتا ہے کہ ان کے کیے کی تلافی کریں۔“ کشور نے اس سے درخواست کی۔

”بالکل... مجھ سے جو ہو سکا اس کے لیے ضرور کروں گا لیکن تم یہ بتاؤ کہ اس کا ابھی کیا حال ہے؟“ مراد شاہ نے اسے یقین دہانی کرواتے ہوئے ماہ بانو کی حالت کے بارے میں پوچھا۔

”ڈاکٹر نے بتایا ہے کہ اس کی حالت خطرے سے باہر ہے۔“ مراد شاہ کو جواب دیتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ اس کی معلومات ادھوری ہیں۔ دراصل بھائی کے بارے میں خبر سن کر فطری طور پر وہ اس کے لیے اتنی فکر مند ہو گئی تھی کہ ڈاکٹر سے ماہ بانو کے بارے میں تفصیلات جاننے کا خیال ہی نہیں رہا تھا اور اب اپنے اس رویے پر شرمندگی سی محسوس ہو رہی تھی۔

”میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تم جاؤ اور اس کی خبر لے لو۔“ مراد شاہ نے اس کی کیفیت کو سمجھتے ہوئے رسان سے کہا تو وہ کمرے سے نکل گئی اور انکو آری سے ماہ بانو کا کمر معلوم کر کے وہاں پہنچ گئی۔ ماہ بانو کی پر سر رکھے گہری نیند سو رہی تھی اور ایک نرس اس کی دیکھ بھال کے لیے مستعد بیٹھی ہوئی تھی۔ ”اب کیسی طبیعت ہے ان کی؟“ اس نے نرس سے ہی دریافت کیا۔

”پہلے سے بہت بہتر ہیں لیکن ابھی بہت دیکھ بھال کی ضرورت ہے۔ کیس خاصا مشکل تھا اور ان کی حالت کو مزید مشکل بنا دیا تھا۔ میرے خدا... میں نے اپنے آٹھ سال کے کیریئر میں کسی حاملہ خاتون کو اتنی بری حالت میں نہیں دیکھا۔ حقیقتاً ہمیں سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ پہلے ان کے زخموں کی مرہم پٹی کریں یا بے بی کو ڈیلیور کروائیں۔ بس سمجھیں کہ اوپر والے کی مہربانی سے ماں اور بچے کی زندگی بچ گئی ورنہ ہمیں تو دانتوں پسینا آ گیا تھا۔“ نرس نے گویا کانوں کو ہاتھ

مسز بلقیس مصطفیٰ زیادہ بردبار خاتون تھیں اس لیے فوراً ہی خود کو سنبھال لیا اور مثبت انداز میں سوچنے لگیں۔ ان کی سوچ سے کشور کو بھی ڈھارس ملی اور ساتھ ہی یہ تسلی بھی ہو گئی کہ وہ بلقیس کے ساتھ مل کر اس صورت حال سے زیادہ اچھی طرح نمٹ سکے گی۔ کسی کو حوصلہ دینے کے لیے انسان کے اپنے پاس بھی حوصلہ ہونا ضروری ہوتا ہے اور اس وقت بلقیس اس کا حوصلہ بن گئی تھیں۔

☆☆☆

وہ بے لباسی کی حالت میں ٹھنڈے فرش پر پڑا ہوا تھا اور جوڑ جوڑ دیکھتے جسم میں فرش کی ٹھنڈک اتر کر درد کے احساس کو مزید سوا کر رہی تھی۔ بھوک، پیاس اور تشدد نے جسم کو اتنا نڈھال کر دیا تھا کہ کروٹ بدلنے کو بھی دل نہیں چاہتا تھا اور ہوش میں ہونے کے باوجود وہ بالکل بے سدھ پڑا ہوا تھا۔ صرف آنکھیں تھیں جو حلقوں میں حرکت کر رہی تھیں لیکن ان کے سامنے بھی دھند سی چھائی ہوئی تھی اور کوئی منظر صاف نظر نہیں آتا تھا۔ یکدم ہی اسے دھند کے اس پار حرکت کا احساس ہوا۔ کوئی تھا جو دروازہ کھول کر اندر آیا تھا۔

وہ بصارت پر زور دے کر آنے والے کو دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کی نظروں نے سب سے پہلے سیاہ رنگ کی اس چادر کو فوکس کیا جس پر نیلے رنگ کے چھوٹے چھوٹے پھول کڑھے ہوئے تھے۔ وہ چونک گیا۔ اس قید خانے میں بھلا عورت کا کیا کام تھا؟ حیرت زدہ سا وہ چادر میں لپٹے اس بیوے کو اپنی طرف بڑھتا دیکھتا رہا جس کے نقش و نگار واضح نہیں تھے لیکن یہ چادر اس کے لیے ضرور آشنا تھی۔ میں نے اس چادر کو کہاں دیکھا ہے؟ اس نے اپنی یادداشت پر زور دیا اور پھر یکا یک ذہن میں جھماکا ہوا۔ یہ چادر تو اس نے بلتستان کے سفر کے دوران بشام ہوٹل میں قیام کرنے پر ایک ویٹر سے خرید کر ماہ بانو کو دی تھی۔ وہ ویٹر اپنے گھر کی عورتوں کے ہاتھوں تیار کردہ دستکاری کے نمونے گا بہوں کو فروخت کر کے اضافی آمدنی حاصل کرتا تھا۔ اسے یہ چادر ماہ بانو کے لیے اتنی پسند آئی کہ فوراً ہی خرید لی اور واقعی چادر ماہ بانو پر سج گئی تھی لیکن یہاں کون تھا جو وہ چادر پہنے اس کے سامنے چلا آیا تھا۔ وہ اپنی پوری جان آنکھوں میں سمو کر دھند سے ابھرتی اس شبیہ کو دیکھنے لگا اور جب اس کے نقش و نگار واضح ہوئے تو گویا شادی مرگ میں جتلا ہو گیا۔

”ماہ بانو... تم... تم یہاں کیسے؟“ اس نے استعجاب و خوشی کی ملی جلی کیفیت میں پوچھا۔

”میں آپ کے لیے آئی ہوں۔ آپ اتنی تکلیف میں

تھے کہ میں آپ سے دور رہ ہی نہیں سکی اور سب چھوڑ چھاڑ کر آپ کے پاس چلی آئی۔“ وہ اس کے قریب دوزانو بیٹھتی ہوئی اپنی شیریں آواز میں بولی تو وہ خوش ہو گیا۔ کسی کے لیے آپ اتنے اہم ہوں کہ وہ آپ کے لیے سب چھوڑ دے، یہ احساس ہوتا ہی بہت خوش کن ہے لیکن اس کی خوشی مل بھری کی ہی تھی کیونکہ اسے کچھ یاد آ گیا تھا۔

”تمہیں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا ماہ بانو! تم اب اسلم کی ہو۔ تم پر بس اس کا حق ہے۔“ دل پر جبر کر کے اس نے ماہ بانو کو ٹوکا۔

”نہیں، مجھ پر سب سے پہلے آپ کا حق ہے کیونکہ میرا آپ سے دل کا رشتہ ہے اور یہ رشتہ سب رشتوں پر بھاری ہوتا ہے۔“ وہ جو اس کی ہر بات پر سر تسلیم خم کر دیا کرتی تھی، ضدی لہجے میں بولی۔

”دنیا ان باتوں کو نہیں مانتی۔“ اس نے کمزور سے لہجے میں اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”اور میں دنیا کو نہیں مانتی۔“ وہ مزید ضدی ہوئی۔

”اچھا چھوڑو اس بحث کو۔ مجھے تھوڑا سا پانی پلا دو۔“

حلق بالکل خشک ہو رہا ہے۔“ اس نے بحث ٹالنے کے لیے فرمائش کی۔ یوں بھی اسے بہت شدید پیاس لگ رہی تھی۔

اس کے فرمائش کرتے ہی ماہ بانو نے پانی کا بھرا ہوا گلاس اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ اس نے بہت بے چینی سے گلاس سے گھونٹ بھرنے کی کوشش کی لیکن جانے کیا ہوا کہ

گلاس ماہ بانو کے ہاتھوں سے چھوٹ کر زمین پر گر گیا اور سارا پانی بہہ گیا۔

”نہیں...“ وہ زور سے چیخا اور پھر اس کی آنکھ کھل گئی۔ کھلی آنکھوں سے نظر آنے والے عقوبت خانے کے

منظر میں ماہ بانو تھی اور نہ ہی زندگی کو رواں رکھنے والا پانی۔ وہ محض ایک خواب دیکھ رہا تھا۔ ایسا خواب جو اس کے دل کے چور خانوں میں چھپی تصویر کو سامنے لے آیا تھا۔ عام

حالات میں اسے اپنے اعصاب پر اتنا قابو رہتا تھا کہ وہ کبھی ماہ بانو کے خیال کو خود پر حاوی نہیں ہونے دیتا تھا۔ اس کے

لیے زندگی کو سہل بنانے کی کوششیں اپنی جگہ لیکن اس کی پاکیزہ محبت کو یہ گوارا نہیں تھا کہ وہ اسلم کی منکوحہ کو اپنے تصور

میں لانے کی جسارت کر سکے۔ لیکن کہتے ہیں تاکہ انسان انتہائی خوشی اور تکلیف میں اسے یاد کیے بغیر نہیں رہ سکتا جس

سے سب سے زیادہ محبت کرتا ہو... سو وہ بھی لاشعوری طور پر ماہ بانو کو اپنے تصور میں دیکھنے کی غلطی کر بیٹھا تھا لیکن یہ

تصور بھی ذرا دیر کا تھا اور حقیقت کی دنیا میں وہ اس حال میں

گرداب

ہوا۔ کھڑی پٹر کی چند آوازوں کے بعد قدموں کی چاپ اس کے قریب آ کر بند ہو گئی اور وہ اس کے بال سختی سے مٹھی میں جکڑ کر چلا یا۔

”چل اوئے مہمان کے بچے، تیری خوراک کا سہ ہو گیا ہے۔“ اس نے زنجیروں میں جکڑے شہریار کے سر پر زبردستی ایک آہنی خود پہنا دیا۔ شہریار جو آنکھیں کھول چکا تھا، یہ دیکھ کر چونک گیا کہ آہنی خود کے ساتھ بجلی کے تار جڑے ہیں اور اسے خود پہنانے والا تاروں کے ساتھ موجود پلگ لے کر سوئچ پینل میں موجود ساکت میں لگا رہا ہے۔ وہ فوراً ہی سمجھ گیا کہ اس کے ساتھ کیا سلوک کیا جانے والا ہے۔ ”اپنے سارے حربے آزما کر دیکھ لو بھئی مگر لیکن تمہیں حاصل کچھ نہیں ہونے والا۔“ اس نے بھئی مگر کو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے چیلنج کیا۔

”تم کچھ بھی کہو ہمیں تو اپنی پریم پر اپوری کرنی ہے۔ ہم تمہاری پوری خاطر کریں گے تاکہ مرتے سے یہ شکایت نہ کرو کہ ہم سے تمہاری سیوا میں کوئی کمی رہ گئی ہے۔“ اس نے جواب دیا اور پھر اطمینان سے کھانے میں مصروف ہو گیا۔ ادھر شہریار پر قیامت ٹوٹ گئی۔ بجلی کے وہ جھٹکے تپتی دیر تک اسے دیے گئے، وہ صحیح حساب تو نہیں لگا سکا لیکن حقیقتاً اس پر سے ایک قیامت گزر گئی تھی۔ ہمیشہ کی طرح اول اول اس نے ضبط سے کام لینے کی کوشش کی اور چیخوں کو حلق میں ہی گھونٹتا رہا لیکن پھر اس کی یہ کوشش ناکام ہو گئی اور حلق سے چیخیں برآمد ہونے لگیں۔ فوراً ہی برقی رو منقطع کر دی گئی اور وہ ہانپتے ہوئے خود کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگا۔ چند سیکنڈ کے اندر اندر اس کی حالت بری ہو گئی تھی اور اب پورا جسم پسینے میں بھیگ رہا تھا۔

”اپنی ہار مان کر سب کچھ بتانے کا وعدہ کرو تو میرے ساتھ اس کھانے میں شریک ہو سکتے ہو ورنہ ہمیں تمہاری کچھ نہ کچھ خاطر تو کرنی ہی ہے۔“ بھئی مگر جو اپنے لیے جام تیار کرتے ہوئے اس کی حالت کا بغور جائزہ لے رہا تھا، بیک وقت ترغیب اور دھمکی دیتے ہوئے بولا۔

”تم جیسے حرامہ کے پلے کے ساتھ کھانے میں شریک ہونے کے مقابلے میں مجھے اپنی جان سے جانا منظور ہے۔“ شہریار نے نفرت سے جواب دیا جسے سن کر بھئی مگر کا چہرہ اہانت کے احساس سے سرخ پڑ گیا۔

”اس کے دماغ کا علاج کرو۔“ اس نے اپنے ماتحت کو حکم دیا اور ایک بار پھر شہریار کو اس قیامت سے گزرنا پڑا۔ اس بار دورانہ پہلے کے مقابلے میں زیادہ تھا۔

بڑا تھا کہ جوڑ جوڑ دکتے جسم کو اپنی مرضی سے حرکت دینے کا بھی اہل نہیں تھا۔

اسے اس حال کو پہنچا دینے والے سوراخوں کو اس کی اتنی خراب حالت کے باوجود ڈر تھا کہ وہ کوئی ایسی ویسی حرکت نہ کر ڈالے چنانچہ انہوں نے اسے زنجیروں میں جکڑ کر ڈالا ہوا تھا۔ ہر بار غیر انسانی تشدد سے گزارنے کے بعد وہ اسے یونہی تھوڑا سا وقفہ دیا کرتے تھے کہ شاید وہ اپنی شکست تسلیم کر لے لیکن وہ اپنی شکستہ حالت کے باوجود ذہنی طور پر ان کے آگے گھٹنے ٹیکنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ ہاں، جان وہ ضرور لے سکتے تھے اور اس کے جانے کا اسے غم نہ ہوتا کہ وہ سرے کفن باندھ کر ہی گھر سے نکلتا تھا۔

کھل ہوش میں آنے کے بعد اپنے عزائم کو دل میں دہراتا وہ یونہی وقت کی گھڑیاں گن رہا تھا کہ کمرے کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور پھر فوراً ہی اس کے نتھنوں سے ایک اشتہا انگیز خوشبو نکل کر آئی۔ اس خوشبو کو سونگھ کر خالی معدے میں بے چینی کی ایک لہری دوڑ گئی اور اس نے فوراً دروازے کی سمت دیکھا۔ ایک آدمی کھانے کی ٹرالی لیے اندر آ رہا تھا۔ ٹرالی اندر لا کر اس نے اس کرسی کے سامنے رکھ دی جس پر بیٹھ کر بھئی مگر اس سے مذاکرات کرتا تھا۔ ٹرالی لائے جانے کے چند لمحوں کے بعد بھئی مگر خود بھی اندر آ گیا اور کرسی پر پھیل کر بیٹھ گیا۔

”واہ... کیا شاندار مہک ہے۔ سو اد بھی لازمی اچھا ہو گا۔“ ٹرالی کے قریب چہرہ کر کے اس نے ایک گہری سانس کے ساتھ کھانے کی خوشبو اپنے اندر اتاری اور جھوم کر بولا۔ شہریار سمجھ گیا کہ وہ اس پر نفسیاتی دباؤ ڈالنے کے لیے ایسے اوچھے ہتھکنڈے استعمال کر رہا ہے چنانچہ اس کی طرف سے منہ پھیر کر آنکھیں بند کر لیں۔

”چکن تنکے سے اشارت کرتا ہوں۔ ایسا سنہری اور خستہ چکن تنکا میں نے اپنے جیون میں پہلے نہیں دیکھا۔“ اس کے بے نیازی برتنے کے باوجود وہ باز نہ آیا اور بلند آواز میں بول کر کھانا شروع کر دیا۔ اس کے کھانے کی آوازیں شہریار کے کانوں تک پہنچ رہی تھیں اور بالکل ایسا لگ رہا تھا کہ کوئی کسانڈیاں بھنبھوڑ رہا ہو۔

”ارے بھئی، ہمارے مہمان کو تو کچھ دو۔ کہتے ہیں مہمان بھگوان سمان ہوتا ہے اور بھگوان کی سیوا کرنا تو ضروری ہے نا... چلو پھر شروع ہو جاؤ۔“ اس کا یہ خطاب یقیناً کھانے کی ٹرالی لانے والے ماتحت سے تھا جس کے فوراً حرکت میں آ جانے کا اندازہ شہریار کو قدموں کی چاپ سے

درمیان میں وقفہ دے کر اس سے زبان کھولنے کے بارے میں پوچھا گیا اور انکار پر دوبارہ اس اذیت سے گزارا گیا۔ تا معلوم کتنی بار وہ اس اذیت ناک مرحلے سے گزرا اور آخر کار بے ہوشی کی بانہوں میں جا کر ہی پناہ پائی۔ بے ہوشی کا یہ دورانیہ کتنی مدت پر محیط تھا، یہ اندازہ لگانے کے لیے اس کے پاس کوئی پیمانہ نہیں تھا۔ اسے جس جگہ رکھا گیا تھا، وہاں ہر وقت نیم تاریکی رہتی تھی اور روشنی صرف اس وقت کی جاتی تھی جب وہ لوگ اس پر کوئی نیم ستم توڑنے کے لیے اس عقوبت خانے میں قدم رکھتے تھے لیکن ابھی تک اسے توڑنے میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے۔ ہوش میں آتے ہی اسے عجیب سا احساس ہوا پھر فوراً ہی اس کی وجہ بھی سمجھ آگئی۔ وہ ہوش میں خود نہیں آیا تھا بلکہ لایا گیا تھا اور اس کا ثبوت اس کا ترچہ تھا۔

”اٹھ جاؤ یار! اتنی دیر لگائی تو بڑی مشکل ہو جائے گی۔“ ابھی اس نے اپنی زنجیریں کھولتے ہی بولے کو دیکھا ہی تھا کہ اس کی آواز سن کر چونک گیا۔ وہ سو فیصدی سلو کی آواز تھی لیکن وہ پھر بھی بے یقینی کا شکار ہونے لگا اور ایسا محسوس ہوا کہ ماہ بانو کی طرح وہ سلو کو بھی حالت خواب میں دیکھ رہا ہے۔

”ہری اپ...! ابھی ہمیں یہاں سے نکلنا بھی ہے۔“ سلو نے اس کا چہرہ تھپتھپایا تو اسے یقین آیا کہ وہ کوئی خواب نہیں دیکھ رہا ہے۔ اس نے تیزی سے اپنی جگہ سے اٹھنے کی کوشش کی اور اس کوشش پر اس کی ہر ہڈی نے بھرپور احتجاج کیا۔ تشدد اور مستقل بندھے رہنے کی وجہ سے اس کا جسم فوری طور پر حرکت کرنے کے قابل نہیں تھا۔ سلو نے بھی یہ بات سمجھ لی اور ہمدردی سے بولا۔

”تم اپنے ہاتھ پیروں کو ہلا کر حرکت میں لانے کی کوشش کرو، میں ابھی آتا ہوں۔“ وہ ر کے بغیر فوراً باہر نکل گیا۔ شہر یار اس کی ہدایت کے مطابق اپنے ہاتھ پیروں کو ہلانے جلانے لگا۔ تھوڑی سی کوشش سے وہ اس قابل ہو گیا کہ کھڑا ہو سکے۔ کھڑے ہونے کے بعد بھی اس نے حرکت جاری رکھی اور پنچوں کے بل اچھلنے کے علاوہ بازوؤں کو بھی حرکت دیتا رہا۔ ان کوششوں کے دوران اسے اندازہ ہو گیا کہ اگرچہ تشدد نے اس کے جسم کا کباڑا نکال دیا ہے لیکن وہ اتنا گیا گزرا نہیں کہ بالکل ہی ہاتھ پیر چھوڑنے پر مجبور ہو جائے۔ سلو کی واپسی تک وہ خود کو کافی حد تک سنبھال چکا تھا۔

”یہ لو، یہ کپڑے پہن لو۔“ وہ پینٹ شرٹ پر مشتمل ایک جوڑا لیے اس کے سامنے کھڑا تھا۔ شہر یار نے شکر گزاری کے گہرے احساس کے تحت جوڑا اٹھا لیا اور جلدی

جلدی پہننے لگا۔ پینٹ لمبائی میں معمولی سی کم تھی لیکن گزارہ ہو سکتا تھا۔ کم سے کم بے لباسی کے مقابلے میں تو سب کچھ قابل قبول تھا۔

”تم یہاں کیسے پہنچے؟“ اپنا بنیادی مسئلہ حل ہوتے ہی اس نے سلو سے پوچھا۔

”لمبی کہانی ہے۔ پہلے یہاں سے نکل جائیں پھر بتاؤں گا۔ یہاں سے نکلنا اتنا آسان نہیں ہوگا۔ اس وقت ہم را کے ایک ٹھکانے پر موجود ہیں اور یہاں ہمیں کسی بھی وقت مشکل کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔“

سلو نے اسے جواب دیا اور ساتھ ہی ایک پستل بھی تھما دیا۔ خود اس کے اپنے ہاتھ میں ایک شارٹ گن موجود تھی۔ یہ وہ اسلحہ تھا جو وہ مون ہوٹل سے اپنے ساتھ لے کر چلے گئے لیکن شہر یار پھنس جانے کی وجہ سے اس سے محروم ہو گیا تھا جبکہ سلو پہلے ہی فرار ہو جانے کی وجہ سے اپنے پاس موجود اسلحہ بھی ساتھ لے جانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ وہ فرار ہو کر کہاں گیا تھا اور پھر یہاں کیسے پہنچا تھا، فی الحال یہ سب معلوم کرنے کا موقع نہیں تھا اور وہ قدم سے قدم ملائے سلو کے ساتھ اس عقوبت خانے سے باہر جا رہا تھا۔ عقوبت خانہ زیر زمین قائم کیا گیا تھا اس لیے وہاں دن میں بھی اندھیرا رہتا تھا۔

وہ سلو کے ساتھ سیدھیاں چڑھ کر اوپر آیا تو وہ خانے کے آہنی دروازے کے قریب ایک آدمی عریاں حالت میں پڑا نظر آیا۔ اس کی کھوپڑی چٹنی ہوئی تھی جو یقیناً شارٹ گن کے دستے سے لگائی گئی چوٹ کا نتیجہ تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ اس کے جسم پر موجود لباس بھی اسی شخص کا ہے۔

”یہاں کتنے لوگ ہیں، مجھے ٹھیک سے اندازہ نہیں ہے۔ میں سیدھا تم تک آیا تھا تا کہ دونوں مل کر یہاں سے نکلنے کی تدبیر کر سکیں۔“ سلو نے سرگوشی میں اسے بتایا اور وہ دونوں دروازہ کھول کر باہر نکل گئے۔ باہر نکلنے کے بعد انہوں نے دروازہ بند کر دیا۔ عریاں پہرے دار کی لاش بھی بند دروازے کے پیچھے ہی چھپ گئی۔ اب وہ ایک کوریڈور میں تھے جو فی الحال سنسان پڑا ہوا تھا۔ یہ ایک بالکل سیدھا اور سپاٹ دیواروں والا کوریڈور تھا جہاں نہ تو کسی کمرے کا دروازہ کھل رہا تھا اور نہ ہی چھپنے کی کوئی جگہ تھی۔ چنانچہ وہ دونوں محتاط لیکن تیز قدموں سے وہاں سے گزر رہے تھے۔ ابھی انہوں نے آدھا کوریڈور پار کیا تھا کہ آخری سرے پر موجود دروازہ کھلا اور ایک آدمی اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی ٹرے تھی جس میں چائے کے دو کپ

”میرے سوال کا جواب دو۔“ سلو نے اس کی گردن پر دباؤ ڈالنا شروع کیا۔

”بتاتا ہوں...“ وہ رحم طلب لہجے میں بولا اور پھر فر فر بتانا شروع کر دیا۔ اس کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق عمارت میں کل سات افراد موجود تھے جن میں سے دو کو تو وہ یہاں ڈھیر کر ہی چکے تھے جبکہ باقی پانچ میں سے دو آپریشن روم میں ڈیوٹی دے رہے تھے اور تین نے ریٹائرنگ روم میں تاش کی محفل جمائی ہوئی تھی جس کے ساتھ شراب کا دور بھی جاری تھا۔ بھنگا گر کے بارے میں معلوم ہوا کہ فی الحال وہ وہاں موجود نہیں ہے اور کسی کام سے نکلا ہوا ہے۔

عمارت کے بارے میں اس کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق یہاں سے نکلنے کے لیے مین گیٹ کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا اور مین گیٹ کو صرف آپریشن روم سے ہی کھولا اور بند کیا جاسکتا تھا۔ وہاں کوئی چوکیدار موجود نہیں تھا۔ ان معلومات کے حصول کے دوران سلو کو بار بار اس کی گردن پر دباؤ بڑھانا پڑتا تھا جب وہ رواں ہوتا تھا ورنہ بار بار انک جاتا تھا۔ سلو کو جب یہ اندازہ ہو گیا کہ اب اس کے پاس کچھ بتانے کو باقی نہیں بچا ہے تو اس نے اس کی گردن پر پاؤں کا پورا دباؤ ڈال دیا۔ دباؤ پڑنے پر وہ شخص بن پانی کی پچھلی کی طرح تڑپا اور پھر ساکت ہو گیا۔

”ہمارے سامنے دو ٹارگٹ ہیں... ایک آپریشن روم اور دوسرا ریٹائرنگ روم۔ دونوں جگہ ایک سے زائد افراد ہیں اس لیے ہم وہاں گوریلا ایکشن کے بجائے ڈائریکٹ ایکشن پر مجبور ہوں گے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ دونوں جگہ بیک وقت ایکشن لیا جائے۔ لیکن تم بتاؤ کہ تمہاری کیا پوزیشن ہے؟ میرے اندازے کے مطابق تم پر جتنا تارچہ ہوا ہے تمہارے لیے فی الوقت تیزی سے حرکت کرنا بھی مشکل ہو گا۔“ اس آدمی کو اس کے انجام تک پہنچانے کے بعد وہ شہر یار سے مخاطب ہوا۔

وہ لوگ جس جگہ موجود تھے، وہ اس اعتبار سے بڑی اچھی تھی کہ یہاں کوئی مداخلت کرنے والا نہیں تھا اور انہوں نے اطمینان سے ساری کارروائی نمٹائی تھی۔ شاید اس حصے کو وہ صرف بطور تارچہ سیل استعمال کرتے تھے اس لیے وہاں دو محافظوں کے علاوہ کسی کی مستقل آمدورفت نہیں تھی اور دوسرے افراد صرف اسی وقت یہاں رخ کرتے تھے جب کسی قیدی سے پوچھ گچھ کرنا مقصود ہو۔

”میں بیچ کر لوں گا۔“ اس نے مختصر جواب دیا۔ اس

رکھے ہوئے تھے جبکہ اس کی گن اس کے شانے سے لگی ہوئی تھی۔ قیاس کیا جاسکتا تھا کہ وہ پہرے دار کا ساتھی تھا جو چائے لینے گیا ہوا تھا اور اس کی غیر موجودگی میں یہاں بازی پلٹ گئی تھی۔ پورے اطمینان سے واپس آتے ہوئے وہ اس منظر کا گمان بھی نہیں کر سکتا تھا جو اس کے سامنے تھا۔ چنانچہ پہلے رد عمل کے طور پر اس نے یوں منہ کھولا جیسے اپنے سامنے بھوت دیکھ لیا ہو پھر چائے کی ٹرے ہاتھ سے چھوڑ کر گن سنبھالنی چاہی لیکن اس سے قبل ہی سلو حرکت میں آچکا تھا۔ اس نے کسی چیتے کی سی پھرتی سے جست لگائی اور آنے والے کے گن سنبھالنے سے پہلے اس پر جا پڑا۔

اگلے لمحے وہ اس کے نیچے تھا اور سلو ایک ہاتھ سے اس کا منہ دبوچے دوسرے سے اسے تار بڑ توڑ کے مار رہا تھا۔ اس دوران میں شہر یار بھی حرکت میں آیا اور دروازے کے قریب جا کر باہر جھانکا۔ کہیں کسی کے کوئی آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ اس نے دروازہ بند کر لیا اور پلٹ کر سلو کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے شکار کی اچھی خاصی درگت بتا چکا تھا اور اس طرح اس پر چھا گیا تھا کہ اسے جوابی رد عمل ظاہر کرنے کی بھی مہلت نہیں ملی تھی۔

”عمارت میں کتنے لوگ ہیں؟“ اسے سیکنڈوں میں اچھا خاصا ادھ موا کر دینے کے بعد اس نے سوال کیا جس کے جواب میں اس آدمی نے زور سے نفی میں گردن ہلائی جس کا مطلب تھا کہ وہ اس کے سوال کا جواب دینے کے لیے راضی نہیں ہے۔

”اس سے سوال جواب میں وقت ضائع کرنے کے بجائے اسے آف کرو۔ ہم باہر نکل کر خود ہی سب سے نمٹ لیں گے۔“ شہر یار کا اندازہ تھا کہ را کے کسی ٹرگے سے معلومات اگلوانا اتنا آسان نہیں ہو گا اس لیے اس نے سلو کو مشورہ دیا

”تم ابھی دیکھنا کہ یہ کیسے طوطے کی طرح فر فر بولے گا۔“ سلو یکدم ہی کھڑا ہو گیا اور اپنا ایک پیر اس آدمی کے سینے پر رکھنے کے بعد دوسرے کو کچھ اس انداز میں اس کی گردن پر رکھا کہ اس کا چہرہ بائیں رخ پر مڑ گیا اور جسم نے ایک زور کا جھٹکا کھایا لیکن منہ آزاد ہونے کے باوجود اس کے حلق سے ہلکی سی خرخراہٹ کے سوا کوئی آواز برآمد نہیں ہو سکی۔

”اب بولو کہ یہاں کتنے آدمی موجود ہیں؟“ سلو کے لہجے میں درندے کی سی غراہٹ تھی۔ سوال کرنے کے بعد اس نے اس شخص کی گردن پر سے پاؤں کا دباؤ تھوڑا کم کیا۔ وہ فوراً ہی کسی کتے کی طرح ہانپ ہانپ کر سانس لینے لگا۔

لی حالت اگرچہ واقعی خاصی خراب تھی لیکن خود پر اتنا اعتبار
 تھا کہ ہاتھ پیر بے شک زیادہ نہ چلا پائے لیکن اسلحے کے زور
 پر کچھ نہ کچھ کر ہی لے گا۔ اسی خیال کے تحت اس نے محافظ کی
 گن بھی اپنے ہاتھ میں لے لی تھی اور پستل جیب میں ڈال
 یا تھا۔

”او کے... پھر تم آپریشن روم کی طرف جاؤ، میں
 ریٹائرنگ روم والوں سے نمٹتا ہوں۔“

سلو نے فیصلہ کرتے ہوئے یقیناً اس بات کو ملحوظ رکھا
 تھا کہ شہریار کے حصے میں کم افراد آئیں کیونکہ مردہ حالت
 میں پڑے محافظ کی اطلاع کے مطابق آپریشن روم میں
 صرف دو افراد تھے۔ دونوں کمروں کی لوکیشن وہ معلوم کر
 چکے تھے اس لیے وہاں تک پہنچنا کچھ مشکل نہیں تھا۔

اطراف کا دھیان رکھتے ہوئے وہ دے قدموں آگے
 بڑھتے رہے۔ شہریار کے پاؤں میں جوتے بھی نہیں تھے
 کیونکہ جس محافظ کا لباس اس نے پہنا تھا، اس کے جوتے
 اس کے پاؤں میں نہیں آسکے تھے اور دوسرے کے جوتے
 چپک کرنے کا اسے خیال نہیں آیا تھا۔

”جب تمہاری طرف سے فائر کی آواز آئے گی، تب
 میں ایکشن لوں گا۔“ انگریزی حرف ایل کی شکل والے
 برآمدے میں ریٹائرنگ روم پہلے پڑتا تھا جبکہ آپریشن روم
 برآمدے کے مڑنے کے بعد دوسرے حصے میں تھا اس لیے
 اسے سرگوشی میں آگاہ کر کے سلو وہیں رک گیا جبکہ وہ سر کو
 تقبیہی جنبش دے کر آگے بڑھتا چلا گیا اور پھر آپریشن روم
 کے سامنے جا کر ہی رکا۔ کمرے کا دروازہ کھولنے کے لیے
 ابھی اس نے ہینڈل پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ اندر سے فون کی
 گھنٹی بجنے کی آواز سنائی دی۔ وہ بے ساختہ ہی رک گیا۔

”ییس سر!“ کال ریسیو کرنے والے کے مؤدبانہ
 انداز سے ظاہر تھا کہ وہ کسی اہم آدمی سے بات کر رہا ہے۔

”سہاش صاحب اور باقی لوگ ابھی ڈنر سے فارغ
 ہوئے ہیں۔ میں انہیں آپ کا میسج پہنچا دیتا ہوں۔“ شہریار
 کو دوسری طرف کی بات سنائی نہیں دے رہی تھی لیکن اتنا
 ضرور سمجھ آ رہا تھا کہ کوئی ایسا پیغام دیا گیا ہے جو ریٹائرنگ
 روم میں موجود افراد تک پہنچایا جانا ہے۔ اس کے اعصاب
 اپنی جگہ تن گئے کیونکہ امکان یہی تھا کہ وہ شخص پیغام پہنچانے
 کے لیے کمرے سے باہر نکلے گا اور اس کی مجبوری یہ تھی کہ
 جب تک وہ فون پر مصروف تھا، ایکشن لینے کی غلطی نہیں کر
 سکتا تھا کیونکہ اس صورت میں فون کے ذریعے کسی بھی گڑبڑ
 کی خبر باہر پہنچ جاتی۔ صورت حال کو دیکھتے ہوئے اس نے

انتظار کر لیتا ہی مناسب سمجھا حالانکہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس کی
 طرف سے کارروائی کے آغاز میں تاخیر سلو کو تشویش میں مبتلا
 کر رہی ہوگی۔

”اپنے بھٹناگر صاحب کو جانے کیا ہو گیا ہے۔ اس
 سے پہلے میں نے انہیں کبھی اتنا پریشان نہیں دیکھا۔ ایک
 طرف وہ اس سلو کی تلاش میں دیوانے ہو رہے ہیں تو دوسری
 طرف اس قیدی کے لیے فکر مند ہیں۔ وہ کوئی بھوت تو ہے
 نہیں کہ اتنی موٹی موٹی زنجیریں توڑ کر قید خانے سے نکل
 بھاگے گا۔ آئندہ اور نوود کی تہ خانے کے باہر ڈیوٹی لگا کر بھی
 انہیں چھین نہیں مل رہا ہے۔ ابھی مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ
 کسی نے جا کر قیدی کی خبر لی یا نہیں؟ میرا جواب سن کر
 بگڑنے لگے کہ اتنے خطرناک قیدی کی چننا کرنے کے
 بجائے یہاں لوگ ڈنر کرتے پھر رہے ہیں۔ اب تم بتاؤ کہ
 وہ بھوکا پیاس بندہ جس کا جوڑ جوڑ انہوں نے ہلا ڈالا ہے،
 آخر کمرے کا تو کیا کمرے کا؟“ فون کال ریسیو کرنے والے
 نے کال ختم ہونے کے بعد اپنے ساتھی کے سامنے اظہار
 خیال شروع کر دیا۔

”تو ان ساری ہنجایتوں میں کیوں پڑ رہا ہے یار! تجھے
 بھٹناگر صاحب نے جتنا کہا ہے اتنا کر۔ وہ ایسے بیکار میں
 پریشان ہونے والے آدمی نہیں ہیں۔ کچھ خاص بات ہے جسے تو
 وہ اتنی چننا کر رہے ہیں۔ تو نے اس بندے کا پکا پن نہیں دیکھا
 کیا؟ اتنے نارج کے بعد سب ”چھیں“ بول دیتے ہیں لیکن اس
 نے ابھی تک ایک بات بھی نہیں اگلی ہے۔ میرے حساب سے تو
 بھٹناگر صاحب کی پریشانی ٹھیک ہے۔“

دوسرے شخص نے اپنے ساتھی کی رائے سے
 اختلاف کرتے ہوئے بھٹناگر کے حق میں دلائل دیے۔
 شہریار کو وہ موقع بالکل مناسب لگا۔ اس نے ایک جھٹکے سے
 دروازہ کھولا اور اندر والوں کو سنبھلنے کا موقع دیے بغیر فائرنگ
 شروع کر دی۔ رد عمل میں فوراً ہی اسے ایک چیخ سنائی دی
 لیکن دوسرا شخص خاصا پھر تیرا ثابت ہوا۔ اس نے ایک بڑی
 میز کے پیچھے پناہ لیتے ہوئے فوراً ہی اس کی طرف ایک فائر
 داغا۔ شہریار کو بائیں بازو میں کہنی سے ذرا اوپر شدید جلن کا
 احساس ہوا۔ گولی اس کے بازو کو چھوتی ہوئی نکل گئی تھی۔ وہ
 فوراً ہی پیچھے ہٹ گیا اور دیوار کی آڑ میں رہتے ہوئے اندر
 برسٹ مارا۔ جواب میں اندر سے بھی فائرنگ کی گئی۔ حقیقتاً
 وہ دونوں اس پوزیشن میں تھے کہ کوئی بھی دوسرے کو نشانہ
 نہیں بنا سکتا تھا اور کامیابی کا امکان بس اسی صورت میں تھا
 کہ کوئی ایک اتفاقاً طور پر زد میں آ جائے۔ دوسری طرف سلو

نے بھی کارروائی شروع کر دی تھی کیونکہ وہ برآمدے کے دوسرے حصے میں ہونے والی فائرنگ کی آواز خوب اچھی طرح سن رہا تھا۔

”تمہارے لیے بہتر ہے کہ ہتھیار ڈال دو کیونکہ ہم سب کو مار کر بھی تم یہاں سے باہر نہیں نکل سکو گے۔“ فائرنگ کے دوران ذرا سا وقفہ آیا تو اندروالے نے چیخ کر اسے متنبہ کیا۔

شہریار نے زبان سے اس کی بات کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا اور دو فائر داغ دیے۔

”میری بات نہ مان کر تم بہت بڑی غلطی کر رہے ہو۔ میراوشواں کرو، یہ بلڈنگ تمہارے لیے چوہے دان ثابت ہوگی۔ تم اس کی دیواروں سے سر پٹختے رہ جاؤ گے لیکن اپنی مرضی سے باہر نہیں نکل سکو گے۔“

”وہ ہمارا مسئلہ ہے۔ تمہیں اتنی ہمدردی جتانے کی ضرورت نہیں ہے۔“ شہریار نے سختی سے اس کی بات کا جواب دیا۔ اسی وقت اس نے برآمدے کے موڑ سے سلو کو نمودار ہوتے دیکھا۔ وہ تیز لیکن بے آواز قدموں سے چلتا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا۔

”کیا پوزیشن ہے؟“ قریب آ کر اس نے سرگوشی میں پوچھا۔

”ایک مارا جا چکا ہے جبکہ دوسرے نے مقابلے کے لیے مورچا سنبھالا ہوا ہے۔“ اس نے بتایا۔

”تم برسٹ مارو، اندر میں دیکھتا ہوں۔“ سلو نے کہا تو وہ اس کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے ذرا سا پہلو بدل کر برسٹ مارنے کے لیے تیار ہو گیا۔ ادھر اس کی گن سے گولیاں نکلیں، ادھر اس نے سلو کو فرش پر اوندھا لیٹ کر دروازے کی طرف ریختے ہوئے دیکھا۔ اس کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا کیونکہ عین اسی وقت اندر سے بھی جوابی برسٹ مارا گیا تھا اور سلو دروازے کے عین سامنے ہونے کی وجہ سے نشانہ بن سکتا تھا لیکن خوش قسمتی نے

اس کا ساتھ دیا اور اندر سے آنے والی گولیاں اس کے اوپر سے گزرتی چلی گئیں۔ اصل میں اندر موجود بندے کو اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ اس کے مقابل کی مدد کے لیے کوئی اور آچکا ہے اس لیے اس نے پہلے ہی کی طرح دیوار کی آڑ میں چھپے شہریار کو نشانہ بنانے کی کوشش کی تھی۔ رینگ کے عین دروازے کے بیچ میں پہنچ جانے والے سلو کی طرف تو اس کی توجہ ہی نہیں گئی تھی اور اسی چیز کا سلو نے فائدہ اٹھایا تھا۔ میز کے پیچھے چھپا وہ بندہ فائر کرنے کے لیے آڑ سے ذرا باہر نکلا

تھا اور اس سے قبل کہ واپس پناہ گزین ہوتا، سلو کی شارٹ گن نے ایک قہقہہ اگلا اور اس کی کھوپڑی کے پرچے اڑ گئے۔ اب ان کے لیے میدان بالکل صاف تھا۔

وہ دونوں اندر داخل ہوئے۔ پہلے شہریار کا شکار ہونے والے کی گردن میں گولی لگی تھی اور وہ زندگی کی آخری سانسیں گن رہا تھا۔ وہ بد قسمت، شہریار اور اس کے مقابل کے درمیان ہونے والی فائرنگ کے تباہی کے زد میں بھی آیا تھا اور اس کے جسم کے مختلف حصوں میں گولیاں لگی ہوئی نظر آرہی تھیں لیکن یہ اس کی بد نصیبی بھی تھی کہ کوئی بھی گولی ایسے مقام پر نہیں لگی تھی کہ زندگی کا چراغ فوراً ہی گل ہو جاتا، سوائے سسک سسک کر اپنی جان دینی پڑ رہی تھی۔

اس پر نظر پڑتے ہی شہریار نے پہچان لیا کہ یہ وہی شخص ہے جس نے اسے خاردار کوڑے سے پیٹنے کے بعد زخموں پر نمک ملا تھا اور پھر سر کے نیچے آگ دھکا دی تھی۔ اب وہ اذیت پسند شخص خود شدید اذیت برداشت کرتے ہوئے موت کی آغوش میں جا رہا تھا۔ اسے اس کے انجام تک پہنچنے کے لیے چھوڑ کر وہ خود کمپیوٹر کی طرف متوجہ ہو گیا۔ سلو نے جس شخص پر تشدد کر کے معلومات حاصل کی تھیں اس نے یہی بتایا تھا کہ بیرونی گیٹ کو صرف آپریشن روم سے ہی کھولا اور بند کیا جاسکتا ہے اور اب وہ کی بورڈ پر مختلف بٹن دبا دبا بیرونی گیٹ کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ خوش قسمتی سے کمپیوٹر اور کنٹرول سینٹرل کمرے میں ایسے رخ پر رکھے ہوئے تھے کہ فائرنگ کی زد میں آنے سے محفوظ رہے تھے اور اس وقت وہ اس قابل تھا کہ مین گیٹ کھولنے کی کوشش کر سکے۔ اس کی اس کوشش کا نتیجہ فوراً سامنے آ گیا۔ مین گیٹ کھولنے کے لیے کمپیوٹر اس سے کوڈ مانگ رہا تھا اور ظاہر ہے اسے کوڈ معلوم نہیں تھا۔

”کیا ہوا... کام بنا؟“ مختلف دروازوں کو پھرتی سے کھول کر ان کی تلاشی لینے میں مصروف سلو نے اسے خاموش کھڑے دیکھ کر پوچھا۔

”نہیں، گیٹ کھولنے کے لیے کمپیوٹر کوڈ مانگ رہا ہے۔“ اس نے پریشانی سے بتایا تو سلو بھی پریشان ہو گیا اور بے ساختہ ہی اس شخص کی طرف دیکھا جو اب تک جان کنی کے عالم میں تھا۔ اس کے دیکھتے ہی اس شخص نے آخری جھٹکا لیا اور جان کنی کی تکلیف سے نجات پا گیا۔

”شٹ... یہ تو بہت برا ہوا۔ تم کوشش کرو کہ کسی طرح کوڈ ٹوٹ جائے۔“ جھنجھلائے ہوئے سلو نے اس سے فرمائش کی تو وہ دوبارہ کوشش میں مصروف ہو گیا لیکن جسم کی

اس کا دعویٰ بالکل درست ثابت ہوا تھا۔ واقعی وہ دیواروں سے سر پٹختے پھر رہے تھے لیکن باہر نکلنے کا راستہ تلاش نہیں کر پا رہے تھے۔ یہ عمارت ان کے لیے چوہے دان بن گئی تھی جہاں وہ پھنس کر رہ گئے تھے۔ باہر نکلنے کا صرف ایک ہی راستہ تھا، مین گیٹ اور وہ اس راستے کو کھولنے والے جادوئی ”کھل جاسم سم“ سے آگاہ نہیں تھے۔

ہر طرف سر پھوڑ لینے کے بعد وہ ایک بار پھر سیاہ رنگ کے گیٹ کے سامنے جا پہنچے لیکن وہ قسمت کے بند تالے کی طرح کھلنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ کچھ دیر اسے کھولنے کی لا حاصل سعی کرنے کے بعد وہ پلٹنے ہی لگے تھے کہ کسی گاڑی کے انجن کی آواز نے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ گاڑی گیٹ کے سامنے ہی آ کر رکی تھی لیکن دروازے میں کوئی درزن نہ ہونے کے سبب وہ اسے دیکھنے سے قاصر تھے۔ شہر یار کچھ سوچ کر سر پٹ آپریشن روم کی طرف بھاگا کیونکہ وہ وقتاً فوقتاً مستقل کوشش کرتا رہا تھا اس لیے کمپیوٹر کی اسکرین پر اس وقت بھی مین گیٹ کا منظر ہی نظر آ رہا تھا۔ اس نے کچھ منٹوں کو پیش کیا تو منظر وسیع ہو گیا اور گیٹ کے باہر موجود گاڑی نظر آنے لگی۔ جس وقت اس نے گاڑی کو دیکھا وہ ریورس ہو رہی تھی پھر بھی اسے ڈرائیونگ سیٹ پر موجود بھٹنا گر کا چہرہ نظر آ گیا جس پر اس وقت شدید الجھن اور پریشانی کے تاثرات تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے گاڑی اسکرین سے غائب ہو گئی اور سامنے سیاٹ زمین نظر آنے لگی۔

”کیا ہوا؟ کون تھا باہر؟“ اس کے پیچھے آپریشن روم میں آنے والے سلو نے پوچھا تو وہ آہستہ سے اس کی طرف پلٹا۔

”بھٹنا گر۔“ اس یک لفظی جواب میں سب کچھ تھا۔

وہ دونوں ہی جانتے تھے کہ بھٹنا گر کا یہاں تک آ کر واپس پلٹ جانا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ گیٹ نہ کھلنے پر وہ سمجھ گیا ہو گا کہ اندر کوئی گڑبڑ ہو چکی ہے اور ظاہر ہے یہ اس کی جگہ تھی اس لیے یہاں ہونے والی گڑبڑ سے نمٹنے کے لیے وہ موثر اقدامات کرنے کی پوزیشن میں تھا جبکہ وہ دونوں انتظار کے سوا کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ اور یہ بالکل عالم برزخ میں ٹھہرائی گئی روحوں کا سا انتظار تھا کہ دیکھیں پردہ غیب سے ان کے لیے جنت کے در کھلنے کا اعلان ہوتا ہے یا وہ جہنم میں دھکیلے جانے والے ہیں...!

ہنسی بھی تو انسانی بھی اس ہنگامے میں خرچ کر لینے کے بعد اس کے دماغ پر کمزوری سے دھند کی چھانے لگی تھی اور وہ بھرپور کوشش نہیں کر پا رہا تھا۔ سلو نے اس کی کیفیت کو بھانپ لیا اور تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر میں وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ڈبل روٹی اور دودھ کے ٹیڑا پیک تھے۔

”یہ لو، جلدی سے یہ کھا لو تا کہ کچھ کرنے کے لیے توانائی بحال ہو سکے۔“ اس نے ڈبل روٹی کے سلائس کے ساتھ ٹیڑا پیک اس کی طرف بڑھایا تو اس نے بلا تکلف دونوں چیزیں تھام لیں۔ شکستہ جسم کو اس وقت توانائی کی اتنی شدید ضرورت تھی کہ وہ فی الحال دشمن کے اس ٹھکانے سے نکلنے کی فکر بھی بھول گیا تھا۔

سلو دونوں چیزیں یقیناً فریج سے نکال کر لایا تھا اس لیے بے حد ٹھنڈی ہو رہی تھیں، اس کے باوجود وہ جلدی جلدی سلائس کو چباتا دودھ کی مدد سے حلق سے نیچے اتارتا چلا گیا۔ دوسری میز پر چڑھ کر بیٹھا سلو بھی اسی عمل میں مصروف تھا اور اس کے انداز سے بھی ظاہر تھا کہ اسے بھی کافی طویل وقفے کے بعد کچھ کھانے کو ملا ہے۔ ڈبل روٹی اور دودھ کے پیکنوں کو ٹھکانے لگانے کے بعد انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر زور سے ہنس دیے۔

”چلو چل کر یہاں سے نکلنے کا کوئی اور راستہ تلاش کرتے ہیں۔“ یہ تجویز سلو نے پیش کی جس سے اتفاق کرتے ہوئے وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ اگلے چند منٹوں میں انہوں نے پوری عمارت میں گھوم پھر کر دیکھ لیا۔ عجیب قلعہ نما عمارت تھی جس سے باہر نکلنے کا مین گیٹ کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔ کھڑکیوں پر لوہے کی اتنی مضبوط سلاخیں لگی تھیں کہ انہیں توڑنے یا کاٹنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ان دونوں نے پھر بھی اپنے طور پر کوشش کر کے دیکھ لی لیکن ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ عمارت کی بناوٹ کچھ ایسے طرز کی تھی کہ چھت پر جانے تک کا راستہ نہیں رکھا گیا تھا ورنہ وہ وہاں سے ہی نکلنے کی کوشش کرتے۔ دیواریں توڑ کر نکلنا بھی ممکن نہیں تھا کیونکہ اول تو دیواریں بہت مضبوط تھیں، دوسرے ان کے پاس ایسا ساز و سامان بھی نہیں تھا جس کی مدد سے ایسی کوئی کوشش کی جاسکتی۔ شہر یار کو اپنے مقابل کے آخری الفاظ یاد آئے۔ اس نے کہا تھا۔ ”میراوشوا اس کرو، یہ بلڈنگ تمہارے لیے چوہے دان ثابت ہوگی۔ تم اس کی دیواروں سے سر پٹختے رہ جاؤ گے لیکن اپنی مرضی سے باہر نہیں نکل سکو گے۔“

یہ پریمچ و سنسنی خیز داستان جاری ہے
مزید واقعات آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں

ایک تیر دو شکار

سلیم انور



سانپ بھی مرجائے اور لائھی بھی نہ ٹوٹے... یہ مشہور مثل آپ نے بھی سنی ہوگی...
سانپ اور لائھی کی خاصیت پر پورا اترنے والے دوست اور دشمن کی ملی جلی
جدوجہد... ہرجگہ... ہر دم ایک نیا رخ اختیار کرتی تیز رفتار کہانی کے اتار چڑھاؤ۔

جانے اور انجانے شخص کی شخصیت کے روپ در روپ... جرم کی دنیا کا ڈرامائی ڈراپ سین.....

فرینکلی ڈیوائس یہ سن کر ہنس دیا۔ گا ہے بگا ہے دربان
کی مٹھی گرم کرنا اس وقت اس کے کام آگیا تھا۔ وہ آتے
جاتے دربان کی لاپچی مٹھی میں کچھ نہ کچھ رکھ دیا کرتا تھا۔
سوٹ میں ملبوس ان دو افراد نے اپنا تعارف بطور

اس سہ پہر جب وہ باہر نکلا ہوا تھا تو سوٹ میں ملبوس
دو افراد اس کے بارے میں پوچھتے ہوئے کراؤن ان آئے
تھے۔ یہ بات اسے کراؤن ان کے دربان نے ان لوگوں
کے جانے کے بعد سیل فون پر فوراً ہی بتادی تھی۔

انشورنس سیزمین کرایا تھا لیکن فرینکلی کو علم تھا کہ وہ کون لوگ ہو سکتے تھے۔ اس نے اپنا کیریئر ہمہ وقت چوکس رہنے سے ہی بنایا تھا۔ ساتھ ہی وہ خود کو ہمیشہ غیر نمایاں رکھتا تھا اور اپنے حواس بھی تیز اور قائم رکھتا تھا۔

لیکن سوال یہ تھا کہ پولیس کو اس کے ٹھکانے کا علم کیونکر ہو گیا تھا؟

اب یہ بات بے معنی تھی۔ اس کا ماضی اسے پھنسا سکتا تھا اور یہاں سے غائب ہونے کے سوا اس کے پاس اور کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ یہ فرینکلی کی خوش قسمتی تھی کہ ٹورنٹو شہر کے اس گنجان علاقے میں صبح کے چار بجے ٹیکسی ملنا دشوار نہیں تھا۔ خود اس کی طرح یہ شہر بھی شاذ و نادر ہی سوتا تھا۔

”پیٹر سن ائرپورٹ!“ اس نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا۔ پھر اس سردرات کے سائے میں ٹیکسی کی نشست پر اطمینان سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

اسے احساس تھا کہ اب اسے اپنی پرانی طرز زندگی کی ہیجان خیزی اور ولولہ انگیزی سے محروم ہونا پڑے گا۔ جیسے کہ اس کی آخری واردات جو خاصی سنسنی خیز رہی تھی۔ یہ سوچتے ہی اس نے اپنے ہونٹ سختی سے بچھ لے۔

اسے نئے ماڈل کی پورٹے بیکسٹر کار چرانی تھی اور اسٹاک ایکسچینج ٹاور کی انڈر گراؤنڈ پارکنگ لاٹ سے اسے چرانا نہایت ہی آسان کام تھا لیکن برا یہ ہوا کہ کار کا مالک کچھ جلدی ہی واپس آ گیا۔ تب فرینکلی کے پاس اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں تھا کہ وہ اس سادہ لوح کو ہمیشہ کے لیے خاموش کر دے۔

اپنا اوور نائٹ بیگ ہاتھ میں تھا مے فرینکلی صبح منہ اندھیرے جانے والے ان مسافروں کی اس بھیڑ میں آسانی سے شامل ہو گیا جو ائرپورٹ میں داخل ہو رہے تھے۔ اس نے ایک الیکٹرانک مشین سے اپنے لیے جہاز کا ٹکٹ خریدا اور پھر ٹھہلتا ہوا انٹرنیشنل ڈیپارچرز کے چیک ان کاؤنٹر کی جانب روانہ ہو گیا۔

راستے میں ایک اوپن ائر کافی شاپ کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس نے ایک نگاہ اندر موجود اوور ہیڈ ٹی وی پر ڈالی۔ وہ یہ قطعی توقع نہیں کر رہا تھا کہ اس کا چہرہ مقامی خبروں میں دیکھنے کو ملے اور نیچے یہ پٹی چل رہی ہو جس پر لکھا ہو: ”پولیس کو مشتبہ قاتل کی تلاش۔“

اس نے اپنی جیب سے سیاہ فریم والی ایک عینک نکالی اور اسے پہننے کے بعد دیگر مسافروں کے ہم قدم آگے بڑھنے لگا۔ اس دوران اس کی چوکس نگاہیں مسلسل ان سیکورٹی

گارڈز پر جمی ہوئی تھیں جو ائرپورٹ کی عمارت کے اندر پٹرولنگ کر رہے تھے۔ فرینکلی کو علم تھا کہ زیادہ دیر نہیں جب پولیس اپنی تلاش کا دائرہ ائرپورٹ تک بڑھا دے گی۔

چیک ان کاؤنٹر پر ایک بیزار سے انٹینڈنٹ نے فرینکلی کے پاسپورٹ کے صفحات الٹ پلٹ کر چیک کیے اور اس کے بزنس ٹرپ کے بارے میں معمول کے چند سوال پوچھے۔

فرینکلی نے نہایت سکون کے ساتھ ان سوالات کے مختصر سے جوابات دیے۔ دس منٹ بعد اس کی اپنی فلائٹ میں بورڈنگ بھی ہو گئی۔

جب جہاز ہوا میں بلند ہو گیا تو فرینکلی پورٹو پلانا میں اپنی نئی پُر آسائش طرز زندگی کے تصور میں کھو گیا۔ ایک ملازمہ اور ایک باورچی سے لیس ایمبر کوئٹ کا وہ متمول گھر ایک پرائیویٹ آؤٹ ڈور پول اور کٹہرہ ائر کنڈیشنڈ کمروں کا حامل تھا جہاں سے بحر کا چاروں طرف سے مسلسل نظارہ کیا جاسکتا تھا۔

اور یہ سب نیویارک میں اس کے پاس ماریو کی مہربانی کا نتیجہ تھا۔ تاہم ایسا نہ ہوتا تب بھی ماریو کے لیے یہ کوئی مسئلہ نہیں تھا کہ وہ فرینکلی کے بچ نکلنے کے لیے کوئی بھی زبردست پلان کی تدبیر کر لیتا لیکن جب ماریو نے اسے ایک بہترین کاسمیٹک سرجن، ایک ٹرویپل ولا اور ایک نہایت آسان نیا معروف نام فراہم کرنے کی پیشکش کی... تو بھلا فرینکلی کیونکر انکار کر سکتا تھا۔

ہاں، ماریو ایک نہایت کھلے دل کا آدمی تھا۔ اس بات کو مد نظر رکھتے ہوئے کہ کس طرح فرینکلی گزشتہ گرمیوں میں صرف دو ملاقاتوں کے بعد اس کی بد صورت بہن سے جان چھڑا کر بھاگ کھڑا ہوا تھا۔

اس معاملے میں کون اسے قصور وار ٹھہرا سکتا تھا؟ گو ماریو کی بہن تیس سالہ ایک غیر شادی شدہ عورت تھی لیکن وقت سے پہلے عمر رسیدگی کی تباہ کاریوں..... کے زیر اثر آچکی تھی۔ پھر چونچ دار ٹاک اور ست آنکھیں بھی کسی کام کی نہیں تھیں۔ فرینکلی نے جب اسے پہلی بار دیکھا تھا تو پکا سو کی مسترد کردہ خیال کیا تھا۔ لیکن اپنے ان خیالات کو ماریو کے روبرو زبان پر لانے سے کھل احتیاط برتی تھی۔ اس کی مناسب وجہ بھی تھی۔ جس کسی نے بھی

ماریو کے ساتھ کام کیا تھا، وہ یہ بات بخوبی جانتا تھا کہ اپنی بہن کے خلاف معمولی سی بھی ہتک کو ماریو اپنی ذاتی توہین سمجھتا تھا۔ وہ ان لوگوں کے ساتھ کسی قسم کی رحم دلی نہیں کرتا

غریب باپ کا نکما بیٹا میٹرک کے امتحان میں فیل ہوا تو اسے بیٹے پر رہ کر غصہ آنے لگا کیونکہ اسی محلے کی ایک لڑکی اسی امتحان میں فرسٹ ڈویژن میں کامیاب ہوئی تھی۔

”اس لڑکی کو دیکھو... اس نے اپنے گھر اور خاندان کا نام روشن کر دیا... اور ایک تم ہو، نکمے، آوارہ اور جاہل۔“

باپ غصے میں آکر بیٹے کو بار بار یہی طعنے دے رہا تھا۔

اسی لعنت ملامت میں دو روز گزر گئے۔ تیسرے دن بیٹے نے باپ کی زبان سے یہی سب سنا تو اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور اس نے جل کر کہا۔ ”ابا! میں اس لڑکی کو اور کتنا دیکھوں۔ سال بھر اسی کو دیکھتے رہنے کے چکر میں پڑ کر میں امتحان میں فیل ہوا ہوں۔“

(کوئٹہ سے حسن سردار کی بے بسی)

جلدی اسے ایک نئی شناخت مل جائے گی۔ تب اسے اپنے ماضی کے کیے کسی بھی جرم کی پروا نہیں رہے گی جو اس کے اعصاب پر ایک بوجھ کی طرح سوار تھے۔

جب ٹیکسی فور وایا کونڈور پر واقع سفید رنگ کی دو منزلہ عمارت کے سامنے پہنچی تو فرینکلی نے عمارت کے داخلی دروازے پر ایک دلکش نوجوان نرس کو کھڑے ہوئے پایا۔ وہ فرینکلی کو دیکھ کر مسکرا دی جیسے اسی کا انتظار کر رہی ہو۔ وہ فرینکلی کو اپنے ساتھ اندر لے گئی۔

لیکن جب فرینکلی نے نرس سے سرجن کے بارے میں پوچھا تو وہ گاڑھے اسپیشل لہجے میں بولی۔ ”نواسپیک انگلش۔“

پھر وہ ریسپشنسٹ کی ڈیسک کے سامنے سے تیزی سے گزرتے ہوئے ایک مختصر سی راہداری میں داخل ہو گئی اور اسے ڈاکٹر کے کمرے میں پہنچانے کے بعد کمرے سے نکل گئی اور دروازہ بند کر دیا۔

جب وہ انتظار کر رہا تھا تو دیگر خیالات اسے مسلسل آزار دینے لگے۔ گو کہ وہ ماریو پر ایک بھائی کی طرح اعتماد کرتا تھا لیکن اسے اپنی جلد کے اوپر چیونٹیاں سی رہتی محسوس ہو رہی تھیں اور وہ اس اعصابی بے چینی سے چھٹکارا پانے سے قاصر تھا۔ پھر سونے پر سہاگاہیہ کہ دواؤں کی چھینے والی بو جو کمرے میں رہتی ہوئی تھی، اس کا جی بری طرح متلا رہی تھی اور وہ اپنی اس کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔

پھر اس نے اپنی توجہ کا رخ دفتر کی آرائش کی جانب موڑ دیا۔ کمرے میں لکڑی کی ایک رائٹنگ میز اور اس سے میچ کرتی ہوئی ایک ہتھ دالی آرام دہ کرسی کے علاوہ بائیں

تھا جو اس کے جذبات کو مجروح کرتے تھے۔ وہ انہیں اپنے محفوظ چلتے کے اثرات سے پرے در بدر کر دیتا تھا جہاں پولیس بھی نہیں پہنچ سکتی تھی۔

ماریو کی بہن کو دھتکارنے کے شدید رد عمل کے خوف نے فرینکلی کو پریشان کر دیا تھا۔ اسی لیے فرینکلی اگلے ہی روز وضاحت کے لیے ماریو کے پاس جا پہنچا۔ ”سوری ماریو! میرے خیال سے تمہاری بہن ایک بہترین بیوی بن سکتی ہے لیکن میں شادی کرنے والے ٹائپ کے لوگوں میں سے نہیں ہوں۔“ اس نے ماریو سے رازدارانہ انداز میں کہا جیسے وہ آپس میں بے حد بے تکلف دوست رہے ہوں۔

”ارے فکر کی کوئی بات نہیں۔ میں اس کا کسی اور کے ساتھ رشتہ جوڑ دوں گا۔“ ماریو نے جواب دیا تھا۔

تب فرینکلی نے اطمینان کا سانس لیا تھا۔

لیکن یہ سب ماضی کا قصہ تھا۔

☆☆☆

اپنی حالیہ خوش قسمتی کے باوجود پورٹو پلاٹا میں کاسمیٹک سرجن کے ساتھ اپنا اپائنٹمنٹ فرینکلی کو اتنا بھاری محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی گردن میں چکی کا پاٹ لٹکا ہوا ہو۔ بلاشبہ وہ اس سے قبل بڑے شہروں کی عقبی سڑکوں پر اس سے زیادہ ہولناک سخت آزمائشوں کو جھیل چکا تھا لیکن واضح خطرات کو ٹالنا ایک الگ بات تھی اور خود کو ایک پلاسٹک سرجن کے ہاتھوں میں دے دینا اور اپنا وجود اس کے سپرد کر دینا ایک بالکل الگ معاملہ تھا۔

اور اس بارے میں سوچنے پر اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اس کا سرجن کون ہے؟

”ایک دوسرے کو اپنا نام نہیں بتاتا۔“ ماریو نے فرینکلی کو پہلے ہی متنبہ کر دیا تھا۔ ”یہ بات تمہارے اپنے تحفظ کے حق میں ہے۔“

جب فرینکلی لائیوین ائرپورٹ سے سیدھا پلاسٹک سرجن کے پرائیویٹ کلینک جانے کے لیے ٹیکسی میں سوار ہوا تو سورج کی زرد کرنیں پورٹو پلاٹا کے ساحل سے منعکس ہو رہی تھیں۔ ماریو نے اسے یہی ہدایات دی تھیں۔

اس دلکش منظر سے لطف اندوز ہونے کے بجائے فرینکلی اس خطرناک تجربے کے سوا اور کچھ نہیں سوچ رہا تھا جس سے وہ پلاسٹک سرجن کے پرائیویٹ کلینک میں دو چار ہونے جا رہا تھا۔

کوئی پریشانی کی بات نہیں، اس نے خود کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ سرجری جتنی جلدی مکمل ہو جائے گی، اتنی ہی

جانب دیوار کے ساتھ ایک چارپٹ والا بک کیس رکھا ہوا تھا جس میں نصاب کی کتابیں بھری ہوئی تھیں۔ ایک گوشے میں بیوی ڈیوٹی پیپر شریڈر بھی موجود تھا۔

اس کے پیٹ میں مروڑ سا اٹھنے لگا۔ ابھی اس نے یہاں سے نکل جانے کا فیصلہ کیا ہی تھا کہ لیب کوٹ میں ملبوس ایک عظیم شخص کمرے میں داخل ہوا۔

”گڈ ڈے... میں وہ ڈاکٹر ہوں جو تمہاری پلاسٹک سرجری کرے گا۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ اس ڈاکٹر کی عمر پچاس سے کچھ اوپر رہی ہوگی۔

فرینکلی نے اس شخص کے بھاری بھر کم لہجے اور اس کی مضبوط گرفت کو خاص طور پر محسوس کیا۔

ڈاکٹر اپنی میز پر بیٹھ گیا اور اس نے وہاں رکھا ہوا فولڈر کھول لیا۔ ”ہمارے مشترکہ دوست ماریو نے مجھے مطلع کیا ہے کہ تمہیں کارلوس مولینا کی شناخت دے دی جائے۔“ یہ کہتے ہوئے ڈاکٹر نے اسے سیاہ بالوں والے ایک ہنڈسم شخص کی تصویر دیکھنے کے لیے دے دی۔

فرینکلی نے تصویر دیکھ کر اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ اپنے باس ماریو کے تیز فہم ذوق پر دل ہی دل میں اس کا شکریہ ادا کرنے لگا۔ گو اسے تجسس تو تھا لیکن اس نے کارلوس کے بارے میں معلومات حاصل کرنے سے احتراز کیا۔ وہ اس قسم کے معاملات میں اپنے باس کے فیصلوں پر کسی قسم کے شبہات کے اظہار سے گریز کو ہی بہتر سمجھتا تھا۔

”سو تم ماریو کو کس طرح جانتے ہو؟“ اس نے ڈاکٹر سے کارلوس کے بارے میں پوچھنے کے بجائے یہ سوال کر ڈالا۔

”میرے بھتیجے نے ایک بار نیویارک میں اس کے لیے کچھ کام کیا تھا اور ایک مرتبہ اس کی بہن کے ساتھ ڈیٹ پر بھی گیا تھا۔“ ڈاکٹر نے سر ہلاتے ہوئے کہا اور ساتھ ہی اس کے ہونٹوں پر ایک کشادہ مسکراہٹ ابھر آئی۔ ”اس نے مجھے بتایا کہ اس نے اس جیسی بد صورت ترین عورت بھی نہیں دیکھی۔ اچھی بات یہ ہے کہ ماریو اس معاملے میں کسی سے بھی بغض نہیں رکھتا۔“ اس نے ہلکا سا قبضہ لگاتے ہوئے کہا۔

فرینکلی بھی ہنس دیا لیکن منہ سے کچھ نہیں کہا۔ اس لیے کہ یہ سب ماضی کی باتیں تھیں۔

”تمہارا نیا پاسپورٹ اور ذاتی کاغذات اس روز تیار ہوں گے جس روز تمہیں یہاں سے ڈسچارج کیا جائے گا۔“ ڈاکٹر نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں

سرجری کے بارے میں کوئی سوال پوچھنا ہے؟“ اپنے خوف کے باوجود فرینکلی نے جرأت سے کام لیتے ہوئے پوچھا۔ ”اس میں رسک کیا کیا ہیں؟“

”میری ٹیم نے اس سے پہلے بھی اس قسم کی سرجریز متعدد بار کی ہیں۔ تمہیں کسی قسم کی پریشانی نہیں ہونی چاہیے۔“ ڈاکٹر نے پُر اعتماد لہجے میں کہا۔ پھر اس کا بغور جائزہ لیتے ہوئے بولا۔ ”تمہاری جلد کی زیتونی ٹون، سیاہ آنکھیں اور درمیانی کاٹھ تمہیں بطور کارلوس مولینا تبدیل کرنے میں زیادہ کامیاب رہے گی۔“ پھر اس نے فرینکلی کے ہاتھوں پر ایک سرسری نگاہ ڈالی۔ ”ہم تمہاری انگلیوں کے نشانات بھی تمہاری نئی شناخت کے مطابق تبدیل کر دیں گے اور ایک اضافی احتیاط کے طور پر ہم تمہیں ہسپتانا مز بھی کریں گے تاکہ تم اپنی پرانی شناخت فراموش کر دو۔ یقیناً تمہیں اپنا موجودہ پاسپورٹ اور ذاتی شناخت بھی لازمی تلف کرنا ہوں گے۔“ اس نے کاغذوں کو کترنوں میں کاٹنے والی مشین کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

فرینکلی نے اپنا پاسپورٹ اور پلاسٹک کارڈز نکال لیے اور انہیں شریڈر میں ڈال دیا۔

☆☆☆

ہفتوں بعد وہ اپنے ولا کے سوئنگ پول کے پاس آرام وہ کرسی پر بیٹھا مجوا سٹراحت تھا۔ اس نے سر پر چوڑے حاشیے کا تنکوں کا بنا ہوا ہیٹ پہن رکھا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں رم کا گلاس تھا جبکہ دوسرے ہاتھ میں اس نے ایک دستی آئینہ پکڑا ہوا تھا۔ اس کے انگلیوں کی پوروں کی جلد تیزی سے مندمل ہو رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کے اطراف کی سوجن ابھی مکمل طور پر نہیں اتر رہی تھی۔

لیکن آئینے میں اپنے عکس کا جائزہ لینے پر جو چہرہ اسے دکھائی دیا، وہ اسے پسند آیا تھا۔ وہ تو اصلی کارلوس سے بھی بہتر دکھائی دے رہا ہے، اس نے سوچا۔

پھر جلد ہی فرینکلی نے ہیورٹو پلانٹا کے ممتاز طبقے میں خود کو کارلوس مولینا کی حیثیت سے متعارف کرانا شروع کر دیا اور ان کے اعزاز میں پُر تعیش ڈنر پارٹیوں کا اہتمام کرنے لگا۔ اس نے لوگوں کو یہی بتایا کہ وہ ایک مارکیٹنگ کنسلٹنٹ ہے اور اس پیشے سے منسلک ہونے پر اسے ابتدا ہی میں کامیابی حاصل ہو گئی تھی۔

اب اسے اپنے ماضی کے بارے میں کسی قسم کی خلش محسوس نہیں ہوتی تھی۔ وہ زندگی کو بھرپور طریقے سے انجوائے کر رہا تھا اور مطمئن زندگی گزار رہا تھا۔ اس کی

ایک تیردو شکار

”سینور کارلوس مولینا؟“ ان میں سے ایک نے جس کی داہنی آنکھ کے نیچے زخم کا نشان تھا، اپنا پولیس بیج لہراتے ہوئے کہا۔

”ہی؟“

”میں ڈیٹیکٹیو گارسیا ہوں اور یہ میرے پارٹنر ڈیٹیکٹیو الفانسو ہیں۔ ہم آپ سے کچھ بات کرنا چاہتے ہیں۔ کیا ہم اندر آ سکتے ہیں؟“

”کیوں نہیں۔“ فرینکی ان دونوں کو گیٹ روم میں لے آیا۔ ”یہ سب کیا ہے؟“ اس نے جانتا چاہا۔

ڈیٹیکٹیو الفانسو کی نظریں اس کی گھنی ابروؤں کے نیچے سے فرینکی کے چہرے کا طواف کرنے لگیں۔ ”آپ کی حراست کے لیے ایک انٹرنیشنل وارنٹ جاری ہوا ہے۔“

”کس بنیاد پر؟“ فرینکی نے پرسکون لہجے میں کہا۔ وہ اس بارے میں یقین تھا کہ اس کا ماضی اب اسے کسی قسم کی گزند نہیں پہنچا سکتا۔

”ایپین میں ماریہ فوئیس کے قتل کے الزام میں۔“ لیکن میں نے اسے قتل نہیں کیا۔ میں تو اسے جانتا

تک نہیں ہوں۔“ فرینکی نے برجستہ جواب دیا۔ ”سنو، میں حقیقت میں کارلوس مولینا نہیں ہوں۔ میں نے کاسمیٹک سرجری کرائی تھی تاکہ میں کارلوس مولینا کی طرح دکھائی دوں۔ لیکن میرا اصل نام... میں...“

☆☆☆

”ہیلو، ماریو؟“

”ہاں ڈاکٹر؟“

”کام ہو گیا۔ پولیس چند لمحے قبل اسے اپنے ساتھ لے گئی ہے۔“

”تم نے اپنے بھتیجے کی روانگی کے لیے فلائٹ بک کرا دی ہے، ڈاکٹر؟“ ماریو نے پوچھا۔

”ہاں، کارلوس آج پرائیویٹ جیٹ سے ایپین سے روانہ ہو جائے گا۔ ماریو! تمہارا ایک بار پھر شکریہ کہ تم نے اس کے ٹورنٹو فرار ہونے اور وہاں پر اس کی کاسمیٹک سرجری کے انتظامات کرنے میں اس کی مدد کی۔“ ڈاکٹر نے کہا۔

”یہ بات دہرانے کی ضرورت نہیں۔“ ماریو نے کہا۔ ”بائی دی وے، میرے بھتیجے کا وہاں ٹورنٹو میں نیا نام اور نئی شناخت کیا ہوگی؟“ ڈاکٹر نے پوچھا۔

ماریو نے قدرے توقف کیا پھر بولا۔ ”فرینکی ڈیوائن!“

شخصیت میں بھی نکھار آ گیا تھا۔ اس کی نو دریافت کشش کے باعث علاقے کے لوگ بھی اسے اپنی پارٹیوں میں مدعو کرنے لگے تھے۔

ایسے ہی دو مواقع پر وہ پیڈرو نامی ایک ریٹائرڈ اسپیشل سرائیگرساں کی توجہ کا مرکز بن گیا جو ریٹائرمنٹ کے بعد اپنی بیوی کے ہمراہ اس کے ایک قریبی ولا میں رہائش پذیر تھا۔

”یہ عجیب سی بات ہے... لیکن تم مجھے اب بھی کچھ جاننے پہچاننے سے لگتے ہو، کارلوس۔“ یہ بات پیڈرو نے فرینکی سے اپنی تیسری ملاقات کے موقع پر کہی جب وہ پڑوس کی ایک پول پارٹی میں مدعو تھے۔ ”کیا تمہیں یقین ہے کہ تم کبھی ایپین میں نہیں رہے؟“

”میرا جواب اب بھی وہی ہے جو پہلے میں نے دیا تھا، پیڈرو۔ میرا جنم اور میری پرورش امریکا میں ہوئی ہے۔“ فرینکی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ البتہ پیڈرو کی چھان بین پر مسلسل اصرار نے اس کے اعصاب پر بوجھنا ہٹ پیدا کرنا شروع کر دی تھی۔

پھر پہلے کی طرح پیڈرو نے اس کے جواب پر شانے اچکا دیے اور گفتگو کا موضوع تبدیل کر دیا۔

لیکن اس مرتبہ فرینکی کی اضطرابی کیفیت نے اس کے لیے ایک الارم سا بجا دیا تھا۔ اس نے کارلوس مولینا کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنے کی خاطر اس کاسمیٹک سرجن کے پاس جانے کا فیصلہ کیا جس نے سرجری سے اسے کارلوس کا چہرہ اور شناخت عطا کی تھی۔

اگلے روز صبح وہ ٹیکسی میں سوار ہو کر وایا کونڈور پہنچا تو اسے وہ کلینک کہیں دکھائی نہیں دیا جہاں اس کی کاسمیٹک سرجری ہوئی تھی۔ اس نے ٹیکسی میں اس بلاک کے تین چکر لگائے اور سڑک کے دونوں جانب واقع عمارتوں کا بغور جائزہ لیا لیکن اسے فور نمبر کی وہ دو منزلہ سفید رنگ کی عمارت کہیں نظر نہیں آئی۔ وہاں ایک پلاٹ تھا جو خالی پڑا تھا۔

فرینکی بوکھلا گیا اور اس پر دہشت سی طاری ہو گئی۔ اس نے نیویارک ماریو کوفون کیا تو ریسپنشنٹ نے اسے بتایا کہ ماریو اپنے کاروباری دورے پر کہیں دور گیا ہوا ہے اور اس سے رابطہ نہیں ہو سکتا۔

اسی روز شام کو فرینکی کے دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے دروازہ کھولا تو لائٹ ویٹ سوٹ میں ملبوس دو بڑے کٹے آدمیوں کو اپنے سامنے پایا۔

جیسے وہی چیف ہو۔ اس کے سر کے آدھے سے زیادہ بال اڑ چکے تھے اور وہ دس سال سے مصنوعی وگ استعمال کر رہا تھا۔ اس سے پہلے وہ پٹرول آفیسر تھا جہاں اس کی کارکردگی تسلی بخش نہیں تھی لیکن اپنے چچا کی مہربانی سے جو چیف کے عہدے سے ریٹائر ہونے والا تھا، اس کی نوکری پر کوئی آنچ نہیں آئی بلکہ جاتے جاتے وہ اسے سراغ رساں کے عہدے پر ترقی دے گیا۔ یہ اقربا پروری کی بدترین مثال

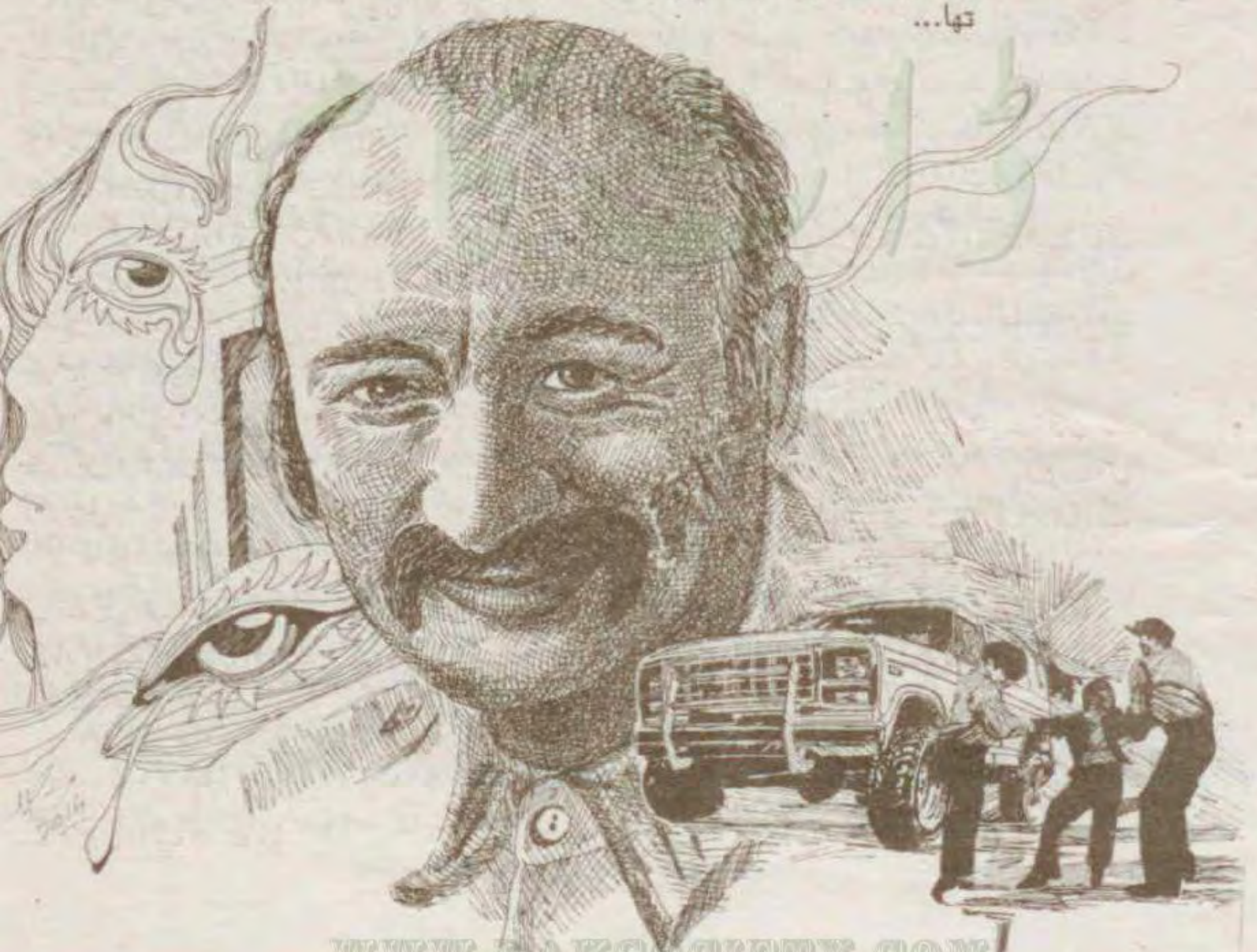
یعنی کو سراغ رساں کا عہدہ سنبھالے ایک ہی ہفتہ ہوا تھا کہ چیف پونڈر نے اسے اپنے دفتر میں طلب کر لیا۔ وہ اوک ڈیل پولیس ڈپارٹمنٹ کی پہلی خاتون افسر تھی جسے اس عہدے پر فائز ہونے کا اعزاز حاصل ہوا تھا۔ جب وہ چیف کے دفتر پہنچی تو لیڈ فورڈ وہاں پہلے سے موجود تھا۔ وہ اسے دیکھ کر تھوڑی سی پریشان ہو گئی کیونکہ وہ انتہائی خود پسند اور سنجی خور تھا اور اس وقت بھی اس انداز میں بیٹھا ہوا تھا

دوران ملازمت ایک دوسرے کے درمیان باہمی چپقلش کا حیرت انگیز نتیجہ

جعل سا

تنویر ریاض

کامیابی، خوش قسمتی سے ملتی ہے... اور خوش قسمتی کا ادراک... کامیابی کی ضمانت دیتا ہے... کوشش اور محنت کے امتزاج سے کامیابی کے نت نئے انداز منتخب کرتی کہانی کے رموز... ایک نہ تجربہ کار سراغ رساں کا احوال... پہلے ہی کیس نے اسے تنہا مشکل سے دوچار کر دیا تھا...



تھی لیکن وہاں کون تھا جو اسے چیلنج کرتا۔

جب وہ چیف پونڈر کے دفتر میں داخل ہوئی تو اس نے بڑی مشکل سے اپنی جھنجلاہٹ پر قابو پانے اور پرسکون رہنے کی کوشش کی تاہم یعنی کی وہاں موجودگی اسے کچھ سوچنے پر مجبور کر رہی تھی کیونکہ کئی سالوں سے بجٹ میں کمی ہو جانے کے سبب سراغ رساں ٹیمیں تشکیل نہیں دی جا رہی تھیں اور اب سراغ رساں انفرادی طور پر ہی کام کیا کرتے تھے۔ مینی کو بھی تنہا اپنے فرائض انجام دینا اچھا لگتا تھا۔ وہ اسے اپنے لیے ایک چیلنج سمجھتی تھی اور ویسے بھی اس کی موجودگی میں مرد آفیسر اپنے کام پر پوری طرح توجہ نہیں دے پاتے تھے۔

یعنی لیڈ فورڈ اس معاملے میں خاصا غیر ذمے دار تھا۔ جب وہ پٹرول آفیسر تھی تب بھی اس پر غیر ضروری تنقید کرنا اس کا معمول تھا البتہ اس نے مینی پر جملے کتے ہوئے یہ احتیاط ضرور رکھی کہ اس پر کسی عورت کو جنسی طور پر ہراساں کرنے کا الزام نہ لگ جائے۔ مینی تنہا عورت تھی اور ان مسائل کو سمجھتی تھی جو مردوں کے معاشرے میں ایک عورت کو پیش آسکتے ہیں۔ وہ اس قسم کے رویوں کی عادی ہو چکی تھی اور اپنی خود اعتمادی کے بل بوتے پر آگے بڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ابھی اسے سراغ رساں کے طور پر ایک سال کا آزمائشی عرصہ گزارنا تھا۔ یعنی اس سے سینئر تھا اور اگر مینی کو اس کے ساتھ کام کرنا پڑتا تو اس کی رپورٹ پر ہی اس کی ملازمت کے مستقل ہونے یا نہ ہونے کا انحصار ہوتا۔ اس لیے وہ نہیں چاہ رہی تھی کہ ایک سال کی آزمائشی مدت ختم ہونے سے پہلے وہ یعنی کے ساتھ کام کرے۔

یعنی کی خمار آلود آنکھوں نے اس کا تعاقب کیا۔ اس کی جاذب نظر شخصیت کے پیش نظر کوئی بھی مرد اس کے چہرے سے نظریں نہیں ہٹا سکتا تھا۔ بہت سے لوگوں کے خیال میں وہ اس کا ونٹی کی سب سے زیادہ خوب صورت اور پُرکشش عورت تھی۔ نو سال پہلے کالج کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد اس نے اوک ڈیل پولیس ڈپارٹمنٹ میں ملازمت اختیار کی تھی تاکہ اپنے والدین اور بہن بھائیوں سے قریب رہے۔ وہ اس عزم کے ساتھ اس محکمے میں آئی تھی کہ اسے ایک دن قصبے کی پہلی خاتون پولیس چیف بننا ہے لیکن اس نے کسی کے سامنے اپنے اس مقصد کا اظہار نہیں کیا تھا۔

وہ یعنی کے برابر والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ یعنی نے اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرا اور ایسی مسکراہٹ کے ساتھ اس کا استقبال کیا جیسے کوئی احسان کر رہا ہو۔ مینی نے اسے کوئی

اہمیت نہیں دی اور اپنی کرسی پر سیدھی بیٹھی رہی۔ اس کی نظریں پولیس چیف کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں جس نے ان دونوں سراغ رسالوں کو مطلع کیا کہ انہیں مل کر کام کرنا ہے اور ایک عادی مجرم ایڈی پر نظر رکھنی ہے جو دس سال جیل میں رہنے کے بعد پیرول پر رہا ہو کر شہر میں واپس آ گیا ہے۔ بارہ سال پہلے وہ خود ایک سراغ رساں تھا اور اس نے ایڈی کو ایک جرم کے سلسلے میں جیل بھجوا دیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ایڈی واپس آنے کے بعد اپنی مجرمانہ سرگرمیاں دوبارہ شروع کر دے۔

”یہ تم دونوں کے لیے پہلی ترجیح ہے۔“ چیف نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”اس پر گہری نظر رکھو۔ اگر وہ کسی غیر قانونی سرگرمی میں ملوث ہے تو اس کا پتا لگاؤ تاکہ ہم اس پر ہاتھ ڈال سکیں۔“

”مجھے سراغ رساں مینی کے ساتھ کام کر کے خوشی ہو گی۔“ یعنی نے اس کے خوب صورت متناسب جسم پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ”میں شروع سے ہی اس کی صلاحیت کا معترف ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ میرے وسیع تجربے۔۔۔۔۔“

”مختصر بات کرو۔“ چیف نے اسے ایک فائل دیتے ہوئے کہا جس میں ایڈی کی سابقہ مجرمانہ سرگرمیوں کی تفصیل تھی۔ ”اس وقت تم ہی واحد تجربہ کار سراغ رساں ہو جسے یہ کام سونپا جاسکتا ہے۔ دوسرا سراغ رساں جی جونز آنے والے جمعے کو ریٹائر ہو رہا ہے اور اس سے پہلے اسے اپنے تمام معاملات کلیئر کرنا ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ تم اپنی بہترین صلاحیتوں سے کام لے کر ایڈی کی گردن پر ہاتھ ڈال سکو گے۔ اس سے پہلے کہ وہ ہمیں کوئی بڑا نقصان پہنچائے۔“

یعنی نے ایڈی کی تصویر اور کاغذات پر ایک سرسری نظر ڈالی اور فائل مینی کی طرف بڑھادی۔ اس سے پہلے کہ اس کی انگلیاں مینی کے ہاتھ سے ٹکراتیں، اس نے پھرتی سے وہ فائل پکڑ لی۔ اس نے ایڈی کی تصویر کو غور سے دیکھا۔ وہ ایک درمیانی عمر کا شخص تھا جس کا شیو بڑھا ہوا اور سر تقریباً گنجا ہو چکا تھا۔ شرارتی آنکھوں اور عیار مسکراہٹ سے اس کی مکاری ظاہر ہو رہی تھی۔ مینی نے اس کی فائل پڑھنے میں زیادہ وقت لگایا۔ اسے بیس سال کے دوران۔۔۔۔۔ نو مختلف سنگین جرائم کے سلسلے میں سزا ہو چکی تھی۔ پیرول پر رہا ہونے کے بعد اس نے اوک ڈیل میں رہائش اختیار کر لی تھی۔ وہ بے روزگار تھا لیکن اس نے نقد ادائیگی کر کے ایک مکان کرائے پر لے لیا تھا جس سے پولیس کے شعبے کو تقویت ملی جو اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کر سکتی تھی کہ اس

سے تعلق رکھنے والے ہم پیشہ افراد ابھی تک گرد و نواح کے قصبات میں رہائش پذیر تھے۔ گوکہ اس کے ریکارڈ میں کسی پُر تشدد کارروائی کا ذکر نہیں تھا لیکن بینی جانتی تھی کہ اس کے جرائم کے نتیجے میں کتنے لوگ متاثر ہوئے ہوں گے جن کی خدمت اور حفاظت کا اس نے حلف اٹھا رکھا تھا۔

”میں تمہیں اس کام کے لیے زیادہ سے زیادہ دو ہفتے دے سکتا ہوں۔“ چیف نے کہا۔ ”کوئی سوال؟“
 بینی گھبراتے ہوئے بولا۔ ”لیکن چیف! اگلے ہفتے میری چھٹیاں شروع ہونے والی ہیں۔“
 ”تب تو تمہیں ایک ہفتے میں یہ کام نمٹانا ہوگا۔“ چیف نے بے رخی سے کہا۔

انہوں نے ایک گھنٹے کے اندر اپنے کام کا آغاز کر دیا۔ ان کا ارادہ پہلے ایڈی کے گھر کی طرف جانے کا تھا جو اوک ڈیل کے مشرق میں واقع تھا۔ اس کے لیے انہوں نے گیراج سے بغیر نشان والی پولیس کار نکالی۔ یعنی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا اور اس نے بینی سے یہ پوچھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی کہ کیا وہ ڈرائیونگ کرنا چاہے گی۔

جیسے ہی ان کی کار ہائی وے پر آئی تو بینی نے کہا۔ ”ہمیں پہلے لٹچ کر لینا چاہیے ورنہ میرا شوگر لیول کم ہو جائے گا۔“

”ابھی تو دو پہر بھی نہیں ہوئی۔“ بینی نے کہا۔
 ”مال پر ایک نیا چائینز کھلا ہے۔ وہاں جوڑوں کے لیے کیمین بھی بنے ہوئے ہیں۔“

”میں نے اپنے لیے سینڈوچ خرید لیا تھا۔“ بینی نے اسے ٹالنے کے لیے کہا۔ وہ اس کی گستاخ نظروں کو محسوس کر رہی تھی جو اس کے جسم کے مختلف حصوں میں تیر کی طرح پیوست ہو رہی تھیں۔

”اگر تم باقاعدگی سے ورزش کرو تو تمہارا جسم مزید خوب صورت ہو سکتا ہے۔“ اس نے اپنے پیٹ پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ”مجھے بھی دوبارہ ورزش شروع کر دینی چاہیے تاکہ میرا جسم پرانی حالت میں واپس آجائے اور میں ہر قسم کے ایکشن کے لیے تیار رہوں۔ گوکہ تم مجھ سے چھوٹی ہو لیکن یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اس سلسلے میں کوئی مشورہ ضرور دو گی۔“

بینی نے سامنے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ فی الحال ہمیں اپنی پوری توجہ ایڈی پر مرکوز رکھنی چاہیے۔“

”کیا خیال ہے اگر کام کے بعد ہم تھوڑی سی جاگنگ

کر لیں۔ صرف میں اور تم۔“ ایک بار پھر اس کی نظریں بینی کے جسم پر پھسلنے لگیں۔

”بہتر ہوگا کہ تم اپنی نظریں سڑک پر رکھو۔ اس سے پہلے کہ ہماری گاڑی کی ٹکر ہو جائے۔“

کچھ دور جانے کے بعد وہ ہائی وے سے اتر کر مشرق کو جانے والے اولڈ فارم روڈ پر مڑ گئے۔

بینی کو اوک ڈیل کے چپے چپے سے واقفیت تھی۔ وہ پٹرول آفیسر رہ چکی تھی اس لیے اسے تمام مقامات اور سڑکوں کے نام معلوم تھے۔ بینی نے اس کی ہدایات کو نظر انداز کیا اور آدھ گھنٹے تک بھٹکتا رہا۔ بہر حال وہ اس مکان تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے جس کی انہیں تلاش تھی۔

یہ مکان سڑک کے آخری کنارے پر واقع تھا جو کہ جانوروں کے ایک باڑے پر جا کر ختم ہوتی تھی۔ اس جگہ کو دیکھ کر بینی کو یاد آ گیا کہ وہ اپنی سابقہ بیوی کے ساتھ کئی مرتبہ یہاں سے گزر چکا ہے۔ قریب ترین پڑوسی کا گھر اس کے عقب میں سو گز کے فاصلے پر تھا اور دونوں مکانوں کے درمیان گھنے درختوں کی قطار تھی۔ بینی نے گاڑی واپس گھمائی تاکہ ایڈی کے گھر کو قریب سے دیکھ سکے۔

”بالکل الگ تھلگ اور پرائیویٹ جگہ ہے۔“ بینی نے کہا۔ ”یہاں کسی قسم کا ٹریفک بھی نہیں ہے اور اگر ایڈی پولیس آفس میں رپورٹ نہ کرتا تو کسی کو اس کی یہاں موجودگی کے بارے میں علم نہ ہوتا۔“

وہ پھر کا دن تھا اور اس روز مشرقی علاقے سے کچرا اکٹھا کیا جاتا تھا۔ سڑک کے کنارے ایک ہی سائز کے نیلے، سبز اور سیاہ ڈرم رکھے ہوئے تھے۔ اس ایک منزلہ مکان کی ہر کھڑکی پر پردے لٹکے ہوئے تھے جن کی وجہ سے اندر کا منظر دیکھنا ممکن نہ تھا۔ پتھر لیے راستے پر ایک فورڈ پک اپ کھڑی تھی اور اس کا رخ سڑک کی جانب تھا۔ وہ پرانے ماڈل کی گاڑی تھی لیکن دیکھنے میں صاف ستھری اور قابل اعتبار دکھائی دے رہی تھی۔ اس پر کوئی ڈینٹ تھا اور نہ ہی انجن کے نیچے تیل کا کوئی دھبہ نظر آ رہا تھا۔

بینی نے اپنی جیب سے نوٹ بک نکالی اور اس میں پک اپ کا نمبر اور دیگر تفصیلات درج کرنے لگی۔
 ”یہاں تو کچھ بھی نظر نہیں آ رہا۔“ بینی نے کہا۔

”وہ بہت زیادہ منظم اور سلیقہ مند معلوم ہوتا ہے۔“ بینی نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ ”وہ اپنے آپ کو لوگوں کی توجہ سے دور رکھتے ہوئے جزئیات پر نظر رکھتا ہے اور مقامی آبادی میں گھل مل گیا ہے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ نامی

گرمی مجرم ہے۔

”یہ اندازہ تم نے کس طرح لگایا؟“ لینی نے پوچھا۔
 ”اس کا ٹرک امریکن ساخت اور مقبول ماڈل کا ہے جسے اس نے بڑی اچھی حالت میں رکھا ہوا ہے۔ اس کے گھر کی کھڑکیوں کے پردے برابر ہیں اور ان کے بیچ کوئی خلا نہیں۔ دروازے کے باہر رکھے ہوئے تین ڈرم ظاہر کرتے ہیں کہ وہ کچرے کی مختلف اقسام کو علیحدہ کر کے ان میں ڈالتا ہے۔ ان سب باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کتنا محتاط ہے۔“

لینی نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ”پھر ہمیں کیا کرنا چاہیے؟“

”ہمیں اس کے گھر کے اتنے نزدیک گاڑی نہیں کھڑی کرنی چاہیے۔ وہ ہمیں دیکھ سکتا ہے۔ بہتر ہوگا کہ ہم یہاں سے چوتھائی میل کے فاصلے پر کھڑے ہوں جہاں سے ہمیں یہ جگہ صاف نظر آ سکے۔“

”اس کے لیے ہمیں ایک طاقتور دوربین کی ضرورت ہوگی۔“ لینی نے کہا لیکن اس سے پہلے ہی مینی اپنے ہینڈ بیگ سے ایک دوربین نکال چکی تھی۔

”سنو۔“ لینی نے ایک بار پھر کہا۔ ”کیوں نہ ہم پہلے لچ کر لیں۔ کچھ دیر کے لیے کام کو بھول جاؤ۔“

وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ”بہتر ہوگا کہ ہم ایک گھنٹے تک اس مکان کی نگرانی کریں اور دیکھیں کہ کیا ہوتا ہے۔ اگر تمہارا شوگر لیول کم ہونے لگے تو میں تمہیں آدھا سینڈویچ دے دوں گی۔“

تیس منٹ کے انتظار کے بعد ایڈی گھر سے باہر نکلتا دکھائی دیا۔ اس کے بازو میں ایک بھاری تھیلا دبا ہوا تھا۔ اس وقت وہ کلین شیو تھا اور اس نے عمدہ لباس پہن رکھا تھا۔ البتہ وہ اپنی آخری تصویر کے مقابلے میں چند برس زیادہ عمر کا لگ رہا تھا اور اس کے رہے سہے بال بھی غائب ہو چکے تھے۔ مینی نے دوربین لینی کی طرف بڑھائی۔ اس نے سرسری انداز میں ایڈی کو دیکھا اور دوربین واپس کرتے ہوئے بولا۔ ”کم بخت کا سر بلیئرڈ کی طرح لگتا ہے۔ یہ مت سمجھنا کہ وہ عورتوں کے ساتھ اچھا سلوک کرتا ہوگا۔“

مینی نے ایک بار پھر دوربین آنکھوں سے لگائی اور ایڈی کو دیکھنے لگی جو پک اپ میں سوار ہو رہا تھا۔ اس نے وہ تھیلا سیٹ کے پیچھے فرش پر رکھ دیا تھا۔

”میں اس بارے میں نہیں جانتی۔“ مینی نے نظریں ہٹائے بغیر لینی کی بات کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ”کچھ

عورتیں ایسے مردوں کو پسند کرتی ہیں یا ان کے بارے میں بالکل نہیں سوچتیں۔“

”اب یہاں سے چلنے کی کرو۔“ لینی نے کہا۔

مینی نے دوربین کا رخ گھر کی جانب کر لیا۔ صرف یہ دیکھنے کے لیے کہ شاید کوئی کھڑکی یا دروازے میں نظر آجائے لیکن اسے وہاں کوئی نظر نہیں آیا۔

”میں کسی ایسے شخص میں کشش محسوس کروں گی جس کا مستقبل محفوظ ہو۔“ مینی نے دوبارہ ٹرک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اور میں نہیں سمجھتی کہ ایسے مردوں کی کوئی کمی ہے۔“

”تم بہت فلسفیانہ گفتگو کرتی ہو۔“ لینی نے کہا۔ ”میں خود بھی خاصا فلسفی ہوں۔ ہمیں کسی وقت اس موضوع پر بات کرنی چاہیے۔ کیوں نہ کسی روز ایک ساتھ ڈنر کیا جائے۔“

”میرے پاس اس سے بھی اچھا آئیڈیا ہے۔“ وہ بولی۔ ”ہمیں یہاں سے فوراً نکلنا چاہیے کیونکہ ایڈی ابھی ابھی روانہ ہوا ہے۔“

انہوں نے کچھ فاصلہ رکھ کر اس کا تعاقب شروع کر دیا۔ ایڈی کا رخ اس راستے پر تھا جو قصبے سے باہر کی طرف جارہا تھا۔ ایک میل بعد وہ شہر کی حدود سے باہر نکل چکے تھے لیکن ایڈی وہاں نہیں رکا بلکہ آگے ہی بڑھتا گیا۔ البتہ لینی نے اپنی کار روک دی اور بولا۔ ”ہم اس سے آگے نہیں جا سکتے۔ آج کے دن کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔“

”ایسا کوئی قانون نہیں ہے جس میں لکھا ہو کہ ہم اپنی حدود سے باہر اس کا تعاقب نہیں کر سکتے۔“ مینی نے کہا۔ ”ہم اس کی جتنی زیادہ نگرانی کریں گے، اس کے بارے میں اتنا ہی زیادہ جان پائیں گے۔“

لینی نے ایک طویل سانس لے کر کار کی رفتار بڑھا دی۔ اب تک اس نے مینی کو رجھانے کی جتنی کوششیں کیں، وہ سب ناکام رہیں لیکن وہ ناامید نہیں تھا۔ اسے یقین تھا کہ بہت جلد وہ مینی کو اپنے ساتھ لچ یا ڈنر پر لے جانے میں کامیاب ہو جائے گا۔ دوسری جانب مینی اس کی سوچوں سے بے خبر ایڈی کی پک اپ پر نظریں جمائے ہوئے تھی جو شہر کی حدود سے نکلنے کے چند میل بعد دائیں جانب مڑ کر ایک ٹرک اسٹینڈ پر کھڑی ہوئی تھی پھر وہ تھیلا بغل میں دباتے ہوئے پک اپ سے باہر آیا اور ایک ریسٹورنٹ میں داخل ہو گیا۔ اس نے کھڑکی کے ساتھ والا کیمین منتخب کیا۔ اس دوران میں مینی نے مسلسل اس پر نظریں جمائے رکھیں اور لینی کو لمحہ بہ لمحہ رپورٹ دیتی رہی۔

ایک منٹ بعد ایک اور شخص بوتھ میں داخل ہوا اور ایڈی کے ساتھ بیٹھ گیا۔ ویٹریس ان دونوں کے لیے کافی لے کر آئی۔ وہ کافی پینے کے دوران میں باتیں کر رہے تھے پھر ایڈی اپنی جگہ سے اٹھا، اس نے ایک خالی پلیٹ میں کچھ نوٹ رکھے اور اپنا تھیلا وہیں چھوڑ کر باہر چلا آیا۔ ایک منٹ بعد دوسرا شخص بھی وہی تھیلا بغل میں دبائے ریستورنٹ سے باہر نکلا۔ مینی نے اپنی دور بین کا رخ اس کی جانب کر لیا اور جب وہ پارکنگ لاٹ میں اپنی گاڑی تک پہنچا تو مینی نے فوراً ہی اس کا نمبر اپنی نوٹ بک میں درج کر لیا۔

”منشیات۔“ مینی نے کہا۔ ”اس کے علاوہ اس تھیلے میں اور کیا ہو سکتا ہے؟“

”لیکن میں نے کوئی لین دین ہوتے نہیں دیکھا اور مجھے منشیات یا پیسوں کا کوئی تبادلہ ہوتا نظر نہیں آیا۔ سوائے اس کے کہ ایڈی نے کافی کے بل کی ادائیگی کی تھی۔“

مینی نے اپنا سر سیٹ کی پشت سے لگا یا اور مایوس ہوتے ہوئے بولا۔ ”ہم نے اپنا لچھ چھوڑا، چالیس میل کا سفر طے کیا، پوری دوپہر ضائع کی اور صرف یہ جان سکے کہ ایڈی ایک اچھا ڈرائیور ہے اور اپنے پیسے ادھر ادھر پھینکتا پھرتا ہے۔“

”یہ بھی تو ممکن ہے کہ وہ ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے اوک ڈیل سے باہر محفوظ فاصلے پر مجرمانہ سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہو۔“ مینی نے کہا۔ ”جہاں پولیس اسے نہیں جانتی لیکن اب بھی اس کا پرانے ساتھیوں سے رابطہ ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ اس کے پاس خرچ کرنے کے لیے خطیر رقم ہے جبکہ اس کے کام کے بارے میں ہم کچھ نہیں جانتے۔ ہمارے پاس یہ شک کرنے کی گنجائش ہے کہ اس نے مال تو دیا لیکن رقم نہیں لی۔ اس کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ ایڈی کو دوسرے آدمی پر بھروسہ ہے۔ ممکن ہے کہ وہ اس کا قریبی ساتھی ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ دونوں کسی بڑے نیٹ ورک کا حصہ ہوں۔ میں نے دوسرے آدمی کی گاڑی کا نمبر نوٹ کر لیا ہے۔ اس کے ذریعے ہمیں اس کا نام اور پتا معلوم ہو سکتا ہے۔“

مینی نے ونڈ شیلڈ پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ”میں بھی یہی بات کہنے والا تھا۔“

☆☆☆

کارر جسریشن آفس سے اس گاڑی کے بارے میں جو معلومات حاصل ہوئیں، اس کے مطابق کسی نے اس کار کی چوری کی رپورٹ درج نہیں کروائی تھی۔ اس پر بھی کوئی جرمانہ نہیں ہوا، نہ ہی کوئی وارنٹ جاری ہوئے۔ کار کا مالک

جصل سار

کسی سنگین جرم میں ملوث نہیں تھا اور وہ محض اس بنیاد پر اس اس سے پوچھ گچھ نہیں کر سکتے تھے کہ وہ ایڈی سے ملنے اس ریستوران میں کیوں گیا اور اس نے اسے جو تھیلا دیا، اس میں کیا تھا۔ مجبوراً انہیں اپنی ساری توجہ ایڈی پر مرکوز کرنا پڑی۔ اگلے چند روز تک اس کا یہی معمول رہا۔ وہ اپنے قصبے سے نکل کر خاصا فاصلہ طے کر کے اپنی منزل پر جاتا۔ ہر بار اس کے پاس ویسا ہی تھیلا ہوتا جسے وہ اپنے کسی پہچان والے کے حوالے کر دیتا۔ اس مقصد کے لیے کسی ریستوران یا عوامی جگہ کا انتخاب کیا جاتا جہاں انہیں دیکھنے والا کوئی نہ ہو۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ مینی کی مایوسی بڑھتی گئی اور جمعے کی سہ پہر اس کے صبر کا پیمانہ چھلک پڑا۔

”میں کہتا ہوں کہ ہمیں یہ تعاقب ختم کر دینا چاہیے۔“ وہ بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ اس وقت ان کی گاڑی پبلک اسکوائر کے قریب کھڑی تھی۔ اس بار مینی نے ایڈی کی حالیہ میٹنگ کی تصویریں ٹیلی فون ٹولینس سے بنائی تھیں۔ مینی بیزاری سے بولا۔ ”ان تصویروں سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ اگلی بار جب وہ گھر سے روانہ ہو تو اسے ٹریفک قوانین کی خلاف ورزی کے الزام میں روکو۔ اس کے مشتبہ رویے کو وجہ بنا کر اس کی کار کی تلاشی لو اور

Personality Development Dr. Online

- ۱۔ مشہور قوت ارادی کے ساتھ ہر اعتماد اور کامیاب زندگی گزارنا آپ کا حق ہے
- ۲۔ آپ ہماری رہنمائی میں اپنی شخصیت کی خامیاں دور کر کے اپنا یہ حق حاصل کر سکتے ہیں۔
- ۳۔ Suggestion کی مشقوں کے ذریعہ احساس کمتری دور کر کے خود اعتمادی حاصل کریں۔ کامیاب زندگی گزاریں۔
- ۴۔ سرپریم کی مشقوں کے ذریعے (صرف 27 دن میں) بے پناہ قوت ارادی حاصل کریں۔ ارادے کی قوت سے آپ جو چاہیں حاصل کر سکتے ہیں۔
- ۵۔ علم انفس کی مشقوں کے ذریعے دل و دماغ کو پرسکون کر سکتے ہیں۔ مراقبہ کر سکتے ہیں اور مادی قوت حاصل کر سکتے ہیں۔
- ۶۔ مثبت انداز زندگی سیکھ کر آپ بہتر ازدواجی اور معاشرتی زندگی گزار سکتے ہیں خاندان اور معاشرے کے ہر دل عزیز فرد بن سکتے ہیں۔
- ۷۔ اپنے (Anxiety اور Depression کو (Medicine & Psychotherapy کے ذریعے دور کر کے اپنے اندر کی اداس مایوسی یا امیدیں بے چینی بے خوابی غصہ جہیز اپنی ذاتی اور ازدواجی زندگی میں ناکامی پر قابو پا کر ایک پرسکون اور کامیاب زندگی گزار سکتے ہیں۔
- ۸۔ اپنے روحانی مسائل کے حل اور وظائف کے حصول کے لئے بھی رابطہ کر سکتے ہیں۔ ہر طرح کی نفسیاتی اور جسمانی کمزوری کے لئے Alternative Medicines بذریعہ ٹیلی فون ای میل ایس ایم ایس منگوائی جاسکتی ہیں

ڈاکٹر محمد امین شاہین
1116 1116 1116
03218528001
email: dr.muhammadamishaheen@gmail.com

معلوم کرو کہ ان تھیلوں میں کیا ہے۔“
 ”وہ ایک اچھا ڈرائیور ہے اور اس کا رویہ کبھی
 مشکوک نہیں ہوتا۔ اسے روکنے کے لیے کوئی معقول جواز
 ہونا چاہیے۔“

”معذرت کے ساتھ کہوں گا کہ تمہیں ابھی بہت کچھ
 سیکھنے کی ضرورت ہے۔“

”کچھ بھی ہو، میں ایسی حماقت نہیں کر سکتی۔“ مینی نے کہا۔
 مینی نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”ٹھیک ہے، تم کار میں بیٹھ
 کر اپنا میک اپ درست کرو۔ اس دوران میں ڈرائیڈی
 سے دو دو ہاتھ کر لوں۔ اسے معلوم ہونا چاہیے کہ ہم اس کی
 نگرانی کر رہے ہیں اور ہمیں اوک ڈیل میں اس کی
 سرگرمیوں پر شک ہے۔ تم آزادی اظہار کا مطلب سمجھتی ہو
 جس کا مطلب ہے کہ ایک شہری دوسرے کے سامنے اپنی
 رائے کا اظہار کر سکتا ہے۔“

”میں یقین سے نہیں کہہ سکتی کہ چیف کے ذہن میں
 ایسی کوئی بات ہوگی۔“ مینی نے کہا۔

”تم ایک بات بھول رہی ہو۔“ مینی نے کہا۔ ”ہمیں
 آج سہ پہر تک چیف کو اب تک کی کارروائی سے آگاہ کرنا
 ہے۔ ہم اسے کیا بتائیں گے؟“

”یہی کہ ہم آگے بڑھ رہے ہیں لیکن ہمیں مزید
 وقت چاہیے۔“

مینی نے اپنے دونوں ہاتھ اسٹیرنگ وھیل پر رکھتے
 ہوئے کہا۔ ”میرے پاس اب وقت نہیں ہے کیونکہ مجھے
 اتوار کی سہ پہر تھائی لینڈ کے لیے روانہ ہونا ہے اور یہ ٹکٹ
 ناقابل واپسی ہے۔“

”اس کا مطلب ہے کہ ہمیں ہفتے کو بھی کام کرنا ہو
 گا۔“ مینی نے کہا۔

اتفاق سے چیف کسی ضروری معاملے میں الجھا ہوا تھا
 اس لیے اس نے دونوں سراخ رسالوں کے ساتھ جمعے کی
 میننگ منسوخ کر دی۔ اس طرح انہیں اپنی کارروائی کے
 لیے مزید وقت مل گیا۔ دوسرے دن صبح وہ پولیس گیراج میں
 ملے اور اس مرتبہ انہوں نے ایک مختلف ماڈل اور میک کی
 کارنگوائی۔ مینی نے تجویز پیش کی کہ کار وہ چلائے گی۔ مینی
 نے کچھ کہے بنا چابیاں اس کے حوالے کر دیں۔ دس منٹ
 بعد وہ اسی جگہ پہنچ چکے تھے جہاں سے انہیں ایڈی کا گھر
 صاف نظر آتا تھا۔

”تم مجھے اپنی دور بین دے دو۔“ مینی نے کہا۔
 دو گھنٹے تک وہ اپنی کار میں بیٹھے اس مکان کی نگرانی
 کرتے رہے۔ وقفے وقفے سے مینی سردرد کی شکایت کرتا

اور اپنی قسمت کو کوستا رہا کہ اسے ایک نا تجربہ کار سراخ
 رساں کے ساتھ کام کرنا پڑ رہا ہے۔ بالآخر وہ اونگھنے لگا۔
 اس نے اپنا سر کھڑکی سے نکا دیا۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو
 دوپہر ہو چکی تھی۔

”وہ دو مرتبہ گیراج میں رکھے ڈسٹ بن تک آچکا
 ہے۔“ مینی نے کہا۔ اس کی آنکھیں اب بھی مکان پر جمی
 ہوئی تھیں۔ ”اس کے علاوہ کوئی ایسی بات نہیں جو میں تمہیں
 بتا سکوں۔ وہ اس گھر میں تنہا ہی رہتا ہے۔“

مینی کمزور آواز میں بولا۔ ”میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“
 ”رات کیا دیر تک جاگتے رہے؟“

اس نے اپنے کندھے اچکائے اور بولا۔ ”میں اس
 طرح کام کرنے کا عادی نہیں ہوں۔“

”شاید آج ہم جدا ہو جائیں۔“ مینی نے کہا۔
 ”پہلی بار تم نے عقل کی بات کی ہے۔“

”البتہ کل ہمیں دوبارہ کام شروع کرنا ہوگا۔“
 ”کل۔۔۔ کیا تم اتوار کے دن بھی کام کرو گی؟ پاگل
 ہو گئی ہو۔“

”میں کبھی چرچ جانا نہیں چھوڑتی لیکن چیف نے سختی
 سے کہا تھا کہ ہمیں ایڈی پر کڑی نظر رکھنی ہے۔“

”اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم اتوار کو بھی کام کریں۔“
 مینی بولا۔

”ٹھیک ہے پھر میں ہی سنبھال لیتی ہوں۔ تم اپنی
 رپورٹ میں لکھ دینا کہ میں نے اس معاملے میں غیر معمولی
 اقدامات کیے۔“

دوسری صبح وہ پولیس اسٹیشن کے باہر ملے۔ قریبی گرجا
 گھر سے گھنٹیوں کی آواز آرہی تھی۔ مینی بیس منٹ دیر سے

آیا۔ اس سے پہلے ہی مینی ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان ہو
 چکی تھی۔ مینی کے ہاتھ میں کافی کا تھرماس اور ایک بیگ تھا۔

”اب طبیعت کیسی ہے؟“ مینی نے پوچھا تو مینی نے
 جواب میں صرف سر ہلا دیا۔

وہ اپنے مقررہ مقام تک پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ
 ایڈی اپنے کچرے کے ڈرم لڑھکتا ہوا باہر لا رہا ہے پھر اس

نے تینوں ڈرم بڑے سلیقے سے سڑک کے کنارے رکھ دیے
 اور واپس گھر میں چلا گیا۔ ایک منٹ بعد اس کی واپسی

ہوئی۔ اس بار اس کی بغل میں وہی تھیلا تھا۔ وہ معمول کے
 مطابق پک اپ میں سوار ہوا اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔

”ہمیشہ کی طرح وہ آج بھی اپنی پک اپ میں بیٹھ کر
 کہیں چلا گیا۔“ مینی نے بیزاری کے عالم میں کہا۔ ”اس کا

جاسوسی ڈائجسٹ 145 جنوری 2014ء

پیچھا کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ ابھی مجھے گھر جا کر پکنگ بھی کرنی ہے۔“

”کیوں نہ ہم اس کے کچرے کی تلاشی لیں۔ شاید کوئی کام کی بات معلوم ہو جائے۔“ بینی نے کہا۔

لینی نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا اور بولا۔ ”اب تم اس کے کوڑے میں ہاتھ ڈالنا چاہتی ہو۔“

”میں یہ موقع ضائع کرنا نہیں چاہتی۔“

لینی ایک لمحے کے لیے ساکت بیٹھا رہا پھر اس نے اپنا سیل فون اٹھا کر اس کے سامنے کر دیا تاکہ وہ بھی وقت دیکھ لے پھر بولا۔ ”صرف آدھا گھنٹا۔ اس سے زیادہ ایک منٹ نہیں۔ جہاز جانے میں صرف چھ گھنٹے ہیں اور ابھی مجھے تیاری بھی کرنی ہے۔“

بنی نے دستانے پہنے اور سڑک پار کر کے ایڈی کے گھر کی جانب چل دی۔ انہوں نے پہلے سبز رنگ کا ڈرم دیکھا۔ اس میں کئی ہوئی گھاس اور پتوں کے سوا کچھ نہ تھا۔

سیاہ ڈرم میں ایسا کچرا اور قالتو سامان تھا جو ری سائیکل نہیں ہو سکتا تھا۔ نیلا ڈرم ڈبوں، بوتلوں اور کاغذ کے تھیلوں سے بھرا ہوا تھا۔ بینی نے اسے پوری طرح کھنگال ڈالا۔ لینی نے بھی اس میں جھانک کر دیکھا اور بولا۔ ”اس میں کوئی کام کی چیز نہیں ہے۔“

بنی نے ایک ایک کر کے سب چیزیں باہر نکال لیں۔ ان میں درجن کے قریب خالی بوتلیں، نصف درجن پانی کے ڈبے، دو پیڑا کے خالی باکس، ایک کتاب اور ہارڈ ویئر اسٹور کی رسید تھی جس کے مطابق ایک فلیش والو اور بال کا ک اسمبلی کی خریداری کی گئی تھی۔ بینی نے وہ کتاب اور رسید اپنے ہینڈ بیگ میں رکھ لی اور باقی چیزیں واپس ڈرم میں ڈال دیں۔

”چابیاں۔“ لینی نے اس کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا۔

”کیا مطلب؟“

”میں کار کی چابیاں مانگ رہا ہوں۔ ہمارا کام ختم ہو گیا ہے اور اب میں کار چلاؤں گا۔“

”میں کچھ کہنا چاہ رہی تھی۔“

”لیکن میں کچھ سننا نہیں چاہتا۔ شاید میں نے اس کیس کے سلسلے میں تمہیں ضرورت سے زیادہ چھوٹ دے دی تاکہ تمہارے اندر اعتماد پیدا ہو۔ یہ میری غلطی تھی۔“

”اگر تم مجھے وضاحت کا موقع دو۔۔۔۔۔“ بینی التجا آمیز لہجے میں بولی۔

”تم چابیاں دو۔“ وہ سختی سے بولا۔

بنی کا چہرہ سرخ ہو گیا اور وہ جوشیلے انداز میں بولی۔

”مجھے یقین ہے کہ صرف چیف ہی نہیں بلکہ قصبے کے لوگ بھی ہماری بہترین کوششوں کو سراہیں گے۔“

”میں چھٹیوں سے واپس آنے کے بعد چیف سے بات کروں گا اور کہوں گا کہ میں کسی نا تجربہ کار سراغ رساں کے بغیر ہی تنہا اس کیس پر کام کر سکتا ہوں۔ چاہے اس کے لیے مجھے کتنا ہی وقت کیوں نہ دینا پڑے۔“

”تم ایک موقع اور دو۔ مجھے یقین ہے کہ ہم اس معاملے کو بہت جلد نمٹا لیں گے۔“

”تم اپنے سارے مواقع استعمال کر چکی ہو۔“

”میں واقعی سوچ رہی ہوں۔۔۔۔۔“

”تم سوچتی بہت ہو۔“ یہ کہہ کر لینی نے اس سے کار کی چابیاں چھین لیں اور بولا۔ ”کار میں جا کر بیٹھو۔“

بنی کی آنکھوں میں آنسو آگئے لیکن اس نے سختی سے اپنے ہونٹ بھینچ لیے اور ایک لفظ کہے بغیر کار کی طرف چل دی۔ لینی نے اسٹیرنگ سنبھالتے ہوئے کہا۔ ”بہتر ہوگا کہ تم تیزی سے اپنے جسم کو متناسب بنا لو ورنہ دوسری صورت میں تمہیں دوبارہ پٹرول آفیسر بنا دیا جائے گا۔“

بنی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سارے راستے ان کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ پولیس گیراج پہنچ کر انہوں نے سرکاری کار واپس کی اور اپنی اپنی گاڑیوں میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہو گئے۔ کسی نے بھی ایک دوسرے کو خدا حافظ نہیں کہا۔ لینی گھر جا کر اپنی تیاریوں میں لگ گیا۔ چند گھنٹوں بعد اس کی فلائٹ تھی۔ اسے رہ رہ کر بینی پر غصہ آرہا تھا جس نے اس کا اتوار کا دن برباد کر دیا پھر وہ تھائی لینڈ کے ساحلوں کے تصور میں کھو گیا جہاں خوب صورت حسیناؤں کی قربت میں وہ دنیا جہاں کے تفکرات سے نجات حاصل کر لیتا جبکہ بینی نے دوبارہ ایڈی کے گھر کا رخ کیا اور وہاں پہنچ کر ایک بار پھر نیلے رنگ کے ڈرم کو کھنگالنے لگی۔

☆☆☆

جب لینی چھٹیاں گزار کر کام پر واپس آیا تو اس نے لابی میں افسروں کے ایک گروپ اور سوبیلین ملازمین کو دیکھا۔ اس جگہ عام طور پر چیف، لوگوں کی ترقیوں اور اسٹاف سے متعلق دیگر خبروں کے بارے میں نوٹس آویزاں کیا کرتا تھا۔ وہ سب نوٹس بورڈ کی جانب اتنے انہماک سے دیکھ رہے تھے کہ کسی نے بھی لینی کی واپسی کا نوٹس نہیں لیا جو بینکاک میں ایک بڑی رقم خرچ کر کے نئی وگ لگوا کر آیا تھا۔

وہ مجمع میں سے راستہ بناتا ہوا آگے بڑھتا کہ دیکھ سکے کہ نوٹس بورڈ پر ایسی کیا خاص بات ہے جسے یہ لوگ اتنے اٹہاک سے پڑھ رہے ہیں۔ یہ مقامی اخبار کے صفحہ اول پر شائع ہوا تھا جس کے ساتھ مینی کی چار کالمی تصویر بھی تھی جس میں وہ ایڈی کو ہتھکڑیاں لگائے اس کے گھر سے باہر لا رہی تھی۔ مضمون کا عنوان تھا۔ ”اوک ڈیل کی زیر تربیت سراغ رساں نے جعلی کرنسی پھیلانے والے گروہ کا پتا لگایا۔“

مضمون کے متن میں بتایا گیا تھا کہ اوک ڈیل پولیس ڈپارٹمنٹ کی تحقیقات کی بدولت وفاقی ادارے امریکی تاریخ کے سب سے بڑے جعل ساز گروہ کا خاتمہ کرنے میں کامیاب ہو گئے جو ملک میں بڑے پیمانے پر جعلی کرنسی پھیلا رہا تھا۔ اس گروہ کا سرغنہ چوالیس سالہ ایڈی گزشتہ روز اپنے کرائے کے مکان سے اوک ڈیل پولیس ڈپارٹمنٹ اور امریکی اٹارنی کے دفتر کی مشترکہ کوشش سے گرفتار ہوا۔ بعد ازاں چھ دیگر مشتبہ افراد کو بھی تین دوسرے ملحقہ قصبوں سے گرفتار کیا گیا جبکہ مزید گرفتاریاں متوقع ہیں۔

امریکی اٹارنی کے دفتر کے مطابق گرفتار ہونے والے پانچ افراد کو جعلی کرنسی کا کاروبار کرنے کے الزام میں آج مقامی عدالت میں پیش کیا جائے گا۔ سیکرٹ سروس ایجنٹ اسکاٹ کیمل جس نے اس چھاپے کے دوران پولیس کی مدد کی تھی، اس کا کہنا ہے کہ مینی ٹیلر کی ماہرانہ تفتیش کے بغیر یہ کارروائی کامیاب نہیں ہو سکتی تھی جسے صرف تین ہفتے قبل ترقی دے کر پٹرول آفیسر سے سراغ رساں بنایا گیا تھا۔ ترقی ملنے کے ایک ہفتے بعد ہی اسے ایک اور سراغ رساں کے ساتھ مل کر ایڈی کی نگرانی کرنے کے لیے کہا گیا۔ اوک ڈیل پولیس چیف بڈی پونڈر کے کہنے کے مطابق دوسرا سراغ رساں ایک ہفتے بعد ہی تعطیلات گزارنے تھائی لینڈ چلا گیا، اس وقت تک اس معاملے میں کوئی خاص پیش رفت نہیں ہوئی تھی۔

پونڈر نے سراغ رساں مینی کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ اس نے مینی کے چھٹیوں پر چلے جانے کے بعد بھی اپنے طور پر تفتیش جاری رکھی اور ایسے ثبوت تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئی جس کے نتیجے میں اسے یقین ہو گیا کہ ایڈی اپنے گھر میں جعلی کرنسی چھاپنے کے ساتھ ساتھ اسے قصبے سے باہر دوسرے علاقوں میں پھیلا رہا ہے۔

مینی نے اخبار کو انٹرویو دیتے ہوئے بتایا کہ اسے سب سے اہم سراغ ایکوائٹ ہیئر اسپرے کے چھ خالی ڈبوں کی صورت میں ملا جو اس نے ایڈی کے گھر کے باہر

رکھے کچرے کے ڈرم سے اٹھائے تھے۔ ماہرین کے مطابق یہ ہیئر اسپرے عام طور پر جعلی کرنسی پر ایک تہہ جمانے کے کام آتا ہے جس کے بعد اس کے نقلی ہونے کو پہچاننا مشکل ہو جاتا ہے۔

”میں ہیئر اسپرے کی اتنی بڑی مقدار دیکھ کر حیران رہ گئی۔“ مینی نے کہا۔ ”جبکہ ایڈی ڈرومنڈ گنجا ہے اور اسے ہیئر اسپرے استعمال کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس کے علاوہ نگرانی کے دوران میرے ساتھی اور میں نے اس کے گھر میں کسی عورت کی موجودگی کے آثار نہیں دیکھے۔ وہ بے روزگار تھا لیکن اس کی جیبیں نوٹوں سے بھری رہتی تھیں۔ کرائے کے گھر میں رہنے کے باوجود وہ مرمت کا کام خود کیا کرتا تھا جس کا مطلب ہے کہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ باہر کا کوئی فرد اس کے گھر میں آئے تاکہ کسی اور کو اس کی خفیہ سرگرمیوں کا علم نہ ہو۔“

ہیئر اسپرے کے ڈبے بطور ثبوت حاصل کرنے کے بعد مینی نے دوسرے روز بھی ایڈی کا تعاقب کیا۔ وہ چند میل جانے کے بعد ایک ڈرائیوان ریستوران کے باہر رک گیا۔ جب وہ قطار میں کھڑا ہوا تھا تو مینی اپنا شناختی کارڈ دکھا کر اندر گئی اور اس کھڑکی کے قریب چھپ گئی جہاں سے گا کہوں کو سامان دیا جاتا تھا۔ جیسے ہی ایڈی نے اپنا بل ادا کیا جو بیس ڈالر کے نوٹ کی شکل میں تھا، مینی نے سب سے آنکھ بچا کر وہ نوٹ اٹھا لیا اور اس کی جگہ اپنی جیب سے نوٹ نکال کر اس کی جگہ رکھ دیا۔

جب اس نوٹ کا بغور معائنہ کیا گیا تو وہ جعلی نکلا لیکن وہ اتنی مہارت سے تیار کیا گیا تھا کہ اس پر اصل کا گمان ہوتا تھا اور کوئی بھی پہلی نظر میں اسے نہیں پہچان سکتا تھا۔ اس انکشاف کے بعد اس نے یہ معاملہ نزدیک ترین اٹارنی آفس کے سپرد کر دیا۔

مینی کے پاس ثبوت کے طور پر ایسی کئی تصاویر تھیں جن میں ایڈی کو دوسرے مشتبہ افراد کو جعلی کرنسی کے تھیلے فراہم کرتے دکھایا گیا تھا۔ ان کی بنیاد پر سیکرٹ سروس کے ایجنٹوں نے اس کی گرفتاری کا وارنٹ حاصل کر کے اس کے گھر پر چھاپا مارا۔ ایڈی کے گھر سے ایک بڑی نوٹ چھاپنے کی مشین کے علاوہ بیس لاکھ ڈالر کی جعلی کرنسی بھی برآمد ہوئی۔ ایڈی کے پاس فرار ہونے کی گنجائش نہ تھی چنانچہ اس نے موقع پر ہی اپنے جرم کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ اس نے نوٹ چھاپنے کی جدید تکنیک جیل میں قیام کے دوران سیکھی تھی چنانچہ پٹرول پر رہا ہونے کے بعد اسے

جعل ساز

”ڈنر کے بارے میں کیا خیال ہے؟ ہم نئے سرے سے اپنے تعلقات کا آغاز کریں گے تاکہ تم مجھے اچھی طرح جان سکو۔ آج رات میں فارغ ہوں۔ تم کیا کہتی ہو؟“

”مجھے یہ بتاتے ہوئے خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ میری زندگی میں کوئی اور آ گیا ہے۔ ہماری ملاقات گزشتہ ہفتے ہی ہوئی تھی اور میں پہلی نظر میں ہی دل ہار بیٹھی۔ وہ آج رات میرے والدین سے ملنے آ رہا ہے۔“

”اگر تم مذاق نہیں کر رہی ہو تو یہ بہت اچھی خبر ہے۔“
لینی نے زبردستی مسکرا نے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”کیا میں اس خوش نصیب کا نام جان سکتا ہوں؟“

بنی نے اخبار میں چھپی ہوئی سکرٹ ایجنٹ اسکاٹ کیمبل کی تصویر کی طرف اشارہ کیا جس نے بنی سے کہا تھا کہ وہی ایڈی ڈرومنڈ کو ہتھکڑی پہنائے کیونکہ درحقیقت یہ کارنامہ اسی نے سرانجام دیا ہے۔

لینی نے غور سے تصویر کو دیکھا۔ وہ جانتا چاہ رہا تھا کہ کیمبل میں ایسی کیا خاص بات ہے جو بنی جیسی لڑکی اس سے متاثر ہو گئی۔ لینی نے اندازہ لگایا کہ اس کی عمر پینتیس کے لگ بھگ ہوگی۔ اس کے چہرے پر پرسکون مسکراہٹ نظر آرہی تھی اور آنکھوں میں ذہانت کی چمک نمایاں تھی۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو اپنی ذات کی حد تک پُر اعتماد ہوتے ہیں اور انہیں کچھ ثابت کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لینی بھی ایسا ہی آدمی بننا چاہ رہا تھا اور اپنی زندگی میں بڑی تبدیلیاں لانے کا خواہش مند تھا۔ اگر وہ اپنی کوشش میں کامیاب ہو جاتا تب بھی اس کے اور اسکاٹ کیمبل کے درمیان ایک فرق باقی رہتا اور وہ یہ کہ اسکاٹ کے بال اصلی تھے اور وہ دگ نہیں لگاتا تھا۔

”کیسا لگا؟“ بنی نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

”تمہاری پسند میری پسند ہے۔“ لینی نے ہلکتے خورہ انداز میں کہا۔ ”آخر دوست ہوں تمہارا۔ اب تو تمہیں میرے ساتھ ڈنر پر جانے میں کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔“

”آج نہیں۔۔۔ پھر بھی۔“ بنی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

یہ کہہ کر وہ لہراتی ہوئی وہاں سے چل دی۔ اسے ایک ساتھ دو خوشیاں ملی تھیں۔ ایک جانب اس کی ترقی ہوئی تھی تو دوسری طرف اسکاٹ جیسا اسمارٹ شخص اس کے دل کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ اس نے پلٹ کر لینی کی طرف دیکھا اور سوچنے لگی کہ اگر اس کے سر پر بال ہوتے تو کیا وہ اسے قبول کر لیتی؟

دولت کمانے کا یہی محفوظ ترین راستہ نظر آیا۔ اس کی نشاندہی پر چند مزید مقامات پر چھاپے مارے گئے جہاں سے دس لاکھ ڈالر زماہیت کی مزید جھلی کرنسی برآمد ہوئی۔

”اس کارنامے کا تمام تر سہرا سراغ رساں بنی ٹیلر کے سر ہے۔ اس نے انتہائی ہمت اور بہادری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس جعل ساز گروہ کا پتا لگایا۔“ سکرٹ ایجنٹ اسکاٹ نے اعتراف کرتے ہوئے کہا۔

اس موقع پر پولیس چیف نے بنی کی صلاحیتوں کے اعتراف کے طور پر اس کی آزمائشی مدت ختم کرنے اور اسے اگلے درجے میں ترقی دینے کا اعلان کرتے ہوئے کہا۔ ”میں آنے والے برسوں میں اسے مزید ترقی کرتے دیکھ رہا ہوں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ سلسلہ کہاں جا کر رکے گا کیونکہ کامیابی کی کوئی حد نہیں ہوتی۔“

لینی حیرت اور تعجب کے ساتھ نوٹس بورڈ پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ اس کا ذہن یہ حقیقت قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھا کہ بنی ایک ہی جست میں اس کے برابر آکھڑی ہوئی ہے اور کچھ عجب نہیں کہ کل وہ اس سے آگے نکل جائے جبکہ ایک ہفتے پہلے تک وہ اس کی ماتحت تھی اور وہ اس پر محکم چلا رہا تھا۔ اس خیال کے ذہن میں آتے ہی اس کی طبیعت مکر ہونے لگی۔

”چھنیاں کیسی گزریں۔۔۔ مجھے امید ہے کہ تم نے خوب آرام کیا ہوگا؟“

اس آواز پر اس نے گھوم کر دیکھا۔ وہ اس سے چند فٹ کے فاصلے پر کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے عمدہ سلاہوا سوٹ پہنا ہوا تھا اور ہونٹوں پر نئے شیڈ کی لب اسٹک لگائی ہوئی تھی جس سے اس کے حسن میں مزید نکھار آ گیا تھا۔ لینی نے گھونٹ لگتے ہوئے کہا۔

”میں نے یہاں سے دور رہ کر بہت کچھ سوچا اور اب میں نے اپنے آپ کو بالکل بدلنے کا تہیہ کر لیا ہے۔“

”یہ تو بہت اچھی بات ہے۔“ بنی نے کہا۔

”میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ باقاعدگی سے جم جاؤں گا، شراب نوشی کم کر دوں گا۔ بہتر غذا لوں گا اور اپنی نیند پوری کروں گا اور پہلے والی حالت پر واپس آ جاؤں گا۔ شاید تمہیں اس بارے میں معلوم نہیں۔“

”یہ بڑی مثبت سوچ ہے۔“ بنی نے کہا۔

”تمہیں یہ جان کر حیرت ہوگی کہ میں اسکول کے زمانے میں ایٹھلیٹ رہ چکا ہوں۔“

”مجھے تمہاری بات پر یقین ہے۔“

سکسپیٹر کا کہا ہوا ایک ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گیا ہے کہ زندگی ایک اسٹیج ہے جس پر ہم سب اداکار ہیں جو اپنا اپنا کھیل دکھا کے چلے جاتے ہیں۔۔۔ یہی "اداکار" زندگی کے آغاز سے انجام تک ایک جوا کھیلتا ہے۔۔۔ جس میں خدشات اور حادثات کی بازی پہلی سانس کے ساتھ لگتی ہے اور آخری سانس تک جاری رہتی ہے۔۔۔ تخلیق کے نقائص ہوں یا بیماریاں۔۔۔ وہ زندگی کے ہر نومولود کو شکست سے دو چار کرنا چاہتے ہیں مگر زندگی مقابلہ کرتی ہے اور یہ کھیل انسانی تدبیر اور نوشتہ تقدیر کے ساتھ زندگی کے تمام اہم ورغیر اہم فیصلوں میں جاری رہتا ہے۔۔۔ خوشی۔۔۔ غم۔۔۔ نفع۔۔۔ نقصان۔۔۔ دوستی۔۔۔ دشمنی۔۔۔ محبت اور نفرت۔۔۔ سب ہار جیت کے وہ روپ ہیں جن سے ہر انسان ایک جوا ری بن کے سامنا کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔۔۔ جوا ری۔۔۔ انسانی جذبوں کے رد عمل سے جنم لینے والی وہ کہانی ہے جو نگر نگر گلی گلی اور گھر گھر تھی بھی لگتی ہے اور پرانی بھی۔۔۔ آپ بیتی بھی اور جگ بیتی بھی۔۔۔ تجسس اور حیرانی کے سارے رنگ دہلاتی جادو اثر تحریر۔۔۔

جوا ری

احمد اتہال

ساتویں قسط

زندگی کی بساط پر اندھا جوا کھیلنے والے کھلاڑی کی ہوش ربا داستان





WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

ایم اے پاس خاور سکھر جیل میں سزائے موت کا منتظر تھا۔ اس پر قتل کا جھوٹا الزام ایک گینگ لیڈر نادر شاہ کے ایما پر عائد کیا گیا تھا۔ وہیں ڈاکوؤں کے گروہ کا سردار گمار ستم بھی پھانسی کا منتظر تھا۔ اس کے ساتھی جیل پر حملہ کر کے اسے چھڑا لے جاتے ہیں۔ گمار، خاور کو ساتھ لے جاتا ہے۔ خاور ایک پرانی غیر آباد حویلی میں پناہ لیتا ہے۔ خاور کو اس حویلی کے کھنڈر میں نورین ملی جو لباس عروسی میں تھی اور اپنے شوہر کو قتل کر کے آئی تھی۔ اس کی پرورش کرنے والے چچا نے نورین کی تمام جائیداد اور دولت پر قبضہ کر لیا تھا اور زبردستی اس کو اپنے پاگل بیٹے سے بیاہ دیا تھا۔ پاگل چچا زاد کی دست درازی سے بچنے کے لیے نورین نے اسے قتل کر دیا اور کھڑکی کے راستے آسیب زدہ مشہور حویلی میں آگئی۔ کسی نے اسے دیکھا تو بدروح سمجھ کے بھاگ گیا۔ نورین یہاں سلیبان خان نامی ایک شخص سے چھپ کر ملتی تھی۔ اسے پتا تھا کہ عدسے کے مطابق وہ یہاں موجود ہوگا لیکن وہ نہیں آیا تھا۔ نورین پریشان تھی کہ صبح پولیس اسے قتل کے الزام میں گرفتار کر لے گی۔ وہیں اس کی ملاقات خاور سے ہوئی۔ اس کھنڈر کی دوسری منزل پر خاور کو سلمان کی لاش نظر آئی۔ وہ اپنا وعدہ نبھانے پہنچا تھا لیکن قتل ہو گیا تھا۔ تلاشی پر خاور کو اس کی چپ سے دس لاکھ نقد ملے۔ خاور نے اپنے کپڑے اسے پہنائے اور خود اس کے کپڑے پہن کے رقم جیب میں ڈال لی۔ اس نے اپنا حلیہ بدلا اور نورین کو برج میں چھپا کر لے گیا۔ وہ اکیلا نورین کے گھر گیا تو اسے علم ہوا کہ نورین پر شوہر کے قتل کا الزام ہے جبکہ نورین نے نکاح نہ ہونے کے باعث اسے تسلیم نہیں کیا تھا۔ خاور نے نورین سے جھوٹ بولا کہ سلمان جو پہلے سے بے روزگار تھا نوکری مل جانے پر بدلتی چلا گیا تھا۔ باہر جانے میں خطرہ تھا کیونکہ فرید الدین (خاور) کے جیل سے فرار کی اطلاع کے بعد نادر شاہ نے اپنے کارندے اسے تلاش کرنے پر لگا دیے تھے جو کتوں کی طرح ہر جگہ اس کی بوسختی پھرتے تھے۔ دوسرا خطرہ پولیس سے تھا جن کو خاور کے علاوہ نورین کی بھی تلاش تھی۔ خاور، نورین کو لے کر نکلا اور ایک ہوٹل میں ٹھہر گیا۔ تاہم وہاں غیر محفوظ ہونے اور نورین کی اچانک طبیعت خراب ہونے پر وہ ایک اسپتال میں آگئے۔ خاور اور نورین وہاں سے نکلے۔ ہر بڑے ریلوے اسٹیشن، بس اسٹینڈ اور انٹرپورٹ پر وہ پکڑے جاسکتے تھے چنانچہ انہوں نے پنجاب کا رخ کیا اور کئی مقامات پر ٹرین بدلتے رہے۔ اس کے باوجود نادر شاہ کے بندوں نے جو دیگر کی وردی میں تھے، خاور کو پہچان لیا۔ ایک کو خاور نے چلتی ٹرین سے کودنے پر مجبور کر دیا۔ دوسرے نے نورین اور خاور کو حفاظت اور اپنی حمایت کا یقین دلایا۔ اس نے ایک تصویر دکھائی جو نورین کی گتھی تھی مگر وہ نازی کی بہن تھی۔ اسے کسی وڈیرے کے بیٹے نے اغوا کر کے اپنے پاس رکھا تھا اور آبروریزی کے بعد قتل کر دیا تھا۔ جذباتی نورین اسے اپنا بھائی تسلیم کر چکی تھی۔ خاور بھی اسے معاف کرنے پر مجبور ہو گیا، اس کا اصل دشمن نادر شاہ تھا۔ خانیہ کے وینک روم میں رات گزار کے وہ دونوں ایک پرائیویٹ کیری ڈبے سے لاہور کے لیے روانہ ہوئے۔ نازی نے انہیں رات بھر کے لیے کسی اجنبی قصبے کے باہر ایک کپے خالی گھر میں رکھا اور انہیں سلی دی کہ صبح وہ لاہور کے مضافات میں پہنچ جائیں گے۔ لیکن صبح جاگنے پر نادر شاہ کے آدمی آگئے اور نورین اور خاور کو لے گئے لیکن راستے میں نورین نے جانے کیا کیا کہ گاڑی حادثے کا شکار ہو گئی۔ خاور بچ گیا مگر نورین کا پتا نہ چل سکا۔ خاور نے رحیم بخش نامی شخص کے گھر میں پناہ لے لی مقامی چودھری رحیم بخش کی بیٹی سے شادی کا خواہش مند تھا۔ رحیم بخش کو قتل کر دیا گیا اور رحیم اور خاور کو چودھری کے گھر لے آئے گئے۔ خاور کو قید کر دیا گیا تاہم وہ اکبر کے بھائی انور کے ساتھ رہا ہو گیا اور انور نے حویلی پر اپنا اختیار حاصل کر لیا۔ رحیم بھی حویلی میں ہی تھی۔ چودھری انور نے اکبر کو قید کر دیا۔ اکبر اور خاور کو حویلی سے نکال کے دوسری جگہ پہنچایا گیا۔ تاہم کچھ وقت گزرنے کے بعد دوبارہ حویلی میں قید کر دیا گیا۔ حویلی میں انور نے اپنے مہمان ڈی آئی جی ملک احسان سے خاور کو ملوایا۔ اس نے بتایا کہ آپ کے دوست کا ہم شکل ایک مجرم جیل سے فرار ہے۔ تاہم پتا ہوا کہ اس نے کسی شک کا اظہار نہیں کیا۔ ادھر بڑے چودھری کو دل کا دورہ پڑا لیکن اس نے اسپتال میں داخل ہونے سے انکار کر دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ تمام کام گھر پر ہی کیے جائیں۔ خاور اور انور نے اسپتالوں کو ایک پمپٹ سپلائی کرنے والی کمپنی سے رابطہ کیا اور ان سے ایک پمپٹ کی خریداری کی بات کی۔ وہیں ایک شخص نے خاور کو فرید الدین کی حیثیت سے شناخت کیا تاہم خاور نے انکار کر دیا۔ انور اسے لے کر شناختی کارڈ آفس گیا تا کہ اسے نئی شناخت دے سکے مگر شناختی کارڈ بنانے والے نے فکرم پرش دیکھ کر انکار کر دیا۔

..... اب آپ آگے پڑھیے

انور کے سکون اور اعتماد میں ذرا بھی فرق نہیں پڑا۔
 ”دیکھو... ہم جو تمہیں اتنی بڑی رشوت دے رہے ہیں...
 اس لیے نہیں کہ ہم بے وقوف ہیں... یہ جائز اور قانونی
 شناختی کارڈ بنوانے کی قیمت نہیں ہے۔“
 ”وہ تو ٹھیک ہے لیکن... خطرہ مول لیتے ہوئے ڈر
 لگتا ہے۔“
 انور مسکرایا۔ ”میاں جی... ڈر کس کا ہے؟“
 ”پکڑے جانے کا۔“ وہ عیاری سے بولا۔
 انور نے کہا۔ ”دنیا میں یا آخرت میں؟ یہاں ہر
 غیر قانونی کام ہر آدمی اپنے فائدے کے لیے کرتا ہے۔
 رشوت لینے والا اور دینے والا دونوں جہنمی ہیں۔ یہ ڈر ہوتا تو
 نہ تم یہ کام کرتے نہ ہم... اور آج تم یہ کام پہلی بار کر رہے ہو
 نہ ہم... اس طرح تم اپنا ریٹ نہیں بڑھا سکتے۔ ایسے کام
 کرنے والے بہت ہیں... ہم کہیں اور چلے جاتے ہیں۔“
 اس نے مجھے اٹھنے کا اشارہ کیا۔
 وہ جلدی سے بولا۔ ”میرا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا۔ کام
 ہو جائے گا، آپ کرتے کیا ہو؟“
 انور نے کہا۔ ”میں غیر قانونی طور پر لوگوں کو باہر
 بھجواتا ہوں۔ شناختی کارڈ اور پاسپورٹ دونوں کسی اور کے
 نام پر ہوتے ہیں۔“
 شہباز خان نے سر ہلایا جیسے سب سمجھ گیا ہو۔ ”مسئلہ
 یہ ہے کہ اس کا شناختی کارڈ پہلے جاری ہوا تھا۔ فرید الدین
 ولد چودھری رشید الدین... یہی نام تھا نا... تم خود دیکھ لو،
 اس کی تصویر بھی ہے۔“

میں نے کہا۔ ”اب مجھے دوسرے نام سے چاہیے۔ تم یہ کام کر سکتے ہو تو بتاؤ ورنہ چھوڑو۔“

”کارڈ بن جائے گا لیکن تمہیں انگوٹھے کا نشان دوسرے ہاتھ کا لگانا پڑے گا۔“

”مجھے اس میں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔“

”بات تکلیف کی نہیں... تمہیں آئندہ یہ یاد رکھنا ہوگا کہ تمہارے انگوٹھے کا نشان کس ہاتھ کا ہے ورنہ صحیح فنگر پرنٹ تمہارا پچھلا پورا ریکارڈ سامنے لے آئے گا کہ پہلے تم ملک سلیم اختر نہیں تھے۔ پہلے تم پکڑے جاؤ گے... میری باری بعد میں آئے گی۔ جب دوسرے کارڈ کے اجرا کے معاملے کی تفتیش ہوگی اور تاریخ اجرا پر دیکھا جائے گا کہ ذمے دار کون لوگ تھے۔“

”میں خیال رکھوں گا۔“ میں نے کہا۔

”برانہ مانو تو ایک مفت مشورہ دوں... جو تمہارے مفاد میں بھی ہے اور میرے بھی۔“

”بولو۔“ انور نے بڑی فراخ دلی سے کہا۔

”جس انگوٹھے کا نشان ریکارڈ پر ہے... وہ کٹوا دو...“

شناختی علامت بھی یہی لکھ دو۔“

میں چونک پڑا۔ ”کٹوا دوں؟“

”ہاں کیا حرج ہے؟ آگے کا تھوڑا سا حصہ نہ ہو تو کیا فرق پڑتا ہے... کہاں کام آتا ہے؟“

میں نے انور کی طرف دیکھا۔ ”ہم سوچیں گے اس بارے میں... تم اپنا کام کرو۔“

اس نے لاپچی پُر امید نظروں سے انور کی طرف دیکھا۔ ”یہ کام سمجھو ہو گیا تمہارا... لگاؤ یہاں انگوٹھا... یہ نہیں یار یہ والا۔“ اس نے میرا ہاتھ پکڑ کے انگوٹھا اسٹیپ پیڈ پر دبایا اور اسکیئر پر رکھ دیا۔

انور نے چیک نکالا۔ ”ہم پھر کب آئیں... تم ملو گے؟“

وہ بے شرمی سے ہنسنے لگا۔ ”یار! ہم اپنی دکان چھوڑ کے کدھر جائے گا؟“

”یہ دکان نہیں... سونے کی کان ہے۔“ انور نے چیک اسے دے دیا۔

اس نے چیک کو غور سے دیکھا۔ ”یہ بینک تو لاہور میں ہی ہے۔ تم کیش کرا کے لا دو تو اچھا ہے۔“

انور نے چیک واپس لے لیا۔ ”اوکے... پھر ہم شام کے وقت آئیں گے۔“

”نہیں، تم کیش لے لو مجھ سے ابھی۔“ میں نے کہا۔

اور اسے گن کر پچیس ہزار دے دیے۔ اس نے کہا کہ ہم کل شام کارڈ لے جائیں۔

ہم باہر آئے اور ایک بار پھر ٹیکسی میں نیلا گنبد پہنچے جہاں انور کا ڈرائیور گاڑی میں سو رہا تھا۔ انور نے اسے سونے دیا اور اگلے دو گھنٹے ہم نے انارکلی میں شاپنگ کرتے گزارے۔ انور نے اپنے لیے کچھ کپڑے بنوائے اور اس کے اصرار پر میں نے بھی بنوائے تاہم میرا ذہن شناختی کارڈ آفس کے معاملے میں الجھا ہوا تھا۔ میرے ذہن میں شکوک اور اندیشے سر اٹھاتے جا رہے تھے۔ انور نے یقیناً یہ بات نوٹ کی ہوگی لیکن بازار میں چلتے چلتے اس نے مجھ سے بات کرنے سے گریز کیا۔ ہم واپس آئے تو ڈرائیور جاگ رہا تھا۔ ایک بار پھر ہم میونسپل ایکو پمنٹ سہاکی کمپنی میں گئے۔ انہوں نے ہمیں شام تک قطعی جواب دینے کا وعدہ کیا تھا۔

گاڑی کچھ فاصلے پر رکی تو میں نے دوبارہ اندر جانے کا رسک نہ لینے کا فیصلہ کیا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ مجھے سکھر جیل کے قیدی کی حیثیت سے پہچاننے والا اب مجھ سے اپنے اطمینان کے لیے مزید سوالات کرے۔ ایسا لگتا تھا کہ میری وضاحت سے اس کا شک دور نہیں ہوا تھا۔ اگر وہ خود جیل میں نہ ہوتا تو مجھے شناخت کیسے کرتا لیکن مجھے اس کے جرم کی تفصیلات جاننے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

انور آدھ گھنٹے بعد آیا تو بہت خوش تھا۔ ”یار! کام بن گیا۔ انہوں نے جو تخمینہ دیا تھا، اس کا نصف میں نے ادا کر دیا۔ یہ کل سے ایکو پمنٹ کی تنصیب شروع کر دیں گے۔ اباجی کے کمرے کو آئی سی یو بنانے میں ایک ہفتہ لگے گا۔“

”یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ اباجی خوش ہوں گے۔“

”بس یار... دنیا گھوم کے ہم نے یہی دیکھا کہ کوشش سے سب کچھ ہو جاتا ہے۔“

”اب مرحلہ رہ گیا ڈاکٹر اور نرس کا۔“ میں نے کہا۔

”نرس کو منانے کا مسئلہ نہیں ہوگا۔ بس منہ مانگی خواہ اور سہولت دینی ہوگی۔ منانا پڑے گا اس ریٹائرڈ کارڈ یا لوجسٹ کو... پہلے کہیں چائے پیتے ہیں پھر چلتے ہیں اس کی طرف۔“

مال پر کر پارام کیاؤنڈ میں دوسرا شیڈان اور نیشنل تھا۔ اس کا ماحول بیڈن روڈ کے کانٹینٹل سے یکسر مختلف تھا۔ یہاں کا طرز آرائش سو فیصد مشرقی اور کسی حد تک مغربی تھا۔ دیواروں کی پینٹنگ سے لے کر ڈیکوریشن پیس، لائٹس اور فرنیچر میں کچھ درباری ماحول نظر آتا تھا۔ ہم صبح دان سے روشن ایک گوشے میں جا بیٹھے۔

انور نے کہا۔ ”اب بتا مجھے... تو اتنا پریشان کیوں ہے؟“

”حد کرتے ہو تم یار... شناختی کارڈ کے دفتر میں جو کچھ ہوا...“

”کچھ بھی نہیں ہوا وہاں... اور نہ ہوگا۔ اپنے ماضی کو بھول جا... اب تو ملک سلیم اختر ہے... گواہی میری۔“

”اور شناخت میری... اس کا میں کیا کروں؟“

”وہ بھی بدل جائے گی وقت کے ساتھ دوست... حوصلہ رکھ۔“

”یار! میں کچھ اور سوچ رہا تھا۔“

اس نے غور سے مجھے دیکھا۔ ”کیا؟“

”جو اس ایجنٹ نے کہا تھا، وہ قابلِ عمل ہے... مجھے انگوٹھا کنوا دینا چاہیے۔“

”ادمانی گاڈ... یار اتنا مایوس ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ حلیہ بدلنے کے آسان اور بہتر طریقے بھی ہیں۔ تو داڑھی بڑھا سکتا ہے... موچھیں پال سکتا ہے۔“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”مائی ڈیئر انور! آئی ایم سوری... مگر تم میری طرح وہ شخص نہیں ہو جو زندگی کے لیے بھاگ رہا ہو۔ امید اور ناامیدی کے درمیان صرف ایک نظر نہ آنے والا لمحہ حائل ہوتا ہے۔ میں اس سے سوتے جاگتے خائف رہتا ہوں کیونکہ وہ لمحہ مجھے پھر پھانسی کے تختے پر نظر آتا ہے۔ معلوم نہیں کیوں خدا نے میرے جیسے گناہ گار کو یہ ایک زندگی گزارنے کی مہلت پھر عطا کر دی... ایسا دوسری بار نہیں ہوگا۔“

اس نے میرے ہاتھ پر تھپکی دی۔ ”یہ گزشتہ دو تین دن کے اتفاقات سے پیدا ہونے والا ڈپریشن ہے۔ میں ذرا پریکٹیکل آدمی ہوں۔ سر درد لیے پھرنے کے بجائے ایک گولی سے اس کا علاج کر لیتا ہوں۔ کیا حرج ہے اگر تو بھی کوئی اینٹی ڈپریشن میڈیسن استعمال کر لے کیونکہ ڈپریشن کے اسباب تو رہیں گے۔“

”پھر میں دوا کی بیساکھی کا محتاج ہو جاؤں گا... نو سر! میں اسباب کو ختم کرنے کی کوشش کروں گا... میرا خیال ہے کہ ایک نئی اور مختلف شناخت کے ساتھ نئی اور مختلف زندگی اپنانے کے لیے شارٹ کٹ کوئی نہیں، اس میں کچھ وقت لگے گا۔“

”اد کے... جیسی تیری مرضی بھائی... ابھی تو اٹھ... ایک آخری کام ہے، وہ بھی نمٹالیں۔“

ہم ریٹورنٹ سے نکلے تو رات اپنا دامن پھیلا چکی

تھی۔ مال پر روشنیاں جاگ اٹھی تھیں۔ سڑک پر ایک قطار میں نظر آنے والی اسٹریٹ لائٹس... ایک سیلاب کی صورت بہتی کاروں کی ہیڈ لائٹس... بڑی بڑی فیشن شاپس کے سائن بورڈز اور شوکیسوں کی آرائشی لائٹس اور تاریک افق کے پس منظر میں رنگین روشنی کے حروف والی اشتہاری نیون لائٹس... کاروباری مصروفیت والا ایک دن گزرتے ہی لاہور کے مال پر حسن و نور کے جلووں سے سجتی رات جوان ہو جاتی ہے۔ ہم اس متحرک ہجوم میں شامل ہو کے چیرنگ کر اس سے ایبٹ روڈ کی طرف مڑ گئے۔ بڑے چودھری صاحب کے پرانے پسندیدہ اور خاندانی ڈاکٹر کا کلینک لکشمی چوک سے آگے بسنت روڈ پر تھا۔ کلینک کے ویٹنگ روم میں اس وقت بھی مریض اپنی باری کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ انور نے دروازے سے اندر جھانکا۔

ڈاکٹر کی خاتون مریض کا نسخہ لکھ کے فارغ ہوا ہی تھا۔ ”چودھری انور... آئیے۔“ وہ کچھ حیران ہوا۔

”ہم آپ کا وقت ضائع نہیں کریں گے... ہمیں اس کارڈ یا لو جسٹ کا پتا چاہیے۔“ انور نے کہا۔ ”پھر ہم چلتے ہیں۔“

اس نے ایک کاغذ پر ہتا لکھا۔ ”دن میں آتے تو میں آپ کے ساتھ چلتا... چائے تو پی کر جائیں۔“

”کلف کی کوئی بات نہیں۔ یہ وقت مریضوں کا ہے... خدا حافظ۔“ انور نے کاغذ کا پرزہ لے لیا اور باہر آ کے ڈرائیور کو دے دیا۔ ”اس سچے پر جانا ہے... چلو۔“

ڈرائیور پرانا اور لاہور کی سڑکوں ہی نہیں، گلیوں کے جغرافیے سے بھی واقف تھا۔ اس نے تقریباً پون گھنٹے بعد ہمیں جیل روڈ کی ایک کوٹھی کے سامنے اتار دیا۔ اس کی گیٹ لائٹس بجھی ہوئی تھیں۔ اسٹریٹ لائٹس کی روشنی میں باہر دو نیم پلیٹیں پڑھی جاسکتی تھیں۔ ایک ڈاکٹر محمود جلالی کی اور دوسری کرنل عامر محمود کی۔ روشنی صرف اوپر والی منزل کے ایک حصے میں نظر آتی تھی۔ کال بیل بھی صرف ایک تھی۔ گھنٹی نہ جانے کہاں بجی۔ انور دوبارہ بٹن دبانے ہی والا تھا کہ ایک کھڑکی روشن ہوئی۔ شیشے کے پٹ کھول کے کسی نے جھانکا اور پوچھا۔ ”کون ہے؟“

انور نے کہا۔ ”جی... مجھے ڈاکٹر جلالی سے ملنا ہے۔“

میں چودھری انور علی ہوں۔“

”اس کے لیے تمہیں اوپر آنا پڑے گا یا مجھے نیچے... ورنہ بولو کیا کام ہے مجھ سے؟“ بوڑھے ڈاکٹر جلالی کی آواز میں بھی جلال تھا۔

عمر سے گزر آئے جس سے تم گزر رہے ہو۔“
انور نے مسکرا کے کہا۔ ”لا علاج عشق کا کوئی تجربہ نہیں

ہوا آپ کو؟“

وہ ہنسا۔ ”آخری ایسا ہی تھا۔ صدے اٹھا اٹھا کے دل کی قوت مدافعت اتنی کم ہو گئی تھی کہ خودکشی کرنا پڑی۔ بقول منیر نیازی... کچھ سانوں مرن دا شوق دی سی... اس کی سزا بن گئی ہے اب یہ زندگی۔“

”خودکشی کیسے کی تھی آپ نے سر؟“

”یار ایک مولوی کے سامنے دو لفظ بول کر... کہ

قبول ہے... ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے... انجام سب کا ایک ہی ہوتا ہے۔ تم بھی یہی کرو گے بالآخر... پھر

ایک دن اچانک تنہا رہ جاؤ گے میری طرح... ایک پیسے والی گاڑی...“ اس نے دیوار پر لگی ایک تصویر کو دیکھا۔

”وہ خود... رفاقت کے تیس برس اور چھ بچے کہاں گئے...“

خواب تھا جو بھی ہم نے دیکھا جو بھی سنا افسانہ تھا۔ خیر... پہلے بتاؤ چائے پیو گے کافی... پھر بتانا اپنی آمد کا مقصد۔“

انور کا اندازہ بالکل ٹھیک تھا۔ دیوار پر جس خوب صورت عورت کی تصویر تھی، وہ یقیناً اس کی مرحومہ بیوی تھی۔

چھ فریم ان بچوں کی تصویروں کے تھے جو خود اپنے بچوں کے ساتھ کھڑے تھے لیکن صرف تصویر کی صورت میں یا

عکس رہ گئے تھے... اس گھر کی وسعت میں وہ اپنے ماضی کے ساتھ تنہا تھا۔ ہم اسے کافی بتاتا دیکھتے رہے۔ ایک

کامیاب زندگی کا یہ ناکام انجام یقیناً افسردہ کرتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کے پاس سنانے کے لیے اپنے ماضی کی کتاب میں

قابل رشک داستان اور قابل فخر فتوحات کی کہانیاں تھیں لیکن آج اپنے اکیلے پن کے سوا کچھ نہ تھا۔ ایسا شخص باتیں

نہیں کرے گا تو اور کیا کرے گا۔ ہم اس کی داستان صبر سے سن رہے تھے۔ انور نے

بڑی شائستگی اور سعادت مندی سے اس کی خوشنودی حاصل کر لی تھی۔ جب اس کے سینے میں بھرا ہوا غبار نکل گیا تو اس

نے خود ہی پوچھا۔ ”یار ایک جھٹی بوڑھے کو معاف کر دینا... اپنی باتوں میں بھول گیا کہ تم پہلی بار آئے ہو تو کسی کام سے

آئے ہو گے... کچھ پرانے مریض کبھی آتے ہیں تو مفت مشورے کے لیے... بے غرض ملنے والا اب کوئی نہیں

رہا۔“

انور نے کہا۔ ”میں آپ کی شہرت کا سن کے آیا تھا۔“

”کون ہو تم؟ کسی چیتھڑا اخبار کے رپورٹر جسے کوئی شو بزنس کی تھرڈ ریٹ ایکٹریس... کوئی دو کوڑی کا پاپ

انور نے کہا۔ ”بات ایسی ہے کہ ہمیں اوپر آنا پڑے

گا۔“

”اچھا... ایک منٹ ٹھہرو۔“ اس کا چہرہ کھڑکی سے

غائب ہوا اور پھر دو منٹ بعد نمودار ہوا۔ اس نے ایک چابی اوپر سے پھینکی۔ ”یہ لو... گیٹ کا تالا کھول کے اندر آؤ...“

پھر گیٹ لاک کر دو... بائیں جانب پورچ کے بعد گیلری ہے۔ اس کے آخر میں زینہ ہے۔ دوسری چابی اس کے گیٹ

کی ہے۔ اندر آنے کے بعد اسے بھی لاک کر دینا۔“

چودھری انور نے چابی کیج کر لی تھی۔ اس نے گیٹ میں نصب لاک کو کھولا۔ ”اس سے نمٹنا آسان نہیں ہوگا

دوست۔“

میں نے کہا۔ ”بہت کڑک چیز ہے۔ مشکل ہے کہ

مانے۔“

”میرے پاس ہے ایسے بوڑھوں سے نمٹنے کا ایک نسخہ۔“

انور نے گیٹ کو اندر سے لاک کیا۔ ”سعادت مندی... ان کو بولنے دو... اپنی بالکل نہ کہو... ہر بات

سے اتفاق کر دو... پھر اپنی منوالو۔“

”دیکھتے ہیں آج یہ نسخہ کتنا کارگر ثابت ہوتا ہے۔“

”شرط لگا لو۔ میں جیت جاؤں گا۔ یورپ میں ایسے

تنہا بوڑھوں کو ایکسپلائٹ کر کے بہت فائدہ اٹھایا تھا میں نے جن کا آگے پیچھے کوئی نہیں ہوتا۔ بیوی بچے سب چھوڑ جاتے

ہیں تو وہ بات کرنے والے کو ترستے ہیں۔“ انور نے اوپر جانے کا راستہ کھولا اور پھر بند کر دیا۔ زینے کے آخر میں

سب سے اوپر پھر ایک دروازہ تھا۔ ہمارے آخری زینے پر قدم رکھتے ہی وہ جیسے خود بخود کھل گیا۔ روشنی کے فریم میں

ہمیں دراز قد اور درمیانے جسم والا ڈاکٹر جلالی نظر آیا جو اپنے گھنے برف جیسے سفید بالوں کے ساتھ بے حد گریس فل لگتا

تھا۔

اس نے باری باری ہم سے پرجوش مضبوط ہاتھوں کی گرفت کے ساتھ مصافحہ کیا۔ ایک واجبی انداز میں آراستہ

ڈرائنگ روم اور پھر لاونج یا کھانے کے کمرے سے گزر کے ہم جس بیڈ روم میں پہنچے، وہ خاصا کشادہ اور روشن تھا۔

اس کی آرائش میں نفاست اور سادگی کا حسن تھا۔

ہمارے سامنے بیٹھ کے اس نے پوچھا۔ ”یس...“

اب بتاؤ دل کے روگ کا مسئلہ کس کا ہے؟ ایک جوانی میں راہ

چلتے بھی لگ جاتا ہے اٹھتے بیٹھتے بھی... اس کا شافی علاج تو

کوئی نہیں... ایک عشق کے روگ سے نجات تب ہی ملتی

ہے جب اس سے زیادہ سنگین عشق کا روگ لاحق ہو۔ ہم اس

سنگر... کوئی تانکا پارٹی کا سیاسی ورکر بھی انٹرویو نہیں دیتا۔“
وہ برہم ہو گیا۔

انور نے فوراً کہا۔ ”جی نہیں سر... آپ بڑے نامور
کارڈیالوجسٹ تھے اور طویل تجربہ رکھتے ہیں۔“

”سب سمجھتے ہیں میں ٹاکارہ، آؤٹ آف ڈیٹ
ہوں... لیکن ایسا نہیں ہے۔ میں سب دیکھتا رہتا ہوں...
میڈیکل سائنس میں کیا پیش رفت ہو رہی ہے۔ میں سرجن
تھا۔ سیکڑوں کامیاب آپریشن کیے میں نے اور میرے
ہاتھوں کے اعجاز مسیحائی نے انہیں حیاتِ نو دی جو ہر طرف
سے مایوس لوٹ آئے تھے۔ اب میرے ہاتھ کانپتے ہیں، نہ
میری بصارت میں فرق آیا ہے لیکن دنیا بدل گئی ہے۔ خیر،
میں پھر اپنی کہنے لگا، تم اپنا مسئلہ بتاؤ۔“

جب انور نے اپنی بات شروع کی تو حیرت انگیز طور
پر اس نے پوری توجہ سے سنی اور کوئی دخل اندازی نہیں کی۔
انور نے بھی گھما پھرا کے بات نہیں کی۔ بڑے چودھری
صاحب کا مسئلہ اور مرض کی پوری تفصیل ڈاکٹر کے سامنے
رکھ دی۔ آخر میں اس نے یہ بتایا کہ اب ان کی ضد پر علاج
معالجے کی تمام سہولت گھر میں بھی فراہم کر دی گئی ہے۔ کمی
ہے تو صرف ایک اچھے معالج کی جو ان کی دیکھ بھال کر
سکے... مسئلہ نہ معاوضے کا ہوگا اور نہ سہولت کا... اگر وہ
ساتھ رہیں تو ان کی ہر شرط اور ہر مطالبہ پورا کرنے کی مکمل
ضمانت دی جائے گی۔

جب انور خاموش ہوا تو ڈاکٹر جلالی کچھ دیر سوچتا رہا
پھر اس نے اپنا مختصر فیصلہ سنا دیا۔ ”میں چلوں گا۔“

انور کے چہرے پر سکون اور مسرت کے جذبات
روشن ہو گئے۔ ”میں آپ کا شکریہ کیسے ادا کروں؟“

”اس کی ضرورت نہیں۔ یہ بتاؤ مجھے کب جانا ہوگا؟“

”جب آپ کہیں گے گاڑی بھیج دی جائے گی۔ اچھا

ہوگا کہ تمام انیکوپمنٹ آپ کی نگرانی میں لگایا جائے۔“

”پھر کل صبح دس بجے میں تیار رہوں گا... شرط میری

صرف ایک ہے۔“

”فرمائیے۔“ انور کا جوش و خروش جیسے کچھ ٹھنڈا

پڑنے لگا۔

”تم یہ کمرادیکھ رہے ہو؟ یہ تمہیں یوں کا یوں یہاں

سے اپنی حویلی میں منتقل کرنا ہوگا۔ بالکل اسی طرح... اس

کی ہر چیز جائے گی اور وہاں کسی کمرے میں اسی ترتیب کے

ساتھ رکھ دی جائے گی۔ ایک مریض کی نگرانی اور علاج

میری ذمہ داری ہے لیکن اس کے بعد میری زندگی اپنی

ہے... یہ ڈسٹرب نہ ہو تو مجھے کیا فرق پڑتا ہے کہ میں لاہور
میں رہوں یا کسی اور جگہ۔“

”مجھے بالکل منظور ہے... آپ کو کسی فرق یا کمی کا

احساس ہو تو ذمہ دار میں...“ انور اٹھ کھڑا ہوا۔ ”اب
مجھے اجازت دیں۔ گاڑی صبح ٹھیک دس بجے آپ کے

دروازے پر ہوگی۔“

یہ انتہائی غیر متوقع کامیابی تھی۔ اس میں ہمارا وقت تو

صرف ہوا لیکن محنت نہیں۔ جو وقت لگا، وہ بھی ڈاکٹر جلالی کی

باتیں سننے میں لگا۔ انور کا صبر اور حوصلہ کام آیا۔ سعادت

مندى کی جس حکمتِ عملی سے اس نے اپنے باپ کی موافقت

حاصل کر لی تھی، اسی سے وہ ڈاکٹر کا دل جیتنے میں بھی

کامیاب رہا۔ رات ساڑھے آٹھ بجے کے قریب ہم نے

واپسی اختیار کی اور امید تھی کہ ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد حویلی میں

ہوں گے۔ ہم گاؤں کی طرف جانے والی سڑک سے بیس یا

تیس کلومیٹر دور تھے اور دونوں طرف خاصا گھنا جنگل تھا۔

یہاں سڑک پر روشنی ہونے کا تو سوال ہی نہ تھا... رات بھی

تاریک تھی۔ یہ چاند کی آخری تاریخیں تھیں جب چاند کہیں

نصف شب کے بعد جھلک دکھاتا ہے۔ مطلع شام سے ابر آلود

تھا۔ ہمیں اندازہ بھی نہیں ہوا کہ پادلی گہرے ہو گئے ہیں۔

سڑک گاڑی کی ہیڈ لائٹس سے روشن تھی ورنہ اس تاریکی میں

سڑک کی سیاہ چوڑائی کا اندازہ ہونا بھی ناممکن تھا۔

جب ہم نے مین روڈ چھوڑ کے دائیں جانب کی نسبتاً

کم چوڑی سڑک پکڑی تو سناٹا مزید گہرا ہو گیا۔ اب مین روڈ

پر دونوں طرف سے آنے والا ٹریفک بھی نہیں تھا۔ اچانک

ہوا تیز ہو گئی اور اس کا اندازہ شیشم اور پمپل کے پتوں کا شور

بڑھ جانے سے ہوا تاہم بھیر و ایسی طاقتور گاڑی تھی کہ

دشت و صحرا اور ندی نالوں پر سے دندناتی گزر جاتی تھی۔ یہ

علاقہ ہمیشہ سے ڈاکوؤں کی دست برد سے محفوظ رہا تھا چنانچہ

میں اور انور علی بے فکری سے باتیں کرتے جا رہے تھے۔

انور اپنی اس کامیابی سے خوش تھا کہ اباجی کا علاج ان کی ضد

اور منشا کے مطابق اب حویلی میں ہی ہوگا اور یہ بات انور

کے حق میں جائے گی۔ شاید اکبر نے اباجی کی بیماری کو اتنی

اہمیت بھی نہ دی تھی اور اس کے لیے بھی یہ سارا انتظام ناممکن

نہیں تھا مگر وہ اتنا تردد ہی نہ کرتا۔ انور بہت پُر امید تھا کہ

آنے والے ہفتے میں وہ تمام معاملات خوش اسلوبی سے طے

کر لے گا اور سب کی ناراضی بھی دور کر دے گا۔ اکبر اس

کے حسن انتظام سے مطمئن نہیں ہوتا تو آخری کام یہ ہو سکتا

ہے کہ تمام جائیداد... دونوں میں مساوی طور پر تقسیم کر دی

دیکھنے والا چشمہ نہیں ہو سکتا تھا۔ اس اندھا دھند فائرنگ کا جواب دینا بھی بے وقوفی ہوتی۔ اس سے حملہ آوروں کو پتا چل جاتا کہ ہم کدھر جا رہے ہیں۔ مجھے نہ انور کا پتا تھا اور نہ ڈرائیور کا... وہ بھی خاموشی سے فرار ہو کے محفوظ مقام تک پہنچنا چاہتے تھے۔ فائرنگ کے درمیان ہی میں نے کسی کے بھیاٹک آواز میں چلانے کی آواز سنی۔ یہ غالباً ڈرائیور تھا اور وہ کسی کی گولی کا نشانہ بن گیا تھا۔

مجھے نہیں معلوم تھا کہ میری سمت کیا ہے اور مجھے بھاگتے ہوئے کتنی دیر ہو چکی ہے لیکن پھر فائرنگ کم ہوتے ہوئے ختم ہو گئی اور آوازیں بھی بہت پیچھے رہ گئیں تو میں دم لینے کے لیے ٹھہرا۔ میری سانس دھونکی کی طرح چل رہی تھی اور میرے حواس قابو میں نہ تھے۔ جب مجھے اس بات کا یقین ہوا کہ موت ٹل گئی ہے تو میں جیسے تیسے کر کے اس درخت پر چڑھ گیا جس کے نیچے رکا تھا۔ یہ شیشم کا درخت تھا اور اس کے تنے پر ریٹکے والے چبوتے میرے ہاتھوں پر آ گئے۔ انہوں نے مجھے بڑی بے رحمی سے کاٹا بھی لیکن میں نے کچھ اوپر ایک شاخ پر نکلنے سے پہلے کسی تکلیف کی پروا نہیں کی۔

جب میں غلیل کی شکل کے ایک مضبوط دو شاخے پر پہنچ گیا تو میں نے خود کو کچھ محفوظ محسوس کیا۔ زمین سے پندرہ فٹ کی بلندی پر مکمل تاریکی کی پناہ میں مجھے کوئی بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ہوا اس درخت کے پتوں میں سے بھی سنسناتی گزر رہی تھی اور ہر طرف سے اٹھنے والے اس شور کی کونج ماحول کو پُر خوف بنا رہی تھی۔ اب بادلوں میں بجلی بھی چمکنے لگی تھی۔ صرف لمحہ بھر کے لیے پھیلنے والی اس روشنی میں مجھے اپنے چاروں طرف جنگل کے جھومتے درختوں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ حملہ آور نہ جانے کہاں تھے۔ وہ ہمیں تلاش کر رہے تھے یا اپنی ناکامی سے مایوس ہو کے واپس جا چکے تھے۔ مجھے نہ انور کا پتا تھا کہ وہ کس سمت میں فرار ہوا اور میری طرح کسی درخت میں پناہ لے چکا تھا یا ابھی تک بھاگ رہا تھا۔ یقیناً اتنی ہی تشویش اسے میری طرف سے ہو گی لیکن ابھی سانس روک کر خاموش بیٹھ رہنے کے سوا کوئی بھی کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ ڈرائیور کے بارے میں مجھے اندیشہ تھا کہ اس نے حملہ آوروں کو دیکھا تو ان کو نشانہ بنایا اور انہی کے ہاتھوں مارا گیا۔ جب تک پورا یقین نہ ہو کہ حملہ آور ناکام لوٹ گئے ہیں، میں انور کو یا انور مجھے آواز دینے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔

آہستہ آہستہ میری سانس قابو میں آئی اور میرے

جائے اور پھر وہ اپنے حصے میں جو چاہے کرے۔

اچانک میرے کانوں نے ایک فائر کی آواز سنی لیکن اس سے پہلے ڈرائیونگ سائنڈ کی کھڑکی کے شیشے پر مگڑی کا جالا سا پھیل چکا تھا۔ پھر دوسرا فائر ہوا اور گولی کہیں گاڑی سے باہر لگی۔ تیسری گولی نے انور کی طرف کی کھڑکی کے شیشے کو منتشر کر دیا۔ یہ سب دو چار سیکنڈ کے وقفے سے ہوا۔ گاڑی نے اتنی دیر میں سو پچاس گز کا فاصلہ ہی طے کیا ہوگا۔ ڈرائیور ایک دم چلا آیا۔ ”سرنیچے کر لیں جناب عالی۔“ مگر اس کے چلانے سے پہلے ہی ایک خود کار عمل کے تحت ہم سیٹوں سے نیچے گر گئے تھے۔ ڈرائیور نے گاڑی کو سوچے سمجھے بغیر ایک طرف گھما دیا۔ گاڑی اچھلی اور دائیں بائیں ہوئی لیکن کسی درخت سے ٹکرائی نہیں۔ ڈرائیور کی مہارت تھی کہ اس نے اسپید کو بھی کنٹرول کیا اور درختوں کے درمیان سے راستہ بھی نکالا۔ اتنی دیر میں دو گولیاں اور گاڑی کے شیشوں کو منتشر کر چکی تھیں۔ بجبرو کے شیشے اس حد تک ضرور ہلٹ پڑے تھے کہ پتھر یا گولی لگنے سے ذرہ ذرہ ہو کے بکھرتے نہیں تھے۔ ایسا ہوتا تو اندر آنے والے شیشے کے ذرات بھی ہمیں لہو لہان کر دیتے۔ انور نے چلا کے مجھ سے پوچھا اور میں نے اس سے کہ تم ٹھیک ہو۔ صاف ظاہر تھا کہ فائرنگ کرنے والے دائیں بائیں موجود تھے۔ وہ گاڑی کے پیچھے کسی دوسری گاڑی میں نہیں آرہے تھے۔ گاڑی بالآخر ایک درخت سے تصادم کے بعد رکی۔ اس جھٹکے نے ہمیں گاڑی کے اندر اچھال دیا۔ ہیڈ لائٹس ٹوٹ گئی تھیں یا ڈرائیور نے آف کر دی تھیں۔ میں نے اندھیرے میں اس کی آواز سنی۔ اس نے چلا کے کہا۔ ”بھاگو جناب عالی۔“ پھر وہ خود گاڑی سے کود گیا۔ ایک دروازے سے میں نے باہر جست لگائی اور دوسرے سے انور نے... قسمت نے اب تک ہمارا ساتھ دیا تھا کہ گولی شیشے میں سوراخ کر کے گزر گئی تھی لیکن ہم نشانہ بننے سے بچ گئے تھے۔ اگر پہلی گولی نے ڈرائیور کی کپٹی میں سوراخ کر دیا ہوتا تو گاڑی بے قابو ہو کے الٹ جاتی۔

میں اندھیرے میں سمت دیکھے بغیر بھاگا اور گھنی جھاڑیوں میں سے گزر گیا۔ میرے ہاتھوں پر گہری خراشیں آئیں۔ فائرنگ اب بھی جاری تھی۔ لگتا تھا کہ حملہ آور گاڑی کے تعاقب میں جنگل کے اندر کھس آئے ہیں۔ اسلحہ انور کے پاس بھی تھا اور ڈرائیور کے پاس بھی لیکن اندھیرے میں کسی پر جوابی فائرنگ کرنا ممکن ہی نہ تھا۔ خود حملہ آور اندازے سے گولیاں چلا رہے تھے۔ ان کے پاس اندھیرے میں

کپڑے پانی میں شراہور ہو گئے۔ میں دل کو مضبوط کرتا رہا کہ انہی صبر آزما حالات میں مجھے ایک پوری رات گزارنی ہے۔

ایک وقت ایسا آیا جب میرے لیے گول تے کو گھوڑا بنا کے بیٹھنا بھی اتنا ہی تکلیف دہ اور ناقابل برداشت ہو گیا جتنا پیر اوپر اٹھا کے بیٹھنا۔ بارش کی شدت میں کچھ کمی آئی تو میں نے نیچے اترنے کا فیصلہ کیا۔ اس میں ایک ڈر کی بات بھی تھی کہ کہیں کوئی بل سے نکل آنے والا سانپ مجھے نہ ڈس لے۔ اندھیرے میں نظر کچھ آتا تھا تو آسمان پر چمکتی بجلیوں کی روشنی میں... نیچے اتر کے میں نے تے کے گرد گھوم کے وہ جگہ دیکھی جہاں پانی کی بوچھاڑ کچھ کم تھی۔ تے سے ٹیک لگا کے میں کچھ دیر کھڑا رہا پھر کھڑے کھڑے تھک گیا تو وہیں بیٹھ گیا۔ بارش رفتہ رفتہ ختم ہو گئی اور بجلیوں کے جلوے بھی کم ہو گئے۔

میں نے اندازے سے کسی سمت کا تعین کرنے کی کوشش کی اور نا کام رہا۔ معلوم نہیں میں کدھر سے آیا تھا اور انور کس طرف بھاگا تھا۔ سڑک کہاں تھی اور گاڑی کا خستہ و خراب شکستہ ڈھانچا کہاں کھڑا تھا۔

دور کہیں گیدڑ چلا رہے تھے۔ کئی بار مجھے سرسراہٹ سے ایسا لگا جیسے کوئی جانور جھاڑیوں میں سے نکلا ہو۔ ایک بار مجھے اس کا متحرک سایہ بھی دکھائی دیا۔ میں نے سنا تھا کہ رات کو بھیڑیے بھی نکل آتے ہیں اور وہ بھوکے ہوں تو ہوا کے ساتھ انہیں انسان کی بو محسوس ہو جاتی ہے۔ وہ اکیلے بھی نہیں ہوتے... غول کی صورت میں پھرتے ہیں۔ احتیاط کا تقاضا تھا کہ میں واپس درخت کے دو شاخے پر مورچا سنبھالے رہوں۔ میں نے اوپر دیکھا تو تاریک آسمان پر کہیں کہیں ستارے روشن ہو رہے تھے۔ بادل جس تیزی سے محیط ہوئے تھے، اب اسی تیزی سے منتشر ہو رہے تھے۔ آسمان کچھ دیر میں بالکل صاف ہو گیا اور میں نے برسوں بعد قطبی تارے کو بھی تلاش کر لیا۔ اب سڑک کی سمت معلوم کرنا میرے لیے ناممکن نہیں رہا۔ اس بات کا امکان ختم ہو گیا تھا کہ میں مخالف سمت میں چلا جاؤں۔ ہمت کر کے میں نے اندھیرے میں قدم آگے بڑھائے۔ میں نے آنکھیں بند کر کے سوچا کہ لاہور سے روانگی کے بعد ملتان کی طرف آتے ہوئے ہم نے کون سی سمت میں سفر کیا تھا۔ اب میں اسی اندازے کی بنیاد پر چل رہا تھا۔ صرف دو گھنٹے میں میری آنکھوں نے الو کی طرح اندھیرے میں دیکھنا سیکھ لیا اور تاروں کی برائے نام روشنی بھی مجھے کافی محسوس ہو رہی

اعصاب پر بھی خوف کے مفلوج کر دینے والے اثرات کم ہونے لگے۔ میں نے تاریکی میں روشن نظر آنے والے گھڑی کے ڈائل کو دیکھا تو رات کے گیارہ بجنے والے تھے۔ ابھی یہ اعصاب کی جنگ تھی۔ یہ ہو سکتا تھا کہ نامعلوم حملہ آور بھی کہیں تاریکی میں دم سادھے ہمارا کوئی رساغ ملنے کے منتظر ہوں۔ کسی آواز پر یا آہٹ پر کان لگائے کھڑے ہوں۔ آخر وہ کب تک انتظار کریں گے؟ خون ریزی کا یہ کھیل صرف تاریکی میں جاری رہ سکتا تھا۔ اچالے میں ان کا روپوش ہو جانا یقینی تھا لیکن رات بہت باقی تھی۔ کم سے کم آٹھ دس گھنٹے اس درخت پر ٹنگے رہنا مشکل اور صبر آزما کام تھا۔

بھوک پیاس کوئی آزمائش نہ تھی۔ نیند کے آنے کا سوال ہی نہ تھا لیکن مجھے اندازہ تھا کہ یہاں اس پوز میں ایک گھنٹے بعد ہی میرا اسٹیمنا ختم ہو جائے گا۔ میں نے دل ہی دل میں دعا مانگی کہ اے خدا انور کو خیر و عافیت کے ساتھ اپنی پناہ میں رکھنا اور اسے اتنی عقل دینا کہ وہ مجھے تلاش کرنے کی احمقانہ جرأت نہ کرے۔ اسے بھی صبح کا اجالا بھٹکنے تک جنگل میں گم رہنا چاہیے۔ شواہد یہ کہتے تھے کہ قاتل صبح ضرور تھے مگر ان کے پاس ٹارچ جیسی کوئی چیز نہیں تھی ورنہ وہ روشنی ڈال کے جنگل میں دور دور تک ہمارا سایہ تلاش کرتے اور درختوں کو بھی دور سے کھنگالتے۔ زیادہ امکان یہ تھا کہ وہ لوٹ گئے یا فرار ہو گئے۔

تمام خدشات، امکانات اور سوالات کے پس منظر میں ایک سوال پوری شدت سے نمایاں تھا کہ آخر یہ قاتلانہ حملہ کس کے ایما پر ہوا اور کس نے کیا؟ اس کا جواب تو آنے والا وقت ہی دے سکتا تھا۔ خدا کا شکر گزار میں اس بات پر تھا کہ اس نے ہمیں نادیدہ دشمن کے ناپاک عزائم سے محفوظ رکھا۔ جسم پر چڑھنے والے کیڑے مکوڑوں کو جھٹکنے کے لیے مجھے بار بار ایک ہاتھ کو استعمال کرنا پڑ رہا تھا۔ دوسرے ہاتھ سے میں ہوا سے ہلتی شاخ کو تھامنے پر مجبور تھا ورنہ توازن بگڑتا تو میں پندرہ فٹ نیچے گرتا۔ درختوں میں ہر رات سکون سے پناہ لینے والے پرندے ایک انسان کی دخل اندازی پر ناراضی کا اظہار شور مچا کے کر رہے تھے کہ اچانک موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ جنگل میں ہوا کے ساتھ اس کا شور مزید بھیا تک ہو گیا۔

سوائے استقامت سے اپنی جگہ بیٹھے رہنے اور صبر کرنے کے میں کیا کر سکتا تھا۔ درخت کی پناہ میں بھی بارش مجھ پر برس رہی تھی۔ ذرا سی دیر میں میرے سارے

بے مقصد حرکت ہوتی۔ کچھ دیر یونہی سرنگوں بیٹھنے کے بعد میں اٹھ کھڑا ہوا۔ میں یقین سے کہہ سکتا تھا کہ میں اس جگہ سے دور نہیں جہاں گاڑی درخت سے ٹکرا کے رکی تھی۔ میں نے دائیں بائیں دیکھا اور پھر ایک طرف قدم بڑھائے۔ رک کے واپس آیا اور ڈرائیور کی جیب میں دیکھا۔ کسی جیب میں ریوالور نہیں تھا۔ ریوالور اس کے ہاتھ میں یا ہاتھ کے نزدیک بھی نہیں تھا۔ جھک کر اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے ہر طرف دیکھنے پر بھی مجھے ریوالور کہیں قریب نظر نہ آیا تو میں نے بڑے تذبذب کے ساتھ اس کی لاش کو تھوڑا سا ہلا کے ایک ہاتھ نیچے ڈالا... ریوالور اس کے نیچے دبا ہوا تھا جو ایک دم میرے ہاتھ میں آ گیا۔ اس کے بے جان بدن نے ریوالور کو بارش میں بھیگنے سے بچا لیا تھا... یہ استعمال کے قابل تھا۔

تھینک یوفرینڈ... میں نے دل ہی دل میں کہا اور اب زیادہ اعتماد کے ساتھ آگے بڑھا۔ سراغ کوئی نہ تھا۔ بس میں اندازے سے چلتا گیا۔ تھوڑا سا دائیں طرف... پھر تھوڑا سا مخالف سمت میں... جہاں بھی مجھے راستہ کچھ صاف ملا۔ بحیرہ بھی اچانک اسی طرح میرے سامنے آگئی جیسے ڈرائیور کی لاش آئی تھی۔ وہ ایک درخت میں ٹھکی ہوئی تھی۔ میں کچھ دیر دم سادھے کھڑا رہا۔ پھر میں نے نیچے سے ایک خاصا بڑا پتھر اٹھایا اور دوسرے درخت کی اوٹ سے گاڑی پر اچھال دیا۔ پتھر نے گاڑی کی فولادی چھت پر ایک دھماکا کیا۔ یہ آواز گرد و پیش میں سو گز دور دشمن کو بھی متوجہ کر سکتی تھی۔ جب دس منٹ تک جنگل کا سکوت برقرار رہا تو میں نے اللہ کا نام لے کر گاڑی کی طرف قدم بڑھائے۔

اس کا سامنے کا حصہ تصادم سے تباہ ہو گیا۔ ونڈ اسکرین نکل گئی تھی۔ گرل ٹوٹ گئی تھی لیکن درمیان سے ٹکری وجہ سے ایک طرف کی ہیڈ لائٹ سلامت تھی۔ میں نے ڈرائیور کی سائڈ سے کھڑکی میں جھانکا اور اندر ہاتھ ڈال کے ہیڈ لائٹ کا سوئچ آن کر دیا۔

تاریک جنگل میں ایک دم روشنی بکھر گئی۔ ہیڈ لائٹس کے سامنے جہاں تک رکاوٹ نہیں تھی، روشنی کی ایک راہ گزر سی بن گئی۔ دس پندرہ گز کے بعد درختوں اور جھاڑیوں کے حائل ہونے تک اس اجالے نے رینگنے والی مخلوق سے اڑنے والے کیڑے مکوڑوں تک کی حرکت واضح کر دی۔ منعکس ہونے والی روشنی نے بھی دائیں بائیں اور اوپر تک جنگل کا پورا منظر نمایاں کر دیا۔ اوپر والے درخت کے پتے بھی

تھی۔ اس کے باوجود میں رک رک کر قدم بڑھا رہا تھا۔ ایسی ہی احتیاط نے شاید میری جان بھی بچالی۔ میں نے چند فٹ کے فاصلے پر حرکت دیکھی اور ایک نظر میں اسے گلہری یا گرگٹ جیسا کوئی جانور سمجھا مگر حرکت آہستہ اور مسلسل تھی۔ میں رک گیا۔ سب سانپ زہر پلے نہیں ہوتے۔ شاید بہت کم اتنے زہر پلے کہ ان کا کاٹا پانی نہ مانگے لیکن سانپ کی دہشت اپنی جگہ ہے۔ ایک لمحے کے لیے میرے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ وہ یقیناً خاصا موٹا اور لمبا سانپ تھا جس نے میرے راستے کو کاٹا۔ اسے گزرنے میں دس سیکنڈ تو ضرور لگے ہوں گے۔ حرکت اور رفتار سے میں نے اندازہ لگایا کہ شاید وہ مجھ سے آٹھ فٹ لمبا ہوگا۔ میں اس کی گزرگاہ سے چار قدم کی مسافت پر تھا۔ وہ دس سیکنڈ بعد گزرتا یا... ایک ہی وقت میں ہمارا ٹکراؤ ہوتا۔ کہا تو یہی جاتا ہے کہ جانور سے خطرناک کوئی جانور نہیں۔ کیا سانپ اور

فیولا... کیا اگیدڑ اور شیر... حضرت انسان کے سائے سے بھی سب بچتے ہیں لیکن کہیں آنا سامنا ہو جائے اور خطرہ جانور کو محسوس ہو یا درندہ بھوک سے مجبور ہو تو پھر آدمی ہی مارا جاتا ہے۔ جب مجھے پورا یقین ہو گیا کہ سانپ گزر کے دوسری طرف کافی دور جا چکا ہے تو میں نے آگے قدم بڑھائے۔ ایک جگہ راستہ یوں بند ہوا کہ چاروں طرف جھاڑیاں تھیں اور مجھے ان کے درمیان سے گزرنے کا ہیچ سے نکلا تو ایک دم میرے اعصاب پر بجلی سی گری۔ میں صدمے سے سن اپنی جگہ ساکت ہو گیا۔ میرے سامنے چند فٹ کی جگہ صاف اور ہموار تھی۔ تقریباً ایک والی بال کے گراؤنڈ جتنی... اور اس کے وسط میں کوئی انسان لیٹا ہوا تھا۔ وہ الٹا پڑا تھا اور اس کے ہاتھ دونوں طرف پھیلے ہوئے تھے۔ تاریکی میں بھی اس کی شناخت کے لیے چہرہ دیکھنا ضروری نہیں تھا اور نہ یہ سمجھنا کہ وہ محض ایک لاش ہے۔ یہ انور علی کا ڈرائیور تھا جس کے گولی کا نشانہ بننے کی پرورد آواز میرے کانوں نے بھی سنی تھی۔ اس جائگہ نے ہمیں قاتلوں کی یلغار سے بحفاظت نکال لیا تھا۔ انہیں ہم سے دور رکھنے کے لیے اس نے حملہ آوروں کو نشانہ بنایا تھا مگر وہ اکیلا تھا۔ ان کے جوابی قاتل سے وہ خود مارا گیا تھا۔

آہستہ آہستہ اس کے قریب پہنچ کر میں گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ اندھیرے میں نہ زخم کا پتا چلتا تھا اور نہ زخم سے بہنے والے لہو کا... اس کا جسم بھی بارش میں سرد پڑ کے اکڑ چکا تھا۔ اسے پلٹ کر سیدھا کرنا اور اس کی صورت دیکھنا ایک

مضطرب ہو کے احتجاجی انداز میں بولے اور ایک دوڑنے فضا میں چکر بھی لگایا۔ یہ ان کی پرسکون راتوں میں الو کی مداخلت تھی۔ میں نے لائٹ کو چند سیکنڈ بعد آف کر دیا اور خود ایک درخت کی اوٹ میں روپوش ہو گیا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ روشنی انور علی کے علاوہ میرے دشمنوں کو بھی متوجہ کر لے جو میری طرح دم سادھے بیٹھے ہوں کہ آخر کب تک میں اپنی پناہ گاہ سے نہیں نکلتا۔

پورے دس منٹ میں نے بڑے ضبط کے ساتھ گزارے اور پھر باہر آ کے لائٹ کو دوسری بار آن کیا۔ ایسا میں نے بار بار کیا۔ لائٹ آن اور پھر آف کرنے سے تاریک جنگل کا ایک حصہ بار بار روشن ہوتا تھا۔ بہت دور سے بھی اس سنل کو دیکھا جاسکتا تھا۔ اگر انور کی نظر ایک بار ادھر نہ اٹھی تو دوسری بار اسے افق کے بار بار روشن ہونے سے اندازہ ہو جاتا چاہیے کہ یہاں ایسی روشنی صرف اس کی گاڑی پھیلا سکتی تھی۔ گاڑی کے دونوں دروازے تصادم کی قوت سے پھنس گئے تھے۔ انجن کے بعد اس کے ڈرائیونگ کیبن کے فریم کو بھی نقصان پہنچا تھا اور گاڑی تقریباً تباہ ہو گئی تھی۔

ایک کھڑکی کا شیشہ غائب تھا۔ وہ غالباً جھٹکے سے پورا ہی نکل گیا تھا۔ اس میں سے خود کو اندر پہنچا کے میں نے ڈیش بورڈ کے خانوں کی تلاشی لی۔ مجھے اس میں سے ایک نارنج ملی۔ دوبارہ باہر آنے سے پہلے میں نے گاڑی کا ہارن بجایا۔ ایک بار... پھر دوسری بار زیادہ دیر تک اور تیسری بار... پھر میں نے مزید دس منٹ ایک درخت کے پیچھے انتظار میں گزارے۔

میری یہ کوشش کامیاب رہی۔ تیسری بار میں درخت کے پیچھے ہی تھا کہ میں نے اندھیرے میں کوئی حرکت سی دیکھی۔ میں نے باہر نکل کے غور کیا تو وہ کوئی انسانی ہیولا تھا جو ایک جھٹک دکھا کے غائب ہو گیا۔ دوسری بار وہ چند سیکنڈ کے وقفے سے نظر آیا۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ یہ انور کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ حملہ آور ایسی احتیاط کا مظاہرہ نہ کرتے۔ وہ دور سے ہی مجھے نشانہ بنانے کے لیے فائر کھول دیتے۔ وہ یقیناً فرار ہو چکے تھے اور یہ انور تھا جو میرے لائٹ سنل یا گاڑی کا... ہارن سن کے اس طرف آرہا تھا۔ میں درختوں کی اوٹ میں آگے بڑھا۔ تقریباً چالیس پچاس گز کے فاصلے سے میں نے انور کو پہچان لیا۔ میں احتیاط کو بالائے طاق رکھ کے دوڑا۔

”انور...“ میں نے چلا کے کہا اور انور چونک کے

میری طرف دوڑا۔ ہم ایسے بغل گیر ہوئے جیسے برسوں بعد ملے ہوں۔

”تو نے دیکھ لیا تھا میرا لائٹ سنل...؟“ میں نے خوشی سے کہا۔

”ہاں... ہارن کی آواز بھی سنی تھی۔“ وہ بولا... ”تو ٹھیک ہے نا؟“

”ہاں... اور تو؟“ میں نے اسے ٹٹول کر دیکھا۔

”تو زخمی ہے۔“ انور نے کہا۔

”یہ خراشیں ہیں... خدا کا شکر ہے کہ تجھے بھی کچھ نہیں ہوا... کہاں تھا تو؟“

”درخت پر چڑھا بیٹھا تھا۔ چیونٹے کاٹتے رہے پہلے اور پھر میں تھک گیا تو نیچے اتر۔“

میں ہنسا۔ ”یہی میرے ساتھ ہوا... اچھا اب چل... یہ بتا جانا کدھر ہے... تجھے اندازہ ہے راستے کا؟“

”ہاں... بہت اچھی طرح۔“ وہ میرا ہاتھ پکڑ کے چلنے لگا۔ اب ہم نارنج کی روشنی میں راستہ دیکھ سکتے تھے۔

”یار! وہ تیرا ڈرائیور... وہ مارا گیا۔“

”تجھے کیسے پتا چلا... فائر کی اور اس کی چیخ کی آواز تو سنی تھی میں نے بھی۔“

”میں نے اس کی لاش دیکھی ہے ابھی...“ میں نے دکھی دل سے کہا۔

وہ رک گیا۔ ”اچھا... کہاں دیکھی ہے؟“

میں نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ ”ادھر پیچھے... سو گز دور۔“ اور پھر ریوالور نکالا۔ ”یہ اس کے نیچے دبا ہوا تھا اس لیے پانی سے خراب نہیں ہوا۔“

”اللہ اس کی مغفرت کرے۔ اس نے جوابی فائر کیا تھا۔ یہ نہ کرتا تو شاید نشانہ بننے سے بچ جاتا۔“

”کوئی حملہ آور بھی تو نشانہ بنا ہوگا؟“

”واپس آ کے دیکھیں گے... چل۔“ وہ میرا ہاتھ پکڑ کے بولا۔

”یار! اس جاں نثار ڈرائیور کی لاش کو جانور تو نقصان نہیں پہنچا نہیں گے؟“

”جنگل میں گیدڑ اور بھیڑیے تو ہیں... لیکن مجھے آس پاس سے ان کی آواز سنائی نہیں دی۔“

میں نے کہا۔ ”وہ خون کی بو پر آسکتے ہیں۔“

”نہیں... وہ اتنی دیر سے نہیں نکلتے۔ اب تک وہ بھوک مٹا کے واپس جا چکے ہوں گے۔ تین گھنٹے میں اجالا

پھیل جائے گا۔ ہم جا کے جلد از جلد واپس آتے ہیں۔“
”تجھے یہ جگہ یاد رہے گی؟“

”یار! میرا سارا بچپن اور لڑکپن اسی علاقے میں شکار کرتے گزرا ہے۔ ہرن وغیرہ تو ہیں نہیں... خرگوش بہت مارے میں نے اور پرندے۔“

”انور! یہ حملہ کرنے والے کون تھے؟“

”معلوم ہو جائے گا۔ ظاہر ہے ہمارے دشمن تھے۔ دشمن کون ہو سکتے ہیں، یہ تو بھی جانتا ہے۔“ وہ تلخی سے بولا۔

ہماری پیش قدمی کی رفتار اب خاصی تیز تھی۔ صرف آدھے گھنٹے بعد ہم سڑک پر تھے۔ اس ذیلی سڑک پر اس وقت کسی قسم کا ٹریفک نہیں ہو سکتا تھا۔ اب مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ میں کس حد تک زخمی ہوں۔ گہری خراشیں میرے ہاتھوں پر ہی نہیں، چہرے اور گردن پر بھی تھیں جن سے بہنے والا خون اب جم گیا تھا۔ میرے کپڑے جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے تھے۔ ابھی اس کا اثر میری جسمانی صلاحیت پر نہیں پڑا تھا۔ میں بھوک، پیاس اور بے آرامی کے باوجود ٹھکن یا کم ہمتی کا شکار نہیں تھا۔ یہی کیفیت انور کی تھی۔ ہم زندہ تھے اور اپنے پیروں پر چل سکتے تھے۔ یہ احساس ہمیں قوت دے رہا تھا۔

سڑک پر ہماری رفتار بڑھ گئی۔ صرف ایک گھنٹے بعد ہم نے حویلی کو دیکھا۔ اس کے دروازے پر کرسی رکھ کے سونے والا گارڈ انور کے ہلانے سے ہڑبڑا کے اٹھا اور اس نے بوکھلاہٹ میں اپنی رائفل اٹھا کے انور کو سیلیوٹ کیا۔
”وہ سر! ذرا میری طبیعت خراب تھی۔“

انور نے اس کے کندھے پر چھکی دی۔ ”چلو دروازہ کھولو۔“

اس نے بڑی مستعدی سے دروازے کا قفل کھولا۔ یوں ڈیوٹی پر غفلت کے جرم میں رنگے ہاتھوں پکڑے جانے پر وہ کتنا پریشان ہوگا، اس کا مجھے اندازہ تھا۔ شاید اسے اب بھی ڈر ہوگا کہ اس کو سزا ضرور ملے گی۔ مگر انور نے وہی کیا تھا جو میں کرتا۔ انسان کوئی مشین نہیں ہوتا اور خراب تو مشین بھی ہو جاتی ہے۔ اس بار معافی مل گئی تو دوبارہ وہ ایسی غلطی کا ارتکاب نہیں کرے گا۔ میں اور انور اندر پہنچے تو سب معمول کے مطابق تھا۔ کسی کو بھی یہ اندازہ نہیں ہو سکتا تھا کہ ہم لوٹ کر کیسے آئے اور آنے سے پہلے ہم پر کیا گزری۔ سب نے بے آسانی فرض کر لیا ہوگا کہ ہم لاہور میں ہی کسی ہوٹل میں رات گزارنے کے لیے رک گئے۔

رات کے محافظ تینوں برآمدوں میں ٹہل رہے تھے۔

جواراں

ایک برآمدے میں دوسرا کمرہ میرا تھا اور آخری انور کا... دوسرے میں پہلا خالی تھا۔ دوسرا کمرہ اکبر اور تیسرا اس کی بیوی کی تحویل میں تھا۔ تیسری طرف بڑے چودھری صاحب کا بیڈروم تھا اور ان کا مہمان خانہ... اپنے کمرے میں جا کے انور نے باہر اٹھیں شین ہو جانے والے گارڈ کو اشارے سے اندر بلا دیا۔ ”جاؤ چاچا گل کو جگاؤ۔“

”جی جناب عالی...“ گارڈ نے پُر تشویش نظر سے انور کو دیکھا مگر اس کا موڈ دیکھ کر کوئی سوال کرنے سے گریز کیا۔

”میرا خیال ہے تو ابھی یہیں رک... واش روم میں جا کے خود کو صاف کر لے۔“ انور نے کہا۔

میں کرسی پر بیٹھ کے اپنی توانائی بحال کر رہا تھا۔ ”اس کی جلدی نہیں... پہلے تو کچھ کھانے پینے کے لیے منگوا۔“

”ابھی چاچا گل سے کہتا ہوں۔ وہ سب سنبھال لے گا۔“ انور نے کہا۔ ”اس وقت میں کسی کو ڈسٹرب کرنا نہیں چاہتا۔“

چاچا گل خاصی تشویش کے ساتھ نمودار ہوا۔ ”خیریت ہے جناب عالی... یہ کیا ہوا؟“

”ابھی بتاتا ہوں۔ پہلے کچن میں کسی سے کہو کہ ہمارے لیے کافی لائے... ابلے ہوئے انڈے... اس کے بعد ہائی لکس پک اپ نکلواؤ... دیکھو کون ڈرائیور تمہارے ساتھ جائے گا۔ ایک دو بندے اور لے جاؤ اپنے ساتھ... اور دیکھو... ابھی کسی کو کچھ بھی نہیں بتانا ہے۔“

”جانا کہاں ہے جناب؟“

انور نے اسے وضاحت سے اس جگہ کے بارے میں بتایا جہاں سے چاچا گل کو ڈرائیور کی لاش اٹھانی تھی۔ ”سب کے پاس ٹارچ ہونی چاہیے۔ تھوڑا سا تلاش کرو گے تو وہاں پہنچ جاؤ گے۔ اس کی لاش اٹھوا کے لاؤ اور صبح ہوتے ہی کفن و دفن کا انتظام کرو۔ ابھی کسی کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔“

آدھے گھنٹے بعد میں گرم پانی سے غسل کر کے اپنے زخم ڈینول سے صاف کر چکا تھا اور کپڑے بدل چکا تھا۔ میں نے اپنے بیڈروم کا واش روم استعمال کیا تھا۔ اتنی دیر میں انور بھی صاف ستھرا ہو چکا تھا۔ ہم نے اکٹھے بیٹھ کر کافی پی۔

ابلے ہوئے انڈوں کے علاوہ بھی کچن سے بہت کچھ آگیا تھا۔ ہم نے درود کا احساس مٹانے والی گولیاں بھی کھائیں۔ اس وقت تک صبح کاذب کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ فوری طور پر مجھے نیند کی ضرورت محسوس نہیں ہو رہی تھی اور یہ وقت سونے کا تھا بھی نہیں۔ انور کچھ دیر کے لیے بیڈ پر دراز ہوا

سوئے گا۔

میں نے اپنے بیڈروم کا واش روم استعمال کیا تھا۔ اتنی دیر میں انور بھی صاف ستھرا ہو چکا تھا۔ ہم نے اکٹھے بیٹھ کر کافی پی۔

ابلے ہوئے انڈوں کے علاوہ بھی کچن سے بہت کچھ آگیا تھا۔ ہم نے درود کا احساس مٹانے والی گولیاں بھی کھائیں۔ اس وقت تک صبح کاذب کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ فوری طور پر مجھے نیند کی ضرورت محسوس نہیں ہو رہی تھی اور یہ وقت سونے کا تھا بھی نہیں۔ انور کچھ دیر کے لیے بیڈ پر دراز ہوا

سوئے گا۔

میں نے اپنے بیڈروم کا واش روم استعمال کیا تھا۔ اتنی دیر میں انور بھی صاف ستھرا ہو چکا تھا۔ ہم نے اکٹھے بیٹھ کر کافی پی۔

ابلے ہوئے انڈوں کے علاوہ بھی کچن سے بہت کچھ آگیا تھا۔ ہم نے درود کا احساس مٹانے والی گولیاں بھی کھائیں۔ اس وقت تک صبح کاذب کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ فوری طور پر مجھے نیند کی ضرورت محسوس نہیں ہو رہی تھی اور یہ وقت سونے کا تھا بھی نہیں۔ انور کچھ دیر کے لیے بیڈ پر دراز ہوا

اور میں صوفے پر لیٹا رہا۔ ہم دونوں خاموش تھے۔ کچھ دیر پہلے تک ہم پر گزر جانے والی رات کے واقعات کا اثر نہیں تھا لیکن اب اس وقت کا ہر لمحہ جیسے پھر زندہ ہو گیا تھا۔ شاید انور بھی وہی سوچ رہا تھا جو میں... اور یہ فطری رد عمل تھا۔ زندگی کی مہلت ابھی تمام نہیں ہوئی تھی چنانچہ خدا نے ہمیں محفوظ رکھا۔ مارے جانے والے سے بچانے والا ہاتھ یقیناً زیادہ بڑا اور طاقتور ہوتا ہے۔ پھر بھی یہ خیال جاتا نہ تھا کہ سازش کامیاب ہو جاتی تو کیا ہوتا۔ انور بھی کسی سوچ میں گم تھا۔

کچھ دیر بعد وہ بولا۔ ”یار! میں چاہتا ہوں کہ ابھی اصل بات کسی کو معلوم نہ ہو۔“

”تو نے گل چاچا سے بھی یہی کہا تھا لیکن لاش اٹھانے والے جو اس کے ساتھ گئے ہیں؟“

”جب گل چاچا کو بتا دیا ہے میں نے... تو وہ ایسا ہی کرے گا۔ انجی لاش لانے کے بعد میں اسے مزید ہدایات دوں گا۔“

میں نے کہا۔ ”او کے... ہماری اسٹوری کیا ہوگی؟“ وہ سوچ کے بولا۔ ”ہم شہر سے آرہے تھے... مراد اداں والی کی طرف آنے والی سڑک پر کچھ لوگوں نے ہماری گاڑی روکنے کے لیے فائر کیے... انہوں نے ہمیں اتار دیا اور ڈرائیور کو ساتھ لے گئے۔“

”وہ ڈاکو نہیں تھے؟“

”ظاہر ہے... ورنہ ہمیں لوٹتے... ہمارے دشمن ہوتے تو ہمیں بھی لے جاتے یا مار دیتے۔“

میں نے کہا۔ ”یہ ڈرائیور کی ذاتی دشمنی کا شاخسانہ تھا؟“

”ہاں... وہ یہاں تین سال سے تھا اور یہاں کا رہنے والا نہیں تھا۔“

”اور دنیا میں اکیلا تھا... اس کا کوئی خاندان نہیں تھا؟“

”ہمیں علم نہیں... وہ کسی کے حوالے سے آیا تھا۔ کبھی کبھی چھٹی لے کر جاتا تھا۔“

”کہاں جاتا تھا؟ میں یہ اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ پولیس تفتیش کی رکی کارروائی ضرور کرے گی۔“

”اسی لیے میں تجھے بتا رہا ہوں... ممکن ہے اکبر کو یا اباجی کو اس کے بیک گراؤنڈ کا علم ہو۔ انہیں کچھ بتانا ہوگا تو وہ بتا دیں گے۔ ہم اپنی بات کو اسی واقعے تک محدود رکھیں گے کہ یہ واقعہ کس وقت اور کہاں پیش آیا؟“

”ہم اتنی رات گئے کیوں واپس آرہے تھے؟“

”ہم وقت پر پہنچ جاتے۔ میرا مطلب ہے رات کو لاہور سے کھانا کھا کے چلتے تو زیادہ سے زیادہ بارہ بجے یہاں ہوتے لیکن لاہور سے باہر آئے تو گاڑی میں کچھ خرابی ہوئی۔ ڈرائیور نہ جانے کہاں سے مکینک کو لایا۔ دیر اسی لیے ہوئی۔ ڈرائیور کے وہ دشمن جانتے تھے کہ وہ واپس آئے گا تو اسی راستے سے گزرے گا۔ وہ انتظار کرتے رہے۔“

”اور یہ واقعہ کب پیش آیا؟“

”رات ڈھائی بجے کے بعد... پھر ہم پیدل واپس آئے۔“

”اور یہ خراشیں... جو ہم دونوں کو آئی ہیں؟“

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ ”اسٹوری میں ترمیم کر لیتے ہیں۔ وہ ہمیں بھی لے گئے تھے مگر جنگل میں ایک جگہ انہوں نے ہمیں اتار دیا۔ پھر بارش ہوئی۔ گاڑی کو وہ ڈرائیور سمیت آگے کہاں لے گئے، ہمیں نہیں معلوم... ہم بارش رکنے کے بعد آئے تو یہ خراشیں آئیں۔“

میں نے سر ہلایا۔ ”ٹھیک ہے۔ تو چاہتا ہے کہ کہانی میں سے سازش کا عنصر نکال دیا جائے۔ ہم یہ نہ کہیں کہ قاتلانہ حملہ ہم پر کیا گیا تھا؟“

”ہاں، میرا یہی مقصد ہے۔ اس واردات کے پیچھے جو بھی تھا... اسے شک نہ ہو۔“

”شک تو ہمارے جھوٹ سے ہو جائے گا۔“

وہ بولا۔ ”ہاں... لیکن وہ سمجھے گا کہ ہم ڈر گئے... یا ہم اس واقعے کی تشہیر نہیں چاہتے۔ اسے یہی پریشانی ہوگی کہ آخر ہم نے ایسا کیوں کیا۔ اس کا تجسس اسے مجبور کرے گا کہ جھوٹ کی وجہ جانے۔“

میں نے کہا۔ ”جیسی تیری مرضی یار... لیکن کیا تجھے کسی پر شک ہے؟“

وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے بولا۔ ”اس کا نام لینا ضروری ہے دوست؟“

”نہیں... ثبوت کوئی نہیں تو نام لینے سے فائدہ؟“

”رائٹ... ثبوت مل جائے گا۔ آج نہ سہی کل... لیکن اب میں بھی چوکس ہوں۔ مجھے معلوم ہے وہ چین سے نہیں بیٹھ سکتا۔“

انور علی کی رائے سے اختلاف کی گنجائش بھی نہیں تھی۔ اس موضوع پر مزید بات کرنے کا موقع بھی نہ ملا۔ گل چاچا نے اندر آ کے کہا۔ ”میت آگئی ہے جناب عالی۔“

نہیں بھولتے۔ اگر ایسا ہو تو میری لاش میرے خاندان والوں تک پہنچانے کی کوشش کرنا اور یہ ساری کمائی میری ماں کو دے دینا۔“

چاچا گل کی بات نے مجھے بھی اداس کر دیا تھا۔ ایک سادہ صفحہ نظر آنے والوں کی زندگی بھی کیسی داستان ہو سکتی ہے۔ کبھی گل رنگ تو کبھی لہو رنگ... میں نے کہا۔ ”تمہیں اس کی فیملی کا پتا معلوم ہے؟“

”جی سر... اس نے خود ہی دیا تھا۔“ چاچا گل نے کہا۔

”ٹھیک ہے... پھر تم خود ہی یہ ذمے داری پوری کرو۔ یہاں پولیس کی ریکی کار روائی پوری ہو جائے تو میت لے جاؤ۔“ انور علی نے کہا۔

”جو کچھ تم نے ہمیں بتایا ہے... پولیس کو بھی بتا دینا۔“ میں نے کہا۔

”بتا دوں گا سر... اب چھپانے کا کچھ فائدہ نہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا انہیں جو اسے قتل کرنے آئے تھے؟“ انور نے اقرار میں سر ہلایا۔ ”اسی لیے انہوں نے ہمیں اتار دیا تھا، جنگل میں لے جا کے... ہم ان کے چہرے نہیں دیکھ سکے تھے۔“

چاچا گل چلا گیا تو انور نے کہا۔ ”ہم جو کہانی بنا رہے تھے، وہ حقیقت تھی۔“

”چلو جھوٹ سے بچ گئے لیکن اب مجھے بہت افسوس ہو رہا ہے۔ دنیا میں کتنے دکھی دل والے اپنے زخم چھپائے پھر رہے ہیں۔“

اب صبح کا اجالا بہت پھیل گیا تھا۔ معمول کے مطابق بڑے چودھری صاحب کا ناشتا ان کے کمرے میں پہنچا دیا گیا تو ریشم دروازے میں نمودار ہوئی۔ اس کی شخصیت میں رونما ہونے والی تبدیلی نے مجھے حیران کر دیا۔ ایسا اچانک ہوا تھا یا پہلے میں نے اس پر غور نہیں کیا تھا۔ میرے سامنے جو لڑکی تھی، وہ کسی طرح بھی دیہاتی نہیں تھی۔ اس کا لباس پیش قیمت ہی نہیں، جدید ترین وضع کا بھی تھا اور یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ لباس اس پر حسین لگ رہا تھا یا لباس نے اسے اتنا حسین بنا دیا تھا۔ ریشم کا روپ بھی نکھر آیا تھا اور محسوس نہ ہونے کے باوجود اس نے بڑے سلیقے سے ہلکا سا میک اپ بھی کیا تھا۔

ہم دونوں کو دم بخود اور پلک جھپکائے بغیر اپنی طرف دیکھتا پا کے ریشم کا رنگ لال ہو گیا۔ وہ خوش بھی ہوئی تو یہ ایک فطری بات تھی۔ یہی وہ چاہتی ہوگی۔ اس نے کہا۔ ”کیا

انور اٹھ کھڑا ہوا۔“ کہاں رکھی ہے؟“ ”مہمان خانے میں۔“ وہ کچھ اداس تھا۔

”تم جانتے ہو نا ہماری گاڑیوں کی سروس اور دیکھ بھال کہاں ہوتی ہے۔ انہیں فون کر کے بتا دو کہ گاڑی کو حادثہ پیش آیا ہے اور وہ کہاں موجود ہے... اسے اٹھوا لیں... میں شہر جاؤں گا تو ان سے بات کر لوں گا۔ ڈرائیور کب سے ہمارے پاس تھا؟“

”تین سال سے زیادہ ہو گئے جناب۔“ ”کہاں کا رہنے والا تھا؟ کس کے حوالے سے آیا تھا... اس کا کوئی والی وارث ہے؟“

”سوات یا گلگت کا رہنے والا تھا۔ بڑے چودھری صاحب کے پاس آیا تھا۔ انہیں ملا تھا کہیں... سال میں ایک دو بار چھٹی لے کر جاتا تھا مگر یہ معلوم نہیں کہ کہاں... سنا ہے قبائلی علاقے سے بھاگا ہوا تھا۔ کوئی لڑکی نکال لایا تھا۔ اس کے قبیلے والے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ کافی عرصہ دونوں چھپ کر رہے اور ادھر ادھر پھرتے رہے... پھر قبیلے والوں کو پتا چل گیا۔ انہوں نے دونوں کو قتل کرنے کے لیے گھیر لیا تھا مگر یہ بچ کر نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اب اپنی بیوی کے قاتل سے بدلہ لینے کے چکر میں تھا اور وہ اسے مارنے کے چکر میں... اس نے اپنا نام بھی بدل رکھا تھا۔“

”تم تو سب کچھ جانتے ہو۔ یہ اس نے خود بتایا تھا تمہیں؟“

”جی جناب... آدمی بالکل اکیلا کیسے رہ سکتا ہے۔ کوئی تو ہونا چاہیے جس سے کبھی دل کی بات کہے... پہلے نہیں بتاتا تھا مگر بعد میں مجھ پر بھروسہ کرنے لگا تھا۔“

”اور کون لوگ تھے خاندان میں؟“

”سب تھے جناب عالی... باپ تھا... بھائی بہن تھے۔“ گل چاچا نے آہ بھری۔

”کمائی کا کیا کرتا تھا؟“

اس نے کچھ تذبذب سے کہا۔ ”کچھ نہیں... میرے پاس رکھوا دیتا تھا۔ میں نے کئی بار سمجھایا کہ چلو اب بہت سوگ منا لیا... شادی کر لو یہاں۔ اپنا گھر بناؤ... میری بات سنا تھا، شاید مان بھی جاتا۔“ چاچا گل نے آنکھوں میں آنے والے آنسو صاف کیے۔

”سب قسمت کے کھیل ہیں چاچا... اب اس کی رقم کا کیا کرو گے؟“

”اس نے کہا تھا کہ اگر میرے دشمنوں نے مجھے تلاش کر لیا تو چھوڑیں گے نہیں۔ قبائلی سو سال بعد بھی بدلہ لینا

ہو گیا ہے تم دونوں کو... میں ریشم ہوں۔“
میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”نہیں... ریشم کو جانتے ہیں ہم۔“
”تم اس کارٹکین ڈی کس ایڈیشن ہو... یہ انقلاب کیا ہے...؟“ انور نے کہا۔
وہ شرما کے بولی۔ ”سلوٹی نے سب کیا ہے۔“
انور نے کہا۔ ”اسے میں پرائنڈ آف پرفارمنس دے سکتا ہوں۔“
ریشم ہنسی۔ ”وہ کیا ہوتا ہے؟“
”اعلیٰ کارکردگی کا انعام... اس نے تو کمال کر دیا۔“
انور بولا۔

میں نے کہا۔ ”دوست! تمہارا مطلب ہے ریشم خود کچھ نہیں تھی... اب ہیرا نظر آرہی ہے تو پہلے کوئلہ تھی؟“
”دیکھو، یہ تمہیں مجھ سے بدگمان کرنے کی کوشش کر رہا ہے... سونا تو سونا ہوتا ہے... زرگر اسے زیور بناتا ہے۔“

ریشم کھلکھلا کے ہنسی۔ ”چلو اب بہت ہو گیا۔ تم لوگ رات کو کہیں سے پٹ کر آئے ہو... یہ کیا ہوا ہے؟“
ایک دم مجھے بھی یاد آیا کہ ڈرائیور کی میت گیٹ ہاؤس میں رکھی ہے اور ہم کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ شاید یہ خود غرضی اور بے حسی تھی کہ ہم ایک فرض شناس نمک خوار کی موت کو اتنی غیر سنجیدگی سے لے رہے تھے۔ وہ اس گھر کا فرد ہوتا تو ہمارا دکھ کتنا زیادہ ہوتا۔ پھر ہم ایسی باتیں نہ کرتے۔ شاید خود انور کو بھی اسی احساس نے شرمندہ کر دیا۔ ہم دونوں ہی ایک دم افسردہ اور شرمسار ہو گئے۔

انور نے کہا۔ ”رات ایک حادثہ پیش آ گیا تھا۔“
میں نے کہا۔ ”اور اس میں ڈرائیور مارا گیا۔ ہم نے بہتر سمجھا کہ بڑے چودھری صاحب کو فوراً نہ بتائیں۔ وہ ناشتا کر لیں تو بتا دیں گے... وہ دل کے مریض ہیں۔“
ریشم کا چہرہ بھی اداس ہو گیا۔ ”چلو پھر ناشتا کر لیں ہم بھی... آج بھابی ہمارے ساتھ ناشتا کریں گی... وہ انتظار کر رہی ہیں۔“

”ان کو بھی بعد میں بتائیں گے پوری تفصیل۔“ انور نے کہا۔

ناشتے کی میز پر چھوٹی چودھرائن کا موجود ہونا ایک حوصلہ افزا تبدیلی کی طرف اشارہ کرتا تھا۔ شاید خود اس نے یہ تسلیم کر لیا تھا کہ انور علی کا حالات پر مکمل کنٹرول ہے اور اس کا امکان ایک فیصد بھی نہیں کہ اس کے شوہر کا دور حکومت

واپس آ سکے۔ صورت حال پر غور کرنے اور اسے سمجھنے کے لیے اسے کافی وقت مل گیا تھا۔ اپنے کمرے کی تنہائی میں وہ عملاً دن رات قید تھی اور یقیناً بہت دکھی بھی ہوگی کہ زندگی کی گاڑی جو ایسی سبک رفتاری سے جاہ و جلال اور عیش و عشرت کی شاہراہ پر رواں دواں تھی، اچانک ایک حادثے میں الٹ گئی تھی اور وہ سب جسے اس نے ہمیشہ کے لیے اپنی زندگی کا حصہ اور حق تسلیم کر لیا تھا، ماضی کی ایک تکلیف دہ یاد کے سوا کچھ نہیں رہا۔ وہ ایک بچے کی ماں بھی بننے والی تھی اور اپنی زندگی کے لیے حالات کو قابل قبول حد تک بہتر بنانے کے لیے صرف اس کا رونا دھونا کافی نہیں ہوگا۔ اس کا شوہر ایک قیدی کے سوا کچھ نہیں۔ وہ اپنے لیے کچھ نہیں کر سکتا تو اپنی فیملی کے لیے کیا کرے گا۔ یہ ذمے داری اب تمام تر اس کے کندھوں پر آ گئی تھی۔ اس کے لیے حالات سے لڑنا ناممکن تھا۔ ان حالات سے سمجھوتا کر کے اور مصالحت اور مفاہمت سے کام لے کر وہ کوشش ضرور کر سکتی تھی کہ اپنے شوہر کے لیے زندگی کی ضمانت کے ساتھ آسانی حاصل کر سکے۔

انور نے بھابی کو ناشتے کی میز پر دیکھ کر خوشی کا اظہار کیا اور اسے عزت بھی دی۔ ”مجھے بہت اچھا لگا آپ کا ساتھ ہونا... خواہش تو میری تھی کہ ہم سب ابا جی سمیت ایک فیملی کی طرح بیٹھتے۔“ اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔
”اگر تم چاہو گے بھائی جی تو یہ بھی ہو جائے گا۔“ وہ بولی۔ ”کبھی نہ کبھی۔“

انور نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں صرف خواہش کر سکتا ہوں... امید نہیں رکھ سکتا۔“

بھابی نے فوراً بات کا رخ پلٹ دیا۔ ”تمہیں اندازہ نہیں کہ ابا جی کی رائے تمہارے بارے میں بدل گئی ہے۔“
”اب تو بدلے گی... وقت جو بدل گیا ہے۔“ انور نے کہا۔

”وہ کہہ رہے تھے کہ انور یہ سب کیسے کرے گا... کہ میرے علاج کا انتظام یہاں ہو جائے۔“

”میں نے ایسا کر لیا ہے لیکن... آج آپ بھی دیکھ لیں گی۔“ انور نے کہا۔ ”اور ابا جی کو بھی یقین آ جائے گا۔“
ریشم نے کہا۔ ”آپ لوگ ناشتا بھی کریں... صرف باتیں نہیں۔“

بھابی نے سر ہلایا۔ ”یہ تمہارے چہرے کو کیا ہوا ہے؟“

”وہ ہم جنگل میں پھنس گئے تھے کل رات۔“

”تم لوگ لاہور گئے تھے یا شکار کرنے؟“ بھابی بولی۔

”شکار کرنے تو نہیں گئے تھے۔ خود شکار ہو گئے۔ ناشتا کریں پھر بتاؤں گا۔“ انور نے کہا۔

شاید انور کے لہجے سے بھابی نے غلط اندازہ کیا کہ اس کی باتیں انور کو ناگوار گزری ہیں۔ وہ خاموشی سے سر جھکا کے ناشتا کرتی رہی۔ ناشتا ختم کرتے ہی انور اٹھ کھڑا ہوا۔

”آپ اباجی کے کمرے میں آجائیں۔“ بڑے چودھری صاحب اپنے بستر پر دراز ٹی وی پر کوئی فلم لگا کے دیکھ رہے تھے۔ مجھے اور انور کو دیکھ کر انہوں نے ٹی وی بند کر دیا۔ میں نے محسوس کیا کہ مجھے نہ بھابی نے لفٹ کرائی ہے اور نہ چودھری صاحب نے... انہوں نے تو میرے سلام کا جواب تک نہیں دیا تھا۔

”رات دیر سے آیا تھا تو میرے سونے کے بعد...؟“ انہوں نے پوچھا۔

”جی اباجی... کافی دیر ہو گئی تھی۔“ انور کی ماں نے کہا۔ ”تیرے چہرے پر یہ خراشیں اور نیل کیسے ہیں پتر؟“

”کوئی خاص بات نہیں اماں جی... ایک اچھی خبر ہے اور ایک بُری۔“

چودھری صاحب نے کہا۔ ”اچھی پہلے سنا۔“

”کل ہم دونوں نے سارا لاہور چھان مارا... اور وہ سب کر لیا جو آپ چاہتے تھے۔ آج سے علاج کی تمام سہولت آپ کے کمرے میں فراہم کرنے کا کام شروع ہو جائے گا۔ امید ہے اسی ہفتے میں سب کچھ لگ جائے گا۔ تمام مشینیں... انہیں چلانے کے لیے جنریٹر... ضروری دوائیں سب آجائے گا۔“

چودھری کے چہرے پر کچھ خوشی کے آثار نمودار ہوئے۔ ”اچھا، میں تو سمجھ رہا تھا کہ مشکل ہوگا۔“

”کوشش سے مشکل بھی آسان ہو جاتی ہے اباجی... ایک ڈاکٹر سے بھی بات کر لی ہے۔ وہ یہیں رہے گا۔ ایک نرس بھی آجائے گی جو چوبیس گھنٹے آپ کی دیکھ بھال کرے گی۔“

چودھرائن نے دوپٹے کے پلو سے اپنے آنسو صاف کیے۔ ”اللہ جزا دے گا تجھے۔“

میں نے محسوس کیا کہ انور کے والدین کے رویے میں واضح ندامت تھی مگر ان کا مرتبہ اور ان کی انا اس کے اعتراف میں حائل تھی۔ تاہم اب مجھے امید نہیں یقین تھا کہ

بہت جلد وہ خود انور کے ساتھ ہونے والی زیادتی اور ظلم کا اعتراف بھی کر لیں گے۔

”چل اب بُری خبر بھی سنا دے۔“ بڑے چودھری نے کہا۔

انور نے کہا۔ ”وہ جو ہمارا ڈرائیور تھا، سوات کا... وہ کل مارا گیا... دشمنوں کے ہاتھوں۔“

چودھری صاحب نے سارا واقعہ توجہ سے سنا لیکن میں نے نوٹ کیا کہ انہیں اس پر زیادہ دکھ نہیں ہوا۔ ان کے لیے وہ عام ملازم ہی تھا۔

”اس کی لاش میں سوات بھجوا رہا ہوں۔“ انور نے کہا۔

”اوئے پتر اس کی کیا ضرورت ہے... یہیں دفن کرادو۔“ چودھری بولا۔

”دراصل مرنے سے پہلے اس نے درخواست کی تھی۔ پتا بھی بتا دیا تھا... اور میں نے وعدہ کر لیا تھا۔“ انور بولا۔

آدھا دن ڈرائیور کی لاش کو کفن دینے کے بعد روانہ کرنے میں گزر گیا۔ میت گئی تو ماحول پر سوگوار فضا طاری رہی۔ دوپہر کے بعد گل چاچا ہماری حادثے میں تباہ حال گاڑی کو ورکشاپ پہنچانے چلا گیا۔ سہ پہر کے بعد میڈیکل کمپنی کا ایک ٹرک نمودار ہوا۔ اس میں دو ماہرین تھے اور دو مددگار جن میں ایک خود ٹرک ڈرائیور تھا۔ ماہرین میں ایک وہی تھا جس نے مجھے سکھر جیل کے ایک قیدی کی حیثیت سے شناخت کر لیا تھا۔ یہ میرے لیے خطرے کی گھنٹی تھی۔ اس کا

امکان موجود تھا کہ یہاں وہ زیادہ فراغت کے ساتھ مجھ سے بات کرے اور مجھے بتائے کہ ہو بہو میری شکل و صورت والا ایک سزائے موت کا قیدی اس نے سکھر جیل میں بھی دیکھا تھا۔ میں پھر اس کی پُر زور تردید کر سکتا تھا اور خود اس سے پوچھ سکتا تھا کہ آخر اس کا سکھر جیل میں جانے کا اتفاق کیسے ہوا تھا لیکن ہر صورت میں مجھے رسک لگتا تھا۔

ٹرک سے اتر کے اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ ”کیسے ہیں آپ ملک سلیم صاحب؟“

میں نے کہا۔ ”آپ نے کل اپنا تعارف تو کرا دیا تھا مگر یہ نہیں بتایا تھا کہ وہاں آپ کرتے کیا ہیں؟“

”بس انشالیشن منیجر ہوں۔ تمام مشینیں اور آلات لگانا اور ان کی پاور سپلائی میرا کام ہے۔ یہ الیکٹریکل اور مکینیکل انجینئرنگ ہے۔“

”آپ کے پاس دونوں ڈگریاں ہیں؟“

جاسوسی ڈائجسٹ 165 جنوری 2014ء

WWW.PAKSOCIETY.COM

”میں نے لی ایس سی کیا تھا مکینیکل انجینئرنگ میں... این ای ڈی کراچی سے... پھر مجھے کمپنی نے ایک سال کی ٹریننگ پر جاپان بھیجا اور وہاں میں نے مختلف اسپتالوں کو دیکھا... انسٹالیشن پراسیس کو دیکھا اور ایک طرح سے اپرنٹس کی حیثیت سے کام کرتا رہا۔ یہ دوسرے صاحب ان مشینوں کی ورکنگ اور کارکردگی دیکھتے ہیں... میٹنی ٹینس انجینئر ہیں... علیم الدین ان کا نام ہے۔“

علیم الدین اس وقت انور سے بات کر رہا تھا۔ وہ ہمارے قریب آگئے۔ ”ملک... یہ علیم صاحب ہیں... یہ کمرہ دیکھنا چاہتے ہیں جہاں سارا ایکو پمنٹ لگایا جائے گا۔“

علیم نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور چند منٹ بعد ہم بڑے چودھری صاحب کی خواب گاہ میں تھے۔ دونوں ماہرین نے دو منٹ میں اپنا فیصلہ سنا دیا۔ ”ہمیں یہ کمرہ خالی چاہیے... بالکل خالی۔“

”اس میں تو وقت لگے گا۔“ انور نے پریشانی سے کہا۔

”ابھی ہم ایکو پمنٹ اتار جاتے ہیں... آپ بتائیں پھر کب آئیں؟“

”میرا خیال ہے کہ کل صبح۔“ انور نے کہا۔

”دوسری بات... ہم کمرے کو مکمل طور پر ڈس انفیکٹ کریں گے۔ جیسے کہ اسپتال کا کمرہ ہوتا ہے۔ دیواروں پر سے یہ سب اتار لیں جو موجود ہے... ان پر سفید رنگ ہوگا۔“

بڑے چودھری نے خاموشی سے احتجاج کیا۔ ”اوئے پھر تو ہر وقت مجھے ایسا لگے لگا کہ میں اسپتال میں داخل ہوں۔“

انور نے کہا۔ ”نہیں اباجی... آپ کو ایسا نہیں لگے گا۔ ہم اس کی نئی ڈیکوریشن کرا دیں گے۔ پھول اور تصاویر...“

”آخر بیڈ یہ کیوں نہیں رہ سکتا؟“ بڑے چودھری نے کہا۔

علیم نے سوچ کے کہا۔ ”رہ سکتا ہے... فوم بدل دیں۔ یہ بہت نرم ہو گیا ہے اور بیڈ شیٹس اتنی ہوں کہ ہر روز بدلی جائیں۔ بالکل صاف اور الگ دھلی ہوئی۔“

انور نے کہا۔ ”یہ کوئی مشکل کام نہیں... رنگ کے لیے بھی ایک دن چاہیے کم سے کم۔“

”رنگ کرنے والے بھی شہر سے ہی آئیں گے۔ وہ

آپ ہی لے آئیں تو بہتر ہے۔“

”ہم لے آئیں گے۔“ علیم نے کہا۔ ”اس کے بعد کمرے کو ایسے استعمال نہیں ہونا چاہیے جیسے عام طور پر ہوتا ہے۔ صفائی کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے۔“

”اس کی آپ فکر نہ کریں۔“ انور نے کہا۔

اب ان دونوں نے جائزہ لینا شروع کیا کہ کس چیز کے لیے کہاں جگہ مناسب رہے گی اور اسے کہاں سے یاور سپلائی ہوگی۔ شام ہوتے ہی وہ چلے گئے۔ مجھے بھی شناختی کارڈ آفس جانا تھا۔ انور مجھے ساتھ لے گیا۔ اس شام ہمیں اور کوئی مصروفیت نہیں تھی۔ انور نے غیر متوقع طور پر ریشم کو ساتھ چلنے کے لیے کہہ دیا۔ ریشم نے غالباً احتیاط پسندی سے کام لیتے ہوئے سلونی کو بھی دعوت دے دی تا کہ اس پر اکیلے میرے ساتھ جانے کا الزام بھی نہ آئے۔ وہ ایک بڑی خوشگوار شام تھی۔ شناختی کارڈ کا مسئلہ تو چند منٹ میں حل ہو گیا۔ اس کے بعد ہم نے پی سی کے پرسکون اور خوب صورت ماحول میں چائے پی اور رات کے کھانے تک کا وقت تفریح میں گزارا۔ سلونی تو خیر ہمیشہ سے خوش لباس تھی۔ اس نے ریشم کو بھی حیرت انگیز طور پر اپنے جیسا بنا دیا تھا۔ یہ لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ بابا رحیم بخش کی وہی بیٹی ہے جو چند روز قبل تک دیہاتی فیشن کے سوا کچھ نہیں جانتی تھی۔ دونوں خواتین کی تعلیم میٹرک تک تھی۔ میٹرک دونوں نے پاس نہیں کیا تھا۔ ریشم بڑی حیرت سے سلونی کی نگرانی میں سوشل اینٹی کیش اور اپر کلاس کی خواتین کے ادب آداب سیکھنے میں کوشاں تھی۔

ریشم کے مقابلے میں سلونی زندگی کے گرم سرد کا زیادہ تجربہ رکھتی تھی اور تلخ تجربات نے اسے وہ سب سکھا دیا تھا جو اپنے جدی پشتی حالات کے کنوئیں میں مینڈک بن کر رہنے والے ساری عمر گزار کے بھی نہیں سیکھتے۔ شاید ایسا ہی سلونی اور ریشم کے ساتھ بھی ہوتا لیکن ان کو حسین صورت کے ساتھ ذہانت اور ہمت بھی عطا ہوئی تھی چنانچہ حالات کی آزمائش میں بھی ان کو آگے بڑھنے کا راستہ ملا۔ سلونی نے شہر میں بھی آگے بڑھنے کا جو راستہ تلاش کیا، وہ شریفانہ ہرگز نہیں کہلاتا مگر جب موقع ملا تو وہ انہی حالات کی سیر بھی پر کامیاب ہوتی چلی گئی اور آج انور کا اعتماد حاصل کر چکی تھی۔ ریشم کے لیے ہر جگہ جہاں ہم گئے، نئی تھی اور وہاں کے ماحول کے مطابق اور اس سوسائٹی کے لائف اسٹائل... انداز و اطوار اور اینٹی کیش کو اختیار کرنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس پر تھوڑی سی گھبراہٹ طاری تھی

اور وہ جھجک کے ساتھ احساس کمتری کے کمپلیکس کا شکار ضرور تھی جو ایک قدرتی بات تھی لیکن وہ مشاہدہ کر رہی تھی۔
 سیکھ رہی تھی اور بدل رہی تھی۔ ہم تین جو ریشم کے ساتھ تھے، باہر کی دنیا کے گرم سرد کا مزہ چکھ چکے تھے۔ میرا پس منظر شہری تھا اور میں نے متوسط طبقے کے ماحول میں بھی کالج، یونیورسٹی تک تعلیم حاصل کر لی تھی اور پھر زندگی مجھے نادر شاہ کے مقابل کھڑا کر کے... نا کردہ گناہ کی سزا میں سکھر جیل کی کال کوٹھری تک لے گئی تھی۔ انور جہاندیدہ کتابی علم میں بہت آگے اور اکتسابی علم میں اس سے بھی آگے تھا۔ اس کی خوش قسمتی نے ساتھ دیا اور وہ اپنی عقل و ذہانت کو اپنی مرضی کے مطابق بڑھانے اور استعمال کرنے کے قابل رہا تھا۔ بس ایک حادثے یا غیر متوقع تجربے نے اسے زندگی کا وہ رخ بھی دکھا دیا تھا جو میں دیکھ چکا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اسے پھر سے حقیر تنکے کی طرح بے بسی سے بہہ کر تباہی اور ہلاکت کی طرف لے جانے والے حالات کے دھارے میں سے نکالنے والا میں ہوں۔ میں ایسا نہیں سمجھتا تھا۔ اگر قدرت نے مجھے اس کی رہائی کا وسیلہ بنایا تھا تو اس کے حالات کو بھی میری زندگی کا رخ بدلنے کے لیے رکھا تھا۔ یوں ہم چاروں یکجا تھے اور اپنی اپنی زندگی کے اس خوشگوار انقلاب کی خوشی میں ایک دوسرے کے ساتھ شریک تھے۔ ریشم نے قدم قدم پر غلطی کی۔ چائے پیتے ہوئے پی سی کے ماحول میں وہ گھبراہٹ کا شکار تھی۔ وہ چائے نہیں پیتی تھی مگر اس نے پی۔ کھانے کے وقت جب ویٹر نے مینیو اس کے سامنے رکھا تو اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کرے یا کیا کہے... سلونی نے ویٹر کو کچھ دیر بعد آنے کا کہہ کے ٹالا اور پھر ریشم کو بتاتی رہی کہ اس میں کیا لکھا ہے۔ انگریزی وہ پڑھ سکتی تھی مگر کیا چیز کیا ہے... یہ اسے کیسے معلوم ہو سکتا تھا۔ اس کام میں بھی سلونی نے اس کی مدد کی۔ ریشم نے کنفیوز ہو کے اس سے کہہ دیا کہ وہ خود ہی انتخاب کر لے۔ میں نے اور انور نے عدا اس کی طرف نہیں دیکھا اور اپنی باتوں میں لگے رہے... پھر انور نے اور میں نے سلونی کو اپنی پسند بتادی اور اس نے ویٹر کو آرڈر لکھوا دیا۔ ریشم کو یوں کانٹا استعمال کرنا کہاں سے آتا۔ اس کی وجہ سے ہم نے بھی ہاتھ ہی استعمال کیے۔ اس ماحول میں اپنی اجنبیت کے احساس پر ریشم نے خود ہی قابو پایا اور شاید اسے یہ دیکھ کر تسلی ہوئی کہ صرف ہم نہیں... وہاں کوئی بھی اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ دیکھنے میں وہ کسی سے بھی کم نہیں لگتی تھی۔ ہم کھانا کھا چکے تھے۔ ویٹر برتن اٹھا کے لے گیا اور

میں درحقیقت ایسا محسوس کر رہا تھا کہ یہ میری دوسری زندگی ہے۔
 انور نے سب کو مخاطب کیا۔ ”اب کافی یا آئس کریم؟“
 ریشم نے سب سے پہلے کہا۔ ”میرے لیے تو آئس کریم۔“
 ”میرے لیے کافی۔“ میں نے کہا۔
 ”میرے لیے بھی۔“ سلونی نے ہاتھ اٹھایا۔
 ”اوکے... میں ریشم کا ساتھ دوں گا۔“ اس نے ویٹر کو اشارہ کیا۔

اسی وقت ریشم نے انور کی طرف جھجک کے آہستہ سے کچھ کہا اور اس نے سر ہلایا۔ ”سلونی! تم آرڈر دو... میں ذرا ریشم کے ساتھ جا رہا ہوں۔“ پھر وہ دونوں اٹھے اور ٹیبلوں کے بیچ میں سے گزرتے غائب ہو گئے۔ یہ منظر میرے لیے بڑا حیران کن تھا کہ ریشم نے راہنمائی کے لیے اپنا ہاتھ انور کے ہاتھ میں دے دیا تھا اور گاؤں کی اس لڑکی کو اس ہال میں بیٹھتے ہوئے لوگوں کی تجسس بھری نظر اور معنی خیز مسکراہٹ کی کوئی پروا نہ تھی۔ یہاں یہ نظارہ معیوب تھا، نہ انوکھا... ایسے انداز دلبری اور آداب عاشقی کا مظاہرہ اس سوسائٹی کے ایٹھ کیٹس میں شامل تھا۔ متوجہ کرنے والا ریشم کا حسن بے مثال تھا جو رنگ پیراہن اور میک اپ کے اضافے سے نگاہوں کو خیرہ کر رہا تھا۔ حسن و شباب کی دلکشی خدا داد تھی تو اسے اجاگر کرنے کا سارا کریڈٹ سلونی کو جاتا تھا۔ شاید ہال میں اس وقت اپنے حسن پر نازاں ہر پری چہرہ کے غرور کا آئینہ ٹوٹ گیا ہوگا۔

”تم نے بھی کیا کمال کیا ہے سلونی... خاک آلودہ پتھر کو ہیرے کی آب و تاب دے دی ہے۔“ میں نے کہا۔
 سلونی ہنسی۔ ”آپ تو شاعری پر آگئے... یہ نظر کا قصور ہے یا دل کا؟“

میں نے خفت سے کہا۔ ”تم خود دیکھ رہی ہو... مگر یہ دونوں جا کہاں رہے ہیں؟“
 ”ریشم کو داش روم جانا ہوگا۔“ سلونی نے کہا۔
 ”اسے تو کچھ پتا ہے نہیں۔“

میں نے کہا۔ ”وہ تم سے کہہ سکتی تھی۔ کیا لیڈیز ایسی بات جینٹلس سے کرتی ہیں؟“
 ”ہو سکتا ہے میرا اندازہ غلط ہو... آپ جیلیسی تو محسوس نہیں کر رہے؟“

میں نے مزید خفت سے کہا۔ ”کرنا تو چاہیے... انور

یقیناً خوش قسمت ہے... یہ سب محسوس کر رہے ہوں گے... سوائے میرے۔“

”آپ کیوں نہیں؟“

”ریشم کے لیے میرے دل میں کبھی سافٹ کارنر نہیں تھا۔ یہ بھی نہیں کہوں گا کہ میں اسے نہیں سمجھتا تھا... دراصل ابھی تک میں نورین کے ٹرانس سے نکل نہیں پایا۔“

”کیا وہ اس سے بھی زیادہ خوب صورت تھی؟“

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ ”خوب صورت؟ پتا نہیں... ہو سکتا ہے کہ صرف مجھے لگتی ہو... حسن تو دیکھنے والے کی نظر میں ہوتا ہے... خیر تم چھوڑ دو... کافی پیو۔“

سلونی نے دو خالی کرسیوں کے سامنے رکھے دو آئس کریم کے پیالوں کو دیکھا۔ ”آپ دکھی ہو گئے؟“

”کبھی ایسی جان لیوا محبت تمہیں نہیں ہوئی؟“ میں نے کہا۔

وہ خلا میں دیکھتی رہی۔ ”صرف مجھے ہوتی تو کیا؟ دل تو بچہ ہے... کھیلنے کو چاند بھی مانگ سکتا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”کون تھا وہ بد قسمت؟“

”بد قسمت، وہ کیسے ہوا؟“

”میرے نزدیک تھا... جو تم جیسی لڑکی سے محروم رہا۔“ میں نے کہا۔

وہ ہنسی۔ ”میرے جیسی؟ آپ نے ابھی دیکھا یہاں سب کے دیکھ رہے تھے؟ اسے جو سب سے حسین تھی... میں کس شمار قطار میں بھلا... ان سب کے مقابلے میں جو

صرف یہاں ہیں میں تو آخری ہوں... کون دیکھے گا میری طرف؟“

میں دیکھتا رہا۔ ”سلونی! تم خود کو بہت انڈراسٹی میٹ کر رہی ہو... یہ میں تمہارا دل رکھنے کے لیے نہیں کہہ رہا

ہوں۔ حسن کا ایک خیرہ کن جلوہ بادلوں میں چمکنے والی بجلی دکھاتی ہے۔ سورج کی طرف دیکھنے والوں کی نظریں چندھیا جاتی ہیں... مگر ایک جادو چودھویں شب کی چاندنی کا ہوتا

ہے جو آہستہ آہستہ دل پر اثر کرتا ہے اور اپنے حسن میں جذب کر لیتا ہے۔ تم میں دوپہر کے سورج کی چکاچوند نہ

سکی... ماہِ کامل کا اسیر کر لینے والا سحر ہے۔ تمہاری شخصیت کا تاثر جب دل کو گرفت میں لیتا ہے تو سارے نظارے دھندلا جاتے ہیں۔“

سلونی کے چہرے پر وہی بے یقینی کی مسرت پھیل گئی جو بڑی حقیقی ہوتی ہے۔ جو عورت کے چہرے پر اس وقت ہی نور بن کے پھیلتی ہے جب ایک ماں اپنے گم شدہ لختِ جگر

کو پھر پالیتی ہے یا اس وقت نظر آتی ہے جب کوئی مسیحا کسی حرماں نصیب سہاگن کو یہ خوش خبری دیتا ہے کہ اس کا وہ شوہر زندہ رہے گا جس کے دن قطعی طور پر گئے جا چکے تھے۔ شاید یہ نعمت کسی مرد کے حصے میں نہیں آئی۔

اس نے آہستہ سے کہا۔ ”آپ الفاظ کے جادو کا استعمال خوب جانتے ہیں۔“

”تمہیں مجھ پر اعتبار کرنا چاہیے... اور یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ خود تمہیں اس کا احساس نہ ہو۔ ہاں، تمہاری یہ بات زندگی کی ٹھوس حقیقت ہے کہ ہر خواب کو تعبیر نہیں ملتی... شاعر کی زبان میں... وصال یا فقط آرزو کی بات نہیں۔“

وہ مسکرائی۔ ”لگتا ہے ایسے ہی تجربے سے آپ بھی گزر چکے ہیں۔“

میں نے سوچ کے کہا۔ ”شاید میں گزر رہا ہوں ابھی... میں لگی لپٹی رکھے بغیر اعتراف کروں گا کہ نورین کا

ایسا ہی معاملہ ہے۔ وہ میرے خیالوں میں زندہ ہے... لیکن جب وہ میرے ساتھ تھی تب بھی اس کا خیال کسی اور کے ساتھ تھا۔“

”آپ نے کچھ نہیں کہا... تو کیا اس نے بھی نہیں سمجھا؟“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”کبھی نہیں... اسے احساس ہوتا تو وہ اظہار کرتی نہ کرتی... مجھے خبر ہو جاتی۔“

سلونی نے کہا۔ ”یہ دونوں کہاں چلے گئے... آئس کریم تو پکھل کے شربت بن گئی ہے... لو... میرے بات کرنے کی دیر تھی... وہ آگئے... کیا انہیں احساس ہو گا کہ

آدھا گھنٹا گزر گیا؟“

”شاید نہیں... اور ضرورت بھی کیا ہے احساس دلانے کی؟“

انور نے قریب آ کے کہا۔ ”سوری یار! اس کی طبیعت اچانک بو جھل ہو گئی تھی... باہر تازہ ہوا میں بحال ہوئی۔“

ریشم نے ادھورے اعتماد کے ساتھ وہ بات کہی جو اسے انور نے سمجھائی ہوگی۔ ”شاید کھانے میں ایسی کوئی چیز تھی... میں عادی نہیں نا۔“

سلونی نے کہا۔ ”اب یہ شربت پی کے گزارہ کریں گے آپ دونوں یا میں پھر آرڈر دوں؟“

”آئس کریم تو ہم ضرور کھائیں گے... خواہ وہ اسی کو پھر جما کے لائیں۔“

ہم جب واپس پہنچے تو پھر آدھی رات کے بعد کا وقت تھا۔ اس جگہ سے گزرتے ہوئے جہاں ہم پر قاتلانہ حملہ ہوا

اور یہ اتنی بری بھی نہیں ہے۔ جب تک تقدیر اس کا رخ نہ موڑے، اسی پر قناعت کرو اور خوش رہو۔ جو تھا نہیں ہے جو ہے نہ ہوگا۔ یہی ہے دستور زندگی کا۔۔۔ بالآخر اس احساس میں سکون پا کے میں سو گیا۔

مجھے نہیں معلوم یہ بزدلی یا خود غرضی کے ساتھ زندگی سے سمجھوتا کرنے پر شرمندگی کا احساس تھا یا کچھ اور۔۔۔ لیکن رات کے کسی حصے میں اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ اندھیرے میں نظر کچھ نہ آتا تھا۔۔۔ پھر بھی میں نے ایک سایہ سا متحرک دیکھا لیکن اس سے زیادہ اعصاب کو متاثر کرنے والی ایک خوشبو تھی جس نے مجھ پر یلغار کی۔ اس خوشبو کو میں بھول نہیں سکتا تھا۔ ہزاروں کے مجمع میں اس خوشبو پر میں سیدھا نورین کے پاس پہنچ سکتا تھا۔ اس خوشبو نے پہلی بار مجھے اس رات اندھیرے میں اسیر کیا تھا جب میں سکھر جیل کی کال کوٹھری سے فرار ہو کے ایک آسیب زدہ حویلی کے کھنڈر میں چھپا تھا۔ پھر یہ خوشبو نورین کے قالب میں ڈھل گئی تھی اور اس کی شناخت بن گئی تھی۔

میں نے اندھیرے میں اس کے پیکر کو محسوس کرنے کی کوشش کی۔ ”نورین۔۔۔ یہ تم ہو؟“ میں نے کہا اور پھر لائٹ جلانے کی کوشش کی مگر سوچ آن کرنے کے باوجود اجالا نہ ہوا۔۔۔ شاید یہ کوئی خرابی تھی یا فیوز اڑا ہوا تھا۔

اس نے ایک بار سسکی لی۔۔۔ ”میرا نام یاد ہے تمہیں؟“

میں نے طنز کے اس تیر کی چھن دل میں محسوس کی۔ ”کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ میں تمہارا نام بھول جاؤں؟“

”مجھے تو بھول ہی گئے ہونا۔“

”نہیں، تم میری یادوں کا سب سے قیمتی سرمایہ ہو۔۔۔ یہاں آؤ میرے قریب۔“

”نہیں، اب اس دوری کو میں نے بھی قبول کر لیا ہے۔۔۔ میری قسمت میں صرف محرومیاں ہیں۔“

”ایسا مت کہو نورین۔۔۔ میں نے اس کا اظہار نہیں کیا کبھی۔۔۔ لیکن حقیقت یہی ہے کہ۔۔۔“

اس نے گئی سے میری بات کاٹ دی۔ ”خوب جانتی ہوں تمہاری حقیقت کو میں۔۔۔ مجھے سمجھنے میں ذرا دیر لگی۔ تم صرف ایک جھوٹے دھوکے باز انسان تھے جس پر میں نے بے وقوفی میں اعتبار کر لیا۔“

”یہ غلط ہے۔۔۔ ایسا کیوں سمجھتی ہو تم۔۔۔؟“

”کیوں؟ کیا تم نے دھوکا نہیں کیا تھا میرے ساتھ؟ جھوٹ نہیں بولا تھا کہ تم سلمان سے ملے تھے۔۔۔ اس کے

تھا، مجھے گزشتہ رات کی ساری بے رحمی یاد آئی۔۔۔ زمیں سخت مخالف ہے آسماں میرا۔۔۔ پناہ ملی تو یوں جیسے سزائے موت کو عمر قید میں بدل دیا جائے۔۔۔ رات کیسی تاریک تھی۔۔۔ موسم کتنا نامہرباں تھا۔ آج کی رات جیسے زخم کی ٹیس پر مرہم۔۔۔ آج سکون ہی سکون تھا۔۔۔ عاقبت ہی عاقبت تھی۔ معلوم نہیں ریشم اور سلونی کے جذبات کیا تھے۔ ابھی ہمارے رشتوں میں قربت کا احساس مصنوعی لگتا تھا۔ اجنبیت کی ایک دیوار اتنی جلدی کیسے گر جاتی۔ ریشم کل تک ایک عام غریب دیہاتی لڑکی تھی جس کی آبرو پر اکبر جیسے بھیڑیے کی نظر تھی اور وہ خود کو ایک بھیڑ سے زیادہ کمزور اور بے بس سمجھنے پر مجبور تھی۔ سلونی کی حیثیت پہلے بھی ایک زر خرید داشتہ جیسی ہی تھی اور خواہ انور اس کی عزت افزائی کر رہا تھا لیکن وہ کیسے بھول سکتی تھی کہ وہ بہر حال اس کی خدمت گار اور ملازم ہے۔ اس کے مقابلے میں انور کی سماجی حیثیت بہت بلند تھی۔ اس کے ساتھ وہ علم اور تجربے میں ہم سب سے زیادہ تھا۔ میں خود کو تعلیم یافتہ تو کہہ سکتا تھا لیکن میں ایک سزا یافتہ اور مفروز مجرم بھی تھا۔ یہ انور کی فراخ دلی اور فیاضی تھی کہ وہ ہم سب کو رفاقت کا احساس دلارہا تھا اور ساتھ لے کر چلنے کی حوصلہ افزائی کر رہا تھا۔ شاید خیالات کی اس کشمکش نے واپسی پر انور کے سوا سب کو خاموش رکھا۔

اس رات اپنے خیالوں نے مجھے سونے نہ دیا۔ پہلی بار میں نے اپنا نام فرید الدین سے بدل کے خاور کیا تھا تو یہ عذر مجبوری تھی۔ دوسری بار اس کی ضرورت نہ تھی لیکن وقت نے اپنی چال چلی۔ زنداں سے رہائی دلوائی تو مراد اداں والی کا اسیر بنا دیا۔ نئی زندگی کے لیے نئی شناخت عطا کی اور چودھری فرید الدین کو ملک سلیم اختر بنا دیا۔ بظاہر نہ اس کا امکان نظر آتا تھا اور نہ میرے دل میں ایسی کوئی خواہش تھی کہ میں زندگی کا یہ چلن بدلوں۔ عدم آباد کی راہ کا مسافر مراد اداں والی کا ہو گیا تھا۔ حادثہ بے سبب نہیں ہوتا۔۔۔ اس کے پیچھے قدرت کے ہاتھ کی کار فرمائی ہوتی ہے جو انسان کے نوشہہ تقدیر کو اس کی زندگی کا حصہ بناتا ہے۔ آج میں نے نورین کے بارے میں جو بھی کہا تھا، اپنے وقت کی حقیقت تھی لیکن آج کے وقت کی حقیقت کچھ اور تھی۔ نورین میری زندگی کے سفر میں ایک پڑاؤ کی طرح آئی تھی جسے میرے دل نے منزل سمجھ لیا۔ اب یوں لگتا تھا کہ وہ سفر تمام ہوا۔۔۔ وہ پڑاؤ گزر گیا۔ اس کی یاد کا نقش کتنا بھی دلنوازی، ماضی کا قصہ بن چکا تھا اور آہستہ آہستہ دھندلا پڑتا جا رہا تھا۔ تو ملک سلیم اختر۔۔۔ اب یہی ہے تمہاری زندگی۔۔۔

گھر گئے تھے؟“

”وہ... میں نے مصلحت کے تحت کہا تھا... تمہیں صدمے سے بچانے کے لیے...“

”یہ بھی جھوٹ؟“ اس نے میرے سامنے ایک اخبار لہرایا۔ ”اس میں سب کچھ ہے... سلمان زندہ نہیں تھا... تم نے اس کی لاش بھی دیکھ لی تھی وہیں جہاں وہ مجھ سے ملنے پہنچا تھا۔ تم نے اس کے کپڑے بھی پہن لیے تھے۔ ضرور تم نے اسے لوٹا بھی ہوگا... میرے ساتھ جانے کے لیے وہ گھر سے خالی ہاتھ تو نہیں نکلا ہوگا۔ تم ایک پیشہ ور قاتل تھے... تم نے اسے مار دیا اور اس کی لاش کھنڈر میں اوپر ڈال دی پھر تم میرے ساتھ شرافت کا ڈراما کرتے رہے... مجھے ساتھ لیے پھرتے رہے... ایک کے بعد ایک جھوٹ بولتے گئے... کیوں خاور... شاید یہ تمہارا اصلی نام بھی نہیں ہوگا۔“

”میں مانتا ہوں کہ میں نے اپنا نام بھی غلط بتایا تھا۔ وہ میری مجبوری تھی لیکن سلمان کو میں نے قتل نہیں کیا تھا... میں تمہاری قسم کھا سکتا ہوں۔“

”مت کھاؤ میری جھوٹی قسم... پاگل میں تھی کہ تمہارے جال میں پھنس گئی۔ آخر کیا چاہتے تھے تم؟ کسی دن اپنی ہوس کا نشانہ بناتے اور میری بے بسی کا فائدہ اٹھاتے رہتے؟ بلیک میل کرتے مجھے... بالآخر جج دیتے کسی کے ہاتھ...“

”نورین... خدا کے لیے بس کرو۔ تم سے نا جائز فائدہ اٹھانے کے لیے بہت وقت ملا تھا مجھے...“ میں نے فریاد کی۔

”فائدہ تو ہو گیا تمہارا... میرا سب کچھ تمہیں مل گیا... سارا زیور، نقد رقم... میری آبرو بھی کب تک محفوظ رہتی... کیسے مزے سے کتنی بے غیرتی کے ساتھ ملک سلیم اختر بنے تم یہاں زندگی کے مزے لوٹ رہے ہو... ایک ریشم ہے... ایک سلونی... ایسی اور بہت ملیں گی... نورین پر لعنت...“

”نورین...“ میں چلایا۔ اسی وقت لائٹ آگئی۔ میں نورین کی طرف لپکا تھا مگر وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ اس کمرے میں جہاں وہ موجود تھی۔ اس کی کوئی نشانی تھی تو وہ خوشبو جو اس کے وجود کی علامت تھی۔ باہر سے محافظ ایک دم اندر آ گیا۔

”سر! آپ نے آواز دی مجھے... خیریت ہے نا جی؟“

”ہاں، سب خیریت ہے... تم جاؤ۔“

”میں نے کسی کو نکلنے دیکھا تھا یہاں سے... لائٹ گنی ہوئی تھی۔“

”کوئی نہیں تھا یہاں۔“ میں نے جھٹکا کے کہا اور لائٹ آف کر کے لیٹ گیا۔ میرے سارے جسم پر ٹھنڈا پسینا بہہ رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ خواب کے سوا کچھ نہ تھا... مگر خواب اپنے پیچھے خوشبو چھوڑ کے ختم نہیں ہوتے۔ اس کی خوشبو کو صرف میں نے ہی نہیں، گارڈ نے بھی محسوس کیا تھا۔ روحوں کے وجود سے انکار کرنا بھی اتنا ہی دشوار تھا جتنا ان کے وجود کو تسلیم کرنا لیکن روح کا دنیا سے جا کے پھر زندگی کے قالب میں نظر آنا... یہ میری عقل نے کبھی تسلیم نہیں کیا تھا۔ ساری دنیا میں ایسے واقعات پیش آتے رہتے تھے جن کو عقل کی کوئی دلیل یا وضاحت قابل قبول نہیں بنا سکتی تھی لیکن میرے ساتھ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا... میں نے کسی سے سنی سنائی کو بھی تسلیم نہیں کیا تھا چنانچہ میں کنفیوز ہو گیا کہ آخر یہ کیا تھا... فریب خیال؟ فریب نظر... تصور کا طلسم یا دماغ کی خرابی؟

صبح تک میں ذہنی انتشار اور خیالوں کے آسیب سے کافی حد تک نجات پا چکا تھا اور یہ نتیجہ اخذ کر چکا تھا کہ میرے ذہن پر بوجھ تھا اور لاشعور میں بہت گڑبڑ تھی۔ نورین کو فراموش کر دینے کا احساس جرم... اپنی شخصیت بدل لینے کا خیال پھر پکڑے جانے کا ڈر اور موجودہ حالات سے ایک خود غرضانہ مفاہمت پر شرمندگی... ان سب عوامل نے مل کر مجھے اتنا ڈسٹرب کیا تھا کہ میں نے ایک برا خواب دیکھا... لیکن اس وقت میری عقل بالکل خطہ ہو گئی جب میرے جاگنے کے کچھ دیر بعد ریشم نے سرد دروازے سے اندر ڈال کے بڑی شوخی کے ساتھ پوچھا۔

”سر... میں حاضر ہو سکتی ہوں؟“

میں غسل کے بعد لباس بدل کے ناشتے کی تیاری کر رہا تھا۔ میں نے خوش دلی سے کہا۔ ”یس میڈم! آپ ہی کا انتظار تھا مجھے...“

اس نے اندر آ کے ناک کو ادھر ادھر گھما کے سوں سوں کی... ”یہ کیسی خوشبو ہے؟ اور کس کی؟“

”یہ تم اپنے ساتھ لائی ہو۔“

”اونہوں...“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”یہ اس سے بالکل مختلف ہے ورنہ مجھے کیوں محسوس ہوتی۔“

میں سوچ میں پڑ گیا۔ ”کیسی ہے یہ خوشبو؟“

”یہ میں کیسے بتاؤں... گلاب، چنیل، موتیا کا نام

لے سکتی ہوں... سلونی نے کل مجھے جو خوشبودی تھی، وہ بھی بہت اچھی تھی۔ کیا نام تھا اس کا... چارلی... جو تم نے یا چودھری صاحب نے لگائی تھی، وہ بھی اچھی تھی۔ یہ الگ ہے، اس کا کیا نام بتاؤں۔ اس سے پوچھو نا جس کی ہے۔

”اچھا، تم مجھ پر شک کر رہی ہو؟ رات ساڑھے بارہ بجے ہم آئے تھے اور اب بجے ہیں ساڑھے آٹھ... اس درمیان میں کون آسکتا ہے... یا آسکتی ہے یہاں... خود اپنی کہو کہ یہ انقلاب کیسا اور کس کے لیے؟ چند دن پہلے تم کیا تھیں اور اب کیا ہو؟“

وہ کچھ لال ہوئی۔ ”یہ سب تم سلونی سے پوچھو... وہی میرے پیچھے پڑی ہوئی ہے... اور اب چلو نا شتے کے لیے۔“

”میرا خیال ہے کہ تم بھی یہاں بیٹھو... ناشتا منگوا لیتے ہیں۔“ میں نے سر نکال کے خادم کو ناشتے کے لیے کہہ دیا۔

”صرف ہم ہی نہیں...“ وہ ایک صوفے پر نیم دراز ہو گئی۔ ”حویلی میں بہت کچھ بدل رہا ہے۔“

”اچھا ہی ہو رہا ہے سب۔“ میں نے کہا۔ ”انور بہت سمجھ دار ہے... سختی نرمی کہاں ہونی چاہیے کہاں نہیں، سب جانتا ہے۔ چھوٹی چودھرائن کے رویے کی تبدیلی میں نے دیکھی۔ وہ بڑی چودھرائن اور چودھری صاحب کا دل بھی جیت لے گا۔ اس کے بعد امید ہے اکبر کے ساتھ بھی صلح صفائی کا راستہ نکال لے گا۔“

”اس کی نیت اچھی ہے... لیکن اندر کے معاملات ایسے نہیں جیسے نظر آتے ہیں۔“

میں اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ ”تمہاری نظر اندر کے معاملات تک پہنچ گئی... کیا بات ہے؟“

”مجھے تو چار دن ہوئے ہیں یہاں آئے ہوئے لیکن سلونی نے حویلی کے اندر بہت کچھ دیکھا ہے اور سنا ہے... اس نے بتایا ہے مجھے۔“

”اور تم سمجھتی ہو کہ وہ سب صحیح ہے؟“

”وہ غلط کیوں بتائے گی آخر...؟ اس کی اور میری دوستی ہو گئی ہے... ہم ایک دوسرے کے راز دار ہیں۔“

”اچھا کیا بتایا ہے اس نے؟“

”اس نے بڑے چودھری صاحب کے زمانے میں حویلی کے اندر کے سارے معاملات بڑی خوش اسلوبی سے چلائے... وہ حویلی کے علاوہ مہمان خانے کے انتظام بھی کرتی تھی۔“

”میں جانتا ہوں، وہ کیا انتظامات تھے۔“

”اس کی مجبوری الگ تھی لیکن اس نے بڑی ذہانت سے اس مجبوری کو دوسروں کی مجبوری بنا دیا۔ کیا یہ تعریف کی بات نہیں؟ ایک بات پر شاید تم یقین نہ کرو... اس نے مجھ سے کہا کہ تم سے جھوٹ نہیں بولوں گی۔“

”مطلب یہ کہ دوسروں سے بولتی ہو۔“

”وہ بولنا پڑتا ہے... کیا تم نہیں بولتے؟“ اس نے جارحانہ انداز میں کہا۔

میں فوراً پیچھے ہٹ گیا۔ ”اوکے... میں مان لیتا ہوں کہ سلونی نے سچ کہا اور سچ کے سوا کچھ نہیں کہا۔“

”سب کا خیال ہے کہ اس کو بڑے چودھری صاحب نے اٹھوایا تھا تو اپنے لیے... مگر ایسا نہیں تھا۔ بڑے چودھری میں خرابیاں بہت زیادہ ہیں لیکن ان کی کچھ اچھائیاں بھی ہیں۔ وہ چاہتے تھے کہ سلونی اپنی تعلیم مکمل کرے مگر اکبر نے کہا کہ گاؤں میں پڑھا لکھا بندہ ہوتا ٹھیک نہیں۔ لڑکی پڑھ کے دوسری عورتوں کو بھی خراب کرے گی۔“

مطلب یہ کہ آزادی یا حق کی بات کرنا خرابی ہے۔ نیت اس کی شروع سے تھی... اس نے سلونی کو اٹھوایا... بڑے چودھری کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں رہا... ہاں ان کے کہنے پر وہ مہمانوں کی خدمت ضرور کرتی رہی۔“

خدمت کی بات کرتے ہوئے ریشم کی نظر جھکی رہی اور چہرہ لال ہو گیا۔ ”اس میں بڑے چودھری کی اچھائی کیا تھی؟“

”بڑے چودھری نے ہمیشہ اس کے ساتھ شفقت کا برتاؤ کیا۔ اس کو وہ عزت دی جو اکبر اسے نہ دیتا۔ کچھ عرصے بعد اس کا دل بھر جاتا تو وہ سلونی کو بھی نکال باہر کرتا۔ اس کی جگہ کوئی اور لے لیتی... لیکن بڑے چودھری نے اس کی ذہانت اور اس کی خدمت سے متاثر ہو کے اسے کچھ ذمے داری دی۔ سلونی نے یہ بھی بتایا کہ بڑی چودھرائن کی اس پر کڑی نظر تھی۔ بیٹے کی آوارہ مزاجی ان کے نزدیک کوئی ایسی بات نہ تھی۔ گاؤں کی کم ذات لڑکیاں آخر ہوتی کس لیے ہیں۔ خود بڑے چودھری صاحب اپنی جوانی میں ایسے ہی تھے لیکن شادی کے بعد بڑی چودھرائن نے کچھ عقل سے اور کچھ اپنی زبردستی سے بڑے چودھری کو غلیل ڈالی۔“

دراصل وہ بڑے بھائی کی بیٹی تھی اور اس کا باپ بہت سخت تھا۔ وہ چھوٹے بھائی کو یعنی بڑے چودھری کے باپ کو تھپڑ مار دیتا تھا۔ اکبر کی بیوی یہ نہیں کر سکی... بس سلونی کے خلاف ہونے کی پہلی وجہ یہ تھی۔ اسے لگتا تھا کہ اس کے شوہر

WWW.PAKSOCIETY.COM

پر زیادہ کنٹرول سلوونی کا ہے اور سلوونی کو وہ اپنی مرضی سے نکال باہر نہیں کر سکتی تھی لیکن ایک وجہ اور بھی تھی۔“
میں نے کہا۔ ”باتوں کے ساتھ ناشتا بھی جاری رکھو۔“

”جیسا کہ تم جانتے ہو... اکبر چھوٹا ہے... بڑے چودھری صاحب کے دونوں بیٹوں کی شادی ایک خاندانی روایت کے مطابق تایا کی دونوں بیٹیوں سے طے تھی۔ بڑے کی شادی بڑی سے... چھوٹے کی چھوٹی سے... لیکن ہوا یہ کہ شادی کی بات پر انور نے پہلے انکار کیا... پھر دباؤ سے بچنے کے لیے اعلیٰ تعلیم کے بہانے ملک سے ہی بھاگ گیا اور آٹھ سال باہر بھٹکتا پھرا۔“

”اسے تم بھٹکتا کیوں کہتی ہو... اس نے واقعی اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔“

”یہ اکبر کی بیوی کہتی ہے... ظاہر ہے یہاں کسی کے نزدیک تعلیم کی حد میٹرک ہے... وہ بھی لڑکوں کے لیے... تاکہ وہ حساب کتاب سمجھ لیں اور زمینوں کے معاملات... انور نے جتنی تعلیم حاصل کی وہ سب کے نزدیک دماغ کی خرابی تھی مگر وہ انکار کر کے نکل گیا اور کسی کے بلانے پر لوٹ کے نہیں آیا تو تایا کیا کرتے۔ لڑکی کو بٹھائے رکھتے؟ انہوں نے بڑی کی شادی اکبر سے کر دی۔ اب اگر ہوگی تو چھوٹی کی شادی بڑے بھائی سے ہوگی۔ چھوٹی چودھرائن اپنی اس بے عزتی کو بھولی نہیں کہ انور نے اسے ٹھکرا دیا تھا۔ دراصل جب دونوں بہنیں چھوٹی تھیں، تب سے ان کے دماغ میں یہ تھا کہ کس کا شوہر کون ہوگا۔ بڑی خوش تھی کہ حویلی میں بڑی چودھرائن وہ بنے گی۔ مراد اداں والی پر حکومت اس کے شوہر کی ہوگی پھر تم بھی دیکھ سکتے ہو کہ انور گیا ہے ماں پر، اکبر اپنے باپ پر... انور زیادہ خوب صورت ہے۔ اب وقت آیا تو معاملہ الٹا ہو گیا۔ چنانچہ یہ غلط نہیں کہ سازش اس نے کی۔ اس نے بڑے چودھری کو انور کے خلاف کیا اور اکبر کو اس کی جگہ دلوا دی۔ سلوونی کو بھی اس نے نکال باہر کیا تھا لیکن وہ پھر آگئی ہے... اور جو اس نے سوچا تھا، وہ الٹا ہو گیا ہے۔ اب اکبر قیدی ہے اور انور حاکم... اب چھوٹی بہن آجائے گی چودھرائن بن کے... تم میری بات سمجھ رہے ہو؟“

”بہت اچھی طرح۔“ میں نے کہا۔ ”بھابی کے رویے میں میرے لیے یہ دوستانہ تبدیلی ایک سیاسی چال ہے۔“
”وہ چاہتی ہیں کہ تمہارے ذریعے انور سے چھوٹے

بھائی کے لیے رعایت حاصل کریں۔“
”وہ انور پہلے ہی دینا چاہتا ہے۔“
”یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے باپ کو استعمال کرے... جائداد کی تقسیم کرائے... تاکہ پورے کی نہ سہی، وہ آدھے کی مالک بنے۔“

”مجھ سے تو انور نے ایک بڑی عجیب بات کی تھی۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ اس کے سرور تایا کی جتنی جاگیر ہے، وہ اس کی دونوں بیٹیوں کو جائے گی کیونکہ بیٹا ہے نہیں... یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ وہ تایا سے ساری جائداد اپنی بیوی کے نام کرائے جو بڑی بیٹی ہے... وہ چھوٹی کی حق تلفی نہیں کرے گا... یہ بھی ناممکن ہے کہ وہ چھوٹی بہن سے بھی شادی کر لے۔ دو بہنیں بیک وقت ایک مرد کے نکاح میں نہیں رہ سکتیں... لیکن... ایک کے بعد دوسری آ سکتی ہے۔“

ریشم چونکی۔ ”یعنی وہ بڑی کو فارغ کر دے گا؟“
”فارغ؟ بالکل فارغ... طلاق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا... لیکن بیویاں مر جاتی ہیں... کبھی بیماری سے... کبھی حادثے میں۔ وہ پہلے بچے کی ماں بننے والی ہے... اکبر کے لیے کیا زیادہ اہم ہوگا... بچہ یا تایا کی ساری پر اپنی؟“
ریشم نے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ ”یعنی وہ قتل کر دے گا بیوی کو؟“

”اسے یہاں قتل نہیں کیا جائے گا۔ ڈیلیوری میں گاؤں کی عورتوں کا مرنا عام سی بات ہے اور جب خود اپنی خاندانی دایہ کے سوا کوئی یہ کام نہ کرتا ہو تو کام کتنا آسان ہو جاتا ہے۔ کوئی شک بھی نہیں کر سکتا۔ بچوں کا کیا ہے... ہوتے رہیں گے بعد میں بھی... بڑی سے نہ سہی چھوٹی سے... اور اب انور اگر چھوٹی سے شادی پر راضی نہیں تو تایا کیا کرے گا۔ ایک کے نہ رہنے کو اللہ کی رضا سمجھ کے قبول کر لے گا اور دوسری اسے دے کر فارغ ہو جائے گا... شادی تو کرنا ہی ہے اس کی۔“

”تو بہ تو بہ... زمین جائداد کے پیچھے کوئی یہ بھی کر سکتا ہے۔“

”ایسا ہمیشہ ہوا ہے اور ہوتا رہے گا... ہوشیار بننے والی بھابی کو اندازہ ہی نہیں کہ وہ خود کتنی بڑی سازش کا شکار ہو سکتی ہے۔ وہ انور سے بے عزتی کا بدلہ لینے کے چکر میں ہے... یہ احساس نہیں کہ اپنی جان خطرے میں ہے۔“
”ایک اور بات سنی ہے سلوونی نے... ابھی ثبوت کوئی

نہیں... کہ چھوٹی والی بھی انور سے شادی کرنا نہیں چاہتی۔“

”کیوں؟ اور کوئی ہے خاندان میں؟“

”ہاں، اس کے باموں کا بیٹا ہے۔ جب باپ کی طرف سے کوئی نہیں تو ماں کے بھائی کا نمبر پہلا... وہ پسند بھی کرتی ہے اسے۔“

میں نے کہا۔ ”اگر سلونی کے کانوں تک ایسی بات پہنچ گئی ہے تو اکبر کو بھی پتا ہوگا... اور اس کا مطلب یہ ہے کہ اکبر کو اب ایک تیر سے دو شکار کرنے ہیں۔ قضا کے تیر کا نشانہ پہلے وہ بھی بن سکتا ہے جو انور کی جگہ لے سکتا ہے۔ پہلے اسے مقابلے سے خارج کر دیا جائے۔ پھر بیوی کی جگہ دوسری بیوی کے لیے خالی کی جائے۔ کیا انور یہ سب نہیں سمجھتا؟“

”اگر نہیں جانتا تو تم اسے بتا دو... سمجھا دو... صرف تم ہی یہ کام کر سکتے ہو۔“

میں نے گھڑی دیکھی۔ ”اچھا، اب میرا خیال ہے کہ کمپنی کے لوگ آنے والے ہوں گے۔ کیا بڑے چودھری صاحب کو دوسرے کمرے میں شفٹ کر دیا گیا ہے؟“

”ہاں... وہ رات کو دوسرے کمرے میں سوئے تھے... ان کا کمرہ بالکل خالی ہے۔“

”اب ایک سوال میں تم سے پوچھوں؟“

”شرمانے کی کون سی بات ہے اس میں؟“ ریشم بولی۔

”ہاں، جب تمہیں شرم نہیں آتی تو مجھے کیوں آئے... کل رات آئس کریم چھوڑ کے تم انور کے ساتھ کہاں گئی تھیں؟“

اس کا رنگ پھر لال پڑ گیا۔ ”تمہیں کیا شک ہے، میں لے گئی تھی اسے؟ اس نے خود کہا تھا مجھ سے کہ مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔“

”اچھا؟ پھر کیا کہا اس نے؟ چاہو تو بتا دو ورنہ میں اپنے اندازے پر قائم رہوں گا۔“

ریشم نے ایک گہری سانس لی۔ ”اس نے کہا... کہ میں تمہارے ساتھ جانے کا خیال چھوڑ دوں۔“

میں چونکا۔ ”مگر میں کہاں جا رہا ہوں؟“

”ہم جانا چاہتے تھے... جانیں سکے تھے۔ اس کی خواہش ہے کہ تم یہاں اس کے ساتھ رہو مگر اسے اعتبار نہیں... تم اپنی مرضی سے چلے جاؤ... یا مجبور ہو جاؤ... میں تو اسی گاؤں کی بیٹی ہوں۔ مجھے گاؤں نہیں چھوڑنا

چاہیے... ایک اجنبی کے ساتھ۔“

”بالکل ٹھیک مشورہ دیا اس نے... کیا اس نے یہ بھی بتایا کہ تمہارے گھر میں اب تمہاری حفاظت کرنے والا کوئی نہیں تو تم اکیلی وہاں کیسے رہو گی؟ یا اس نے کہہ دیا کہ تم چاہو تو ہمیشہ حویلی میں رہ سکتی ہو... مہمان بن کے نہیں... مائکن کی حیثیت سے...؟“

ریشم کا رنگ شرم سے لال چھندر ہو گیا۔ ”حد سے زیادہ چالاک ہو تم... اور بے شرم۔“ وہ جھینپ کر ایک دم انہی۔

میں نے ایک قہقہہ مارا۔ ”چاند لکھتا ہے تو سب کو نظر آتا ہے... ویسے میرا مشورہ ہے کہ اس کی مان لو۔“ مگر اتنی دیر میں ریشم فرار ہو چکی تھی۔ میرے لیے یہ اطلاع یا انکشاف اس لیے حیرانی کا سبب بنا کہ ایک نظر کی محبت کوئی افسانہ یا شاعرانہ بات نہیں تھی۔ شاید نورین کے معاملے میں میرے ساتھ ایسا ہی ہوا تھا۔ لیکن انور جیسے جہاں گرد اور افلاطونی ذہن رکھنے والے کے معاملے میں بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ یہ میرے لیے بڑے اطمینان کی بات بھی تھی۔ میرے کندھوں سے ریشم کی ذمے داری کا بوجھ اتر گیا تھا جو نہ میں نے اپنی مرضی سے لیا تھا اور نہ ریشم ڈالنا چاہتی تھی لیکن حالات کی گردش نے اسے دونوں کی مجبوری بنا دیا تھا۔ پہلے میں نورین کی ذمے داری اٹھانے کا تجربہ کر چکا تھا جو مجھے بہت مہنگا پڑا تھا۔ بعد میں یہ کوئی زبردستی کا سودا نہیں رہا تھا۔ خود میں اس سے نہ بھاگ سکتا تھا اور نہ بھاگنا چاہتا تھا۔ وہ میرے احساس اور وجود کا ایک حصہ بن گئی تھی اور آج بھی تھی۔ گزری ہوئی رات کا واقعہ وہم تھا یا حقیقت کا کوئی روپ... لیکن اس نے میرے دل میں پرانی کسک کو تازہ کر دیا تھا۔ ریشم نے بھی میری خلش میں اضافہ ہی کیا تھا۔ خوشبو اسے بھی محسوس ہوئی تھی۔ رات کے محافظ کی گواہی کے بعد میں ریشم کو جھٹلا نہیں سکتا تھا۔ دوسری طرف اسے سمجھنے سے قاصر تھا۔ یہ آرزو کا سراپ تھا... یا سچ مجھے وہ روح بن چکی تھی اور اب یونہی راتوں کے اندھیرے میں یا خواب میں میرا پیچھا کرتی رہے گی۔ ایسا سمجھنا دنیا سے اس کے مادی وجود کا عالم ارواح میں پہنچ جانے کے مترادف تھا۔ کیا میں مان لوں کہ وہ واقعی مر چکی ہے؟ قدرت کا یہ اشارہ میرے شک کی تصدیق کرتا ہے۔

ریشم کے فرار سے پہلے ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ میڈیکل انکویسٹ سپلائی کمپنی کا ٹرک پہنچ گیا ہے۔ جب میں نے جا کر دیکھا تو کمرے میں پینٹ کا کام شروع ہو چکا

تھا۔ دونوں منبر مشینوں کے لیے پاور سوئچ کی جگہ کو مارک کر رہے تھے اور ایک الیکٹریشن ان کی ہدایات کے مطابق وائرنگ دیکھ رہا تھا۔۔۔۔۔ باہر نصب ہونے والے پچاس کے دی اے کے آٹومیک جزیٹر کو بھی اسی سسٹم سے جوڑنا تھا۔ مجھے دیکھ کر انہوں نے ایک کاروباری مسکراہٹ کے ساتھ مجھ سے ہاتھ ملایا۔

میں نے کہا۔ ”کیا خیال ہے، یہ کام آج مکمل ہو جائے گا؟“

ان دونوں کا سر نفی میں ہلا۔ ”آج تو کسی صورت نہیں۔۔۔ ایک دن جزیٹر کی تنصیب کے لیے چاہیے۔۔۔ ایک دن باقی مشینوں کو لگانے کے لیے۔۔۔ میرا خیال ہے پرسوں شام تک ہم اسے قابل استعمال بنا دیں گے۔“

انہیں اپنے کام میں مصروف چھوڑ کے میں بڑے چودھری صاحب کی خیریت معلوم کرنے گیا تو انور پہلے سے وہاں موجود تھا اور ایک بے حد خدمت گزار، فرماں بردار دختر مشرق کی طرح بہوان کے پاؤں دبانے کا ثواب سیٹ رہی تھی۔ مجھے ایک نظر میں اندازہ ہو گیا کہ انور نے میدان مار لیا ہے۔ میرے سلام کا جواب بھی ملا اور ماں جی نے مجھے دعا بھی دی۔

اس سے پہلے کہ میں یا کوئی اور کچھ کہتا، بھابی نے کہا۔ ”ماں جی۔۔۔ یہ سب ان کی کوشش سے ہوا۔“

چودھری صاحب نے طمانیت کا اظہار کیا۔ ”بہت اچھا انتظام ہو گیا میرے لیے۔“

میں نے کہا۔ ”چودھری صاحب! یہ سو فیصد انور کی خواہش اور کوشش کا نتیجہ ہے۔۔۔ میں نے صرف ساتھ دیا۔“

”تم جیسا مخلص دوست بھی ہر ایک کو کہاں ملتا ہے۔“

بھابی نے کہا۔

انور بولا۔ ”اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ ملک سلیم بڑا مخلص اور سیانا بندہ ہے۔ اس سے میں نے کہا ہے کہ جانے کا خیال چھوڑے، ادھر ہی رہے ہمارے ساتھ۔“

بڑے چودھری نے اس خیال پر کوئی حوصلہ افزا رد عمل نہیں دیا مگر بھابی نے فوراً کہا۔ ”بالکل ٹھیک ہے۔ اب یہ جائیں گے بھی کہاں۔۔۔ ان کے کون سے بیوی بچے یاد کر رہے ہیں۔ آج میرے والد بھی آرہے ہیں اباجی کی خیریت معلوم کرنے۔۔۔ وہ آپ سے مل کے خوش ہوں گے۔ میں نے انہیں بتایا تھا آپ کے بارے میں۔“

بھابی اب تم سے آپ پر آگئی تھی۔ یہ میری عزت

میں ترقی کی علامت تھی۔ میں نے اخلاقاً کہا۔ ”مجھے بھی خوشی ہوگی ان سے مل کر۔“

انور اٹھا تو مجھے بھی اٹھنے کا موقع مل گیا۔ ”ملک سلیم۔۔۔ تم ذرا ان کام کرنے والوں کو دیکھو۔۔۔ مجھے کچھ اور کام ہیں۔“

کرنے والے اپنا کام تند ہی سے کر رہے تھے۔ اس میں نگرانی کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ بھی چاہتے تھے کہ ان کا کام جلد از جلد ختم ہو تو کمپنی کو اپنے پیسے ملیں اور وہ جائیں۔ دوپہر کے کھانے کے بعد مجھے اچانک انور کے کہنے سے شہر جانا پڑ گیا۔ وہاں مجھے تباہ شدہ گاڑی کی مرمت اور مکمل بحالی کے معاملے میں ورکشاپ والوں سے بات کرنی تھی۔ لاہور کا راستہ ہی سوا گھنٹے سے زیادہ کا تھا۔ پھر لاہور کے اندر بھی ورکشاپ دوسرے کنارے پر بلکہ اس سے بھی آگے شاہدرہ میں تھی۔ ورکشاپ والوں کے تخمینے یوں بھی زیادہ تھے کہ ان کے ملازم اور کارکن چاہے عام مکینک ہوں، وہ اسپیشلسٹ شمار ہوتے تھے اور بڑے لوگوں کی بڑی گاڑیوں کی مینٹی نینس کے اخراجات بھی اسی تناسب سے وصول کرتے تھے۔ کوئی چھوٹی گاڑی والا چھوٹا آدمی ان کا کلائنٹ ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ انہوں نے نقصان کو خوب بڑھا چڑھا کے پیش کیا جو اتنی غلط بات بھی نہ تھی۔ گاڑی واقعی تباہ ہو گئی تھی لیکن وہ اپنا فائدہ کیسے بھول جاتے۔ مخلصانہ مشورہ دیتے تو کہتے کہ اب گاڑی کچھ پرانی ہو گئی ہے اس کی ری سیل کم ہے اور مرمت کے بعد تو بالکل نہیں رہے گی۔ بہتر ہو گا کہ آپ نئی لے لیں۔ وہ بھی کہتے رہے کہ جب ہم کام کر کے دیں گے تو آپ کو نئی پرانی کا فرق پتا نہیں چلے گا۔ مجھے اندازہ ضرور تھا کہ نئی گاڑی کی قیمت کیا ہے۔ یہ تین سال پرانا ماڈل اور جینوئن کنڈیشن میں کتنے کا ہو گا۔ بیچنے اور خریدنے کی قیمت ہمیشہ الگ ہوتی ہے۔ لیکن گاڑی کی قیمت بننے کے بعد کتنی ملے گی، یہ ذرا مختلف بات تھی۔ یہ ہو سکتا تھا کہ اناڑی کو فرق نظر نہ آئے۔ ڈیلر اور تجربہ رکھنے والے خریداروں سے یہ بات چھپی نہیں رہ سکتی کہ گاڑی ایکسڈنٹ شدہ اور بنی ہوئی ہے۔

میرے نزدیک اس تباہ شدہ حالت میں گاڑی کوئی لیتا تو لوہے کے بھاؤ تول کر۔۔۔ نقصان یقیناً ہوا تھا مگر اسے یوں کم کیا جا سکتا تھا کہ گاڑی بنوا کے سیل کے لیے رکھ دی جائے اور کوئی شوقین مگر غریب پھنس جائے تو نکال دی جائے کہ چاندی بنوا ب تیرے حوالے۔۔۔ جو اچھی قیمت ملے، وہ ڈال کے دوسری نئی گاڑی خریدنا چودھری فیملی کے لیے مشکل

نہیں تھا۔ انور نے بھی میرے فیصلے کی تائید کی اور بعد میں یہی ہوا کہ نئے ماڈل کی نئی گاڑی لینے کے لیے انہیں نصف رقم ضرور مل گئی۔ رات کے کھانے سے پہلے میں واپس پہنچ گیا۔ دن میں کام کرنے والے فارغ ہو چکے تھے اور انہیں مہمان خانے میں جگہ دے دی گئی تھی۔ انہوں نے ایک دن میں کافی کام کر لیا تھا۔ اب اگلے دن جزیئر آنا تھا اور اس کے بعد مشینوں کی تنصیب کا باقی کام مکمل ہونا تھا۔ تیسرا دن انہوں نے مشینوں کو چالو کرنے اور ٹیسٹ کرنے کے لیے رکھا تھا۔ ریشم اور انور مجھے کہیں نظر نہ آئے۔ شاہینہ اس وقت بھی چودھری صاحب کے پاس تھی۔ سلونی مجھے مہمان خانے کی طرف سے آتی ہوئی ملی۔ ”یہ کمپنی والے رات کو کام ختم کر کے واپس جانا چاہتے تھے۔ انور صاحب نے کہا کہ ابھی ڈیڑھ گھنٹے میں جاؤ گے اور صبح پھر ڈیڑھ گھنٹا لگے گا آنے میں... فون کر دو کمپنی میں اور گھر پر کہ ہم رات کو یہاں قیام کریں گے۔ انہیں یہ بات ٹھیک لگی۔ اب مہمان خانے میں جگہ کا انتظام کر دیا ہے... آپ کا کام ہو گیا؟“

”ہاں، وہ کوئی اتنا بڑا کام نہیں تھا۔ یہ دونوں کہاں ہیں... انور اور ریشم؟“

”ابھی تو یہیں تھے۔ شاید پیچھے باغ میں ہوں گے۔ آپ فریش ہو جائیں سر تو میں کھانا لگواتی ہوں۔“

میں نے کہا۔ ”ایک گزارش ہے تم سے۔“
”آپ حکم دیں سر۔“ سلونی نے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔

”نہ مجھے سر کہلانا اچھا لگتا ہے اور نہ جناب عالی... میں تمہاری طرح عام آدمی ہوں... صرف نام کافی ہے۔“
”میں کوشش کروں گی سر... دراصل عادت نہیں ہے۔“

”ہو جائے گی۔“ میں نے کہا اور حویلی کے پیچھے باغ میں جانے کے لیے آخری برآمدے میں بائیں طرف کے دروازے سے نکل گیا۔ رات کے نو بجے تھے اور باغ میں اندھیرا ہی تھا لیکن بارہویں تیرہویں شب کے چاند نے گھنے درختوں کے بیچ میں خالی جگہ سے اپنی روشنی پھیلا دی تھی۔ اس سے گھپ اندھیرا کسی حد تک دھندلکے میں ڈھل گیا تھا جس میں میری آنکھیں دور تک دیکھ سکتی تھیں۔ انور اور ریشم مجھے کہیں نظر نہیں آ رہے تھے۔ اخلاقیات مجھے ان کی پرائیویسی سے دور ہی رہنا چاہیے تھا لیکن ایک شک کی تصدیق کے خیال نے مجھے آگے بڑھنے پر مجبور کر دیا۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ کیا واقعی وہ راجہ عشق کی مسافت پر کچھ کی طرح

ریٹنے کے بجائے خرگوش کی طرح جست لگاتے ایک دوسرے کے لیے پیار اور وارفتگی کی آخری منزل تک پہنچ گئے ہیں یا ہنوز سفر میں ہیں۔ ایک جگہ مجھے کچھ حرکت محسوس ہوئی اور میں نے غور سے دیکھا تو دوسرے متحرک نظر آئے۔ وہ ضرور آہستہ آہستہ باتیں کرتے جا رہے تھے۔ پھر کسی بات پر ریشم کھلکھلا کے ہنسی۔ کچھ اور آگے جا کے میں نے دیکھ لیا کہ وہ ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دیے چل رہے ہیں۔ اب باغ کی آخری حد آگئی تھی اور وہ حویلی کی طرف پلٹ گئے۔ اس مرحلے پر میں نے بہتر سمجھا کہ میں بھی خاموشی سے واپس چلا جاؤں۔ ان کے اور قریب جانا معیوب بات تھی اور انہیں میری موجودگی کا پتا چل جاتا تو یہ زیادہ بری اور غیر اخلاقی بات ہوتی۔ جو میں دیکھنا چاہتا تھا، وہ میری آنکھوں نے دیکھ لیا تھا۔ شک و شبہ کی اب کوئی بات نہیں تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی محبت میں شدت سے اور بڑی تیز رفتاری سے گرفتار ہو چکے تھے۔ یہ ایک آفاقی سچائی کا مشاہدہ تھا۔ کوئی نئی یا انوکھی بات نہ تھی۔ نگری نگری پھر مسافر... مگر دل ٹھہرا تو کہاں... ایک گمنام گاؤں مرادوں والی کی گمنام اور کم حیثیت لڑکی پر... عشق نہ دیکھے دیں، قبیلہ، عشق نہ کچھے ذاتاں... اور عشق کوئی کام نہیں کہ کوئی اپنی ضرورت یا فرصت میں وقت اور مقام دیکھ کے عقل و ہوش سے کرے... یہ تو ایسے ہی ہوتا ہے جیسے جان لیوا کینسر کے نہ احتیاط کام آتی ہے نہ علاج... یہ ایسا ہی ہے اور ایسا ہی رہے گا۔

انہوں نے مجھے حویلی کی پچھلی طرف دروازے کے قریب دیکھا۔ ”تم کب آئے؟“ انور نے اخلاقیات پوچھا۔
”ابھی کچھ دیر پہلے... سلونی نے کہا کھانا لگوا رہی ہوں تو میں نے سوچا تمہیں بھی بلا لوں۔“

”میں ذرا ریشم کو اپنے پائیں باغ کی سیر کر رہا تھا۔ یہی کہیں گے نا اسے۔“ وہ خوش دلی سے مسکرایا۔ ”لیکن باغ کی طرح اس میں گل بوٹے نہیں ہیں... بس پھل دار درخت ہیں... پھل بھی ان کا شوق سے کوئی نہیں کھاتا۔“

کھانے کی میز پر بھابی شاہینہ کی موجودگی میرے لیے اب زیادہ حیرانی کا سبب نہیں بنی۔ حیرت مجھے بڑے چودھری صاحب کو دیکھ کر ہوئی۔ وہ نہ صرف خوش اور مطمئن تھے بلکہ کسی طرح سے بھی بیمار نظر نہ آتے تھے۔ یہ اچھی علامت تھی۔ اس کا سبب پوچھنا لا حاصل ہوتا لیکن انور کی ماں بڑی چودھرائن کے نہ آنے پر میں نے پوچھ لیا۔
”کیا... بڑی چودھرائن کھانا نہیں کھائیں گی؟“

جی کہانیوں آپ بیتیوں جگ بیتیوں کا بے مثال مجموعہ

سرگزشت

ماہنامہ

شمارہ جنوری 2014ء

کی جھلکیاں

سفر مزاج

ایک انتہائی اہم شخصیت کی زندگی کے عروج و زوال کی دلچسپ روداد جو خود میں بھرپور سبق ہے

چاپانی سنری نور

غربت سے امارت تک پہنچنے والے کی روداد جس نے پوری دنیا میں تہلکہ مچا دیا تھا

مروہ کامجنوں

ایلی مجنوں کی داستان سے زیادہ اہم داستان عشق مروہ کے مجنوں کی کتھا

سلطانہ بیگم

انا کے خول میں بند عورت کا قصہ جو بہو اور بیٹی میں فرق کرنے کی عادی تھی

لہو کی علامہ

لہو کی گردش تیز کر دینے والی داستان ”سراب“ فلمی دنیا کا ماضی محال ”فلمی الف لیلا“ اور بہت سی دلچسپ تحریریں جنہیں آپ پسند کریں گے جنہیں آپ کوڑھ حنا چاہیے

آج ہی نزدیکی بک اسٹال پر اپنا شمارہ مختص کرالیں

خاص شمارہ..... ہر شمارہ، خاص شمارہ..... ہر شمارہ، خاص شمارہ

انور نے فوراً نارمل لہجے میں کہا۔ ”وہ کھا چکی ہیں۔ اکبر کے ساتھ... تم شروع کرو۔“

بڑے چودھری اور شاہینہ بھابی کی خوشی کا سبب واضح ہو گیا تھا۔ میں اس پر کوئی تبصرہ کیوں کرتا۔ صاف ظاہر تھا کہ آج دن میں کسی وقت انور نے ماں کو اجازت دے دی تھی کہ وہ کھانا اپنے بیٹے اکبر کے ساتھ کھا سکتی ہیں۔ بڑے چودھری کی موجودگی ایک طرح سے مفاہمت اور صلح جوئی کی اس کوشش کی حوصلہ افزائی تھی۔ ان کے چہرے پر ایک بے نام سی شرمساری کا عکس بھی نظر آتا تھا۔ وہ ہمیشہ سب کے سامنے سر بلند رہے تھے۔ اپنا خاندان ہو یا اپنی رعایا... سب ان کے تابع تھا اور صحیح وہی تھا جو وہ کہیں یا کریں۔ شاید ان کے لیے ڈوب مرنا زیادہ آسان ہوتا... اپنے کیے پر شرمندگی کا اظہار کرنا یا کسی سے معافی مانگنا ان کی فطرت قبول نہ کرتی۔

بھابی اسے اپنی کامیابی کی منزل کی طرف بڑی پیش رفت سمجھ رہی تھی اور اس کا یہ امید رکھنا حق بجانب لگتا تھا کہ اگلے مرحلے میں یعنی مستقبل قریب میں انصاف پسند بھابی جی کا دل اس سہاگن کے لیے موم ہو جائے گا جو بیوہ جیسی زندگی گزارنے پر مجبور تھی۔ شاید اس کے نزدیک دوبارہ اقتدار حاصل کر لینے کا مرحلہ اتنا دشوار بھی نہیں تھا جتنا وہ سمجھ رہی تھی۔ اس کے شوہر کے مقابلے میں انور بے وقوفی کی حد تک رحم دل تھا۔ ایسا شاید اس لیے تھا کہ انور نے حکمرانی نہیں کی تھی، وہ علم کی دولت سمیٹتا رہا تھا جو یہاں بے مصرف تھی۔ کم سے کم وہ ایسا ضرور سمجھتی ہوگی۔ اس کے ظاہری روپ سے اندازہ کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن تھا کہ اس ظاہری معصوم چہرے کی طفلانہ مسکراہٹ کے پیچھے کیسے انتقامی جذبات کا کیسا آتش فشاں سویا ہوا ہے۔ دنیا کے بہت سے سرسبز و شاداب گل پوش یا برف پوش آتش فشاں ایسے ہیں جن سے کسی پیشگی وارننگ کے بغیر آگ کا دریا بہنے لگتا ہے تو ہنسی بستی آبادیاں راتوں رات خاکستر ہو کے لاوے کی بے رحم تہ کے نیچے قبرستانوں میں بدل جاتی ہیں۔ عورت کی فطرت کی عیاری و مکاری اور انتقامی فطرت کی کہانیاں میں نے بہت سنی تھیں جو زیادہ تر مردوں کے تعصب کی پیداوار لگتی تھیں کیونکہ عورت کو میں نے ماں، بہن اور بیوی یا بہن کے روپ میں صرف محبت اور بے غرضی اور قربانی کا پیکر دیکھا تھا۔ لیکن جو مشہور تھا، سو فیصد جھوٹ بھی قرار نہیں دیا جاسکتا تھا۔ شاہینہ وہ عورت تھی جو انتقام کی آرزو میں زہریلی ناگن کی طرح خطرناک ہو گئی تھی اور موقع ملے ہی انور کے

ساتھ مجھے اور ریشم کو بھی ڈس سکتی تھی۔

ایک بار پھر شاہینہ نے مجھے یاد دلایا۔ ”ملک صاحب! آپ کو یاد ہے نا، کل والد صاحب تشریف لارہے ہیں آپ سے ملاقات کے لیے۔“

دونوں خطابات نے مجھے حیران کیا۔ ملک صاحب اور والد صاحب... یہ اندازِ مخاطب سراسر منافقت کا آئینہ دار تھا۔ شاید خود انور اور بڑے چودھری صاحب کو بھی اس پر کچھ حیرانی ہوئی۔ انور نے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا مگر بڑے چودھری صاحب کی نظر اپنی بہو پر سوالیہ انداز میں ٹھہر گئی۔

میں نے کہا۔ ”جی مجھے یاد ہے۔ آپ کو یاد دلانے کی ضرورت نہیں۔“

”میں نے اس لیے کہا کہ آپ اپنی مصروفیت میں بھول نہ جائیں۔“

انور نے لہجے سے طنز یا تمسخر کا اظہار کیے بغیر کہا۔ ”تایا جی... ان کے نام کے ساتھ عقیدت مند بہت سے القاب و آداب استعمال کرتے ہیں لیکن میں تو بچپن سے انہیں تایا جی کہنے کا عادی ہوں۔ بڑے پچھے ہوئے پیر مانے جاتے ہیں۔ گرد و نواح میں ان کے بہت عقیدت مند ہیں جو ان کے پاس دعائے خیر اور حاجت روائی کے لیے آتے رہتے ہیں۔“

بڑے چودھری نے کہا۔ ”ہاں، اب وہ پیر و مرشد ہو گئے ہیں۔“

سر کے لہجے میں کچھ تمسخر اور کچھ طنز کا عنصر بہو کو پسند نہیں آیا۔ ”آپ تو جانتے ہیں اباجی... ان کا مزاج شروع سے ایسا ہی ہے، صوفیانہ... دنیا داری میں کبھی نہیں پڑے... لوگوں کا اعتقاد ہے۔“

”چھوٹے بھائی کے لیے تو کبھی کچھ نہیں کیا۔“ بہو کا لہجہ زیادہ جارحانہ ہو گیا۔ ”اللہ نے سب کچھ دے رکھا ہے آپ کو اباجی... کسی اور کے لیے وہ کیا کرتے ہیں دعا کے سوا اور لیتے کچھ نہیں۔“

”ملک سلیم اختر! تجھے ہے ضرورت دعاؤں کی... اور پیسا سا جاتا ہے کنوئیں کے پاس... تجھے خود حاضر ہونا چاہیے پیر صاحب کی خدمت میں۔“ بڑے چودھری نے کہا۔

میں نے کہا۔ ”جی میں ضرور جاتا لیکن وہ یہاں بڑے بھائی کی حیثیت سے آرہے ہیں۔ آپ کی طبیعت کا حال پوچھنے۔“

انور نے کہا۔ ”مجھے تو کل جانا ہے ایک ضروری کام سے شہر۔“

بھابی نے کہا۔ ”آخر ایسا کون سا ضروری کام پڑ گیا ہے بھائی جی؟“

”اب تمہیں کیا بتاؤں بھابی جی... آج ملک ورکشاپ گیا تھا۔ ایک تو انہوں نے مانگے ہیں پانچ لاکھ روپے... لیکن اصل بات یہ ہے کہ ایک مہینہ لگے گا تو اتنا عرصہ ہم کیا انہی دو گاڑیوں سے گزارہ کریں گے۔ انہوں نے کہا ہے کہ آپ کو نئی گاڑی دے دیتے ہیں۔ پرانی گاڑی کی قیمت ہم بعد میں ایڈجسٹ کر لیں گے... مرمت کے بعد... کیا ملک نئی کی کچھ قیمت بتائی تھی انہوں نے؟ اور گاڑی کون سی دیں گے؟“

میں سمجھ گیا تھا کہ انور کو تایا جی کے سامنے جانا منظور نہیں۔ ان کی نیت کچھ بھی ہو انور کو ان کی دوسری بیٹی کے لیے انکار کا مرحلہ بھی تھا۔ اسے ڈر ہو گا کہ کہیں پیر صاحب یہ بات نہ چھیڑ دیں۔ دوسرا نا پسندیدہ موضوع ان کے داماد اکبر کے لیے رعایت حاصل کرنے کا ہو سکتا تھا۔ اگر وہ عفو و درگزر کے موضوع پر خطبہ شروع کر دیتے تو انور کے لیے نہ انکار کا راستہ ہوتا نہ اقرار کا... کام کو بہانہ بنا کے فرار میں ہی عافیت تھی۔ میں نے اسے سپورٹ کیا۔ ”گاڑیاں کئی تھیں مگر میں کیا فیصلہ کرتا... میں نے کہا کہ کل چودھری انور صاحب خود آ کے طے کریں گے۔“

کھانا ختم ہونے سے پہلے ہی بڑے چودھری صاحب اٹھ گئے۔ آخر میں ہم بھی اٹھے۔ انور میرے ساتھ آ گیا۔ اس نے برتن سینے والے ملازم کو کافی کے لیے کہہ دیا تھا۔ ریشم نے مجھ پر بہت سے انکشافات کیے تھے۔ یہ خاندان کے اندر کی سیاست تھی جس میں ماضی کی تاریخ کے خونی اوراق تھے تو مستقبل کی تاریخ میں بھی ہوس کی قربان گاہ پر بھی بہت سے بے گناہ سر دکھائی دیتے تھے۔ اگر میں انور سے کہتا کہ کیا ملک پر حکمرانوں کی تخت نشینی کا قصہ ایسی چھوٹی چھوٹی جاگیروں پر قبضے کے لیے ہمیشہ ایسے ہی ہر جگہ دہرایا جاتا رہے گا؟

انور نے کہا۔ ”تو کیوں چپ ہے ملک؟“ میں چونکا۔ ”ایسے ہی... میں ابھی خود کو محفوظ محسوس نہیں کرتا... اب کل پیر صاحب بھی مجھ سے میرا شجرہ نسب پوچھیں گے۔ حوالے مانگیں گے۔ یہاں شناختی کارڈ کی کیا حیثیت ہے۔ بندہ خاندانی ہو تو اس کا خاندان بھی ہو۔“

”تو ان معاملات کو اہمیت مت دے۔ کہہ دے میں

کیا آپ شوگر موزی مرض سے نجات چاہتے ہیں؟

آج کل تو ہر انسان شوگر کی مرض سے بیزار پریشان فکر مند ہے۔ ہم نے ایک طویل عرصہ دیسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں پر ریسرچ کر کے ایک ایسا خاص قسم کا ہربلز شوگر نجات کورس ایجاد کر لیا ہے جو کہ انشاء اللہ آپ کو شوگر سے نجات دلا سکتا ہے۔ شفا منجانب اللہ پر ایمان رکھیں کیونکہ مایوسی تو گناہ ہے۔ یاد رکھیں شوگر کی مرض تو انسان کو اندر ہی اندر ویمک کی طرح کھوکھلا کمزور بے جان بنا دیتی ہے۔ اگر آپ بھی شوگر سے نجات چاہتے ہیں تو آج ہی فون پر تمام علامات بیان کر کے گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک VP وی پی شوگر نجات کورس منگوالیں۔ خدا را ہمارا شوگر کورس آزما کر تو دیکھیں

المسلم دار الحکمت (رجسٹرڈ)

(دیسی طبی یونانی دوا خانہ)

ضلع و شہر حافظ آباد پاکستان

0300-6526061

0301-6690383

صبح 9 بجے سے دوپہر 1 بجے تک

عصر 4 بجے سے رات 10 بجے تک

آپ صرف فون کریں شوگر کورس ہم پہنچائیں گے

مرغ کی مخلوق ہوں۔ آسمان سے اتر اہوں۔“ وہ ہنسا۔
”کچھ بھی کہنے سے کیا فرق پڑتا ہے۔“ میں نے کہا۔
دروازے کی سائڈ سے ناک کر کے راجا ریاست
نے پوچھا۔ ”میں حاضر ہو سکتا ہوں؟“
”آئیے آئیے راجا صاحب۔“ انور بولا۔

وہ ہمارے ساتھ سائڈ والے صوفے پر براجمان ہو
گیا۔ ”میں نے مداخلت تو نہیں کی؟“
”بالکل نہیں، ہم کھانا کھا کے ذرا گپ لگانے بیٹھے
تھے۔ آپ بتائیے کوئی تکلیف تو نہیں ہے مہمان خانے
میں؟“

وہ مسکرایا۔ ”تکلیف؟ آپ شرمندہ کرتے ہیں
سر۔۔۔ ہمیں تو لگتا ہے کہ کسی فانیو اسٹار ہوٹل میں آگئے ہیں۔
اس دور افتادہ گاؤں میں ایسی خاطر مدارات اور سہولتوں کا
ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔“

وہ کچھ دیر بیٹھا انور کی سعادت مندی کو سراہتا رہا
جس نے باپ کے علاج کے لیے پیسا پانی کی طرح بہا کر
ناممکن کو ممکن کر دیا تھا اور اسی جگہ مکمل علاج اور دیکھ بھال کی
سہولت فراہم کر دی تھی۔ میں نے اسے بتایا کہ ایک
کارڈ یا لو جسٹ اور ایک ٹریڈنرس کا انتظام بھی کر لیا گیا ہے
جو دن رات یہیں رہیں گے تو وہ بڑا متاثر ہوا۔

پھر ایک خادم نے آ کے بڑے چودھری صاحب کا
پیغام دیا۔ وہ انور کو بلا رہے تھے۔ وہ کافی ختم کر کے چلا
گیا۔ راجا ریاست پھر بھی بیٹھا رہا۔ پھر مجھے جس بات کا
اندیشہ تھا اس نے وہی کی۔
”ملک صاحب! دراصل میں آپ سے ہی بات کرنا
چاہتا تھا۔“

میں نے محتاط ہو کے کہا۔ ”کہیے۔“
وہ بولا۔ ”مجھے معذرت کرنی تھی آپ سے۔۔۔ اس
دن میں نے جو بات کی، وہ محض غلط فہمی کا نتیجہ تھی۔“
”آپ نے سکھر جیل کا ایک بندہ کہا تھا مجھے۔۔۔ میں
نے مسکرا کے کہا۔“

وہ بولا۔ ”صورت کی مشابہت سے مجھے ایسا لگا تھا۔“
”بس اتنی ہی بات تھی؟“ میں نے کہا۔
وہ کچھ تذبذب کے ساتھ بولا۔ ”شاید اتنی ہی بات
نہیں تھی۔ مجھے۔۔۔ یہ شبہ ہوا۔۔۔ کہ آپ نے بھی پہچان لیا تھا
مجھے۔۔۔“
میں ہنس پڑا۔ ”میں نے تو ایسی کوئی بات نہیں کہی
تھی۔“

”وہ... دراصل... آپ چوکنے تھے مجھے دیکھ کر... آپ کو احساس نہیں ہوا۔ ایک لمحے کے لیے آپ کے قدم رکے تھے۔ یہ بالکل لاشعوری رد عمل تھا پھر آپ سنبھل گئے۔ کیا یہ بھی غلط نہیں تھی میری؟“

”یعنی تم نے یقین نہیں کیا تھا میری بات کا... اب کیا کرنا چاہیے مجھے خود کو بے گناہ ثابت کرنے کے لیے؟“ میں نے سنجیدہ ہو کے کہا۔

وہ ہلکے جھپکائے بغیر مجھے دیکھتا رہا۔ ”اس دن...“

یعنی پرسوں... آپ کہنی کے آفس سے کہاں گئے تھے؟“

میں نے غصے سے کہا۔ ”یہ تم کیوں پوچھ رہے ہو؟“

”مجھے معلوم ہے... آپ شناختی کارڈ کے آفس گئے تھے... اپنا شناختی کارڈ بنوانے۔“

میرا اعتماد ڈانواں ڈول ہونے لگا مگر میں نے اعتماد میں فرق نہیں آنے دیا۔ ”کیا مطلب؟ تم جاسوسی کر رہے تھے میری؟ میرے پیچھے لگے ہوئے تھے؟“

وہ متاثر ہوئے بغیر بولا۔ ”آپ نے ایک نیا شناختی کارڈ بنوایا ہے؟“

”ہاں... پرانا کھو گیا تھا۔“

”جی نہیں... پرانا کھو جائے تو نئے پر وہی نمبر آتا ہے جو پہلے تھا۔ تاریخ اجرائی ہوتی ہے... اس کے لیے کوئی ایجنٹ کو رشوت نہیں دیتا اور وہ تو ہے ہی بدنام ایسے کاموں کے لیے۔“ وہ اب زیادہ بے خوفی سے بات کر رہا تھا۔

”اٹھو۔“ میں نے اونچی آواز میں کہا۔ ”اور نکل جاؤ میرے کمرے سے... ورنہ میں خود تمہیں اٹھا کے باہر پھینک دوں گا۔“

”آپ ایسا کچھ نہیں کریں گے فرید... میرا مطلب ہے ملک سلیم صاحب۔“

میرے سامنے جیسے بم پھٹ گیا۔ اس نے دانستہ میرا جیل کا نام لیا تھا۔ اسے نام یاد آ گیا تھا اور وہ مجھے پہچان گیا تھا۔ میں اس اچانک پیدا ہونے والی صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ بلاشبہ میں چیختا دھاڑتا اور اسے دھکے دے کر نکالتا تو شور سب سنتے... انور علی کے ساتھ بڑے چودھری صاحب بھی متوجہ ہوتے۔

”اتفاق یہ ہے کہ اسی ایجنٹ سے میں نے ایک جعلی شناختی کارڈ بنوایا تھا، چھ مہینے پہلے... اور میں نے تعاقب نہیں کیا تھا آپ کا... اگلے دن یعنی کل... وہ ایجنٹ نظر آ گیا مجھے... اور میں نے اس سے پوچھ لیا کہ کیسا چل رہا ہے کاروبار... اور اس سے پوچھا کہ حال ہی میں کسی نے

ملک سلیم اختر کے نام سے شناختی کارڈ حاصل کیا ہے؟ وہ بڑا حیران ہوا اور کہنے لگا کہ تمہیں کیسے معلوم ہوا۔ کارڈ بنوانے وہ میرے پاس ہی آیا تھا کل... آج کارڈ لینے آئے گا۔ پھر میں نے پوچھا کہ اس کا نام پہلے فرید تھا نا... وہ پریشان ہو گیا۔ کہنے لگا کہ ہاں فرید الدین تھا۔ یہ تم کیسے جانتے ہو... میں نے ہنس کے ٹال دیا کہ بیٹا ہم بھی بڑی پچھلی ہوئی چیز ہیں۔ دراصل اس کہنی میں ملازمت ملنے سے پہلے میں نے بہت دھکے کھائے۔ بہت سے غلط کام بھی کیے۔ ایک بندے کو شناختی کارڈ کی ضرورت تھی۔ مجھے اس ایجنٹ کا پتا چلا تو میں نے کہا کہ میں گا ہک لاتا ہوں... مجھے کیا دو گے۔ اس نے دو کہے... میں نے پانچ... چار پر بات ہو گئی۔ جان پہچان کی وجہ یہی تھی۔“

اچانک میں نے محسوس کیا کہ میں ایک بندگی میں محصور ہو گیا ہوں۔ راستہ نہ آگے تھا اور نہ پیچھے... انکار ممکن ہی نہیں رہا تھا۔ جواب تک شکل کی وجہ سے خوف کی بات تھی، اب وہ خطرہ بن کے سامنے آگئی تھی اور میرا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اس مشکل سے نجات کے دو ہی راستے تھے۔ یا میں فرار ہو جاؤں یا مجھے پہچان لینے والے کو قتل کر دوں... یا میں نہ رہوں یا وہ نہ رہے... لیکن یہ دونوں راستے بھی بند تھے۔ یہ ناممکن تھا۔ اب تیسرا اور آخری راستہ اعتراف کے بعد یہ پوچھنے کا تھا کہ آخر وہ کیا چاہتا ہے اور رازداری کا معاہدہ کن شرائط پر ممکن ہے۔ میں نے اٹھ کے دروازہ بند کیا تو وہ چوکنے لگا۔

میں نے کہا۔ ”ڈرو نہیں... میں تم سے صرف بات کرنا چاہتا ہوں اور نہیں چاہتا کہ ہماری باتیں کوئی بھی سنے۔“

”یہ میں بھی نہیں چاہتا۔“ اس نے مطمئن ہو کے سر ہلایا۔

میں پھر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ ”اب اگر میں تم سے ایک سوال کروں۔“

وہ بولا۔ ”مجھے اندازہ ہے کہ سوال کیا ہوگا۔ تم پوچھو گے کہ میں سکھر جیل میں کیوں تھا؟“

”اگر تم اعتماد کرو گے تو میں بھی یہ رسک لوں گا۔“

وہ بولا۔ ”رسک ہے تو دونوں کے لیے... اس لیے میں تمہارے سوال کا جواب دوں گا۔ سچ اور تفصیل سے... کہانی ذرا لمبی ہے۔“

”فکر مت کرو... مجھے سونے کی جلدی نہیں... رات بہت لمبی ہے۔“ میں نے کہا۔

”ظاہر ہے اس کے بعد تم نے مجھ سے بوجھا تھا کہ میرے ساتھ کیا ہوا اور میں نے تمہیں بتا دیا تھا کہ تقریباً ایسی ہی کہانی میری ہے۔ میں جرم محبت کی پاداش میں سولی پر چڑھایا جا رہا تھا۔ لیکن کے لیے مجنوں نے جان دی تو تاریخ بن گئی، فلمیں بن گئیں... انا رکلی کو سزائے موت دی گئی تو مغل اعظم میں دلپ کمار چلا چلا کے گاتا رہا... اے محبت زندہ باد... فرہاد بھی شہید محبت... لیکن کلثوم کے عشق کے جرم کی سزا سعدی کو مل رہی ہے تو یہ انصاف ہو رہا ہے؟ نام تو سعادت تھا میرا لیکن یار دوستوں میں سعدی تھا۔ بعض شیخ سعدی بھی کہہ دیتے تھے کیونکہ میں واقعی کچھ نیک اور شریف تھا ان کے مقابلے میں اور انہیں برائی سے روکتا بھی تھا۔ کلثوم وہ لڑکی تھی جس سے محبت کرنا میرا جرم بنا۔

”اب یہ محبت کیسے ہوئی اور کیوں ہوئی؟ یہ الگ کہانی ہے اور ہر محبت جیسی کہانی ہے... جو کی نہیں جاتی، ہو جاتی ہے... قدرت حالات پیدا کر دیتی ہے اور کوئی بھی بات بہانہ بن جاتی ہے۔ ہمارے ملک کا عجب حال ہے... اگر کوئی الیکٹرک انجینئر بن جائے تو وہ صرف الیکٹریشن بن سکتا ہے وہ الیکٹریشن جو کسی سرٹیفکیٹ، ڈپلوما یا ٹریننگ کے بغیر سوچ لگاتے لگاتے پوری فننگ اور ریپنر سیکھ لیتا ہے۔ یہی آٹوموبائل انجینئر کے ساتھ ہوتا ہے۔ ان سے وہ استاد برتر جو بیس تیس سال کا تجربہ رکھتے ہیں۔ تیل گریس میں فرش پر لیٹ کر گاڑیاں ٹھیک کر لیتے ہیں... بس میں بھی چکر میں تھا کہ اب الیکٹریکل انجینئرنگ کی کتابوں کے علم کا استعمال کہاں کروں... ایک حوالے سے مجھے کلثوم کی ٹیوشن مل گئی جو انٹر سائنس کا امتحان دے رہی تھی مگر سائنس میں کمزور تھی۔ بتانے والے نے تو صرف یہ کہا کہ وہ انجینئر ہے۔ وہ انٹر کی فزکس کیمسٹری تو میں بھول گیا تھا مگر میں نے دوبارہ دیکھ لی اور پڑھانا شروع کر دیا۔ پانچ ہزار فی مضمون کے حساب سے دس تھے جو بڑھ کر پندرہ ہو گئے کیونکہ دمی رانی کی انگریزی بھی مسئلہ تھی... خود مجھے انگریزی ہمیشہ مسئلہ رہی مگر میں نے کہا کہ جناب پڑھا دوں گا... ہر مضمون میں کامیابی اعلیٰ نمبروں سے ہوگی۔

”اس کے بعد اللہ بھلا کرے آپ کا... عشق تو ہونا ہی تھا۔ پہلے نگرانی سخت تھی۔ پھر یہ دیکھ کر سعادت یار خان تو واقعی شیخ سعدی ہے، پہرے داری کم ہو گئی۔ چائے اور خاطر تواضع ان کا دتیرہ تھا۔ میرا تو اس کی طرف نظر بھر کے دیکھنے سے برا حال ہوتا تھا لیکن وہ تھی ہی اتنی خوب صورت کہ نظر اٹھتی تھی تو ٹھہر جاتی تھی۔ پہل اس کی طرف سے ہوئی

”میرا اصل نام سعادت یار خان ہے جیسے تمہارا چودھری فرید الدین ہے۔ میں نے نام ہی نہیں چہرہ بھی بدلا ہے ورنہ تم بہ آسانی مجھے پہچان لیتے۔ کچھ لوگ جن میں شاید میں بھی شامل ہوں... آواز کو لا شعور میں محفوظ کر لیتے ہیں اور برسوں بعد بھی آواز سن کے بندے کو پہچان سکتے ہیں۔ یہ صلاحیت تم میں نہیں ہے۔ چھ سات مہینے پہلے میں سکھر جیل میں تھا اور وہاں یہ وقت میں نے جوڈیشل ریمانڈ پر گزارا تھا۔ اس وقت میری اور تمہاری جان پہچان ہوئی تھی۔ تمہارے بارے میں مجھے معلوم ہوا تھا کہ تم پڑھے لکھے آدمی ہو... کسی کی دشمنی نے تمہیں وہاں پہنچایا ہے اور دشمن اتنا طاقتور ہے کہ ایک بے گناہ کو پھانسی کے تختے پر پہنچا دیا ہے۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ اس طاقتور دشمن کا نام نادر شاہ ہے تو مجھے کچھ حیرانی اور دلچسپی پیدا ہوئی کیونکہ یہ نام میں نے پہلے بھی سنا تھا۔ اس کے ایک دو کارندے جیل کاٹ رہے تھے۔ اب پتا نہیں ان کا قصور کیا تھا۔ وہ جیل کے اندر خود کو محفوظ سمجھنے لگے تھے کہ مار دیے گئے... ایک پر الزام آیا کہ وہ فرار کی کوشش میں مارا گیا جبکہ اسے سلاخوں کے پیچھے کوٹھری میں گولی ماری گئی تھی۔ دوسرے کی جیل کے اندر لڑائی میں ہلاکت دکھائی گئی۔ وہ جرائم پیشہ پہلے سے تھے اور کسی طرح نادر شاہ کے گردہ تک پہنچ گئے تھے۔ اس قسم کے ہر جرائم پیشہ گروہ میں کام کرنے والے عموماً بدترین حالات میں پرورش پانے والے... جاہل اور جرائم میں ملوث نوجوان ہوتے ہیں... کسی مہذب اور تعلیم یافتہ آدمی کا ایسے گروہ میں کیا کام... ظلم اور تشدد تم پر بھی بہت ہوتا تھا۔ یہی خیال مجھے تمہاری طرف لے گیا اور میں نے موقع پا کے تم سے بات کی تھی اور تفصیل سے تو نہیں لیکن تم نے مجھے بتا دیا تھا کہ تم پر نادر شاہ نے اپنے ہی بھائی کے قتل کا کیس کھڑا کیا اور اب وہی تمہیں پھانسی کے پھندے تک پہنچانے کے لیے اپنا اثر سوخ استعمال کر رہا ہے۔ تم نے ہائی کورٹ میں تو اپیل کی تھی مگر وہ مسٹر دھوگئی تو تم نے آگے سپریم کورٹ میں اپیل نہیں کی تھی۔ ایک تو تم مایوس تھے کہ وہاں بھی فیصلہ یہی ہوگا۔ عدالت ثبوت اور شہادت دیکھتی ہے، کسی کے دل میں نہیں دیکھ سکتی۔ دوسرے تمہارے پاس وسائل نہیں تھے کہ بڑا وکیل کر سکو۔ اگر قواعد کے مطابق تمہیں سرکاری وکیل صفائی فراہم کیا جاتا تو وہ محض رسمی کارروائی ہوتی اور وہ بس اپنا فرض پورا کرتا۔ چنانچہ تمہیں یقین تھا کہ تمہاری زندگی کے زیادہ دن باقی نہیں رہے...

تو میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ میں نے ہاتھ جوڑے کہ بی بی کیوں مجھے مرواتی ہو۔ اس نے غیرت دلائی کہ مرد ہو کے ڈرتے ہو۔ کہتے کیوں نہیں کہ میں اچھی لگتی ہوں... لگتی ہوں نا؟“

میں نے سر ہلا کے کہا۔ ”ہاں مگر کسی نے سن لیا تو...“ اس نے مجھے ڈانٹا۔ ”صرف میں سن رہی ہوں... بولو۔“

میں نے کہا۔ ”دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔“ ”ان دیواروں کے نہیں ہیں۔ میرے ہیں۔ تم جھوٹ کہتے ہو۔ میں شور مچاؤں کہ تم نے چھیڑا ہے مجھے؟“

”لو جی، تھا تو بچ مگر اس نے زبردستی مجھ سے اظہار محبت کر لیا اور پھر فوراً اپنی محبت کا اعتراف بھی کر لیا۔ عجیب طوفان لڑکی تھی۔ زیادہ نگرانی نے اس کو باغی کر دیا تھا۔ میں جو اس کے عشق کے بحر الکامل میں غرق ہوا تو بس غرق ہو گیا اور وہ مجھ سے ہر معاملے میں چار قدم آگے ہی رہی۔ کالج چل رہا تھا تو وہ خود بتاتی تھی کہ مجھے کب کہاں پہنچنا ہے۔ مجھ سے پہلے وہ خود موجود ہوتی تھی۔ امتحان کے زمانے میں اس نے بیچر ایک نہیں دیا۔ یوں دیا کہ ہال میں گئی، کاپی پر رول نمبر لکھا اور آدھے گھنٹے میں باہر... اصولاً آدھا وقت گزرنے سے پہلے اجازت نہیں ملتی مگر اصول کہاں چلتے ہیں۔ خیر یہ تو بہت بعد کی بات ہے، اس نے پہلے ہی خبردار کر دیا تھا کہ وقت کم ہے۔ ہمیں بھاگ جانا چاہیے اور اس کے لیے امتحان سے پہلے تیاری پوری ہونی چاہیے۔ وہ بے حد ذہین لڑکی تھی اور بہت محتاط تھی۔ سب کی آنکھوں میں دھول جھونک دیتی تھی اور کسی کو پتا نہیں چلتا تھا کہ وہ اندھے ہو چکے ہیں۔ پہلے اس نے مجھے راستے دکھائے۔ پھر میں تربیت یافتہ گھوڑے کی طرح دوڑنے لگا۔ پہلے میں نے اس کا اور اپنا شناختی کارڈ بنوایا۔ اس کا طاہرہ سلطانہ دختر حاجی اللہ دتا مرحوم کے نام سے۔ تاریخ پیدائش پتا سب غلط۔ اپنا شیخ وقاص احمد ولد نور دین مرحوم... اس کے لیے پیسا خود کلثوم نے دیا اور اسی زمانے میں میری اس شناختی کارڈ بنانے والے سے رسم وراہ ہوئی تھی۔ تب یہ بھی سکھر میں تھا۔ ہم حیدرآباد میں تھے۔ میں نے جامشورو یونیورسٹی سے ڈگری لی تھی۔ اگلا مرحلہ تھا پاسپورٹ بنوانے کا۔ اس کے لیے میں کراچی گیا۔ وہاں بڑا شہر ہونے کی وجہ سے بھی یہ کام تھوک کے بھاؤ ہوتا تھا۔ ایجنٹ بھی بہت تھے۔ پیسا خرچ ہوا مگر میرا نہیں کلثوم کا۔ میرے پاس پیسا تھا ہی کہاں۔ میرا ایک بڑا بھائی تھا جس نے مجھے پالا اور تعلیم دلوائی کیونکہ ماں

باپ بہت پہلے مر چکے تھے۔ دو سال قبل وہ بیوی بچوں کے ساتھ دبئی چلا گیا تھا لیکن مجھے تعلیم کا خرچ برابر بھیجتا رہا۔ پاسپورٹ حاصل کرنے تک جہاں کلثوم کو میرے ساتھ جانا پڑا، وہ گئی۔ پھر امتحان کا وقت آیا تو اسے جلدی پڑی کہ اب پندرہ بیس دن ہیں... مجھے معلوم نہیں پیسا وہ کہاں سے نکالتی تھی۔ اس کے باپ کا بڑا بزنس تھا اور ٹھیکے تھے۔ آخر میں اس نے مجھے زیور بھی دیا کہ بیچ دو۔ میں نے اس کا اور اپنا نکاح نامہ بنوایا۔ یہ سب سے سستا جعلی کام تھا۔ کلثوم نے مجھے پورا پلان دیا۔ میں نے کہا کہ ہم پہلے تو چلتے ہیں کراچی... ایک کروڑ کا شہر ہے۔

اس نے کہا۔ ”بے وقوف! سب وہیں جاتے ہیں۔ ہمیں تلاش کرنے والے بھی ادھر ہی جائیں گے۔“ ”پھر... لاہور کی طرف چلیں؟“

”تم ویزا الوسری لنکا کا... آسانی سے ملتا ہے۔“ ”ہم سری لنکا میں رہیں گے شادی کے بعد؟“ ”یا شیخ... اتنے الوکیوں ہو تم آخر؟ بھی وہاں سے ہم جائیں گے سنگاپور... وہ بھی آسان ہوگا۔ سنگاپور سے جائیں گے ڈھاکا... وہ بھی بہت بڑا شہر ہے۔ وہاں کی آبادی میں ہم بہ آسانی گم ہو سکتے ہیں۔ ادھر کسی کا خیال نہیں جاسکتا۔“

”اس کے لیے پیسا کتنا چاہیے؟“ ”وہ میں کر رہی ہوں نا... ہم خالی ہاتھ نہیں ہوں گے۔“

”میں کلثوم کو دیکھ رہا تھا۔ اسے سن رہا تھا۔ اسے محسوس کر رہا تھا۔ اس کے خواب دیکھ رہا تھا اور اس کی تعبیریں... میں نے سری لنکا کے لیے ویزا اپلائی کیا تو ٹورسٹ ویزا کے لیے ایجنٹ نے کہا کہ اپنے اور وائف کے پاسپورٹ لاؤ۔ ان کی کاپی دو۔ میں نے پاسپورٹ دیے تو ٹکٹ بن گیا۔ ویزا کے لیے فوٹو کاپی کرانے گیا۔ ایک جگہ میرے پاسپورٹ کی کاپی بنی تو لاسٹ چلی گئی۔ یہ کچھ پتا نہیں تھا کہ کتنی دیر میں آئے گی۔ میں کلثوم کے پاسپورٹ کی کاپی بنوانے آگے چلا گیا۔ کافی چلنا پڑا مجھے۔ بالآخر ایک مشین مل گئی۔ وہاں فوٹو کاپی کرنے والے نے طاہرہ کی تصویر کو غور سے دیکھا اور بولا۔ ”یہ آپ کی وائف ہے؟“

مجھے بڑا طیش آیا۔ ”اور کیا تمہاری وائف ہے؟ کیا مطلب ہے اس سوال کا... کاپی بناؤ۔“

”ناراضگی کیسی سائیں۔ ابھی لو۔“ اس نے کاپی بنانی شروع کی تو پہلا صفحہ شاید خراب نکلا۔ اس نے خود ہی دیکھا

اور چرمر کے ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا۔ یہ کاپی اس نے دوبارہ بنائی اور پھر پوری فوٹو اسٹیٹ کاپی بنا کے پاسپورٹ مجھے واپس کر دیا۔

”بس یہی حد تھی میری خوش قسمتی کی۔ اس کے آگے بد قسمتی تھی۔ مجھے فوٹو اسٹیٹ کرنے والے کے سوال سے اس کی نیت کا کیا اندازہ ہو سکتا تھا۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ کمینہ کسی زمانے میں کلثوم کے باپ کا ڈرائیور تھا اور دس سال رہا۔ بڑی وفاداری سے خدمت کرتا رہا۔ کلثوم کو اسکول بھی لاتا لے جاتا رہا اور کچھ عرصہ کالج بھی۔ پھر کلثوم نے ضد کر کے باپ سے ایک نئی چھوٹی سی مہران لے لی اور خود ڈرائیو کرنے لگی۔ اس شخص کے بھائی کی فوٹو اسٹیٹ اور اسٹیشنری کی دکان تھی۔ ایک دن وہ دکان پر تھا کہ نہ جانے کدھر سے گولی آئی اور اس کے سر میں اتر گئی۔ سڑک پر فائرنگ ہوئی تھی۔ نشانہ وہ بھی بن گیا۔ اس کا گھر اسی آمدنی سے چلتا تھا۔ پیچھے رہ گئی ایک بیوی اور دو چھوٹے بچے۔ اکیلی وہ کیسے رہتی۔ اس بھائی نے ہی بھابی سے شادی کی اور اس کے دونوں بچوں کا باپ بن گیا۔ اس نے ڈرائیوری چھوڑ دی اور دکان پر بیٹھنے لگا۔

”اس خبیث نے میرے جاتے ہی کلثوم کے پاسپورٹ والا صفحہ اٹھایا اور اس کے باپ کو پہنچا دیا کہ یہ تو ہو بہو اپنی کلثوم بی بی لگتی ہے مجھے۔ کلثوم کا باپ جدی پستی وڈیرا اور بڑے اثر رسوخ والا آدمی تھا جس کے خاندان میں جرم محبت کی سزا صرف موت ہے۔ باپ، چچا یا بھائی ایسی لڑکی کو عزت کے نام پر خود مار کے تھانے میں حاضر ہو جاتا ہے اور ان کا کچھ بھی نہیں بگڑتا۔ تھانے میں ان کی غیرت مندی کو سراہنے والے انہیں بچا لیتے ہیں۔ ایسے حالات میں کلثوم نے جان ہتھیلی پر رکھ کے مجھ سے محبت کی۔ کون کہتا ہے کہ عورت ذات کمزور یا بزدل ہوتی ہے۔ وہ جب دل لگاتی ہیں تو ہم مردوں سے زیادہ دلیر ثابت ہوتی ہیں۔ کچے گھڑے پر طوفانی رات میں سیلابی دریا عبور کرنے اتر جاتی ہیں۔ وہ میرے بارے میں تو کچھ بھی نہ بتا سکا اور پاسپورٹ شناختی کارڈ کے پتے پر بھی میرا سراغ نہ ملا۔ یہ بھی بہت بچایا ہمیں خدا نے ورنہ آج آپ کو یہ سب بتانے کے لیے زندہ ہی کہاں ہوتا۔ میری ہڈیاں پڑی ہوتیں کسی نامعلوم مدفن میں۔ اس نے کلثوم سے پوچھ کچھ کی تو اس نے حلف اٹھا کے کہہ دیا کہ وہ کیا جانے یہ سچ وقاص کون ہے۔ اور وہ کیسے کسی کی بیوی ہو گئی، محض صورت کی مشابہت پر جس کا پاسپورٹ بھی موجود ہے۔ اس کے

اثر رسوخ والے باپ نے ادھر ادھر اپنے بہت جاسوس چھوڑے مگر وہ میرا سراغ لگانے سے قاصر رہے۔ کلثوم نے کسی ذریعے سے مجھے خبردار کر دیا کہ میں غائب ہو جاؤں ورنہ مارا جاؤں گا اور اب زندگی رہی تو میں خود تم سے آملوں گی ورنہ خدا حافظ۔ میں نکل گیا دہلی اور کئی مہینے اپنے بھائی کے پاس رہا۔ کلثوم سے رابطے کا کوئی ذریعہ ہی نہیں تھا۔ میں نے وہاں ملازمت بھی کر لی مگر کلثوم کو نہ بھلا سکا۔ اس کے باپ نے میری تلاش میں ناکامی کے بعد دوسرا پکا کام یہ کیا کہ فنانٹ بینک کو بیاہ کے رخصت کر دیا۔ رشتہ تو اس کا روایت کے مطابق بچپن ہی سے طے تھا۔ ظاہر ہے وہ بھی روپیٹ کے اور صبر کر کے بیٹھ گئی۔ جب مجھے پتا چلا تو اس واقعے کو کئی مہینے گزر چکے تھے۔ میں نے بھی صبر کیا لیکن ٹریجڈی پوری نہیں ہوئی تھی۔

”ایک دن میں کسی دوست سے ملنے گیا تھا۔ اس سے اگلے دن میں کراچی چلا جاتا اور وہاں سے دعی۔ وہ ہنگاموں کا دور تھا۔ نہ جانے کس معاملے میں گھنٹا گھر سے آگے احتجاج ہو رہا تھا۔ ایک طرف مظاہرین نعرے لگا رہے تھے اور پتھر اوڑھ کر رہے تھے۔ دوسری طرف سے پولیس نے پہلے لاٹھی چارج کیا اور پھر شیلنگ... لوگ جان بچانے کے لیے ادھر ادھر بھاگے۔ میں بھی اپنی جان ایک شیل سے بچانے کے لیے بھاگا جو میرے قریب آ کے گرا تھا۔ کسی پولیس مین نے گھما کے میرے سر پر لاٹھی ماری اور مجھے پکڑ لیا۔ ایسے موقع پر یہی ہوتا ہے۔ ہنگامہ کرانے والے بھاگ جاتے ہیں۔ تماشا دیکھنے والے پکڑے جاتے ہیں۔ پولیس کو اپنی کارکردگی دکھانے کے لیے نفری پوری کرنی ہوتی ہے کہ یہ موقع واردات سے پکڑے گئے مجرم ہیں۔ میں بھی حوالات میں پہنچ گیا جہاں میرے جیسے سب ہی اپنی بے گناہی کا رونا رو رہے تھے۔ اب میری شامت اعمال کہ ان میں وہ فوٹو شاپ والا بھی موجود تھا۔ میں تو اسے نہیں پہچان سکا مگر اس نے مجھے پہچان لیا اور کلثوم کے باپ کو فون بھی کر دیا۔ وہ آیا اور اس نے اپنے بندے کو تو چھڑا لیا اور مجھے تاڑ لیا۔ رات بھر میں ان کی آزادی کا سودا ہوتا رہا جن کے والی وارث آزادی کی قیمت دے سکتے تھے۔ جو گئے چنے لاوارث بد قسمت رہ گئے، ان میں ایک میں بھی تھا۔ حوالات میں چند لوگ بیٹھے تھے، کچھ مجرم اور کچھ ناکردہ گناہ کے ہی روز شہر میں ڈکیتی کی ایک واردات ہوئی تھی جسے پولیس نے ناکام بنا دیا تھا۔ ڈاکوؤں کے دو ساتھی تو مارے گئے تھے اور ایک زخمی ہوا تھا جسے خود پبلک اسٹاف نے پکڑ

تھا کہ میں نے اپنے بھائی کو بتایا ہوگا۔ کلثوم کو لے کر میں دبی ہی جاتا۔ اگر میں نے یہ بک دیا کہ مجھے کلثوم کے باپ نے محبت کے جرم کی سزا دلوائی ہے تو اس کی بدنامی بہر حال ہو گی۔ خواہ وہ مجھے مراد دے۔ مجھے یہ یقین بھی دلایا گیا کہ میری خاموشی کلثوم کی جان بچا سکتی ہے اور میں نے صرف اس لیے خاموشی اختیار کی اور ڈکیتی کا اعتراف کر لیا۔ مجھے کیا پتا تھا کہ بعد میں میری احمقانہ خاموشی سے کلثوم کو فائدہ نہیں ہوگا۔ بد قسمتی سے اس دن آپریشن منجر جو اسپتال میں زیر علاج تھا، مر گیا۔ اب مجھے پتا ہی نہیں چلا اور ڈکیتی میں قتل کی فرد جرم بھی شامل ہو گئی۔

”بس اس کے بعد سب بدل گیا۔ جو ایف آئی آر درج ہوئی اس کے واقعات اخبارات کی کہانی بن گئے۔“
”مجھے سر پر کپڑا ڈال کے عدالت میں پیش کیا گیا تو جج نے نظر اٹھا کے بھی نہیں دیکھا۔ یہ تک نہیں پوچھا کہ ڈکیتی کی واردات میں گرفتار ہونے والا ڈاکو تو زخمی تھا۔ یہ تو دونوں ٹانگوں پر سیدھا چل کے آیا ہے۔“

قصہ مختصر، سیشن کورٹ میں میرے خلاف جو مقدمات پیش ہوئے، اس میں مجھے عادی مجرم بتایا گیا جو پہلے سے فلاں فلاں وارداتوں میں مطلوب تھا۔ ان میں اقدام قتل، ڈکیتی اور اغوا برائے تاوان جیسے جرائم بھی شامل تھے۔ اس کے بعد مجھے جوڈیشل ریمانڈ پر جیل بھیج دیا گیا۔ اس وقت تک میرے ذہن میں جو شکوک تھے، وہ سب رفع ہو چکے تھے۔ مجھے کلثوم کے باپ کے ایما پر اس شے میں سزائے موت دی جا رہی تھی کہ مجھ پر اس کی بیٹی کو ورغلائے کا الزام تھا۔ میں نے ٹیوٹر ہونے کا ناجائز فائدہ اٹھایا تھا۔ یہ کہانی بھی عام نہیں کی گئی تھی کیونکہ اس سے ایک عزت دار آدمی کی حیثیت پر حرف آتا تھا۔ تاہم کسی نہ کسی طرح اس کی بھنک کلثوم کے شوہر کے کانوں میں بھی پڑی۔ تھا وہ بھی اسی فرعونی نظام کا حصہ۔ اس نے کلثوم سے پوچھا۔ شک یا افواہ بے سبب نہیں ہوتی۔ دھواں وہیں سے اٹھتا ہے جہاں آگ ہو۔ کلثوم کی صفائی یا تردید کیا معنی رکھتی تھی۔ کاری قرار دے کر اسے بھی زیر خاک سلا دیا گیا۔ اسی پر بس نہیں۔ یہ خبر مجھ تک پہنچائی گئی تا کہ مجھے اذیت یا عبرت ہو اور یہ بھی پتا چلے کہ میرا جرم کتنا سنگین اور ناقابل معافی تھا۔

”پہلے کلثوم کی بدنامی کے خیال نے مجھے لب نہ کھولنے پر مجبور کیے رکھا تھا۔ بعد میں یہ مجبوری نہ رہی، تب بھی فرق نہ پڑا۔ میں چلا چلا کے حقیقت کا ڈھنڈورا پیٹتا تو جیل کی دیواروں کے سوا کون سنا۔ الٹا یہ ہوتا کہ سزائے

کے پولیس کے حوالے کر دیا تھا۔ وہ بھی حوالات میں آرام کر رہا تھا۔ پولیس نے اس کی مرہم پٹی کرادی تھی اور وہ مزے سے کھا پنی بھی رہا تھا۔ کلثوم کے باپ کے کہنے پر میرے خلاف جو پرچہ کاٹا گیا، اس میں مجھے ان ڈاکوؤں کا ساتھی بنادیا گیا اور لکھا یہ گیا کہ میری نشاندہی اس زخمی ڈاکو نے تفتیش کے دوران کی اور اپنے دیگر ساتھیوں کے نام بتائے۔ اب تک میں نے صرف سنا تھا پھر دیکھا اور بھگتا کہ پولیس کیسے کیس بناتی اور بگاڑتی ہے۔ پولیس نے ڈاکوؤں کے ساتھ مل کے بڑی اچھی کہانی بنائی اور مجھے بھی بینک ڈکیتی میں مجرم ثابت کر دیا۔“

”اگلے دن مجھے نیم مردہ حالت میں اٹھا کے انچارج کے کمرے میں پہنچا دیا گیا اور وہاں میں نے کلثوم کے باپ کو دیکھا۔ اس نے کہا کہ ہاں یہی بندہ ہے اور مجھ سے میرا نام بھی پوچھا۔ میں نے اپنا اصل نام بتا دیا۔ اس کے جانے کے بعد انچارج نے افسوس سے سر ہلایا۔“

”اوئے تو نے اس کی کڑی پھنسی کی تھی؟“
میں نے کہا۔ ”جناب! مجھے محبت تھی اس سے۔“
”اوئے تو اسے بھگا کے لے جانا چاہتا تھا۔ دیکھ... ساری اسٹوری مجھے بتا دے سچ سچ۔ شاید میں تیری جان بچا لوں ورنہ یہ ناممکن ہے۔ یہ عزت دار بندہ ہے۔ ایسی باتیں تیری زبان سے نکلنا اس کے لیے بڑے شرم کی بات ہوگی اور اب تو وہ لڑکی بھی شادی شدہ ہے۔ اس کا شوہر پہلے اسے مارے گا پھر تجھے مارنے آجائے گا۔ ادھر حوالات میں ہی گولی مار کے چلا جائے گا۔“

”میں اس کے ہمدردانہ لہجے سے متاثر ہو گیا اور میں نے اسے اول تا آخر سب سچ بتا دیا۔ یہ بھی کہ کب کلثوم نے مجھے کتنے پیسے دیے تھے اور کتنا زیور میں نے کس کے ہاتھ بیچا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ میں اعتراف جرم نہیں کر رہا، اپنے ڈیڑھ وارنٹ پر سائن کر رہا ہوں۔ میں جب حوالات پہنچایا گیا تو اس ڈاکو نے میری ساری بات سنی اور بہت افسوس کا اظہار کیا کہ یا تو بڑا بے وقوف ہے۔ مرنا تو ہے تجھے... یہ سب بتانے کی کیا ضرورت تھی۔ اب تو اپنی کلثوم کی زندگی بھی خطرے میں ڈال دی ہے تو نے... مشکل ہے کہ وہ بچے... بعد میں ایسا ہی ہوا۔ کلثوم کو اس کے شوہر نے شادی کے چھ ماہ بعد قتل کر دیا۔ بعد میں تھانے دار نے مجھ سے ایک معاہدہ کیا کہ میں کلثوم والا معاملہ دوبارہ اپنی زبان پر نہ لاؤں اور ڈکیتی کے جرم میں اعتراف کر لوں تو تین سال کی جیل پر بات ٹل جائے گی۔ دراصل کلثوم کے باپ کو خطرہ

موت کے فیصلے سے قبل ہی موت آ جاتی۔

”پھر اچانک وہ ہوا جسے میں معجزہ ہی کہوں گا۔ جیل میں ڈاکو بھی تھے جن کا تعلق کسی ایک گروہ سے تھا۔ ان کے سردار کا نام بھی عجیب تھا... گامارستم۔ گاما تو غلام محمد سے بگڑ کے بنا تھا، رستم خوانخواہ ساتھ لگا لیا۔ نوان ون۔ انہیں چھڑا کے لے جانے کے معاملات پر جیل انتظامیہ سے مذاکرات جاری تھے۔ تمام شرائط طے ہو گئیں تو ایک رات ڈاکوؤں کے گروہ نے جیل پر حملہ کیا۔ اسکرپٹ کے مطابق حفاظتی عملے نے مزاحمت کی مگر وہ دیوار توڑ کے اندر آئے اور اپنے تمام ساتھیوں کو نکال لے گئے۔ اندر سب کو معلوم تھا چنانچہ بہت سے قیدیوں نے ڈاکوؤں کی منت سماجت کر کے اپنے لیے بھی بات کر لی تھی۔ اندر والے سب جانتے ہیں کہ مجرم کون ہے اور بے گناہ کون۔ گامارستم نے بھی ایک فہرست بنائی تھی کہ ان کی آزادی کی خوشی میں اور کون کون سے بے گناہ رہا کیے جائیں گے۔ ان سب کی ہتھکڑی اور کوٹھریوں کے تالے کھول دیے گئے تھے یا توڑ دیے گئے تھے۔ ڈاکوؤں کے ساتھ وہ بھی فرار ہوئے... میرا نام بھی اس فہرست میں شامل تھا۔ جب اصل لوگ طے شدہ پروگرام کے مطابق شمال کی طرف فرار ہوئے تو سیدھا یا جنوب کی طرف بھاگنے والوں پر فائرنگ کی گئی اور کافی لوگ مارے گئے یا پکڑے گئے۔ تاہم میں شمال کی طرف ہی نکلا تھا۔ تم بھی ادھر ہی نکلے ہو گے چودھری فرید الدین۔“

☆☆☆

جب وہ خاموش ہوا تو میں نے اقرار میں سر ہلایا۔
”میں گامارستم کے ساتھ تھا۔“

اس نے کہا۔ ”پھر تمہیں معلوم ہو گا کہ اب وہ کہاں ہے؟“

”نہیں، لیکن تم ایسی بے خوفی سے اس کمپنی میں ملازمت کر رہے ہو۔ آخر تم نے اپنی شناخت کسے بدلی؟“
”یہ آج کل کیا مشکل ہے۔ ایک تو یہ دیکھو۔“ اس نے سر کے اوپر سے وگ ہٹا دی۔

میں نے حیرانی سے اس کے اصل بالوں کو دیکھا جو براؤن تھے اور گھنگرا لے... وگ میں سیدھے گہرے سیاہ بال تھے جن میں درمیان سے مانگ نکلی ہوئی تھی۔ ”ہاں، یہ تو آسان کام ہے۔“

اس نے آنکھوں پر سے کنٹیکٹ لینس اتارے۔ اس کی عام سیاہ آنکھیں نیچے سے ”بلی آنکھیں تھیں۔“
”میں یہ نہ کرتا تو پہچان سے کیسے بچتا۔ لیکن میں نے

اور بھی بہت کچھ کیا۔ ایک تو یہ بیوٹی سیلون بہت مدد کرتے ہیں۔ پھر میک اپ آرٹسٹ جوئی وی کے ڈراموں میں جوان کو بوڑھا اور بوڑھے کو جوان کرتے ہیں۔ میں بہت گورا تھا۔ اب کافی سانولا بن چکا ہوں۔ میری ناک کے پاس ایک مسابہت نمایاں تھا۔ وہ جلا دیا گیا ہے۔ ایسے کہ نشان تک باقی نہیں۔ وہ میری شناخت کی علامت لکھا جاتا تھا۔ ادھر ادھر کام کرنے کے بعد مجھے اس کمپنی میں موقع ملا۔ کام تو مجھے آتا تھا مگر میرے پاس ڈگری نہیں تھی۔ جو بھی اس پر نام اصل لکھا ہوا تھا۔ میں نے ایک جعل ساز کا معلوم کیا جو دستاویزات بنانے اور بدلنے کا ماہر تھا۔ وہ ڈگری تو نہیں بنا سکتا تھا مگر اس نے کمال مہارت سے اس پر میرا نام اور ولدیت بدل دی۔ ڈگری پر تصویر تو ہوتی نہیں۔ رول نمبر میں نے فرسٹ کلاس میں پاس ہونے والے کا معلوم کیا تھا، اس کا نام سعادت یار خان تھا۔ میں نے ڈگری پر یہی لکھوایا اور بس... اب میں سعادت یار خان ہوں۔ کمپنی والے زیادہ سے زیادہ ڈگری کی تصدیق کراتے تو جواب میرے حق میں آتا کہ ہاں ڈگری اصل ہے لیکن کمپنی کو اس کی ضرورت نہیں محسوس ہوئی۔ انٹر دیو لینے والوں نے میری لیاقت کا اندازہ کر لیا تھا۔ باقی میں نے اپنے کام سے ثابت کر دیا۔ پرومیشن پیریڈ تین مہینے کا تھا۔ اب میں کنفرم ہوں اور محفوظ بھی۔ لیکن چودھری فرید الدین...“

”بار بار یہ نام مت لو۔ کسی روز بلا ارادہ تمہاری زبان پر آ جائے گا۔“ میں نے حلقی سے کہا۔ ”اور مجھے یہ بتاؤ کہ آخر تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟“
”میں... کچھ نہیں چاہتا۔“

”پھر میرا اعتراف جرم حاصل کرنے کا مقصد... تم بلیک میل کرو گے مجھے... راز کو راز رکھنے کی قیمت طلب کرو گے؟“

”تم مجھے بے عزت کر رہے ہو۔ کیا میں ایسا آدمی ہوں؟“ وہ حلقی اور رنجیدگی سے بولا۔

”آدمی ایسا ویسا کچھ نہیں ہوتا۔ حالات جو بناتے ہیں، بن جاتا ہے اور حالات کے ساتھ بدلتا رہتا ہے۔“

”میں بتا چکا ہوں کہ پیسے کا لالچ ہوتا تو میں لاکھوں سمیٹ کر غائب ہو جاتا۔ زندگی کو داؤ پر نہ لگاتا۔“ وہ گرم ہو گیا۔ ”اور ایسے الزامات تو میں تم پر بھی لگا سکتا ہوں۔ تم کیا کر رہے ہو یہاں اور کیوں کر رہے ہو؟ اپنی حقیقت پر ایک پردہ ڈال کے فائدہ اٹھا رہے ہو یا نہیں؟ تمہاری حقیقت جاننے سے پہلے تو میں نے اپنے بارے میں سب بتا دیا۔“

کچھ بندوبست... تمہیں سونے کی جلدی تو نہیں ہے؟“
”اب نہیں رہی... تمہاری کہانی سن کے ہی جاؤں گا۔“

میں نے اسے اپنے بارے میں اتنا ہی سچ بتایا جتنا اس نے بولا تھا۔ نورین کے بعد ریشم... پھر انور علی اور اب سعدی۔ ان سب کے سامنے میں اپنی عمر رفتہ کی کتاب کا ہر صفحہ کھول کے رکھ چکا تھا۔ راز کو ایسے راز رکھتا کہ خود اپنے سوا کسی پر ظاہر نہ ہو، اسی صورت میں ممکن تھا کہ میں ان چاروں کے سامنے جھوٹ بولتا۔ الگ الگ چار کہانیاں نہ سنی... ایک کہانی بنا لیتا جو دہراتا رہتا مگر مجھے معلوم تھا کہ جھوٹ بولنے والے کو یاد نہیں رہتا کہ اس نے پہلے کب کہاں کیا کہا تھا اور کیوں... آپ جیتی تو دماغ میں یوں محفوظ رہتی ہے جیسے ریکارڈ کی ہوئی آواز...۔

ریشم آئی اور ایک نظر مجھ پر اور میرے مہمان پر ڈال کے لوٹ گئی۔ اس کی نظر میں نہ کوئی سوال تھا نہ شک۔ اگر ہم باتیں کر رہے تھے تو نہ حیرانی کی بات تھی نہ پریشانی کی۔ کام کی بات کے علاوہ بھی باتیں تو بہت ہوتی ہیں اگر کرنے والا مل جائے۔ میں نے بھی اپنی ساری کہانی سنا دی۔ حقیقت کے بارے میں کہتے ہیں کہ فسانے سے زیادہ دل پر اثر کرتی ہے تو یہ بھی حقیقت ہے۔

”سوری، تم نے اگر کلثوم سے محبت کی تھی تو کوئی جرم نہیں کیا تھا۔ جرم تھا تمہارا غریب ہونا۔“

اس نے اعتراف میں سر ہلایا۔ ”ہمارے ملک میں ایسا ہی ہے۔ انسان کوئی جرم نہ کرے تب بھی وہ پیدائشی طور پر مجرم ہوتا ہے۔ وہ غریب گھر میں کیوں پیدا ہوا، کم ذات کیوں تھا، مسلمان کے گھر پیدا ہوا تو اکثریت رکھنے والے فرقے سے تعلق کیوں نہیں تھا۔ باپ کا خاندانی عقیدہ بیٹے کے لیے جرم بن جاتا ہے اور ایسے بد نصیب بھی ہوتے ہیں جو اس جرم کا کفارہ جان دے کر ادا کرتے ہیں۔ انسان کی شرافت، علم، ہنر، صلاحیت، اس کا عظیم شاعر یا موسیقار یہاں تک کہ سائنس داں ہونا بھی بیکار... اس کا جرم اپنی جگہ رہتا ہے۔“

”تم الیکٹریکل انجینئر سے زیادہ فلسفی ہو۔ مجھے بتاؤ کیا تمہارا خون اتنا سرد ہے۔ تمہارے دل میں انتقام کی آگ ہی نہیں ہے۔ تم اسے کوئی سزا نہیں دینا چاہتے جس نے تمہاری زندگی برباد کی، تمہیں مجرم بنا دیا۔ اس لڑکی کو بے گناہ مار دیا جس سے تم محبت کرتے تھے اور تمہیں یہ زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا جس میں تم چہرے، نام اور شناخت

تمہارے پوچھے بغیر ہی... ورنہ کیا ضرورت تھی مجھے... یہاں آ کے اعتراف کرنے کی۔“

مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ ”آئی ایم سوری... میں اپنی غلطی مانتا ہوں۔ مجھے ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا۔“
اس نے ایک گہری سانس لی۔ ”ہم تو ایک ہی کشتی کے سوار ہیں ملک سلیم اختر... ایک ساتھ ڈوبیں گے۔ اچھا ہے ایک دوسرے کا پردہ رکھیں اور برانہ چاہیں۔ اچھا اب میں چلتا ہوں۔“

میں نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ ”ابھی تو رات کے بارہ ہی بجے ہیں۔ یہاں گاؤں میں وقت کی رفتار کتنی کم ہو جاتی ہے۔ ٹھہر دو... میں دیکھتا ہوں اس وقت کوئی کافی لا کے دینے والا ہے یا نہیں۔“

میں نے برآمدے میں آ کے دیکھا تو محافظ دونوں برآمدوں کے سنگم پر اسٹول لیے بیٹھا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کے کھڑا ہو گیا۔ پھر مجھے درمیانی حصے میں ایک سایہ متحرک نظر آیا۔ میں نے نور سے دیکھا تو یہ ریشم کے کمرے کا دروازہ تھا۔ کوئی ابھی ابھی باہر سے اندر گیا تھا۔ کمرے کا دروازہ کھلا ہو گا لیکن اندر سے روشنی باہر نہیں آئی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ لائٹ آف تھی۔ گاڑ سے کچھ کہنے کے بجائے میں نے صحن کو توجہ مبذول کیا اور برآمدے میں عین اسی دروازے پر پہنچ کے انگلی سے دستک دی۔ اندر سے فوراً ریشم کی سہمی ہوئی آواز آئی... ”کون؟“

میں نے آہستہ سے کہا۔ ”میں دیکھنے آیا تھا کہ تم سو رہی ہو یا جاگ رہی ہو؟“

اس نے دروازہ کھولا اور مجھے دیکھا۔ ”اب سچ بھی بتا دو۔“

”ایک درخواست لے کر آیا تھا منظوری کے لیے... اچانک مجھے کافی کی اشد ضرورت پڑ گئی ہے۔“

وہ مسکرائی۔ ”آخر تم جاگ کیوں رہے تھے؟“

”دیکھو، میں نے تو نہیں پوچھا تم سے کچھ بھی۔ محبت میں شبِ فراق ایسے ہی گزاری جاتی ہے، ابھی مجھے تارے بھی گننے ہیں۔“

”اچھا اچھا... جاؤ میں لاتی ہوں۔ خود ہی سب کرنا پڑے گا، کسی کو جگاؤں گی نہیں میں۔“

”اللہ تمہیں اس نیکی کا اجر دے گا۔“ میں نے کہا۔ ”تمہیں تمہارے خوابوں کا شہزادہ ملے گا... اور میرا گھر میری جنت والا۔“

میں واپس آ کے سعدی کے سامنے بیٹھ گیا۔ ”ہو گیا

بدل کے پھر رہے ہو؟“

کیا... میرا پہلا مجرم وہ ہے۔“

”اور تم اپنے ارادے میں اٹل ہو؟“

”ابھی تک ہوں۔ حالانکہ تقدیر مجھے موقع فراہم کر چکی ہے، زندہ رہنے کا، محبت کرنے کا اور خوشی پر اپنا حق حاصل کرنے کا۔ میرا باپ تو ایک غریب اور شریف آدمی تھا جس نے ہماری تربیت مذہب اور انسانیت کے ان اصولوں کے مطابق کی تھی جن پر وہ خود بھی کاربند رہا۔“

بات کرتے کرتے اچانک میری نظر کھلے دروازے سے باہر گئی تو مجھے اندھیرے میں کوئی متحرک نظر آیا۔ وہ بڑی تیزی سے صحن کو عبور کر کے برآمدے میں غائب ہو گیا۔ میرا دماغ چونکا ہوا کے خطرے کی گھنٹی بجانے لگا۔ اس وقت کون ایسے جاسکتا ہے؟ باہر آسمان تاریک تھا۔ شاید چاند کی آخری تاریکی تھیں۔ روشنی برآمدوں میں تھی لیکن وسیع صحن کو روشن کرنے کے لیے ناکافی تھی۔ اس کے باوجود تاریکی ایسی نہیں تھی کہ اس سے کوئی فائدہ اٹھا سکے۔ باہر گیٹ پر گارڈ تھا اور دروازہ بند تھا۔ اندر کے کسی ملازم کو ایسے صحن کو اس کرنے کی کیا ضرورت... میں نے بھی صرف حرکت دیکھی تھی۔ وہ ایک زیادہ سیاہ سایہ تھا جس پر انسان ہونے کا شبہ ہی کیا جاسکتا تھا، جن بھوت ہونے کا نہیں۔ قد و قامت میں وہ انسان کے برابر ہی تھا۔

سعدی نے مجھ سے پوچھا۔ ”کیا ہے باہر؟“

میں نے کہا۔ ”میں ابھی دیکھ کے آتا ہوں۔ میں نے کچھ دیکھا ہے۔“

میں اٹھ کے باہر آیا تو مجھے یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ چاروں طرف کے برآمدوں کے کونے جہاں رات کو محافظ پہلے کھڑے رہتے تھے یا برآمدے میں گشت کرتے تھے اور اب انور کی اجازت سے اسٹول ڈال کے بیٹھے نظر آتے تھے، اپنی جگہ پر موجود نہیں اور وہ دونوں کارنر تاریک پڑے ہیں جہاں رہائشی کمرے تھے، بڑے چودھری صاحب کے اور حویلی کے دوسرے لوگوں کے بیڈ روم تھے۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی میں نے اس کونے کی مدھم روشنی میں محافظ کو بیٹھا دیکھا تھا۔ وہاں اب کوئی نہیں تھا۔

میں اسی طرف گیا اور ابھی چند قدم ہی چلا تھا کہ بلب روشن ہو گیا اور گارڈ بھی نمودار ہو گیا۔ میں نے اس سے پہلا سوال یہی کیا۔ ”کہاں تھے تم؟ اور یہ لائٹ کیوں آف تھی؟“

وہ گھبرا گیا۔ ”سر! میں یہی دیکھنے گیا تھا۔“

”ادھر کیا دیکھنے گئے تھے؟“

وہ کچھ دیر خاموش رہا پھر اس نے کہا۔ ”ملک صاحب! ایک زمانہ تھا جب میرے خون میں انتقام کے شعلے بھڑکتے تھے لیکن اب میں سوچتا ہوں کہ اس سے کیا ہو گا... کیا کٹھوم مجھے واپس مل جائے گی؟ میں انتقام لوں گا تو کس کس سے... مجرم ایک اس کا باپ ہی تو نہیں... اس کا شوہر بھی ہے۔ اس کے غلام اور معاون پولیس کے وہ حکام بھی ہیں جو وردی پہنتے ہیں قانون کی حفاظت کے لیے... مظلوم کمزور کی مدد کے لیے... مگر وہ کرتے کیا ہیں؟ آخر کتنے قتل کروں گا میں... وہ بھی اپنی زندگی کو داؤ پر لگا کے۔ ایک بار تو خدا نے بے گناہ جان کے بچا لیا۔ جب شکر ادا کرنے کے بجائے میں خود مجرم بن جاؤں گا تو اس کے رحم و کرم کا مستحق بھی نہیں رہوں گا اور پھر اس سے فرق بھی کیا پڑے گا؟ تم کہہ سکتے ہو میں بے غیرت یا بزدل ہوں۔“

”کاش میری فطرت بھی تمہاری طرح درگزر کرنے والی ہوتی۔“

”درگزر کرنا مجبوری ہے میری... مجھے زندگی سے پیار ہے۔ میں پیچھے دیکھنے کے بجائے آگے چلنا چاہتا ہوں۔ یہ جانتا ہوں کہ اکیلا چنا بھاڑ نہیں جھونک سکتا۔ وقت جو گزر گیا، واپس نہیں آ سکتا۔“

”تمہاری باتوں نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔ ورنہ اب تک تو مجھے جینے کا مقصد اس کے سوا کچھ اور دکھائی نہیں دیتا تھا کہ میں کسی طرح نادر شاہ کے وجود سے اس دنیا کو پاک کر دوں۔ اس لیے نہیں کہ وہ بہت بڑا بد معاش... انڈر ورلڈ مافیا کنگ یا ڈان ہے۔ ناجائز اور تمام غیر قانونی اور غیر اخلاقی کام کرتا ہے۔ ایسے تو ہزاروں لاکھوں ہیں۔ نیچے سے اوپر تک ہر جگہ موجود ہیں جن کو خدا نے طاقت دی ہے اور ذمے داری کہ ان سے لڑیں، وہ ان کے معاون بنے ہوئے ہیں پھر میں کیا اور میری اوقات کیا کہ دنیا کونہ سہی پاکستان کو ویسا بناؤں جیسا قائد اعظم کہا کرتے تھے۔ اس ملک اور معاشرے کو اسلام کے اخلاقی نظام کا آئینہ دار بناؤں... نہیں... یہ سب تو مجھے ناممکن نظر آتا ہے اب... کم سے کم اپنی زندگی میں... میں تو بس نادر شاہ سے اپنے بھائی کے قتل کا بدلہ لینا چاہتا ہوں۔ اس نے کوئی جرم نہیں کیا تھا مگر اسے مجرم بنا دیا گیا... بے گناہ مار دیا گیا پھر اس کے جرم بے گناہی کی سزا میں مجھے پھانسی کے تختے تک پہنچایا گیا۔ اس نظام سے میں کیا لڑوں گا، میری نظر میں تو وہ قاتل ہے۔ اس نے خود گولی نہیں چلائی تو کیا ہوا اس نظام کو استعمال

دیکھ رہی تھیں باہر؟“

”پہلے تم بتاؤ... تم کیوں کھڑے تھے بھابی کے دروازے پر؟“

”میں نے کہا۔“ مجھے شک ہوا تھا کہ ادھر کوئی آیا ہے۔ جب ذرا سی دیر کے لیے لائٹ آف ہوئی تھی، کسی نے صحن کراس کیا تھا۔“

”سلیم! یہاں کچھ دال میں کالا ہے۔ کل سے دیکھ رہی ہوں میں۔ پہلے تو اپنا وہم سمجھا تھا میں نے مگر مجھے بھی رات کے وقت ایسا لگتا ہے کہ کچھ مشکوک سائے حرکت کرتے ہیں۔ آوازیں سنائی دیتی ہیں کبھی کبھی۔“

”کیسی آوازیں... کہاں سنائی دیتی ہیں؟“

”بھابی کے کمرے میں سے... جیسے سرگوشی میں بات کرنے والا بے دھیانی میں اونچا بولنے لگے پھر خاموش کر دیا جائے۔ مجھے پتا نہیں کیا ہو گیا ہے۔ رات کو نیند نہیں آتی۔ شاید دن میں سوئی رہتی ہوں اس لیے... کل رات پہلے میں نے سوچا کہ تمہیں جگا دوں لیکن انور نکل آیا اور ہم کافی دیر باہر پھرتے رہے۔ باہر کا مطلب ہے حویلی سے باہر... پیچھے ان کا خاندانی قبرستان ہے... وہاں۔“

”آدھی رات کے بعد؟ تمہیں ڈر نہیں لگتا... کیا چیز ہوتی ہے؟ جن بھوت ہوتے ہیں وہاں۔“

”میں خود انہی میں سے ہوں۔“ وہ آہستہ سے ہنسی۔ ”ایک بار انور کو بتایا تھا، وہ کہنے لگا کہ دیکھتے ہیں تمہاری ہمت... وہ مجھے بتاتا رہا اپنے دادا اور دادی... نانا اور نانی کے بارے میں۔“

”آج بھی تم دونوں باغ میں گھوم رہے تھے، اندھیرے میں... خیر وہ بات بتاؤ جس کے لیے تم مجھے جگانا چاہتی تھیں؟“

”اگر اندھیرے میں وہ شرم سے لال ہوئی تھی تو میں دیکھ نہیں سکا۔“ ”یہاں کچھ ہو رہا ہے۔ پتا نہیں بچ کی دیوار ایسی ہے یا میرے ہی کان زیادہ سنتے ہیں۔ اب میں بھابی پر یہ الزام تو لگا نہیں سکتی کہ کوئی ان سے ملنے آتا ہے۔ ابھی اتنے دن بھی نہیں ہوئے اکبر سے جدا ہوئے... ویسے بھی یہ ناممکن ہے یہاں۔“

”پھر کیا شک ہے تمہیں؟“

”تمہیں کیا شک ہوا جب تم نے کسی کو دیکھا تھا؟ میں کہہ سکتی ہوں کہ وہ تمہارا وہم نہیں لیکن کوئی اندر آیا کیسے؟“

”میں دروازے سے باہر نکل گیا۔“ ”میں دیکھتا ہوں۔“

”ادھر فیوز بورڈ ہے سر! کبھی فیوز اڑ جاتا ہے تو کسی ایک حصے میں لائٹ نہیں رہتی۔“

”لائٹ تو کہیں بھی نہیں تھی باہر۔ سب برآمدوں میں اندھیرا تھا۔“

اس نے کہا۔ ”ان کا ایک ہی فیوز ہے سر... ادھر کی لائٹوں کا۔“ اس نے ہاتھ کے اشارے سے واضح کیا۔

”تم نے ابھی کسی کو اندر آتے دیکھا؟“

وہ گھبرا گیا۔ ”کون سر؟ میں نے تو نہیں دیکھا کسی کو۔“

میں اسے چھوڑ کے آگے بڑھ گیا۔ ایک دروازہ ریشم کے بیڈروم کا تھا۔ دوسرا شاہینہ بھابی کا اور تیسرا انور کا۔ میں نے کچھ ذہن پر زور دیا کہ میں نے جو سایہ متحرک دیکھا تھا، وہ برآمدے میں کہاں گیا تھا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ وہ میرا وہم نہیں تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی نے سرتا پاپا اپنے وجود کو سیاہ چادر میں چھپایا اور عین اس وقت جب برآمدے کی لائٹس آف ہوئیں، اس نے صحن عبور کر لیا۔ میری نظر شاہینہ بھابی کے دروازے پر رک گئی۔ میرا اندازہ غلط بھی ہو سکتا تھا لیکن کوئی ادھر آیا تھا تو اس کی ڈائریکشن میں یہی دروازہ تھا۔ اس کے دائیں بائیں کے دونوں دروازے پندرہ فٹ دور تھے۔ میرا اندازہ اتنا غلط نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ سایہ ایک تیر کی طرح خط مستقیم میں گیا تھا۔

ابھی میں تذبذب میں کھڑا تھا کہ کوئی دروازہ خفیف سی چڑچڑاہٹ کے ساتھ کھلا۔ آواز ایسی تھی جیسے پرانے زنگ خوردہ قبضے میں سے نکلتی ہے، اگر اسے تیل دینے کی ضرورت ہو۔ میں چونک پڑا۔ میرے پیچھے ریشم کے کمرے کا دروازہ اب بند تھا مگر مجھے یقین تھا کہ وہ کھولا گیا مگر فوراً بند بھی کر دیا گیا ہوگا اور بند کرتے وقت اس نے چوں بھی نہیں کی ہوگی۔ میں پلٹ کے گیا اور آہستہ سے ایک انگلی سے دروازے کو ٹاک کیا۔ چند سیکنڈ کے توقف کے بعد ریشم کی ڈری بھی آواز نے پوچھا۔ ”کون؟“

میں نے کہا۔ ”بھوت... اس وقت اور کون آ سکتا ہے؟“

اس نے دروازہ کھولا۔ ”تم... اب کیا ہوا ہے؟“ وہ سرگوشی میں بولی۔

میں نے کہا۔ ”ابھی تک تو کچھ بھی نہیں ہوا۔ ابھی تم نے دروازے سے جھانکا تھا؟“

”ہاں، اندھیرے میں اندازہ نہیں ہوا کہ تم ہو۔ اندر آ جاؤ۔“ اس نے ہاتھ پکڑ کے مجھے اندر کھینچ لیا۔

میں نے دروازہ اپنے پیچھے بند کر کے پوچھا۔ ”تم کیا

مجھے سعادت کا خیال تھا کہ وہ میرے انتظار میں ہوگا لیکن وہ کمرے میں نہیں تھا۔ مجھے واپس آنے میں دس منٹ سے زیادہ ہی لگ گئے تھے اور شاید وہ تھکن اور نیند سے مغلوب تھا۔ اس نے سارا دن جو محنت کی تھی، وہ جسمانی تھی۔ پھر اسے یقین ہی نہیں ہوگا کہ میں کتنی دیر میں واپس آتا ہوں۔ یہ ایک طرح سے اچھا ہی ہوا۔ میں بھی اب سونا ہی چاہتا تھا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ ایک نظر گیٹ پر ڈال لوں۔ اگر واقعی کوئی اندر آیا تھا تو وہ گیٹ سے ہی گزرا ہوگا اور گیٹ پر گارڈ نے کچھ نہیں دیکھا ہوگا تو پھر میں سمجھوں گا کہ وہ میری نظر کا دھوکا دیا پھر جھوٹ تھا۔

گیٹ رات کو بند رہتا تھا۔ باہر سے آنے والے کو پہلے گارڈ سے قفل کھلوانا ضروری تھا مگر اندر سے کوئی باہر جانا چاہے تو اس کے لیے بڑے پھانک میں ایک کھڑکی اتنی بڑی تھی کہ اس میں سے سر کو جھکا کے گزرا جاسکتا تھا۔ میں نے اس کھڑکی کو کھلا دیکھا تو میرا ہاتھ ٹھنکا۔ اگر کبھی رات کو حویلی کے اندر سے کوئی یہ کھڑکی کھول کے نکلتا تھا تو گارڈ قفل کھول کے اندر آتا تھا اور کھڑکی بند کر کے گیٹ سے باہر چلا جاتا تھا اور پھر تالا لگا دیتا تھا۔ میں نے کھڑکی سے باہر جا کے دیکھا۔ گارڈ کرسی پر سر جھکائے بیٹھا ہوا محو خواب تھا۔ اس کی رائفل دونوں ٹانگوں کے بیچ میں دبی ہوئی تھی اور اس کی نوزل گارڈ کے پیٹ میں کھب رہی تھی۔

گارڈ کا یوں سو جانا کوتاہی اور غفلت میں آتا تھا اور جرم تھا لیکن وہ بہر حال انسان تھا۔ خدا نے رات سونے کے لیے بنائی ہے مگر وہ نوکری کی وجہ سے رات جاگ کر کاٹنے پر مجبور تھا۔ گارڈ کو کرسی فراہم نہ کرنا ویسے تو زیادتی لگتا ہے لیکن انہیں بیٹھنے دیا جائے تو وہ انسانی کمزوری کا شکار ہو کے اونگھ جاتے ہیں۔ قریب جا کے میں نے اسے آہستہ سے کندھا پکڑ کے ہلایا۔

”گارڈ... ایسے ڈیوٹی دیتے ہو تم؟“

عموماً ایک آواز پر گارڈ ہڑبڑا کر اٹھ کھڑے ہوتے تھے اور معافی مانگنے لگتے تھے یا طبیعت اچانک ناساز ہونے کا عذر پیش کرتے تھے مگر یہ گارڈ ٹس سے مس نہ ہوا۔ دوسری بار میں نے زیادہ برہمی سے اس کا شانہ ہلایا۔ ”اتنی گہری نیند...“ مگر اس سے آگے بولنے کا مجھے موقع نہ ملا۔ گارڈ بیٹھے بیٹھے ایک طرف کو جھکا اور کرسی الٹی تو فرش خاک پر سجدہ ریز ہو کے ساکت ہو گیا۔ اس کی رائفل اس کے اوپر گری۔ میں بے اختیار دو قدم پیچھے ہٹا اور پھر گارڈ کے قریب گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ میرا دل گواہی دیتا تھا کہ یہ بے

ہوشی نہیں خواب ابد ہے۔ وہ زندہ نہیں ہے لیکن تصدیق کے لیے میں نے اس کا ایک ہاتھ تھام کے نبض کو محسوس کرنے کی کوشش کی۔ نبض کی حرکت مفقود تھی۔ روایتی طریقے پر میں نے سانس کی آمد و رفت کو چیک کرنے کے لیے اس کی ناک کے نیچے پھیلی کوالٹا رکھا۔ مجھے کسی حرارت یا نمی کا احساس نہیں ہوا۔ اس کی ایک جیب سے ٹارچ باہر جھانکنے لگی تھی۔ میں نے ٹارچ روشن کر کے اس کی ایک آنکھ کے پوٹے کو اٹھا کے دیکھا۔ نیچے آنکھ کی پتلی ساکت تھی۔ اس کا جسم ابھی گرم تھا اور زندگی سے محروم بدن کی طرح سخت ہو کے اکڑا نہیں تھا۔ اس کا مطلب اس کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتا تھا کہ اسے مرے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ اس کے جسم پر کہیں خون یا زخم نہ تھا۔ اصل اسباب کا تعین اب پوسٹ مارٹم رپورٹ ہی کر سکتی تھی۔

میں اٹھا تو ٹارچ کی روشنی کے دائرے میں مجھے کرسی کے دوسری طرف ایک کپ پرچ نظر آئے۔ میں نے اس پر روشنی ڈالی۔ کپ کی تہ میں تھوڑی سی چائے موجود تھی۔ میں نے کپ کو احتیاط سے ایسے اٹھایا کہ کنڈے پر فنکر پر ٹپس ہوں تو محفوظ رہیں۔ پھر میں لوٹ کے اندر گیا اور انور کے دروازے پر دستک دی۔ دوسری دستک کے بعد وہ آنکھیں ملتا ہوا نمودار ہوا۔ ”سلیم! کیا ہوا؟ خیریت ہے؟“

میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ”نہیں... خیریت بالکل نہیں ہے... تو ذرا منہ پر پانی کا چھینٹا مار کے آ۔“

”یار! کچھ بتا تو سہی۔“ وہ بولا۔

میں نے کہا۔ ”بتانا نہیں، میں کچھ دکھانا چاہتا ہوں... فنانٹ آجا۔“

وہ دو منٹ میں پھر نمودار ہوا اور میرے ساتھ چل پڑا۔ میں نے خاموشی سے اسے گیٹ پر پڑی ہوئی گارڈ کی لاش دکھادی۔ اس کا رد عمل بھی شاک کا تھا۔ ”اومائی گاڈ... اسے کیا ہوا ہے؟“ وہ بولا۔

میں نے کہا۔ ”یہ مر چکا ہے... بلکہ مار دیا گیا ہے۔ تو پہلے اس کی لاش اٹھوا... پھر میں تجھے کچھ اور بھی بتاتا ہوں۔“

دس منٹ بعد وہ میرے کمرے میں بیٹھا تھا۔ میں نے اسے وہ بتا دیا جو دیکھا تھا اور وہ بھی جو ریشم سے سنا تھا۔ وہ پریشانی اور تشویش زدہ کرسی کے بازو پر انگلیاں چلاتا رہا۔ ”میرا بھی خیال ہے کہ اسے چائے میں زہر دیا گیا اور زہر دینے والا وہی تھا جو کالے سراپا میں اندر محسن سے گزرا۔“

تین لفافے

ایک بڑی کمپنی میں سیلز کے شعبے میں نیا چیف مقرر کیا گیا۔ چارج لینے کے بعد جانے والے چیف نے اس سے علیحدگی میں ملاقات کی اور اسے تین مہر بند لفافے دیے جن پر ایک سے تین تک نمبر پڑے ہوئے تھے۔

اس نے کہا۔ ”سیلز کے شعبے میں اکثر کڑا وقت آتا رہتا ہے۔ جب بھی تم مشکلات سے دوچار ہو، تو ترتیب وار ان لفافوں کو کھولنا، ان میں میرے تجربات کا انچوڑ ہے۔“

چھ ماہ خوب گزرے پھر کاروبار یکا یک مندا ہونے لگا۔ نئے چیف نے پہلا لفافہ کھولا۔ اس میں لکھا تھا۔ ”اس مندی کا سارا الزام اپنے پیش رو پر ڈال کر سرخ رو رہو۔“

اس نے یہی کیا بلکہ ایک پریس کانفرنس بھی کر ڈالی۔ کام تیزی سے چل نکلا۔ مالکان اس سے خوش ہو گئے۔

ڈیڑھ سال بعد پھر مندی کا حملہ ہوا۔ وہ پچھلے تجربے سے خوش تھا۔ اس نے دو نمبر والا لفافہ کھولا۔ اس میں ہدایت تھی۔ ”کچھ پرانے لوگوں کو نکالو، نیا اسٹاف بھرتی کرو۔“

یہ تدبیر بھی کارگر رہی۔ تین برس بعد مندی کا تیسرا حملہ ہوا تو اس نے بڑی امید سے لفافہ نمبر تین کھولا تو یہ تحریر اس کا منہ چڑا رہی تھی۔ ”اپنے جانشین کے لیے ایسے ہی تین لفافے تیار کرلو۔ یہاں تمہارا وقت پورا ہو چکا ہے۔ سیلز میں کوئی زیادہ دیر نہیں ٹک سکتا کیونکہ مالکان کا پیٹ کبھی نہیں بھرتا۔“

(بنگلہ دیش سے عائشہ خرم کا تجزیہ)

کے بارے میں دیے گی؟ یہ پاکستان ہے بیٹے... تو دلایت میں نہیں ہے۔ اگر تو نے بھروسہ کیا تو میں پہلے ہی بتا دیتا ہوں کہ رپورٹ میں کیا لکھا جائے گا... چائے میں کچھ نہیں تھا۔“

”تھینک یو یار! تو نے مجھے خبردار کر دیا۔ مجھے ان معاملات کا زیادہ پتا نہیں۔“

”اور مجھے دوسروں سے کہیں زیادہ ہے۔“

اس کے بعد جو ہوا معمول کی کارروائی تھی۔ پولیس کئی کھنٹے بعد آئی۔ اتنی دیر گارڈ کی لاش اسی طرح پڑی رہی۔ بڑے چودھری صاحب کا بلڈ پریشر بڑھ گیا، بھابی سخت فکر مند نظر آتی رہی۔ میڈیکل کمپنی والے تمام معاملات سے بے نیاز اپنا کام کرتے ہوئے گیارہ بجے کے قریب ضابطے

”اور بھابی کے کمرے کی طرف گیا۔“

”ابھی ایسا مت بول۔ یہ قتل سے زیادہ سنگین الزام بن جائے گا۔ گڑبڑ تو یقیناً ہے کہیں... یہ صرف میرا وہم نہیں۔“

”گڑبڑ کیسی؟“

”اس کا امکان تو ایک فیصد بھی نہیں کہ... کوئی بھابی سے ملنے آتا ہو۔ انہیں واقعی اپنے شوہر سے بہت محبت ہے۔“

”شادی کے بعد یہ محبت ان کا فرض ہے یا مجبوری ہے۔“ میں نے کہا۔

”شادی سے پہلے بھی ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ اس کے اور ہمارے گھروں میں اس وقت اس محبت کا کوئی تصور نہیں جو فلموں یا ناولوں میں ہوتی ہے۔“

”شادی سے پہلے اپنے منگیترا یا نامزد شوہر سے تو ہو سکتی ہے۔ نامزدگی پہلے تیری ہوئی تھی، سینیارٹی کی وجہ سے... پھر اکبر نے تیری جگہ لے لی۔ بھابی نے اپنی محبت کو سوچ اور تو کیا ہوگا۔ جیسے بجلی کو ایک فیر سے دوسرے فیر پر سوچ کرتے ہیں۔“

وہ کچھ دیر مجھے دیکھتا رہا پھر اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ ”ہاں، ایسا ہوا تھا۔ لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ شوہر سے محبت کے فرض کو نبھا رہی ہیں۔ ہر عورت نبھاتی ہے۔ میرے لیے اب ان کے دل میں صرف نفرت ہو سکتی ہے مگر اس کا نشانہ گارڈ کیوں بنے گا؟“

”اس کا نشانہ تو ہی بنے گا۔“ میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

اس نے کچھ دیر بعد کہا۔ ”تیرے کہنے کا مطلب ہے...“

”میرا بالکل وہی مطلب ہے جو تو سمجھا۔ محتاط ہو جا۔ یہ ناممکن نہیں ہے کہ بھابی اپنے التفات سے ڈبل گیم کھیلے۔ مجھ سے شوہر کے لیے مراعات بھی حاصل کرے اور اسے دوبارہ تخت پر بٹھا دے بعد میں یا اس سے پہلے ہی... اس مرتبہ تجھے ہرگز یہ امید نہیں رکھنی چاہیے کہ صرف قیدی بدلے جائیں گے۔ جو ایک بار سانپ کے ڈسنے سے فک جائے، وہ سانپ کو دوسرا چانس دینے کا رسک نہیں لیتا۔ نہ بھابی اتنی بے وقوف ہے اور نہ اس کا شوہر۔“

”یو آر رائٹ۔“ انور علی نے اعتراف کیا۔ ”اس چائے کی پیالی کو تالے میں رکھ۔ جب پولیس آئے گی تو لے جائے گی۔“

”اور میڈیکل رپورٹ اسی کپ میں بچی ہوئی چائے

کی کارروائی مکمل ہونے کے بعد حالات ایسے نارمل نظر آنے لگے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ انور علی بھی اسی شک کا اظہار کرتا رہا کہ قتل گارڈ کی ذاتی دشمنی کا شاخسانہ تھا۔ یہ یہاں عام بات تھی۔ اس کی جگہ دوسرے گارڈ نے لے لی۔ یہ بھی عام سی بات تھی۔

جب سعادت سے میری ملاقات ہوئی تو وہ بڑی تندہی سے مشینری انشال کرانے میں لگا ہوا تھا۔ یہ مشینری کچھ دیر پہلے ہی ان کے ایک ٹرک سے اتاری گئی تھی۔ دوپہر سے کچھ پہلے بڑی بھابی شاہینہ خود مجھ سے ملنے آئی۔ ”تمہیں کچھ معلوم ہے یہ انور بھائی کہاں غائب ہو گئے ہیں؟“

”ابھی کچھ دیر پہلے تو وہ میرے ساتھ تھے۔“
”تم ان کے دوست اور مشیر اعلیٰ ہو... انہیں کچھ سمجھاؤ۔“ وہ شکایتی لہجے میں بولی۔

”وہ خود کافی سمجھ دار ہے اور آپ بھی کوئی بات سمجھائیں گی تو سمجھ لے گا۔“ میں نے کہا۔ ”رہی بات میرے مشیر اعلیٰ ہونے کی تو میں اسے کیا کہوں... آپ کی خوش فہمی یا غلط فہمی۔“

”مجھے ایک بات معلوم ہوئی ہے۔ وہ حویلی کے سارے سیکورٹی گارڈز کو تبدیل کر رہا ہے۔ آخر کیوں؟“

”میں کیا بتاؤں... اس نے مجھ سے اس معاملے میں کوئی مشورہ تو کیا، بات تک نہیں کی۔ اور یہ ہے بھی ایک انتظامی معاملہ... ممکن ہے کل رات گارڈ کے قتل کے بعد اسے محسوس ہوا ہو کہ سیکورٹی والا عملہ کچھ مستعد نہیں رہا۔ رات کو ڈیوٹی دینے والے کو خود میں نے کئی بار سوتا ہوا دیکھا اور کل اس کا قتل ایک غیر معمولی واقعہ ہے۔“

”میں نے سنا ہے کہ وہ کسی عورت کا چکر تھا۔“
”ہو سکتا ہے... لیکن کل رات جب لائٹ گئی تو سیکورٹی گارڈ غائب تھے۔ یہ میں نے خود دیکھا اور اس وقت مجھے شک ہوا کہ کوئی اندر آیا تھا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ گارڈ کو قتل کر کے اندر پہنچا ہو۔“

شاہینہ کا رنگ متغیر ہوا۔ ”یہ تم نے پولیس کو نہیں بتایا۔“
”میرے پاس کوئی ثبوت نہیں۔ محض شک کی بنا پر میں کیا بیان دیتا؟“

”پرانے لوگ آزمائے ہوئے تھے، پرانے نمک خوار اور وفادار تھے۔ ان کو سختی سے ہدایات دی جاسکتی تھیں۔ اب یہ نئے لوگ نہ جانے کہاں سے آئیں گے۔ ان پر بھروسہ کیا جاسکتا ہے۔“

”وہ بھی ایک پرانا نمک خوار تھا جس نے انور کی جان لینے کی کوشش کی تھی۔ یہ سیدھے سادے مقامی لوگ آج کل کی سیکورٹی کے تقاضے کیا جانیں۔ یہ مزدور کسان تھے۔ بندوقیں دے کر کھڑا کر دیا گیا کہ چوکیداری کرو۔ اگر انور نے ایسا سوچا ہے تو میں اس کے حق میں ہوں۔ اسے مشورہ دوں گا کہ وہ شہر سے کسی پروفیشنل سیکورٹی کمپنی کو کنٹریکٹ دے۔ وہ اپنے ایکو پمنٹ کے ساتھ آئیں گے۔ خاردار تاروں کی باڑھ جس میں کرنٹ ہو... انفراریڈ لائٹ کے الارم... گلوٹرکٹ کیمرے۔“

شاہینہ بے وقوفوں کی طرح میری صورت دیکھتی رہی۔ ”مجھے تو ان چیزوں کا کچھ پتا نہیں... لیکن ایک بات اور تھی۔ آج میرے والد صاحب آرہے تھے۔ انہوں نے کہلوا یا تھا کہ وہ بھائی صاحب سے بھی ملنا چاہتے ہیں مگر بھائی صاحب نے کل رات ہی ضروری کام سے کہیں جانے کا اعلان کر دیا تھا۔ اب یہ کوئی اچھی بات نہیں۔ ہر بار وہ ایسا ہی کرتے ہیں۔“

”ہر بار کیا مطلب؟ سال بھر سے تو وہ نیچے قید تھا۔“
”اس سے پہلے... اور والد صاحب تو ان سے نیچے جا کے بھی ملنا چاہتے تھے لیکن انہوں نے ملنے سے انکار کیا۔“

میں نے کہا۔ ”یہ انور علی کا ذاتی معاملہ ہے... میرا اس میں دخل دینا کسی صورت مناسب نہیں۔“

میں نے محسوس کیا کہ بھابی کچھ پریشان ہے۔ پیر صاحب کے آنے کا غلغلہ ہوا تو میں نے باہر نکل کے دیکھا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ان کا جلوس ایسی شان و شوکت کے ساتھ نمودار ہوگا۔ میرے ذہن میں ان کا تصور بالکل مختلف قائم کیا گیا تھا۔ یوں جیسے وہ ذرا بھی دنیا دار نہیں... نام و نمود سے دور رہنے والے اور دولت و جاگیر سے بے نیاز کوئی صوفی ہیں جو اپنی شان درویشی اور تصوف سے بڑا لگاؤ رکھتے ہیں۔ ان کے ساتھ درجن بھر مرید تھے۔ ان میں دو ذاتی محافظ تھے۔ وہ دونوں اندر تک آئے۔ باقی کو دروازے پر ہی روک کر مہمان خانے میں جگہ دے دی گئی۔ خود پیر صاحب مقامی سے زیادہ سعودی لگتے تھے۔ وہی لمبی سفید قبا... سر پر چار خانے والا رومال... ہاتھ میں سبز منکوں والی تسبیح... اور چہرے پر بالشت بھر سے زائد لمبی سفید داڑھی...

شاہینہ کے والد کے استقبال میں جوش و خروش کا اظہار ایک فطری بات تھی لیکن حویلی کے مکینوں میں سے باقی

ذہنی طور پر ان کے تمام سوالات کے لیے تیار تھا۔ سب سے پہلے انہوں نے میرے شجرہ نسب کی بات کی۔ میرا تعلق کس خاندان سے ہے اور میرے آباؤ اجداد کون تھے۔ یہ عام سی بات تھی جو مجھ سے ہر جگہ ہر شخص پوچھتا تھا۔ اب میں نے اپنا ایک بیک گراؤنڈ بنا لیا تھا اور اپنی کہانی پر ایسے قائم رہتا تھا کہ کوئی بھی فرق نہ نکال سکے۔

حسب توقع وہ بہت جلد مطلب کی بات پر آ گئے۔ ”بھئی ہم نے سنا ہے کہ تم انور کے معتمد خاص ہو۔ وہ تمہاری رائے پر چلتا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”یہ صحیح نہیں ہے۔ وہ ماشاء اللہ عاقل و بالغ ہے اور بہت تعلیم یافتہ ہے۔۔۔ بہت دنیا دیکھ چکا ہے۔“ ”ہم چاہتے تھے کہ تم اس معاملے میں کوئی مصالحتی کردار ادا کر سکو۔۔۔ یہ جو بھائیوں کے درمیان اختلافات کا سلسلہ ہے۔۔۔“

”دیکھیے۔۔۔ یہ محض اختلافات نہیں۔۔۔ اور میں اس کے پس منظر سے قطعی ناواقف ہوں۔ میں باہر کا آدمی ہوں اور میرا یہاں قیام بھی عارضی ہے۔ میں اس خالص خاندانی معاملے میں نہیں پڑ سکتا۔ آپ بزرگ بھی ہیں اور تمام حالات سے باخبر بھی۔۔۔ یہ کام آپ ہی بہتر طور پر کر سکتے ہیں۔“

پیر صاحب نے عفو و درگزر کے موضوع پر ایک تقریر کے بعد کہا۔ ”اگر ہم یہ ذمے داری تمہیں تفویض کرنا چاہیں؟“

میں نے کہا۔ ”میں خود کو اس کے قابل نہ سمجھتے ہوئے آپ سے معذرت کروں گا۔“

رفتہ رفتہ میرے نہ ماننے کے باوجود ان کے لہجے میں سختی آنے لگی اور انہوں نے نہ صرف اپنی ناپسندیدگی کا اظہار برہمی کی صورت میں کیا بلکہ وہ مجھے اللہ تعالیٰ کے غیظ و غضب سے بھی ڈرانے لگے۔ اس وقت تک مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اپنے داماد اکبر کی معزولی اور گرفتاری کا براہ راست ذمے دار مجھے ہی سمجھتے ہیں اور ان کے خیال میں مجھے اکبر نے ریشم کے ساتھ فرار ہونے کے جرم میں قید کیا تھا تو اسے ایسا ہی کرنا چاہیے تھا کیونکہ ہم دونوں ایک ایسے غیر شرعی فعل کا ارتکاب کر رہے تھے جس کی آخری سزا سنگساری ہو سکتی تھی۔ میں نے بہت برداشت اور مصلحت سے کام لیا۔ بہت سے تحفظات میری راہ میں حائل تھے۔ پھر یہ احساس کہ میرا ماضی ایک پرفریب پردہ ہے جو چاک ہو سکتا ہے۔ پھر یہ کہ پیر صاحب ابھی جلال میں آجائیں تو نہ جانے اپنے

کو غیر موجود پا کے وہ مایوس تھی۔ انور پہلے ہی غائب ہو گیا تھا۔ بڑے چودھری صاحب بھی باہر نہیں آئے۔ ان کے پاس علالت کا بہانہ تھا لیکن وہ اپنے بھائی کی پیری مریدی کا تذکرہ پہلے ہی ایسے غیر سنجیدہ انداز میں کر چکے تھے کہ مجھے ان سے یہی امید تھی۔ پھر بڑی چودھرائن کیوں باہر نکلتی۔۔۔ شاید اسے مجھ سے بھی شکوہ ہوگا کہ میں ان کے استقبال کے لیے کیوں باہر نہیں نکلا۔

پیر صاحب پہلے بھائی کے کمرے میں گئے۔ یہ رسم دنیا بھی تھی اور شاید مزاج پرسی کے بعد انہوں نے بھائی کی صحت یابی کے لیے مخصوص دعا ارسال کرنا اس تمام انتظامات سے زیادہ فائدہ مند سمجھا ہو جو انور اپنے باپ کے علاج کے لیے کر رہا تھا۔ پہلے مجھے خیال آیا کہ میں بھی گھر سے غائب ہو سکتا ہوں لیکن۔۔۔ سعادت نے مجھے روک لیا۔ ان کا کام پورا ہو چکا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ انور اپنا اطمینان کر لے۔ اس کی غیر موجودگی میں یہ ذمے داری مجھ پر آگئی۔ میں ان کی مشترکہ ہدایات کو سمجھنے کی پوری کوشش کرتا رہا کہ کس مشین کو کیسے استعمال کیا جائے گا اور اس میں کیا احتیاط لازمی ہوگی۔ اس کے بعد دوپہر کے کھانے کا وقفہ آگیا اور انہوں نے کہا کہ اگر چودھری صاحب کو بیڈ پر شفٹ کر دیا جائے تو وہ ایک آزمائشی مظاہرہ کر سکتے ہیں جو ہماری عملی تربیت کے لیے بھی ضروری ہے۔

پیر صاحب اس وقت اپنی بیٹی کے کمرے میں تھے۔ میں نے چودھری صاحب سے بات کی۔ ”ابھی آپ شفٹ ہو جائیں۔۔۔ باقی سامان بعد میں منتقل کیا جاسکتا ہے۔“ ”اگر تم یہی کہتے ہو تو ٹھیک ہے۔ تم پیر صاحب سے ملے؟ انور تو ہے نہیں۔“ انہوں نے قدرے غیر سنجیدہ لہجے میں کہا۔

”ابھی ہوگی ملاقات۔“ میں نے کہا۔ ”میں نے سنا ہے کہ انور سارے ملازموں کی چھٹی کر رہا ہے؟“ بڑے چودھری صاحب کچھ ناخوش تھے۔ ”مجھے معلوم نہیں۔۔۔ لیکن وہ ایسا کر رہا ہے تو ٹھیک ہے۔ یہ پرانے چوکیداروں کا زمانہ نہیں۔“ ”وہ تو ٹھیک ہے لیکن ان بے چاروں کا کیا ہوگا۔۔۔ پرانے نمک خوار ہیں۔“

”میرا خیال ہے کہ انور کسی کو بے روزگار نہیں کرے گا۔ ان کے لیے دوسرے کام بہت ہیں۔“ اسی وقت مجھے کھانے کے لیے بلاوا آگیا۔ مجھے پیر صاحب سے کھانے کی میز پر شرفِ ملاقات حاصل ہوا۔ میں

مریدوں کے لشکر سے ایک بد عقیدہ کافر کی کیسی مرمت کرادیں... اس کی انہوں نے دھمکی بھی دے دی تھی کہ معاملات میری اور انور کی کوشش سے ٹھیک نہ ہوئے تو پھر انہیں ہی کچھ کرنا پڑے گا۔ کچھ کرنے کے بھی دو مطلب تھے۔ ایک یہ کہ وہ اپنی دنیاوی قوت یعنی مریدوں کی فوج سے کام لیں اور دوسرا اپنی روحانی قوت سے ہمیں درس عبرت بنا دیں۔ بہتر ہے کہ ہم ان کے جلال کو نہ للکاریں۔ اور کوئی جگہ یا موقع ہوتا تو میں ان جیسے فراڈ پیروں کے چیلنج کو قبول کرتا اور ان کی اوقات ان پر واضح کر دیتا۔ یہاں میں مجبور تھا اور بروقت خدا نے میری مدد کر دی۔ مجھے پیغام ملا کہ بڑے چودھری صاحب کو ان کے روم میں شفٹ کر دیا گیا ہے اور میں دیکھ لوں۔ پیر صاحب قبلہ یہ بھی مجھ پر واضح کر چکے تھے کہ ان کے روحانی دستِ شفا سے منکر ہو کے اور ان شیطانی مشینوں پر انحصار کر کے ہم دنیا و عاقبت میں خرابی مول لے رہے ہیں۔ میں موقع کو غنیمت جانتے ہوئے فوراً نکل گیا بلکہ فرار ہو گیا۔ میں اب انور کے اور بڑے چودھری کے روئے کو حق بجانب سمجھنے پر مجبور تھا اور اسے بھی انور علی کی خوش نصیبی سمجھتا تھا کہ وہ ان پیر صاحب کا داماد ہونے سے بچ گیا۔

میڈیکل سہلائی کمپنی نے اپنا کام تسلی بخش طریقے سے پورا کر لیا تھا لیکن ابھی ایک آخری مرحلہ باقی تھا۔ کسی وجہ سے جزیئر نہیں پہنچا تھا اور اسے لگانے کے لیے انہیں مزید ایک دن درکار تھا۔ اس رات دونوں انجینئرز نے پھر مہمان خانے میں قیام کرنا ہی بہتر سمجھا لیکن شام کو سعادت کے ساتھی کو اپنے گھر سے کوئی پیغام ملا اور وہ چلا گیا۔ پیر صاحب قبلہ بھی سہ پہر کے وقت رخصت ہو گئے۔ ان کی روانگی کے وقت میں نے بہتر سمجھا کہ غائب ہو جاؤں۔ مجھے نہیں معلوم کہ انہوں نے شاہینہ سے میرے بارے میں کیا کہا لیکن ان کے جانے کے بعد مجھے بھابی کے روئے میں نمایاں تبدیلی نظر آئی۔

اس نے شام کو مجھ سے شکایت کی۔ ”والد صاحب بہت ناراض تھے۔ تم نے انہیں بہت بے عزت کیا۔“ میں نے کہا۔ ”یہ بالکل غلط ہے۔ میں نے بہت برداشت کیا... صرف اس لیے کہ آپ کے والد ہیں۔ ورنہ میں پیری فقیری کا بالکل قائل نہیں... جو کچھ وہ مجھ سے چاہتے تھے، وہ میں کر نہیں سکتا تھا۔“

”تم شرافت سے بھی تو انکار کر سکتے تھے۔“

”میں نے ایسا ہی کیا۔ وہ تو کھلی دھمکی دے کر گئے

ہیں مجھے... میرا کیا تعلق اس گھر کے معاملات سے؟“

انور شام کو سیکیورٹی کمپنی کے ایک نمائندے کے ساتھ واپس آیا۔ اس نے چاروں طرف گھوم پھر کے موجودہ انتظامات کا جائزہ لیا اور اپنی رائے بھی دیتا گیا۔ ظاہر ہے کہ اس کا مشورہ پروفیشنل ایکسپٹ کا تھا اور ان کے چارجز بھی اسی حساب سے تھے۔ جاتے جاتے اس نے کہا کہ حویلی میں مستقل رہائش رکھنے والوں اور آنے جانے والوں کی مکمل تفصیل کی ضرورت ہوگی اور وہ تمام کوائف کی تصدیق کریں گے۔ تمام سیکیورٹی امور کی ذمہ داری قبول کرنے میں انہیں ایک ہفتہ لگے گا۔

یہ جمعرات کا دن تھا۔ حویلی کی روایات کے مطابق بڑے چودھری صاحب اپنے والدین کی قبروں پر پھول چڑھانے، اگر بتیاں جلانے اور فاتحہ خوانی کے لیے گئے۔ وہاں نہ جانے ان کے دل میں کیا آئی کہ انہوں نے قبرستان کی دیکھ بھال کرنے والے کو طلب کر لیا۔ وہ ایک مالی تھا جو یہاں بھی تھوڑا بہت کام کرتا تھا۔ انور ان کے ساتھ رہنے پر مجبور تھا اور میں انور کا ساتھ دینے پر۔

بڑے چودھری صاحب نے دو قبروں کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ کیسے دھنس رہی ہیں... نہ بارش ہوئی ہے نہ سیلاب آیا ہے... نہ زلزلہ...“

مالی نے اعتراف کیا۔ ”ابھی دو دن پہلے تو ایسا نہیں تھا۔“

”ان کو ٹھیک کرالو کے پٹھے... ورنہ میں تجھے گاڑ دوں گا بیچ میں۔“

انور دو دن پہلے اس قبرستان میں ریشم کے ساتھ آیا تھا۔ اس نے کہا۔ ”کسی نے کھودا ہے انہیں؟“

یہ سوال اس نے حیرانی سے کیا تھا۔ مالی نے مؤدبانہ جواب دیا۔ ”کون کر سکتا ہے جی اس کی جرأت؟“

انور کے تجسس نے اسے آگے بڑھنے پر مجبور کیا۔ اس وقت مغرب کا دھند لگا گہرا ہو رہا تھا۔ اچانک ایک اسکی بابت ہوئی جس نے مجھے بھی ناک آؤٹ کر دیا۔ مجھے کچھ دیر اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا کہ جو میں دیکھ رہا ہوں، وہ حقیقت ہے یا میری نظر کا دھوکا۔

انور اچانک غائب ہو گیا تھا۔ محاورے کے مطابق اسے زمین نے نگل لیا تھا۔ وہ جہاں کھڑا تھا، اب وہاں نہیں تھا۔

ہر معاذ پر ایک نئے داؤ کی منتظر
جواری کی تدبیریں اگلے ماہ بڑھے

پنجایت

محمد تنویر اختر

ہم اکیسویں صدی میں جی رہے ہیں لیکن ہماری بہت سی رسوم و روایات کئی صدیوں پیچھے کی چلی آرہی ہیں... زیرِ نظر کہانی میں کالا، کالی کے موضوع پر چاہ کن راچاہ درپیش کے مصداق طبع آزمائی کی گئی ہے... وہ اپنی بدمعاشی کے نشے میں دھت تھا... اس بات سے بے خبر کہ وہ مکافاتِ عمل سے نہ بچ سکے گا اور پھر وہ ہوا جو اس نے کسی اور کے لیے سوچا بھی نہ تھا...



سراٹگی و سیب کے تناظر میں ایک خیال انگیز کہانی...

کے خاوند ڈٹو کو بھی جو ایک کونے میں شرم سے سر جھکائے کھڑا ہوا تھا۔

تمام مرد کمرے سے باہر آ گئے۔ وہ بھی جس نے بختو کے زخموں پر مرہم پٹی کی تھی اور ٹانگ پر لگے زخم کا ابتدائی

ٹوٹی پھوٹی سراٹگی میں جب ڈٹو کی بیوی بختو بی بی نے حاکم علاقہ کے سامنے زبان کھول کر اپنا قصہ سنایا تو ایک لخت حاکم علاقہ کے دفتر میں سناٹا سا چھا گیا۔ حاکم عورت نے سارے مردوں کو کمرے سے باہر جانے کا حکم دیا۔ بختو

علاج معالجہ کیا تھا۔ جب سارے مرد حاکم کے کمرے سے چلے گئے تو حاکم عورت نے ایک بار پھر وقوعے کے بارے میں جانکاری لی۔ کچھ نئے سوال کیے کچھ پرانے دہرائے۔ حاکم عورت نے ان زخموں کا خود بھی معائنہ کیا جو بختو کے جسم پر لگے تھے اور ان سے مرہم پٹی کے بعد بھی لہورس رہا تھا۔ ناخنوں کے نشان تو کسی گنتی میں نہ تھے۔ یہ دیکھ کر حاکم عورت کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ایک درد بٹانے والی کا آسرا ملا تو بختو بھی سسکیاں بھر بھر کر رونے لگی۔ اس نے ایک بار پھر پورا واقعہ دہرایا۔

ڈتو بستی کا ایک معمولی سا بندہ تھا۔ والدین کی وفات کے بعد تنہا رہ گیا۔ گھر کیا تھا بس سر چھپانے کا ٹھکانا تھا۔ لکھنے پڑھنے کی فرصت ہی نہ ملی تھی۔ اماں بابا مرتے سے زمین، جائیداد بھی نہ چھوڑ گئے تھے کہ اسے بیچ کر پیٹ کا دوزخ بھرنا یا گزراوقات کے لیے اناج ہی اکٹھا کر لیتا۔ بھوک بھوک ہی میں زندگی کے دن گزار رہا تھا۔ پورے علاقے میں کوئی ایسا نہ تھا جو دو بول ہمدردی کے بولتا۔ سر پر ہاتھ رکھتا۔ تھک ہار کر ڈتو نے روزی روٹی کے لیے شہر کا رخ کیا۔ ادھر، ادھر جہاں مزدوری ملتی، کر لیتا۔ وہیں اس کی ایک بوڑھے مزدور سے ”دوستی“ ہو گئی جو ”نقل مکانی“ کے عذاب سے گزرا ہوا تھا۔ اس کی بیوی مر چکی تھی اور ایک چاند چہرہ بیٹی کا بوجھ کاندھوں پر لیے ہوئے تھا۔ جسے سر سے اتار پھینکنے کے لیے اسے ڈتو مل گیا تھا۔ باجوں شہنائیوں کی حاجت نہ تھی، پرانے کپڑوں میں ہی اپنی بیٹی کو ڈتو کے حوالے کر دیا۔

مولوی صاحب کو دینے کے لیے ڈتو نے کچھ رقم جوڑ رکھی تھی۔ رخصتی بھلا کہاں ہوتی تھی۔ کرائے کا ایک کمرہ جہاں دولہا دلہن نے شب عروسی بتائی اور بوڑھا باپ باہر فٹ پاتھ پر آگ جلا کے رات کا ٹنارہا۔

ڈتو کے حالات سے بخت نور بھی بے خبر نہ تھی گھر ٹھکانا نہ سہی مگر دونوں کو خود پر بھروسہ تھا۔ دونوں نے مل جل کر مزدوری کی ٹھانی۔ بختو لوگوں کے بھانڈے مانجھتی اور جھاڑو دیتی۔ ڈتو دن بھر منڈی میں مزدوری کرتا۔ شام ڈھلے دونوں تھکے ہارے گھر کو لوٹتے اور باتیں کر کے ایک دوسرے کو حوصلہ دیتے۔ شہر کی تا بڑ توڑ مہنگائی نے کمر توڑ ڈالی تھی اس لیے انہوں نے جمع شدہ پونجی سمیٹ کر بستی جانے کا فیصلہ کیا۔ بستی آتے ہی ڈتو نے اپنے گھروندے کی لپٹا پوتی کر کے ایک چھوٹی سی پرچون کی دکان کھول لی۔ باری باری ڈتو اور بخت نور جسے بستی والوں نے بختو کا نام دیا تھا، دکان پر بیٹھنے لگے۔

ڈتو کو کبھی کبھار سامان لینے کے لیے شہر بھی جانا پڑتا تھا۔ بختو دو چار دنوں میں ہی اپنے برتاؤ، من بھاؤنی مورت اور سیدھے سجاؤ، بھولی بھالی باتوں کے سبب بستی میں سب کو اچھی لگنے لگی۔ ملی جلی اردو سرائیکی میں اس کی بولی کا مزہ لینے کے لیے کئی عورتیں اس کی سہیلیاں بن گئیں۔ سودا بھی بہنے لگا اور دکان بھی خوب چل پڑی۔

رفتہ رفتہ ڈتو اور بختو کو اپنی خوش حالی کے خواب آنے لگے اور وہ اپنی دکانداری بڑھانے کا بھی سوچنے لگے۔ اس ہنسی خوشی کے دنوں میں اچانک ہی بختو کے نصیب آڑے آ گئے۔ بستی کا لوفر ملک سونہار کے دل کو بختو بھاگئی۔ اس بار جب وہ اپنی ڈیوٹی سے لوٹا تو دوسرے ہی دن وہ پرچون کی دکان پر جا پہنچا۔ بنی سنوری، بال سلجھاتی بختو اس کے تن، من میں آگ بھڑکا گئی اور وہ اپنی آگ بجھانے کے لیے ڈیوٹی پر واپس جانا ہی بھول گیا۔ پولیس کی ٹریننگ میں اسے یہی بتایا گیا تھا کہ مور چا سامنے ہو تو پیٹھ دکھانا بزدلی ہوتی ہے۔ وہ بھی مورچے پر دھوٹی رہا کر بیٹھ گیا۔ پہلے اس نے ”شاہ خرچی“ سے کام نکالنے کی کوشش کی۔ یہ حربہ بیکار گیا۔ ڈتو بھی اس کی خرمستیاں دیکھ رہا تھا۔ کمزور تھا اس لیے ہر کمزور کی طرح اپنے غصے کو پی گیا۔ کام بنانا نہ دکھائی دیا تو ملک سونہارا زور زبردستی پر اتر آیا۔ باری باری وہ اور اس کے دوست دکان کے باہر پہرہ دینے اور آوازے کئے گئے۔

دکان جو صبح سویرے کھل جاتی تھی، دیر سے کھلنے اور جلد بند ہونے لگی۔ بستی کی عورتوں نے بھی دکان کے آگے آوارہ لڑکوں کا جھگڑنا دیکھا تو ان کا بھی آنا جانا کم ہو گیا۔ ہوتے ہوتے دکان داری بھی کم ہو گئی اور آخر کار دکان بند ہو گئی۔ دکان میں پڑا سامان بھی اونے پونے داموں بک گیا۔ ترازو، باٹ بھی اپنا وزن گنوا کر ادھر ادھر بکھر گئے۔ لوفروں نے کھلی دھمکی ڈتو کو دے دی کہ اگر دکان چلائی ہے تو ترازو ہمارے ہاتھ رہے گا۔ ڈتو اور اس کی بیوی سیدھے سادے، بے بس ضرورت تھے لیکن انہیں دکان بند کرنا تو گوارا تھا مگر کسی بھی قیمت پر اپنی ناموس بیچنا اور ترازو کی ڈنڈی ملک سونہارے اور اس کے ساتھیوں کے ہاتھ دینا منظور نہیں تھا۔ ڈتو نے بے روزگار ہو کر بھوکا مرنا قبول کر لیا۔ بستی والوں سے یہ صورت حال ڈھکی چھپی نہ تھی۔ جیسا کہ ہر بستی میں اچھے لوگ بھی ہوتے ہیں ویسے ہی بستی میں کچھ اچھے لوگ بھی تھے۔ جو کسی مصیبت زدہ کی ڈھارس بندھانے پر یقین رکھتے تھے۔ وہ لوفر لفنگوں کے منہ لگنے کا حوصلہ تو نہیں رکھتے تھے مگر ڈتو اور اس کی بیوی کو بھوکوں مرتا بھی نہیں دیکھ سکتے

گھر میں روز روز کے جھگڑوں سے تنگ آ کر میاں جی نے اپنی دردناک زندگی کے خاتمے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ جوڑیا بازار کی ایک دکان پر پہنچے اور ایک سرلیج الاثر زہر طلب کیا۔ دکان دار نے انکار کر دیا۔ وہ زہر اجازت نامے کے بغیر پہنچنا جرم تھا۔

”اجازت نامہ تو نہیں ہے۔“ میاں جی نے مایوسی سے کہا۔ ”یہ کاغذ ہیں... انہیں دیکھ لو!“

دکان دار نے غور سے ان دونوں کاغذوں کو دیکھا۔ وہ دونوں میاں جی کے دو نکاح ناموں کی فوٹو کاپیاں تھیں۔ وہ دیکھتے ہی دکان دار نے ملازم کو آواز لگائی۔

”جلدی سے بھائی صاحب کو سٹکھیا کی بڑی بوتل دے دو!“

(کراچی سے امتیاز احمد کا تعاون)

ضلع کے ڈی پی او کو اپنا بیان دے کر اور ڈاکٹری معائنہ کرانے کے بعد دونوں میاں بیوی جب اپنی بستی کے بس اسٹاپ پر اترے تو ایک بار پھر انہیں اغوا کر لیا گیا۔ بندوق کی ٹوک پر اس کے انگوٹھے کے نشان لیے گئے۔ اس کاغذ پر لکھا تھا کہ پنچائیت نے معاملہ سننے کے بعد فیصلہ دیا ہے۔ اب مجھے ملک سونہارے اور اس کے ساتھیوں سے کوئی شکایت نہیں۔ بچوں کا فیصلہ مجھے منظور ہے۔ میں اس معاملے میں اپنی طرف سے درج کرائی جانے والی رپورٹ واپس لیتی ہوں۔ ٹوٹی پھوٹی سرائیکی بولنے والی وہ شہر میں رہنے والی بچوں کا فیصلہ مان گئی۔

کون تھے وہ شیخ؟ اس بات کا اتنا پتا کسی کو نہ چلا۔ معاملہ تو خیر رفع دفع ہو گیا۔ غریب رو دھو کر چپ ہو گئی۔ شہر کا سپاہی ہر الزام سے بری ہو گیا۔

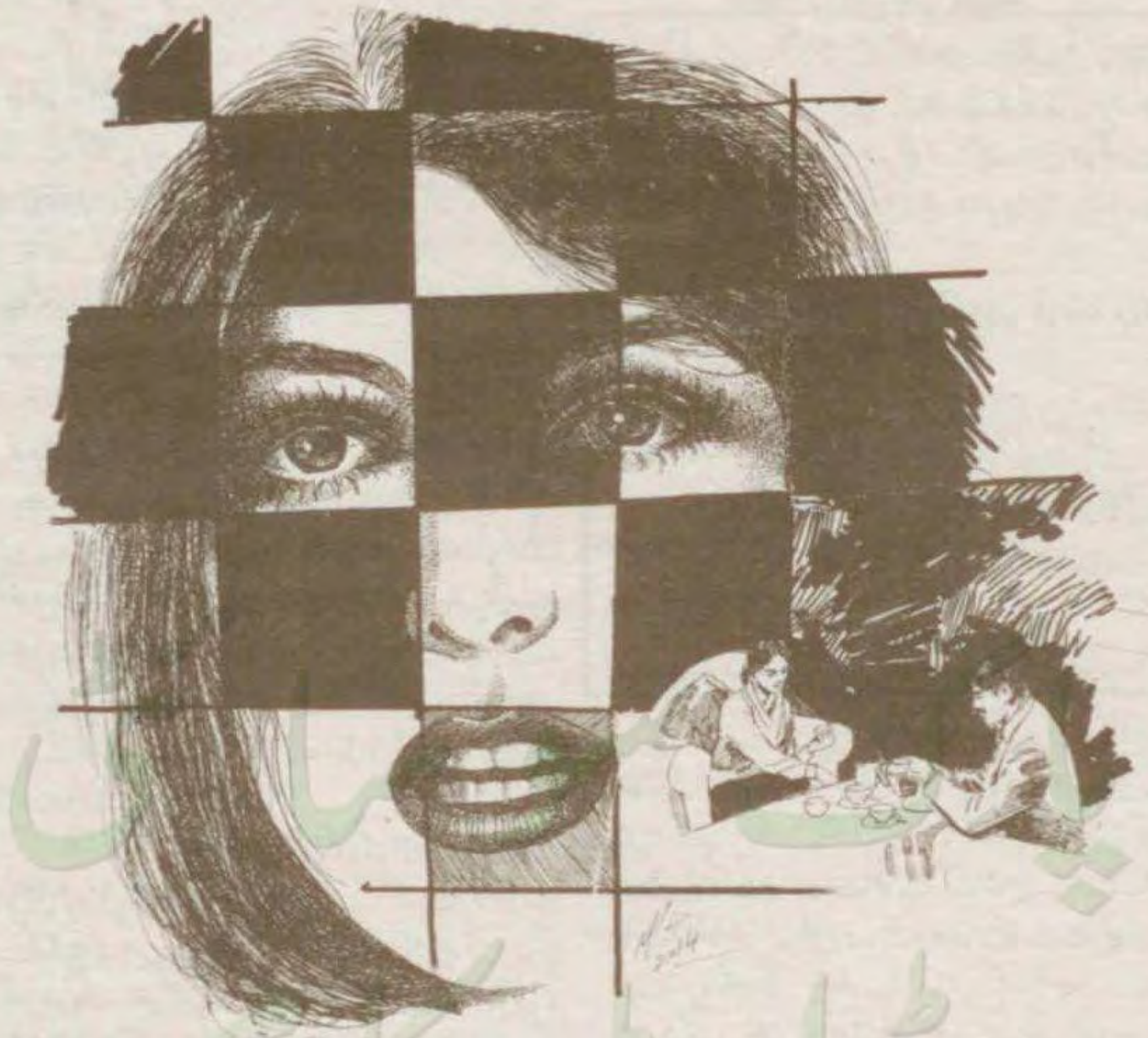
کچھ مہینوں بعد لوگ ان باتوں کو بھول گئے... مگر ابھی گرد زیاہہ بیٹھی بھی نہ تھی کہ ایک بار پھر آندھی چلی اور بستی والوں کو گزری باتیں یاد آ گئیں... شاید اس لیے کہ عید سے ایک رات پہلے انہی لفنگوں کی ٹولی کے سردار ملک سونہارے نے اپنے مزارعے کے بیٹے سے وعدے پر ملنے کے لیے جانے والی اپنی بہن کو موقع پر دبوچ لیا۔ ”کالا“ تو بھاگ گیا لیکن ”کالی“ کو اس نے گلا دبا کر مار دیا اور مقامی پولیس کی جیسیں بھرتا وہ شہر اپنی ڈیوٹی پر واپس چلا گیا۔ کون جانے؟ اس بار بستی کی پنچائیت میں بچوں کا فیصلہ کیا ہوگا؟

تھے۔ انہوں نے ملک سونہارے کی زیادتیوں سے نہ چاہتے ہوئے بھی سمجھوتا کر رکھا تھا۔ ایسے ہی وسیع القلب لوگوں میں سے ایک بھلے آدمی نے اپنے حصے کے پانچ بیگھے واپس نبھنے کے لیے ٹھیکا پر دے دیے۔ دونوں میاں بیوی ایک بار پھر پوری تندہی سے محنت مزدوری پر ڈٹ گئے۔ فصل تیار ہوگی تو پریشانیوں میں کمی واقع ہوگی۔ انہوں نے فصل کی رکھوالی کے لیے کھیتوں میں ایک جھونپڑی بھی ڈال لی اور وہیں رات دن رہنے لگے۔

ایک رات جب رم جھم کی پھوار، اور آسمان کو بادلوں نے چاروں طرف سے گھیرا ہوا تھا، لوفروں کا ٹولا، نشے میں دھت، ڈانگوں سوٹوں سمیت جھونپڑی کی دہلیز پر آن پہنچا۔ اس سے پہلے کہ سویا ہوا ڈٹو جاگتا اور جوانی کا رروائی کرتا۔ لفنگوں نے مار دھاڑ شروع کر دی اور ڈٹو کو چار پائی سے رسیوں کے ذریعے باندھ دیا اور بختو کو جھونپڑی سے اٹھا کے لے گئے۔ چیخ چلاتی، دہائیاں دیتی بختو کو کھیتوں کے درمیان لے گئے اور پانچ بندوں نے اسے اپنی وحشت و بربریت کا نشانہ بنا ڈالا۔

بختو جو ملی جلی اردو سرائیکی بولتی تھی اور جس کی بولی کا بستی کی عورتیں خاص طور پر مزہ لیتی تھیں۔ بختو جسے ڈٹو شہر سے لے کر آیا تھا۔ اس سے اس کے نازک جسم و جاں پر قیامت کی گھڑیاں گزر رہی تھیں۔ اس کی چیخیں نہ آسمان تک پہنچیں نہ بستی والے جاگے۔ پانچ بندے باری باری اسے اپنی مردانگی کا یقین دلاتے رہے۔ ان میں سب سے آگے وہ تھا جو دور پار کے ایک تھانے میں سپاہی تھا اور جو اپنے افسر کو رشوت دے کر حاضری لگوا لیتا تھا۔ جس نے ڈٹو کی بیوی کو پیسوں کا لالچ دیا۔ یوں دال نہ گلی تو دھونس دھاندلی پر اتر آیا۔ دکان بند کرائی۔ آخر کار زبردستی اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل میں کامیاب ہو گیا۔ سب کچھ ہو گیا تو جاتے جاتے اپنے گزرے دنوں کا حساب چکانے کے لیے اپنے چاقو کی ٹیکھی دھار سے اس کی ٹانگ پر ایک لمبی لہو کی لکیر کھینچتا چلا گیا کہ جب تک جیسے یاد کرتی رہے گی۔

یہی وہ نشان تھا جو بختو نے اس روز حاکم عورت کے بند کمرے میں اسے دکھایا تھا۔ جسے دیکھ کر حاکم عورت بھی رو پڑی تھی اور اس کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے تھے۔ اس نے اپنے ماتحتوں سے بختو کی فریادی عرضی تیار کرائی۔ ضلع کے سب سے بڑے افسر کو اس وقوعے کی رپورٹ بھیجی اور اپنے بندوں کے ہمراہ بختو، اس کے خاوند کو اس یقین دہانی کے ساتھ بستی لوٹا دیا کہ اس کے ساتھ پورا پورا انصاف ہوگا۔



”مز سونیا! آپ اس کمرے سے دور رہیں... یہ ضروری ہے کہ وہاں کسی چیز کو نہ چھیڑا جائے۔“ شہزاد فردی نے پرویز کی بیوہ سے کہا۔ ”بظاہر یہ ہارٹ فیل کا طبیعی کیس ہے۔ تاہم تفتیش کی تکمیل تک ضروری ہے کہ وہاں کسی چیز کو نہ چھوا جائے۔“ اول دن سے وہ یہاں کے متواتر چکر لگا رہا تھا۔ سونیا سے یہ بات اس نے پہلے روز بھی کہی تھی۔

سونیا نے کچھ بولنا چاہا لیکن پھر خاموشی کو ترجیح دی۔ تفتیش والی بات اسے عجیب لگی تھی۔ یعنی پولیس پرویز کی اچانک موت کی ”ذبحہ“ کو اس طرح تسلیم کرنے کے لیے فی الفور تیار نہیں تھی۔

سونیا ڈاکٹر کے سرٹیفکیٹ سے پوری طرح مطمئن لگ رہی تھی کہ موت حرکتِ قلب بند ہونے سے واقع ہوئی ہے... اگرچہ اس کے چہرے پر افسردگی کی علامات واضح تھیں۔ سونیا تفتیش والی بات کو محض معمول کی کارروائی سمجھ

پرویز اختر کی شطرنج کے مہرے ہاتھی دانت کے تھے۔ اُن مہروں پر گرد کی تہ موجود تھی۔ بساط پر کھیل نامکمل رہ گیا تھا اور یہ بازی پرویز اختر کی زندگی کی آخری بازی ثابت ہوئی تھی...

ایش ٹرے میں سگریٹ کے ٹوٹے ٹکڑے کہیں کہیں راکھ کے ڈھیر میں سے جھانک رہے تھے۔ راکھ کی چھوٹی سی ڈھیری کسی قبر کی طرح معلوم ہو رہی تھی۔

سونیا نے ہاتھ اپنی آنکھوں پر رکھے ہوئے تھے۔ سونیا اس کمرے میں نہیں تھی جہاں پرویز کی موت واقع ہوئی تھی۔ لاش کے قریب شطرنج کی بساط پر ادھوری بازی جوپ کی توں موجود تھی۔ پرویز کی تدفین چند روز قبل کر دی گئی تھی۔

انسپکٹر شہزاد فردی ایک سب انسپکٹر کے ہمراہ جائے واردات پر موجود تھا۔ وہ ضروری ہدایات جاری کر رہا تھا۔

فیل خانہ

امجد رئیس

ہر کھیل

کے کچھ

اپنے لوازم

خاص ہوتے

ہیں... ان رموز

کو ایک کھلاڑی ہی

سمجھ سکتا ہے...

کھیل کی بنیاد پر تحریر

کردہ ایک مختصر نادر

کہانی... کمال کی بات یہ تھی

کہ اس کا ہر کردار شطرنج کے گرد

گھوم رہا تھا... اور شطرنج کی

بساط ان سے چمٹی ہوئی تھی۔

کھیل ہی کھیل میں زندگی کا پانسلاٹ دیے والی بازی

رہی تھی۔ شہزاد فردی کے عام سے انداز نے بھی اس کے خیال کو تقویت بخشی تھی۔ تاہم کئی روز گزرنے کے باوجود پولیس کی دلچسپی اس کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ جبکہ پولیس کا معمول تھا کہ اس قسم کے کیسز کی فائلز وہ جلد بند کرنے کی کوشش کرتی تھی... جبکہ انسپکٹر شہزاد فردی کا آنا جانا مسلسل لگا ہوا تھا۔

سونیا، شہزاد فردی کی ساکھ سے بے خبر تھی۔ انسپکٹر شہزاد فردی کئی روز سے وہاں آ رہا تھا جبکہ ایک پولیس اہلکار اس نے مستقل وہاں چھوڑا ہوا تھا۔ جو اپنے دیگر ساتھیوں کے ساتھ ڈیوٹی تبدیل کرتا رہتا تھا۔

شہزاد کی عمر تیس کے لگ بھگ تھی۔ اپنے چہرے بدن، ٹھنکریا لے بال اور چمک دار

بڑی بڑی آنکھوں کے باعث وہ عام پولیس والوں سے مختلف دکھائی دیتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب ناقابل فہم اداسی کی ہلکی سی جھلک ہمہ وقت موجود رہتی تھی۔

آنکھوں کی وجہ سے، سونیا کو اس کی شخصیت میں ہالی ووڈ کے اسٹارنگولس کچ کی جھلک نظر آتی تھی۔

سونیا مناسب بدن کی ایک دلکش عورت تھی۔ اس کی عمر بھی تیس برس سے زیادہ نہیں تھی۔ قذآدم آسنے کے سامنے پہنچ کر اس نے ہمت کر کے اپنے عکس کو دیکھا۔ اسے کوئی خاص تبدیلی نظر نہیں آئی۔ چہرے پر ہلکی سی زردی اور اداسی تھی... آسنے میں اس کا عکس خوف زدہ تھا اور نہ ہی نروس... وہ ایک بیدہ کی طرح ہی نظر آ رہی تھی۔ تھکی ہوئی اور ناخوش۔

حالات کے پیش نظر حسیب تدفین کے بعد سے نہیں آیا تھا۔ حسیب اکثر پرویز کے ساتھ شطرنج کھیلتا تھا... اس روز بھی وہ پرویز کے ساتھ کھیل رہا تھا اس لیے اس کا کسی قدر نروس نظر آنا قدرتی بات تھی... ☆☆☆

حسیب، پرویز کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہینڈسم تھا۔ علاوہ ازیں وہ شطرنج کا بھی ماہر کھلاڑی تھا۔ سونیا کو وہ دن یاد تھا جب وہ پہلی بار ایک پیٹرول پمپ پر حسیب سے ملی تھی... وہ ایک سرسری سی ملاقات تھی، تاہم دونوں پر اپنے دیرپا اثرات چھوڑ گئی تھی۔

حسیب کے آنے سے قبل پرویز، ناتھ ناظم آباد میں ڈسٹرکٹ چیمپئن تھا۔ شطرنج کے مشترکہ شوق کے باعث سونیا کو اسے پرویز سے ملوانے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی تھی۔ قیاحت یہ تھی کہ حسیب کے کھیل کا معیار قوی سطح کا تھا... جلد ہی ڈسٹرکٹ میں پرویز کی برتری ختم ہو گئی۔ تاہم دونوں کا وقتاً فوقتاً پرویز کے گھر پر شطرنج کا کھیل چلتا رہتا تھا۔

اس موقع پر سونیا بھی موجود ہوتی لیکن اس کی موجودگی کا سبب حسیب تھا۔ سونیا کو شطرنج سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ جلد ہی دونوں کی

گھر سے باہر ملاقاتیں شروع ہو گئیں... اور سونیا پرویز سے دور ہوتی چلی گئی... یہ اور بات کہ پرویز کو کسی قسم کا شک نہیں ہوا۔ وہ اس بات پر خوش تھا کہ اسے حسیب کی شکل میں ایک اچھا مضبوط پارٹنر مل گیا ہے۔ وہ حسیب سے کھیلتے وقت کافی پُر جوش نظر آتا اور کھیل میں پوری توانائی صرف کرتا تھا۔ مضبوط تدر مقابل کے باعث پرویز کا کھیل مزید بہتر ہوتا جا رہا تھا۔ اس کی توجہ سونیا اور حسیب کے تعلقات کے بجائے شطرنج پر مرکوز ہوتی تھی۔ وہ اندر ہی اندر ڈویرٹل چیمپئن شپ جیتنے کی منصوبہ بندی کر رہا تھا۔ اگر وہ کامیاب ہو جاتا تو پھر پروڈیونل اور آخر میں نیشنل چیمپئن شپ... اس کا دیرینہ خواب تھی۔

☆☆☆

وہ بدھ کا روز تھا جب خلاف معمول شہزاد فردی دوسری مرتبہ وہاں پہنچا جبکہ سونیا دوسری مرتبہ حسیب کی آمد کے لیے تیار تھی۔ شہزاد فردی کی شکل نے اس کی طبیعت مکدر کر دی... وہ ایک مضبوط اعصاب کی عورت تھی اس لیے اپنے تاثرات چھپانے میں کامیاب رہی۔ وہ اسے نشست گاہ میں لے آئی۔ سونیا صاف محسوس کر رہی تھی کہ شہزاد فردی بغور اس کی حرکات و سکنات کا مشاہدہ کر رہا ہے۔ تاہم اس نے کسی قسم کا رد عمل ظاہر نہیں کیا۔ شہزاد فردی کے انداز میں کوئی اُن دیکھی تبدیلی محسوس ہو رہی تھی۔

”اب آپ کیسا محسوس کر رہی ہیں، مسز پرویز؟“

”بہتر، پہلے سے بہتر... میری کوشش ہے کہ میں اس منحوس دن کے بارے میں زیادہ نہ سوچوں... مجھے اس کمرے سے ڈر لگنے لگا ہے۔“ سونیا نے جواب دیا۔ ”میں چاہتی ہوں کہ کسی ملازمہ کے ذریعے اس کی صفائی کروا دوں۔ ایک ہفتہ ہونے والا ہے۔“

”پلیز ایک آدھ روز اور صبر کریں۔“ شہزاد فردی نے سگار نکالا۔

سونیا نے نڈھال انداز میں شہزاد فردی کی آنکھوں میں جھانکا اور وہ سوال کر ہی ڈالا جسے وہ کئی روز سے ٹال رہی تھی۔ ”انسپکٹر کیا آپ کو ڈاکٹر کی رپورٹ پر شک ہے؟“

”نہیں ایسا تو نہیں ہے۔“ وہ دھیرے سے بولا۔ ”لیکن

میں آپ کے شوہر کی اچانک موت سے مطمئن نہیں ہوں۔“ یہ کھلا انداز کسی دھماکے کی طرح تھا جس کی گونج سونیا برداشت نہ کر سکی۔ اس کے تاثرات میں لمحہ بھر کے لیے تغیر پیدا ہوئی گئی۔

”میں سمجھی نہیں۔“ اس نے آواز کو حتی الامکان ٹارٹل رکھنے کی کوشش کی... دماغ میں متواتر پٹاخنے سے چل رہے تھے۔ تاہم اس نے شہزاد فردی سے آنکھیں چرانے کی حماقت نہیں کی۔ اس نے دیکھ لیا کہ شہزاد فردی کی آنکھوں میں ہمہ وقت نظر آنے والا اداسی کا موہوم عکس کچھ گہرا ہو گیا۔

”مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔“ شہزاد فردی نے اس کا سوال نظر انداز کر دیا۔ ”کیا آپ مجھے ایک بار پھر بتائیں گی کہ اس روز جب آپ کے شوہر اپنے دوست حسیب مرزا کے ساتھ زندگی کی آخری بازی کھیل رہے تھے تو کیا ہوا...“ وہ رک کر پھر بولا۔ ”میرا مطلب ہے کہ شاید کوئی بظاہر غیر اہم بات آپ کے ذہن سے نکل گئی ہو...“

”دیکھیے میں اس کھیل کے بارے میں کچھ نہیں جانتی، سوائے اس کے کہ اسے شطرنج کہتے ہیں اسی لیے میں کھیل کے دوران میں شاذ ہی ادھر موجود ہوتی ہوں... اس روز میں وہاں تھی اور میرا بیان پہلے ہی کی طرح ہے... ویسے بھی میرا مشاہدہ ہے کہ شطرنج کے دو کھلاڑی عموماً خاموشی سے ہی کھیلتے ہیں۔“

سونیا کا جواب سن کر شہزاد فردی خاموش رہا۔ اس کے دائیں ہاتھ کی انگلی کھٹکریا لے سیاہ بالوں کی ایک لٹ سے کھیل رہی تھی۔ کمرے میں کچھ دیر کے لیے سکوت طاری ہو گیا۔

پھر شہزاد فردی گویا ہوا۔ ”مسز پرویز! شاید آپ کو معلوم نہ ہو کہ میں کالج کے زمانے سے شطرنج کھیلتا رہا ہوں... یہ ایک خاموش کھیل نہیں ہے۔ بظاہر کھلاڑی گھنٹوں خاموشی سے کھیلتے ہیں لیکن... اندرونی طور پر کھلاڑی کے دل و دماغ میں ہلچل مچی ہوتی ہے اور کھیل کے اتار چڑھاؤ کے حساب سے بیجانی کیفیت بڑھتی جاتی ہے... حرکت قلب بڑھ جاتی ہے اور بلڈ پریشر بھی... شاید آپ یقین نہ کریں کہ کرسی پر آرام سے بیٹھ کر بظاہر بے ضرر سا کھیل ہائی لیول پر اتنی توانائی خرچ کرتا ہے۔ جتنی میدان میں کھیلتے ہوئے پیشہ ور فٹ بالر کو بھی نہیں کرنی پڑتی۔“ شطرنج اعصابی توانائی کو نچوڑ لیتی ہے۔“ شہزاد فردی خاموش ہو گیا۔

سونیا کچھ مطمئن دکھائی دی۔ ”جی ہاں۔“ پرویز کے ساتھ بھی ایسا ہی کچھ ہوا ہے۔“ وہ بولی۔ ”ویسے بھی وہ بھی ایک مضبوط دل کے مالک نہیں رہے۔“

شہزاد نے سر ہلایا۔ ”بے چارہ پرویز، ڈاکٹر نے تصدیق کر دی ہے لیکن میں مطمئن نہیں ہوں۔“ اس نے

پہلی بار پولیس انسپکٹر کی طرح سپاٹ لہجے میں صاف گوئی سے کام لیا۔

سونیا کا دل زور سے دھڑکا۔ ”کیا مطلب ہے آپ کا؟“

”یہ کھیل اتنی سنجیدگی سے نہیں ہو رہا تھا کہ کھلاڑی کو شدید دباؤ برداشت کرنا پڑتا۔۔۔“

میرا مطلب ہے کہ یہ کوئی گرینڈ ماسٹر کی سطح کا ٹیم نہیں تھا اور نہ ہی کسی بین الاقوامی چیمپئن شپ کے لیے کھیلا جا رہا تھا۔“ شہزاد فردی کی آنکھوں میں اداسی بڑھ گئی۔ عجیب انداز تھا اس کا۔ یہ اداسی کا عنصر جذبات سے غیر متعلق تھا۔۔۔ مثلاً جیسے کوئی بے خیالی میں مسکرا دے جس کا خوشی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

سونیا اسے گھور رہی تھی۔ تاہم اس کے اعصاب ابھی تک قابو میں تھے لیکن اسے وہ انداز پسند نہیں آیا جس انداز میں شہزاد فردی اسے دیکھ رہا تھا۔

”آپ نے اپنے بیان میں کہا تھا کہ آخری چال آپ کے شوہر نے چلی تھی۔ پھر وہ کرسی میں پیچھے کی جانب گر گیا۔ دوبارہ سیدھا ہونا اسے نصیب نہیں ہوا؟“

”ہاں، میں نے یہی کہا تھا۔“ سونیا نے جواب دیا۔ ”کیا تمہیں میری اس بات پر شک ہے؟“

”جلد بازی سے کام مت لو، تم اپنے سابقہ بیان پر دستخط کر چکی ہو۔“

”بالکل اور تم حبیب سے بھی تصدیق کر سکتے ہو۔۔۔ وہ آنے والا ہو گا۔“ سونیا نے کہا۔ لیکن اس کے اندر بے کلی بڑھتی جا رہی تھی۔

شہزاد فردی آج بالکل مختلف نظر آ رہا تھا پھر اس نے وہ سوال کیا۔ جس نے سونیا جیسی عورت کے اعصاب توڑ ڈالے۔ یہ سوال نہیں دھماکا تھا۔

”ہاں، اچھا خیال ہے۔ میں حبیب سے بات کرنا پسند کروں گا۔“ اس نے کہا۔ ”یہ بتائیے کہ آپ کبھی ”ڈریم ہیج“ ریسٹورنٹ گئی ہیں؟“

سونیا کو خود کو سنبھالنے میں شدید جدوجہد کرنی پڑی۔ وہ اس سادہ سے سوال کی سنگینی کو سمجھ گئی تھی۔ کیونکہ وہ ”ڈریم ہیج“ پر حبیب کے

ساتھ کئی شامیں گزار چکی تھی۔۔۔

”ہاں، میں وہاں بھی بھی اپنے دوستوں کے ساتھ جاتی ہوں۔“ سونیا کی آواز کی مضبوطی میں رخنہ پڑ چکا تھا۔

شہزاد کے لب زہر خند انداز میں کھنچ گئے۔ ”دوستوں سے مراد؟“

”عزیز، احباب۔۔۔ شناسا وغیرہ۔“ سونیا نے پہلو بدلا۔

”کیا ان میں حبیب بھی شامل ہے؟“ شہزاد فردی نے تیز نظروں سے سونیا کی آنکھوں میں جھانکا۔

”دیکھیے۔۔۔ پرویز کی مشاغل کی نوعیت ایسی ہے کہ مجھے رکشے میں ادھر ادھر گھومنا پڑتا ہے لیکن یہ میری عادت نہیں ہے۔“

”میرا سوال کچھ اور تھا۔“ سونیا نے غصہ ضبط کر کے جواب دیا۔

”ہاں چند بار حبیب بھی وہاں آیا تھا۔ اس کی بھی ممبر شپ ہے وہاں پر۔۔۔“

”جانتا ہوں، وہاں ممبر کے سوا کوئی نہیں جا سکتا۔“ لیکن آپ کی ممبر شپ کئی برس پرانی ہے۔۔۔ جبکہ حبیب نے چند ماہ قبل ممبر شپ لی ہے۔“

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ نیز کیا یہ نجی نوعیت کے سوالات نہیں ہیں؟“ سونیا نے اعتراض کیا۔

”میں جو کچھ کہہ رہا ہوں یا گزشتہ چند روز میں کرتا رہا ہوں۔۔۔ یہ سوالات اس تفتیش سے گہرا تعلق رکھتے ہیں۔۔۔ اور۔۔۔“

شہزاد کی بات ادھوری رہ گئی اور اطلاعی کھنٹی کی آواز گونج اٹھی۔

سونیا کو اندازہ تھا کہ کون ہو گا پھر بھی اس نے انٹرکام پر سوال کیا اور بشن دبا کر آٹومیٹک لاک کھول دیا۔ کچھ دیر بعد حبیب مرزا ڈرائنگ روم میں تھا۔ شہزاد فردی کو دیکھ کر وہ لمحہ بھر کے لیے ٹھنکا۔۔۔ پھر آگے آ کر مصافحے کے لیے ہاتھ۔۔۔ بڑھا دیا۔

حبیب محتاط ہو گیا۔ اس نے خطرہ محسوس کر لیا تھا۔ اس کی آنکھیں سونیا کے چہرے کو فوکس کیے ہوئے تھیں۔



شہزاد بغور اس کا جائزہ لے رہا تھا پھر وہ اچانک بولا۔ ”بیٹھ جائیں مسٹر حبیب۔“ تاہم شہزاد فردی لہجے کی کڑواہٹ کو دبانے میں پوری طرح کامیاب نہیں ہوا۔

”مسز پرویز مجھے بتا رہی تھیں کہ اس روز کیا ہوا۔“

شہزاد فردی نے پھر کہا۔ ”پرویز صاحب آخری چال چل کر کرسی میں گر گئے تھے... یقیناً آپ بھی اس بیان کی تصدیق کریں گے۔“

حبیب نے سر ہلایا۔ ”ایسا ہی ہوا تھا۔“

شہزاد کھڑا ہو گیا۔ ”میں جانتا ہوں کہ پرویز کی شطرنج کی ساکھ اچھی تھی۔ آئیے گیم روم میں چلتے ہیں۔“

حبیب نے اثبات میں سر ہلایا۔ اچانک ڈرائنگ روم میں دو پولیس اہلکار داخل ہوئے۔ شہزاد فردی نے بے نیازی کا مظاہرہ کیا لیکن سونیا و حبیب کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ تاہم وہ شہزاد فردی کے ساتھ کھیل کے کمرے میں آ گیا۔

سونیا کی دھڑکنیں بے قابو ہو گئیں۔ اسے یقین ہو چلا تھا کہ اس آٹکھوں والے نے دال کالی کر دی ہے... تاہم وہ اس معصے کو حل نہیں کر پا رہی تھی... ڈاکٹر سرٹیفکیٹ دے چکا تھا۔ ہر چیز بظاہر ٹھیک تھی۔ ”ڈریم چیچ“ کے انکشاف نے اسے ہلا دیا تھا... لیکن اس سے کیا ثابت ہو سکتا ہے؟ وہ ساکت، بے جان سی کمرے کے وسط میں کھڑی تھی۔ دونوں پولیس اہلکار اسے دیکھ رہے تھے۔

دفعتاً حبیب، کھیل کے کمرے سے برآمد ہوا... اس کا چہرہ سفید پڑ گیا اور اعصاب منتشر محسوس ہو رہے تھے... ”تم نے بساط پر مہروں کو چھوا تھا۔“ وہ جیسے چیخ پڑا۔ ”تم احمق! کم عقل عورت... تم نے سب کچھ برباد کر دیا۔“

حبیب کے چہرے کی سفیدی، سرخی میں بدلنے لگی... سونیا نے بے عزتی کے ساتھ دہشت محسوس کی۔

”سونیا پرویز، تم لوگوں کا منصوبہ اپنے انجام کو پہنچ گیا۔ حبیب صاحب تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ آخری چال آپ کے مقتول شوہر نے نہیں چلی تھی۔“ شہزاد فردی نے پہلی بار مقتول کا لفظ استعمال کیا۔ سونیا کم صدم کھڑی تھی۔

”پوسٹ مارٹم میں، زہر کی ”مخصوص“ قسم دریافت کر لی گئی تھی جو مقتول کے معدے میں تھی۔ یہ ایک مشکل کام تھا لیکن جدید فارنسک ٹیکنیک کے ذریعے چند سراغ ہمیں مل گئے تھے۔ گھبراہٹ میں چند مہرے بساط پر لڑھک گئے تھے جن کو بعد ازاں حبیب کی غیر موجودگی میں تم نے دوبارہ سیٹ کر دیا تھا۔ غالباً اس وقت حبیب صاحب پولیس کو فون کر رہے تھے۔ کیونکہ آپ ایک بیوہ کی کامیاب

اداکاری میں مشغول تھیں۔“

سونیا کی آنکھوں میں الجھن تیر رہی تھی۔ وہ شہزاد فردی کی بات سمجھنے سے قاصر تھی۔

”اس سے کیا ہوتا ہے، ڈاکٹر...“ سونیا کی آواز لڑکھڑائی۔

”آپ بھول رہی ہیں کہ آپ کو شطرنج کے بارے میں کچھ پتا نہیں... ڈاکٹر اور پولیس میں بھی عموماً شطرنج نہیں کھیلتے... مسز سونیا پرویز آپ نے مہروں کو ہاتھ لگا کر خوف ناک غلطی کی۔“ شہزاد فردی کہتا رہا۔ ”پہلے دن بساط دیکھتے ہی مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ آخری چال آپ کے شوہر نے نہیں چلی تھی۔“

سونیا پھٹی پھٹی نظروں سے شہزاد فردی کو دیکھ رہی تھی۔

”لہذا میں نے فوراً ہی پوسٹ مارٹم کے احکامات جاری کر دیئے تھے۔ تاہم ہمیں اعتراف جرم کی بھی ضرورت تھی... اعتراف کے بعد اس تفصیل میں جانا بیکار ہے کہ پچھلے دنوں میں کہاں کہاں بھاگتا رہا... بشمول ڈریم چیچ“ شہزاد فردی نے اشارہ کیا اور پولیس اہلکاروں نے حبیب کے لیے ہتھکڑیاں نکال لیں۔

”کس نے کیا ہے اعتراف؟“ سونیا چلا اٹھی۔

شہزاد فردی نے اس کے محل حواس کو نظر انداز کیا اور گویا ہوا۔ ”میرا قیاس تھا کہ حبیب کی نظر جب دوبارہ چھپس بورڈ پر پڑے گی تو وہ بوکھلائے بغیر نہیں رہے گا اور ہمارے مطلب کی کوئی نہ کوئی بات اس کے منہ سے ضرور نکلے گی۔ خادم شاطر کی نفسیات سے خوف واقف ہے۔“ شہزاد فردی مسکرایا۔ ”ہمیں مطمئن کرنے کے لیے وہ ضرورت سے زیادہ ہی کہہ گیا۔“

”آخری سوال۔“ شہزاد فردی نے سونیا کو مخاطب کیا۔ ”آپ کے شوہر سفید مہروں سے کھیل رہے تھے؟“

”ہونہہ...“ سونیا نے مردہ آواز میں جواب دیا۔

”حبیب صاحب بھی ادھورے کھیل میں بساط پر لگے مہروں کو دیکھ کر دنگ رہ گئے تھے۔“

”جو بکواس کرنی ہے... کر ڈالو۔“ سونیا پھٹ پڑی۔

”کوئی شاطر دونوں فیل ایک قطار میں نہیں رکھ سکتا کبھی نہیں رکھ سکتا... یہ ناممکن ہے... اور آپ نے گرا ہوا کالا فیل بھی سفید خانے میں رکھ کر لاعلمی میں فاش غلطی کی۔“

شہزاد فردی نے اُداس نظروں سے باری باری حبیب اور سونیا کو دیکھا اور باہر نکل گیا۔



امکانات و تغیرات کے بغیر کچھ ممکن نہیں... یہ امکانات و تغیرات کبھی
حسین ہوتے ہیں اور کبھی اذیت و ایذا کا سبب بن جاتے ہیں... نوجوانی کے
جوش و جذبوں میں وہ طوفانی تندی و تیزی ہوتی ہے... کہ سامنے کی
بات بھی سمجھ میں نہیں آتی... جب طوفان گزر جاتا ہے... لہریں ہموار
اور سبک ہو جاتی ہیں تو ہر بات آئینے کی طرح صاف و شفاف نظر آنے
لگتی ہے... زندگی کے ابتدائی موڑ پر بچھڑ جانے والے محبت کے پروانے...
جب ملے تو سلگتی چنگاری ایک بار پھر بھڑک اٹھی...

بازی عشق میں دغا بازی کی ملاوٹ کا تلخ و کسلا واقعہ

حساب برابر

لبستی زبیر

چالیس سالہ ایس بی شرافت فتح خان لٹچ سے
فارغ ہوا تھا اور اس وقت کسی قدر غنودگی محسوس کر رہا تھا۔ لٹچ
کے بعد اکثر تھانوں میں سستی کا رائج ہوتا ہے۔ رات بھر کی
محنت مشقت اور صبح سویرے آنے والوں کو نمٹاتے ہوئے
اہلکار دوپہر تک خاصے نڈھال ہو چکے ہوتے ہیں اور اس
پر مرغن لٹچ سونے پر سہاگ کا کام کرتا ہے اس لیے دوپہر کا
وقت تھانے میں سکون اور امن کا وقت ہوتا ہے لیکن شرافت
فتح خان اول تو تھانے میں نہیں تھا، وہ انویسٹی گیشن میں تھا



اور ہیڈ کوارٹر میں براہ راست ڈی آئی جی کے ماتحت تھا۔ دوسرے اسے لنچ کے بعد سونے کی عادت نہیں تھی۔ برسوں سے اس کا معمول تھا۔ وہ صبح چھ بجے اٹھ جاتا اور اس کے بعد بارہ بجے سے پہلے بستر پر نہیں جاتا تھا۔ شادی کے بعد بھی اس کا یہ معمول برقرار رہا تھا۔ ایکسرسائز اور معمولات کی باقاعدگی نے اسے فٹ رکھا ہوا تھا۔

شرافت خان کے خاندان میں پولیس والوں کی بھرمار تھی۔ اس کا باپ خود ریٹائرڈ ڈی آئی جی تھا۔ اس کے دو بھائی پولیس میں تھے۔ چاچاؤں اور ماماؤں میں بھی پولیس والوں کی کمی نہیں تھی۔ پیچھے سے کھاتا پیتا آیا تھا اور ملازمت میں آنے کے بعد بھی شرافت خان نے کھانے پینے میں کوتاہی نہیں کی تھی لیکن وہ ہاتھ پاؤں بچا کر کام کرنے کا عادی تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس ملک میں کسی پولیس والے کا کچھ نہیں بگاڑا جاسکتا۔ جس سال اس کی شادی ہوئی، اسی سال وہ انسپٹر بنا اور اب اس کے چار بچے تھے۔ اس کی بیوی سارہ شادی کے دس سال بعد بھی خوب صورت تھی اور اس کے ہوتے ہوئے شرافت خان کو کسی اور طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں تھی لیکن ماضی میں اس کے روابط کئی خوب صورت عورتوں سے رہے تھے۔ البتہ شادی کے بعد اس نے یہ ڈگر چھوڑ دی تھی اور صرف اپنی بیوی کا ہو کر رہا تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ اب موقع نہیں رہا تھا۔ مواقع تو ایس پی بننے کے بعد بے حساب ہو گئے تھے۔ یہ اس کا اپنا فیصلہ تھا کہ کم سے کم اس معاملے میں قدم نہیں ہٹکنے چاہئیں۔

چاق و چوبند ہونے کے لیے شرافت خان نے چائے منگوائی اور کمپیوٹر پر انویسٹی گیشن کے لیے آنے والی کچھ درخواستیں دیکھنے لگا۔ اچانک اس کے موبائل کی گھنٹی بجی تو اس نے کمپیوٹر اسکرین سے نظر ہٹا کر موبائل دیکھا۔ ایک اجنبی نمبر تھا۔ اس کی پیشانی پر شکنیں آ گئیں۔ وہ عام طور سے اجنبی نمبر سے آنے والی کالز ریسیو نہیں کرتا تھا۔ اس نے توجہ نہیں دی اور گھنٹی بج کر بند ہو گئی۔ اس کے ایک منٹ بعد ایس ایم ایس ٹون بجی اور اس بار اس نے موبائل اٹھا کر دیکھا۔ ایس ایم ایس اسی نمبر سے تھا اس نے پڑھا جہاں ایک سطر میں لکھا تھا۔

”شرافت! آئی ایم شیا۔۔۔ پلیز پک مائی کال۔“

شرافت خان کچھ دیر کے لیے ساکت ہو گیا۔ اس کا ذہن ماضی کے ان گوشوں میں چلا گیا جب وہ کالج میں پڑھتا تھا۔ یہ کوا بیکویشن کالج تھا اور شیا اس کے ساتھ پڑھتی تھی۔ شرافت آج بھی سرخ و سفید رنگ کا وجیہ آدمی تھا۔

اس وقت اس کی خوش روئی دیکھنے والی تھی۔ لڑکیاں اسے کالج کا خوب صورت ترین لڑکا کہتی تھیں۔ اسی طرح شیا کا شمار کالج کی خوب صورت ترین لڑکیوں میں ہوتا تھا۔ دوسروں نے ان کے علم میں لائے بغیر ان کی جوڑی بنادی تھی اور پھر رفتہ رفتہ یہ بات ان تک بھی پہنچ گئی تو وہ ایک دوسرے کے قریب آ گئے۔ اس وقت شرافت شیا کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ بس اتنا پتا تھا کہ اس کا تعلق کسی بڑے خاندان سے ہے۔ وہ صبح ایک شاندار کار میں آتی تھی۔ ڈرائیور اتر کر اس کے لیے دروازہ کھولتا تو وہ نیچے قدم رکھتی تھی۔

اس کے بدن پر یونیفارم قیمتی کپڑے کا ہوتا تھا اور اس کے نازک پیروں میں مہنگے ترین سینڈلز ہوتے تھے۔ جیولری اور میک اپ پر پابندی تھی لیکن وہ اس کے بغیر بھی سب سے حسین نظر آتی تھی۔ اس کے ساتھ شرافت کو پتا نہیں چلا کہ چار سال کیسے گزرے۔ صرف شیا کی خاطر وہ روز کالج جاتا تھا ورنہ اسے پڑھنے لکھنے سے بہت زیادہ شغف نہیں تھا۔ فائنل ہوئے اور پھر اسے پتا چلا کہ اب وہ اور شیا روز نہیں مل سکیں گے۔ جس دن آخری پرچہ تھا، اس دن وہ ایک ریسٹوران میں ملے۔ یہ پہلی اور آخری مرتبہ تھا کہ وہ کہیں باہر ملے تھے۔ اس ملاقات میں شرافت نے کھل کر اس سے حال دل کہا۔ اس کا خیال تھا کہ شیا اس کے اظہار محبت کو قبول کر لے گی لیکن وہ خاموشی سے کولڈ ڈرنک پیتی رہی جب شرافت کے پاس کہنے کو کچھ نہیں رہا تو وہ بولی۔

”یہ ممکن نہیں ہے۔“

شرافت کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا کیونکہ گزشتہ چار سالوں میں شیا کی ایک ایک ادا اور بے شمار جملوں نے اسے بار بار یقین دلایا تھا کہ اس کے دل میں بس وہی ہے اور اب وہ کہہ رہی تھی کہ یہ ممکن نہیں ہے۔ ”کیوں...؟“

”کیونکہ میں ایک طوائف زادی ہوں۔“ شیا نے اسی سکون سے کہا۔ ”میں اس خاندان سے تعلق رکھتی ہوں جس میں نسب ماں سے چلتا ہے اور باپ کو کوئی نہیں جانتا۔“ یہ شرافت کے لیے زیادہ بڑا شاک تھا۔ اس نے ناقابل یقین لہجے میں کہا۔ ”تم غلط کہہ رہی ہو... مذاق کر رہی ہو۔“

”شرافت! تمہارے خیال میں کوئی لڑکی اس قسم کا مذاق کر سکتی ہے؟ میری ماں نے مجھے اس اعلیٰ کالج میں اس لیے بھیجا تھا کہ میں تعلیم کے ساتھ اونچے طبقے کے طور طریقے

کچھ بھی نہیں بھولا تھا۔ دوبارہ کھنٹی بجی تو وہ چونکا اور شیبیا کا نمبر دیکھ کر اس نے کال ریسیو کی۔ ”ہیلو۔“
”شرافت۔“ شیبیا نے کہا۔
”بات کر رہا ہوں۔“

”سنو، مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔“ وہ بلا تمہید بولی۔ ”آج میں بہت مشکل میں ہوں اور تمہارے سوا کوئی مجھے اس مشکل سے نہیں نکال سکتا۔“

شرافت جو ذرا جذباتی ہو رہا تھا، شیبیا کی بات پر اس کے اندر کا پولیس مین بیدار ہو گیا۔ ”معاملہ پولیس کا ہے؟“
”ہاں لیکن میں پولیس کے پاس نہیں جاسکتی۔ یہ بات ایسی ہے کہ اس کے کھلنے پر میں مرنے کو ترجیح دوں گی۔“

”میں تو سمجھتا تھا کہ تمہاری زندگی میں ایسی کوئی چیز نہیں ہے۔“ شرافت نے سرسری سے انداز میں کہا۔
”ٹھیک ہے، تم میرے دفتر آ جاؤ۔“

”میں نہیں آ سکتی... پلیز شرافت! تم زحمت کر لو۔“
اس نے سوچا اور بولا۔ ”ٹھیک ہے میں آ رہا ہوں، اپنا پتا بتاؤ۔“

☆☆☆

ڈیفنس کی یہ شاندار کوٹھی اپنے منہ سے اپنے مکینوں کی امارت کا حال بتا رہی تھی۔ گیٹ پر دو باوردی گارڈز تھے۔ شرافت اپنی ذاتی کار میں آیا تھا، یہ اس حد تک ذاتی تھی کہ اس پر پولیس یا سرکاری نمبر پلیٹ نہیں تھی۔ شرافت نے اپنا چہرہ سی سی ٹی وی کیمرے کے سامنے کیا تو اندر شیبیا نے تصدیق کی اور گارڈز نے گیٹ کھول دیا۔ وہ گاڑی اندر لے آیا۔ کوٹھی کم سے کم چار کنال پر تھی اور عمارت کا طرز تعمیر دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ شرافت حیران ہوا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ شیبیا اتنی شاندار کوٹھی کی مالک ہوگی۔ پورچ میں ایک ملازم اس کا منتظر تھا۔ اس نے شرافت کی راہنمائی کی اور وہ اندر ایک خوب صورت مگر چھوٹے کمرے میں پہنچا۔ یہاں دبیز قالین کے ساتھ دو چھوٹے صوفے اور درمیان میں گلاس ٹاپ ٹیبل تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ یہ کمرادو افراد کی نشست کے لیے مخصوص ہے۔ ملازم نے جانے سے پہلے اس سے پانی یا کسی اور چیز کا پوچھا۔ شرافت نے شکریے کے ساتھ انکار کر دیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ شیبیا نے اسے کس معاملے میں مدد کے لیے بلایا ہے؟

چند منٹ بعد کمرے کا دروازہ کھلا اور شیبیا اندر آئی۔ شرافت نے اسے بیس سال بعد دیکھا تھا۔ وہ اس سے ایک برس چھوٹی یعنی انتالیس برس کی تھی۔ لیکن اس وقت جو شیبیا

بھی سیکھ سکوں، یہ سب آئندہ میرے کام آئے گا۔“
یہ شرافت کے لیے ایک اور ناقابل یقین بات تھی۔
”تم صرف اسی لیے کالج میں آئی تھیں؟“

”ہاں... ورنہ اور کس لیے آتی؟“ شیبیا نے اپنے ریشمی بال سنوارے۔ ”ہمارے پیٹھے میں اصل اہمیت تو جسم اور خوب صورتی کی ہوتی ہے۔ وہ میرے پاس ہے۔ البتہ تعلیم اور دوسری چیزوں سے مارکیٹ اچھی ہو جاتی ہے۔“

شرافت کو بڑی مشکل سے یقین آیا اور جب آیا تو اس نے شیبیا سے درخواست کی۔ ”ٹھیک ہے، تم نے اچھا کیا جو مجھے حقیقت بتادی مگر اس سے میری محبت پر کوئی فرق نہیں پڑا۔ مجھے تم سے محبت ہے۔ مجھے تمہارے خاندان سے کچھ لیتا دینا نہیں ہے۔“

شیبیا نے نفی میں سر ہلایا۔ ”حیرت ہے تم اب بھی نہیں سمجھتے۔ میں تمہیں بتانے آئی ہوں کہ آج ہماری آخری ملاقات ہے، کل سے مجھے اس دنیا میں داخل ہونا ہے جہاں میری نظر محبت کو نہیں صرف روپوں کو دیکھے گی۔ میری ہر بات ایک نئے پیچھے کے ساتھ گزرے گی۔“

”شیبیا! تم میرے ساتھ عزت کی زندگی گزارو گی۔“
وہ تمسخرانہ انداز میں ہنسی۔ ”عزت... یہ کس چیز کا نام ہے شرافت خان صاحب... ہم اس چیز سے نا آشنا ہیں۔ اور یہ تمہاری خام خیالی ہے کہ تم سے شادی کر کے مجھے کوئی عزت ملے گی۔ دوسروں کو چھوڑو، خود تمہارے خاندان والے مجھے منہ نہیں لگائیں گے۔ میں ابھی پاکباز ہوں، کسی مرد نے مجھے نہیں چھوا لیکن میں تیس چالیس سال بعد بلکہ مرتے دم تک طوائف ہی کہلاؤں گی۔ مجھے کیا ملے گا تم سے شادی کر کے... ذلت ہی کمائی ہے نا تو بندہ اپنی مرضی سے کمائے۔“

شرافت نے جان لیا کہ وہ شیبیا کو قائل نہیں کر سکے گا، لہذا اس نے شرافت کو قائل کر لیا۔ اس ملاقات کے بعد ان کی راہیں ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئیں اور آج اس بات کو بیس سال گزر چکے تھے۔ ان بیس سالوں میں شرافت نے کبھی شیبیا کے بارے میں جاننے کی کوشش نہیں کی کہ وہ کہاں تھی اور کیا کر رہی تھی۔ اگر وہ چاہتا تو ایک دن میں سب معلوم کر سکتا تھا۔ اس کے لیے یہ ذرا بھی مشکل کام نہیں تھا۔ اسے صرف کسی ایسے ایچ او کو کہنا پڑتا۔ شہر کی نوے فیصد ہائی کلاس کال گرلز کو وہ چہرے سے پہچانتا تھا مگر ان میں شیبیا شامل نہیں تھی۔ اس نے اسے اپنے ذہن سے نکال دیا مگر آج اتنے عرصے بعد ایس ایم ایس میں اس کا نام دیکھ کر شرافت کو ماضی یاد آ گیا تھا۔ اسے لگا کہ وہ خود کو دھوکا دیتا آیا تھا، وہ

اس کے سامنے کھڑی تھی، وہ کہیں سے انتالیس برس کی نہیں لگ رہی تھی۔ وہی مناسب بدن جواب مناسب ترین ہو گیا تھا۔ چمکتی دمکتی جلد اور چہرے کے دلکش نقوش سے وہ تیس سے زیادہ کی نہیں لگ رہی تھی۔ اس نے میکسی نما لباس پہن رکھا تھا جو سرسراتے ہوئے اس کے جسم پر ڈھلک رہا تھا۔ وہ ہلکورے لپٹی اس کے پاس آئی تو شرافت کھڑا ہو گیا۔ اس نے شیا کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا۔ ”مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم نے اتنی ترقی کی ہوگی لیکن ذاتی طور پر تم میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔“

”تھینک یو شرافت۔“ شیا نے اسے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ”شکر ہے تم نے میری بات رکھ لی۔“

”ہمارا تعلق ختم ہوا تھا، دوستی نہیں۔“ شرافت نے کہا۔ ”دوستی ملنے جلنے اور تعلق سے مشروط نہیں ہوتی، دوست پچاس سال بعد ملے تب بھی دوست ہوتا ہے۔“

”اور محبت...“ شیا نے آہستہ سے پوچھا۔

”وہ تعلق مانتی ہے۔“ شرافت نے صاف گوئی سے کہا۔ ”ختم محبت بھی نہیں ہوتی لیکن اگر تعلق نہ ہو تو پھر پہلے جیسی نہیں رہتی۔“

”باتیں ہوتی رہیں گی، یہ بتاؤ کیا ہو گے؟“

”میں سب پیتا ہوں لیکن ابھی میں صرف تمہارے کہنے پر آیا ہوں۔ تم بتاؤ کیا مسئلہ ہے؟“

شیا نے گہری سانس لی۔ ”شرافت! میری کچھ ذاتی چیزیں چوری ہو گئی ہیں۔“

”ذاتی چیزیں؟“ شرافت نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

اس بار بولتے ہوئے شیا ہچکچاتی۔ ”کچھ جیولری تھی شاید پانچ چھ لاکھ کی ہوگی۔“ اس نے یوں کہا جیسے پانچ چھ روپے کہہ رہی ہو۔ ”کچھ کیش تھا پانچ لاکھ سے اوپر ہوگا۔ لیکن اصل چیز چند تصویریں تھیں۔ مجھے زیور اور رقم کی پروا نہیں ہے لیکن وہ تصویریں ہر قیمت پر واپس چاہئیں۔“

شرافت غور سے سن رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ”خاص تصویریں تھیں؟“

شیا کا گلابی چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس نے سر ہلایا۔

”میری تھیں... کسی وقت میں ملک صاحب نے لی تھیں۔“

”ملک صاحب کون؟“

شیا نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ”تم نہیں جانتے؟ میں ملک ہدایت اللہ کی بات کر رہی ہوں۔ انہوں نے مجھ سے شادی کی تھی۔“

شرافت حیران ہوا۔ وہ کیا... ملک ہدایت اللہ کو سارا

ملک جانتا تھا۔ وہ وسطی پنجاب سے تعلق رکھنے والا سیاست دان تھا اور اس کا شمار ان چند سیاست دانوں میں ہوتا تھا جو کبھی وزیر، مشیر یا کسی عوامی عہدے پر نہیں رہے لیکن سیاسی پارٹیاں اس کی محتاج ہوتی تھیں۔ اس سے قطع نظر ہدایت اللہ کی سیاست کا وہی انداز تھا جو ملک میں رائج ہے۔ وہ الیکشن سے پہلے اپنا مفاد دیکھ کر اگلی پارٹی کا تعین کرتا تھا۔ اس کی سیٹ پکی ہوتی تھی اور کیونکہ وہ وزارت یا کوئی عہدہ بھی نہیں مانگتا تھا اس لیے ہر پارٹی میں مقبول تھا۔ ہر پارٹی کی کوشش ہوتی تھی کہ ہدایت اللہ اس سے مل جائے۔ ہدایت اللہ جدی پشتی جاگیر دار تھا۔ سیاست کے چالیس برسوں کے دوران میں اس کی زمینیں بڑھتی گئیں۔ صرف زمینیں ہی نہیں، اس نے بے شمار صنعتوں اور کاروبار میں بھی ہاتھ ڈالا ہوا تھا۔ ملک کے ہر اہم شہر میں اس کے کاروباری دفاتر اور عالی شان کوٹھیاں تھیں۔

لیکن یہ شرافت کے لیے اطلاع تھی کہ ہدایت اللہ نے شیا سے شادی کی تھی۔ اس شاک سے سنبھل کر اس نے سوال کیا۔ ”یہ کب کی بات ہے؟“

”کل رات...“

”میں تمہاری اور ملک صاحب کی شادی کی بات کر رہا ہوں۔“ شرافت نے اس کی بات کاٹی۔

”اوہ... اسے تو بارہ سال ہو چکے ہیں۔“ شیا نے کہا۔

”لیکن میں سال پہلے تمہارے خیالات کچھ اور تھے۔“

”اس وقت میں نا تجربے کار تھی اور میرے منہ میں میری ماں کی زبان بولتی تھی۔ وہ کب چاہتی کہ میں شادی کر لوں اور ہمیشہ کے لیے اس کے ہاتھ سے نکل جاؤں۔“ شیا کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ ”آٹھ سال... پورے آٹھ سال میں اس کے ہاتھوں کھلتی رہی اور پھر مجھے عقل آئی۔“

”یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ تمہیں ملک صاحب مل گئے۔“

”تم چاہو تو ایسا ہی سمجھ لو۔“ شیا کا لہجہ سپاٹ ہو گیا۔

”لیکن یہ سچ ہے کہ میں ذلت کی زندگی سے تنگ آ گئی تھی۔ اگر ملک صاحب نہ ملتے تب بھی میں سب چھوڑ دیتی اور بھاگنا پڑتا تو بھاگ جاتی۔“

”اوکے، میں مان لیتا ہوں تم تنگ آ گئی تھیں اور تم نے اسی لیے ملک صاحب سے شادی کی اور یہ شادی بارہ سال قائم رہی۔“

شیا افسردہ ہو گئی۔ ”تم سمجھو گے شاید میں جھوٹ بول رہی ہوں لیکن یہ سچ ہے کہ ان بارہ برسوں میں ملک

جارج بش پریشان تھے کہ ان کی مقبولیت میں روز بروز کمی آرہی ہے اور امریکی انہیں احمق تک کہنے لگے ہیں۔ انہوں نے ملکہ معظمہ سے رابطہ کیا۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ بش کو اپنے معتمد ساتھیوں میں ذہین لوگوں کو شامل کرنا چاہیے۔ اپنی کارکردگی جتانے کے لیے ملکہ نے ٹونی بلیئر کو بلایا اور پوچھا۔ ”تمہارے گھر میں ایک بچہ پیدا ہوتا ہے۔ وہ تمہارا بھائی ہے نہ بہن... بتاؤ وہ کون ہے؟“

ٹونی نے برجستہ کہا۔ ”وہ میں خود ہوں۔“

بش نے بات گرہ میں باندھ لی۔ ڈک چینی کو بلا کر بش نے وہی سوال کیا۔ ڈک چینی کی پیشانی پر ہل پڑ گئے۔ اس نے کہا۔ ”بڑا مشکل اور ٹیڑھا سوال ہے۔ میں ابھی جواب پتا کر کے آتا ہوں۔“

ڈک چینی بھاگا بھاگا کولن پاؤل کے پاس گیا۔ کولن پاؤل نے وہ سوال سنتے ہی کہا۔ ”وہ میں ہی ہوں۔“

ڈک چینی اٹنے قدموں لوٹ گیا۔ اس نے بش کو آگاہ کیا۔ ”سراوہ بچہ کولن پاؤل ہے۔“

بش نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ”تم نرے گھامڑ اور بے وقوف ہو... کولن نہیں، وہ بچہ ٹونی بلیئر ہے... ٹونی! اس نے ملکہ کے سامنے یہی بتایا تھا۔“

(دہائی سے آباد اظہار کی برجستگی)

مجھ سے زیادہ خوب صورت ہے۔ بچے نہیں ہیں اور اس کی بی بی آر بہت ہے۔ جلد اسے کوئی دوسرا مل جائے گا۔ ویسے ملک صاحب نے بھی اسے بہت کچھ دیا ہوگا۔

”ملا تو تمہیں بھی بہت کچھ ہے۔“

”کہاں... صرف بالائی ہے، اصل دودھ تو اصل وارثوں کو چلا گیا۔“ شیبہ کے منہ سے جیسے اچانک نکلا اور پھر وہ یک دم چپ ہو گئی۔

”ٹھیک ہے، مجھے دکھاؤ۔“ شرافت کھڑا ہو گیا۔

”چوری کہاں ہوئی اور چور کہاں سے آیا۔“

”میرے ساتھ آؤ۔“ شیبہ نے کہا اور اسے کوٹھی کے اندرونی حصے میں لائی۔ یہاں بیڈروم تھے اور ان میں ایک بیڈروم اس کا تھا۔ یہ ناقابل یقین حد تک پرلچیش تھا۔ شرافت نے پُرخیال انداز میں اس کا جائزہ لیا اور بولا۔

”ملک صاحب اس عمر میں بھی شوقین مزاج آدمی تھے۔“

شیبا جھینپی۔ ”ہاں، اللہ نے صحت اور دولت دے رکھی تھی تو شوقین کیوں نہ ہوتے۔ پھر کوئی گناہ تو نہیں کیا نا۔“

”میں نے کب کہا۔“ شرافت بولا۔ ”لیکن اب یہ

صاحب کے ساتھ مجھے جو سکھ ملے، وہی میری زندگی کا حاصل ہیں۔ انہوں نے مجھے سب دیا لیکن سب سے انمول چیز ان کی محبت اور ان کا اعتماد تھا۔ میں نے ان کے منہ سے ایک بار بھی کبھی اپنے ماضی کا طعنہ نہیں سنا۔ وہ عمر میں مجھ سے تیس سال بڑے تھے مگر یہ فرق بھی کبھی آڑے نہیں آیا۔ چند مہینے پہلے وہ دنیا سے گئے تو مجھے لگا میری تو کائنات ہی لٹ گئی ہے۔“

شرافت نے ہاتھ پھیلائے۔ ”یہ کوٹھی بھی ملک صاحب کی ہے؟“

”نہیں، یہ انہوں نے شادی کے کچھ عرصے بعد میرے نام کر دی تھی۔ صرف یہی نہیں بلکہ اور بھی بہت کچھ میرے نام کیا۔ میں اور میرے بچے بہت آرام سے گھر بیٹھ کر ساری عمر کھا سکتے ہیں۔“

شرافت پھر چونکا۔ ”بچے... تمہارے بچے ہیں؟“

”کیوں، کیا میرے بچے نہیں ہو سکتے؟“

وہ جھینپ گیا۔ ”میرا یہ مطلب نہیں ہے۔ آئی مین تم دیکھنے میں کہیں سے بچوں کی ماں لگتی نہیں ہو۔“

”میرے تین بچے ہیں۔ سب سے بڑا گیارہ سال کا راحت ہے، اس سے چھوٹا نو سال کا فرحت ہے اور چھ سال کی بیٹی اریبا ہے۔“ شیبہ نے بتایا اور پھر ہچکچاتے ہوئے بتایا۔ ”یہ تصویریں ملک صاحب نے راحت کی پیدائش کے بعد لی تھیں۔“

”اتنے عرصے سے تم نے یہ تصویریں سنبھال کر رکھی تھیں اب ایسی کیا بے پروائی کی جو...“

”میں نے بے پروائی نہیں کی۔“ شیبہ اس کی بات کاٹ کر بولی۔ ”تصویریں، زیورات اور رقم کے ساتھ سیف میں تھیں۔ چور نے اسے کھولا اور دوسری چیزوں کے ساتھ تصویریں بھی لے گیا۔“ کہتے ہوئے شیبہ روہانسی ہو گئی۔ ”پلیز شرافت... کچھ کرو ورنہ میں کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہوں گی۔“

”میرا خیال ہے بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ تم ہدایت اللہ کی بیوی تھیں۔ ویسے میری معلومات کے مطابق ان کی دو بیویاں اور بھی ہیں۔“

”مجھے معلوم ہے۔ میں ہی تو ان کی تیسری بیوی ہوں۔ پہلی خاندان سے ہے وہ اور اس کے بچے اب ملک صاحب کے وارث شمار ہوں گے۔ زمینوں کے بھی اور سیاست کے بھی۔“ شیبہ کا لہجہ ہلکا سا تلخ ہوا۔ ”دوسری اسلام آباد میں ہے، وہ ایک طرح سے ان کی سیکریٹری بھی تھی۔ وہ

سب یہاں سے ہٹا دو۔“ اس نے تصویروں اور مجسموں کی طرف اشارہ کیا۔ ایک طرف بار بھی تھا۔ ”تمہارے بچے ہیں، کیا وہ یہاں نہیں آتے؟“

”ملک صاحب کی زندگی میں انہیں یہاں آنے کی اجازت نہیں تھی۔ ان کے بعد میں نے یہ کمرابند کر دیا۔ اب میں دوسرے کمرے میں سوتی ہوں۔ بچے اب بھی یہاں نہیں آتے ہیں۔“

”سیف کہاں ہے؟“

شیبا نے دیوار پر لگی ایک دیہاتی لڑکی کی پینٹنگ بٹائی، وہ پٹ کی طرح کھل گئی۔ اس کے پیچھے چھوٹی ٹی فولادی تجوری تھی۔ یہ چابی سے کھلنے والی تجوری تھی۔ کسی نے ڈرل کی مدد سے اس کا سوراخ بڑا کر کے اندر سے لاک کونا کارہ بنا کر تجوری کھول لی تھی۔ بڑا آسان طریقہ تھا لیکن کام کرنے والا اپنے کام میں ماہر تھا۔ شرافت نے جھک کر دیکھا اور پھر اپنے موبائل کی بیم لائٹ سوراخ پر مرکوز کر کے دیکھی۔ دھات جھک رہی تھی۔ یہ گن میٹل تھا جو یقیناً اتنی آسانی سے نہیں کٹتا۔ شرافت نے پوچھا۔ ”چوری اندازاً کس وقت ہوئی؟“

”میں یقین سے بتا سکتی ہوں، کل رات دس سے بارہ کے درمیان یہ کام ہوا ہے۔ میں بچوں کو لے کر آئس کریم کھلانے.... گئی تھی۔ کچھ دیر ہم نہر کے کنارے ڈرائیو بھی کرتے رہے تھے اس لیے واپسی تک بارہ بج گئے۔ میں نے واپس آ کر بچوں کو ان کے کمروں میں بھیجا اور اپنا کچھ زیور یہاں رکھنے آئی تو سیف کو کھلا دیکھا۔“

”گھر میں اس وقت کوئی نوکر یا ملازمہ تھی؟“

”نہیں، نوکر اور ملازما میں رات نو بجے کے بعد یہاں نہیں ہوتے ہیں۔ میں تمام دروازے کھڑکیاں اندر سے بند کر لیتی ہوں۔“

”کل رات جاتے وقت بھی تم نے تمام دروازے کھڑکیاں بند کی ہوں گی؟“

”بالکل، یہ میری عادت ہے۔“

”تب چور کہاں سے اندر آیا؟“

شیبا نے اسے پرانے طرز کے ونڈو اے سی کا ڈک دکھایا۔ کیونکہ بعد میں یہاں اسپلٹ اے سی لگ گیا تھا اس لیے اس ڈک کو اندر سے لکڑی کا خوب صورت ٹینل لگا کر بند کر دیا گیا اور باہر لوہے کا کھانچہ پہلے ہی لگا ہوا تھا جس پر اے سی لگایا جاتا ہے۔ چور نے آری سے دیوار کے ساتھ لگے اس کے چاروں اسکر وکٹ دیے تھے اور پھر لکڑی کا

ٹینل ہٹا کر اندر گھس آیا تھا۔ کیونکہ یہ حصہ سرونٹ کو آرٹر سے بھی دور تھا اور مین گیٹ سے بھی اس لیے اگر شور ہوا تو بھی کسی نے نہیں سنا اور چور آرام سے اپنا کام مکمل کر کے عقبی دیوار پھلانگ کر واپس چلا گیا۔ وہ آیا بھی اسی طرف سے تھا۔ کوئی سڑکل پٹی پر بھی یعنی اس کے دونوں طرف گلی تھی البتہ اس طرف والی گلی سنان اور آمدورفت سے خالی تھی۔ شرافت نے اپنا معائنہ مکمل کر کے پوچھا۔

”یہاں کتنے ملازم اور ملازما ہیں ایسی ہیں جو اندر آتے ہیں؟“

”گارڈ اور مالی تو باہر ہی رہتے ہیں۔ تین ملازما ہیں اور تینوں ماں بیٹیاں ہیں۔ مالی کی بیوی اور بیٹیاں ہیں۔ یعنی ایک ہی خاندان ہے۔ بس وہی اندر آتی ہیں۔ کبھی کبھی کچھ منگوانا ہو تو مالی خود آ جاتا ہے۔ ڈرائیور یہاں نہیں رہتا۔ وہ صبح سے رات تک ہوتا ہے۔ اسی طرح گارڈز بھی کمپنی کے ہیں۔ ان کی ڈیوٹی ختم ہوتی ہے تو اپنے گھر چلے جاتے ہیں۔“

”گویا یہاں صرف مالی اور اس کی فیملی رہتی ہے؟“

”ہاں لیکن یہ ان کا کام نہیں ہے۔ یہ بیس برس سے یہاں ہیں اور ملک صاحب کے گاؤں کے ہیں۔ ہم ان پر آنکھ بند کر کے اعتبار کرتے ہیں۔“

”تم لوگ یقیناً کرتے ہو لیکن پولیس اگر آنکھ بند کر کے اعتبار کرنے لگے تو کوئی کیس ہی نہ حل ہو اور نہ کوئی مجرم پکڑا جائے۔ ننانوے فیصد کیسز میں مجرم سب سے قریبی آدمی ہی نکلتا ہے۔ لیکن اس معاملے میں شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو کیونکہ یہ پیشہوروں کا کام لگ رہا ہے۔ بہر حال، میں دیکھتا ہوں۔“

شیبا نے پاس آ کر اس کا بازو تھام لیا اور ہتھی لہجے میں بولی۔ ”کوشش نہیں شرافت، پلیز یہ کام ہونا چاہیے۔ مجھے چور کی گرفتاری بھی نہیں چاہیے۔ میں اس سے کچھ واپس نہیں مانگوں گی۔ بس مجھے وہ تصویریں دے دے۔“

شیبا اتنے قریب آ گئی تھی کہ شرافت اس کی مہک اور بدن کی گرمی بھی محسوس کر سکتا تھا۔ شیبا اس سے تقریباً لگ گئی تھی۔ شرافت نے اس کی آنکھوں میں دیکھا تو اسے واضح پیغام نظر آیا۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر اس نے گہری سانس لے کر شیبا سے بازو چھڑا لیا۔ اس کی آنکھوں کا پیغام بھگ گیا اور وہ مرجھائے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”شاید تمہارے دل میں میرے لیے کچھ باقی نہیں رہا ہے۔“

”بیس سال طویل عرصہ ہوتا ہے۔“ شرافت نے نرمی

شرافت نے اس سے ملک ہدایت اللہ کے بارے میں پوچھا تو نعیم ٹیپ ریکارڈر کی طرح بجنے لگا۔ شرافت غور سے سن رہا تھا۔ درمیان میں وہ سوالات بھی کرتا رہا۔ شرافت کا خیال تھا کہ وہ ملک ہدایت اللہ کے بارے میں جانتا ہے لیکن نعیم کی معلومات سے اسے اندازہ ہوا کہ وہ تو دس فیصد بھی نہیں جانتا۔ نعیم نے بڑے انکشافات کیے تھے۔ ایک گھنٹے بعد اس نے اسے واپس مزنگ چھوڑا تو اسے محسوس ہوا کہ اس کا خرچ ضائع نہیں کیا۔ نعیم نے اترتے ہوئے پیشکش کی تھی کہ اگر اسے ملک ہدایت اللہ یا اس کے لواحقین کے بارے میں مزید معلومات درکار ہیں تو وہ معلوم کر سکتا ہے، تب شرافت کو خیال آیا اور اس نے کہا۔ ”ہاں، کچھ معلومات مل جائیں تو بہتر ہوگا۔۔۔“

نعیم اس کی بات غور سے سن رہا تھا، اس نے سر ہلایا۔ ”مسئلہ ہی نہیں ہے۔ یہ تو اپنے لبور کی بات ہے آپ کہو تو میں ملک ہدایت اللہ کے گاؤں پہنچ جاؤں؟“

”نہیں اتنی دور جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ویسے کام تو یہیں کا ہے۔“

”میں آپ کو کل کسی وقت کال کروں گا اور جو معلوم ہوا گوش گزار کر دوں گا۔“

شرافت وہاں سے نکلتا تب بھی اس کا رخ گھر کی جانب نہیں تھا بلکہ وہ ڈیفنس کی حدود سے لگنے والے تھانے پہنچا۔ وہاں کا ایس ایچ او سبحان کاظمی، شرافت کے ساتھ کام کر چکا تھا اور اس کا نیاز مند تھا۔ اسے دیکھ کر وہ کھل اٹھا۔

”سر... سر! آج نصیب کھل گئے۔ آپ آئے ہیں۔“

”کام سے آیا ہوں یار۔“

”سر! یہ بھی تو نصیب ہی ہوئے نا کہ آپ کو ہم جیسے نکلے لوگوں سے کام پڑا ہے ورنہ ہم تو ترستے ہیں کہ آپ کچھ حکم کریں اور ہم تعمیل کریں۔“

اس کے منع کرنے کے باوجود سبحان نے اس کے لیے ایچل چائے منگوائی۔ چائے آنے تک شرافت نے اسے بتایا کہ وہ یہاں کیوں آیا ہے اور اسے ہر قیمت پر مطلوبہ شخص چاہیے۔ سبحان کاظمی غور سے سنتا رہا اور اپنے سامنے رکھے کاغذ پر نوٹ لکھتا رہا۔ جب شرافت نے بات مکمل کی تو اس نے سر ہلایا۔ ”میں سمجھ گیا سر! آپ بس چوبیس گھنٹے کی مہلت دیں اور کل اسی وقت زحمت کریں یا آپ جہاں کہیں میں وہاں آجاؤں سب کو لے کر۔۔۔“

”نہیں، میں یہیں آؤں گا مگر خیال رہے کوئی شور شرابا نہ ہو۔ مطلب سب خاموشی سے اور اندر ہی اندر ہو۔“

سے کہا۔ ”جیسے تمہاری شادی ہوئی اور اب بچے ہیں، ایسے ہی میری شادی بھی ہوگئی اور میرے بیوی بچے بھی ہیں۔“

”تمہاری بیوی یقیناً خوب صورت ہوئی؟“

”یہ تو مجھے نہیں پتا لیکن وہ مجھے دنیا کی سب سے خوب صورت عورت لگتی ہے۔“ شرافت نے اعتراف کیا۔ ”شیبا! میں پوری کوشش کروں گا، یہ میرا وعدہ ہے۔ تم جانتی ہو کہ میں وعدہ کرتا ہوں تو اسے نبھاتا بھی ہوں۔“

شیبا نے سر ہلایا۔ ”میں جانتی ہوں۔“

”مجھے اجازت دو۔ جیسے ہی کوئی بات علم میں آئی، میں تمہیں بتاؤں گا۔“ شرافت نے کہا۔ ”اور ہاں، مجھے مالی اور اس کی بیوی اور بیٹیوں کی تصاویر چاہئیں۔“

”ان کا کیا کرو گے؟“ شیبا نے پوچھا۔ شرافت نے جواب نہیں دیا تو اس نے اپنے پاس موجود ان چاروں کی فائل تصاویر لا دیں۔ یہ سب کی حالیہ تصاویر تھیں۔ شرافت انہیں لے کر وہاں سے رخصت ہو گیا۔ عام طور سے شرافت پانچ بجے دفتر سے اٹھ جاتا تھا، ہاں اگر کوئی میٹنگ ہوتی یا کوئی اہم معاملہ ہوتا تو وہ رک جاتا تھا۔ شیبا کے گھر سے نکلتے ہوئے اسے دیر ہوگئی تھی اور وہ واپس دفتر پہنچا تو چھ بج رہے تھے۔ اس نے پہلے گھر کال کر کے روٹی کو بتایا کہ وہ آج لیٹ آئے گا اور ممکن ہے کھانا بھی باہر کھائے۔ پھر اس نے ریکارڈ روم سے کچھ فائلیں منگوائیں اور انہیں دیکھتا رہا۔ آٹھ بجے اس نے ایک صحافی نعیم کو کال کی۔ نعیم لفافے والا صحافی تھا۔ یوں تو اس کے پاس دنیا جہان کی معلومات رہتی تھیں لیکن اگر اسے کہیں سے متوقع لفافہ نہیں ملتا تو وہ خاص طور سے ایسے شخص کی کھوج میں لگ جاتا اور اس کا سارا کچا چٹھا کھودلاتا تھا۔

شرافت کی آواز سن کر وہ چپکا۔ ”کیا بات ہے سر جی... بہت دنوں بعد یاد کیا؟“

”مزنگ فوڈ اسٹریٹ جا رہا ہوں... اگر ابھی کہیں سے دعوت نہیں ہے تو وہاں آجاؤ۔“

”سر جی! آپ کے لیے تو صدر وزیر اعظم کی دعوت چھوڑ دیں جی، میں آتا ہوں۔“

آدھے گھنٹے بعد وہ شرافت کے سامنے بیٹھا تھا۔ شرافت نے اس کی پسندیدہ چیزیں منگوائی تھیں۔ کھانے پر ہلکی پھلکی گفتگو ہوتی رہی۔ ”حکم کر دوسر کار۔“

”یہاں نہیں۔“ شرافت نے ایک بڑا نوٹ جو یقیناً بل سے زیادہ تھا، میز پر رکھا اور لڑکے کو اشارہ کیا تو وہ تیر کی طرح آیا۔ چند لمحے بعد وہ شرافت کی کار میں جا رہے تھے۔

بندے بے شک سوچو پر زیادتی کسی کے ساتھ نہ ہو اور نہ مار پیٹ ہو۔ میری بات سمجھ رہے ہوتا؟“

”آپ کے کہنے سے پہلے سمجھ گیا ہوں سر۔“ سبحان نے مستعدی سے کہا۔ ”آخر اتنے عرصے آپ کے ساتھ رہا ہوں، آنکھ کا اشارہ سمجھتا ہوں۔ آپ کو شکایت ہو تو بے شک میری کھال اتار کر ہاتھ میں رکھ دیتا۔“

”نہیں یار! تم ماتحت نہیں ہو دوست ہو اور دوستوں کے کام آیا جاتا ہے یا ان سے کام کہا جاتا ہے۔“

سبحان کاظمی خوش ہو گیا۔ ”یہ بھی عزت ہے سر میری کہ آپ نے دوست کہا۔ بس مجھے کل تک مہلت دیں۔“

اگلے دن وہ دفتر آیا تو شہباز کی کال آگئی۔ ”شرافت! کچھ معلوم ہوا؟“

”نہیں لیکن میں نے جال پھیلادیا ہے۔ اب دیکھو اس میں کتنی مچھلیاں آتی ہیں اور ان میں مطلوبہ مچھلی ہوتی ہے یا نہیں۔“

”پلیز ایسا نہ کہو...“ شہباز روہانسی ہو گئی۔ ”تم سوچ نہیں سکتے کہ میں کتنی ٹینس ہوں۔ اگر اس نے ان تصویروں کا غلط استعمال کر لیا تو میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گی۔“

”ایسا نہیں ہوگا۔“ شرافت نے نرمی سے کہا۔ ”ایک بار مطلوبہ شخص ہاتھ آ گیا تو سمجھ لو ایسا ہر راستہ بند ہو جائے گا کیونکہ وہ صرف بچ بولے گا اور اگر اس نے کچھ آگے کیا ہوگا تو وہ بھی میری گرفت سے نہیں بچ سکے گا۔“

شہباز خوش ہو گئی۔ ”شرافت! میں نے اسی لیے تم سے رابطہ کیا اور مجھے یقین ہے کہ تم وہ تصویریں تلاش کر لو گے۔ اگر تم نے یہ کام کر لیا تو شہباز کی جان بھی مانگو گے تو وہ خوشی سے دے دے گی۔“

”مجھے تمہاری جان کی ضرورت نہیں ہے۔ بس تم خوش رہو میرے لیے یہی کافی ہے۔“ شرافت نے کہا۔ ”اوکے، میں ذرا کچھ کام نمٹا رہا ہوں۔“

”ٹھیک ہے، میں شام کو کال کروں گی۔“

”نہیں، میں خود کروں گا۔“ شرافت نے اسے منع کیا۔

”اچھا، آج رات ڈنر میرے ساتھ کرونا... کچھ پرانی یادیں تازہ کریں گے۔“

”نہیں... یہاں سے میں تمہارے کام کے لیے جاؤں گا اور نہیں معلوم کہ اس میں کتنی دیر لگتی ہے۔“

”ٹھیک ہے، پر کام ہونے کے بعد تمہیں میری بات ماننا ہوگی۔“ شہباز نے خاص انداز میں کہا۔

”نہیں، میں شام کو کال کروں گی۔“

”نہیں، میں خود کروں گا۔“ شرافت نے اسے منع کیا۔

”اچھا، آج رات ڈنر میرے ساتھ کرونا... کچھ پرانی یادیں تازہ کریں گے۔“

”نہیں... یہاں سے میں تمہارے کام کے لیے جاؤں گا اور نہیں معلوم کہ اس میں کتنی دیر لگتی ہے۔“

”ٹھیک ہے، پر کام ہونے کے بعد تمہیں میری بات ماننا ہوگی۔“ شہباز نے خاص انداز میں کہا۔

”پہلے کام تو ہو جانے دو۔“ شرافت نے بغیر کسی رد عمل کے کہا۔ ”اوکے بائے۔“

موبائل رکھ کر اس نے فائلیں اپنی طرف کیوں اور کام میں لگ گیا۔ اس کی عادت تھی کہ روز کا کام روز نمٹاتا تھا۔

اس وجہ سے بعض اوقات اسے یہ سہولت بھی ہوتی تھی کہ وہ بغیر اطلاع کے چھٹی کر جاتا تھا۔ کیونکہ دوسروں کی طرح کام جمع کر کے اسے خود کو بہت مصروف ظاہر کرنے کی عادت نہیں تھی، اسی وجہ سے ساتھی افسران اس سے چڑتے بھی تھے۔ اپنے ماتحتوں سے عزت سے پیش آتا تھا اور ممکن حد تک انہی کا فیور کرتا تھا۔ ان کے کاموں کی ذمہ داریاں لیتا تھا اور آج تک اس نے کسی ماتحت پر ذمہ داری نہیں ڈالی تھی جیسا کہ دیگر افسران کا وتیرہ تھا کہ وہ اپنا کیا دھرا بھی ماتحتوں کے سر ڈال کر بری الذمہ ہو جاتے تھے۔ دوسرے معاملات میں بھی وہ ان کے کام آتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ دل سے شرافت کی عزت کرتے تھے اور جب کہیں اور چلے جاتے، تب بھی اسے یاد رکھتے تھے۔ جیسا کہ سبحان کاظمی کو وہ یاد تھا حالانکہ شرافت تین سال بعد اس سے ملا تھا مگر وہ ایک اشارے پر دل و جان سے اس کے لیے کام کرنے کو تیار ہو گیا تھا۔ دفتر میں اسے نعیم کا فون آیا اور اس نے شرافت کو کچھ نئی معلومات مہیا کیں۔

شام کو پہلے وہ گھر گیا۔ گزشتہ رات وہ تاخیر سے پہنچا تھا، بچے سو چکے تھے اور اس کی چھوٹی بیٹی اس سے ناراض تھی۔ شرافت نے اسے منایا، ڈنر کیا اور بچوں کو نذر دیکھی آکس کریم پارلر لے جا کر آکس کریم کھلائی اور پھر تیار ہو کر روانہ ہوا۔ روٹی کو اس نے پہلے بتا دیا تھا کہ شاید آج دیر ہو جائے۔ روٹی کے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ وہ جانتی تھی کہ شرافت ایک پولیس افسر ہے اور اسے دن کے علاوہ بھی ڈیوٹی پر جانا پڑتا ہے۔ اس نے بھی شرافت کے اس معاملے میں دخل نہیں دیا تھا۔ وہ تھانے پہنچا تو سبحان کاظمی اس کا مختصر تھا۔ اس نے کہا۔ ”سر! پہلے ٹھنڈا گرم کر لیتے ہیں۔“

”نہیں۔“ شرافت نے انکار کیا۔ ”یہ معاملہ زیادہ ضروری ہے، ٹھنڈا گرم بعد میں دیکھا جائے گا۔“

سبحان کاظمی نے پہلے رپورٹ دی۔ ”سر! آپ نے جو بتایا تھا اس کی روشنی میں ہماری نظر میں سات بندے ہیں ان میں سے دو جیل میں ہیں، ایک یہ کام چھوڑ چکا ہے اور اس کی تالے چابی کی دکان ہے۔ باقی چار ابھی دھندے میں ہیں۔ لیکن میں نے پانچوں کو بلا لیا ہے۔ ابھی کچھ نہیں کہا ہے بس بند کیا ہوا ہے۔“

”نہیں۔“ شرافت نے انکار کیا۔ ”یہ معاملہ زیادہ ضروری ہے، ٹھنڈا گرم بعد میں دیکھا جائے گا۔“

سبحان کاظمی نے پہلے رپورٹ دی۔ ”سر! آپ نے جو بتایا تھا اس کی روشنی میں ہماری نظر میں سات بندے ہیں ان میں سے دو جیل میں ہیں، ایک یہ کام چھوڑ چکا ہے اور اس کی تالے چابی کی دکان ہے۔ باقی چار ابھی دھندے میں ہیں۔ لیکن میں نے پانچوں کو بلا لیا ہے۔ ابھی کچھ نہیں کہا ہے بس بند کیا ہوا ہے۔“

”نہیں۔“ شرافت نے انکار کیا۔ ”یہ معاملہ زیادہ ضروری ہے، ٹھنڈا گرم بعد میں دیکھا جائے گا۔“

سبحان کاظمی نے پہلے رپورٹ دی۔ ”سر! آپ نے جو بتایا تھا اس کی روشنی میں ہماری نظر میں سات بندے ہیں ان میں سے دو جیل میں ہیں، ایک یہ کام چھوڑ چکا ہے اور اس کی تالے چابی کی دکان ہے۔ باقی چار ابھی دھندے میں ہیں۔ لیکن میں نے پانچوں کو بلا لیا ہے۔ ابھی کچھ نہیں کہا ہے بس بند کیا ہوا ہے۔“

”نہیں۔“ شرافت نے انکار کیا۔ ”یہ معاملہ زیادہ ضروری ہے، ٹھنڈا گرم بعد میں دیکھا جائے گا۔“

سبحان کاظمی نے پہلے رپورٹ دی۔ ”سر! آپ نے جو بتایا تھا اس کی روشنی میں ہماری نظر میں سات بندے ہیں ان میں سے دو جیل میں ہیں، ایک یہ کام چھوڑ چکا ہے اور اس کی تالے چابی کی دکان ہے۔ باقی چار ابھی دھندے میں ہیں۔ لیکن میں نے پانچوں کو بلا لیا ہے۔ ابھی کچھ نہیں کہا ہے بس بند کیا ہوا ہے۔“

”نہیں۔“ شرافت نے انکار کیا۔ ”یہ معاملہ زیادہ ضروری ہے، ٹھنڈا گرم بعد میں دیکھا جائے گا۔“

”نہیں سر! آپ کا شاگرد ایسی حماقت کر سکتا ہے... سب الگ الگ ہیں۔ ایک کو دوسرے کی خبر نہیں ہے۔“ سبحان کاظمی نے فخر سے کہا۔

شرافت خوش ہو گیا۔ ”یہ کیا نام نے کام۔“
”آپ کہیں تو انہیں باری باری لاؤں؟“

”ہاں، پہلے اسے لاؤ جس نے کام چھوڑ دیا ہے۔ اسے کہاں سے اٹھایا تھا؟“

”صبح دکان کی طرف جا رہا تھا، میں نے بلا کے موبائل میں بٹھالیا، کسی کو پتا نہیں چلا۔ اسے کہا کہ اپنے گھر والوں کو بتا دے اور ان سے کہے کہ وہ خاموش بیٹھیں، تم واپس آ جاؤ گے۔“

شرافت نے مطمئن ہو کر سر ہلایا۔ چند منٹ بعد ایک عمر رسیدہ شخص اس کے سامنے تھا۔ اس نے سفید کرتہ اور چار خانے کی لنگی باندھ رکھی تھی۔ سر اور خوشنخی داڑھی کے بال سفید ہو رہے تھے۔ شرافت نے اسے سامنے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا تو وہ کسی قدر حیرت کے ساتھ کرسی پر ٹک گیا۔ شرافت نے اس سے چند سوالات کیے۔ اسے یقین ہو گیا کہ وہ اس کام میں ملوث نہیں ہو سکتا۔ وہ ان محدودے چند مجرموں میں سے تھا جو صرف خوفِ خدا کی وجہ سے جرم کی راہ چھوڑتے ہیں۔ اس نے سبحان کو بلایا اور کہا۔ ”بابا کو گاڑی میں جہاں یہ کہیں چھڑوا دو۔“
بوڑھے نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ”نہیں سرکار! زحمت نہ کریں۔ میں خود چلا جاؤں گا۔“

”تمہیں گاڑی میں لائے تھے، اب گاڑی میں ہی واپس جاؤ گے۔“

سبحان نے اسے ایک موبائل میں روانہ کیا۔ شرافت نے دوسرا آدمی بلانے سے پہلے اس سے کہا۔ ”آئندہ اسے کسی معاملے میں مت بلانا۔ یہ اب سدھر گیا ہے۔“
”پتا ہے سر! ہمیں نہیں پتا ہوگا تو اور کسے پتا ہوگا کہ کون سدھرا ہوا ہے اور کون مزید بگڑ گیا ہے۔ اسے تو بس گرمی میں بلوایا تھا۔“
”ٹھیک ہے، دوسرے کو بھیجیو۔“

دوسرا ایک تیز طرار شخص تھا۔ وہ حال ہی میں چھ مہینے کی سزا کاٹ کر آیا تھا۔ شرافت نصف گھنٹے تک اس سے بات کرتا رہا اور اس نے خاص انداز میں گھما پھرا کر بار بار سوالات کیے اور اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ اس کام میں ملوث نہیں۔ پھر اچانک اسے مالی، اس کی بیوی اور بیٹیوں کی

شوہنشاہ شریف

گھریلو جھگڑے کے بعد بیوی نے اپنے کپڑے بکس میں رکھنا شروع کر دیئے۔

شوہر نے پوچھا۔ ”کہاں جانے کا ارادہ ہے؟“ بیوی نے جواب دیا۔ ”اپنی ماں کے گھر۔“
تھوڑی دیر کے بعد شوہر نے بھی اپنے کپڑے بکس میں رکھنا شروع کر دیا۔

جس پر بیوی نے پوچھا۔ ”تم کہاں جا رہے ہو؟“ شوہر نے اطمینان سے جواب دیا۔ ”اپنی ماں کے گھر۔“
بیوی نے سوال کیا۔ ”اور بچوں کا کیا ہوگا؟“ شوہر نے جواب دیا۔

”جب تم اپنی ماں کے یہاں جا رہی ہو اور میں اپنی ماں کے یہاں تو میرا خیال ہے کہ بچے بھی اپنی ماں کے یہاں جائیں گے۔“

لاٹری

پانچ بچوں کے باپ نے لاٹری میں ایک مہنگا کھلونا جیتا اور خوشی خوشی گھر لے آئے۔ سارے بچوں کو جمع کر کے کہا۔ ”وہ بچہ یہ کھلونا حاصل کرے گا جو بہت ہی فرماں بردار ہو اور کبھی اپنی ماں کو جواب نہ دیتا ہو۔ چاہے وہ کچھ بھی کہے۔“

جس پر پانچوں بچوں نے کچھ دیر سوچا اور ایک ساتھ کہا۔ ”ابو! آپ جیت گئے... یہ کھلونا آپ کا ہوا۔“

نظارہ کا

بیوی نے اپنے شوہر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”ہمارے پاس جو کتا ہے، وہ بہت ہوشیار اور چالاک ہے۔ یہ ہر روز صبح باہر سے اخبار اٹھا کر لاتا ہے۔“
شوہر نے کہا۔ ”یہ تو ہے مگر زیادہ تر پالتو کتے یہ کام روز ہی اپنے مالک کے لیے کرتے ہیں۔“
بیوی بولی۔ ”مگر ہم نے تو کبھی بھی کسی اخبار کا بل نہیں دیا۔ یہ دوسروں کے اخبار ہمارے لیے لاتا ہے۔“
(امریکا سے جاوید کاظمی کے شگفتہ پارے)

مرزا شہر کی مشینی زندگی سے اکتا کر ایک گاؤں میں منتقل ہو گئے۔ وہاں پہنچ کر انہوں نے ایک دیہاتی سے دو ہزار روپے میں بکری خرید لی۔ دیہاتی نے رقم لے کر انہیں گلے دن بکری دینے کا وعدہ کر لیا۔ وہ اگلے دن گئے تو دیہاتی نے منہ لٹکا کر انہیں اطلاع دی کہ بکری تو اچانک مر گئی۔ مرزا نے اپنی جمع پونجی کی واپسی کا مطالبہ کیا تو دیہاتی نے سادگی سے بتایا کہ مرزا رقم دے چکے تھے اس لیے دیہاتی کی نہیں، ان کی بکری مری تھی اور یہ اللہ کی مرضی تھی۔ مرزا نے مری ہوئی بکری کا مطالبہ کیا۔ دیہاتی حیران تھا کہ وہ ایک مردار کا کیا کریں گے۔ مرزا نے اس سے التجا کی کہ وہ اس سووے اور بکری کی موت کے بارے میں اپنی زبان بند رکھے۔ دیہاتی نے پکا وعدہ کر لیا۔

مرزا نے گاؤں میں سو روپے میں بکری کی لاٹری کا اعلان کر دیا۔ لالچ میں لوگ دھوا دھڑا آنے لگے۔ مرزا نے چند گھنٹوں میں ستر خود ساختہ پرچیاں بیچ ڈالیں۔

دیہاتی کو جب پتا چلا کہ گاؤں میں کوئی ہنگامہ ہوا نہ فساد تو وہ مرزا کے پاس پہنچ گیا۔ ”تم نے مری ہوئی بکری کا ڈراما کیا اور کوئی کچھ نہ بولا۔ یہ کیا چکر ہے؟“

”میں نے اس پر ساڑھے چار ہزار کمائے ہیں۔“ مرزا نے فخر سے بتایا۔ ”ستر پرچیوں کے ساتھ ہزار ملے۔ دو ہزار میں، میں نے تم سے مری ہوئی بکری لی تھی۔۔۔“

”اور کسی نے کوئی شکایت نہیں کی؟“ دیہاتی نے ان کی بات کاٹ کر حیرت سے پوچھا۔

”جس کے نام بکری نکلی، اس نے شکایت کی تھی۔ میں نے اس کے سو کے بدلے اسے پانچ سولوناد دیے اور وہ خوش ہو گیا۔ یوں مجھے ساڑھے چار ہزار بیچ گئے۔“

مرزا شہر لوٹ آئے۔ آج وہ تین کاٹن فیکٹریوں، پیٹرول پمپ اور آئل مل کے مالک ہیں۔

(نوحان شیخ، کراچی، پاک کالونی)

تصاویر دکھا کر ان کے بارے میں پوچھا تو اس نے کوئی رد عمل نہیں دکھایا اور انہیں پہچاننے سے انکار کر دیا۔ شرافت نے اسے چھوڑنے کے بجائے واپس بھجوا دیا۔ تیسرا فرد ایک نوجوان تھا۔ اس کی عمر پچیس سے زیادہ نہیں تھی۔ شکل صورت کا اچھا تھا مگر اس کی آنکھوں سے ایک قسم کی عیاری

جھلک رہی تھی۔ شرافت اس سے بھی سوالات کرتا رہا اور وہ سوچ کر جواب دیتا رہا۔ اسی دوران میں شرافت نے جان بوجھ کر چاروں تصاویر اس کے سامنے میز پر یوں رکھ دیں کہ وہ انہیں دیکھ سکتا تھا۔۔۔ فوراً ہی اس کے چہرے پر تغیر نمودار ہوا۔ وہ بار بار چاروں میں سے ایک خاص تصویر کو دیکھ رہا تھا۔ شرافت نے اس سے کوئی سوال نہیں کیا۔ آدھے گھنٹے بعد اس نے اسے بھی واپس بھیج دیا اور ایک گھنٹے میں باقی دو کو بھی نمٹا دیا پھر اس نے سبحان کو بلایا۔

”دوسرا نوجوان، کیا نام ہے اس کا۔۔۔؟“

”سلیم شاہ سر۔“

”ہاں، یہ کم عمر ہے۔“

”جی سر لیکن گنوں کا پورا ہے سر۔“

”مجھے اس پر شک ہے۔“

”حکم فرمائیں سر۔۔۔ زبان کھلوانے کا بندوبست ہے۔“

”نہیں، میں اس سے دوبارہ بات کروں گا۔ اسے

یہاں لاؤ۔“

سلیم شاہ دوبارہ آیا تو اس بار وہ خوفزدہ تھا۔ شاید

اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس پر شک کیا جا رہا ہے اس لیے

آتے ہی اس نے رونا دھونا اور دہائیاں دینی شروع کر دیں

کہ وہ بے قصور ہے اور اس نے کچھ نہیں کیا ہے۔ مگر شرافت

نے اس کے داویلے کا اثر لیے بغیر اسے ہتھکڑیاں لگانے کا

اشارہ کیا۔ اس کے حکم کی تعمیل ہوئی۔ شرافت کھڑا ہو گیا۔

اس نے سلیم کی زنجیر کا سرا تھا ما اور اسے اپنے ساتھ کار تک

لایا۔ اسے فرنٹ سیٹ پر دھکیل کر وہ خود ڈرائیونگ سیٹ پر

آیا اور سبحان سے کہا۔ ”میں ایک گھنٹے میں واپس آ سکتا

ہوں، اگر نہیں آیا تو کال کر دوں گا۔“

”یس سر۔“ اس نے اٹینشن ہو کر کہا۔

سلیم سہا ہوا تھا۔ کار تھانے سے نکلی تو اس نے ہمت

کر کے پوچھا۔ ”سرکار! کہاں لے جا رہے ہیں؟“

”ہم ایک ڈرائیو پر جا رہے ہیں۔ اس کے بعد یا تو تم

آزاد ہو کر اپنے گھر چلے جاؤ گے اور کوئی دوبارہ تمہیں نہیں

پکڑے گا یا پھر تم واپس تھانے جاؤ گے۔ تم پر غیر قانونی

اسلحہ، منشیات رکھنے، راہزنی اور ڈکیتی کے ایسے کیس بنیں

گے جن میں تم تین چار سال تو عدالتوں میں دھکے کھاؤ گے

اور اس کے بعد اگر آزاد بھی ہوئے تو باہر آتے ہی تم پر

دوبارہ کیس بن جائیں گے۔“

”میرا قصور سرکار۔“ وہ رو دینے والے لہجے میں بولا۔

”ملک ہدایت اللہ کی کوٹھی میں تم نے نقب لگائی اور تجوری توڑ کر اس سے زیور، نقدی اور کچھ تصاویر نکال لی تھیں۔“

”نہیں جی...“ سلیم نے کمزور لہجے میں تردید کرنا چاہی۔
”میری بات غور سے سنو... میں الزام نہیں لگا رہا۔ میں اسے ثابت کر سکتا ہوں۔ مجھے صرف تمہیں ملک ہدایت اللہ کے مالی کی جٹی کے سامنے لے جا کر کھڑا کرنا ہوگا اور وہ خود تمہیں شناخت کرے گی۔ لیکن میں تمہیں ایک موقع دے رہا ہوں۔ میرے لیے یہ بھی ناممکن نہیں ہے کہ تمہیں تھانے میں لے جا کر الٹا لٹکا دوں اور صبح تک تم ساری عمر کا کھایا پیایا اگل چکے ہو گے۔ اس لیے اب انکار کر کے خود کو عذاب میں مبتلا نہ کرو۔ میں جو کہہ رہا ہوں اسے غور سے سنو اور پھر سوچ کر جواب دو۔ تم نے تجوری سے جو نکالا تھا، وہ سب اپنے پاس رکھو ایک چیز بھی واپس مت کرو، سوائے ان تصویروں کے۔ اب تمہارے پاس دو منٹ ہیں۔ اگر دو منٹ میں تم نے جواب نہیں دیا تو میں کار واپس تھانے کی طرف موڑ دوں گا۔“

سلیم کانپنے لگا۔ وہ تذبذب میں تھا کہ اقرار کرے یا نہ کرے۔ اسے دونوں صورتوں میں جان بچنی مشکل لگ رہی تھی لیکن پھر اس نے شرافت کی بات پر اعتبار کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے دو منٹ سے پہلے سر ہلایا۔ ”میں تیار ہوں جی۔“

”گڈ! تصویریں کہاں ہیں؟“

”میرے گھر پر ہیں جی۔“

”تم نے کسی کو دکھائیں؟“

”جی، کچھ دوستوں کو دکھائیں۔“ اس نے اقرار کیا۔

”ان کی کوئی کاپی کی یا کوئی تصویر لی؟“

”نہیں جی، میں نے بس ایسے ہی رکھی تھیں۔“ سلیم

ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولا۔ ”میں قسم کھاتا ہوں جی کہ جان

کر نہیں لایا ایک لفافہ رکھا تھا، میں نے ایسے ہی اٹھالیا کہ

اس میں بھی کچھ رقم یا کوئی پرائز بونڈ ہوگا، پر گھر لایا تو اس

میں سے تصویریں نکلیں۔“

”کتنی تصویریں تھیں؟“

”سات جی... پرانی تھیں۔“

شرافت سلیم کو لے کر اس کے گھر پہنچا۔ وہ ڈیفنس

کے پاس ہی ایک عام سی بستی میں رہتا تھا۔ کار سے اترنے

سے پہلے شرافت نے اس کی ہتھکڑیاں کھول دیں۔ ”اگر

میاں بیوی ایک بڑے میلے کی سیر کو گئے جہاں دوسری تفریحات کے ساتھ ایک چھوٹا جہاز بھی موجود تھا جس میں سوار ہو کر چار ہزار روپے میں شہر کا ایک فضائی چکر لگایا جا سکتا تھا۔

دونوں وہاں رک کر حسرت سے جہاز کو دیکھنے لگے۔ شوہر نے کہا۔ ”ہوائی سفر کا کتنا عمدہ موقع ہے۔ پتا نہیں اگلے میلے تک ہم ہوں یا نہ ہوں... کاش ہم اس موقع سے فائدہ اٹھا سکتے۔“

”دل تو میرا بھی چاہ رہا ہے مگر ہم دونوں کے آٹھ ہزار روپے... کاش! ہمارے پاس اتنی رقم ہوتی۔“

پائلٹ ان دونوں کی حسرت بھری باتیں سن رہا تھا۔ ان کے قریب آ کر بولا۔ ”میں تم دونوں کو ایک شرط پر جہاز میں سیر کرا سکتا ہوں کہ دوران پرواز تم بالکل خاموش رہو گے۔ دونوں میں سے کوئی بھی بولا تو آٹھ ہزار روپے دینے پڑیں گے۔“

انہوں نے خوشی خوشی آپس میں مشورہ کیا اور تیار ہو گئے۔

پائلٹ نے جہاز اڑایا۔ رفتار خوب تیز کی۔ جہاز کو ترچھا کیا، قلابازی کھلائی، الٹا کر کے اڑایا، کئی غوطے کھلائے مگر پیچھے بالکل خاموشی رہی۔ پائلٹ نے ہوا بازی کے سارے کرتب دکھائے پھر انہیں دہرایا مگر سکوت نہ ٹوٹا۔

آخر کار اس نے جہاز اتار لیا اور ٹھکست خوردہ لہجے میں بولا۔ ”تم دونوں جیت گئے۔ واقعی تم بہت دلیر ہو۔ میں تمہیں خوف زدہ کر کے چیخنے پر مجبور نہیں کر سکا۔“

”ہمارے پاس رقم نہیں تھی۔“ پیچھے سے شوہر کی کانپتی ہوئی آواز آئی۔ ”تم نے غوطہ مار کر میری بیوی کو جہاز سے نیچے گرایا تو میں نے بمشکل اپنی جھج روکی تھی۔“ (ریاض سے عذرار ریاض کی آتش شوق)

بھاگنے کا شوق ہو تو یہ بھی پورا کر لینا۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ تم مجھ سے تیز نہیں بھاگ سکو گے۔“

”نہیں سر جی! آپ نے مجھے مرید کر لیا ہے۔“ سلیم نے عاجزی سے کہا۔ ”اگر آپ کی جگہ کوئی سپاہی بھی ہوتا تو میں اس وقت تھانے میں لٹکا ہوتا جی... آپ تو بادشاہ ہو۔“

سلیم اسے اپنے گھر لے گیا۔ اس نے تصویریں اپنے ٹرنک میں لاک کر کے رکھی تھیں۔ اس نے تصویروں والا لفافہ نکال کر شرافت کے حوالے کیا تو اس نے پہلے تصویروں کا معائنہ کیا، یہ کل سات تھیں۔ گیارہ سال پرانی ہونے کی وجہ سے ان کا کاغذ خستہ ہو رہا تھا اور معیار بھی بہت اچھا نہیں تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ملک صاحب نے خود ہی ڈیولپ بھی کی تھیں کیونکہ اس قسم کی تصاویر وہ کسی شاپ سے ڈیولپ کیسے کرا سکتے تھے۔ شرافت نے شیبہ کو کال کی اور پوچھا۔ ”تصاویر کتنی ہیں؟“

وہ خوش ہو گئی۔ ”کیا مل گئی ہیں؟“

”ہاں... جواب دو۔“

شرافت کے کان میں چپکاری گونجی اور پھر شیبہ نے کہا۔ ”کل سات ہیں۔“

”ٹھیک ہے، ان کی بیک پر کچھ لکھا ہوا ہے؟“

”میرا خیال ہے کہ کچھ نہیں لکھا ہے۔“

تصاویر کی پشت صاف تھیں لیکن شرافت مزید تصدیق چاہ رہا تھا۔ شیبہ سے بات کر کے اس نے موبائل رکھا اور سلیم کی طرف دیکھا۔ ”تم نے اپنی ہڈیاں اور کھال بیچالی ہے لیکن میرے کچھ سوالوں کے جواب دو۔ ایک یہ کہ تمہیں ملک ہدایت اللہ کے بیڈروم میں موجود تجوری کا کیسے پتا چلا؟“

”شمینہ نے بتایا تھا۔“ سلیم نے جھجک کر کہا۔ ”شمینہ مالی کی بیٹی تھی۔“

”وہ بھی تمہارے ساتھ شامل ہے؟“

”نہیں سرکار! وہ تو بس مجھ سے پیار کرتی ہے۔ اس نے ایسے ہی باتوں باتوں میں ذکر کر دیا تھا۔“

”اور تم نے موقع سے فائدہ اٹھا لیا۔“ شرافت نے اسے گھورا۔ ”اب تم اس سے نہیں ملو گے۔“

”سرکار! میں اس سے محبت کرتا ہوں۔“

”آدمی جن سے محبت کرتا ہے، ان کے اعتماد کو دھوکا نہیں دیتا۔ تم ایک بار یہ کام کر چکے ہو اس لیے اب ناقابل اعتبار ہو بہر حال میں تمہیں خبردار کر رہا تھا کیونکہ میں ایسا بندوبست کروں گا کہ تم اس سے ملو گے اور ادھر مجھے خبر ہو جائے گی۔ اس کے بعد تمہاری معافی ختم ہو جائے گی۔“

تھانے جاؤ گے اور سارا کھایا پیابھی اگلنا پڑے گا۔“

سلیم لرز گیا۔ ”بالکل نہیں ملوں گا جی... اب ادھر کا رخ بھی نہیں کروں گا۔“

”یہ سمجھ داری ہوگی۔“ شرافت نے کہا۔ ”ایک بات اور ہے، اگر تم نے یا کسی اور نے ان تصاویر کی موبائل یا کسی اور کیمرے سے تصویر لی ہے تو مجھے بتا دو۔ میں وہ ضائع کرادوں گا۔“

”میں قسم کھا کر...“

”قسم مت کھاؤ، بس اتنا یاد رکھنا کہ اگر ان کا کوئی پرنٹ کہیں نظر آیا یا انٹرنیٹ پر آیا تو میں اسے تمہارے کھاتے میں ڈالوں گا۔ اس کا حساب تمہیں دینا ہوگا۔“

”میں پکا بتا رہا ہوں، ان تصاویر کی کوئی تصویر نہیں لی گئی ہے نہ میں نے اور نہ میرے دوستوں نے۔ میں خیال ہی نہیں آیا۔“

”یہ اچھا کیا تم نے اپنے حق میں۔“ شرافت نے کہا اور اس کے گھر سے نکل آیا۔ جیسے ہی وہ باہر آیا شیبہ کی کال آ گئی۔

”تم کہاں ہو؟ تصویریں کب میرے پاس لے کر آؤ گے؟“

”کچھ دیر لگے گی۔“ شرافت نے کہا۔ ”مجھے ایک ضروری کام سے آفس جانا ہے، ہو سکتا ہے کچھ دیر لگ جائے لیکن میں آج ہی آؤں گا۔“

”میں انتظار کروں گی۔“ شیبہ نے کہا تو اس کا لہجہ بوجھل ہو گیا۔ ”تصویروں کا نہیں، تمہارا انتظار کروں گی۔“

شرافت نے شیبہ سے غلط نہیں کہا تھا۔ وہ دفتر پہنچا اور اس نے یوکیس لیب کے انچارج کو بلایا۔ ”تم سے ایک کام ہے لیکن تم کسی سے ذکر نہیں کرو گے۔“

”ٹھیک ہے جناب۔“ اس نے کہا۔ ”آپ کہیں گے تو ذکر نہیں کریں گے جی۔“

لیب انچارج پڑھا لکھا اور کیمسٹری سائنس میں ماسٹر تھا اور اسی وجہ سے وہ اس عہدے پر تھا۔ شرافت اس کے ساتھ لیب میں آیا اور اس نے تصویروں والا لفافہ نکال کر اسے دیا اور اسے سمجھایا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ ”لیکن خیال رہے، تصویروں کو کوئی نقصان نہ ہو۔“

انچارج نے لفافے سے تصویریں نکال کر انہیں دلچسپی سے دیکھا۔ ”چیز تو اچھی ہے۔“

”بس تو کام بھی اسی معیار کا ہونا چاہیے۔“

پولیس لیب انچارج کے لیے یہ کوئی نئی چیز نہیں تھی۔ وہ آئے دن اس قسم کی تصویریں دیکھتا تھا اس لیے ابتدائی دلچسپی کے بعد وہ اپنے کام کی طرف متوجہ ہوا۔ اس نے



بندوبست

سمندر کے کنارے تین امریکی نوجوان بنیاں ڈالے اطمینان سے مچھلی کا شکار کر رہے تھے۔ باتیں شروع ہوئیں تو ذرا دور تک چلی گئیں۔

ایک نے بتایا۔ ”میرے گھر میں بہت بری طرح آگ لگی تھی۔ گھر کے ساز و سامان کے ساتھ سارے نوادرات اور ڈالر بھی جل کر راکھ ہو گئے۔ انشورنس والوں نے میرا سارا نقصان پورا کر دیا۔۔۔ اب بے فکری اور عیش ہی عیش ہے۔“

دوسرے نے کہا۔ ”عجب اتفاق ہے۔۔۔ میرے گھر کی گیس لائن میں دھماکے کے ساتھ آگ لگی اور میرا سب کچھ چاٹ گئی۔ انشورنس سے بھاری معاوضہ ملا اور میرے دن پھر گئے۔“

تیسرا ایک آہ بھر کر بولا۔ ”خوفناک سیلاب میرے گھر سمیت ہر چیز کو بہا لے گیا۔ قیمت ہے کہ انشورنس سے رقم مل گئی اور میں اب پہلے سے بہتر زندگی گزار رہا ہوں۔“ دونوں نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا پھر پہلے نے تھیرزدہ انداز میں تیسرے سے کہا۔ ”گھر کو آگ لگانا تو خیر آسان سا کام ہے۔ تھوڑی سی ہوشیاری کی ضرورت ہوتی ہے۔۔۔ یہ بتاؤ کہ تم نے سیلاب کا بندوبست کیسے کیا تھا؟“

کنزٹی یونس، کراچی



”آج پینے سے انکار نہیں کرو گے تم؟“ یہ سوال سے زیادہ حکم تھا۔

شرافت نے سر ہلایا تو وہ اس کے لیے گلاس بنالائی۔ وہ اس نے شرافت کو تھمایا تو اس نے پوچھا۔ ”تم نہیں پیتیں؟“

”نہیں، میں نے آج تک نہیں پی۔“ وہ بولی۔ ”اس وقت بھی نہیں جب میں پیسے میں تھی۔“

شرافت کا بھی یہی اندازہ تھا۔ اگر شہیا پیتی تو اب تک اس کی جوانی ڈھلک چکی ہوتی۔ مگر وہ ہمیشہ کی طرح خستہ

شرافت سے کہا۔ ”سر! تقریباً ایک گھنٹا لگے گا۔“ ”کوئی مسئلہ نہیں ہے۔“ شرافت نے وہیں نشست سنبھال لی۔ رات کے وقت ہیڈ کوارٹر میں بس وہی افراد تھے جن کی ڈیوٹی تھی اور لیب میں سوائے انچارج کے کوئی نہیں تھا۔ شرافت نے اسی لیے یہ وقت منتخب کیا تھا اور وہ اپنے سامنے یہ کام کرانا چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ لیب انچارج اچھا آدمی ہے لیکن وہ اس معاملے میں کوئی رسک نہیں لینا چاہتا تھا اس لیے اپنے سامنے کام کر رہا تھا۔ خلاف توقع کام آدھے گھنٹے میں منٹ گیا اور لیب انچارج نے نتیجہ شرافت کے سامنے رکھا۔ اس نے بہ غور دیکھا اور مطمئن ہو کر بولا۔ ”گڈ ورک۔۔۔“

”شکر یہ سر۔“ انچارج خوش ہو کر بولا۔ شرافت نے تصویریں اور ان کی لی ہوئی اضافی تصویریں لفافے میں ڈال کر اپنی جیب میں رکھیں۔ ”تم نے سچ سچ اچھا کام کیا ہے۔ کوئی مسئلہ ہو تو مجھے بتانا۔“ ”مسئلہ تو کوئی نہیں ہے لیکن میری پروموشن فائل آپ کے پاس آنے والی ہے۔“

”تم بے فکر ہو جاؤ۔“ شرافت نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

چند منٹ بعد وہ شہیا کی کوٹھی کی طرف جا رہا تھا۔ رات کے گارڈز نے اسے پوری طرح چیک کیا اور جب تک شہیا نے اجازت نہیں دی انہوں نے گیٹ نہیں کھولا۔ وہ عام گارڈز نہیں تھے بلکہ ریٹائرڈ فوجی تھے اور خود کار ہتھیاروں سے مسلح تھے۔ ہر قسم کی صورت حال کے لیے ان کے پاس واضح ہدایات ہوتی تھیں۔ وہ انہی ہدایات کے تحت عمل کرتے تھے انہیں پروا نہیں تھی کہ یہاں آنے والا کون تھا۔ شرافت کی کار اندر آئی۔ پورچ میں خود شہیا موجود تھی۔ وہ بے تابی سے شرافت کو اندر لے آئی اور واضح طور پر یہ بے تابی تصویروں کے لیے تھی۔ وہ شرافت کو اسی چھوٹی سٹنگ میں لائی۔ کوٹھی میں خاموشی اور سناٹا تھا۔ ملازم یقیناً اپنے کوارٹر میں تھے اور بچے سونے کے لیے جا چکے تھے کیونکہ رات کے دو بج رہے تھے۔ باہر شہیا نے شال لی ہوئی تھی لیکن اندر آتے ہی اس نے شال اتار دی۔ نیچے اس نے ٹائٹی پہن رکھی تھی۔ یہ گلے سے ٹخنوں تک تھی لیکن کپڑا اتنا ہلکا تھا کہ اس کا بدن جھلک رہا تھا اور یہ یقیناً شرافت کو دکھانے کے لیے پہنی گئی تھی۔ اس نے شرافت کے سینے پر ہاتھ رکھ کر اسے صوفے پر دھکا دیا اور خاص لمبے میں پوچھا۔

اور دلکش تھی۔ نائی سے جھلکتے جسم کا تناسب نظر آ رہا تھا۔ شرافت نے گلاس سے چھوٹا سا گھونٹ لیا۔ یہ غیر ملکی دائن تھی۔ اس نے تعریف کی تو شیا خوش ہو گئی۔

”اس میں سات تصاویر ہیں، تم نے بھی اتنی ہی بتائی تھیں لیکن تم پھر بھی چیک کر لو۔“

شیا نے تیزی سے لفافہ اٹھایا اور تصویریں نکال کر دیکھیں۔ فوراً ہی اس کے چہرے پر سکون نظر آیا۔ اس نے جھک کر کہا۔ ”پوری ہیں اور وہی سب ہیں لیکن...“ وہ متفکر ہو گئی۔ ”کہیں چور نے ان کی تصویر نہ لے لی ہو۔“

”میں پورا اطمینان کر کے آیا ہوں۔ ان کی تصاویر نہیں لی گئی ہیں، تم بالکل بے فکر رہو۔“

شیا مسکراتے لگی۔ شرافت نے محسوس کیا کہ تصاویر کی تصویریں لینے کے بارے میں اس کی تشویش میں حقیقت کا عنصر کم تھا اور بناوٹ زیادہ تھی۔ اس نے میز پر رکھے گلاس کی طرف دیکھا۔ ”تم نے تو ابھی ایک بھی گلاس ختم نہیں کیا ہے۔“

”یہ بھی کافی ہے، آج کل میں احتیاط کرنے لگا ہوں۔ بس اتنی لیتا ہوں کہ طلب مٹ جائے۔“

”آج میں اتنی پلاؤں گی کہ ہوش کھودو گے۔“ شیا نے لگاوٹ سے کہا۔

”نہیں، تم نے ایک ہی بار میرے ہوش اڑائے تھے اور جب ہوش ٹھکانے آئے تو اس کے بعد میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اپنے ہوش و حواس اپنے ہاتھ میں رکھوں گا۔“

شرافت کی بات اور لہجے پر شیا کا رنگ ذرا پھیکا ہوا مگر وہ اتنی آسانی سے ہار ماننے والی عورتوں میں سے نہیں تھی۔ ”کم سے کم آج رات کے لیے تمہیں یہ فیصلہ بدلنا ہوگا۔“

شرافت نے جواب میں اپنا گلاس اٹھایا اور اٹھ کر کمرے میں ٹھیلنے لگا۔ ”تمہاری کوٹھی بڑی خوب صورت ہے اور یہاں نو ملازمین ہیں، یقیناً اس کا خرچ بہت زیادہ ہوگا۔“

”ہاں، تقریباً دس لاکھ روپے مہینے کا۔“ وہ یوں بولی جیسے دس لاکھ روپے اس کے لیے کوئی حیثیت نہ رکھتے ہوں۔ ”ملک صاحب یقیناً اتنا چھوڑ کر گئے ہوں گے کہ تم یہ خرچ انورڈ کر سکو؟“

”آں... ہاں۔“ وہ محتاط ہو گئی۔ ”ملک صاحب بہت کچھ چھوڑ کر گئے ہیں لیکن اب میں چاہتی ہوں کہ ذرا احتیاط کروں۔“

”اسی لیے تم نے باہر جانے کا فیصلہ کیا؟“ شرافت

نے کہا تو وہ چونک گئی۔

”تمہیں کیسے پتا چلا؟“

”شیا! تم شاید اب بھی مجھے کالج والا سیدھا سادہ شرافت سمجھ رہی ہو اور بھول گئی ہو کہ میں ایس پی ہوں۔ میں یقیناً دوسرے لوگوں سے زیادہ جانتا ہوں اور کوئی بھی بات جاننا میرے لیے مشکل نہیں ہے۔“

شیا کچھ دیر سکتے میں بیٹھی رہی پھر اس نے بہ مشکل پوچھا۔ ”کیا جانتے ہو تم؟“

”یہی کہ تم دینی منتقل ہو رہی ہو۔ وہاں ملک صاحب نے تمہارے نام سے ایک بزنس کمپنی کھولی تھی اور ایک عالی شان اپارٹمنٹ بھی لیا تھا۔ میں نے غلط تو نہیں کہا؟“

”ٹھیک کہا تم نے۔“

”میرا خیال ہے کہ اگر تم یہ کوٹھی بیچ دو تو اتنی رقم ضرور مل جائے گی کہ تم اسے انویسٹ کر کے دینی میں بھی... پُرآسائش زندگی گزار سکتی ہو۔ وہاں تمہیں گھر اور ملازموں پر اتنا خرچ نہیں کرنا پڑے گا۔“

”یہ درست ہے، یہاں میں اس اسٹینڈرڈ کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ میرے بچے بھی اس کے عادی ہیں پھر میرے سر پر ملک صاحب کا سایہ نہیں رہا ہے، وہ میرے محافظ تھے۔ اب مجھے ڈر لگنے لگا ہے۔“

”کس سے... ملک صاحب کی پہلی بیوی اور بچوں سے؟“

”ان سے بھی اور حالات سے بھی۔“ شیا بولی پھر ایک گہری سانس لی۔ ”میں بھول گئی کہ میں ایک طوائف خاندان سے ہوں لیکن میرے خاندان والے نہیں بھولے ہیں۔ ماں کے بعد میری سب سے بڑی بہن خاندان کی سربراہ ہے اور اس نے مجھے پیغام بھیجا ہے کہ میں واپس خاندان میں آ جاؤں۔“

”صرف پیغام بھیجا ہے؟“

”نہیں دھمکی بھی ہے میرے بچوں کے حوالے سے۔“ شیا نے گہری سانس لی۔ ”میں ان پر ذرا بھی رسک نہیں لے سکتی۔“

”اسی لیے تم نے بچوں کو باہر بیچ دیا ہے؟“

شیا ایک بار پھر حیران ہوئی۔ ”تم یہ بھی جانتے ہو؟“

”ہاں، تم کہو تو میں آج شام کی اس فلائٹ کا نمبر بھی بتا دوں جس سے تمہارے بچے باہر گئے ہیں اور ان کے ساتھ تمہارا ڈرائیور ہے۔“

شیا نے سر ہلایا اور سپاٹ لہجے میں بولی۔ ”وہ وفادار

دوہلا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں

گھر بیٹھے

رسالے حاصل کیجیے

جاسوسی ڈائجسٹ سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ ماہنامہ سرگزشت

باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں، اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا رسالہ (بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 700 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 8,000 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 7,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

یہ آپ کی طرف سے اپنے پیادوں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے

بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر بھاری بینک فیس عاید ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

رابطہ: شمر عباس (فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

فون: 35895313 فیکس: 35802551

آدمی ہے۔ ملک صاحب بھی اس پر آنکھ بند کر کے بھروسہ کرتے تھے۔“

”لیکن میرا مشورہ ہے کہ ملک صاحب کے دور کے کسی ملازم پر آنکھ بند کر کے بھروسہ مت کرو۔ ایسا کرنا تمہارے اور تمہارے بچوں کے لیے نقصان دہ ہو سکتا ہے۔“ شیبہ فکر مند ہو گئی پھر اس نے سر ہلایا۔ ”ٹھیک ہے، یہاں سے جانے کے بعد میں اسے بھی قارع کر دوں گی۔“ ”وہاں تمہیں ملازم کی ضرورت ہو گی تو بے شمار بنگالی، سری لنکن اور فلپائنی ملازم مل سکتے ہیں۔ وہ زیادہ محنتی ہوتے ہیں اور کم تنخواہ میں بھی مان جاتے ہیں۔ جب تم یہاں سے جا رہی ہو تو بہتر ہے کہ یہاں کے کسی آدمی پر بھروسہ یا انحصار بھی مت کرو۔“

شیبہ نے سر ہلایا۔ ”میں ایسا ہی کروں گی۔“ شرافت نے خالی گلاس میز پر رکھ دیا۔ ”میرا خیال ہے کہ کوٹھی کا سودا ہو گیا ہے؟“

شیبہ اب مجبور تھی۔ ”سوری شرافت! تم یہ مت سمجھنا کہ میں نے تمہیں استعمال کیا ہے۔ بس میں ہر بات کھل کر نہیں بتا سکتی تھی۔“

وہ مسکرایا۔ ”اگر تم نے استعمال کیا تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہو گی۔ کالج میں بھی تمہیں ایک سہارا درکار تھا جو دوسروں سے تمہیں محفوظ رکھتا اور وہ میری صورت میں مل گیا۔ بہر حال، مجھے اس پر کوئی افسوس نہیں ہے کیونکہ میں نے جو کیا خلوص سے کیا تھا۔“

”اب بھی تو تم نے خلوص سے کیا ہے۔“ شیبہ جلدی سے بولی تو شرافت نے جواب دینے کے بجائے مسکرانے پر اکتفا کیا پھر اس نے کہا۔

”اب میں چلوں گا، دو راتوں سے تمہارے چکر میں اپنی بیوی کو وقت نہیں دے پا رہا۔“

شیبہ سمجھ گئی۔ ”آج رات رک نہیں سکتے؟“ شرافت نے گہری سانس لی۔ ”شیبہ! تمہاری پیشکش کا شکریہ... کسی وقت میں انتظار کرتا تھا اور تم نے کہا نہیں۔ اب میں کسی اور کا ہوں اس لیے تمہاری پیشکش کا جواب نہیں دے سکتا۔“

وہ باہر آئے۔ شیبہ نے پھر شمال اوڑھ لی تھی۔ شرافت نے گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے کہا۔ ”امید ہے کل تک تم بہ خیریت اپنے بچوں کے پاس پہنچ جاؤ گی۔ میں نے مقامی تھانے میں کہہ دیا ہے۔ ایک پولیس موبائل کوٹھی کے پاس رہے گی اور کل جب تک ائر پورٹ جاؤ گی تو یہ تمہیں وہاں

تک چھوڑ کر آئے گی۔“

شیبا کی آنکھوں میں آنسو جھللا رہے تھے اور ہونٹ لرز رہے تھے جیسے کچھ کہنا چاہتی ہو مگر وہ کہہ نہ سکی اور شرافت نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

☆☆☆

لاہور انٹرپورٹ پر شیدا اپنے سامان کے ساتھ لاؤنج میں دعائی جانے والی فلائٹ کی بورڈنگ کا انتظار کر رہی تھی اور شرافت کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ وہ اس کے معاملے میں سچ سچ شریف ثابت ہوا تھا۔ اس نے جان لیا تھا کہ شیدا نے اس سے بہت کچھ چھپایا ہے، اس سے جھوٹ بھی بولا ہے اس کے باوجود وہ اس کے کام آیا۔ یہ کام اس کے علاوہ اور کوئی نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے شیدا کو ایک بار بھی نہیں جتایا، نہ اسے شرمندہ کیا۔ اس نے تو شیدا کی کھلی پیشکش ٹھکرا دی جو اس نے پورے دل و جان سے کی تھی۔ یہ سچ تھا کہ شیدا نے اسے کالج لائف میں بھی استعمال کیا تھا اور اب بھی استعمال کیا تھا بلکہ کر رہی تھی اور شرافت نہیں جانتا تھا۔ اس نے ایک بار پھر شیدا کو خلوص سے مشورہ دیا اور اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ اس پر عمل کرے گی اور دعائی جاتے ہی ڈرائیور کو فارغ کر کے واپس بھیج دے گی۔ اب وہ کسی ہم وطن پر بھروسہ نہیں کرے گی۔ وہاں دوسرے ملکوں کے سستے ملازموں کی کمی نہیں تھی۔

اچانک کوئی اس کے برابر والی نشست پر بیٹھا تو اس نے چونک کر دیکھا۔ وہ شرافت تھا۔ ”تم جانے والی تھیں، میں نے سوچا ایک آخری ملاقات کر لی جائے۔“

”میں بھی تمہارے بارے میں سوچ رہی تھی۔“

”یہی تا کہ بالآخر میں ہی بے وقوف ثابت ہوا؟“

شرافت کا لہجہ معنی خیز ہو گیا۔ شیدا گڑبڑاکی۔

”نہیں تو... میں ایسا نہیں سوچ رہی...“

”افسوس کہ تمہاری سوچ آج بھی وہی ہے جو آج سے بیس سال پہلے تھی۔ حالانکہ میں نے تمہیں خبردار کیا کہ میں بیس سال پہلے والا شرافت نہیں ہوں۔ تمہیں ایک چانس دیا کہ تم سچ بول دو اور مجھ پر اعتماد کرو جس کا میں مستحق ہوں مگر تم نے یہ چانس ضائع کر دیا۔ اب تمہیں اس کی قیمت ادا کرنی پڑے گی۔“

شیبا نے خشک ہوتے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ”کیا مطلب؟“

شرافت نے جیب سے چند تصویروں نکالیں۔ یہ شیدا کی تصویروں سے لی گئی تھیں لیکن سامنے کے رخ سے نہیں

بلکہ پیچھے کے رخ سے جو سادہ ہوتا ہے۔ ”شیبا معذرت کے ساتھ... تیرہ سال ایک آدمی کی بیوی رہ کر بھی تم اندر سے وہی رہیں... آج بھی عزت اور نسوانی حرمت کی تمہارے نزدیک کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ تم اسے مال تجارت سے زیادہ اہمیت نہیں دیتیں جیسے کل رات تم نے معاوضے میں خود کو مجھے پیش کر دیا تھا۔“

”یہ غلط ہے، میں نے تمہیں اپنا محبوب جان کر...“

”یہ بات تمہارے منہ سے اچھی نہیں لگتی شیدا۔“

شرافت کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ ”تم جانتی ہی نہیں ہو کہ محبت کیا ہوتی ہے اور محبوب کے کہتے ہیں۔ تم نے آخری حد تک مجھے استعمال کیا۔“ اس نے تصویروں کی گود میں پھینک دیں۔ ”انہیں دیکھو... ان پر نظر آنے والے نمبرز اور دوسری تفصیلات سوئس اکاؤنٹس کی ہیں جہاں ملک صاحب نے ملک کو لوٹ کر کروڑوں ڈالر جمع کرائے تھے۔ تم نے چالاکی سے یہ سب ان سے حاصل کیے یا انہوں نے خود تمہیں دے دیے اور تم نے انہیں ان تصویروں کی پشت پر ایسی سی سی سے لکھ لیا جو صرف الٹرا وائٹ روشنی میں دکھائی دیتی ہے۔“

”ملک صاحب نے خود یہ اکاؤنٹس میرے حوالے کیے۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ میرے بچوں کا حق ہیں۔“ شیدا نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

”ٹھیک ہے، میں مانتا ہوں۔ میں یہ بھی مانتا ہوں کہ اس راز کو چھپانا تمہارا حق تھا، معاملہ بہت بڑی رقم کا ہے۔ لیکن شیدا تم نے ہمیشہ کی طرح مجھے استعمال کر کے اس حق کو کھو دیا جو میری محبت نے تمہیں دیا تھا۔ اس لیے میں نے فیصلہ کیا کہ تمہیں سزا دوں گا تا کہ تمہیں بھی احساس ہو کہ جب آدمی کا اعتماد ٹوٹتا ہے تو وہ کیسا محسوس کرتا ہے۔ اس میں سے ایک اکاؤنٹ میں اب کچھ نہیں ہے کیونکہ اس کی رقم جو میں تمہیں نہیں بتاؤں گا انٹرنیٹ کے ذریعے ایک دوسرے اکاؤنٹ میں منتقل کر کے اسے وہاں سے نکال لیا گیا ہے۔“

شیبا پھر گئی۔ ”تم ایسا نہیں کر سکتے۔“

”میں ایسا کر چکا ہوں۔“ شرافت کھڑا ہو گیا۔ ”شیبا! تم نے ہمیشہ فائدہ اٹھایا، آج میں نے اٹھا لیا۔ برسوں کا حساب برابر ہو گیا اور تم پر کوئی بار نہیں رہا۔ آئندہ جب مدد کی ضرورت ہو تو تم بلا جھجک مجھے پکار سکتی ہو۔“ وہ کہتے ہوئے لاؤنج سے باہر جانے والے راستے کی طرف بڑھ گیا اور شیدا بے بسی سے اسے جاتا ہوا دیکھتی رہ گئی۔



حرص کی ہوس حاکم بننے پر مجبور کر دیتی ہے... حاکمیت کے تصور سے مغلوب بعض افراد ہر ممکن کوشش کے باوجود ذہنی طور پر محکوم ہی رہتے ہیں... ایک ایسے ہی کوتاہ اندیش کی خوش فہمی سے لبریز کتھا جو ہر صورت اپنی نصف بہتر کوششکست خوردہ اور زیرِ نگیں دیکھنے کا خواہش مند تھا...

زندگی کی بازی ہار کے اپنی بالادستی ثابت کر دینے والے قاتح کا احوال

بالادستی

بابر نعیم

3 اگست 2014ء



باتوں کے دام میں آگئی تھی۔ بد قسمتی سے سام کو جلد ہی پتا چل گیا کہ مارگریٹ اخراجات پر قابو رکھنے کے فن سے بہ خوبی واقف ہے۔ اس نے سام کی مہنگی شراب نوشی کی عادت کو موقوف کر دیا تھا لیکن سام اسے بدھو بنانے کا کوئی نہ کوئی راستہ نکالتا رہا اور یہ سلسلہ کئی سال تک چلتا رہا۔ حتیٰ کہ اس کی نشے میں دھت رہنے کی عادت نے اسے مشکل میں پھنسا دیا۔

مارگریٹ نے جو پیار کی بھوک تھی، اپنا نانا کہیں اور جوڑ لیا۔ اسے ایک اور کم عمر نو جوان مل گیا اور اس نے سام سے طلاق کا مطالبہ کر دیا۔ سام اپنے معاش کا ذریعہ ہاتھ سے نہیں کھونا چاہتا تھا۔ اس نے یہ رشتہ برقرار رکھنے کے لیے

سام لیونگ روم کے فرش پر پڑے اپنی بیوی کے بے جان جسم کو دیکھ کر مسکرا دیا۔ اس نے دھسکی کا ایک بڑا سا گھونٹ بھرا اور اس قطرے کو پونچھنے لگا جو اس کے ہونٹ کے کنارے سے نیچے ٹپک گیا تھا۔

”مارگریٹ! اب بتاؤ ہمارا کون ہے؟“

اپنی نکتہ چیں اور دیوت کو کنٹرول کرنے والی بیوی کو قتل کرنا ایک ایسی بات تھی جو اسے پانچ سال قبل کر لینی چاہیے تھی۔ اس نے دولت کی خاطر مارگریٹ سے شادی کی تھی جو عمر میں اس سے دس سال بڑی تھی۔

مارگریٹ ایک سیدھی سادی عورت تھی۔ وہ سام کے لیے ایک آسان ہدف ثابت ہوئی تھی اور اس کی میٹھی لچھے دار

مارگریٹ سے خوب چکنی چڑی باتیں کیں لیکن اسے کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔

اب اس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ مارگریٹ کو قتل کر دے اور اس کے قتل کا الزام اس کے عاشق کے سر ڈال دے۔ ابتدا میں تو اس خیال کے ذہن میں آتے ہی وہ زروس ہو گیا تھا لیکن پھر وحسکی کے چند جام پینے کے بعد سام نے اپنے مشن کا پہلا مرحلہ بہ خوبی مکمل کر لیا۔

”دیکھتے ہیں کہ جب پولیس تمہاری گلا گھونٹی ہوئی لاش تمہارے عاشق کے گھر سے برآمد کرے گی اور اس کا دیا ہوا اسکارف تمہاری گردن پر مضبوطی سے لپٹا ہوا ملے گا تو وہ لوگ کیا نتیجہ اخذ کریں گے۔“ سام نے طنزیہ ہنسی کے ساتھ وحسکی کا ایک گھونٹ بھرا۔ ”وہ یہی خیال کریں گے کہ یہ جنسی رقابت کے جوش میں کیا گیا قتل کا جرم ہے اور تمہارے اس نوجوان دوست کو ایک طویل عرصہ بڑے گھر میں گزارنا پڑے گا۔“

سام اب قہقہے لگا رہا تھا پھر اس نے اپنی دقتی گھڑی پر نظریں جمادیں۔

”سوا بارہ... بہتر ہوگا کہ میں تمہاری ڈیٹ کے لیے تمہیں لپیٹ دوں۔“ سام نے ایک اور بڑا گھونٹ بھرنے کے بعد کہا اور لڑکھڑاتا ہوا اپنے قدموں پر کھڑا ہو گیا۔ اس نے کپڑوں کی الماری میں سے ایک کمبل نکالا اور اسے مارگریٹ کی لاش کے برابر میں فرش پر بچھا دیا پھر لاش کو کمبل کے ایک کنارے پر کھسکا دیا اور کمبل سے اس کا سر اور پیر ڈھانپنے کے بعد اسے کروٹیں دلاتے ہوئے کمبل میں اس طرح لپیٹ دیا جیسے شکم روٹی کو لپیٹا جاتا ہے۔

”تمہارا قد لمبا ہے لیکن اچھی بات یہ ہے کہ تم موٹی عورت نہیں ہو۔“ سام نے کہا۔ ”اب مجھے ایک اور گھونٹ لینا پڑے گا۔“ پھر سام نے لپٹا ہوا کمبل اٹھایا اور ڈمگاتے قدموں سے بغلی راستے سے گزرتا ہوا گیراج میں آ گیا۔ وہ مارگریٹ کی کار کے عقبی ڈبل ڈور کا کھٹکا کھولنے کے لیے الٹے سیدھے ہاتھ مارنے لگا۔ ٹٹولتے ٹٹولتے اس کا ہاتھ کھٹکے پر پڑ گیا، اس نے کھٹکا نیچے گرا دیا۔

اس دوران میں وہ ہانپنے لگا تھا۔ اس نے اپنا حوصلہ بڑھانے کے لیے اپنی پتلون کی پچھلی جیب میں سے فلاسک نکالا اور وحسکی کا ایک بڑا سا گھونٹ حلق میں انڈیل لیا پھر فلاسک واپس رکھ دیا اور مارگریٹ کی لاش کو عقبی نشست کے نیچے دھکیلنے لگا۔ اسے خاصی طاقت لگانی پڑی۔ مارگریٹ کی لاش کسی نہ کسی طرح نشستوں کے نیچے چھپ گئی البتہ اس کا ایک ہاتھ باہر لٹکا رہ گیا۔

”جانتی ہو، تمہاری جو اوقات ہے... تم اس سے کہیں

زیادہ میرے لیے مشکلات پیدا کر رہی ہو۔“ وہ بڑبڑایا اور لاش کے لٹکے ہوئے ہاتھ کو اٹھا کر دوبارہ کمبل کے نیچے دبا دیا۔

سام نے کار کے عقبی دروازے کو دوبارہ بند کر دیا۔ اس کے قدم اب بھی ڈمگ رہے تھے پھر اس نے مارگریٹ کی گاڑی کی چابیاں اپنی جیب سے نکالیں اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ کار کا انجن اسٹارٹ کرنے سے پہلے اس نے وحسکی کا فلاسک سامنے ڈیش بورڈ کے کپ ہولڈر میں رکھ دیا تاکہ اس کی دسترس میں رہے۔

وحسکی کے بغیر چار میل کا سفر خاصا لمبا ہو جائے گا، وہ سوچ رہا تھا۔

باہر خاصا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ سام نے ایک جھٹکے کے ساتھ کار کو آگے بڑھا دیا۔ سفر کے دوران میں مارگریٹ کی آواز کسی بدروح کی طرح بار بار اس کے ذہن میں آرہی تھی اور وہ اس سے پیچھا چھڑانے کی خاطر وحسکی کے بڑے بڑے گھونٹ لے رہا تھا۔

”تم ہمیشہ ہی سے ہارتے رہے ہو، سام۔ آخر کار تم مائیکل کی طرح ایک بہتر انسان کیوں نہیں بن جاتے؟ لا ابالی پن تمہارے اندر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ تم موٹے گاؤ دی ہو۔ کیا تمہارے اندر کوئی غیرت یا خوداری ہے؟ تم ایک بے حد برے شوہر ہو سام۔ تم نے مجھ سے صرف میری دولت کی خاطر شادی کی تھی۔ میں تمہیں چھوڑ کر جا رہی ہوں سام۔ میں مائیکل کے ساتھ ایک نئی زندگی کا آغاز کر رہی ہوں اور میں اپنی تمام دولت اپنے ساتھ لے جا رہی ہوں...“

سام غصے بھرے ان خیالات میں کھویا ہوا تھا کہ اچانک اسے ایک دھماکا سانس کی دیا۔ مارگریٹ کی کار سڑک پر گھوم کر دوسری لین میں چلی گئی۔ اپنی اضطراری کیفیت کے دھیمے پن کی بنا پر سام کو کار کنٹرول کرنے اور اسے سڑک پر سے اتار کر نرم پٹے پر لے جانے میں خاصی جدوجہد کرنی پڑی۔

”لعنت ہو! میرے پاس ٹائر تبدیل کرنے کے لیے وقت نہیں ہے۔“ سام ایک اور لمبا گھونٹ نگلتے ہوئے بڑبڑایا۔ ”مارگریٹ! میں نے گزشتہ ہفتے ہی تمہیں اس خستہ حال ٹائر کو تبدیل کرنے کو کہا تھا۔ یقین نہیں آ رہا کہ مرنے کے بعد بھی تم میرے لیے اسی طرح وبال جان بنی رہو گی جیسے کہ زندگی میں تھیں۔“

سام نے کار کے ایمر جنسی فلیشر سوچ آن کر دیے اور دروازہ کھول کر اترنے لگا تو زمین پر گر پڑا۔ اس کے قدم بے جان سے ہو رہے تھے۔

اچانک تیز روشنی نے اس کی سوچی ہوئی سرخ آنکھوں کو خیرہ کر دیا۔ اس نے کار کا سہارا لیتے ہوئے اٹھنے کی کوشش کی

اور دوسرے ہاتھ سے اس روشنی سے بچنے لگا جو اس کی آنکھوں کو چکا چوند کرتی ہوئی نزدیک آتی جا رہی تھی۔

”کیا آپ کو کوئی مدد درکار ہے، سر؟“ ایک زنانہ آواز سنتے ہی سام کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ اسے علم تھا کہ وہ اپنی لچھے دار گفتگو سے اس صورت حال سے نمٹ لے گا۔ سام نے ہاتھ پھیر کر اپنے بالوں کو سیدھا کیا اور سانس میں خوشبو پیدا کرنے والی پودینے کی میٹھی گولی منہ میں ڈال لی پھر اپنے پورے چیٹ چٹ چارائچ کے وجود کے ساتھ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”گڈ ایوننگ، آفیسر...“

”گھوڑیا۔“

”بس ٹائر فلیٹ ہو گیا ہے، آفیسر گھوڑیا۔ مجھے اسے تبدیل کرنے میں زیادہ وقت نہیں لگے گا۔“ سام نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اسے امید تھی کہ اس کی آواز بھرائی ہوئی لگی ہوگی۔

”کیا آپ کو کوئی اوزار درکار ہے؟“ آفیسر گھوڑیا نے قدرے توقف کے بعد پوچھا۔

”نہیں، میرے پاس گاڑی میں پیچھے سب کچھ موجود ہے۔“ سام نے کار کے عقبی حصے کی جانب رخ کرتے ہوئے کہا۔ وہ سہارے کے لیے کار پر ایک ہاتھ بھسلا تا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ کار کے عقبی ڈبل دروازے کو اس نے پہلے ہلکے سے کھول کر دیکھا کہ کہیں مارگریٹ کی لاش عقبی نشستوں کے نیچے سے پھسل کر باہر تو نہیں آگئی۔ لاش تو باہر نہیں آئی تھی البتہ سڑک پر اچھلنے اور کار کے ادھر ادھر ڈولنے سے اس کا ایک ہاتھ ایک بار پھر کمبل کے اندر سے نکل کر باہر لٹک گیا تھا۔

سام نے پُرسکون رہتے ہوئے لاش کو ڈسٹرب کیے بغیر جیک باہر نکالا اور دروازے کو تیزی سے بند کر دیا۔

سام نے جیک عقبی بمپر کے نیچے رکھا اور اسے پمپ کرتے ہوئے پیسے کو زمین پر سے اوپر اٹھا دیا۔ اس دوران میں اس کا حلق خشک ہو چکا تھا اور اس کی شدید خواہش تھی کہ دھسکی کا ایک گھونٹ بھر لے لیکن آفیسر کی موجودگی میں اس کی جرات نہیں ہو رہی تھی۔

سام چاہ رہا تھا کہ وہ پولیس آفیسر اپنی بیزار کردینے والی تیز روشنی اس کے چہرے پر سے ہٹا دے لیکن وہ یہ الفاظ زبان پر لانے سے قاصر تھا۔

”دیکھو آفیسر۔“ سام نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ”ہر چیز میرے کنٹرول میں ہے۔ تمہیں یہاں رکنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اپنا کام نمٹاتے ہی یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا۔“

”تو پھر آپ غلط ٹائر کیوں بدل رہے ہیں؟“ اس خاتون پولیس آفیسر نے پوچھا۔ سام پر سکتہ طاری ہو گیا۔

”کیا آپ پیسے ہوئے ہیں، سر؟“ سام نے کچھ مناسب سا جواب سوچنے کی کوشش کی لیکن اس کا ذہن کن ہو رہا تھا۔

”میں آپ کا لائسنس اور رجسٹریشن دیکھنا چاہوں گی، سر۔“ خاتون پولیس آفیسر نے کہا۔

سام کی انگلیاں اپنا پرس ٹٹولنے لگیں۔ اس نے مطلوبہ کاغذات نکالے اور انہیں پولیس آفیسر کی جانب بڑھا دیا۔

”یہیں پر انتظار کریں اور کسی قسم کی حرکت کی کوشش مت کریں۔“ یہ کہہ کر وہ خاتون پولیس آفیسر اپنی پولیس پٹرول کار کی جانب چل دی۔

نشے میں دھت ہو کر ڈرائیونگ کرنے کا جرم، قتل کے جرم کے مقابلے میں کچھ نہیں۔ سام نے دل ہی دل میں خود کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ اب مجھے اپنے اعصاب کو سکون پہنچانے کے لیے دھسکی کے گھونٹ بھرنے کی خاطر مزید کتنا انتظار کرنا پڑے گا۔

”یہ رات تو مجھ پر بہت ہی زیادہ بھاری ثابت ہو رہی ہے۔“ سام سوچ میں پڑ گیا۔

سام نے تھک ہار کر اپنا بدن کار سے نکا دیا۔ اس کے بھاری بھر کم وزن سے کار جیک پر سے پھسل گئی اور اس کا عقبی حصہ نرم مٹی کے پستے سے کھسکتا ہوا شاہ بلوط کے ایک درخت کے تنے سے ٹکرا گیا اور کار کا عقبی دروازہ ایک جھٹکے سے کھل گیا۔ آوازیں سنتے ہی خاتون پولیس آفیسر کار کی جانب متوجہ ہو گئی۔

اس دوران میں کار کے کھلے ہوئے عقبی دروازے سے مارگریٹ کا ہاتھ ایک بار پھر باہر لٹک گیا۔

یہ منظر دیکھتے ہی سام گھٹنوں کے بل جھکتا چلا گیا۔ اس کی ٹانگیں بے جان ہو چکی تھیں۔ اس نے اپنا چہرہ اپنے ہاتھوں میں چھپا لیا۔ اب وہ چکنی چپڑی باتوں سے اپنی جان نہیں چھڑا سکتا تھا۔ زندگی میں تو مارگریٹ ہمیشہ اس پر اپنی بالادستی قائم رکھتی تھی۔ اب مرنے کے بعد بھی اس نے اپنی بالادستی قائم رکھی تھی۔

اس دوران میں خاتون پولیس آفیسر مزید کمک کے لیے اپنے ریڈیو فون پر رابطہ قائم کر رہی تھی۔ ساتھ ہی اس نے اپنا سروں ریوالت نکال کر سام پر تان لیا۔

کمک چند منٹ میں پہنچ گئی۔ سام کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ دھسکی کے چند مزید گھونٹ حلق سے نیچے اتار لے لیکن اس کے ہاتھوں میں تو اب ہتھکڑیاں پڑ چکی تھیں۔ وہ بے بسی سے دھسکی کے فلاسک کو دیکھتا ہوا پولیس پٹرول کار میں جا بیٹھا۔

مرد پر عورت کی بالادستی ایک بار پھر ثابت ہو چکی تھی۔



سرورق کی پہلی کہانی

خواب

نجم مودی

مصنف و ادیب معاشرے کے نباض ہوتے ہیں... انہیں ایسے مضبوط ہاتھوں کی ضرورت ہوتی ہے جو ہر طرح کا کام انجام دے سکیں... تاکہ اس نے جو کچھ دیکھا... سنا اور پڑھا... اس میں سے سچ اور جھوٹ کو الگ کر سکے... کھوٹے اور کھوے سونے میں فرق کر سکے... اسے ذہانت اور علم کی بھی ضرورت ہوتی ہے... ذہانت اور علم کے بغیر کوئی انسان ان باتوں پر یقین نہیں کر سکتا... جن کا مشاہدہ اس کی آنکھیں کرتی ہیں... صلاحیت اور قیادت کے حامل ایک ایسے ہی مصنف کا احاطہ کرتی کہانی... قدرت نے اسے انسان کی ان گنت نفسیاتی و ذہنی الجھنوں کو سمجھنے کا فن عطا کیا تھا... قتل کے ایک کیس کی انوکھی روداد... ادیب کے مشاہدے اور تجربے کا ناقابل فراموش کارنامہ...

سراہوں اور خوابوں کے سلسلے پر محیط ایک

خونی و پرتجسس سرورق کہانی...

’کس قیامت کے یہ نامے مرے نام آتے ہیں‘ یہ وہ مصرع تھا جو..... نامور ادیب اور ڈراما نگار مقصود احمد مقصودی کے ذہن میں چکرارہا تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ اس مصرع کے ذیل میں کسی کہانی کا پلاٹ انہیں کچھ لکھنے یا کم از کم سوچنے پر مجبور کر رہا ہو بلکہ اس حد درجہ معروف مصرع کا آموختہ اس لیے جاری تھا کہ مقصود احمد مقصودی صاحب اپنے نام آنے والی ڈاک دیکھ رہے تھے جو انہیں ماہنامہ ”تجسس ڈائجسٹ“ کی معرفت موصول ہوئی تھی۔ ڈائجسٹ

کی معرفت دنیا بھر سے آنے والے زیادہ تر خطوط ان کے پرستاروں کے ہوتے تھے جو اپنے محبوب مصنف کو اپنی تحریر میں خراج عقیدت و خراج تحسین پیش کرنا چاہتے تھے۔ چند خطوط ایسے بھی ہوتے تھے جن میں نئے اور نوآموز رائٹرز ان سے مشورے اور راہنمائی کی درخواست کرتے تھے۔ تاہم ان تمام خطوط میں ایک بات مشترک ہوتی تھی کہ مقصودی صاحب اپنے ذاتی پتے سے خط بھیجنے والے کو ضرور آگاہ کریں۔

مقصودی صاحب بیشتر خطوط کے جواب دے دیا کرتے تھے مگر پتے کے بارے میں معذرت کے ساتھ... وہ سوچتے تھے کہ اگر سب کو پتا دے دیا تو وہ صرف اپنے پرستاروں اور چاہنے والوں سے ہی مل کر اپنا وقت صرف کر دیں گے اور ان کے پاس تخلیقی کام کرنے کے لیے وقت نہیں بچے گا۔ یہی ہدایت انہوں نے ڈائجسٹ کے مدیر کو بھی دی ہوئی تھی کہ ان کا پتا اور فون نمبر کسی کو بھی کسی صورت نہ بتایا جائے۔

اسی دوران میں ان کی نظر ایک لفافے پر پڑی جو عام ڈاک کے بجائے معروف کوریئر کمپنی کے ذریعے بھجوا یا گیا تھا۔ انہوں نے اسے اٹھا لیا۔ اس پر ان کا نام اور ڈائجسٹ کی معرفت پتا لکھا ہوا تھا۔ مقصود احمد مقصودی نے الٹ پلٹ کر لفافے کا جائزہ لیا۔ وہ کاروباری ڈاک میں استعمال ہونے والا لفافہ تھا تاہم اس پر کسی ادارے یا کمپنی کا نام و پتا درج نہیں تھا۔ البتہ ایک کوٹنے پر نوید علی اور ایک فون نمبر درج تھا جو شاید ڈیلیور نہ ہو سکنے کی صورت میں واپس اطلاع دینے کے لیے کام آتا۔

انہوں نے پیمبر ٹائف اٹھایا اور لفافے کو چاک کیا۔ اندر سے امپورٹڈ کاغذ پر چھپا ہوا ایک معروف کمپنی کا لیٹر ہیڈ برآمد ہوا جس پر لکھا تھا:

محترم مقصود احمد مقصودی صاحب!
السلام علیکم!

آپ مجھے نہیں جانتے مگر میں آپ کو آپ کی تحریروں، افسانوں، کہانیوں اور ڈراموں کی وجہ سے اچھی طرح جانتا ہوں۔ آپ اسے مبالغہ نہ سمجھیے گا مگر یہ حقیقت ہے کہ آپ کی تحریروں کو پڑھ کر میں نے لکھنا سیکھا ہے۔ محض اسی بات سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ میں آپ کا کتنا پرانا قاری رہا ہوں گا۔

اس وقت ایک ابھرنے والی چیز ہے اور اس سلسلے میں آپ کی مدد درکار ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ میری

معروضات کو غور سے پڑھیں گے اور ایک مشکل مسئلے کو سلجھانے میں ضرور معاونت فرمائیں گے۔

میں تو بچپن سے ہی آپ کا باقاعدہ قاری ہوں مگر میرے لیے یہ بات حد درجہ فخر و انبساط کا باعث ہے کہ میرے موجودہ پاس یعنی ”ہاف مون گروپ آف انڈسٹریز“ کے مالک جناب اظفر عالم بھی آپ کی تحریروں کے باقاعدہ قاری ہیں اور وہ تمام رسالے، ڈائجسٹ اور اخبار بڑے شوق سے پڑھتے ہیں جن میں آپ کے افسانے اور کہانیاں شائع ہوتی ہیں۔

میں نے ان کی ہدایت پر ماہنامہ تجسس کے دفتر فون کر کے آپ کا پتا یا فون نمبر حاصل کرنے کی کوشش کی تھی مگر شاید آپ کی ہدایت کے مطابق وہاں سے مجھے کوئی مدد نہ مل سکی، البتہ وہاں سے یہ ضرور معلوم ہوا کہ مصنفین کے نام آنے والی ڈاک بلا تاخیر مصنفین کو بھجوا دی جاتی ہے۔

اگر یہ اطلاع درست ہے تو یقیناً اس وقت آپ میرا یہ خط پڑھ رہے ہوں گے۔ میرا خیال ہے کہ میں آپ سے مخاطب ہونے کے باعث شاید کچھ ایکسٹنڈ ہو رہا ہوں اور خطرہ ہے کہ ان باتوں میں الجھ کر کہیں اصل بات کرنے سے نہ رہ جاؤں اس لیے میں اس خط کو مختصر کرتے ہوئے صرف یہ لکھوں گا کہ ہاف مون گروپ آف انڈسٹریز کے مالک جناب اظفر عالم ایک ذاتی معاملے کے سلسلے میں آپ سے ملاقات کے متمنی ہیں اور انہوں نے ہدایت کی ہے کہ اگر آپ اکتیس دسمبر کو شام پانچ بجے انہیں شرفِ ملاقات عطا کرنے ان کے دفتر تشریف لاسکیں تو وہ آپ کے بے حد شکر گزار ہوں گے۔ ان کے دفاتر فیکٹری ہی کی چار دیواری میں ہیں۔

مسئلے کی تفصیل خط میں بیان کرنا ممکن نہیں ہے مگر اظفر صاحب کی طرح میرا بھی یہی خیال ہے کہ آپ میرے پاس کی ایک ابھرنے والی چیز میں یقیناً معاون ثابت ہوں گے۔ اگر آپ کسی وجہ سے تشریف نہ لاسکتے ہوں تو صرف اسی صورت میں درج بالا ٹیلی فون نمبرز پر مجھے مطلع فرمادیجیے گا۔ بہ صورت دیگر حسبِ دعوت جناب اظفر عالم آپ کے منتظر ہوں گے۔

والسلام

آپ کا ادنیٰ پرستار

محمد آصف

سیکرٹری ٹو چیف ایگزیکٹو

ہاف مون گروپ آف انڈسٹریز۔ کراچی

بلو اسکتا ہے۔

انہوں نے وہ لفافہ دوبارہ اٹھایا اور اس میں سے خط نکال کر دیکھا۔ اس پر فیکٹری کا پتا لکھا ہوا تھا جو کورنگی انڈسٹریل ایریا میں واقع تھی۔ کورنگی انڈسٹریل ایریا کراچی کا معروف صنعتی علاقہ تھا۔ اس میں سائٹ کراچی جتنی فیکٹریاں تو نہیں تھیں مگر جس رفتار سے یہاں صنعتیں قائم ہو رہی تھیں، اس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ بہت جلد یہ ایک عظیم صنعتی شہر کی صورت میں ابھرے گا۔ گو کہ پہلے سے موجود صنعتوں اور ان کے گرد و پیش کی حالت اچھی نہیں تھی۔

اس سے پہلے کبھی ان کا اس علاقے میں جانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا اور ان کی زیادہ تر معلومات اخباری خبروں پر مشتمل تھیں جو وقتاً فوقتاً اس انڈسٹریل ایریا کے بارے میں چھپتی رہتی تھیں۔ اس علاقے کے بارے میں سوچتے ہوئے انہیں اظفر عالم کا خیال آیا اور انہوں نے ٹیلی فون کارپوریٹور اٹھالیا۔

ایک لمحہ ذہن پر زور دے کر انہوں نے ایک ٹیلی فون نمبر یاد کیا اور پھر ان کی انگلی مختلف ہندسوں کو بچھ کرنے لگی۔

”ہیلو!“ دوسری طرف سے ٹیلی فون اٹھائے جانے پر انہوں نے کہا۔ ”السلام علیکم!“

”وعلیکم السلام!“ دوسری طرف سے جواب دیا گیا۔ آواز سے ظاہر تھا کہ فون کسی بزرگ نے اٹھایا تھا۔

”ندیم صاحب موجود ہیں؟“ مقصودی صاحب نے وعلیکم السلام کے جواب میں دریافت کیا۔

”آپ کون...؟“ دوسری طرف سے ان کے سوال کے جواب کو گول کر کے پوچھا گیا۔

”میرا نام مقصود احمد مقصودی ہے اور میں ندیم کا دوست ہوں۔“ اس بار مقصودی صاحب نے اپنا تعارف کرا دیا۔

”ایک منٹ ہولڈ کریں۔ میں بلاتا ہوں۔“ دوسری طرف سے جواب آیا اور پھر ٹیلی فون کارپوریٹور میز پر رکھنے کی آواز آئی۔

مقصودی صاحب نے گہرا سانس لیا اور بے دھیانی میں دیوار گیر گھڑی پر نظریں جمادیں۔ اس طرح شاید وہ ایک منٹ کو پورا ہوتا دیکھنا چاہ رہے تھے۔ تاہم سیکنڈ کی سوئی نے اپنا چکر مکمل نہیں کیا تھا کہ ایک ہشاش بشاش چہکتی ہوئی آواز ان کے کانوں میں آئی۔

”ہاں... بولو مقصودی! کیا حال ہیں؟“ یہ ندیم کی

یہ عجیب و غریب خط پڑھ کر مقصودی صاحب الجھن میں پڑ گئے۔ انہوں نے نگاہ اٹھا کر کیلنڈر کو دیکھا۔ وہاں سٹائیس کا ہندسہ پلاسٹک کے مربع خانے کے اندر جگمگا رہا تھا۔ گویا ابھی چار دن باقی تھے اور اس کے بعد نئے سال کا آغاز تھا۔

اظفر عالم اور ہاف مون گروپ آف انڈسٹریز کا نام انہوں نے سن رکھا تھا مگر انہیں ان دونوں کے بارے میں زیادہ تفصیلات کا علم نہیں تھا۔ ایک لمحے کے لیے ان کے دل میں خیال آیا کہ لیٹر ہیڈ پر درج فون نمبرز پر رابطہ کر کے وہ اپنے ادنیٰ پرستار سے بات کریں مگر دوسرے ہی لمحے خط کا آخری جملہ یاد آتے ہی انہوں نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا۔

ابھی چار دن باقی تھے۔ اس دوران میں اظفر عالم، اس کی ہاف مون گروپ آف انڈسٹریز اور سیکریٹری ٹو چیف ایگزیکٹو محمد آصف کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی جاسکتی تھی۔ اور پھر دستیاب معلومات کی روشنی میں اس دعوت کو قبول یا رد کرنے کا فیصلہ کیا جاسکتا تھا۔ یہ اور بات تھی کہ اندرونی طور پر وہ اس دعوت کو قبول کر چکے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ اس کے نتیجے میں انہیں کوئی اچھی کہانی مل سکتی تھی۔

انہوں نے اس فیصلے پر پہنچنے کے بعد باقی ڈاک دیکھنا شروع کر دی پھر انہوں نے کاغذ قلم اٹھایا اور ”قابل جواب“ خطوط کے جواب عموماً اور جن خواتین و حضرات نے جوابی لفافہ ساتھ بھجوا یا تھا ان کو خصوصاً جواب لکھنے میں مصروف ہو گئے۔

تمام خطوط کے جواب لکھنے کے بعد انہوں نے انگریزی لی اور ملازم کو اچھی سی چائے کا حکم دیا۔ اتنی دیر میں وہ ہاتھ منہ دھو کر فریش ہو چکے تھے۔ چائے کے گھونٹ لیتے ہوئے ان کا دھیان اظفر عالم کی طرف چلا گیا۔

نہ جانے کیسا ہو گا یہ شخص جو ایک گروپ آف انڈسٹریز کا مالک ہونے کے باوجود مجھ سے اس طرح پر اسرار انداز میں ملنا چاہتا ہے؟ انہیں یہ بھی خیال آیا کہ شاید وہ اسی قسم کا عام سا سرمایہ دار ہو گا جو اپنے پیسے کے بل پر دنیا کی ہر شے کو خریدنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں، بس انہیں علم ہو جائے کہ وہ شے ان کے اسٹینٹس کے لیے ضروری ہے۔ عین ممکن تھا کہ اس نے اپنے دوستوں سے شرط لگائی ہو کہ وہ مقصود احمد مقصودی جیسے ادیب اور ڈراما نگار کو محض اپنے سیکریٹری کے ذریعے ایک خط لکھوا کر

آواز تھی جو ایک معروف روزنامے میں رپورٹر کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔

”یہ اظفر عالم کے بارے میں کچھ جانتے ہو؟“ مقصودی صاحب نے کسی قسم کی رسمیات میں پڑے بغیر براہ راست پوچھا۔

”اظفر... عا... لم!“ ندیم کی آواز پُر سوچ ہو گئی تھی۔ ”یہ کون ذات شریف ہیں؟“

”یہ جانتا تو تمہیں فون کرنے کا خرچہ کیوں کرتا؟“ مقصودی صاحب نے ذرا چڑنے کا انداز اختیار کر کے کہا۔

”بہر حال اتنا جانتا ہوں کہ یہ صاحب ایک گروپ آف انڈسٹریز کے مالک ہیں... شاید ہاف مون گروپ آف انڈسٹریز...“

”یہ ہاف مون کیوں...“ ندیم نے ان کی بات کاٹ کر کہا۔ ”فل مون کیوں نہیں؟ ویسے میں ان صاحب کو نہیں جانتا...“

”تو پھر کون جانتا ہوگا؟ اور تمہارے اتنے بڑے اخبار میں کام کرنے کا کیا فائدہ ہے؟“ مقصودی صاحب نے بھی اسے جملہ مکمل کرنے کا موقع دیے بغیر کہا۔

”بڑے اخبار میں کام کرنے کے کیا فائدے ہیں اس پر تو ایک مقالہ لکھا جاسکتا ہے۔“ ندیم نے جواب دیا۔ ”مگر اس وقت اس موضوع پر بات نہیں ہو رہی۔ ویسے تم خود بھی کئی پرچوں کے مدیر رہ چکے ہو۔ تم سے زیادہ اچھی طرح بھلا کون جانے گا کہ اخبار کے رپورٹر ہونے میں کیا فائدہ ہے...“

”ابھی تم خود ہی کہہ چکے ہو کہ یہ موضوع زیر گفتگو نہیں ہے پھر بھی اسی کی ٹانگ کھینچنے میں لگے ہوئے ہو۔“ مقصودی صاحب نے اس کی گفتگو کو لمبا ہوتا دیکھ کر درمیان میں مداخلت کی۔ ”اور دوسرے تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ میں شو بز اور پھر ذرا ادبی قسم کے جرائد کا مدیر رہا ہوں اور...“

”آہ...!“ دوسری طرف سے ندیم نے ایک سرد آہ بھری۔ ”کیا یاد دلا دیا... بلکہ کیا ذکر چھیڑ دیا... شو... بز...! جگ مگ کرتے ستارے اور ان ستاروں سے حال احوال پوچھتے اپنے مدیر صاحب... تم نے بھی اس فیلڈ میں کم مزے نہیں لوئے ہوں گے۔“ اس کا لہجہ رشک آمیز ہو گیا تھا۔

”لگتا ہے کہ اس وقت تم سے کوئی کام کی بات کرنا ممکن نہیں ہے۔“ مقصودی صاحب واقعتاً جھنجھلائے لگے

تھے۔ ”میں تم سے پوچھ رہا ہوں کہ اظفر عالم کے بارے میں کچھ جانتے ہو؟“

”اور تمہارے اس سوال کا جواب میں دے چکا ہوں... ایک مرتبہ پھر سن لو کہ نہیں... اور جہاں تک بات ہے اخبار میں کام کرنے کی... تو ہر شخص اپنے شعبے کے حوالے سے تو انسائیکلو پیڈیا ہو سکتا ہے مگر کسی اور کے بارے میں...“

”اور آج کل تمہارا شعبہ کیا ہے؟“ مقصودی صاحب نے پھر اسے بریک لگایا۔

”میری بیٹ شروع ہی سے کرائم کی رہی ہے۔“ ندیم نے مزید کوئی ہیر پھیر کے بغیر سیدھا جواب دیا۔ ”اور اس اظفر عالم کے بارے میں کامرس والا بندہ کچھ بتا سکے گا۔“

”سخت فضول آدمی ہو تم۔“ مقصودی صاحب نے کہا۔ ”یہ بات تم مجھے شروع میں بھی بتا سکتے تھے۔ خواہ مخواہ میں نے اپنا اتنا وقت ضائع کیا۔“

”اپنی تعریفیں سننے کو تم وقت ضائع کرنا کہتے ہو۔“ ندیم نے ایک نئی کہانی شروع کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”میں تو تمہاری کہانی تمہیں یاد دل رہا تھا... ایک قاری کی حیثیت سے یہ تمہیں خراج تحسین تھا جو شاید تمہیں اس نہیں آیا۔ ٹھیک ہے بھئی... نیکی کا تو زمانہ ہی نہیں ہے۔“

”تم اور تمہارا خراج تحسین... دونوں گئے بھاڑ میں۔“ مقصودی صاحب نے جلے کٹے انداز میں کہا۔ ”میں فرخ سے رابطہ کرتا ہوں۔ وہ مجھے اس کے بارے میں بتا دے گا۔“

”ہاں، یہ بندہ اس کام کے لیے نہایت مناسب ہے۔“ ندیم نے بھی تائید کی۔ ”مگر یہ یاد رکھنا کہ وہ اتنی آسانی سے تمہارے ہاتھ نہیں لگے گا جتنی آسانی سے تم نے میرا اتنا وقت برباد کر دیا ہے۔“

مقصودی صاحب نے مزید ایک لفظ کہے بغیر فون بند کر دیا اور دوسرا نمبر ڈائل کرنے کے لیے ہندسوں کو دبانے لگے۔

”ہیلو... فرخ! میں مقصودی بول رہا ہوں۔“ دوسری جانب سے شناسا آواز سنتے ہی انہوں نے کہا۔ ”سائیکس کیا حال ہیں؟“ فرخ کی آواز میں گرم جوشی تھی۔ ”بہت دنوں بعد یاد کیا۔“

”ایک دم فرسٹ کلاس۔“ مقصودی صاحب نے

جواب دیا۔ ”تم سناؤ کام دھند اکیسا چل رہا ہے؟“
 ”سائیں نوکری کر رہے ہیں اور وقت کو دھکا دے
 رہے ہیں۔“ فرخ نے خوشامدی لہجے میں کہا۔
 ”یہ بتاؤ، آج کل کس بیٹ پر ہو؟“ انہوں نے
 ازراہ احتیاط اس سے پہلے ہی اس کے شعبے کے بارے میں
 پوچھا۔

”سائیں... وہی کاروباری دنیا کے کالے گورے
 دھندے ہیں۔“ فرخ نے جواب دیا۔ ”صبح سے شام تک
 بینکوں اور سرمایہ داروں کی خبریں ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔“
 ”ڈھونڈتے پھرتے ہیں یا سونگھتے پھرتے ہیں؟“
 مقصودی صاحب نے ہلکے سے قہقہے کے درمیان کہا۔
 ”بابا! آپ بڑے لوگ ہو جو دل چاہے کہو، ہمیں کچھ
 بھی برا نہیں لگتا۔ ویسے سائیں! آج کل کہاں ہیں؟ بہت
 دنوں سے دیدار نہیں کرایا اور ادھر ٹی وی پر کوئی نیا
 ڈراما بھی نہیں چل رہا۔ سائیں کہیں تھک تو نہیں گئے؟“ آخر
 میں اس کا لہجہ کچھ معنی خیز ہو گیا تھا۔ ”یا کوئی نئی مصروفیت تو
 نہیں ڈھونڈ لی؟“

”ارے نہیں یار! بس سب چل رہا ہے۔ آج کل
 ایک سیریل کی تیاری میں ہوں اس لیے ادھر ادھر آنے
 جانے کا موقع بھی کم مل رہا ہے...“ مقصودی صاحب نے
 ہنستے ہوئے کہا پھر ذرا سنجیدگی سے بولے۔ ”اچھا یہ بتاؤ کہ
 اظفر عالم کو جانتے ہو؟“

”کون... وہی ہاف مون گروپ آف انڈسٹریز کا
 چیف ایگزیکٹو... آپ اسی اظفر عالم کے بارے میں پوچھ
 رہے ہو؟“ اس نے پوچھا تو مقصودی صاحب کو محسوس ہوا کہ
 اس نام نے اسے چونکا دیا تھا۔

”ہاں وہی اظفر عالم... میں اسی کے بارے میں
 کچھ معلومات چاہتا ہوں۔“ انہوں نے تائید کرتے ہوئے
 کہا۔ ”تم اس کے بارے میں یقیناً جانتے ہو گے؟“

”ارے نہیں سائیں... وہ تو کوئی پاگل یا خبطی سیٹھ
 ہے۔“ فرخ نے نیم مایوسانہ انداز میں جواب دیا۔ ”مگر
 آپ یہ بتاؤ کہ آپ کو اس کے بارے میں جاننے کی کیا
 ضرورت پیش آگئی؟“

”پہلے سوال میں نے کیا ہے اس لیے پہلے مجھے
 جواب ملنا چاہیے۔“ مقصودی صاحب نے تادہی انداز
 اختیار کرنے کی کوشش کی۔ ”تمہارے سوالوں کے جواب
 بعد میں ہوں گے۔“

”آپ کی بات سو فیصد درست ہے مگر میں بھی اپنے

تجسس کے ہاتھوں مجبور ہوں۔“ فرخ نے خوش دلی سے
 کہا۔ ”یہ سیٹھ اظفر عالم کاروباری حلقے میں ایک پراسرار
 شخصیت کے طور پر جانا جاتا ہے۔ اس کا بزنس صرف
 پاکستان میں نہیں بلکہ دنیا کے کئی ممالک میں پھیلا ہوا ہے۔
 کئی بار اس کی کمپنیوں کو مختلف ایوارڈز مل چکے ہیں اور اس کا
 گروپ آف انڈسٹریز بلاشبہ بہت اچھی ساکھ کا حامل ہے
 مگر ان سب کے باوجود اظفر عالم کو کسی تقریب میں نہیں
 دیکھا گیا۔ ہر بار... حتیٰ کہ کئی مرتبہ تو صدر یا وزیراعظم کے
 ہاتھوں ملنے والے ایوارڈز یا ٹرافی کو وصول کرنے بھی اس
 کا کوئی خاص ملازم ہی آیا۔ یہ خود بھی نہیں آیا۔ اسی طرح
 مختلف فیڈریشنز وغیرہ میں بھی اس کے نمائندے ہی ممبر شپ
 حاصل کیے ہوئے ہیں۔ وہی اس گروپ کے مفادات کی
 نگرانی کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اظفر عالم اپنے حلقے
 میں ایک پراسرار شخص کی حیثیت سے معروف ہے۔ ایسی
 شخصیت کہ کوئی اس کے بارے میں نہیں جانتا۔ بہت کم
 لوگوں نے اس کی شکل دیکھی ہے۔ اس کے باوجود وہ
 کاروباری دنیا کی خاصی مشہور ہستی ہے...“

فرخ دوسری طرف سے بول رہا تھا اور مقصودی
 صاحب خاموشی سے سن رہے تھے۔ فرخ اظفر عالم کا ذکر
 کرتے ہوئے جتنا اکیسا ہنڈ ہو رہا تھا، اس سے مقصودی
 صاحب کو اندازہ ہوا کہ فرخ کو ان کے سوال پر خاصی حیرت
 ہوئی ہوگی کہ اس درجے کے پراسرار آدمی کے بارے میں
 ایک ادیب اور ڈراما نگار کیوں استفسار کر رہا ہے؟ وہ سمجھ
 گئے تھے کہ اپنی بات ختم کر کے وہ مقصودی صاحب کے
 پیچھے پڑ جائے گا کہ اسے بتایا جائے کہ انہوں نے اظفر عالم
 کے بارے میں یہ معلومات کس وجہ سے حاصل کی ہیں۔

”...میرا خیال ہے کہ اب آپ کو بخوبی معلوم ہو گیا
 ہوگا کہ میں اظفر عالم کا سن کر کیوں چونکا تھا۔“ دوسری طرف
 سے فرخ کہہ رہا تھا۔ ”اور اب اتنی تفصیل بتانے کے بعد
 آپ مجھے یہ بتائیں کہ آپ کو اس کے بارے میں مجھ سے
 سوال کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟“

مقصودی صاحب کیونکہ پہلے ہی اس کا اندازہ لگا چکے
 تھے اس لیے انہوں نے اس کا جواب بھی سوچ رکھا تھا۔ وہ
 اس سے یہ تو نہیں کہہ سکتے تھے کہ اظفر عالم کے سیکریٹری نے
 انہیں اظفر عالم سے ملاقات کرنے کی دعوت دی ہے۔ اس
 صورت میں تو یہ خبر شاید اگلے دن کے کامرس پیج پر جلی سرخی
 میں شائع ہوتی۔

لہذا انہوں نے سرسری انداز میں جواب دیتے

ہوئے کہا۔ ”یار! تم تو جانتے ہو میں چھوٹا موٹا رائٹر ہوں۔ تمہارے اس اظفر عالم کے بارے میں مجھے کچھ اسی طرح کی خبریں ملی تھیں اور مجھے ان پر یقین نہیں آیا تھا کہ بھلا ایک بڑا کاروباری شخص کس طرح اتنا پراسرار ہو سکتا ہے؟ بس اس کی تصدیق کے لیے تمہیں فون کیا تھا کیونکہ اس کے بارے میں سن کر ایک کہانی کا پلاٹ میرے ذہن میں کلبلا نے لگا تھا۔“

”ٹھیک ہے سائیں! آپ ہمیں بھی گولی دے رہے ہو۔“ دوسری طرف سے فرخ نے ایک بار پھر لہجہ بدلتے ہوئے جواب دیا۔ ”ہم بھی اخباری دنیا کے آدمی ہیں مگر یاروں کے یار ہیں۔ ابھی جو کچھ آپ نے کہا ہے، میں نے اس پر یقین کر لیا مگر سائیں! ایک وعدہ کرو۔۔۔ کہ اگر آپ کو اس اظفر عالم کے بارے میں کوئی ایسی بات معلوم ہو جائے جس سے خبر بن سکتی ہو تو وہ مجھے ضرور بتا دینا۔“

مقصودی صاحب بہ خوبی سمجھ گئے تھے کہ فرخ ان کے ٹالنے کے انداز سے سمجھ گیا ہے کہ اصل معاملہ کچھ اور ہے تاہم انہوں نے اس کے خیالات کی تائید یا تصدیق کیے بنا صرف اتنا کہا۔ ”یار فرخ! تم اطمینان رکھو۔۔۔ اگر کوئی خبر مجھے ملی تو وہ میں صرف تمہیں بتاؤں گا۔“

”ٹھیک ہے سائیں۔۔۔ آپ نے کہا اور ہم نے مانا۔“ فرخ نے خوش دلی کے ساتھ کہا۔ ”اور کوئی حکم؟“

”نہیں۔۔۔ شک ک ک۔۔۔“ مقصودی صاحب اس کا شکر یہ ادا کر کے فون بند کرنا چاہتے تھے کہ اچانک انہیں کچھ خیال آیا۔ ”سنو! یہ بتاؤ کہ کیا واقعی اظفر عالم نامی کسی شخصیت کا وجود ہے بھی۔۔۔ ایسا تو نہیں کہ اس نام کے پردے میں کوئی اور چھپا بیٹھا ہو یا۔۔۔؟“

”چھپی بیٹھی ہو!“ ان کا جملہ فرخ نے اچکا اور اسے مکمل کرتے ہوئے بولا۔ ”جو آپ سوچ رہے ہو، ایسا نہیں ہے۔ یہ بات یقینی ہے کہ اظفر عالم موجود ہے البتہ یہ ہے کہ اس نے اپنی شخصیت کو سات۔۔۔ بلکہ چودہ پردوں میں چھپا کر رکھا ہوا ہے۔“

”اس کی فیملی لائف کے بارے میں کیا خبریں ہیں؟“ مقصودی صاحب نے نکتہ نکالا۔

”اس بارے میں بھی کوئی کنفرم اطلاع نہیں ہے۔“ فرخ نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ ”اس کی فیملی کے حوالے سے بھی متضاد اطلاعات مارکیٹ میں گردش کرتی رہی ہیں۔ کچھ کا کہنا ہے کہ اس نے شادی ہی نہیں کی اور بہ قول راوی۔۔۔ وہ ان لوگوں میں سے ہے جو دودھ کی خاطر بھینس

نہیں پالتے بلکہ جب دودھ درکار ہوتا ہے، بازار سے خرید لاتے ہیں مگر ایک ایسی بھی خبر کاروباری حلقے میں گردش کرتی رہی تھی کہ اظفر عالم نے کئی شادیاں کیں مگر اسے اولاد کسی بھی بیوی سے نہیں ملی۔۔۔ اب میں کیا بتاؤں سائیں کہ ایک اطلاع تو نہایت وثوق کے ساتھ یہ بھی پھیلی تھی کہ اس نے صرف ایک شادی کی اور اس کی بیوی غالباً دوسرے یا تیسرے بچے کی ولادت کے دوران انتقال کر گئی تھی مگر سائیں! بات یہ ہے کہ ان میں سے کسی بھی خبر یا افواہ کی کوئی تصدیق نہیں ہو سکی۔ اس کے ملازمین اس کے بارے میں اپنی زبانیں سختی سے بند رکھتے ہیں۔ اس لیے کبھی کسی خبر کی تصدیق نہیں ہو سکی۔۔۔ بس یا اور کچھ؟“ اس نے سوالیہ انداز میں اپنی بات ختم کی۔

”بس ایک دو باتیں اور۔۔۔ مگر اس سے پہلے یہ تعریفی تبصرہ بھی ضروری ہے کہ تمہیں اس کی پراسراریت کے باوجود اس کے بارے میں کافی معلومات ہیں۔“ مقصودی صاحب نے ستائشی لہجے میں کہا۔

”بس سائیں، ابھی اور شرمندہ نہیں کرو۔“ فرخ نے انکشاف کے ساتھ کہا۔ ”یہ تو وہ عام سی باتیں ہیں جو اس کے بارے میں تقریباً سب ہی جانتے ہیں۔ آپ بتاؤ آپ کو کیا پوچھنا ہے؟“

”یار! تم نے مجھے الجھن میں ڈال دیا ہے اور میں سوچ رہا ہوں کہ آج جبکہ انسان مرغ کی خبر لا رہا ہے، یہ کیسے ممکن ہے کہ کراچی جیسے شہر میں ایک انتہائی دولت مند شخص خود کو اس طرح چھپا کر رکھے کہ بہت کم لوگوں نے اس کا چہرہ دیکھا ہو اور لوگ اس کے بارے میں کچھ بھی نہ جانتے ہوں؟“ مقصودی صاحب نے الجھن زدہ لہجے میں کہا۔

”سائیں! یہ نہیں ہے کہ لوگ اسے نہیں جانتے۔ وہ خوب اچھی طرح جانا جاتا ہے۔ شہر میں اس کے کئی فلاحی ادارے کام کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ خود اس کے نام سے بہت سے طالب علموں کو تعلیمی وظائف وغیرہ دیے جاتے ہیں۔“ فرخ نے اظفر عالم کی شخصیت کا ایک اور پہلو مقصودی صاحب پر عیاں کیا۔ ”بس خود اسے پردوں میں رہنے کا شوق ہے۔ میرا خیال ہے کہ شاید اس کے ساتھ کوئی نفسیاتی مسئلہ ہے اور وہ اس طرح خود کو چھپا کر رکھنے میں لطف محسوس کرتا ہے۔“

”بہر حال، کچھ بھی ہو لیکن یہ طے ہے کہ ہاف مون گروپ آف انڈسٹریز کا چیف ایگزیکٹو اظفر عالم ایک پراسرار شخصیت ہے۔“ مقصودی صاحب نے گہرا سانس

لے کر کہا۔ ”میں نے تمہارا اتنا وقت لیا، اس کے لیے شکریہ...!“

”سائیں! ابھی مجھے جوتا تو نہ مارو۔“ دوسری طرف سے فرخ نے احتجاجی لہجے میں کہا۔ ”یہ شکریے کا لفظ ادا کر کے آپ مجھے جوتا تو مار رہے ہو... سائیں! ہم تو آپ ادیبوں، دانشوروں کے خادم ہیں اور ان کی خدمت بجالانا اپنے لیے خوشی کا سبب بنتا ہے۔“

”تمہاری مہربانی ہے کہ تم ایسا سمجھتے ہو۔“ مقصودی صاحب نے ممنون ہوتے ہوئے کہا۔ ”اور ہاں، تم بے فکر رہو... اگر مجھے اظفر عالم کے بارے میں کوئی ایسی بات معلوم ہوئی جو خبر بن سکتی ہو تو میں تمہیں ضرور بتاؤں گا۔“

”میں آپ کے فون کا انتظار کروں گا۔“ فرخ نے دوسری طرف سے کہا اور مقصودی صاحب نے فون بند کر دیا۔

فون بند کر کے انہوں نے ایک مرتبہ پھر انگڑائی لی اور پھر گھڑی پر نگاہ پڑتے ہی چونک اٹھے۔

”اوہ! اتنا وقت گزر گیا اور مجھے احساس ہی نہیں ہو سکا۔“ انہوں نے خود کلامی کی اور پھر اٹھ کر تیار ہونے لگے۔

انہیں یاد تھا کہ اس دن آرٹس کونسل میں ایک معروف ادیبہ کی تازہ ترین تخلیق کی ”رومنائی“ ہونے والی تھی۔ تخلیقات تو ان محترمہ کی بس ایویں ہی ہوتی تھیں مگر بذات خود ادیبہ صاحبہ خاصے کی چیز تھیں اور مقصودی صاحب پر خاصی مہربان بھی تھیں اس لیے اس تقریب میں شرکت ضروری تھی۔ پھر یہ بھی تھا کہ اس پہانے وہاں اور بہت سارے لوگوں سے ملاقات ہو جاتی تھی۔

اس تقریب رومنائی سے مقصودی صاحب کی واپسی کوئی گیارہ بجے تک ممکن ہو سکی۔ تقریب خاصی رنگین ہونے کے باوجود حسب توقع خشک تھی۔ رنگین اس اعتبار سے کہ مدعوین میں زیادہ تعداد رنگین آنچلوں والی شخصیات کی تھی۔ محترمہ ادیبہ صاحبہ ایک پرائیویٹ کالج بھی چلا رہی تھیں اور شاید انہوں نے وہاں پڑھانے والی استانیوں کے ساتھ ساتھ طالبات کو بھی اس تقریب میں شرکت کا پابند کر دیا تھا اس لیے آرٹس کونسل میں خاصی بہار دکھائی دیتی رہی تھی۔

مقصودی صاحب کی موجودگی کی اطلاع نے وہاں موجود حاضرین میں خاصا جوش پیدا کر دیا تھا جن میں استانیوں اور طالبات کی خاصی بڑی تعداد پیش پیش تھی۔ ان میں سے ہر ایک کی خواہش تھی کہ وہ مقصودی صاحب کا آؤگراف لے لے اور کچھ تو ایسی بھی تھیں جو اپنی پرنسپل صاحبہ کے ساتھ تصویر کھینچوانے پر مقصودی صاحب کے

بمراہ تصویر بنوانے کو ترجیح دے رہی تھیں۔

اس جاں فزا ماحول میں بھی مقصودی صاحب مسلسل اظفر عالم کے بارے میں ہی سوچتے رہے۔ اس کا خط انہیں اب پر اسرار محسوس ہو رہا تھا۔ فرخ سے بات کرنے کے بعد ایک لمحے کے لیے انہوں نے سوچا تھا کہ وہ آصف کو فون کر کے دعوت قبول کرنے سے معذرت کر لیں مگر دوسرے ہی لمحے ان کے اندر کے رائٹر نے انہیں مشورہ دیا کہ اس طرح وہ ایک کہانی سے بھی محروم ہو سکتے ہیں۔ اس لیے انہیں وہاں ضرور جانا چاہیے اور ایک ایسی پر اسرار ہستی کو دیکھنا چاہیے جسے بہت سے لوگ کوششوں کے باوجود نہیں دیکھ پا رہے تھے۔

گھر واپس آ کر انہوں نے چائے پی اور پھر کاغذ قلم سنبھال کر لکھنے میں مصروف ہو گئے۔ اب انہیں رات کو دیر تک کہانی لکھنی تھی۔ جب وہ سونے کے لیے لیٹ رہے تھے، تب انہیں خیال آیا کہ انہوں نے فرخ سے اظفر عالم کی رہائش کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا تھا کہ وہ کہاں رہتا ہے۔ انہوں نے ارادہ کیا کہ وہ صبح بیدار ہونے کے بعد فرخ سے ضرور رابطہ کریں گے۔

رات کو دیر سے سونے کے باعث صبح ان کی آنکھ ساڑھے گیارہ بجے کے قریب کھلی اور ناشتا کرتے کرتے ساڑھے بارہ کا وقت ہو گیا۔ یہ تو بریج ہو گیا۔ انہوں نے چائے کے گھونٹ لیتے ہوئے سوچا۔ بریج ختم ہو چکا تھا اور اب وہ چائے پینے کے دوران اخبار کی سرخیوں کا جائزہ لے رہے تھے۔ اسی ورق گردانی کے دوران وہ بے خیالی میں کامرس کا صفحہ دیکھنے لگے۔ اچانک ان کی نظر ایک خبر پر پڑی اور وہ چونک اٹھے۔

آنے والے بجٹ کے حوالے سے ہاف مون گروپ آف انڈسٹریز کے چیف ایگزیکٹو اظفر عالم کا بیان جلی سرنجی کے ساتھ شائع ہوا تھا۔ مقصودی صاحب بے اختیاری کے عالم میں پوری خبر پڑھتے چلے گئے۔ اپنے بیان میں اظفر عالم نے ملکی معیشت کے حوالے سے خاصی تفصیلی گفتگو کی تھی اور کئی ایک مثبت تجاویز بھی پیش کی تھیں۔

مقصودی صاحب نے دیگر اخبار بھی دیکھے۔ تقریباً تمام ہی انگریزی اور اردو اخبارات نے اظفر عالم کے اخباری بیان کو مناسب اہمیت دی تھی۔ اس سے اس کی شخصیت کے وزن کا اندازہ ہو رہا تھا۔

چائے پیتے پیتے انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ آج ہی ہاف مون گروپ آف انڈسٹریز کے دفتر کا جائزہ لے لیں

گے تاکہ تین دن بعد پتا ڈھونڈنے میں وقت ضائع نہ ہو۔

کورنگی انڈسٹریل ایریا ان کی توقع سے زیادہ گنجلک ثابت ہوا۔ ان کا خیال تھا کہ ہاف مون گروپ آف انڈسٹریز کا دفتر مرکزی سڑک پر ہوگا جو گودام چورنگی سے شروع ہو کر داؤد چورنگی تک جاری رہی تھی اور اسی خیال کے تحت وہ انڈسٹریل ایریا کا ہل عبور کر کے سیدھے ہی چلتے چلے گئے۔ داؤد چورنگی کے آثار نظر آنے تک ان کی نظریں اپنے دونوں اطراف میں واقع فیکٹریوں اور کارخانوں کا جائزہ لیتی رہی تھیں مگر انہیں کبھی ہاف مون گروپ آف انڈسٹریز یا ہاف مون انڈسٹری کا بورڈ نظر نہیں آیا۔

داؤد چورنگی تک کا فاصلہ خاصا تھا اور سڑک بھی ایسی تھی کہ بس الہاماً اللہ...! ڈرائیونگ کے دوران سڑک کے گڑھوں سے کار کو بچانے کی جدوجہد میں خود ان کا جوڑ جوڑ مل گیا تھا اور ابھی واپسی کا سفر بھی باقی تھا۔

اب کیا کریں؟ انہوں نے خود سے سوال کیا پھر کسی پی سی او کی تلاش میں ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ اس وقت تک پاکستان میں موبائل فون دستیاب نہیں تھے۔ ان کا ارادہ تھا کہ وہ ہاف مون انڈسٹریز کے فون پر رابطہ کر کے وہاں سے ایڈریس سمجھ لیں گے اور اس کے لیے یہ قطعاً ضروری نہیں تھا کہ وہ اپنا نام اور مقصد بھی بتاتے۔

چند قدم کے فاصلے پر انہیں ایک دکان میں کئی ٹیلی فون اور باہر لگا پی سی او کا بورڈ نظر آ گیا۔ بورڈ پر جلی حروف میں لکھا تھا۔ ”ملکی اور غیر ملکی کالوں کا مرکز!“ انہوں نے اسے پڑھا اور ان کے لبوں پر بے ساختہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

وہ کار سے اتر کر پی سی او کی طرف بڑھے۔ اس سے پہلے وہ ہاف مون انڈسٹریز کے سیکریٹری چیف ایگزیکٹو کا خط گاڑی سے اٹھانا نہیں بھولے تھے۔ اسی پر تو ٹیلی فون نمبرز لکھے ہوئے تھے۔ پی سی او خالی پڑا تھا اور پینٹ شرٹ والا ایک نوجوان ڈائجسٹ کے مطالعے میں مصروف تھا۔ ان کی آمد کا احساس ہونے پر اس نے ڈائجسٹ اٹھا کر کاؤنٹر پر رکھ دیا۔ مقصودی صاحب نے دیکھا، وہ ماہنامہ ”ڈائجسٹ ڈائجسٹ“ کا تازہ شمارہ تھا۔

”جی سر!“ انہیں دکان میں اندر داخل ہوتے دیکھ کر اس نے مہذبانہ انداز میں کہا۔ ”لوکل کال ہے یا کسی دوسرے شہر فون کرنا ہے؟“

”مجھے تو لوکل کال کرنی ہے مگر پہلے ایک بات بتاؤ۔“ مقصودی صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”یہ اپنے دیسی

کالے تو ٹھیک ہے لیکن اگر آپ نے غیر ملک سے بھی کالے ہی منگوائے ہیں تو بڑا ظلم کیا ہے۔ وہاں سے گورے بلکہ گوریاں بلوائی تھیں۔“

”جی...!“ اس غیر متعلق اور انتہائی غیر متوقع بات کو سن کر نوجوان چونک اٹھا۔

”میں تو یہ کہہ رہا تھا کہ آپ نے بورڈ پر لکھا ہے۔“ ”ملکی اور غیر ملکی کالوں کا مرکز!“ مگر یہاں تو مجھے کوئی ملکی کال بھی نظر نہیں آ رہا کیونکہ آپ تو ماشاء اللہ خاصے گورے ہیں۔“ مقصودی صاحب نے باہر رکھے بورڈ کی طرف اشارہ کر کے وضاحتی انداز میں کہا تو نوجوان کے ہونٹوں پر بے ساختہ مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔

”در اصل یہ انگریزی کال کی اردو میں جمع بنائی گئی ہے جس کی وجہ سے ’کالوں‘ ہو گئی ہے ورنہ اصل میں تو کالز لکھا جانا چاہیے تھا۔“ نوجوان نے ملاحظہ ہوتے ہوئے وضاحتی انداز میں کہا۔ ”ویسے یہ حقیقت ہے کہ اس جملے کی یہ تشریح آج تک کسی نے نہیں کی تھی۔ میرا خیال ہے کہ آپ کوئی ادیب یا دانشور قسم کی شخصیت ہیں جب ہی تو آپ نے ایک عام سی غلطی سے ایسی زبردست بات نکال لی۔“

مقصودی صاحب کو اس کے قیاس پر حیرت ہوئی مگر انہوں نے انکساری کے ساتھ کہا۔ ”نہیں بھئی، میں کوئی دانشور یا ادیب نہیں ہوں بس اسے دیکھتے ہی ایک بات ذہن میں آئی اور میں نے اس کا اظہار کر دیا۔ اچھا، اب یہ باتیں چھوڑو اور مجھے ایک نمبر ملا کر دو۔“ انہوں نے اپنے مطلب پر آتے ہوئے کہا۔

”بالکل... بالکل۔“ نوجوان مستعدی سے بولا اور ایک ٹیلی فون ان کی طرف کھسکا کر بولا۔ ”آپ خود ملا لیں۔“

مقصودی صاحب نے شکر یہ کہتے ہوئے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھا لیا۔ اس کے بعد انہوں نے خط پر لکھے فون نمبرز میں سے ایک نمبر ملا لیا۔ دوسری طرف سے گھنٹی بجنے کی آواز آئی۔ تین گھنٹیاں بجنے کے بعد اچانک ایک بیپ کی آواز آئی اور آنسرنگ مشین میں ریکارڈ شدہ پیغام سے سنائی دینے لگا۔

”یہ محمد آصف، سیکریٹری ٹو چیف ایگزیکٹو جناب اظفر عالم کا نمبر ہے۔ وہ اس وقت موجود نہیں ہیں۔ آپ اپنا پیغام مع نام اور ٹیلی فون نمبر اس بیپ کے بعد ریکارڈ کرا سکتے ہیں۔“ یہی پیغام انگریزی میں دہرایا گیا پھر ایک بیپ کی آواز ابھری اور ٹیلی فون پر خاموشی چھا گئی۔ چند لمحے بعد

دوبارہ پیپ کی آواز آئی اور پھر ”نوسٹج ریکارڈ“ کے مختصر پیغام کے بعد ایک مرتبہ پھر پہلے والا پیغام دہرایا جانے لگا۔ مقصودی صاحب نے کریڈل دبا کر کال منقطع کر دی۔ وہ بھلا کیا پیغام ریکارڈ کر سکتے تھے؟ انہوں نے بقیہ نمبر بھی ٹرائی کیے مگر سب پر یہی ریکارڈنگ لگی ہوئی تھی۔ ”کیا ہوا سر؟“ نوجوان نے ان کی مسلسل خاموشی کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”کوئی اٹینڈ نہیں کر رہا؟“

”ہاں، بس ایسی ہی بات ہے۔“ مقصودی صاحب نے الجھن آمیز انداز میں کہا۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ غیر متعلق افراد کے ٹیلی فون سے بچنے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا گیا تھا۔ اب فون کرنے والا اپنا مدعا اور نام و پتا وہاں ریکارڈ کروادیتا اور بعد میں ان ریکارڈنگز کو سن کر یہ فیصلہ کر لیا جاتا کہ کس سے بات کرنی ہے اور کس سے نہیں۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اظفر عالم کا سیکریٹری وہیں موجود ہو اور ہر کال کی ریکارڈنگ کے بعد اسے سن رہا ہو۔ احتیاط کا یہ انداز دیکھ کر مقصودی صاحب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ انہیں اب مزہ آنے لگا تھا۔ ”یہ اظفر عالم تو خاصی دلچسپ شے ثابت ہوتی نظر آرہی ہے۔“ انہوں نے خود سے کہا اور بٹوے میں سے ٹیلی فون کالز کی رقم نکال کر نوجوان کی طرف بڑھائی۔

”یہ کس بات کے؟“ نوجوان نے حیرت سے پوچھا۔ ”آپ کا تو کوئی نمبر اٹینڈ ہی نہیں ہوا۔“

”بس رکھ لو۔“ مقصودی صاحب نے وضاحت کیے بغیر کہا۔ ”کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ فون اٹینڈ نہ ہونے کے باوجود کال ہو جاتی ہے۔ یہ بتاؤ کہ سیکٹر ٹوئینٹی تھری کس طرف ہوگا؟“ انہوں نے فون پر پتا معلوم کرنے کی کوشش میں ناکامی کے بعد اب اس طرح کوشش کی۔

”سیکٹر ٹوئینٹی تھری!“ نوجوان نے دہرایا۔ اس نے ٹیلی فون کالز کی رقم وصول کر لی تھی۔ ”کورنگی یا لائنڈھی؟“ اس نے سوال کیا۔

”کورنگی انڈسٹریل ایریا۔“ مقصودی صاحب نے جواب دیا۔

”کورنگی انڈسٹریل ایریا۔“ نوجوان نے ٹرسوچ انداز میں دہرایا۔ ”سیکٹر ٹوئینٹی تھری... اوہ! ہاں... مگر وہ تو یہاں سے بہت دور ہے... آپ یہاں سے واپس ہو جائیں اور پھر چلتے چلے جائیں۔ یہاں سے چھٹی چورنگی گودام چورنگی ہے، اس سے اٹنے ہاتھ پر مڑیں تو سارا علاقہ سیکٹر ٹوئینٹی تھری ہے۔“

مقصودی صاحب کو ایک لمحے کے لیے لرزہ سا آگیا۔ وہ جو صعوبت برداشت کرنے کے بعد اس مقام تک پہنچے تھے، اس کو دوبارہ برداشت کرنے کے بارے میں سوچتے ہوئے انہیں ٹھنڈے پسینے آنے لگے تھے۔ انہیں افسوس ہوا کہ وہ خواخواہ اس مہم پر تنہا کیوں نکل آئے تھے اور کسی کو نہیں تو وہ کامران ایڈووکیٹ کو تو بلا ہی سکتے تھے جس کی گفتگو میں ان کا وقت اچھا گزر جاتا۔

”اچھا!“ انہوں نے مردہ لہجے میں کہا۔ ”ویسے آپ کو یقین ہے کہ سیکٹر ٹوئینٹی تھری اسی طرف ہے؟“ انہوں نے یقین دہانی چاہی۔ ان کی خواہش تھی کہ وہ نوجوان اپنی رائے پر نظر ثانی کر لے اور انہیں بتا دے کہ ”اوہ! ہاں... میں غلطی پر تھا۔ سیکٹر ٹوئینٹی تھری تو وہ سامنے والا علاقہ ہے۔ بتائیے آپ کو کہاں جانا ہے؟“ مگر افسوس کہ ایسا نہ ہوا اور نوجوان نے وثوق سے اپنا سر ہلایا۔

”میں آپ کو مس گاؤں نہیں کر رہا، مجھے اچھی طرح پتا ہے کہ گودام چورنگی کا علاقہ سیکٹر ٹوئینٹی تھری میں آتا ہے۔“ اس کے انداز نے مقصودی صاحب کو یقین دلادیا کہ انہیں اسی ٹوٹی پھوٹی سڑک پر ایک مرتبہ پھر ڈرائیونگ کرنی ہوگی اور کار کے ساتھ ساتھ اپنے بھی انجری پنجر ڈھیلے کرانے ہوں گے۔

وہ واپسی کے لیے مڑے اور اظفر عالم اور اس کے سیکریٹری کے بارے میں سوچتے ہوئے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئے۔

گودام چورنگی کے نزدیک پہنچ کر انہوں نے ایک چھپر ہوٹل کے مالک سے ہاف مون گروپ آف انڈسٹریز کا پتا معلوم کرنا چاہا تو اس نے ہوٹل میں کھانا کھاتے ایک بابو ٹائپ بندے کو تکلیف دی۔ وہ بھی کوئی نیک انسان تھا۔ کھانا چھوڑ کر اس نے مقصودی صاحب کو آگاہ کیا کہ اس چورنگی سے بائیں طرف مڑنے والی سڑک پر چل کر وہ دوبارہ بائیں طرف مڑیں گے تو اسی اطراف میں انہیں ان کا مطلوبہ پتہ مل جائے گا۔

مقصودی صاحب نے اس کا شکریہ ادا کیا اور پھر اس کی ہدایت کے مطابق جھاڑ جھنکاڑ کے درمیان سے گزرتی سڑک پر روانہ ہو گئے۔ اس کے بعد انہیں زیادہ نہیں پھرنا پڑا۔ مرکزی سڑک کے متوازی سڑک پر دو تین ذیلی سڑکوں کے بعد انہیں ہاف مون گروپ آف انڈسٹریز کا بڑا سا بورڈ نظر آگیا جس پر تیر بنا کر منزل مقصود کی نشاندہی کی گئی تھی۔

انہوں نے دیکھا کہ ڈرائیور کی طرف واقع ہاف

مون گروپ آف انڈسٹریز کا صدر دفتر خاصی شان دار عمارت میں واقع تھا۔ وہ سہ منزلہ عمارت تھی جس کے عقب میں کوئی فیکٹری وغیرہ ہوگی کیونکہ انہیں وہاں بہت بڑے بڑے شینڈلز اور ایک بلند چمنی بھی نظر آرہی تھی۔ فیکٹری غالباً بند تھی اس لیے چمنی سے دھوئیں کا اخراج رکا ہوا تھا۔

انہوں نے قرب و جوار کا جائزہ لیا۔ عمارت کے سامنے رخ پر ایک فیکٹری کی عقی دیوار واقع تھی۔ دیوار غیر معمولی بلند تھی اور انہیں اس پر بجلی کے تار بندھے ہوئے نظر آرہے تھے۔ فیکٹری نہ ہوئی کوئی جیل ہوگئی، انہوں نے سوچا اور واپسی کے لیے روانہ ہو گئے۔ ان کے لیے آج کا کام ختم ہو گیا تھا۔

انہیں خوشی تھی کہ وقت سے پہلے مطلوبہ مقام کو دیکھ لینے کا خیال درست تھا ورنہ وہ دعوت کے مطابق یہاں آتے تو شاید وقت پر نہ پہنچ پاتے اور بھٹکتے ہی رہ جاتے۔

اظفر عالم کے اس دعوتی رقعے کی وصولیابی کے بعد سے ان کا اشتیاق مسلسل بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ وہ اس کے بارے میں جس قدر جاننے کے لیے بے چین تھے، اسی قدر اس کی ذات پر دوں میں لپٹی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ اور اب اظفر عالم کے سیکریٹری کو فون کرنے سے انہیں اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ بھی کچھ کم پراسرار شخصیت نہیں تھا۔ ٹیلی فون آنسرنگ مشین کا ایسا استعمال انہوں نے اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔

واپسی کے سفر میں انہیں پھر کامران کا خیال آیا اور انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ گھر پہنچ کر اسے ضرور ٹیلی فون کریں گے۔ وہ اس سے اپنے تجربات و مشاہدات کو شیئر کرنا چاہتے تھے۔

دوپہر کے قیلو لے کے بعد چائے پیتے ہوئے انہوں نے کامران کو فون کیا۔ وہ کورٹ سے دھکے کھا کر اسی وقت اپنے چیمبر میں پہنچا تھا۔ مقصودی صاحب کی آواز سنتے ہی وہ گویا کھل گیا۔ وہ لمبی گنگٹگو پر آمادہ تھا مگر مقصودی صاحب نے رات کے کھانے کی دعوت دے کر فون بند کر دیا۔

اس کے بعد انہوں نے اپنے معمول کے کام نمٹائے۔ اس کے علاوہ انہوں نے اظفر عالم کے سیکریٹری کی طرف سے موصول ہونے والے دعوت نامے سے لے کر اس کا پتا تلاش کرنے کی صعوبت تک کے تمام واقعات بھی قلم بند کر دیے۔ وہ سوچ رہے تھے کہ یہ ایک نئی کہانی کی بنیاد رکھی جا رہی ہے جسے بعد میں وہ کوئی بھی موڑ دے سکیں گے۔

رات کو آٹھ بجے کامران کا فون آ گیا۔
”او بھائی! کھانا کہاں کھلا رہے ہو؟“ مقصودی صاحب کی ہیلو کے جواب میں اس نے کہا۔ ”مجھے تو ابھی سے بھوک لگنی شروع ہو گئی ہے اور تمہارے جواب دیتے دیتے تو یہ بھوک شدید ہو جائے گی۔“

”گھر آ جاؤ۔ یہیں کچھ کر لیتے ہیں۔“ مقصودی صاحب نے اسے چھینڑنے کی غرض سے کہا۔

”آہ! میں مر گیا۔“ کامران کی بلبلاتی ہوئی آواز آئی۔ ”اور میرا خون ناحق میرے دوست اور عظیم رائٹر مقصودی کی گردن پر ہے جس نے ایک وقت بھوکا رکھ کر مجھے مار ڈالا۔۔۔ اوہ۔۔۔ ہائے۔۔۔ ارے اسٹینو، ادھر آؤ، میرا وصیت نامہ لکھ لو۔۔۔“ کامران کی صدا کاری شروع ہو گئی تھی۔

”تو تم مر رہے ہو؟“ مقصودی صاحب نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ”ایسا کرو کہ مُردے ڈھونے والوں کو بتا دو کہ وہ تمہارا جنازہ شیرٹن پہنچا دیں، میں وہیں تمہاری فاتحہ کا بندوبست کر رہا ہوں۔“

”قبلہ عظیم رائٹر صاحب! آپ مُردے کی فاتحہ تو شیرٹن میں کر رہے ہیں اور مجھ زندہ کو کھانے پر گھر بلا رہے تھے؟ بہر حال میں شیرٹن کے لیے روانہ ہو رہا ہوں، تم وہیں آ جاؤ۔“

”میں زیادہ سے زیادہ دس منٹ میں وہاں پہنچ رہا ہوں۔ تمہیں بھی اتنا ہی وقت لگے گا۔“ مقصودی صاحب نے اسے جواب دیا اور ٹیلی فون بند کر کے اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہیں پہلے سے اندازہ تھا کہ کامران رات کے کھانے کے لیے شیرٹن سے کم پر راضی نہیں ہوگا اس لیے وہ پہلے سے تیار تھے۔ اگر اس کا فون نہ آتا تو وہ خود فون کر کے اسے وہاں بلانے والے تھے۔

شیرٹن کے چاندنی ریسٹورنٹ میں ڈنر کر کے کامران نے پیٹ پر طمانیت بھرے انداز میں ہاتھ پھیرا اور بولا۔
”ہاں تو پیارے! اب بتاؤ کہ اس وقت یہ نظر عنایت کس غرض سے کی گئی ہے؟“

”پہلے کافی کا ایک ایک کپ ہو جائے پھر بات کریں گے۔“ مقصودی صاحب نے سنجیدگی سے کہا تو وہ بھی سنجیدہ ہو گیا۔

”تو چلو لابی میں چلتے ہیں، وہاں کی رونق بھی دیکھتے ہیں اور باتیں بھی کرتے ہیں۔“ اس نے کرسی چھوڑ کر کہا۔
بات معقول تھی اس لیے مقصودی صاحب بھی اٹھ

کتنا کامیاب ہے۔“

مقصودی صاحب ایک لمحے کے لیے سوچ میں پڑ گئے پھر سر اٹھا کر بولے۔ ”تمہاری بات میں وزن ہے۔ اب میں اس معاملے کو تمہاری رائے کی روشنی میں دیکھ رہا ہوں تو مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ اپنی اس رازداری کی وجہ سے وہ زیادہ مقبول اور مشہور ہے جتنا کہ شاید وہ عام حالات میں نہ ہوتا لیکن پھر بھی میں بہر حال یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آخر وہ چیز کیا ہے؟ کاروبار کے علاوہ اس کے اور مشاغل کیا ہیں؟ اس کی گھریلو زندگی، ازدواجی معاملات وغیرہ وغیرہ...“

”یار مقصودی! تم ادیب ہو، ڈراما نگار ہو اور بہت کچھ ہو مگر اخباری رپورٹر ہرگز نہیں ہو۔ اس لیے ان چکروں میں کیوں پڑتے ہو؟ اس نے تمہیں ملاقات کے لیے بلایا ہے۔“ کامران نے اکتانے والے انداز میں کہا۔ ”تمہاری مرضی ہے کہ تم اس سے ملنے جاتے ہو یا نہیں... میرا خیال ہے کہ یہ کوئی زبردستی کا سودا نہیں ہے اور مجھے یہ بھی امید ہے کہ تمہیں اپنے سوالوں کے جواب حاصل کرنے کا یہ بہترین موقع مل رہا ہے، اس سے فائدہ اٹھا لو اور بعد میں مجھے بھی اس کی تفصیل بتا دینا۔“

”چلو ٹھیک ہے، اس موضوع پر لعنت بھیجو۔“ مقصودی صاحب نے کامران کی بات کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ ”جو ہونا ہو گا وہ بدلہ جتا چل جائے گا۔“

”اب کی تا تم نے عقل مندی کی بات۔“ کامران نے کہا تو مقصودی صاحب چونک اٹھے۔

”اس کا مطلب ہے کہ میں اس سے پہلے بے وقوفی کی باتیں کر رہا تھا؟“ انہوں نے تنک کر پوچھا۔

”نہیں... نہیں، میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔“ کامران نے فوراً ہی مصالحانہ انداز میں جواب دیا۔

”تو پھر تمہارا کیا مطلب تھا؟“ مقصودی صاحب نے غرانے کی صداکاری کی۔

”میرا مطلب یہ تھا کہ اتنی حسین رات ہے... ہر طرف رنگینیاں بکھری نظر آرہی ہیں اور تم ایسی خشک اور بے ہودہ باتیں لے کر بیٹھے ہوئے ہو۔“ کامران نے جواب دیا۔ ”اپنے آس پاس دیکھو اور ماحول سے لطف اندوز ہو۔“

”یہ سب ثانوی باتیں ہیں۔“ مقصودی صاحب نے پُرسوج انداز میں کہا۔ ”بہر حال اور کچھ ہو یا نہ ہو، مجھے تو اس دعوت نامے سے ہی ایک خوب صورت اور اچھی کہانی کا پلاٹ مل گیا ہے۔“

کھڑے ہوئے۔

”ہاں، بس اب شروع ہو جاؤ کہ تمہارا ہیرو کہاں پھنس گیا ہے اور اب تمہیں میری کیا مدد درکار ہے؟“ کافی کا آرڈر دینے کے بعد اس نے بے تابی سے پوچھا۔

”ہیرو تو کہیں نہیں پھنسا، البتہ میں خود ایک الجھن میں مبتلا ہوں۔“ مقصودی صاحب نے اسے جواب دیا۔

”بھائی! میرا مطلب بھی یہی ہے کیونکہ میرے لیے تو تم ہیرو ہو۔ اصلی تے وڈے ہیرو!“

جواب میں مقصودی صاحب نے اظفر عالم کا دعوت نامہ ملنے... اور پھر اس کے بعد کے تمام واقعات کی تفصیل کامران کو سنائی۔

”تو اس میں الجھن کی کیا بات ہے؟“ ساری کہانی سن لینے کے بعد اس نے بے پروائی سے کہا۔ ”یہ تو سامنے کی بات ہے۔ وہ اظفر عالم کسی نہ کسی سے تو ملتا ہو گا اور ہر ایک کے لیے اس نے کچھ نہ کچھ طریقے وضع کر رکھے ہوں گے۔ تم سے ملنے کے لیے بھی اس نے یہ طریقہ نکالا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تمہاری طرح دیگر کئی افراد بھی اس کی خواہش پر اس سے ملاقات کر چکے ہوں گے مگر انہوں نے اس کا تذکرہ کہیں نہیں کیا ہو گا۔ مجھے یقین ہے کہ تم سے ملاقات کے بعد وہ تم سے بھی یہی درخواست کرے گا کہ اس کا ذکر کسی سے نہ کیا جائے... اور مجھے یہ بھی یقین ہے کہ تم بھی اس کی اس خواہش کا احترام کرو گے۔“

”تم شاید... بلکہ یقیناً میری بات نہیں سمجھ سکے ہو۔“ مقصودی صاحب نے اس کی تقریر کے جواب میں کہا۔

”میری الجھن یہ ہے کہ آج بیسویں صدی میں جبکہ انسان دوسرے سیاروں کی خبریں لا رہا ہے، ایک شخص کو آخر اتنا پردے میں رہنے کی کیا ضرورت ہو سکتی ہے؟ دوسرے یہ کہ وہ کوئی معمولی شخصیت بھی نہیں ہے۔ فرخ نے بتایا ہے کہ اس کا کاروبار کئی ممالک میں پھیلا ہوا ہے مگر کوئی اسے صحیح طور پر نہیں جانتا...“

”بے وقوفی کی باتیں مجھے بالکل پسند نہیں ہیں۔“ کامران نے مقصودی صاحب کا جملہ اچک لیا۔ ”تم یہ قطعاً نہیں کہہ سکتے کہ اظفر عالم کو کوئی نہیں جانتا... میرا تو خیال ہے کہ وہ خود کو اس طرح زیادہ مشہور کرانے میں کامیاب رہا ہے... اگر وہ اس طرح کا رویہ اختیار نہ کرتا تو تم سوچو کہ کیا تم اس طرح اس کے بارے میں تجسس کا شکار ہوتے؟ قطعاً نہیں... اس نے نہایت خوبی کے ساتھ خود کو خبروں میں ان رکھنے کے لیے یہ سارا کھٹ راگ پھیلا یا ہے اور دیکھو کہ وہ

جن کے لیے بسا اوقات کم سفر بھی انگریزی والے زیادہ سفر میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

مقصودی صاحب کو کئی ذرائع سے یہ معلوم ہوا تھا کہ اظفر عالم اپنے بارے میں پر اسرار کہانیاں اور داستانیں ”مارکیٹ“ میں پھیلانے کے لیے باقاعدہ پیسے خرچ کرتا تھا اور اس کے بیسروں پر خاصی معتبر ہستیاں بھی تھیں۔ باوثوق ذرائع کے مطابق وہ ایب نارمل زندگی گزار رہا تھا اور اسے جانوروں سے عمومی طور پر اور بلیوں سے خصوصی طور پر شدید نفرت تھی۔ یہ بھی اس کی شخصیت کا عجیب پہلو تھا۔ ایسا شخص جو لوگوں سے ویسے ہی نہ ملتا ہو، اسے جانوروں سے بھی نفرت تھی... تو اس کے انسان ہونے میں بھی شبہ کیا جاسکتا تھا۔

انہی سوچوں میں ڈوبے ہوئے مقصودی صاحب کورنگی انڈسٹریل ایریا کی طرف رواں رہے۔ جب وہ ہاف مون گروپ آف انڈسٹریز کے سامنے پہنچے تو ان کی رسٹ وائچ میں چارنج کر پچپن منٹ ہو رہے تھے جس کا مطلب تھا کہ وہ مقررہ وقت سے صرف پانچ منٹ پہلے وہاں پہنچ گئے تھے۔ انہوں نے سوچا کہ پانچ منٹ کا یہ وقت وہ کار میں بیٹھ کر ہی گزار لیں تو بہتر رہے گا۔ ایسا نہ ہو کہ وہ خطی اظفر عالم پانچ منٹ پہلے آنے پر بھی برا مانا جائے اور اپنی دعوت کو منسوخ کر دے۔

ٹھیک پانچ بجے انہوں نے کار سے اتر کر فیکٹری کے گیٹ کے قریب موجود کال ٹیل کا بٹن دبایا۔ فوراً ہی بلند وبالا گیٹ کا ذیلی دروازہ کھلا اور اس میں سے ایک گارڈ نے باہر جھانکا۔

”جی صاحب!“ اس نے سوالیہ نظروں سے مقصودی صاحب اور پھر ان کی کار کو دیکھا۔

”مجھے اظفر عالم سے ملنا ہے۔“ مقصودی صاحب نے اس کی نظروں کے سوال کا جواب دیا۔

”آپ کا نام؟“ اس نے اس بار نظروں کے بجائے زبان سے سوال کیا تھا۔

”مقصود احمد مقصودی۔“ مقصودی صاحب نے جواب دیا۔ ”انہوں نے مجھے ملاقات کے لیے بلایا تھا۔“

مقصودی صاحب کو محسوس ہوا کہ ان کے جواب کے دوسرے حصے نے گارڈ کو حیرت میں مبتلا کر دیا تھا۔

”ملاقات کے لیے بلایا تھا؟“ گارڈ نے ابھن زدہ انداز میں دہرایا پھر سیدھا ہاتھ بڑھا کر بولا۔ ”انہوں نے کوئی دعوت نامہ بجھوایا تھا؟“ اس کے انداز سے عیاں تھا کہ

”ہاں بھی، تم رائٹرز کے مزے ہیں... اپنے ارد گرد جو کچھ دیکھتے ہو، اسے ذرا مریج مسالا ڈال کر لکھ دیتے ہو اور ایک ہم ہیں۔“ وہ آزدگی کی اداکاری کرتا ہوا ایک لمبے کے لیے خاموش ہوا پھر بولا۔ ”سارا سارا دن موٹوں کی بک بک سنتے ہیں، موٹی موٹی کتابوں میں سے نظریں اور حوالے ڈھونڈتے ہیں۔ کیس فائلز کے نام پر ہمیں جو کچھ بڑھنا پڑتا ہے... الامان والحفیظ... ہماری مشقت پھر بھی ختم نہیں ہوتی۔ اس کے بعد مخالف وکیل کی پینترے بازیوں کو سمجھنا اور جج تک اپنی بات صحیح طریقے سے پہنچا کر اسے اپنے حق میں فیصلہ کرنے پر مائل کرنا... اور ان سب سے بڑھ کر... بڑے ہوئے موکل کو سمجھانا... کہ جو کچھ ہو رہا ہے، وہ صحیح ہو رہا ہے اور نتیجہ اچھا ہی نکلے گا۔“

”ہائے...!“ مقصودی صاحب نے ایک آہ بھری اور رحم آمیز نظروں سے کامران کو دیکھا۔ ”واقعی ایک صرف تم ہی ہو جو اپنی روٹی حلال کر کے کھاتے ہو۔“

”جی ہاں... کیونکہ میں ایک شریف وکیل ہوں۔“ کامران نے خیر یہ لہجے میں کہا۔

”وکیل اور شریف؟“ مقصودی صاحب نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”تم وکیلوں کے بارے میں اکبر الہ آبادی نے بہت پہلے اور بہت خوب کہا تھا کہ... پیدا ہوا وکیل تو...“

”بس بس... پورا شعر پڑھنے کی ضرورت نہیں۔“ کامران نے ہاتھ اٹھا کر انہیں روک دیا۔ ”غور سے سنو! شعر اصل میں یوں ہونا چاہیے تھا... پیدا ہوا وکیل تو انسان نے کہا... لو آج ہم بھی صاحب آواز ہو گئے۔“

”واہ واہ۔“ مقصودی صاحب نے ستائشی انداز میں ہولے سے تالی بجاتی۔ ”تم نے وکالت کے ساتھ کیا شاعری بھی شروع کر دی ہے... اچھا ہے، خود کہا ہے؟“

”نہیں بھی... کسی شاعر نے ہی کہا ہوگا۔ میں نے سنا اور یاد کر لیا۔“ کامران نے جواب دیا۔ ”میرے مطلب کا جو تھا۔ اب گھر چلنے کی کرو۔ مجھے آج رات ایک کیس کی تیاری کرنی ہے ورنہ موکل مجھے مار ڈالے گا اور میرے قتل کا مقدمہ دوسرے وکیل لڑ رہے ہوں گے۔“

☆ ☆ ☆

اکتیس دسمبر کا دن خنک تھا۔ مقصودی صاحب کے جھگٹے سے کورنگی انڈسٹریل ایریا کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا اور ویسے بھی اگر گاڑی اپنی ہو تو زیادہ فاصلہ بھی زیادہ نہیں ہوتا۔ مسئلہ تو پبلک ٹرانسپورٹ استعمال کرنے والوں کا ہے

اسے مقصودی صاحب کی بات کا یقین نہیں آیا تھا۔

”ہاں، بالکل۔“ مقصودی صاحب نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور شکر ادا کیا کہ انہوں نے وہ دعوتی رقعہ گھر سے نکلتے وقت اٹھا کر رکھ لیا تھا ورنہ شاید انہیں مایوس لوٹنا پڑتا۔ گارڈ نے وہ خط لیا۔ اس کی تہیں کھول کر اس کے چہرے کے تاثرات تبدیل ہو گئے۔

”آئیے صاحب!“ اس نے یکا یک مؤدبانہ انداز اختیار کر لیا۔

مقصودی صاحب نے دیکھا کہ سامنے ہی ہاف مون گروپ آف انڈسٹریز کے دفاتر بنے ہوئے تھے جہاں تک جانے کے لیے ٹائلز سے مزین راستہ بنا ہوا تھا اور اس کے اطراف ایسا وہ ستونوں پر نیم مخروطی چھت بھی ڈالی ہوئی تھی۔ ایک طرف وسیع کاریار کنگھی اور دوسری طرف تارکول کی پختہ سڑک نظر آرہی تھی جو گھوم کر انتظامی بلاک کے عقب میں غائب ہو رہی تھی۔ اس طرف یقیناً فیکٹری تھی۔

مقصودی صاحب گارڈ کے ساتھ انتظامی بلاک کی طرف چلنے لگے۔ ایسا لگتا تھا کہ اس وقت وہاں ان دونوں کے علاوہ کوئی اور شخص موجود نہیں تھا۔ مقصودی صاحب کے آنے کے بعد گارڈ نے ذیلی دروازہ بند کر دیا تھا اور اب اسے صرف اندر سے ہی کھولا جاسکتا تھا۔

وہ دونوں عمارت کے اندر داخل ہوئے جہاں ہر طرف گہرے سناٹے کا راج تھا۔ تمام کمرے بند تھے اور بند دروازوں کے پیچھے اندھیرا محسوس ہو رہا تھا۔

”کیا آج دفتر میں چھٹی ہے؟“ مقصودی صاحب اپنے تجسس سے مجبور ہو کر پوچھ بیٹھے۔

”چھٹی؟“ گارڈ نے الجھتے ہوئے دہرایا۔ شاید وہ بھی اظفر عالم کی طرح سکی تھا جو ہر بات کو دہرانے کے بعد ہی سمجھتا تھا۔ ”نہیں جناب! آج تو چھٹی نہیں تھی۔“

”تو پھر یہ سب دفتر بند کیوں ہیں؟“

”بند کیوں ہیں؟“ اس نے اپنی عادت کے مطابق الجھتے ہوئے دہرایا پھر گویا ان کا مطلب سمجھتے ہوئے بولا۔ ”در اصل بات یہ ہے کہ دفاتر کے ٹائم صبح سات بجے سے دوپہر دو بجے تک ہیں اس لیے ڈھائی بجے تک یہاں سناٹا ہو جاتا ہے۔“

مقصودی صاحب کو اس جواب سے حیرت ہوئی تھی۔ ”بھلا کراچی جیسے شہر میں صبح سات بجے کسی دفتر میں کام کا آغاز ہوا کرتا ہے؟ یہ اظفر عالم واقعی کوئی کھسکی ہوئی شے

ہے۔“ مقصودی صاحب نے خود سے کہا اور گارڈ کے ساتھ لفٹ میں سوار ہو گئے جو انہیں لے کر اوپر کی طرف روانہ ہو گئی۔ لفٹ پینل پر پانچ بٹن تھے سب سے نچلے پر انگریزی حرف ’بی‘ اور سب سے اوپر والے بٹن پر ’آر‘ کندہ تھا جبکہ بقیہ تین پر ایک، دو اور تین کے ہندسے لکھے نظر آرہے تھے۔

گارڈ نے تین نمبر کا بٹن دبایا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ تیسری منزل کی طرف جا رہے تھے۔ ’بی‘ سے مراد بیسمنٹ اور ’آر‘ کا مطلب روف رہا ہوگا۔

ایک گنگنائی ہوئی ”ٹرنگ“ کے ساتھ دروازہ کھلا تو انہیں معلوم ہوا کہ وہ تیسری منزل پر پہنچ چکے تھے۔

گارڈ مقصودی صاحب کو لے کر دائیں طرف مڑا اور راہداری کے آخری سے پہلے ایک بند دروازے پر ٹھہر گیا۔ مقصودی صاحب نے دیکھا کہ اس پر سیکریٹری نو چیف ایگزیکٹو کی تختی آویزاں تھی۔ تاہم اس پر کوئی نام لکھا ہوا نہیں تھا۔

گارڈ نے انگلی سے دروازے پر ہلکی سی دستک دی اور پھر مقصودی صاحب کے لیے دروازہ کھول کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

مقصودی صاحب نے دروازے کے اندر قدم رکھا تو اس نے اندر موجود کسی شخص کو مخاطب کر کے قدرے بلند آواز مگر انتہائی مؤدب انداز میں کہا۔ ”آپ نے جنہیں بلایا تھا، وہ مہمان آگئے ہیں۔“

یہ کہتے ہی گارڈ نے مقصودی صاحب کے عقب میں دروازہ بند کر دیا۔ اب مقصودی صاحب تھے اور اندر کا کمرہ تھا۔ وہ کوئی کانفرنس روم معلوم ہوتا تھا۔ کمرے کے تقریباً وسط میں مہاگنی سے بنی قیمتی اور غیر معمولی طویل و عریض میز رکھی ہوئی تھی۔ وہ کوئی عام میز نہیں تھی کہ جس کے سامنے کرسیوں پر بیٹھنے والے مہمانوں کے گھٹنے میز سے ٹکراتے رہتے۔

کمرانجی خاصا کشادہ تھا اور بیک وقت اندھیرے اور روشنی میں ڈوبا ہوا نظر آرہا تھا۔ جہاں مقصودی صاحب کھڑے تھے، وہ حصہ روشنی میں تھا جبکہ میز کا نصف اور اس کے بعد والا حصہ نیم تاریکی میں تھا۔ انہیں میز کے پیچھے بلند پشتے والی کرسی پر ایک ہیولا بیٹھا نظر آرہا تھا جو یقیناً اظفر عالم کا سیکریٹری رہا ہوگا۔

”مقصود احمد مقصودی؟“ کمرے میں ایک بلغمی کھرکراتی ہوئی آواز گونجی تو مقصودی صاحب کو اندازہ ہوا

وہ اس ہستی کے روبرو موجود تھے جس کے بارے میں کوئی صحیح طور پر کچھ نہیں جانتا تھا۔ انہوں نے اپنی عینک اتاری، انداز ایسا تھا کہ جیسے وہ یہ کام بے خیالی میں کر رہے ہوں، اس کے بعد انہوں نے میز پر رکھے ٹشو پیپر کے ڈبے میں سے ایک ٹشو نکالا اور عینک کے شیٹے صاف کرنے لگے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ ان کے اس بظاہر لاشعوری عمل کو میز کی دوسری طرف بیٹھے ہوئے اظفر عالم نے گہری نظروں سے دیکھا تھا۔

عینک کے شیٹوں کو صاف کر کے مقصودی صاحب نے اسے دوبارہ اپنی آنکھوں پر لگا لیا۔ انہیں اپنے سوال کا جواب نہیں ملا تھا اس لیے انہوں نے جواب طلب نظروں سے اندھیرے میں دیکھا۔

”ہاں۔“ اظفر عالم نے ان کے سوال کو بھانپتے ہوئے جواب دیا۔ ”یہ وقت اگرچہ ان رسمی باتوں کا نہیں ہے مگر یہ حقیقت ہے کہ میں آپ کا پرانا فین ہوں اور آپ کے بارے میں خاصی معلومات جمع کرنا رہتا ہوں۔“

”آپ نے مجھے کیوں بلایا تھا؟“ مقصودی صاحب نے اس رسمی گفتگو سے الجھن محسوس کرتے ہوئے براہ راست سوال کیا۔ مقصودی صاحب ان لوگوں میں سے نہیں جنہیں ان کے منہ پر کی گئی تعریف خوشی فراہم کرتی ہو۔

مقصودی صاحب نے دیکھا کہ ان کے براہ راست سوال پر اظفر عالم نے پہلو بدلا تھا اور اس دوران ایک لمحہ یا اس سے بھی کچھ کم عرصے کے لیے اس کا چہرہ ہلکی سی روشنی کی زد میں آیا تھا۔ انہوں نے اس قلیل وقت میں یہ دیکھ لیا کہ جسم کے مقابلے میں وہ چہرہ بھر پور اور توانا تھا اور سب سے نمایاں چیز اس کی ناک تھی۔ طوطے کی چونچ کی طرح خم کھائی ہوئی ناک۔ انہیں بخوبی اندازہ ہو گیا کہ اظفر عالم لیڈی کلر ٹائپ مرد ہوگا۔

”میں اپنے پسندیدہ رائٹر سے ملنا چاہتا تھا۔“ اظفر عالم نے جواب دیا۔ ”لیکن اس سے بھی بڑی ایک اور وجہ ہے۔“ وہ شاید سسپنس پھیلا نا چاہتا تھا اس لیے خاموش ہو گیا۔

مقصودی صاحب بھی خاموش بیٹھے رہے۔ انہیں اس کا ٹائپ سمجھ میں آ گیا تھا۔ اس لیے وہ منتظر تھے کہ وہ خود ہی اپنا مدعا بیان کرے تو بہتر رہے گا۔

چند لمحوں کی طرح گزرے پھر شاید اظفر عالم نے مقصودی صاحب کی خاموشی سے اکتا کر خود ہی بولنا شروع

کہ ان سے ان کے نام کی تصدیق کی جا رہی تھی۔

”جی...!“ مقصودی صاحب نے جواب دیا۔ ”اور آپ یقیناً آصف صاحب ہیں... اظفر عالم صاحب کے سیکریٹری!“

جواب میں ایک بلغمی قہقہہ کمرے کی فضا میں بلند ہوا۔ مقصودی صاحب کو وہ قہقہہ آئینی سالگا۔ اس سے پہلے وہ اپنی کہانیوں میں ہیر و ہیر و سنز کو ایسے قہقہے بارہا سنوا چکے تھے مگر اب خود اس قہقہے کو سن کر انہیں محسوس ہوا کہ آئینی قہقہوں کو سننا ہی بڑے دل گردے کا کام ہے۔

”میں آصف نہیں اظفر عالم ہوں۔“ قہقہہ جس طرح بلند ہوا تھا اسی طرح اچانک ختم گیا اور کھر کھراتی ہوئی آواز میں میز کے پیچھے کرسی پر بیٹھے ہوئے نے اپنا تعارف کرایا تو مقصودی صاحب کو حیرت کا جھٹکا لگا۔

”مگر باہر تو سیکریٹری کی تختی لگی ہوئی ہے۔“ انہوں نے اپنی جگہ کھڑے کھڑے کہا کیونکہ ابھی تک اظفر عالم یا جو بھی کمرے میں تھا، اس نے انہیں بیٹھنے کی پیشکش نہیں کی تھی۔ انہیں اپنے کھڑے رہنے پر کچھ بے عزتی کا احساس بھی ہو رہا تھا۔

”آئیے بیٹھیے۔“ شاید دوسری شخصیت نے ان کے خیالات پڑھ لیے تھے۔ ”باہر تختی کسی کے بھی نام کی ہو مگر یہ سارا دفتر بلکہ یہ ساری عمارت اور اس کے پیچھے بنا ہوا کارخانہ... یہ سب میرا ہے۔ میں جہاں چاہوں وہاں بیٹھ سکتا ہوں۔“ مقصودی صاحب کے نشست سنبھالنے پر اظفر عالم نے ان کی الجھن کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ اب اس کی آواز کا کھر کھرا پن کم ہو گیا تھا لیکن لہجہ اب بھی کچھ غیر فطری سا محسوس ہو رہا تھا۔ مقصودی صاحب کو لگا تھا کہ وہ شاید اپنی اصل آواز کو چھپانے کی خاطر کسی مصنوعی طریقے کو استعمال کر کے بول رہا تھا۔

”آپ نے مجھے بلایا تھا؟“ مقصودی صاحب نے بیولے پر نظر جما کے دریافت کیا۔ اب غور سے دیکھنے پر انہیں کچھ کچھ نظر آنے لگا تھا۔ اظفر عالم اوور کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ انہیں صاف طور پر دکھائی دیا کہ وہ درمیانی جسامت کا شخص تھا جس کی آنکھوں پر غیر معمولی موٹے شیٹوں والی عینک لگی ہوئی تھی۔ ایسے چشموں کے پیچھے سے انسان کی آنکھ کتنی گنا بڑی نظر آتی ہے۔ نیم تاریکی کے باعث انہیں آنکھیں نظر نہیں آ سکی تھیں۔ مقصودی صاحب کو کمرے کا ماحول اور کمرے میں اظفر عالم کی موجودگی ایک بے عنوان سی بے چینی میں مبتلا کر رہی تھی مگر اس کے ساتھ ان کا تجسس

کر دیا۔

”آپ ایک معروف قلم کار ہیں۔ بے شمار چھوٹی بڑی کہانیاں، کئی ڈرامے، کالم، فیچر وغیرہ اب تک آپ لکھ چکے ہیں اور جہاں تک میں نے سمجھا ہے کہ آپ انسانی نفسیات کو بھی کچھ نہ کچھ حد تک ضرور سمجھتے ہوں گے۔ اس لیے آپ کی تحریروں میں وہ سچی اور حقیقی گہرائی ہوتی ہے جو دیگر رائٹرز میں نظر نہیں آتی... اور میرا آپ کو بلانے کا مقصد بھی آپ کے اسی علم اور تجربے سے فائدہ اٹھانے کا ہے۔“

مقصودی صاحب کی حیرت میں مزید اضافہ ہو گیا۔ واقعی یہ شخص دوسروں کو حیران کر دینے کی صلاحیت سے مالا مال تھا۔ انہوں نے سوچا مگر خاموش بیٹھے اس کی بات کو سنتے رہے۔

”آپ میرا مطلب سمجھ رہے ہیں نا؟“

اظفر عالم نے دریافت کیا تو مقصودی صاحب نے اپنی کرسی پر پہلو بدلا اور نفی میں گردن ہلا کر بولے۔ ”معاف کیجئے گا... حقیقت یہ ہے کہ میں آپ کی بات کا مقصد بالکل بھی نہیں سمجھ سکا۔“

”اوہ۔“ دوسری طرف سے ایسی آواز آئی جیسے اس جواب نے اسے مایوس کیا ہو۔ ”شاید میں اپنا مسئلہ صحیح طور پر بیان نہیں کر سکا۔“

”ابھی تک آپ نے اپنا کوئی مسئلہ بیان ہی نہیں کیا ہے۔“ مقصودی صاحب نے کہا۔

”میں سمجھ رہا ہوں...“ اظفر عالم نے کہا پھر یکا یک بولا۔ ”ویسے آپ میرے سیکریٹری کا لکھا ہوا خط تو اپنے ساتھ لائے ہیں نا؟“ شاید اسے شک ہوا ہو گا کہ مقصودی صاحب کی جگہ کوئی دوسرا فرد اس کے پاس نہ آ گیا ہو۔

”جی، بالکل لایا ہوں۔“ مقصودی صاحب نے جواب دیا۔ ”اس کے بغیر تو شاید آپ کا گارڈ مجھے اندر داخل ہی نہ ہونے دیتا۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی مقصودی صاحب کے لہجے میں ہلکی سی تلخی آگئی تھی۔

”مجھے وہ خط واپس دے دیں۔“ اس نے اپنا ہاتھ میز کے اوپر پھیلا دیا۔ مقصودی صاحب نے دیکھا کہ اس نے دستانے پکڑ رکھے تھے۔

خطی، سگی، پاگل اور جھکی کے معانی و مطالب والے بے شمار الفاظ مقصودی صاحب کے ذہن میں گونج گئے۔ بے ساختہ ان کا ہاتھ اپنی جیب میں گیا اور ایک کاغذ نکال کر انہوں نے اظفر عالم کی طرف بڑھا دیا۔

اظفر عالم نے ان سے وہ کاغذ لیا اور اسے آنکھوں

کے قریب لے جا کر سرسری طور پر دیکھا پھر تہ کر کے میز پر رکھ دیا۔

”میرا خیال ہے کہ اب میں اپنا مسئلہ بیان کر ہی دوں۔“ اظفر عالم نے اس طرح کہا جیسے خود کو ہدایات دے رہا ہو کیونکہ اس بار بھی اس کا مخاطب مقصودی صاحب نہیں تھے اس لیے وہ خاموش بیٹھے رہے۔

”جی... تو مسٹر مقصودی! بات دراصل یہ ہے کہ میں آج کل ایک الجھن میں مبتلا ہوں اور میری سمجھ میں اس کا کوئی حل نہیں آرہا ہے۔ میں نے آپ کی کہانیاں پڑھی ہیں اور آپ کی تخیل پر دازلی اور تجزیاتی صلاحیتوں کا معترف ہوں اور مجھے یقین ہے کہ آپ میری الجھن کا کوئی نہ کوئی حل ضرور نکال سکیں گے۔“ یہاں تک کہہ کر اظفر عالم خاموش ہو گیا۔ شاید وہ اپنے بکھرے ہوئے خیالات کو مجتمع کرنا چاہ رہا تھا یا پھر اظہارِ مدعا کے لیے مناسب اور موزوں الفاظ کا انتخاب کر رہا تھا۔

”آپ نے اپنی زندگی میں اپنے کرداروں کو بڑی سنگین قسم کی الجھنوں میں مبتلا کر دیا اور پھر انہیں نہایت ذہانت سے ایسی پیچیدگیز سے آزاد بھی کرایا۔ میں سمجھتا ہوں کہ بالکل اسی طرح آپ مجھے بھی اپنی کسی کہانی کا کردار سمجھیں اور میرے مسئلے کا کوئی حل بتائیں... آپ خوابوں پر یقین رکھتے ہیں...؟“

اپنے مسئلے یا اپنی الجھن کے بارے میں بات کرتے کرتے اظفر عالم نے اچانک ایک مرتبہ پھر پٹری بدل لی۔ مقصودی صاحب کے لیے اس کا سوال غیر متوقع تھا مگر وہ چونکہ پوری طرح اس کی طرف متوجہ تھے اس لیے اس کا سوال انہیں سمجھ میں آ گیا۔

”خواب انسانی زندگی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔“ مقصودی صاحب نے بلا توقف جواب دیا۔ ”تاہم ان کا اثر یا ان کی اہمیت، خواب دیکھنے والے کے حالات کے مطابق ہوتی ہے۔“

”اس کا مطلب ہے کہ آپ خوابوں کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں۔“ اظفر عالم نے پُرسوج لہجے میں کہا۔ ”اور میری الجھن بھی ایک خواب کی پیدا کردہ ہے۔ ایک مسلسل خواب ہے جو مجھے باقاعدگی سے نظر آرہا ہے اور میں اس کی کوئی توجیہ نہ نکالنے میں کامیاب نہیں ہو پا رہا ہوں...“

”میں گزشتہ پندرہ بیس دنوں بلکہ راتوں سے ایک مخصوص خواب دیکھ رہا ہوں... میں خود کو اپنے دفتر میں کام میں مصروف پاتا ہوں۔ اچانک میری نگاہ دیوار گیر گھڑی پر

پڑتی ہے جہاں ٹھیک تین بج کر بیالیس منٹ ہوئے ہوتے ہیں۔ گھڑی کو دیکھتے ہی میرے ذہن کو ایک انجانا سا جھٹکا لگتا ہے اور میں بے اختیار ہو کر اپنی دراز سے ایک ریوالور نکال لیتا ہوں۔ میری نگاہ گھڑی کی چھوٹی سوئی پر ہوتی ہے جو مخصوص رفتار سے اپنا سفر جاری رکھے ہوتی ہے۔ میں اٹھتا ہوں اور گھڑی کی منٹ جا کھڑا ہوتا ہوں پھر میرا دھنسا ہوا ریوالور کو تھامے ہوئے میری کپٹی پر آتا ہے۔ میں اس کی نال اپنی کپٹی پر نکالتا ہوں۔ اسی وقت سیکنڈ کی سوئی بارہ کے ہندسے کو چھوٹی ہے اور میں ریوالور کا ٹریگر دبا دیتا ہوں۔ ایک زوردار دھماکا ہوتا ہے اور میری آنکھ کھل جاتی ہے۔ اس وقت میرا پورا جسم پسینے میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے اور سانس کی رفتار بڑھی ہوئی ہوتی ہے۔ ابتدائی دنوں میں یہ خواب ایک رات میں صرف ایک مرتبہ دکھائی دیتا تھا مگر پھر اس کی تعداد بڑھتی چلی گئی اور اب گزشتہ کئی راتوں سے میں ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سو پا رہا ہوں کیونکہ آنکھیں بند کرتے ہی مجھے اپنے دفتر کا منظر دکھائی دینے لگتا ہے۔

وہ اچانک اس طرح خاموش ہو گیا جیسے اسے وہ خواب کھلی آنکھوں سے نظر آنے لگا ہو۔

”...آپ میری کیفیت سمجھ سکتے ہیں نا؟ بے خوابی اور اس خواب کے خوف نے میرے ذہن پر بُرے اثرات مرتب کیے ہیں اور میں ایک عجیب سے عذاب میں مبتلا ہو گیا ہوں۔ اب مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔“

”کیسی مدد؟“ مقصودی صاحب نے حیرت سے پوچھا۔ اس کا مسئلہ سن کر انہیں ایسا لگا تھا جیسے اظفر عالم کے بجائے وہ بھی کوئی خواب دیکھ رہے ہوں اور اظفر عالم کے ہاتھ میں دبے ریوالور کا نشانہ اس کی اپنی کھوپڑی نہیں بلکہ مقصودی صاحب کی پیشانی رہی ہو۔

”آپ مجھے یہ بتائیں کہ آخر مجھے یہ خواب کیوں نظر آرہا ہے؟“ اظفر عالم نے اس طرح پوچھا گویا اسے خواب دیکھانے والے مقصودی صاحب رہے ہوں۔ ”آپ اپنے تخیل کے زور سے ایسی کوئی وجہ ضرور ڈھونڈ سکتے ہیں جو میرے ان خوابوں کا سبب بنی ہوئی ہے۔“

”دیکھیے اظفر عالم صاحب!“ مقصودی صاحب نے بغیر الجھے، سیدھے سادے انداز میں جواب دیا۔ ”یہ خواب آپ کو کیوں نظر آرہا ہے، اس بارے میں میرا تو کیا کسی کا بھی تخیل کچھ نہیں کر سکتا۔ ہاں، اس حوالے سے نفسیات دانوں نے جو تحقیق کی ہے، اس کی روشنی میں...“

”ان جھوٹے اور مکار نفسیات دانوں کا نام میرے

سامنے نہ لیجیے۔“ یکا یک اظفر عالم کا لہجہ پھر سے آہستہ ہو گیا۔ ”یہ سب بیکار اور فضول باتوں کے ذریعے لوگوں کو محض بے وقوف بناتے رہے ہیں۔ میں تو نفسیات اور نفسیات دانوں پر کوئی یقین نہیں رکھتا، آپ اس کے علاوہ کوئی دوسری بات کریں۔“

”خوابوں کے اسرار و رموز پر بے شمار کتابیں مارکیٹ میں موجود ہیں جن میں دنیا بھر کے تحقیقی مواد کو جمع کیا گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ان کا مطالعہ آپ کے لیے مفید رہے گا۔“ مقصودی صاحب نے اس جھکی سے خواخواہ کی بحث کرنے سے گریز کیا ورنہ وہ نفسیات اور نفسیات دانوں کے دفاع میں بہت اچھا بول سکتے تھے۔ ”اور میں تو آپ کو مشورہ دوں گا کہ آپ نیولین بونا پارٹ کی مشہور کتاب ”خوابوں کی راہ گزر“ ضرور پڑھیے۔ اس سے آپ کو اپنا مسئلہ سمجھنے میں کافی مدد ملے گی۔“

”آپ نے تو یہ کتابیں پڑھ رکھی ہوں گی؟“ اظفر عالم نے نیا نکتہ نکالا۔ ”ان کی روشنی میں آپ بھی تو مجھے میرے مسئلے سے متعلق کوئی مشورہ دے سکتے ہیں... اور ہاں، آپ قطعی طور پر اطمینان رکھیے... مجھے آپ کے قیمتی وقت کا اندازہ ہے۔ میں جانتا ہوں کہ کسی تخلیق کار کے نزدیک وقت کی کیا اہمیت ہوتی ہے۔ آپ کا وقت آپ کا سرمایہ ہے اور جو بھی وقت آپ میری خاطر صرف کریں گے میں آپ کو اس کا اچھا ریٹرن دوں گا۔“ اظفر عالم جب بولنے پر آماتا تھا تو بولتا ہی چلا جاتا تھا۔ ”اب بتائیے آپ میرے لیے کیا کر سکتے ہیں؟“

”میری اس بارے میں دیانت دارانہ رائے یہ ہے کہ میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکوں گا۔ میں انسانی نفسیات کی پیچیدگیوں کو اپنی کہانیوں کا موضوع ضرور بناتا ہوں مگر اپنی تمام زندگی میں بھی میں نے اس طرح نہیں سوچا۔“ مقصودی صاحب نے واضح انداز میں اس سے معذرت کرتے ہوئے کہا۔ ”اس لیے آپ اپنی الجھن کے سلسلے میں کسی اور سے رابطہ کر لیں تو بہتر ہوگا اور ویسے بھی اکثر اوقات خوابوں کے کوئی معنی نہیں ہوتے...“

”مجھے آپ کی رائے سے اتفاق ہے مگر میرا خواب کوئی بے معنی خواب نہیں ہے۔ یہ ایک تسلسل کے ساتھ باقاعدہ نظر آنے والا خواب ہے۔ اس کے کوئی تو معنی ہوں گے۔“ اظفر عالم اپنی بات پر اڑا ہوا تھا۔

”دیکھیے اظفر عالم صاحب! قدیم زمانوں سے خواب انسانوں کے لیے تجسس کا باعث رہے ہیں۔ اس پر ہیملون

بینکار

قمر لمبے کو بینک میں نوکری ملی تو خوشی سے پھولے نہ سمائے۔ عمدہ کپڑا خرید کر شہر کے ایک مشہور ٹیلر کو بہترین سوٹ سینے کا آرڈر دیا۔ چند روز بعد ٹیلر نے کچے سوٹ کی ٹرائل کے لیے بلایا، قمر لمبے تراش تراش سے بہت متاثر ہوئے لیکن ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی تو جیبیں ندادار۔ انہوں نے خفگی کا اظہار کیا تو ٹیلر نے رسانیت سے

کہا۔

”سر! آپ ہی نے تو کہا تھا کہ آپ بینک افسر ہیں۔“
”ہاں... کہا تھا۔“ انہوں نے غصے سے اپنا سر بلایا۔ ”اس سے مطلب کیا ہے تمہارا؟“

”سر! آپ کو جیبوں کی کیا ضرورت ہے... بینکاروں کے ہاتھ تو ہمیشہ دوسروں کی جیب میں رہتے ہیں۔“

(کراچی سے بلال علیم کی سوغات)

ہوئے واقعے کا تسلسل ہو؟“ اظفر عالم کی سوچ میں ڈوبی ہوئی آواز ابھری۔ ”میں نے کسی سے کہے نے بغیر ان موضوعات پر کئی کتابوں کا مطالعہ کرنے کی کوشش کی تھی مگر ان کی مشکل زبان اور اصطلاحات کی بھرمار نے مضمون کو اتنا گنجلک اور بھاری بنا دیا تھا کہ میں کچھ بھی سمجھ نہیں پایا۔ اسی لیے میرا یقین ان نفسیات دانوں پر سے اٹھ گیا ہے...“

”ماہر نفسیات انہی مشکلات کو پیش نظر رکھتے ہوئے آسان الفاظ میں آپ کو مدد فراہم کریں گے۔“ مقصودی صاحب نے اس کی بات کاٹ کر اضافہ کیا۔ ”آپ کے ماضی کے حوالے کے تسلسل والی بات ناممکن نہیں ہو سکتی، سگمنڈ فرائیڈ نے اس ذیل میں بہت کچھ لکھا ہے۔ عین ممکن ہے کہ بچپن یا لڑکپن میں تین بچ کر بیالیس منٹ پر کوئی خاص واقعہ آپ کے ساتھ پیش آیا ہو جس نے آپ کے ذہن میں کوئی ایسی گرہ ڈال دی ہو جو کھل ہی نہ پار ہی ہو اور اب وہی گرہ اس بے ہودہ خواب کا سبب بن رہی ہو۔“ مقصودی صاحب نے اس کی معقول بات کے جواب میں معقول استدلال پیش کیا۔ ”ایک بات اور بھی ہے۔ کچھ ماہرین کے نزدیک خواب انسان کی ایسی قوت کے تابع

دور سے لے کر آج تک مسلسل کام ہوتا رہا ہے۔ مجھے اس حوالے سے ایک قدیم مثل یاد آرہی ہے کہ وہ خواب جس کی تشریح نہ کی گئی ہو، ایک ایسا سمجھ ہے جسے ابھی دریافت نہ کیا گیا ہو۔ آپ میں کوئی خواب خواں تو نہیں ہوں جو آپ کے خواب کی تعبیر و تشریح کر سکوں۔ مگر یہ بات ضرور کہوں گا کہ آپ اپنے خواب سے جتنا زیادہ پریشان ہوں گے، یہ آپ کو اتنا ہی زیادہ عذاب میں مبتلا رکھے گا۔ اس لیے آپ اس خواب کو ذہن سے جھٹک دیجیے اور خود کو زندگی کی مصروفیات میں الجھا دیجیے... آپ شادی شدہ ہیں؟“ مقصودی صاحب نے خوابوں کے متعلق گفتگو کرتے کرتے اچانک ہی سوال کیا۔

اظفر عالم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ یہ سوال اس کے لیے شاید غیر متوقع تھا۔

مقصودی صاحب نے چند لمحے انتظار کیا پھر خود ہی بولنا شروع کر دیا۔ ”اگر آپ شادی شدہ ہیں تو اپنا وقت بیوی بچوں کے ساتھ گزارے اور اگر نہیں ہیں تو فوری طور پر شادی کر لیجیے۔ ازدواجی سرزمین آپ کو بُرے خوابوں سے نجات دلا دیں گی۔“

”تو آپ میری کوئی مدد نہیں کر سکتے؟“ مقصودی صاحب نے اپنی بات ختم کی تو اظفر عالم کی مایوسانہ آواز ابھری۔

”میں آپ کو اچھے اور قابل نفسیات دانوں کے نام تجویز کر سکتا ہوں۔“ مقصودی صاحب نے کہا مگر اظفر عالم درمیان میں بول اٹھا۔

”ان مشوروں کے لیے تو میں شہر کیا دنیا کے کسی بھی نامور نفسیات دان کو بلا سکتا ہوں جو شعور، تحت الشعور، لاشعور اور تحلیل نفسی جیسی ثقیل اصطلاحوں سے مزین گفتگو کر کے مجھ سے لاکھوں روپے کمالے گا مگر مجھے یقین ہے کہ میرا مسئلہ حل نہیں ہوگا۔“

چند لمحے پھر خاموشی کے گزرے۔ اس کے بعد مقصودی صاحب نے اٹھنے کا ارادہ کر لیا۔ ”میرا خیال ہے کہ آپ مجھے اجازت دیں۔“ مقصودی صاحب نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

”نہیں، ابھی نہیں۔“ اظفر عالم کی آواز ابھری۔ ”میں کچھ سوچ رہا ہوں اور چاہتا ہوں کہ آپ کو اس میں شریک کر لوں۔“

مقصودی صاحب دوبارہ کرسی پر بیٹھ گئے۔ ”کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ میرا یہ خواب کسی گزرے

ہوتے ہیں جو نیند میں بھی بیدار رہتی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ آپ کے اندر خود کشی کی خواہش موجود ہے جو خواب میں حقیقت کا روپ دھار لیتی ہے۔“

”مگر میرے اندر ایسی کوئی خواہش کیونکر پیدا ہو سکتی ہے؟ میں ایک کامیاب شخص ہوں۔ میری زندگی میں کوئی محرومی نہیں ہے، میں جو چاہتا ہوں حاصل کر لیتا ہوں اس لیے یہ تھیوری تو فیل ہو گئی۔“

جس وقت اظفر عالم نے یہ کہا تو مقصودی صاحب کو نفسیات کی تازہ تحقیق کا وہ باب یاد آ گیا جس میں ماہر نے بتایا تھا کہ ترقی یافتہ ممالک میں خود کشی کے بڑھتے ہوئے رجحان کی وجہ بہت جلد تمام دنیاوی خواہشات کا پورا ہونا بھی ہے۔ کوئی انسان جب تمام مادی خوشیاں حاصل کر لیتا ہے، تب اس کے سامنے زندگی کا کوئی مقصد نہیں رہتا اور وہ زندگی سے فرار چاہتا ہے۔ وہ اس سے یہ نہیں کہہ سکے کہ اگر وہ تھیوری فیل ہو گئی تو کیا یہ نئی تھیوری قابل عمل ہے؟

”میں نے آپ سے کہہ دیا ہے کہ میں کوئی خواب خواں تو نہیں ہوں جو آپ کے اس خواب کی ماہرانہ انداز میں تعبیر و تشریح کر سکوں اس لیے اس تھیوری کے فیل ہو جانے پر مجھے کوئی دکھ نہیں ہے۔ یہ تو میرا خیال تھا جو گزرے ہوئے کسی واقعے کے تسلسل والی آپ کی بات سے میرے ذہن میں آ گیا تھا۔ ویسے ایک بات بتائیں کہ کیا واقعی آپ کے دفتر کی میز کی دراز میں کوئی آتشیں ہتھیار موجود ہے؟“

”بالکل ہے۔“ اظفر عالم نے جواب دیا۔
”تو آپ ایسا کریں، اسے فوری طور پر وہاں سے ہٹوا دیں یا ہٹا دیں۔“ مقصودی صاحب نے کہا۔

”یہ تو ہو ہی جائے گا مگر اس خواب کی وجہ کا مسئلہ اپنی جگہ موجود رہے گا۔“ اظفر عالم نے کہا۔ ”ویسے یہ بتائیں... کیا یہ ممکن ہے کہ اس طرح خواب دکھا کر مجھے خوف زدہ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہو... یا شاید قتل کرنے کی کوشش۔“

مقصودی صاحب چونک کر سیدھے ہو گئے۔
”یہ خیال آپ کو کس طرح آیا؟“ انہوں نے نیم تاریکی میں گھورتے ہوئے پوچھا۔

”کہانیوں وغیرہ میں تو اسی طرح ہوتا ہے اور خصوصاً جرائم پر مبنی کہانیوں میں تو کسی کو قتل کرنے کے لیے ایسے طریقے بیان کر دیے جاتے ہیں کہ بس...!“

”کہانی تو صرف کہانی ہوتی ہے اور اس میں مصنف

کا خیال اس کی راہنمائی کر رہا ہوتا ہے۔ ویسے آج تک میں نے ایسی کوئی کہانی نہیں لکھی جس میں کسی کو قتل کرنے کے لیے اسے بُرے خواب دکھائے گئے ہوں۔“

”تو اب لکھ لیجیے گا۔“ اظفر عالم نے گویا انہیں ایک نئی کہانی کا خیال دیتے ہوئے کہا۔ ”یہ ایک ایسے شخص کی کہانی ہے جسے اس کے دشمن ہلاک کرنا چاہتے ہیں مگر کسی کو جان سے مار دینے کے بعد ملنے والی سزا سے بھی خائف ہیں۔ اس لیے وہ کوئی ایسا طریقہ اختیار کرتے ہیں جس سے ان کے شکار کو مسلسل ایک ہی خواب نظر آتا رہے۔ ایسا شاید ہسپناٹزم کے ذریعے کیا جاسکتا ہے۔ ایک ہی جیسا بھیا تک خواب دیکھتے دیکھتے اس شخص کے اعصاب جواب دے جاتے ہیں اور تنگ آ کر وہ خود کشی کر لیتا ہے... کیسی ہے کہانی؟“

”کہانی تو شاید بنائی جاسکے مگر آپ کو یہ خیال کیوں آیا کہ آپ کے دشمن آپ کو راستے سے ہٹانے کے لیے اس قدر پیچیدہ راہ اختیار کریں گے؟“ مقصودی صاحب نے اس کی بات میں دیا گیا اشارہ سمجھ لیا تھا۔ ”وہ تو کسی کو بھی لاکھ دو لاکھ دیں گے اور کہیں سے کوئی نامعلوم گولی آ کر آپ کا خاتمہ کر دے گی۔ یہ بتائیں کہ کیا آپ ان دنوں ہسپناٹزم کے کسی ماہر سے رابطے میں ہیں؟“

”بالکل نہیں... بالکل بھی نہیں۔ میں صرف منتخب لوگوں سے ملتا ہوں اور بس۔“ اظفر عالم نے فوراً جواب دیا۔ ”ویسے کہانی کیسی ہے؟ ضروری نہیں ہے کہ کوئی ہسپناٹزم جاننے والا ہی مجھے وہ بھیا تک خواب دیکھنے پر مجبور کر رہا ہو۔ کچھ اور طریقہ بھی آپ اپنی کہانی میں اختیار کر سکتے ہیں۔“

”جب آپ کسی سے ملتے ہی نہیں تو آخر وہ کیا طریقہ ہو سکتا ہے جس کے استعمال سے آپ کے دماغ کو کنٹرول کیا جاسکے؟“ مقصودی صاحب نے پوچھا۔

”ٹیلی پیٹھی۔“ اچانک اظفر عالم نے پُر جوش لہجے میں کہا۔ ”اس کے ذریعے تو دور بیٹھے بھی کسی کے دماغ کو کنٹرول کیا جاسکتا ہے... کیا خیال ہے؟“

مقصودی صاحب کی طبیعت سخت مکدر ہو چلی تھی۔
”اس بارے میں میرا علم محدود ہے۔“ مقصودی صاحب نے رکھائی سے جواب دیا۔ مزید بحث سے بچنے کے لیے... انہوں نے بہانہ کیا تھا۔

”میں نے تو سنا ہے کہ محض کسی کی تصویر یا آواز کے ذریعے بھی کسی کے ذہن تک رسائی حاصل کی جاسکتی

ہے... یقیناً میرے ساتھ ایسا ہی ہو رہا ہے۔ میرے دشمنوں نے کسی ٹیلی فون کی مہر سے رابطہ کر لیا ہوگا اور وہ اب میرے دماغ میں آکر مجھے خودکشی پر مجبور کر رہا ہے۔
 ”چلیں، اس طرح آپ کا مسئلہ حل ہو گیا۔“
 مقصودی صاحب نے نیم طنزیہ انداز میں کہا۔ ”آپ کو نظر آنے والے بُرے خواب کی وجہ تو آپ کو معلوم ہو گئی۔“
 ”ہاں لیکن اب مسئلہ یہ ہے کہ میرا وہ دشمن کون ہے جو مجھے مارنے پر تلا ہوا ہے؟“ اظفر عالم نے پُر خیال لہجے میں کہا۔

”میں اسے آپ کا وہم قرار دوں گا۔“ مقصودی صاحب نے کہا۔ ”اور اگر واقعی ایسا ہے تو آپ میرے مشورے کے مطابق ریوالور اپنی دراز سے نکال دیں اور جہاں تک ممکن ہو سکے کسی نہ کسی کو اپنے ساتھ ضرور رکھیں۔“
 انہوں نے یہ نہیں کہا کہ اگر کسی ٹیلی فون کی جاننے والے کو ان سے خودکشی کرانی ہی ہوتی تو وہ اب تک کراچکا ہوتا۔ خوابوں کے لمبے چکر میں پڑ کر اپنا اور اظفر عالم کے دشمنوں کا وقت برباد نہ کرتا۔

”آپ اسے وہم قرار دے رہے ہیں، یہ آپ کی مرضی ہے مگر میں بہر حال سنجیدگی سے اپنے دشمنوں کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہو گیا ہوں۔“ اظفر عالم نے کہا۔
 ”اجیہا، ایسا کریں کہ مجھے اپنے کمرے کو ایک نظر دیکھنے کا موقع فراہم کریں۔ ممکن ہے مجھے کوئی مفید بات معلوم ہو جائے۔“

”اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں ویسے بھی اس کمرے میں کم ہی جاتا ہوں۔“ اظفر عالم نے کہا۔

”تو پھر مجھے اجازت دیجیے۔ میرا خیال ہے کہ آپ کا بنیادی مسئلہ تو حل ہو گیا ہے اور اسی کے لیے آپ نے مجھے بلایا تھا۔“ مقصودی صاحب نے کہا اور ایک مرتبہ پھر کرسی چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

انہیں توقع تھی کہ اظفر عالم ان سے الوداعی مصافحہ نہیں کرے گا۔ اس لیے انہوں نے بے پروائی کے اظہار کے لیے اپنے ہاتھ پینٹ کی جیبوں میں ڈال لیے اور واپسی کے لیے مڑے مگر دوسرے ہی لمحے ٹھٹک گئے۔ ان کے داہنے ہاتھ کی انگلیاں ایک کاغذ سے لکرائی تھیں۔ انہوں نے وہ کاغذ باہر نکال لیا۔

”اظفر عالم صاحب! میں نے آپ کو غلط کاغذ دے دیا تھا۔ آپ کے سیکریٹری کا خط میرے پاس ہی ہے۔“ یہ کہتے ہوئے انہوں نے جیب سے برآمد ہونے والا کاغذ

اظفر عالم کی طرف بڑھا دیا جسے اس نے لیا اور میز پر رکھا پہلے والا کاغذ اٹھا کر مقصودی صاحب کو واپس کر دیا۔
 ”مقصودی صاحب! آپ میرے سیکریٹری کی دعوت پر یہاں آئے اس کے لیے میں آپ کا شکر گزار ہوں اور آپ سے توقع رکھتا ہوں کہ آپ اس ملاقات کا تذکرہ کسی سے نہیں کریں گے۔“ اظفر عالم نے کاغذوں کے تبادلے کے بعد اپنی مخصوص کھر کھراتی ہوئی آواز میں کہا تو مقصودی صاحب نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

اس کے بعد دونوں نے کوئی بات نہیں کی اور مقصودی صاحب... اظفر عالم، اس کے سیکریٹری اور اس ملاقات پر لعنت بھیجتے ہوئے کمرے سے باہر آ گئے۔

باہر آ کر انہیں خوش گواری کا احساس ہوا۔ اندر کے اندھیرا اجالا ماحول نے ان کے اعصاب پر گہرا اثر ڈالا تھا۔ انہوں نے باہر نکل کر گہرے سانس لیے اور ادھر ادھر دیکھا۔ کوریڈور میں سناٹا تھا مگر اسی لمحے ایک طرف سے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی اور فوراً ہی وہی گارڈ ان کے سامنے آ گیا جو انہیں اس کمرے تک پہنچا کر گیا تھا۔

”آئیے جناب! میں آپ کو واپس چھوڑ دیتا ہوں۔“ اس نے مقصودی صاحب کو دیکھ کر ادب سے کہا۔

مقصودی صاحب خاموشی سے اس کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ وہ دونوں لفٹ کے ذریعے گراؤنڈ فلور پر آئے پھر سنان راہداری سے گزر کر عمارت سے باہر آ گئے۔ بلند پھانک کے قریب پہنچ کر گارڈ ایک قدم آگے لپکا اور ان کے لیے ذیلی دروازہ کھول دیا۔

مقصودی صاحب نے سر کی ہلکی سی جنبش کے ساتھ اس کا شکریہ ادا کیا اور پھانک سے باہر نکل آئے۔

اظفر عالم سے ملاقات ان کی زندگی کا عجیب تجربہ تھا۔ اس سے پہلے وہ اپنے کئی مباحثوں سے مل چکے تھے مگر کوئی بھی اس قدر پیچیدہ... بلکہ بے ہودہ ثابت نہیں ہوا تھا۔ یہ اظفر عالم آخر چاہتا کیا تھا؟ واپسی کے لیے ڈرائیونگ کرتے ہوئے انہوں نے خود سے سوال کیا مگر کافی دیر سوچ بچار کے باوجود اس کا کوئی واضح جواب انہیں نہیں مل سکا تو انہوں نے سر جھٹک کر اس سارے قصے پر لعنت بھیجنے کی کوشش کی۔

’جہاں میں اور بے شمار فضول کاموں میں اپنا وقت برباد کرتا رہا ہوں تو کچھ وقت اس اظفر عالم کے لیے بھی سمی۔‘ انہوں نے خود کو تسلی دی مگر انہیں اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہیں ہو سکی تھی۔

اظفر عالم کا خیال کسی آسیب کی طرح ان کے ذہن پر سوار ہو چکا تھا۔ انہوں نے دوسرے دن کامران کو ساری تفصیلات سے آگاہ کیا جسے سن کر وہ بھی سخت حیران اور پھر پریشان ہوا۔ آخر میں اس کے چہرے پر طمانیت کے آثار ظاہر ہو گئے۔

”جو کچھ بھی ہوا، اس پر لعنت بھیجو۔“ اس نے مقصودی صاحب کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”لیکن تمہیں ایک اچھی کہانی کا آئیڈیا اس سے ضرور مل گیا ہے اور اتنے وقت میں اگر ایک اچھی کہانی مل سکتی ہے تو تمہارا وقت برباد نہیں ہوا بلکہ میرے حساب سے تو بہت سودمند ثابت ہوا ہے۔“

”ویسے یار! یہ اظفر عالم واقعی کوئی الجھی ہوئی شے ہے۔“ مقصودی صاحب نے کہا۔ ”کم بخت نے مجھے اتنے اشتیاق اور احترام سے بلوایا مگر چائے تک کے لیے نہیں پوچھا۔ وہ خود کو ٹیلی پیٹھی کا شکار سمجھ کر پریشان ہو رہا ہے۔“

”ٹیلی پیٹھی!“ کامران کھلکھلا کر ہنس دیا۔ ”اچھا لطیفہ ہے۔ ویسے اب میرا دل شدت سے چاہ رہا ہے کہ میں بھی اس اظفر عالم سے ملاقات کروں اور اسے بتاؤں کہ اینٹی ٹیلی پیٹھی بھی ایجاد ہو گئی ہے اور میں اس کا ماہر ہوں۔ میں اپنے عمل سے اس کا دماغ مقفل کر دوں گا پھر اسے کوئی بُرا خواب نظر نہیں آئے گا۔“

موضوع ایسا تھا کہ اس پر لمبی گفتگو ہو سکتی تھی اس لیے وہ دونوں اس پر دیر تک باتیں کرتے رہے اور محفوظ ہوتے رہے۔

اس کے بعد دوسری مصروفیات کے باعث اظفر عالم ان کے دماغ سے اتر گیا تاہم جب بھی انہیں تنہائی ملتی، اس کا خیال لاشعوری طور پر انہیں اس کے بارے میں سوچنے پر مجبور کر دیتا۔

اسی طرح ایک ہفتہ گزرا تھا کہ ایک دن مقصودی صاحب کو انسپکٹر علی رضا کا فون آیا۔

”مقصودی صاحب! میں ہاف مون گروپ آف انڈسٹریز کے ہیڈ آفس سے بول رہا ہوں۔“

”ہاف مون گروپ آف انڈسٹریز!“ مقصودی صاحب کو ایک دھچکا لگا۔ ”تم وہاں کیا کر رہے ہو؟ اس وقت تو وہاں کسی چیز یا کا بیچ نظر نہیں آتا۔“

”آپ کو ایک اطلاع دینی تھی۔“ انسپکٹر علی رضا نے کہا تو مقصودی صاحب کے دل کی دھڑکن خود بہ خود بڑھ گئی۔

”کیسی اطلاع؟“

”آپ اظفر عالم کو تو جانتے ہی ہیں۔“ اس نے تمہید

باندھی۔ ”مجھے چند دن پہلے ہی کامران نے اس ملاقات کے بارے میں بتایا تھا اور میں اس کی تفصیل جاننے کے لیے آپ سے رابطہ کرنے والا تھا مگر خیر... اب اطلاع یہ ہے کہ مسٹر اظفر عالم نے آج سہ پہر خودکشی کر لی۔“

”تمیں بچ کر بیالیں منٹ پر۔“ مقصودی صاحب نے اس طرح کہا گویا انہیں اس کی پہلے سے توقع ہو۔

”تو کیا آپ کو یہ خبر مل چکی ہے؟“ انسپکٹر علی رضا نے ہلکی سی حیرت سے پوچھا۔

”تمہیں کامران نے میری اور اظفر عالم کی ملاقات کی تفصیل نہیں بتائی تھی؟“ مقصودی صاحب نے اس کی حیرت پر حیرت کا اظہار کیا۔

”بالکل بھی نہیں... بس اتنا بتایا تھا کہ آپ نے اظفر عالم سے ملاقات کی تھی۔“ انسپکٹر علی رضا نے جواب دیا۔

”اچھا... تو پھر اب تم نے مجھے اظفر عالم کی خودکشی کی اطلاع دینی کیوں ضروری سمجھی؟“

”اس کی کچھ اور وجہ ہے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”ہمیں اظفر عالم کے دفتری کاغذات میں ایک خط ملا ہے جس میں آپ کو ملاقات کی دعوت دی گئی تھی۔“

”میں اسی دعوت نامے کے مطابق اس سے ملنے گیا تھا۔“ مقصودی صاحب نے اسے اپنی بات مکمل کرنے کا موقع دیے بغیر کہا۔ ”اس میں کون سی انوکھی بات ہے؟“

”آپ کہیں بہت زیادہ مصروف تو نہیں ہیں؟“ اچانک علی رضا نے نئی بات کی۔

”نہیں... مگر کیوں؟“ مقصودی صاحب نے پوچھا۔

”آپ بھی اسی طرف آ جاتے... میرا مطلب ہے کہ یہیں ہاف مون گروپ آف انڈسٹریز کے صدر دفتر میں... جہاں اظفر عالم نے خودکشی کی ہے۔“

”کیا یہ ضروری ہے؟“ مقصودی صاحب نے جان چھڑانے کے انداز میں پوچھا۔

”آپ آجائیں گے تو ذرا دل کو حوصلہ رہے گا۔ آپ کی مدد سے ہم کوئی کام کی بات معلوم کرنے میں کامیاب ہو سکیں گے۔“ اس نے اس طرح کہا جیسے اسے یقین ہو کہ معاملات میں کوئی گڑبڑ ہونے والی تھی۔

”ٹھیک ہے... میں آ رہا ہوں۔ تم ایسا کرو، کامران کو بھی بلا لو۔“ مقصودی صاحب نے اس سے کہا۔

”میں آپ کو کسی چکر میں نہیں بلا رہا۔ آپ کامران کو کیوں زحمت دے رہے ہیں؟“ انسپکٹر علی رضا نے کہا۔

”آپ اظفر عالم کو تو جانتے ہی ہیں۔“ اس نے تمہید

باندھی۔ ”مجھے چند دن پہلے ہی کامران نے اس ملاقات کے بارے میں بتایا تھا اور میں اس کی تفصیل جاننے کے لیے آپ سے رابطہ کرنے والا تھا مگر خیر... اب اطلاع یہ ہے کہ مسٹر اظفر عالم نے آج سہ پہر خودکشی کر لی۔“

”تمیں بچ کر بیالیں منٹ پر۔“ مقصودی صاحب نے اس طرح کہا گویا انہیں اس کی پہلے سے توقع ہو۔

”ارے یار! تم پولیس والوں کا کیا اعتبار... کب کسی شریف آدمی کو کسی چکر میں پھنسا دو۔“

”اب ہمارے بارے میں اتنی بھی بدگمانی اچھی نہیں ہوتی۔“ علی رضا نے شکوہ کرنے کے انداز میں کہا۔ ”بس آپ آجائیں اور بے فکر ہو جائیں... میں کامران کو بھی بلا رہا ہوں۔“

”میں بس فوراً نکل رہا ہوں۔“ مقصودی صاحب نے کہا اور فون بند کر دیا۔

ہیڈ آفس کا بلند پھانک بند تھا۔ مقصودی صاحب نے ہارن بجا کر اندر موجود گارڈ کو متوجہ کیا۔ اس نے ذیلی دروازہ کھولا اور مقصودی صاحب کو کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا دیکھ کر انہیں ٹھہرنے کا اشارہ کیا اور پھر چھوٹا دروازہ بند کر کے بڑا گیٹ کھول دیا۔

مقصودی صاحب کارسیت اندر داخل ہو گئے۔ انہوں نے کار بائیں ہاتھ پر بنی کار پارکنگ میں کھڑی کی اور اندر داخل ہو گئے۔

ایک ہفتہ پہلے سنان نظر آنے والی راہداری اس وقت کئی پولیس والوں سے بھری ہوئی تھی۔

”انسپکٹر صاحب کدھر ہیں؟“ مقصودی صاحب نے ایک سیاہی سے پوچھا تو اس نے مؤدب ہو کر مقصودی صاحب کی راہنمائی کا فریضہ سنبھال لیا۔

لفٹ سے نکل کر وہ داہنی طرف مڑا اور راہداری کے آخری سے پہلے کمرے میں داخل ہو گیا۔ وہاں کئی افراد نظر آرہے تھے جن میں دو خواتین بھی شامل تھیں۔

جب تعارف شروع ہوا تو مقصودی صاحب کو بتایا گیا کہ ان میں سے ایک اظفر عالم کی بیوی اور دوسری بیٹی تھی۔

مقصودی صاحب کو انہیں دیکھ کر خاصی حیرت ہوئی۔ اظفر عالم کی بیوی خاصی کم عمر تھی یا پھر اس نے خود کو اچھی طرح سنبھال کر رکھا تھا کہ ایک تقریباً جوان لڑکی کی ماں ہوتے ہوئے بھی زیادہ عمر کی نظر نہیں آتی تھی۔

بیٹی یقیناً اپنے باپ پر گئی تھی۔ دیگر نقوش کا تو کچھ پتا نہیں تھا البتہ اس کے چہرے پر موجود ناک میں باپ کی بھرپور شباهت موجود تھی۔ ان دونوں کے علاوہ وہاں اظفر عالم کا سیکریٹری محمد آصف اور ایک ڈاکٹر بھی موجود تھا۔

دونوں خواتین کا شمار نہایت خوب صورت خواتین میں کیا جاسکتا تھا۔ رنگت گلابی، لمبے سیاہ بال اور بڑی بڑی جھیل جیسی آنکھیں۔ اظفر عالم کی بیوہ جس کا نام زریںہ معلوم ہوا، خاصی سخت مزاج لگتی تھی اور اپنے شوہر کی خودکشی کے

المناک واقعے کا اس پر زیادہ اثر نظر نہیں آ رہا تھا۔

اظفر عالم کا سیکریٹری چہرے پر بدن کا حامل ایک خوش لباس نوجوان تھا۔ اس کی آنکھوں سے ذہانت اور تیزی ٹپکتی تھی۔

ابھی تعارف کی رسم چل رہی تھی کہ کامران بھی وہاں آن پہنچا۔ اسے صورت حال کی سنگینی کا احساس تھا اس لیے اس کے چہرے پر سنجیدگی طاری تھی۔

انسپکٹر علی رضا نے مقصودی صاحب کا تعارف وہاں موجود افراد سے کرایا اور پھر ان سے اظفر عالم کے ساتھ ایک ہفتہ قبل ہونے والی ملاقات کی تفصیل معلوم کی۔ مقصودی صاحب نے تمام تفصیل وہاں موجود لوگوں کو سنا دی۔

”کمال ہے۔ میں نے آج تک ایسی عجیب و غریب کہانی نہیں سنی تھی۔“ انسپکٹر نے ساری تفصیل سننے کے بعد تبصرہ کیا۔ ”ایک خواب بھی اس طرح کسی کی جان لے سکتا ہے... حیرت انگیز بات ہے۔ کیوں مسز اظفر! کیا آپ کو بھی مرحوم نے یہ خواب سنایا تھا؟“

”ہاں۔“ زریںہ نے اداس اور غمگین لہجے میں نم آنکھوں کے ساتھ جواب دیا۔ ”انہوں نے مجھ سے اس کا ذکر کیا تھا اور میرا خیال تھا کہ اس قسم کے خواب بد ہضمی کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ اس لیے میں نے انہیں اپنے فیملی فزیشن سے رابطہ کرنے کا مشورہ دیا تھا۔“ اس نے وہاں موجود ڈاکٹر اجمل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”لیکن انہوں نے اس سلسلے میں مجھ سے کوئی بات نہیں کی تھی۔“ ڈاکٹر اجمل نے کہا۔ ”ہو سکتا ہے کہ انہوں نے خاموشی کے ساتھ کسی ماہر نفسیات سے رابطہ کیا ہو۔“

اس بارے میں آصف سے پوچھا گیا تو اس نے کہا۔ ”نہیں، کم از کم میرے علم میں ایسی کوئی بات نہیں ہے کہ انہوں نے کسی ماہر نفسیات سے رجوع کیا ہو۔ انہوں نے تو بس مقصودی صاحب کے لیے خط لکھوایا تھا اور میرا خیال تھا کہ شاید اس ملاقات کا مقصد کاروباری گفتگو ہوگی۔“

”ہوں... اچھا اب ذرا ان کی خودکشی کی تفصیلات تو بتائیے۔“ مقصودی صاحب نے آصف کا جواب سننے کے بعد کسی مخصوص فرد سے مخاطب ہوئے بغیر کہا۔

اس کے جواب میں سب خاموش بیٹھے رہے پھر انسپکٹر علی رضا نے بولنا شروع کر دیا۔

”اظفر عالم صاحب معمول کے مطابق اپنے دفتر میں موجود تھے۔ عموماً وہ دو ڈھائی بجے تک لٹچ کرنے کے لیے

چلے جاتے تھے مگر گزشتہ کئی دنوں سے ایک نہایت اہم کاروباری معاملے کے سلسلے میں ان کی مصروفیت بڑھی ہوئی تھی۔ وہ شام کو دیر تک اپنے دفتر میں مصروف رہتے تھے۔ لوگوں کے مطابق آج کل ایک معروف بین الاقوامی کمپنی سے ان کی ایک فرم کے ادغام کا معاملہ چل رہا تھا اور اکثر و بیشتر غیر ملکی مہمان ان سے ملنے کے لیے یہاں آ رہے تھے۔

”آج بھی دو غیر ملکی ان سے ملنے کے لیے یہاں موجود تھے۔ وہ قریباً پونے تین بجے یہاں پہنچے تھے مگر اس وقت اظفر عالم فون پر کوئی نہایت اہم گفتگو کر رہے تھے۔ تقریباً تین بجے وہ خود اپنے کمرے کے دروازے میں آئے اور انتظار گاہ میں بیٹھے ہوئے غیر ملکی مہمانوں سے کہا کہ انہیں تھوڑا سا انتظار مزید برداشت کرنا ہوگا۔ وہ چند اہم کاغذات کا مطالعہ کر رہے ہیں جو اس ملاقات میں زیر بحث آئیں گے۔ اس غیر ملکی کمپنی کے پاکستانی فرم سے ادغام میں غیر ملکیوں کا مفاد وابستہ تھا اس لیے وہ اظفر عالم صاحب کی ہر بات ماننے کو تیار تھے۔

”قریباً چار بجے آصف صاحب کا گزر انتظار گاہ میں ہوا تو وہاں ان مہمانوں کو بیٹھا دیکھ کر چونک پڑے۔ انہوں نے ان سے پوچھا کہ کیا ابھی تک ملاقات نہیں ہو سکی ہے۔ انکار میں جواب ملنے پر وہ اظفر عالم کے کمرے میں داخل ہو گئے۔ اس سے قبل وہ مہمانوں سے کہہ رہے تھے کہ وہ اندر جاتے ہی انہیں بلواتے ہیں۔

”اندر جا کر پہلے تو آصف صاحب نے یہ سمجھا کہ شاید اظفر عالم وہاں موجود نہیں ہیں لیکن پھر میز کے عقب سے انہیں ان کا ہاتھ زمین پر نظر آیا۔ وہ تیزی سے اس طرف گئے اور انہیں اظفر عالم صاحب کھڑکی کے پاس گرے ہوئے ملے۔ ان کا ریوالتور بھی وہیں تھا۔ آصف صاحب باہر آئے اور انہوں نے مہمانوں کو اس المناک واقعے کی اطلاع دیتے ہوئے انہیں رخصت کر دیا اور پھر پولیس اسٹیشن فون کر کے مجھے اطلاع دی۔ اس کے ساتھ انہوں نے ڈاکٹر اجمل کو بھی فون کر دیا تھا۔“

”کیا کسی نے گولی چلنے کی آواز نہیں سنی تھی؟“

”مقصودی صاحب نے سوال کیا۔“

”میرا خیال ہے... نہیں۔“ انسپٹر علی رضا نے سیکریٹری کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اس بارے میں آصف صاحب کا کہنا ہے کہ یہ عمارت مرکزی طور پر ایئر کنڈیشن ہے اور اظفر عالم صاحب کا کمرہ تو خصوصی طور پر ساؤنڈ پروف بنایا گیا تھا۔ پھر یہ کہ ان دنوں برابر والی فیکٹری میں کچھ تعمیراتی کام ہو رہا ہے جس کے باعث اکثر

وہاں گراسٹنگ مشین چلتی رہی ہے، اس کے شور میں تو کچھ بھی سنائی نہیں دیتا۔“

”مطلب یہ ہے کہ گولی کی آواز کسی نے نہیں سنی۔“ مقصودی صاحب نے بھی وضاحت سے اکتا کر کہا۔ ”اچھا یہ بتاؤ کہ تمہارے خیال میں یہ واقعہ کب ہوا...؟ میرا مطلب ہے کہ اظفر عالم نے کب خودکشی کی؟“

”میں یہاں تقریباً ساڑھے چار بجے پہنچا تھا اور لاش کا معائنہ کرنے کے بعد میرا اندازہ تھا کہ انہیں مرے ہوئے ایک گھنٹا گزر چکا تھا۔“ انسپٹر علی رضا نے جواب دیا۔

”گویا یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ اپنے خواب والے وقت پر ہی مرا تھا۔“ مقصودی صاحب نے کہا۔ ”آپ کی کیا رائے ہے؟“ اس کے بعد انہوں نے ڈاکٹر اجمل سے پوچھا۔

”میری بھی یہی رائے ہے۔“ اس نے انسپٹر علی رضا کی تائید کی۔

”مقصودی صاحب! میری رائے میں تو یہ سیدھا سادہ خودکشی کا کیس ہے۔“ انسپٹر علی رضا نے کہا تو مقصودی صاحب کی پیشانی پر تفکر کی سلوٹیں نمودار ہو گئیں۔

”... مگر عجیب و غریب بات یہ ہے کہ اسے خودکشی کا کیس ہونے کے باوجود ایک لحاظ سے قتل کا کیس بھی کہا جاسکتا ہے۔ اظفر عالم صاحب نے آپ کو جو خط لکھ کر بلوایا تھا اور اس کے بعد آپ دونوں کے درمیان جو گفتگو ہوئی، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کوئی ان کا دشمن ضرور تھا... بہر حال اب آپ نے خود ہی صورت حال اتنی واضح کر دی ہے کہ کچھ اور کہا ہی نہیں جاسکتا، لہذا خودکشی ہی...“

”میرا خیال ہے کہ تم کچھ جلد بازی سے کام لے رہے ہو۔“ مقصودی صاحب نے اسے مزید بولنے سے روک دیا اور پھر زریںہ اظفر عالم کی طرف متوجہ ہو گئے۔

”آپ یہ بتائیں کہ کیا آپ کے شوہر کو پر اسرار علوم سے کوئی دلچسپی تھی؟ میرا مطلب ہے کہ ہپناٹزم، ٹیلی پتھی، ذہنی مشقیں وغیرہ؟“

”نہیں، بالکل نہیں۔“ اس نے بلا توقف جواب دیا۔ ”میرے سامنے کبھی انہوں نے ان علوم کے حوالے سے کوئی گفتگو نہیں کی... آہ!“ اچانک ہی جیسے وہ اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکی اور بری طرح سسکنے لگی۔ ”یہ منحوس خواب... کس قدر عجیب بات ہے کہ وہ ایک ہی خواب روزانہ دیکھتے رہے اور اسی خواب نے ان کی جان لے لی۔ کسی خواب کی یہ کتنی بھیاں تک تعبیر ہے۔“

”کیا آپ ان کے مزاج کا اندازہ لگا کر یہ بتا سکتی ہیں کہ ان میں خودکشی کا رجحان موجود تھا؟“

”نہیں... ایسا احساس تو مجھے کبھی نہیں ہوا، البتہ بعض اوقات ان کی طبیعت میں بڑی جھنجھلاہٹ اور بیزاری پیدا ہو جاتی تھی۔“

”وہ تو اپنی جان لینے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔“ یہ اظفر عالم کی بیٹی تھی جس نے پہلی مرتبہ اپنی زبان کھولی تھی۔ ”ڈیڈی تو اپنے بارے میں بے حد محتاط تھے اور انہیں اپنی زندگی سے کچھ زیادہ ہی پیار تھا۔“

”لیکن مس ارجنڈ! عموماً وہی لوگ خودکشی کرتے ہیں جو بظاہر کبھی اس کے متعلق سوچتے بھی نہیں ہیں۔“ مقصودی صاحب نے اسے مخاطب کر کے کہا اور پھر وہ انسپکٹر علی رضا کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ”تم مجھے وہ کمراد کھا سکتے ہو جہاں اظفر عالم کی موت ہوئی تھی؟“

”بالکل... آئیے میں آپ کو وہاں لے چلتا ہوں۔“

علی رضا نے فوراً ہی اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔

اظفر عالم کا کمر برابر والا تھا اور راہداری کے سرے پر واقع تھا۔ یہ اس کے سیکریٹری کے کمرے سے بھی بڑا اور نہایت نفیس انداز میں بنا ہوا تھا۔ مقصودی صاحب اندر داخل ہوتے ہی کھلی ہوئی کھڑکی کی طرف بڑھے جہاں اظفر عالم کے خون کا دھبہ اب بھی قالین پر نظر آ رہا تھا۔ مقصودی صاحب کے ذہن میں اظفر عالم کے جملے گونجے۔ ”اور پھر تین بج کر بیالیس منٹ پر میں اٹھ کر کھڑکی کے پاس جا ہوں اور کپڑی پر ریو اور رکھ کر گولی چلا دیتا ہوں۔“

”کیا یہ کھڑکی اسی طرح کھلی رہتی ہے؟“ مقصودی صاحب نے پوچھا۔

”ہاں... اور یہ بھی اظفر عالم کا سکی پن تھا۔ ایئر کنڈیشنڈ دفتر ہونے کے باوجود وہ یہ کھڑکی کھلی رکھتا تھا۔“ انسپکٹر علی رضا نے جواب دیا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔ ”لیکن ادھر سے تو کسی کے آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

مقصودی صاحب نے سر باہر نکال کر جھانکا۔ واقعی باہر کی طرف سپاٹ دیوار کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ ادھر سے انسان تو کیا پھر تیلی ملی بھی کمرے میں نہیں آ سکتی تھی، انہوں نے سوچا۔

سامنے ہی ایک فیکٹری کی بلند دیوار دکھائی دے رہی تھی اور اس میں بھی کوئی کھڑکی یا روشن دان نہیں تھا۔

”میرے خیال میں تو یہ سامنے والی دیوار اظفر عالم کی خودکشی میں اہمیت کی حامل ہے۔“ انہوں نے

ذریعہ لب کہا۔

”یعنی اس کا کوئی نفسیاتی اثر اظفر عالم کے ذہن پر پڑا تھا؟“ انسپکٹر علی رضا نے پوچھا۔

مقصودی صاحب نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اس وقت میز پر رکھی ایک چمٹی کو بڑی توجہ سے دیکھ رہے تھے۔ وہ اسٹیل کی بنی ہوئی نہایت نفیس چمٹی تھی۔ انہوں نے اس چمٹی کو اٹھایا پھر اس کی مدد سے کرسی کے پیچھے پڑی ہوئی ماچس کی ایک تیلی کو اٹھا کر نوکری میں ڈال دیا۔

”اچھا یہ بتاؤ کہ اظفر عالم کی موت کے وقت مسز اظفر اور مس ارجنڈ کہاں تھیں؟“ انہوں نے اس سے پوچھا۔ ”تم نے اس بارے میں تو معلومات کی ہوں گی؟“

”وہ دونوں اپنے گھر میں تھیں جو یہاں سے زیادہ دور نہیں، بلکہ یہیں اس دفتر کے عقب میں واقع ہے۔“ علی رضا نے جواب دیا اور مقصودی صاحب کو حیرت میں مبتلا کر دیا۔

سمپنس، سرگزشت، پاکیزہ، جاسوسی

نسول ایجنٹ برائے یو۔ اے۔ ای

WELCOME
BOOK SHOP

ویکم بک شاپ

پی او بکس: 27869 کراچہ، دہلی

فون: 04-3961016 فیکس: 04-3961015

موبائل: 050-6245817 ای میل: welbooks@emirates.net.ae

معیاری کتابوں کا اعلیٰ مرکز

WELCOME
BOOK PORT

ویکم بک پورٹ

ریٹیل، ہول سیل، ڈسٹری بیوٹر، پبلشر، ایکسپورٹر

میں اردو بازار کراچی

فون: 32633151, 32639581 (92-21) فیکس: 32638086 (92-21)

ای میل: welbooks@hotmail.com

ویب سائٹ: www.welbooks.com

”کیا مطلب؟“ انہوں نے حیرانی کے ساتھ پوچھا۔
 ”میرا تو خیال تھا کہ اس کا گھر کلفٹن یا ڈیفنس میں ہوگا۔“
 ”وہاں اس کے کئی بھلے اور اپارٹمنٹ ہیں مگر وہ شاید
 اپنے سنگی پن کی وجہ سے وہاں نہیں رہنا چاہتا تھا اس لیے اپنی
 بیوی بچی سمیت یہیں رہ رہا تھا۔“

”ہوں۔“ مقصودی صاحب نے پُرسوج انداز میں
 کہا پھر انسپکٹر کو مخاطب کر کے بولے۔ ”تم ایسا کرو کہ ذرا
 اظفر عالم کی بیٹی کو یہاں بھیج دو۔ میں اس سے اس کمرے
 میں چند سوال کروں گا۔“

اس عجیب و غریب فرمائش پر علی رضا نے حیران
 نظروں سے اپنے فیورٹ رائٹر کو دیکھا پھر سر جھٹک کر باہر چلا
 گیا۔ اسے مقصودی صاحب کی تجزیاتی اور تخیلاتی صلاحیتوں
 پر پورا اعتماد تھا۔

چند لمحوں بعد دروازہ کھلا اور حسین و جمیل ارجمند عالم
 اندر داخل ہوئی۔

”میں آپ سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں... اور مجھے
 امید ہے کہ آپ اس پوچھ گچھ کا بُرا نہیں منائیں گی۔“ اسے
 دیکھ کر مقصودی صاحب نے شائستگی سے کہا۔

”اس میں بُرا ماننے کی کیا بات ہے؟“ ارجمند نے
 رسماً کہا کیونکہ اس کے لہجے کی رکھائی بتا رہی تھی کہ اسے یہ
 بات پسند نہیں آئی تھی۔

”کیا آپ کے علم میں تھا کہ آپ کے ڈیڈی یہ
 ریوالور اپنی دراز میں رکھا کرتے تھے؟“
 ”نہیں۔“ اس نے نفی میں سر ہلا کر جواب دیا۔ ”یہ
 بات مجھے ابھی بتائی گئی ہے۔“

”آپ ماں، بیٹی میں عمر کا فرق بہت کم ہے...“
 مقصودی صاحب نے بولنا شروع کیا تھا کہ اس نے ان کی
 بات کاٹ دی۔

”یہ میری سوتیلی ماں ہے اور مجھ سے صرف آٹھ
 سال بڑی ہے۔“

”اوہ... واقعی یہ میرے لیے ایک حیرت ناک
 خبر ہے۔“ مقصودی صاحب نے تبصرہ کرنے کے انداز میں
 کہا پھر پوچھا۔ ”ذرا یہ بتائیں کہ اظفر عالم سے آپ کے
 تعلقات کیسے تھے؟“

”تعلقات؟“ اس نے بھوئیں اچکا کر انہیں دیکھا۔
 ”میرا مطلب ہے کہ دوسری بیوی کی موجودگی میں
 پہلی بیوی کی اولاد کی طرف عموماً باپ کی توجہ کم ہو جاتی
 ہے۔“ مقصودی صاحب نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

”اس حوالے سے دیکھا جائے تو ہمارے تعلقات
 سرد مہری کا شکار تھے۔ بات یہ ہے کہ میں بھی انہیں زیادہ
 لفٹ نہیں کراتی تھی۔ وہ اسی قسم کے سنگی باپ تھے جن کے
 ساتھ گزارہ کرنا ویسے بھی خاصا مشکل ہوتا ہے۔“
 ”حیرت ہے، آپ اپنے باپ کے بارے میں یہ
 سب کہہ رہی ہیں۔“ مقصودی صاحب نے کہا۔

”میں آپ کا وقت بچا رہی ہوں۔“ اس نے پُرنحوت
 انداز میں گردن کو جھٹکتے ہوئے کہا۔ ”آپ بے شک مجھے بُرا
 بھلا کہتے رہیں لیکن یہ سچ ہے... اور میں تو کیا، میری سوتیلی
 ماں بھی صرف اس لیے مجبور تھی کہ اس کا بھی کوئی اور ٹھکانا
 نہیں تھا۔“

”کسی بھی باپ کا سنگی پن اس قدر نفرت کا باعث تو
 نہیں ہو سکتا۔“ مقصودی صاحب نے اسے غور سے دیکھتے
 ہوئے پوچھا۔ ”کیا اس رویے کی اور بھی کوئی وجہ تھی؟“

”وہ اپنی من مانی کرنے کے عادی تھے اور کسی کو بھی
 کچھ نہیں سمجھتے تھے۔ ان کی رائے سے اختلاف کرنے والا
 ہمیشہ کے لیے ان کی نظروں میں بُرا بن جاتا تھا۔“ ارجمند
 نے جواب دیا۔

”آپ نے ان کی مرضی کے خلاف کوئی کام کیا
 تھا؟“ مقصودی صاحب نے اس کے سراپا پر نظر جمائی۔

”میں نے ایک متوسط درجے کے نوجوان سے
 شادی کرنا چاہی تھی مگر انہوں نے مجھے گھر سے نکال دینے کی
 دھمکی دے کر اس نوجوان کو نوکری سے نکال باہر کیا تھا۔“

ہر نئی بات ایک انکشاف تھی۔ ارب پتی باپ، دوسری
 شادی، نافرمان بیٹی، مرضی کی شادی... مقصودی صاحب
 ان سب باتوں کا تجزیہ کر رہے تھے۔

”وہ آپ سے کیا چاہتے تھے؟“
 ”ان کی خواہش تھی کہ میں کسی ہم پلہ خاندان میں
 شادی کروں۔“ ارجمند نے سپاٹ انداز میں جواب دیا۔

”اور اس جائداد کی اکلوتی وارث ہونے کی وجہ سے میں ان
 کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کر سکتی تھی۔“

”یعنی ان کی موت کے بعد ان کی تمام دولت و
 جائداد کا مالک آپ کو بننا ہے؟“

”آپ کا خیال درست ہے۔“ ارجمند نے جواب
 دیا۔ ”میری سوتیلی ماں کو ایک مقررہ رقم ملے گی اور باقی
 سب کچھ مجھے ملے گا۔ اس اعتبار سے ڈیڈی کی خودکشی
 میرے لیے کوئی زیادہ افسوس ناک واقعہ نہیں ہے۔ میں تو
 کافی عرصے سے ان کی موت کی خواہش مند تھی... اور ویسے

یہ کہتے ہوئے وہ دوبارہ کھڑکی کی طرف گئے اور جھک کر نیچے کی طرف دیکھا۔ انہیں فیکٹری کی دیوار اور دفتر کی عمارت کی درمیانی گلی نما جگہ میں کوئی سیاہ رنگ کی شے نظر آئی۔ انہوں نے مطمئن ہو کر گردن ہلانی اور کمرے سے باہر نکل آئے۔

وہ باہر نکلے تو کوریڈور میں انسپکٹر علی رضا اور کامران نظر آئے۔ کامران کے ہونٹوں میں سگریٹ دبی ہوئی تھی اور وہ گہرے کس لے رہا تھا۔ مقصودی صاحب کو دیکھتے ہی دونوں ان کی طرف لپکے۔

”کیا رہا میرے عظیم رائٹر؟“ کامران نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ ”کہانی کہاں تک پہنچی؟“

”شروع میں تو کہانی چل نہیں رہی تھی مگر اب تیزی سے پھسلتی جا رہی ہے۔“ مقصودی صاحب نے جواب دیا۔

”اور کہانی اتنی دلچسپ ہے کہ قاری اس کے اختتام کا کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا۔“

”ہم تو تمہارے قاری نہیں ہیں اس لیے ہمیں تو تجسس میں مبتلا نہ کرو۔“ کامران نے احتجاجی لہجے میں کہا۔

”صبر... صرف دو منٹ کا صبر۔“ مقصودی صاحب نے ہاتھ اٹھا کر اس کی بے تابی کو بریک لگائے۔ ”ابھی تھوڑی دیر میں سب کچھ واضح ہو جائے گا۔ آؤ، آصف کے کمرے میں چلتے ہیں۔“

”جی تو آصف صاحب...!“ کمرے میں پہنچ کر انہوں نے اظفر عالم کے سیکریٹری کو مخاطب کیا۔ ”آپ بھی مجھ سے ملنے کے مشتاق تھے مگر افسوس کہ ہماری ملاقات کیسے موقع پر ہو رہی ہے۔“

وہ مغموم انداز میں سر ہلا کر رہ گیا۔

”آپ مجھے تفصیل سے وہ تمام واقعات بتائیں کہ کس طرح اظفر عالم صاحب نے مجھ سے رابطہ کرنے کے لیے کہا تھا۔ انہوں نے آپ کو کیا حکم دیا تھا؟“

”یہ چھبیس دسمبر کی بات ہے۔ شام کے چار بجے انہوں نے مجھے اس خط کے بارے میں ہدایت کی تھی اور کہا تھا کہ میں خود یہ خط کوریڈور والوں کو دوں تاکہ سٹائیکس دسمبر تک آپ کو مل سکے۔“

”دفتر کا ٹائم تو غالباً دو بجے تک کا ہے... تو کیا وہ دیر تک دفتر میں بیٹھے تھے؟“

”دفتری ٹائم دیگر اسٹاف کے لیے ہے مگر میں اس

بھی وہ صرف اور صرف دولت کو ہی اپنا سب کچھ سمجھنے لگے تھے۔ انسانوں اور انسانی رشتوں ناتوں سے ان کا اعتبار اٹھ گیا تھا۔“

”مجھے آپ کے سچ بولنے سے خوشی ہوئی ہے۔“ مقصودی صاحب نے کہا۔

”آپ کو کچھ اور تو نہیں پوچھنا؟“ اس نے گویا اس سے اٹھنے کا ارادہ کرتے ہوئے کہا۔

”بس ایک دو چھوٹے چھوٹے سوال۔“ مقصودی صاحب نے اس کا ارادہ بھانپتے ہوئے کہا۔ ”ایک تو یہ کہ کیا یہ چمٹی ہمیشہ ان کی میز پر رہتی تھی؟“ انہوں نے میز پر رکھی ہوئی چمٹی کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

”جی ہاں۔“ ارجمند نے جواب دیا۔ ”میں نے اسے ہمیشہ ڈیڈی کی میز پر دیکھا ہے۔ وہ میز کی اشیا اٹھانے کے لیے جھکنا پسند نہیں کرتے تھے اس لیے چمٹی کا استعمال کرتے تھے۔“ یہ جواب دے کر اس نے منتظر نگاہوں سے مقصودی صاحب کو دیکھا۔

”دوسرا سوال یہ کہ کیا ان کی نظر ٹھیک تھی؟“

”نظر؟“ اس نے دہرایا۔ ”یعنی آئی سائڈ...؟ وہ تو بہت کمزور تھی۔ موٹے شیشوں کی عینک کے بغیر تو وہ کچھ بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔“

”لیکن چشمہ لگانے کے بعد؟“ مقصودی صاحب نے پوچھا۔

”اس کے بعد وہ معمول کے کام بہ آسانی انجام دیتے تھے۔“ اس نے جواب دیا۔

”یعنی عینک لگانے کے بعد وہ سب کچھ پڑھ لکھ لیا کرتے تھے؟“

”جی... بالکل۔“ ارجمند نے جواب دیا۔ ”وگرنہ عینک لگانے کا کیا فائدہ تھا؟“

اس کی بات معقول تھی اس لیے مقصودی صاحب تفہیمی انداز میں سر ہلانے لگے۔

”میں جاؤں؟“ ارجمند نے پوچھا تو مقصودی صاحب نے اثبات میں گردن ہلا کر وہاں سے روانگی کی اجازت دے دی۔

اس کے کمرے سے رخصت ہوتے ہی مقصودی صاحب اٹھے اور اپنے ماتھے پر ہاتھ مار کر خود سے گویا ہوئے۔ ”میں بھی کتنا بے وقوف ہوں۔ بالکل سامنے کی بات ہے اور میں آنکھوں والا ہوتے ہوئے بھی کچھ نہیں دیکھ سکا۔“

سے مستثنیٰ ہوں۔ وہ جب تک یہاں ہوتے ہیں مجھے بھی موجود رہنا پڑتا ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”اچھا تو جب انہوں نے آپ کو خط کی تیاری کا حکم دیا تو کیا گارڈ کو بھی کچھ ہدایت کی تھی؟“

”جی ہاں... انہوں نے گارڈ کو بلایا تھا اور اسے بتایا تھا کہ اکتیس دسمبر کو ایک صاحب پانچ بجے آئیں گے۔ ان سے ان کا نام پوچھ لینا اور خط دیکھ کر اطمینان کر لینا کہ وہی صاحب ہیں جنہیں بلایا گیا ہے۔“

”یہ ہدایت انہوں نے چھبیس دسمبر کو ہی دے دی تھی؟“

”نہیں یہ تیس دسمبر کی بات ہے۔ چھبیس دسمبر کو انہوں نے خط بھجوایا تھا۔“

”ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔“ مقصودی صاحب نے سر ہلایا اور پھر پوچھا۔ ”اچھا یہ بتائیں کہ یہ خط دیکھنے والی ہدایت غیر معمولی نہیں تھی؟ کیا انہیں شک تھا کہ میرے علاوہ کوئی اور بھی ان سے ملنے آ سکتا ہے؟“

”اس بارے میں، میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔“ اس نے جواب دیا۔ ”ان کے ذہن میں جو بات آ جاتی تھی، اس پر وہ پوری طرح عمل درآمد چاہتے تھے۔“

”اکتیس دسمبر کو آپ یہاں نہیں تھے جبکہ اظفر عالم یہیں تھے؟“

”ہاں... اس دن انہوں نے خصوصی طور پر مجھے چھٹی دے دی تھی۔“

”کیوں... اس کی کوئی خاص وجہ؟“ مقصودی صاحب نے چونک کر پوچھا۔

”شاید وہ نہیں چاہتے ہوں گے کہ آپ کی ان کے علاوہ کسی اور سے ملاقات ہو۔“

”اچھا، دوسرے دن انہوں نے آپ سے اس ملاقات کا تذکرہ کیا تھا؟“ مقصودی صاحب نے پوچھا۔

”نہیں... اور نہ ہی میں ان سے دریافت کرنے کی ہمت کر سکتا تھا۔“ اس نے جواب دیا۔

”اچھا یہ بتائیں کہ انہوں نے اپنے کمرے میں مجھ سے ملاقات کیوں نہیں کی تھی؟“

”اس کی وجہ کے بارے میں کوئی بھی کچھ نہیں بتا سکتا۔ یہ ان کی خواہش تھی اور انہوں نے مجھے ہدایت کی تھی کہ میں گارڈ کو بتا دوں کہ وہ آپ سے میرے کمرے میں ملیں گے۔ ویسے یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی، آپ کے علاوہ بھی وہ چند لوگوں سے اسی کمرے میں ملتے

رہے ہیں۔“

”گڈ!“ مقصودی صاحب نے تفسیحی انداز میں کہا پھر انسپکٹر علی رضا سے مخاطب ہو کر بولے۔ ”ذرا اس گارڈ کو تو بلاؤ جو اس روز ڈیوٹی پر موجود تھا۔“

”کس روز؟“ اس نے پوچھا۔

”اکتیس دسمبر کو۔“ مقصودی صاحب نے جواب دیا۔

انسپکٹر نے اپنے سپاہی کو گارڈ کو بلانے کا کہا اور وہ سیلوٹ کر کے وہاں سے روانہ ہو گیا۔

مقصودی صاحب دیکھ رہے تھے کہ کامران اور انسپکٹر دونوں بے چینی و بے قراری کے ساتھ ان کو دیکھ رہے تھے۔

تھوڑی دیر کے بعد گارڈ کمرے میں موجود تھا۔ اس کے چہرے پر سراسیمگی پھیلی ہوئی تھی۔

”تم مجھے پہچانتے ہو؟“ مقصودی صاحب نے اسے ایک کرسی پر بٹھا کر سوال کیا۔

”جی! آپ ایک ہفتہ پہلے صاحب سے ملنے آئے تھے۔“ اس نے جواب دیا۔

”اس دن کیا ہوا تھا؟ ساری بات تفصیل کے ساتھ بتاؤ۔“ مقصودی صاحب نے اس سے کہا۔

”اس دن دوپہر میں چھٹی ہونے کے بعد آصف صاحب نے مجھے بلایا تھا اور یہ کہا تھا کہ ایک صاحب دفتر والا خط لے کر یہاں آئیں گے۔ میں انہیں لے کر ان کے کمرے میں آ جاؤں کیونکہ بڑے صاحب ان سے وہیں ملیں گے۔“ اس نے ٹھہر ٹھہر کر جواب دیا۔

”اس کے بعد تم اظفر صاحب سے ملے تھے؟“ مقصودی صاحب نے پوچھا۔

”جی... میں کوئی ساڑھے چار بجے ان کے بلانے پر ان سے ملنے گیا تھا۔“ اس نے جواب دیا۔

”انہوں نے تمہیں کیوں بلایا تھا؟“

”ان کے ایک ٹیلی فون کا تار پلگ سے نکل گیا تھا، اسے لگوانے کے لیے انہوں نے مجھے انٹرکام کیا تھا۔“

”اس موقع پر انہوں نے کوئی دوسری بات نہیں کی تھی؟“ مقصودی صاحب نے غور سے اسے دیکھا۔

”نہیں، ویسے بھی وہ زیادہ بات نہیں کرتے تھے۔ صرف حکم دیتے تھے... اور بس۔“

”ٹھیک ہے، تم جاؤ۔“ مقصودی صاحب نے اسے جانے کی اجازت دے دی۔

”اور اب میں مسز اظفر عالم سے چند سوال کروں گا۔“ اس کے جانے کے بعد مقصودی صاحب نے کہا۔
”لیکن ان سب سوالوں کی کیا ضرورت ہے؟“
ارجمند نے ناک چڑھا کر کہا۔ ”اب ڈیڈی تو واپس آنے سے رہے اور اب تک کے حالات سے تو ثابت ہو رہا ہے کہ انہوں نے خودکشی کی ہے تو پھر آخر اس فضول جھک جھک سے کیا حاصل ہوگا؟“

”ان سوالوں کا محرک اظفر عالم کا وہ جملہ ہے جس میں انہوں نے مجھ سے اپنے کسی دشمن کا ذکر کیا تھا۔“ مقصودی صاحب نے رمان سے جواب دیا اور مسز اظفر کی طرف متوجہ ہو گئے۔

”جی تو زرینہ صاحبہ! اظفر صاحب کی نظر درست تھی؟“

”نہیں... عینک کے بغیر نہیں۔“ اس نے سر ہلا کر جواب دیا۔

”کیا ان کی نظر خاصی خراب تھی؟“

”خاصی سے بھی بہت زیادہ۔“ زرینہ نے جواب دیا۔ ”اپنی عینک کے بغیر تو وہ تقریباً اندھے ہی ہو جاتے تھے۔ میں نے کئی بار بغیر عینک کے انہیں اندھوں کی طرح مختلف چیزیں ٹٹولتے ہوئے دیکھا تھا۔“

”ان کے پاس ایک سے زائد چشمے تھے؟“

”ہاں، اور یہ ان کی مجبوری تھی۔ وہ ہر وقت ایک سے زائد چشمے اپنے ساتھ رکھتے تھے کہ نہ جانے کب کوئی چشمہ ٹوٹ جائے تو وہ اندھے ہونے سے بچے رہیں۔“

”ہوں۔“ مقصودی صاحب نے ایک ہنکارا بھرا اور پھر گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ ”میرا خیال ہے کہ تحقیقات مکمل ہو چکی ہیں اور اب ہر شے واضح ہو کر میرے سامنے آگئی ہے۔“

کمرے میں خاموشی چھا گئی تھی۔ سب لوگ مقصودی صاحب کی طرف متوجہ تھے جنہوں نے بے پروائی سے سگریٹ سلگا لیا تھا اور اس کے کش لگاتے ہوئے باری باری سب کے چہروں کا جائزہ لے رہے تھے۔

”مقصودی صاحب! آپ یہ معما حل کر چکے ہیں تو ہمیں بھی بتائیے۔“ اضطراب جب حد سے بڑھ گیا تو مسز اظفر عالم نے بے چینی سے کہا۔ ”اس خواب سے ان کی موت کا کیا تعلق تھا؟“

”وہ خواب تو بہت اہمیت کا حامل ہے۔ اصل مسئلہ اسی خواب کا ہے۔“ مقصودی صاحب نے کہا۔

بل سرسبز پہاڑی کے دامن میں بھیڑوں کے بڑے سے گلے کو چرا رہا تھا۔ کچے راستے پر دور سے دھول اڑاتی ہوئی ایک شاندار جیب نمودار ہوئی۔ بل کے قریب سے گزرتے ہی جیب رک گئی۔ ڈرائیور نے اسے قدرے ریورس کیا اور انجن بند کر کے نیچے آ گیا۔

وہ بیش قیمت سوٹ میں ملبوس، قیمتی پرفیم کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ آنکھوں پر رے بین کا چشمہ جما ہوا تھا۔ اس نے بل سے کہا۔ ”اگر میں تم کو یہ بتا دوں کہ اتنے بڑے ریوڑ میں تمہاری بھیڑوں کی تعداد کتنی ہے تو کیا تم ایک بھیڑ مجھے دے دو گے؟“

بل کو دلچسپی محسوس ہوئی۔ ”ہاں دے دوں گا۔“

نودارد نے اپنی جیب سے ٹیمپلیٹ نکالا۔ اسے الیکٹرانک نوٹ پیڈ سے منسلک کیا اور انٹرنیٹ پر ٹاسا کا بیج نکالا۔ صفحہ ملتے ہی اس نے سیٹلائٹ سے چلتے والے جی پی ایس کو جوڑا، اس پر کھیلنے ہوئے اس نے بل کی چراگاہ کا تعین کیا، اس کا ڈیٹا بیس نکالا اور تقریباً 60 اسپرینڈ ٹینس پر پیچیدہ فارمولوں میں الجھے رہنے کے بعد اپنے چھوٹے سے پرنٹر پر ڈیڑھ سو صفحات پر مشتمل رپورٹ نکالی اور بل سے کہا۔ ”اس وقت یہاں 15862 بھیڑیں موجود ہیں۔“

”بالکل درست!“ بل نے سپاٹ لہجہ میں کہا۔

”اب تم ایک بھیڑ لے سکتے ہو۔“

وہ ریوڑ کے قریب گیا اور ایک جانور کو اٹھا کر اپنی جیب کے پچھلے حصے میں ڈال دیا۔ وہ لوٹا تو بل نے کہا۔ ”اب اگر میں تمہارے چشمے کے بارے میں بتا دوں تو کیا تم میرا جانور مجھے واپس دے دو گے؟“

نودارد راضی ہو گیا۔ بل نے کہا۔ ”تم کنسلٹنٹ ہو؟“ وہ حیران رہ گیا۔ ”بالکل درست... تم نے کیسے اندازہ لگایا؟“

”بہت آسان سی بات ہے۔“ بل نے اطمینان سے کہا۔ ”تم بن بلائے میرے پاس آئے... دوسری پہچان یہ تھی کہ تم ایک ایسے سوال کا جواب ڈھونڈنے کی کوشش میں تھے جس کا جواب میں پہلے سے جانتا تھا اور اس کے معاوضے میں ایک بھیڑ کے طلب گار تھے... تیسری اور آخری پہچان یہ تھی کہ تمہیں یہ تک پتا نہیں تھا کہ یہاں کون کون سے جانور ہیں... تم نے بھیڑ کے بجائے میرا کتا اٹھا کر اپنی گاڑی میں ڈال لیا ہے... مہربانی کر کے اب اسے واپس کر دو۔ وہ بہت بے ضرر ہے... صرف بھگنے والی بھیڑوں پر غراتا ہے۔“

(جان محمد کی جامشورو سے حاضر دماغی)

”آہ!“ مسز اظفر نے لرز کر کہا۔ ”اس سے پہلے بھی مجھے ایسی باتوں پر یقین نہیں تھا لیکن اس خواب والے واقعے کے بعد تو میری عجیب کیفیت ہے۔ وہ بے چارہ مجھے اپنا خواب سناتا تھا اور اب اس کا انجام بھی اسی خواب کے مطابق ہو گیا۔۔۔ آہ!“ اس نے ایک سسکی لی اور خاموش ہو گئی۔ اب اس کے لہجے میں اظفر عالم کے لیے کوئی خاص احترام نہیں رہا تھا۔

”واقعی یہ ایک غیر معمولی بات ہے۔“ ڈاکٹر اجمل نے کہا۔ ”اگر مقصودی صاحب نے یہ بات ہمیں نہ بتائی ہوتی تو میں کبھی اس پر یقین نہیں کرتا۔“

”آپ درست کہہ رہے ہیں۔“ مقصودی صاحب نے تائید کرتے ہوئے کہا۔ ”اپنے خواب کا قصہ اگر مجھے اظفر عالم نے خود نہ سنایا ہوتا تو میرے لیے بھی اس پر یقین کرنا ممکن نہیں تھا۔ بہر حال اس تمام واقعے میں تین باتوں نے مجھے پریشان کر کے رکھا ہوا ہے۔ وہ باتیں جو میرے یہاں آنے پر پیش آئی تھیں۔ پہلا سوال یہ ہے کہ آخر انہوں نے گارڈ کو یہ ہدایت کیوں کرائی کہ وہ ان کے خط کی موجودگی کی تصدیق کرے؟“

”شناخت کے لیے۔“ اظفر عالم کے سیکریٹری نے فوراً کہا۔

”نہیں مائی ڈیر سیکریٹری!“ مقصودی صاحب نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”یہ سوچنا ہی غلط ہے کہ محض میری شناخت کی خاطر انہوں نے اتنا تردد کیا ہو۔ اس تاکید کی کوئی اور زیادہ اہم وجہ بھی جس کی بنا پر نہ صرف انہوں نے گارڈ کو خط دیکھنے کی ہدایت جاری کرائی بلکہ بعد میں وہ خط انہوں نے مجھ سے واپس بھی لے لیا۔ تاہم اگر واپس لے بھی لیا گیا تھا تو اس کی اہمیت نہ ہونے کے باعث اسے ضائع کر دینا چاہیے تھا۔ آج ان کے کاغذات میں یہ خط بھی موجود پایا گیا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ آخر یہ خط انہوں نے کیوں سنبھال کر رکھ چھوڑا تھا؟“

”ممکن ہے کہ اس خیال کے تحت انہوں نے یہ خط چھوڑا ہو کہ اگر ان کے ساتھ کوئی غیر معمولی بات ہو جائے تو پھر آپ کے ذریعے ان کے عجیب و غریب خواب کی تفصیلات معلوم کی جاسکیں۔“ یہ ارجمندھی جس نے اپنا خیال ظاہر کیا تھا۔

”تم واقعی بہت ذہین ہو۔“ مقصودی صاحب نے ستائشی نظروں سے اسے دیکھا۔ ”اس خط کو سنبھال رکھنے کی صرف یہی ایک وجہ ہو سکتی ہے۔ ان کی موت کے بعد آخر

کوئی تو ایسا ہو جو ان کے بھیانک خواب کے بارے میں دوسروں کو بتا سکے۔ وہ خواب جو اس سارے قصبے میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ اب دوسرا سوال یہ ہے کہ اکتیس دسمبر کی شام میں نے ان سے کہا تھا کہ وہ مجھے اپنے کمرے میں لے چلیں تاکہ میں ایک نظر اس کا جائزہ لے سکوں تو انہوں نے صاف انکار کیوں کر دیا تھا؟“

اس سوال کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔ مقصودی صاحب نے جواب طلب نظروں سے سب کو دیکھا پھر بولے۔ ”اچھا، میں یہ سوال ایک دوسرے طریقے سے پوچھتا ہوں۔ آخر اس روز اظفر عالم صاحب کے کمرے میں کیا چیز تھی جسے وہ مجھے دکھانا نہیں چاہتے تھے؟“

اس پر بھی سب خاموش رہے۔ ”یہ سوال واقعی مشکل ہے۔“ لمحاتی توقف کے بعد مقصودی صاحب نے کہا۔ ”لیکن اس کے باوجود ہمیں وہ وجہ تلاش کرنی پڑے گی۔ یہ بات تو یقینی ہے کہ اس دن ان کے کمرے میں کوئی ایسی شے ضرور تھی جو وہ مجھے دکھانا نہیں چاہتے تھے۔ بہر حال میں اس سوال کو یہیں چھوڑتا ہوں اور اب تیسرا سوال۔۔۔ اظفر عالم سے میری ملاقات کے دوران انہوں نے اپنا خط مجھ سے طلب کیا تھا اور میں نے جیب سے ایک کاغذ نکال کر انہیں دے دیا تھا جسے انہوں نے کھول کر دیکھا اور پھر تہہ کر کے اپنی میز پر رکھ لیا۔ ملاقات کے اختتام پر جب میں روانگی کے لیے اٹھ گیا تھا، تب مجھے پتا چلا کہ ان کا خط تو میری جیب میں تھا اور میں نے غلطی سے انہیں دوسرا کاغذ دے دیا تھا۔ میں نے وہ کاغذ واپس لے کر انہیں وہی خط دے دیا تھا۔ اب سوال یہ ہے کہ جب انہوں نے پہلی مرتبہ کاغذ لے کر اسے دیکھا تھا تو انہیں یہ کیوں نہیں معلوم ہوا کہ میں نے اسلی خط کے بجائے دوسرا کاغذ انہیں دے دیا تھا؟“

”کیا انہوں نے اس وقت چشمہ نہیں لگایا ہوا تھا؟“ علی رضا نے الجھتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں۔۔۔ انہوں نے اس وقت چشمہ لگا پا ہوا تھا۔ یہی تو اصل نکتہ ہے۔ اگر انہوں نے عینک پہنی ہوئی نہ ہوتی تو سمجھا جاسکتا تھا کہ وہ اپنے خط اور دوسرے کاغذ میں تمیز نہ کر سکے ہوں گے لیکن ایسا نہیں تھا۔ پھر کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ انہیں ان کاغذوں میں کوئی فرق نظر نہیں آیا؟ بس اسی مقام سے کہانی دلچسپ مرحلے میں داخل ہو جاتی ہے۔ کیا

کیا آپ شوگر موزی مرض سے نجات چاہتے ہیں؟

آج کل تو ہر انسان شوگر کی مرض سے بیزار پریشان فکر مند ہے۔ ہم نے ایک طویل عرصہ دیسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں پر ریسرچ کر کے ایک ایسا خاص قسم کا ہربلز شوگر نجات کورس ایجاد کر لیا ہے جو کہ انشاء اللہ آپ کو شوگر سے نجات دلا سکتا ہے۔ شفا منجانب اللہ پر ایمان رکھیں کیونکہ مایوسی تو گناہ ہے۔ یاد رکھیں شوگر کی مرض تو انسان کو اندر ہی اندر دیمک کی طرح کھوکھلا کمزور بے جان بنا دیتی ہے۔ اگر آپ بھی شوگر سے نجات چاہتے ہیں تو آج ہی فون پر تمام علامات بیان کر کے گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک VP وی پی شوگر نجات کورس منگوالیں۔ خدا را ہمارا شوگر کورس آزما کر تو دیکھیں

المسلم دار الحکمت (رجسٹرڈ)

(دیسی طبی یونانی دوا خانہ)

ضلع و شہر حافظ آباد پاکستان

0300-6526061

0301-6690383

صبح 9 بجے سے دوپہر 1 بجے تک

عصر 4 بجے سے رات 10 بجے تک

آپ صرف فون کریں شوگر کورس ہم پہنچائیں گے

خوب کہانی ہے۔ اظفر عالم کو روزانہ ایک ہی خواب نظر آتا ہے جس میں وہ خودکشی کر رہا ہوتا ہے اور پھر کچھ عرصے کے بعد وہ اپنے دفتر میں مردہ پایا جاتا ہے اور حالات اس طرف اشارہ کر رہے ہوتے ہیں کہ اس نے خودکشی کی ہے لیکن...

”لیکن کیا...؟“ کامران نے چونک کر درمیان میں مداخلت کی۔ ”تمہاری بتائی ہوئی تفصیل کے مطابق یہ سیدھا سادہ خودکشی کا ہی معاملہ ہے۔“

”نہیں... ہرگز نہیں۔“ مقصودی صاحب نے نفی میں گردن ہلائی۔ ”اس کے برخلاف یہ ایک قتل کی واردات ہے۔ انتہائی چالاکی اور بہترین منصوبہ بندی سے کیا گیا قتل...“ مقصودی صاحب نے ڈرامائی انداز میں کہا اور سب کے تجسس سے پُر چہروں پر ایک نظر ڈالی۔

”سوال نمبر دو یہ تھا کہ آخر اس روز اظفر عالم مجھے اپنے کمرے میں کیوں نہیں لے جانا چاہتا تھا؟“ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد انہوں نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”وہاں ایسی کیا چیز تھی جسے وہ میری نظروں سے چھپانا چاہتا تھا؟ تو مائی ڈیز فرینڈز! میرا خیال یہ ہے کہ مجھے اکتیس دسمبر کو اظفر عالم کے کمرے میں اس لیے نہیں لے جایا گیا کہ کہیں میں اظفر عالم کو نہ دیکھ لوں۔“

مقصودی صاحب کی اس بات نے سب کو ہونق کر دیا تھا۔ سب کے منہ حیرت سے کھل گئے تھے۔

”مقصودی! تم کوئی کہانی اپنے مداحوں کو نہیں سنا رہے ہو۔ ہم سب اظفر عالم کی خودکشی کے اسباب معلوم کرنے کے لیے یہاں اکٹھے ہوئے ہیں۔“ کامران نے اپنی حیرت پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ”پہلے تم نے اسے قتل کہا اور اب کہہ رہے ہو کہ اظفر عالم کو تمہاری نظروں سے بچانے کے لیے تمہیں اس کے کمرے میں نہیں لے جایا گیا۔“

”میں جو کہہ رہا ہوں، وہ اپنی تیار کردہ کہانی کی بنیاد پر ہی کہہ رہا ہوں۔“ مقصودی صاحب نے مسکراتے ہوئے کامران کو دیکھا اور بولے۔ ”میرے تجزیے اور تخیل کے مطابق وہ اظفر عالم جس سے میں اس کمرے میں ملا تھا، اپنے اور دوسرے خط میں اس لیے تمیز نہ کر سکا کہ اس کی آنکھیں بالکل ٹھیک تھیں لیکن اس نے غیر معمولی شیشوں والی عینک لگا رکھی تھی۔ ایسی عینک عارضی طور پر اچھی بصارت رکھنے والوں کو اندھا کر سکتی ہے۔ جب تک اسے اتارا نہ جائے، وہ صحیح طور پر کچھ نہیں دیکھ سکتے۔ میں نے غلط تو نہیں کہا ڈاکٹر؟“ انہوں نے وہاں موجود ڈاکٹر اجمل سے تائید

طلب کی۔

”ہاں، یہ تو ٹھیک ہے لیکن...“ ڈاکٹر اجمل نے مقصودی صاحب کی تائید کرنے کے بعد کچھ کہنا چاہا مگر مقصودی صاحب نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔

”نہیں... پہلے مجھے اپنی بات مکمل کرنے دو... مجھے اکتیس دسمبر کو ہی کچھ شبہ ہو گیا تھا کہ میں اصلی اظفر عالم سے نہیں، محض ایک اداکار سے ملاقات کر رہا ہوں۔ اس کمرے میں داخل ہوتے ہی مجھے احساس ہو گیا تھا کہ یہ سب کچھ ایک ڈرامے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا کیونکہ اس دن اظفر عالم نے خود کو روشنی سے حتی الوسع بچا کر کمرے کی روشنیاں اس طرح سیٹ کی ہوئی تھیں کہ میں صرف اس کا کوٹ... بلکہ اوور کوٹ، خم دار ناک اور موٹے شیشوں والا چشمہ ہی دیکھ سکوں... اور یہ سب چیزیں مصنوعی بھی ہو سکتی تھیں۔

”اس کے علاوہ ذرا خواب والے قصے پر غور کیجیے۔ کسی کے پاس بھی کیا ثبوت ہے کہ اظفر عالم کو واقعی ایسے بھیا تک خواب نظر آیا کرتے تھے۔ صرف اور صرف اکتیس دسمبر کے دن مجھ سے ملاقات کرنے والے اظفر عالم کا بیان... چنانچہ یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ شاید یہ سارا سلسلہ ہی فراڈ تھا اور اس فراڈ میں دو افراد شریک تھے... ایک...“ انہوں نے تجسس پھیلانے کے لیے خاموشی اختیار کی اور سب کے چہروں کو دیکھا۔ ان کی گفتگو نے دو چہروں کا رنگ تبدیل کر دیا تھا۔ ”مسز اظفر عالم اور دوسرا اظفر عالم کا سیکریٹری محمد آصف...!“

”کیا بکو اس ہے؟“ زرینہ نے چلا کر کہا اور اپنی جگہ سے اٹھنے کی کوشش کی جسے انسپکٹر علی رضا نے ناکام بنا دیا۔ ”آپ مقصودی صاحب کی پوری بات سن لیں۔“ اس نے ملائمت سے کہا۔ ”یہ بہت اچھے کہانی نویس ہیں اور ڈراما نگار ہیں۔“

”مگر یہاں کہانیوں اور ڈراموں کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ زرینہ نے آپے سے باہر ہونے کی اداکاری کی۔ ”یہ اپنی کہانیاں اور ڈرامے اپنے قارئین اور ناظرین کو پڑھائیں اور دکھائیں۔“

”آپ سکون سے تشریف رکھیں اور ہمیں ان کی کہانی سننے دیں۔“ کامران نے بھی اسے مخاطب کر کے کہا۔ ”ورنہ ممکن ہے کہ بقیہ کہانی آپ کو ہتھکڑیوں کے ساتھ سنبھائی پڑ جائے۔“

اس نے منہ سے کچھ نہیں کہا اور کامران کو بُری طرح

گھورتے ہوئے اپنی کرسی پر بیٹھ گئی۔

”ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ اس فراڈ میں دو افراد شریک تھے۔“ مقصودی صاحب نے اپنی گفتگو جاری رکھی۔ ”آصف نے اظفر عالم کی طرف سے مجھے خط لکھا اور میری آمد کے دن اپنے باس سے چھٹی لے کر بظاہر یہاں سے رخصت ہو گیا مگر وہ کسی طریقے سے واپس اس دفتر میں آیا اور پھر خم دار ناک، موٹے شیشوں کی عینک جو یقیناً اظفر صاحب کی ہی رہی ہوگی اور ایک اوور کوٹ پہن کر اپنے کمرے میں بیٹھ گیا۔ اس سے پہلے وہ گارڈ کو یہ ہدایت کر چکا تھا کہ اظفر عالم اپنے مہمان سے اس کے کمرے میں ملاقات کریں گے۔

”اس ڈرامے کا دوسرا حصہ آج مکمل ہوا ہے۔ آصف کسی اچھے موقع کے لیے سخت بے تاب تھا اور آج دو غیر ملکی مہمانوں کی دفتری اوقات کے بعد ملاقات کے پروگرام نے اسے یہ موقع فراہم کر دیا۔ اظفر عالم کی انتظار گاہ میں دو غیر ملکی مہمان ملاقات کے لیے منتظر تھے جو بعد میں حلف اٹھا کر یہ بتاتے کہ اظفر عالم کے کمرے میں کوئی شخص نہیں گیا تھا۔

”اسے علم تھا کہ اظفر عالم کے کمرے کی کھڑکی کھلی رہتی ہے اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ پڑوس کی فیکٹری میں کنکریٹ مکسر کی گڑ گڑاہٹ کے باعث گولی چلنے کی آواز کوئی نہیں سن سکے گا۔ اس نے اپنے کمرے کی کھڑکی کھولی اور جب غیر ملکی مہمان اظفر عالم سے ملاقات کے انتظار میں تھے، اس نے اظفر عالم کی کھڑکی میں کوئی شے رکھ دی۔ اسے علم تھا کہ اظفر عالم اس شے کو دیکھتے یہ بے چین ہو جائے گا اور کھڑکی میں آئے گا۔

”اور ایسا ہی ہوا۔ جونہی اظفر عالم کھڑکی میں آیا اور باہر جھانکنے کے لیے ذرا سا جھکا، آصف نے اپنے کھڑکی میں کھڑے کھڑے ہاتھ بڑھایا اور اس کی کینٹی میں گولی مار دی۔ دونوں کھڑکیوں کے دوسری طرف واقع فیکٹری والی دیوار میں کوئی کھڑکی یا روشن دان نہیں ہے اس لیے وہاں سے اس کا ردائی کو کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔

”آصف... اظفر عالم کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد آدھے گھنٹے تک اپنے کمرے میں ہی رہتا ہے اور پھر یونہی باہر نکل آنے کی اداکاری کرتے ہوئے انتظار گاہ میں موجود مہمانوں کو وہاں دیکھ کر حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کمرے میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس موقع پر اس کی جیب میں ریوالور بھی موجود تھا۔ وہ اندر آیا اور اس

ریوالور پر اظفر عالم کی انگلیوں کے نشانات ثبت کر کے اسے وہیں ڈال دیا اور باہر نکل کر شور مچانے لگا کہ اظفر صاحب نے خودکشی کر لی۔ اس کے علاوہ اس موقع پر اس نے مجھے لکھا گیا خط اظفر عالم کے کاغذات میں شامل کر دیا تھا تا کہ جب وہ برآمد ہو تو مجھے بلایا جائے اور میں یہ بتاؤں کہ اسے بھیا تک خواب آرہے تھے جن کے باعث وہ نفسیاتی طور پر الجھا ہوا تھا، اسی دباؤ کے تحت اس نے خودکشی کر لی۔“

”لیکن سارے قصے میں زرینہ کہاں ہے؟“
کامران نے مداخلت کرتے ہوئے پوچھا۔

”مسز اظفر عالم اس قصے میں کہاں ہیں اور کیوں ہیں...؟ اس کا جواب تو یہ خود ہی دے سکتی ہیں مگر مجھے یہ پتا ہے کہ انہوں نے اظفر عالم کو بھیا تک خواب دکھائی دینے کی تصدیق کی تھی۔ اب انہوں نے یہ تصدیق کیوں کی؟ اس کی وضاحت ان سے ہی طلب کی جائے... اور ہاں، میری اس ساری کہانی کا ثبوت تمہیں آصف کے ہاتھوں کا پیرا فن ٹیسٹ کرانے سے مل جائے گا۔ جس میں اب تمہیں دیر نہیں کرنی چاہیے۔“ آخری جملہ انہوں نے انسپکٹر علی رضا سے مخاطب ہو کر کہا۔

”ہاں لیکن اس سے پہلے میں ذرا مسز اظفر عالم سے ان کا انٹرسٹ دریافت کر لوں۔“ انسپکٹر علی رضا نے کہا اور زرینہ کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔ ”جی... تم یہیں اپنی کہانی سناؤ گی یا پولیس اسٹیشن میں خوف ناک صورت حوالدار کی موجودگی میں...؟“

جواب میں اس نے کچھ نہیں کہا۔ خاموش بیٹھی سراسیمہ لگا ہوں سے مقصودی صاحب کو دیکھتی رہی۔

”ٹھیک ہے...“ علی رضا نے اس کی خاموشی کے پیش نظر ایک فیصلے پر پہنچتے ہوئے کہا۔ ”میں تم دونوں کو پولیس اسٹیشن روانہ کر رہا ہوں۔ وہاں سے ضابطے کی کارروائی کے بعد سیکریٹری صاحب کے ہاتھوں پر بارود کے ذرات تلاش کرالوں گا۔“

یہ کہہ کر اس نے اپنے اہلکاروں کو بلایا اور دونوں کو ہتھکڑی لگا کر لے جانے کا حکم دیا۔

”چلو جی... یہ قصہ تو نمٹ گیا۔“ ان دونوں کے چلے جانے کے بعد کامران نے گہرا سانس لے کر کہا۔ ”مگر یہ تو بتاؤ کہ تم نے اتنا درست نتیجہ کیسے اخذ کیا؟“

”اس کا جواب میں نیچے چل کر دوں گا۔“ مقصودی صاحب نے کہا اور اٹھ کر باہر کی طرف روانہ ہو گئے۔

لفٹ کے ذریعے گراؤنڈ فلور پر پہنچنے کے بعد ان کا رخ دائیں طرف ہو گیا جس کے آخر میں ایک دروازہ تھا۔ ڈاکٹر اجمل، ارجمند، انسپکٹر علی رضا اور کامران ان کے ساتھ تھے۔

وہ لوگ دروازے سے باہر نکلے تو انہوں نے خود کو ایک گلی نما جگہ میں پایا جس کے دوسری طرف برابر والی فیکٹری کی دیوار واقع تھی۔

مقصودی صاحب آگے بڑھے اور انہوں نے نیچے جھک کر ایک پلاسٹک کی بنی ہوئی سیاہ پٹی اٹھائی جو ہو بہو اصلی پٹی کی طرح تھی۔

”یہ وہ شے ہے جو آصف نے اپنے باس کے کمرے کی کھڑکی میں رکھی تھی۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ اظفر عالم کو جانوروں، خصوصاً بلی سے شدید نفرت ہے اور وہ بلی کو اپنی کھڑکی میں دیکھ کر اسے بھگانے کے لیے ضرور کھڑکی میں آئے گا اور اس کے بعد...“

”کمال ہے۔“ کامران نے ستائشی لہجے میں کہا۔ ”ایک معمولی سی کالی بلی نے اس کے کیے کرائے پر پانی پھیر دیا۔ اگر وہ یہ بلی بھی یہاں سے اٹھا لیتا تو اس کا منصوبہ کامیاب ہو جاتا۔“

”اور مجھے یقین ہے کہ یہ تمام منصوبہ اس نے زرینہ کی خواہش کے مطابق تیار کیا ہوگا۔ اسی نے اسے کوئی لالچ دیا ہوگا۔“ مقصودی صاحب نے اپنی بات مکمل کی۔ وہ سب واپس ہو گئے۔

دو دن بعد انسپکٹر علی رضا نے مقصودی صاحب کو فون کر کے بتایا کہ دونوں کے اعتراف جرم کے مطابق زرینہ، آصف سے شادی کرنا چاہتی تھی اور ان کا منصوبہ تھا کہ اظفر عالم سے کامیابی سے نجات پالینے کے بعد وہ ارجمند کو بھی کسی ایسے ہی طریقے سے موت کے گھاٹ اتار دیتے اور اس طرح اظفر عالم کا تمام کاروبار ان کے ہاتھ آ جاتا مگر افسوس کہ مقصودی صاحب کو لا کر ایک گواہ بنانے کے چکر میں آصف اپنی شامت کو آواز دے بیٹھا۔

وہ ایک کہانی کا کردار اپنی کہانی کا کردار بنانا چاہتا تھا مگر اسے یہ علم نہیں تھا کہ ایک سچا رائٹر وہ ہوتا ہے جو خود کسی کہانی کا کردار نہیں بننا بلکہ کردار اس کی مرضی کے مطابق چلتے پھرتے اور اپنے کام انجام دیتے ہیں۔

مقصودی صاحب کو خوشی ہوئی کہ اب ارجمند اپنی مرضی سے اپنی پسند کے نو جوان سے شادی کر سکے گی۔

ارض فرض قرض

سریم کے حنان

بدنیتی اور جھوٹ بولنا کوئی اضطرابی غلطی ہے نہ اتفاقی حادثہ... یہ تو کردار کی خاصیت ہوتی ہے جس کی جڑیں گہری بھی ہوسکتی ہیں... یہ روح کے کھیت میں اگنے والی ایک انتہائی خطرناک گھاس ہے... اگر اسے ابتدا میں ہی اکھاڑا نہ جائے تو یہ بڑھ کر پورے کھیت کو گھیر لیتی ہے اور اتنی جگہ باقی نہیں رہتی ہے کہ اچھے بیجوں کے پھول پھوٹ سکیں... ایک ایسے ہی شخص کی بد خصلتی اور بددیانتی کا ماجرا... جو سر سے پاٹوں تک جھوٹ اور فریب کا لبادہ اوڑھے اپنے عزائم کے لیے زندہ تھا۔

ایک انجانے شخص کی دوستی اور شناسا کی دشمنی کا سنسنی خیز فسانہ

طرف سے مکان پر دھاوا بول دیا۔ منشیات فروشوں نے جواب دیا اور دونوں طرف سے ہتھیاروں کے دہانے کھل گئے۔ مگر فورس والے زیادہ منظم تھے۔ انہوں نے دس منٹ میں سب پر قابو پا لیا۔ اس کے بعد چھپ جانے والوں اور فرار ہونے والوں کی تلاش شروع ہوئی۔ کال سننے والا اس آپریشن کی کمانڈ کر رہا تھا اور وہ فرار ہونے والوں کے پیچھے تھا۔ اس نے دو افراد کو دیکھ لیا تھا جو ٹیلوں کی آڑ لیتے ہوئے فرار ہو رہے تھے۔ وہ ان کے پیچھے لگا رہا اور جیسے ہی ایک شخص نشانے پر آیا، اسے مار گرایا۔ اس نے پیروں کا نشانہ لیا تھا۔ دوسرا بھاگا تو گرنے والے نے اسے پکارا۔ ”مجھے بھی لے کر جاؤ۔“

اس نے مڑ کر کہا۔ ”میں تمہیں نہیں لے جاسکتا۔“ وہ دوسرے کو بھی نشانہ بنانے جا رہا تھا لیکن جیسے ہی اس کی آواز سنی، اس کی انگلی ٹریگر پر نرم پڑ گئی اور دوسرا غائب ہو گیا۔ اس آپریشن میں ایک بڑے منشیات فروش

وہ موبائل کان سے لگائے سن رہا تھا۔ دوسری طرف سے کوئی شخص دھیمی آواز میں کہہ رہا تھا۔ ”اسی سڑک پر آگے جاؤ گے تو ایک چھوٹا ڈیرا ہے۔ اس کے پیچھے ٹیلے اور کھائیاں ہیں۔ پرسوں رات آٹھ بجے وہاں منشیات کی بہت بڑی کھپ آئے گی۔ تمام اہم لوگ بھی ہوں گے۔“ ”تم یہ سب کیوں بتا رہے ہو؟“ سننے والے نے پوچھا۔

”میں ان موت کے سوداگروں کو تباہ کرنا چاہتا ہوں۔“ دھیمی آواز والے نے کہا اور کال منقطع کر دی۔ دو دن بعد رات آٹھ بجے اینٹی نارکوٹکس فورس نے دارالحکومت کے نواحی علاقے میں اس مکان کو گھیرے میں لے لیا۔ ٹھیک آٹھ بجے ایک عام سی پک آپ مکان میں داخل ہوئی۔ بظاہر اس پرانڈوں کے کریٹ لدے ہوئے تھے۔ پک آپ کے مکان میں داخل ہوتے ہی اینٹی نارکوٹکس فورس کے اراکین حرکت میں آ گئے۔ انہوں نے چاروں

نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔

”اب دیکھنا اس کے ساتھ کیا ہوتا ہے؟“

”سوچ لو استاد... کہیں پھر وہی بانیک والا درمیان میں نہ آجائے۔“ پرویز نے کہا تو بالاجی کچھ فکر مند ہوا پھر اس نے بے پروائی سے کہا۔

”دیکھا جائے گا پر اسے چھوڑنا نہیں ہے۔“

☆☆☆

وہ ہاتھ سے اپنا پیٹ دبائے آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کا ہاتھ خون آلود ہو رہا تھا اور خون نیچے بھی ٹپک رہا تھا۔ آدھے گھنٹے پہلے وہ ایک گندی گلی میں مدہوش پڑا تھا۔ جس نے اسے ہواؤں میں اڑایا تھا۔ اسے نہ سردی کا احساس تھا اور نہ آس پاس کا پتا تھا۔ پھر پتا نہیں کیا ہوا، اچانک ہنگامہ ہوا اور کچھ شور شرابے کے بعد گولیاں چلیں۔ اسے جھٹکا لگا تو وہ چونکا۔ تکلیف کا احساس نہیں تھا مگر اسے لگا تھا کہ اس کے پیٹ پر کوئی چیز لگی ہے۔ اس نے ہاتھ لگا یا تو وہ خون سے بھر گیا۔ وہ چونک کر اٹھا۔ اس نے اپنی میلی گرم شرٹ اوپر کی۔ پیٹ پر چلی پھلی والی جگہ سوراخ تھا جس سے رہ رہ کر خون ابل رہا تھا۔ یہ گولی کا نشان تھا۔ وہ بے ساختہ کھڑا ہو گیا اور زخم ہاتھ سے دبایا۔ وہ کسی قدر طویل قد اور مضبوط جسامت کا جوان شخص تھا۔ اس کی صحت سے لگ رہا تھا کہ اسے نشہ شروع کیے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا ہے۔ خوش روئی اور صاف رنگت نشے اور صفائی سے بے پروائی نے دبا دی تھی۔ بڑھی ہوئی شیو اور بال گندے اور الجھے ہوئے تھے۔ اس کے جسم پر ایک معمولی ٹراؤزر کے ساتھ پوری آستین کی گرم جرسی تھی۔ پیروں میں کیونوس شوز تھے اور تمام چیزیں نہایت گندی اور خستہ حال ہو رہی تھیں۔

پولیس سائرن گونجا تو دوسرے نشے بازوں کی طرح وہ بھی وہاں سے نکل گیا۔ اسے اب بھی نہیں معلوم تھا کہ وہاں ہوا کیا تھا۔ گولیاں کس نے چلائی تھیں، کون شکار ہوا تھا اور کس کی چلائی گولی راہ بھٹک کر اس کے جسم میں اتر گئی تھی۔ وہ زخم دبائے آگے بڑھتا رہا۔ گولی کا زخم اس کے لیے نیا نہیں تھا اور وہ اب تک ہوش و حواس میں تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ گولی کسی نازک جگہ نہیں لگی تھی۔ خون رشنا بھی کم ہو گیا تھا مگر گولی کا زخم خطرناک ہو سکتا تھا۔ اگر اسے نہ نکالا جاتا تو اس کا زہر پھیل سکتا تھا۔ پر وہ کہاں جاتا؟ اگر کسی اسپتال یا ڈاکٹر کا رخ کرتا تو وہ سب سے پہلے پولیس کو اطلاع کرتے اور وہ پولیس سے دور رہنا چاہتا تھا۔ اس وقت اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا اور سب سے پہلے وہ اس جگہ

سے نکلنا چاہتا تھا۔ وہ زخم دبائے چلتا رہا۔ کیونکہ شرٹ سیاہ رنگ کی تھی اس لیے صرف اس کے ہاتھ سے پتا چل رہا تھا کہ خون رس رہا ہے۔ سامنے سے کوئی آتا تو وہ دوسرا ہاتھ رکھ لیتا تا کہ خون نظر نہ آئے۔ اسی طرح چلتے ہوئے وہ اس آبادی میں داخل ہوا۔

یہاں مکان چھوٹے تھے لیکن بہت پوش انداز میں بنے تھے۔ مکانات کے باہر اور اندر گاڑیاں تھیں۔ گلیوں میں سناٹا تھا اور اکاؤکا لوگ آتے جاتے نظر آ رہے تھے۔ وہ مکانوں کی آخری قطار کے سامنے کھڑا تھا، اس کے بعد جنگل تھا۔ یہ دارالحکومت کا علاقہ تھا۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے پہلے مکان کی طرف بڑھا۔ اس کے فولادی گیٹ سے ٹیک لگا کر وہ گہرے سانس لینے لگا۔ اچانک گلی کے دوسرے سرے پر ایک پولیس وین نمودار ہوئی۔ وہ عجلت میں گیٹ پر چڑھا اور اندر کود گیا۔ پولیس سے بچنے کے چکر میں اسے خیال نہیں آیا کہ کوئی اندر ہوا تو وہ پکڑا جائے گا مگر اندر کوئی نہیں تھا۔ ایک چھوٹی سفید کار کھڑی تھی اور اس کے ساتھ ایک بانیک تھی۔ پورچ کے ساتھ ایک گیلری تھی جو مکان کے پیچھے تک گئی تھی۔ سامنے والا دروازہ اندر سے بند تھا۔ وہ گیلری میں آیا اور اس طرف کھلنے والی کھڑکیاں چیک کرنے لگا مگر وہ سب اندر سے بند تھیں۔ یہ سب شیشے اور المونیم پٹی کی بنی مضبوط کھڑکیاں تھیں جنہیں توڑنا مشکل تھا۔ اگر وہ کوشش کرتا تو بہت شور ہوتا۔ وہ عقب میں جنگل والی طرف آیا۔ یہاں اتفاق سے ایک کھڑکی کھلی مل گئی۔ اس نے پٹ سرکا یا اور اندر داخل ہو گیا۔ اس دوران میں اسے خاصی حد تک یقین ہو گیا تھا کہ مکان خالی ہے۔

مکان سچ سچ خالی تھا۔ اس کے مکین کہیں گئے ہوئے تھے۔ وہ یہ سوچ کر اندر آیا تھا کہ یہاں اسے مرہم پٹی کا سامان مل جائے۔ شاید کوئی دوا بھی کیونکہ اب زخم تکلیف دینے لگا تھا۔ وہ بیڈروم میں داخل ہوا۔ یہاں بیڈ تو ڈبل تھا مگر ڈریسنگ ٹیبل زنانہ استعمال کی چیزوں سے خالی تھی۔ الماری میں مردانہ کپڑے تھے اور ایک ہی سائز کے تھے۔ اسی طرح نچلے حصے میں جوتے بھی ایک سائز کے تھے۔ بیڈ روم کے ساتھ بڑا سا ہاتھ روم تھا۔ وہ باہر آیا۔ بیڈ روم کے بعد لاؤنج تھا جس میں گیلری والی طرف اوپن کچن تھا جس کی کھڑکیاں اور ایک دروازہ گیلری کی طرف کھل رہے تھے۔ اس سے آگے نشست گاہ تھی جس کا دروازہ پورچ کی طرف کھل رہا تھا۔ لاؤنج کے دوسری طرف سے سیڑھی اوپر جا رہی تھی اور اس کے نیچے ایک سیڑھی تھی جو یقیناً تہ خانے کی

طرف جا رہی تھی۔ مکان سے زیادہ وہ کسی کے ہونے یا نہ ہونے کا جائزہ لے رہا تھا۔ پورا مکان دیکھنے کے بعد اسے اطمینان ہوا کہ یہاں کوئی نہیں ہے۔ شدید سرد موسم میں بھی اسے شدت کی پیاس لگ رہی تھی۔ اس نے کچن کے تل سے پانی لے کر اپنی پیاس بجھائی۔

وہ واپس بیڈ روم میں آیا اور باتھ روم کا جائزہ لیا۔ وہاں بڑے سے شیشے کے پیچھے خانے میں طبی امداد کا مکمل سامان موجود تھا۔ ایک چھوٹا سا سرجیکل اوزاروں کا باکس بھی تھا۔ گھر حیران ہوا، یہاں رہنے والے شخص نے سب رکھا ہوا تھا۔ اس نے باتھ روم میں لگا ہوا انسٹنٹ الیکٹرک گیزر آن کیا اور مگ میں گرم پانی نکالا۔ پھر اس میں ڈیول ملا کر اس نے اپنی شرٹ اتاری۔ ایک لمحے کو وہ سردی سے لرز اٹھا۔ سردی کم کرنے کے لیے اس نے ٹب میں گرم پانی کھول دیا۔ اس سے بھاپ اٹھی تو باتھ روم گرم ہونے لگا۔ کچھ دیر بعد سردی کا احساس کم ہو گیا۔ اس نے آئینے میں اپنے زخم کا جائزہ لیا مگر آئینہ بھاپ سے دھندلانے لگا۔ اس نے تل بند کیا اور ڈبے سے روئی نکال کر اسے بھگو کر زخم صاف کرنے لگا۔ اس بار ایسی تکلیف ہوئی کہ اس کی کراہیں نکل گئیں۔ مگر اصل تکلیف تو ابھی ہونی تھی۔ زخم صاف کر کے اس نے ایک چھوٹا آئینہ لیا پھر ایک چمٹی نما آلہ ڈیول والے پانی سے صاف کر کے اس نے اسے زخم میں داخل کیا۔ اس بار اذیت ایسی تھی کہ وہ چیخ اٹھا۔

مگر وہ رکا نہیں، شدید تکلیف کے باوجود وہ چمٹی سے زخم کرید کرید کر گولی تلاش کرتا رہا۔ اسے امید تھی کہ گولی زیادہ اندر نہیں ہوگی اور آسانی سے مل جائے گی۔ چمٹی لگنے سے زخم کھلا تو پھر خون بہنے لگا مگر وہ اس کی اور تکلیف کی پروا کیے بغیر اپنا کام کرتا رہا۔ بالآخر اس نے گولی تلاش کر لی۔ اسے گرفت میں لیا اور کھینچ کر نکالا تو ایسا درد ہوا کہ پھر اسے ہوش نہیں رہا۔ مگر بے ہوشی کا یہ دورانیہ زیادہ طویل نہیں تھا۔ وہ ہوش میں آیا تو فرش پر ٹیسن سے ٹیک لگائے پڑا تھا اور خون بہنا کم ہو گیا تھا۔ اس نے صاف روئی لے کر اسے زخم پر رکھ کر زخم دبایا۔ ایک منٹ میں روئی پوری طرح بھیگ گئی۔ وہ بار بار روئی بدلتا رہا حتیٰ کہ خون بہنا بند ہو گیا۔ اس دوران میں ٹب کا پانی بھی سرد ہو گیا تھا۔ باتھ روم ٹھنڈا ہونے سے بھی خون رکنے میں مدد ملی تھی۔ آخری بار زخم صاف کر کے اس نے دواؤں کے باکس سے زخم خشک کرنے والا جراثیم کش پاؤڈر نکال کر زخم میں بھرا اور اوپر سے چکنی پٹی رکھ کر اسے ٹیپ کر دیا۔

اس کا ٹراؤزر بھی خون سے بھیگ گیا تھا۔ اس نے ٹراؤزر بھی اتارا اور گرم پانی لے کر اسٹینج سے جسم صاف کیا۔ باہر آ کر اس نے الماری سے ایک ٹراؤزر اور گرم ٹی شرٹ نکال کر پہنی۔ دونوں چیزیں اس کے ٹاپ کی تھیں۔ اب اسے بھوک لگ رہی تھی۔ وہ کچن میں آیا۔ فریج میں دودھ کے بند ڈبے رکھے تھے۔ اس نے ایک ڈبا نکال کر گرم ہونے کے لیے رکھا۔ جب دودھ مناسب گرم ہو گیا تو اس میں تین کپے انڈے توڑ کر ڈالے اور پی گیا۔ یہ بہت طاقتور غذا تھی اور اسے اس وقت ایسی ہی غذا کی ضرورت تھی۔ پھر اس نے دواؤں کے باکس کا جائزہ لیا۔ اس میں اینٹی بائیوٹک کپسول بھی تھے مگر اس نے انجکشن کو ترجیح دی۔ بازو پر پٹی باندھ کر اس نے انس میں انجکشن لگایا۔ دوسرا انجکشن پین کٹر تھا۔ اس کے بعد وہ کمرے کے کمرے میں گھومنے لگا۔

☆☆☆

وہ بہت سے لوگ تھے، روتے سکتے اور کراہتے لوگ... چھتھروں میں نمایاں پسلیوں اور اندر دھنسی آنکھوں والے لوگ... وہ خود کو نوچ رہے تھے... کراہتی آوازوں میں کچھ مانگ رہے تھے... ان کے ہاتھ پیر اور چہرے زخمی تھے۔ وہ میل کی تہوں سے ڈھکے ہوئے تھے... بدبو کے بھکے اڑاتے مگر انہیں اپنی گندگی اور بدبو کا احساس بھی نہیں تھا۔ وہ ان کے درمیان گھوم رہا تھا۔ وہ رحم طلب نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ اس کی طرف مدد کے لیے ہاتھ بڑھاتے مگر وہ پیچھے ہوجاتا۔ پھر اسے ایک نو عمر لڑکا گھٹنوں میں سر دیے نظر آیا۔ وہ اس کی طرف بڑھا۔ اس نے لڑکے کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ اس نے سر اٹھایا۔ وہ دوسروں سے مختلف نہیں تھا۔ اس کے باوجود وہ لڑکھڑا گیا، وہ بے چین ہو گیا۔ لڑکا اس کا بھائی تھا۔ اس دنیا میں اس کا واحد خون کا رشتہ۔ لڑکے نے منہ کھولا تو اچانک اس کے منہ سے خون ابل پڑا... وہ چلا یا... بھائی... نہیں۔ اس نے چلا کر کہا۔

☆☆☆

”نہیں۔“ اس کے منہ سے نکلا اور وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اس نے وحشت زدہ نظروں سے چاروں طرف دیکھا اور اسے کسی قدر تاخیر سے یاد آیا کہ وہ کہاں؟ باہر دن کی روشنی پھیل چکی تھی۔ اسے شدید بھوک محسوس ہو رہی تھی کیونکہ وہ کل کا باقی دن اور گزشتہ رات سوتا رہا تھا۔ اس نے گھڑی کی طرف دیکھا، صبح کے دس بج رہے تھے۔ وہ اکیس گھنٹے سویا تھا۔ اسے حیرت ہوئی کہ اس دوران میں

میں ضرورت کے چند ایک برتن تھے اور فرنج میں صرف فوری استعمال کی خوراک تھی۔ اسے کوئی ایسی چیز نظر نہیں آئی جسے باقاعدہ پکا کر کھا سکے۔

ایسا لگ رہا تھا کہ یہاں ایک ہی شخص رہتا تھا اور وہ بھی زیادہ تر باہر سے کھانا کھاتا تھا۔ چائے پی کر اس نے اینٹی بائیوٹک کپسول اور دو پینا ڈول لے لیں۔ اب انجکشن کی ضرورت نہیں تھی۔ پھر اس نے بیڈ روم کا معائنہ کیا۔ ڈریسنگ ٹیبل پر ایک فوٹو فریم میں تصویر تھی۔ اس نے اٹھا کر دیکھا، ایک نوجوان اور تقریباً اس کی جسامت کا شخص دو عورتوں کے درمیان کھڑا تھا۔ ایک بوڑھی تھی اور دوسری جوان تھی۔ تینوں کی شکلوں کی مماثلت بتا رہی تھی کہ وہ ایک خاندان تھے۔ مرد یقیناً ان عورتوں کا بیٹا اور بھائی تھا۔ شاید وہی اس مکان میں رہتا تھا مگر یہ عورتیں کہیں اور رہتی تھیں۔ تصویر کے پس منظر میں کھلا علاقہ اور دور پہاڑیاں بتا رہی تھیں کہ یہ شہر سے دور کوئی جگہ تھی۔ اس نے فریم اپنی جگہ رکھ کر درازوں کو چیک کیا۔ پہلی دراز میں ایک موبائل فون اور ایک مردانہ پرس بھی تھا۔

پرس میں تقریباً ڈھائی ہزار کی رقم تھی۔ ایک ڈیٹ کارڈ بھی تھا لیکن اہم چیز ڈرائیونگ لائسنس اور شناختی کارڈ تھا۔ یہ دونوں چیزیں کسی عابد الرحمن کی تھیں۔ ان پر لگی تصویر اسی شخص کی تھی جو فوٹو فریم میں بھی تھا۔ اس نے پرس اور اس کی چیزیں واپس دراز میں ڈال دیں اور موبائل لے کر بیڈ پر دراز ہو گیا۔ یہ نیا ٹچ اسکرین موبائل تھا اور اس وقت بند تھا۔ اس نے آن کیا تو چند لمحوں بعد اسکرین پر وال پیپر نمودار ہوا۔ یہ ایک لڑکی کی تصویر تھی جس نے انگلیوں میں ایک کارتوس دیا رکھا تھا اور حیران ہونے والے انداز میں اسے دیکھ رہی تھی۔ پس منظر سے لگ رہا تھا کہ وہ کسی ریسٹوران میں ہے۔ لڑکی کے نقوش ہنکے اور رنگت سرخی مائل سفید تھی۔ اسے بہت خوب صورت تو نہیں کہا جاسکتا تھا لیکن اس میں ایک خاص کشش تھی۔ اسی اثنا میں ایس ایم ایس آنے لگے۔ اس نے پہلا ایس ایم ایس کھولا۔ اس پر نام عالی لکھا ہوا تھا۔ اس میں تحریر تھا۔ ”عابد آپ کہاں ہیں... میرا دل بہت گھبرا رہا ہے۔“

یہ ایس ایم ایس کل صبح کیا گیا تھا۔ پھر ایک ایس ایم ایس کل شام چھ بجے کا تھا اور اس میں بھی عابد کے بارے میں تشویش تھی۔ گویا اس مکان کا مالک کل صبح سے پہلے سے ہی کہیں گیا ہوا تھا اور اپنا موبائل گھر رکھ کر گیا تھا۔ صرف موبائل نہیں، وہ اپنا پرس اور تمام شناختی کاغذات بھی گھر

اسے چرس کی طلب کیوں نہیں ہوئی۔ اس نے اٹھ کر دوبارہ گرم دودھ میں کچے انڈے ڈال کر پیٹ بھرا۔ پھر وہ باتھ روم میں آیا۔ اس نے پٹی ہٹا کر اپنے زخم کا معائنہ کیا۔ اس میں درد تھا اور کناروں پر کسی قدر سوجن تھی مگر زخم خشک ہو رہا تھا اور اس کا منہ بھی چھوٹا ہو گیا تھا۔ پٹی پر رسنے والا خون لگ گیا تھا۔ اس نے دوبارہ پاؤڈر چھڑک کر دوسری پٹی رکھی اور ٹیپ کر دیا۔

پھر اس نے منہ ہاتھ دھویا۔ زخم کی رفوگری کے دوران ہاتھ روم میں خاصی کندگی ہوئی تھی۔ اس نے دیکھا اور صفائی میں لگ گیا۔ اس نے اپنے کپڑے، خون آلود روٹی، پٹیاں، خالی انجکشن اور سرنجیں ایک شاپر میں ڈالیں۔ پھر اس نے پانی اور ڈسٹر جنٹ کی مدد سے ہاتھ روم صاف کیا۔ اس ذرا سی محنت سے وہ تھک گیا اور زخم میں درد ہونے لگا۔ وہ واپس کچن میں آیا۔ فرنج میں ایک بڑی ڈبل روٹی اور مکھن کا ڈبا بھی تھا۔ اس نے چائے کا پانی رکھا۔ چائے کا سامان سامنے ہی رکھا تھا۔ جب تک چائے تیار ہوئی۔ اس نے ڈبل روٹی پر مکھن لگا کر کھایا۔ چائے تیار ہوئی تو وہ چائے کا گگ لے کر مکان کا معائنہ کرنے لگا۔ جس وقت وہ سونے کے لیے لیٹا تھا تو اسے خیال بھی نہیں آیا کہ گھر کا مالک کسی وقت بھی آسکتا ہے۔ مگر جاگنے کے بعد اسے احساس ہوا کہ ایسا کچھ نہیں ہوا ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ مالک مکان شہر میں نہیں تھا یا کسی کام سے ابھی تک باہر تھا۔

اس نے نشست گاہ والے دروازے سے باہر نکل کر دیکھا تو گیٹ کا چھوٹا دروازہ اندر سے بند تھا جبکہ بڑے والے گیٹ پر پاہر تالا پڑا تھا۔ پورچ میں کار اور موٹر سائیکل کے علاوہ کسی تیسری سواری کی گنجائش نہیں تھی۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ کار اور موٹر سائیکل مکان میں ہونے کا مطلب تھا کہ مالک شہر سے باہر ہی گیا ہوا تھا ورنہ ان میں سے کوئی سواری تو لے جاتا۔ وہ واپس اندر آیا۔ اس نے سوچ لیا اگر مالک اچانک بھی آیا تو وہ نشست گاہ سے اندر آئے گا اور وہ کچن والے دروازے سے گیلری میں آئے گا اور چھوٹے گیٹ سے باہر نکل جائے گا۔ اس نے مکان کا پھر معائنہ کیا۔ نشست گاہ اور لاؤنج سادہ فرنیچر سے سجا ہوا تھا۔ نشست گاہ میں فرش کے قالین کے ساتھ ایک فائبرسٹر صوفہ اور گلاس ٹاپ سینئر ٹیبل تھی۔ اسی کے ساتھ کی ایک سیٹھی تھی۔ لاؤنج میں چار افراد کے لیے ڈائنگ ٹیبل تھی۔ یہ شیشے اور دھات کی تھی۔ اسی طرح کچن

چھوڑ کر گیا تھا۔ تیسرا ایس ایم ایس کسی قاریہ کی طرف سے تھا۔ اس نے لکھا تھا۔ ”بھائی آپ کہاں ہیں ہم بہت پریشان ہیں۔ کل کچھ لوگوں نے ہمارے گھر میں گھسنے کی کوشش کی جب ٹائیگر نے انہیں روکا تو انہوں نے اسے گولی مار کر زخمی کر دیا۔ بھائی، امی بہت رو رہی ہیں۔ آپ کا نمبر بند جا رہا ہے... پلیز ہم سے رابطہ کریں۔“

اس نے سوچا اور دوبارہ موبائل آف کر دیا۔ عالی کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ اس کا عابد الرحمن سے ایسا رشتہ نہیں تھا کہ وہ اسے کسی خاص انداز میں مخاطب کرتی جبکہ قاریہ نے اسے بھائی کہا تھا۔ اس نے جو بتایا تھا، وہ عابد الرحمن کے لیے خاصا تشویش ناک ہونا چاہیے تھا مگر وہ خود غائب تھا۔ وہ لینا ہوا تھا اور لینے لینے ہی سو گیا۔ گزشتہ روز اس کا خاصا خون ضائع ہوا تھا اور یقیناً وہ کمزوری محسوس کر رہا تھا ورنہ اتنی دیر تک سونے کے بعد دوبارہ نیند نہ آتی۔

☆☆☆

یہ پہاڑ پر بنا ہوا خوب صورت لیکن کسی قدیر پرانے طرز کا مکان تھا۔ زمین چار کنال سے زیادہ تھی۔ اس پہاڑی قصبے میں یہ سب سے اوپر کی جگہ تھی۔ مکان کے سامنے والی زمین کسی قدر ڈھلان میں تھی لیکن دائیں طرف کی زمین زیادہ ڈھلان میں جا رہی تھی۔ اس پر سیب، انار، آڑو اور لوکاٹ کے درختوں پر مستمل چھوٹا سا باغ تھا۔ مکان کے سامنے والے حصے میں برآمدے کے ساتھ انگور کی بہت بڑی ٹیل تھی مگر اس وقت سردی کی وجہ سے سبزہ مر چھایا ہوا تھا۔ گیٹ سے دس گز کا ڈرائیو دے تھا پھر مکان کا برآمدہ تھا۔ بائیں طرف ایک چھوٹی سی گلی تھی جو مکان کے پچھلے صحن تک جاتی تھی۔ برآمدے میں ایک بوڑھا شخص رانفل لیے موجود تھا۔ اندر کا دروازہ کھلا اور ایک لڑکی باہر آئی۔ وہ قاریہ تھی۔ اس نے آدمی سے کہا۔ ”رفیق بابا! ٹائیگر کا زخم کیسا ہے؟“

”میرے ساتھ آئیے بی بی۔“ رفیق نے کہا اور اسے لے کر عقبی صحن میں بنی ایک چھوٹی سی کوٹھری میں آیا جہاں ڈوبرمین نسل کا کتا پرانی رضائی میں لیٹا لینا ہوا تھا۔ سر سے پاؤں تک ڈارک براؤن رنگ کے اس کتے کے کان نکیلے اور آنکھیں پھلی تھیں۔ اس کی پچھلی ٹانگ کے اوپری حصے میں کسی تیز دھار آلے کا زخم تھا اور کتا اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہو پا رہا تھا۔ گزشتہ رات کچھ افراد نے ان کے گھر میں گھسنے کی کوشش کی تھی لیکن ٹائیگر نے ان کی کوشش ناکام بنا دی۔ البتہ وہ قادر کتا خود شدید زخمی ہو گیا تھا۔ نصف رات

کے بعد کتے کے بھونکنے کی آواز نے سب کو جگادیا تھا۔ رفیق اس کوٹھری کے ساتھ والے کمرے میں سوتا تھا۔ وہ گزشتہ تیس برس سے اس گھر میں ملازم چلا آ رہا تھا۔ وہ باہر آیا، اس کے پاس رانفل تھی اور اس نے چند ہوائی فائر کیے۔ اس لیے بھی حملہ آوروں نے بھاگ نکلنے میں عافیت سمجھی ہوگی۔ قاریہ اور ماں کی آنکھ بھی کھل گئی تھی۔ قاریہ اندر سے پوچھ رہی تھی لیکن رفیق نے اسے باہر آنے سے منع کیا تھا۔ جب رفیق نے تمام جگہوں کو دیکھ لیا تو اس نے قاریہ کو بتایا۔ وہ ٹائیگر کے زخمی ہونے کا سن کر بے قرار ہو گئی۔ وہ چھوٹا سا پلا تھا جب عابد اسے گھر میں لایا تھا اور چھ سال میں وہ گھر کا ایک فرد بن گیا تھا۔ خاص طور سے قاریہ سے بہت ہلا ہوا تھا۔ قاریہ اور رفیق نے اس کے زخم کی صفائی کر کے مرہم لپ کیا۔ رفیق نے کہا۔

”بی بی کم سے کم ایک ہفتہ لگے گا اس کا زخم بھرنے میں۔“

یہ سن کر قاریہ فکر مند ہو گئی۔ ایک ہفتے پہلے عابد نے آخری بار رابطہ کیا تھا اور اس کے بعد اس کا موبائل مسلسل بند جا رہا تھا۔ کوئی اور نمبر نہیں تھا اور نہ ایسا جاننے والا تھا جو اسے عابد کے بارے میں بتاتا۔ قاریہ کو یقین تھا کہ گھر میں گھسنے کی کوشش کرنے والے قادر حیات کے آدمی تھے۔ قادر حیات ان کا رشتہ دار تھا۔ وہ قاریہ کے باپ عبید الرحمن کا چچا زاد بھائی تھا اور اس کی زمینیں ان کے گھر سے ملی ہوئی تھیں۔ وہ ان کے گھر اور زمین پر دعویٰ تو کئی سالوں سے کر رہا تھا مگر ایک سال پہلے اس نے کیس بھی کر دیا تھا۔ اس نے کچھ کچے پکے ثبوت بھی بنا لیے تھے اور ان کے مل پر کیس آگے گھسیٹ رہا تھا۔ عابد نے قاریہ اور ماں کو یقین دلایا تھا کہ وہ کسی صورت کیس نہیں جیت سکتا۔ اس طرح وہ ان پر دباؤ ڈال رہا ہے۔ قادر حیات نے انہیں قیمت کی پیشکش بھی کی تھی کہ وہ لیں اور زمین و مکان اس کے حوالے کر دیں۔ قیمت اگرچہ اچھی تھی مگر ان کے مکان اور زمین کی ویلیو سے کم تھی۔ جب سے ان کا قصبہ مرکزی شاہراہ پر آیا تھا، یہاں زمین اور جائیدادوں کی قیمتیں آسمان سے باتیں کرنے لگی تھیں۔ کیونکہ ان کی زمین سب سے اوپر تھی اس لیے اس کی قیمت بھی سب سے زیادہ تھی۔

قادر حیات مکار اور موقع پرست تھا۔ اس نے پہلے جوڑ توڑ کر کے اپنے سگے بہن بھائیوں کے حصے پر قبضہ کیا اور قصبے کا سب سے بڑا لینڈ لارڈ بن گیا۔ کیونکہ اس کی زمین ان کے مکان سے ملی ہوئی تھی اس لیے اب اس کی نظر اس پر

ارض، فرض، قرض

تھے۔ اس نے خود کو آئینے میں دیکھا اور بولا۔ ”بیکار میں محنت کر رہے ہو، کل یا پرسوں تک تم ان چیزوں سے بھر بے نیاز ہو جاؤ گے۔“

اس نے منہ ہاتھ بھی دھویا۔ ٹھنڈے پانی نے اسے چوکس کر دیا تھا اور وہ جس کی طلب نظر انداز کر کے کچن میں آیا۔ اس نے چائے تیار کی اور پھر انڈوں اور پنیر کی مدد سے سینڈویچز تیار کرنے میں لگ گیا۔ ڈبل روٹی اتنی بڑی تھی کہ آرام سے کل تک بھی چل سکتی تھی، بشرطیکہ اسے کل تک یہاں رہنے کا موقع ملتا۔ چائے پینے سے جسم کے درد میں کمی آئی۔ اس نے دو سینڈویچز لیے تھے کہ اس کی بھوک مر گئی۔ باقی رکھ کر وہ واپس کمرے میں آیا اور اس بار اس نے الماری کی تلاشی لی۔ نکالا کچھ نہیں اور نہ ہی کوئی چیز اپنی جگہ سے ہٹائی مگر ایک ایک جگہ دیکھ لی۔ الماری کے اندر ایک لا کر تھا اور یہ دھات کا بنا ہوا تھا۔ اسے کھولنا یا توڑنا ممکن نہیں تھا۔ اس نے چابیاں تلاش کیں مگر وہاں کسی قسم کی کوئی چابی نہیں ملی۔ حد یہ کہ کار اور موٹر سائیکل کی چابی بھی نہیں تھی۔ جبکہ ان دونوں چیزوں کی چابیاں ہونی چاہیے تھیں۔ وہ کچھ سوچ کر نشست گاہ میں آیا۔ وہاں اسے کی ہولڈر پر کار اور موٹر سائیکل کی چابیاں مل گئیں۔

اسے کسی چیز کی تلاش نہیں تھی، وہ ہونے والی طلب سے توجہ ہٹانا چاہتا تھا۔ وہ سیر می سے نیچے آیا۔ یہاں ایک چھوٹا سا بیسمنٹ تھا جس میں ایک سرساز کے کچھ جدید آلات لگے ہوئے تھے۔ ریکس میں کچھ بیکار اور کم استعمال ہونے والا سامان رکھا تھا۔ اس نے دلچسپی سے ایک سرساز کی مشینیں دیکھیں۔ ایک زمانے میں وہ خود باقاعدگی سے ایک سرساز کرتا تھا۔ اور سگریٹ بھی بہت کم پیتا تھا۔ یہی وجہ تھی اس کا اسٹیمنا بہت اچھا تھا مگر اب جس نے اسے کمزور کر دیا تھا۔ یہاں فی وی یا تفریح کے لیے کوئی اور چیز نہیں تھی۔ بیڈ روم میں ایک ریک پر کچھ کتابیں اور رسائل رکھے تھے۔ وہ انہیں دیکھنے لگا مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ طلب بڑھ رہی تھی۔ جب طلب حد سے بڑھنے لگی تو اس نے دواؤں کے باکس میں دیکھا شاید کوئی ایسی دوا مل جائے جس سے وہ طلب کم کر سکے مگر اس میں ایسی کوئی دوا نہیں تھی۔ تکلیف ہوئی تو وہ بیڈ پر لیٹ گیا۔ اس نے سر تک کمرل اوڑھ لیا۔ اس کا جسم لرز رہا تھا جیسے اسے جاڑا چڑھا ہو لیکن ساتھ اس کے مساموں سے پسینا بہہ رہا تھا۔ وہ تکلیف برداشت کرتا رہا پھر کسی وقت اس پر غشی طاری ہو گئی۔

☆☆☆

تھی۔ پھر یہ سب سے اوپر تھی اور وہ اس پر اپنا حق سمجھتا تھا۔ عدالت میں کیس کے ساتھ ساتھ وہ انہیں دوسرے طریقوں سے بھی ہراساں کرتا تھا۔ اس سے پہلے بھی راتوں کو نامعلوم افراد نے ان کے گھر میں گھسنے کی کوشش کی یا ان کے گھر پر فائرنگ کی گئی تھی۔ فارسیہ کا رشتہ اس کی کم عمری میں اس کے ماموں کے گھر طے ہو گیا تھا مگر اچانک ہی ان کی طرف سے انکار ہو گیا اور پھر پتا چلا کہ فارسیہ کے ماموں زاد کی شادی قادر حیات کی بیٹی سے ہو رہی ہے۔ گویا اس کے پس پشت بھی قادر حیات تھا۔ فارسیہ کو رنج اللہ اچھا لگتا تھا مگر اس سے کوئی جذباتی وابستگی نہیں تھی۔ اسے مسترد کیے جانے کا دکھ تھا مگر جلد اس نے خود کو سنبھال لیا

☆☆☆

وہ سولہ سترہ سال کا نوجوان تھا اور کرکٹ کے میدان میں بولنگ کر رہا تھا۔ لمبا اور چھریا جسم جو فاسٹ بولنگ کے لیے موزوں تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے مخالف ٹیم کی بیٹنگ کو بھس نہس کر دیا۔ پھر جیسے ہی آخری کھلاڑی کی وکٹیں ہوا میں بکھریں، اس کی ٹیم کے کھلاڑی اس سے لپٹ گئے۔ وہ بھی دوڑتا ہوا جا کر ان سے لپٹ گیا۔ اس نے جوش سے کہا۔ ”ہم جیت گئے۔“

مگر پھر منظر بدلا، وہی نوجوان کفن میں لپٹا ہوا لیٹا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ مرجھا گیا تھا۔ اس کا صحت مند جسم کھل گیا تھا۔ اسے کوئی بیماری نہیں تھی، کوئی حادثہ پیش نہیں آیا تھا پھر بھی وہ مر گیا۔ اس ملک کے بے شمار لاکھوں نوجوانوں کی طرح جو بغیر کسی بیماری کسی حادثے کے مرتے رہے ہیں اور مر رہے ہیں اور آئندہ بھی مرتے رہیں گے۔ وہ اس کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ بھی مر گیا ہو۔ وہ مرا نہیں تھا، وہ ہار گیا تھا۔ اس نے نوجوان کے سرد ماتھے کو چوما اور آہستہ سے بولا۔ ”ہم ہار گئے... ہاں، ہم ہار گئے ہیں۔“ وہ رونے لگا۔

☆☆☆

اس کی آنکھ کھلی تو رات ہو چکی تھی۔ ویسے بھی سردیوں کے دن تھے، پانچ بجے تک سورج غروب ہو جاتا تھا۔ اسے اپنی آنکھیں نم محسوس ہو رہی تھیں۔ اس نے چھو کر دیکھا نمی سچ تھی۔ وہ اٹھا تو پہلی بار اسے نشے کی طلب محسوس ہوئی۔ جسم ٹوٹ رہا تھا اور منہ کا ذائقہ خراب تھا۔ وہ باتھ روم... آیا۔ ضرورت سے فارغ ہو کر اس نے دانت صاف کئے۔ کئی مہینوں بعد اس نے پہلی بار باقاعدہ دانت صاف کئے

عالیہ کی ماں اسپتال میں داخل ہو گئی تھی۔ آج اسے پہلی بار اکیلے گھر میں رہنا تھا۔ اگرچہ وہ ماں کے ساتھ اسپتال میں رک سکتی تھی کیونکہ اسے الگ کمر ملا تھا اور اس میں ایک تیماردار کے رکنے کی گنجائش بھی تھی۔ مگر اسے گھر سے آپریشن کے لیے رقم لینا تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ اگلے دن آپریشن کی پوری رقم جمع کرادے تاکہ آپریشن میں کوئی رکاوٹ نہ آنے پائے۔ یہ سبھی پرائیویٹ اسپتال تھا۔ عام فیسیں اتنی زیادہ تھیں لیکن خاص امراض اور آپریشن کی صورت میں اچھے خاصے اخراجات ہو جاتے تھے۔ اس آپریشن کے بھی ڈیڑھ لاکھ روپے لگ رہے تھے۔ نصف رقم اس نے دفتر سے ایڈوانس کی صورت میں لی تھی اور یہ اس کی تنخواہ سے کتنی۔ باقی رقم عابد نے اسے دی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ ماں نے اس کی شادی کے لیے جو زیور بنایا ہے، وہ فروخت کر دے۔ یہ تمین تولے کے قریب تھا اور اس سے اپنی رقم تو مل جاتی۔ مگر عابد نے بہت اصرار کر کے اسے یہ رقم دی تھی۔ اس نے کہا تھا۔

”مجھے افسوس ہے کہ میں ساری رقم نہیں کر سکا۔“

”ایسا نہ کہیں... آپ نے اتنا کیا ہے یہ بھی بہت ہے... اور عابد اس سے زیادہ قیمتی وہ ساتھ اور سہارا ہے جو آپ نے اس کڑے وقت مجھے اور امی کو دیا ہے۔“

مگر اب عابد ایک ہفتے سے غائب تھا اور وہ خود کو بہت اکیلا محسوس کر رہی تھی۔ وہ مخصوص بس اسٹاپ پر اتری۔ یہ اس کے گھر سے خاصے فاصلے پر تھا مگر اس کا بڑا حصہ بازار سے گزرتا تھا اور یہاں رات دس گیارہ بجے تک چہل پہل رہتی تھی جبکہ اس کے گھر کے قریب والا اسٹاپ رہائشی علاقے کے ساتھ تھا اور درمیان میں پارک بھی آتا تھا۔ یہاں شام کے بعد سناٹا چھا جاتا تھا۔ سردیوں میں سورج ویسے بھی جلد غروب ہو جاتا تھا اور وہ عام طور سے تاریکی میں گھر پہنچتی تھی۔ اسے عام حالات میں بھی بہت ڈر لگتا تھا مگر جب لفٹوں والا واقعہ پیش آیا تو اس نے فیصلہ کر لیا کہ اب وہ اس راستے سے نہیں گزرے گی۔ بے شک دس منٹ لیٹ گھر پہنچے اور مزید تھک جائے۔ یہاں سے گزرتے ہوئے وہ سکون میں رہتی تھی۔ لیکن اس روز وہ جب گھر کی طرف روانہ ہوئی تو سامنے اس نے اسی لفٹ کو دیکھا جسے اس نے تھپڑ مارا تھا۔ وہ اسے معنی خیز نظروں سے گھور رہا تھا۔

عالیہ گھبرا گئی اور تیز قدموں سے چلنے لگی۔ کچھ دیر بعد وہ چاروں لفٹ کے پیچھے آ رہے تھے۔ یہاں رونق تھی

اور لوگ آ جا رہے تھے اس لیے انہوں نے قریب آنے یا اسے چھیڑنے کی کوشش نہیں کی۔ عالیہ کو خوف آ رہا تھا کیونکہ بازار ختم ہونے کے بعد رہائشی علاقہ تھا اور وہاں اس وقت سناٹا طاری ہو جاتا تھا۔ عالیہ نے اپنی رفتار مزید تیز کر دی۔ جلد بازار کا حصہ ختم ہو گیا اور اب رہائشی علاقہ تھا۔ جیسے ہی ذرا سناٹا اور ویرانی ہوئی، وہ چاروں پاس آنے لگے۔ اب وہ بول بھی رہے تھے۔ بہ ظاہر وہ آپس میں باتیں کر رہے تھے لیکن درحقیقت اسے سنا رہے تھے اور ان کی گفتگو ناقابل بیان تھی۔ عالیہ کا دل چاہ رہا تھا کہ رونا شروع کر دے۔ اس نے بھی خود کو اتنا بے بس اور دل گرفتہ محسوس نہیں کیا تھا۔ غیر ارادی طور پر اس کے قدم تیز تیز اٹھنے لگے۔ ابھی اس کا گھر دو گلی دور تھا۔ اچانک اسے آواز سنائی دی۔

”آج اسے جانے نہیں دینا ہے۔“

یہ سنتے ہی وہ بھاگنے لگی۔ خوش قسمتی میں سردی کی وجہ سے وہ فلیٹ ایڑی والے پمپ شوز پہنے ہوئے تھی اور اسے بھاگنے میں دشواری پیش نہیں آئی۔ اس کے بھاگتے ہی وہ چاروں بھی اس کے پیچھے لپکے۔ مارے خوف اور گھبراہٹ کے اسے شور کرنے کا خیال نہیں آیا ورنہ یہ چھوٹے گھروں کا علاقہ تھا۔ اس کا شور سن کر ہی اہل محلہ نکل آتے۔ اپنی گلی میں داخل ہوتے ہی اس نے پرس سے گیٹ کی چابی نکال لی۔ گیٹ لاک تھا جو کھینچنے سے بند ہو جاتا تھا اور باہر سے چابی سے کھلتا تھا۔ وہ چاروں رفتہ رفتہ اس کے پاس آتے جا رہے تھے۔ عالیہ کے منہ سے سسکیاں نکل رہی تھیں۔ اگر وہ کوشش کر کے خود پر قابو نہ رکھتی تو شاید گری جاتی۔ گیٹ پر آتے ہی اس نے چابی لگانے کی کوشش کی مگر ہاتھ کانپنے کی وجہ سے پہلی کوشش ناکام رہی۔ وہ دیوانہ وار تالے کے سوراخ میں چابی ڈالنا چاہ رہی تھی اور وہ چاروں قریب آ رہے تھے۔ اس نے ان کی طرف دیکھا وہ مشکل سے دس قدم دور تھے اور طوفان کی طرح آ رہے تھے۔ پھر جیسے چابی خود ہی خود لاک میں چلی گئی۔ وہ اسے گھماتے اور دروازہ دھکیلتے ہوئے اندر آئی اور پھرتی سے اسے واپس بند کیا۔ اس سے پہلے کہ وہ بند ہوتا، کوئی باہر دروازے سے ٹکرایا تو عالیہ نے پہلی بار چیخ ماری۔ اس کی چیخ نے اثر کیا اور دروازے پر دباؤ ختم ہو گیا۔ اس نے دروازہ بند کر کے اندر سے کنڈی بھی لگا دی پھر وہ تیزی سے اندر والے حصے کی طرف بڑھی۔ جب وہ اندر کا دروازہ کھول رہی تھی تو دروازے کے اوپر سے ایک سر نمودار ہوا۔ اس نے عجلت میں نشست گاہ کا دروازہ کھولا اور اندر گھس کر اسے بھی بند کر لیا۔ اس کا جسم

اس کی آنکھ کھلی تو نیا دن طلوع ہو گیا تھا۔ اسے ایک بار پھر شدید بھوک لگ رہی تھی اور حیرت انگیز طور پر ذہن اور جسم ہلکا پھلکا ہو گیا تھا۔ نشے کی طلب اپنے عروج پر پہنچ کر ختم ہو گئی تھی۔ منہ ہاتھ دھو کر وہ کچن میں آیا۔ گزشتہ رات کے بچے ہوئے سینڈویچ کھائے لیکن جب ان سے تسلی نہیں ہوئی تو اس نے مزید انڈے ابا لے اور کچھ تیلے پھر انہیں ڈبل روٹی سینک کر ان سے کھایا۔ بھرپور ناشتے کے بعد دو کپ چائے پی کر وہ خود کو آسودہ محسوس کرنے لگا۔ جب وہ نشے کا عادی نہیں تھا تو اس کی خوراک اچھی خاصی تھی۔ آج بہت عرصے بعد اس نے پیٹ بھر کر کھایا تھا۔ اس کا موڈ اچھا ہو گیا تھا۔ اس نے کچن صاف کیا۔ گندے برتن دھوئے۔ ان کاموں سے فارغ ہو کر اس نے اپنے زخم کا معائنہ کیا۔ دواؤں، اچھی، سادہ خوراک اور مسلسل آرام سے زخم تقریباً بھرنے کی پوزیشن میں آ گیا تھا۔ اس نے چل پھر کر دیکھا۔ اسے تکلیف محسوس نہیں ہوئی۔ وہ دل ہی دل میں عابد الرحمن کا شکر گزار تھا۔ اگر اس کا خالی مکان نہ ملتا تو شاید وہ اس وقت کسی اسپتال سے ہو کر حوالات میں پڑا ہوتا اور پولیس اس پر نہ جانے کون کون سے کیس ڈال چکی ہوتی۔ اب وہ اس قابل تھا کہ یہاں سے چلا بھی جاتا تو اسے فرق نہ پڑتا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ یہاں سے جاتے ہوئے کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگائے گا، سوائے اس خوراک کے جو وہ استعمال کر چکا تھا اور اس ایک جوڑے کے جو اس نے پہن لیا تھا۔ فی الحال وہ اسی طرح عابد الرحمن کا شکر یہ ادا کر سکتا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ رات کو یہاں سے نکلے گا۔ دن میں خطرہ تھا کہ کوئی اسے دیکھ نہ لے۔ رات میں وہ زیادہ آسانی سے یہاں سے نکل سکتا تھا۔ البتہ اس نے یہ نہیں سوچا تھا کہ وہ کہاں جائے گا۔ اس نے ایک بار اور دوا لی۔ اس کے بعد شاید اسے ضرورت نہ پڑتی۔ چرس کی طلب ختم ہونے کے بعد وہ خود کو گندہ محسوس کر رہا تھا اور نہ نشہ پاکی ناپاکی کا احساس سب سے پہلے ختم کرتا ہے۔ وہ واش روم میں آیا، وہاں شیونگ کا مکمل سامان تھا۔ اس نے پہلے اپنا چہرہ صاف کیا۔ اس کے سر کے بال بے ہنگم لیے ہوئے تھے۔ سامان میں سر پر پھیرنے والی مشین بھی تھی۔ اس نے اس کی مدد سے اپنے لمبے بالوں کا صفایا اور انہیں بالکل مختصر کر دیا۔

کچھ دیر بعد ایک اجنبی شخص آئینے کے سامنے کھڑا

تھا۔ حیران کن طور پر وہ چھوٹے بالوں میں بھی اچھا لگ رہا تھا۔ اگرچہ اس کے چہرے پر حالات کی سختی رقم تھی، اس کے باوجود وہ ٹھیک دکھائی دے رہا تھا۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس نے زخم سے نیچے کا حصہ دھویا اور اوپری جسم اسٹینچ پر صابن لگا کر صاف کیا اور آخر میں مین پر جھک کر سر دھولیا۔ اب اس کے سر پر معمولی سے بال تھے۔ صاف ہو کر اس نے خود کو بہت بہتر محسوس کیا تھا۔ مگر ساتھ ہی وہ تھک گیا تھا اس لیے وہ واپس آ کر لیٹ گیا۔ ٹھکن کے باوجود وہ خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ وقت گزاری کے لیے اس نے موبائل اٹھا لیا۔ اسے آن کیا تو ایک بار پھر کئی ایس ایم ایس آئے ہوئے تھے۔ اتفاق سے اس بار بھی ایس ایم ایس ان دو خواتین کی طرف سے تھے۔ عالی نامی لڑکی نے لکھا تھا۔

”پلیز عابد! آپ کہاں ہیں؟ میں خود کو بہت اکیلا محسوس کر رہی ہوں۔ پرسوں امی کا آپریشن ہے۔ عابد! وہی لفٹے کل پھر دکھائی دیے تھے اور انہوں نے میرا پیچھا بھی کیا تھا۔ میں بتا نہیں سکتی کہ میں ان سے کس طرح ہنسی۔ اب اکیلے گھر جاتے ہوئے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ اس سے زیادہ ڈر مجھے اکیلے رہنے سے لگتا ہے۔ عابد! مجھ سے رابطہ کریں۔ آپ کی عالی۔“

دوسرا ایس ایم ایس بھی اسی کا تھا۔ ”میں بہت پریشان ہوں۔ پلیز اگر مجھ سے کوئی خطا ہو گئی ہے تو مجھے معاف کر دیں۔ اگر آپ رابطہ کرنا نہیں چاہ رہے تو ٹھیک ہے مگر ایک بار مجھے ایس ایم ایس کر کے بتا تو دیں... عالی۔“

تین ایس ایم ایس قاریہ کی جانب سے تھے اور اس نے حالات کی مزید خرابی کا ذکر کیا تھا۔ ان کا کہنا ٹائیکرز زخم کی وجہ سے ناکارہ تھا۔ گھر کا واحد ملازم رفیق پُر اسرار طور پر غائب تھا۔ قاریہ کے پیغامات سے لگ رہا تھا کہ خطرہ ان کے سر پر آ گیا ہے۔ وہ حیران تھا کہ جس شخص سے متعلقہ لوگوں کو اتنے سنگین حالات اور مسائل کا سامنا تھا، وہ یوں کہاں چلا گیا تھا کہ اپنا موبائل بند کر کے گھر چھوڑ گیا تھا۔ حد یہ کہ اپنا پرس بھی چھوڑ گیا تھا۔ اس نے ایک بار پھر بیڈ روم کی مکمل تلاشی لی۔ ہر جگہ دیکھا، حد یہ کہ بیڈ کے نیچے بھی دیکھ لیا مگر اسے ایسی کوئی چیز نہیں ملی جس سے پتا چلے کہ عابد الرحمن کیا کام کرتا تھا۔ واحد جگہ جہاں وہ نہیں دیکھ سکتا تھا، الماری کالا کر تھا۔ یہ خا صے بھاری بیج کی فولادی چادر سے بنا ہوا تھا اور اس کا لاک بھی یقیناً اچھی قسم کا تھا۔ اگر وہ عام سالاک ہوتا تب بھی وہ اسے نہیں کھول سکتا تھا۔ اسے یہ فن نہیں آتا تھا۔ جب وہ تھک ہار کر بیٹھ گیا تو اسے خیال آیا کہ وہ تو جلد

یہاں سے چلا جائے گا، تب وہ اتنی کوشش کیوں کر رہا تھا؟
 تین بجے اسے پھر بھوک لگی۔ اس نے پکی پکی ڈبل
 روٹی اور مکھن سے پیٹ بھرا کیونکہ انڈے ختم ہو چکے تھے۔
 ہاں، دودھ کے کئی پیکٹ تھے مگر اسے دودھ سے رغبت نہیں
 تھی۔ پانچ بجے اندھیرا ہو گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ سات بجے
 یہاں سے نکلے گا۔ اس وقت تک سردی کی شدت سے گلیاں
 بھی سنان ہو جائیں گی اور دھند بھی ہو جائے گی، اسے کوئی
 دیکھ نہیں سکے گا۔ اس کے جسم پر موجود لباس گرم تھا مگر یہ باہر
 کی سردی کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے ہچکچاتے ہوئے
 الماری کھولی اور اس میں موجود لیڈر کی جیکٹ نکال کر پہنی
 پھر اس نے جوتوں میں سے جو گرز کا انتخاب کیا۔ گرم
 موزے نکالے۔ لباس اور جیکٹ کی طرح جوتے بھی اسے
 فٹ آئے تھے۔ سات بجے وہ جانے کے لیے لاؤنج میں
 آیا۔ اس نے مچن والا دروازہ کھولا۔ جس کھڑکی سے وہ آیا
 تھا۔ اسے پہلے ہی اندر سے بند کر چکا تھا۔ اس دروازے کو
 بھی لاک لگا دیتا تو ایک بار بند ہونے کے بعد اسے باہر سے
 چابی کے بغیر نہیں کھولا جاسکتا تھا۔

اس نے اپنے اتارے ہوئے لباس اور دوسرے
 کچرے والا سا پر ساتھ لے لیا تھا۔ وہ باہر نکل کر دروازہ بند
 کرنے جا رہا تھا کہ بیڈروم سے موبائل کی بیل سنائی دی۔ وہ
 رک گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا کرے؟ دوپہر میں موبائل
 آن کرنے کے بعد وہ بند کرنا بھول گیا تھا۔ کچھ دیر سوچنے
 کے بعد اس نے دروازہ کھولا اور اندر آیا۔ بیڈروم میں آکر
 موبائل دیکھا۔ اس پر عالی کی کال آرہی تھی۔ جیسے ہی اس
 نے موبائل دیکھا بیل بج کر بند ہو گئی۔ اس نے گہری سانس
 لی۔ وہ موبائل بند کرنے جا رہا تھا کہ دوبارہ بیل بجی۔ اس
 نے کال ریسیو کرنے والا بٹن دبایا اور کان سے لگایا۔
 دوسری طرف سے عالی روہانسی آواز میں کہہ رہی تھی۔
 ”سوری عابد... آئی ایم ریلی سوری... آپ جانتے ہیں
 اس دنیا میں امی کے بعد اگر کوئی مجھے اپنا لگا تو وہ آپ
 ہیں... اسی لیے میں نے آپ سے شاید زیادہ ہی توقع لگا
 لی... مگر آپ مجھ سے رابطہ نہیں رکھنا چاہتے۔ اب میں آپ
 کو تنگ نہیں کروں گی... ایک بار پھر سوری۔“ اس نے کہتے
 ہوئے لائن کاٹ دی۔ وہ ساکت بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے
 ذہن میں ایک بات رہ رہ کر آرہی تھی۔ وہ ہچکچایا لیکن پھر
 اس نے عالی کے نمبر پر ایس ایم ایس کیا۔

”عالی! میں اس وقت بہت مشکل میں ہوں۔ تم سے
 بات نہیں کر سکتا اور نہ آکر مل سکتا ہوں۔ میں شہر سے باہر

ہوں لیکن میں اپنے ایک دوست کو تمہارے پاس بھیج رہا
 ہوں۔ تم اس پر اعتماد کر سکتی ہو۔ اس کا نام بلال مصطفیٰ ہے۔
 وہ اپنا نام بتائے گا اور حوالہ دے گا۔ یہ بتاؤ تمہاری امی کس
 اسپتال میں داخل ہیں۔ وہ وہیں آئے گا اور پلیز اب مجھے
 کال مت کرنا۔ ایس ایم ایس کرنا۔“

اس نے ایس ایم ایس بھیج دیا اور فوراً ہی عالی کی
 طرف سے جواب آیا۔ ”شکر ہے آپ ٹھیک ہیں... امی
 اسی اسپتال میں ہیں آپ جانتے ہیں۔“

”میں جانتا ہوں۔“ اس نے جوابی ایس ایم ایس
 کیا۔ ”لیکن اسپتال کا نام ذہن سے نکل گیا ہے۔ میں اپنے
 دوست کو کیا بتاؤں گا۔“

عالی نے کچھ دیر بعد اسپتال کا نام بھیج دیا۔ اس نے
 اٹھ کر دروازے سے عابد کا پرس نکالا اور ایک بار پھر دل ہی دل
 میں اس سے معذرت کی۔ اس میں موجود ساری رقم نکال کر
 جیب میں رکھی۔ موٹر سائیکل کی چابی لی اور مچن والے
 دروازے سے باہر آیا لیکن اس بار اس نے اسے اندر سے
 لاک نہیں کیا۔ حسب توقع باہر گلی سنان تھی۔ اگرچہ دھند
 بہت معمولی سی تھی مگر کسی نے اسے جانتے نہیں دیکھا۔ وہ
 چھوٹے گیٹ سے باہر آیا اور اسے کھینچ کر بند کر لیا۔ اس میں
 آٹو میٹک لاک لگا ہوا تھا۔ اس نے موبائل بھی ساتھ رکھا اور
 روانہ ہونے سے پہلے اس نے ایس ایم ایس پر تصدیق کر لی
 کہ عالی اسپتال میں ہی ہے۔ اس نے راستے میں کچرے کا
 سا پر ایک کچرے دان میں ڈالا۔ اسپتال اس کا دیکھا ہوا تھا،
 وہ آدھے گھنٹے میں وہاں پہنچ گیا۔ ریسپشن سے اسے کسی قدر
 مشکل سے سہی لیکن عالی کی ماں کے کمرے کا پتا چل گیا۔ وہ
 کمرے تک پہنچا اور دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔ دروازہ
 عالیہ نے کھولا اور سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”بلال مصطفیٰ۔“ اس نے تعارف کرایا۔ ”مجھے عابد
 نے بھیجا ہے۔“

”اوہ... اندر آئیے۔“ اس نے راستہ چھوڑ دیا۔
 عالیہ کی ماں گہری نیند میں تھی۔ اس نے بتایا۔ ”میں امی کے
 ساتھ ہی رکی ہوں مگر کل امی کا آپریشن ہے اور مجھے لازمی
 گھر جانا ہے۔“

”کیوں؟“
 ”آپریشن کے لیے رقم گھر میں ہے۔ میں نے ابھی
 صرف آدھی رقم جمع کرائی ہے، جب تک پوری رقم جمع نہیں
 ہوگی آپریشن نہیں ہو سکے گا۔“

”مسئلہ کیا ہے؟“ وہ کم سے کم الفاظ میں بات کر رہا تھا۔

”عابد کہاں کام کرتے ہیں؟“ عالیہ کا یہ سوال اس کے لیے غیر متوقع تھا۔ اس نے کچھ دیر بعد کہا۔
”کیا عابد نے تمہیں نہیں بتایا؟“
”نہیں۔“ عالیہ شرمندہ ہو گئی۔ ”میں نے بھی کبھی نہیں پوچھا۔“

وہ خاموش ہو گیا اور عالیہ نے بھی دوبارہ نہیں پوچھا۔
کچھ دیر میں وہ عالیہ کے گھر کے پاس پہنچ گئے۔ اس نے کہا۔
”اپنا چہرہ شال سے چھپالو، اگر کوئی نگرانی کر رہا ہو تو تمہیں دیکھ لے گا۔ گھر بتانا، میں اس سے ذرا آگے روکوں گا۔“

”ٹھیک ہے... اس گلی میں مڑ جائیں۔“ عالیہ نے کہا۔ ”اسے کراس کرنے پر میرے گھر والی گلی ہے... وہ چھوٹا براؤن گیٹ ہے جس کے ساتھ پھولوں کی نیل چڑھی ہے...“

اس نے موٹر سائیکل اس گیٹ سے دو گھر آگے روکی اور آہستہ سے بولا۔ ”اتر کر یوں دروازے کی طرف جاؤ جیسے ہم اسی گھر میں آئے ہیں۔“

عالیہ نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ اس دوران میں وہ آس پاس کا جائزہ لے رہا تھا مگر اسے دور تک کوئی دکھائی نہیں دیا۔ اس نے عالیہ کو آواز دی۔ ”ہری آپ... اپنے گھر چلو۔“

عالیہ نے چابی سے گیٹ کا تالا کھولا۔ وہ اس کے ساتھ تھا۔ اندر چھوٹا سا مٹن تھا جس کے ایک طرف چھوٹا سا ہاتھ روم تھا پھر ایک کمرہ تھا۔ عالیہ اب کمرے کا دروازہ کھول رہی تھی کہ اچانک ہاتھ روم کا دروازہ کھلا اور ایک شخص پستول سامنے کیے نمودار ہوا۔ اور خود کار انداز میں حرکت میں آیا۔ اس کی لات گھومی اور پستول والے ہاتھ پر لگی۔ پستول اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ اس نے کراہ کر گالی دی وہ نبیل تھا۔ اس نے گھومتے ہوئے توازن سے دوبارہ نبیل کے سینے پر لات ماری، وہ لڑکھڑاتا ہوا پیچھے آنے والے عاطف سے ٹکرایا اور دونوں ہاتھ روم میں چلے گئے پھر دوبارہ آگے آئے۔ اس نے فرش پر قلابازی کھائی اور اس بار اس کے دونوں پاؤں ریل میں پھر نبیل کے سینے پر بہت قوت سے لگے۔ گھومتی ٹانگوں میں بہت زور تھا۔ نبیل کے حلق سے کھٹی ہوئی چیخ نکلی اور وہ دوبارہ عاطف کو لیتے ہوئے ہاتھ روم میں جا گرا۔ اس بار وہ زیادہ دور گئے تھے۔ جب تک وہ اٹھتے، اس نے فرش سے اٹھتے ہوئے ہاتھ روم کا دروازہ کھینچ کر باہر سے کنڈی لگا دی۔ یہ پلائی کے بجائے دھات کا بنا ہوا دروازہ تھا۔ فوراً ہی

وہ ہچکچائی۔ ”کچھ عرصے پہلے کچھ بد معاش میرے پیچھے پڑ گئے تھے اور عابد نے مجھے بچایا تھا۔ وہ غائب ہو گئے تھے لیکن پچھلے چند دن سے وہ دوبارہ دکھائی دے رہے ہیں۔ کل رات میں جب گھر جا رہی تھی تو وہ میرے پیچھے لگ گئے۔ میں نے راستہ تقریباً بھاگ کر طے کیا۔ سردی کی وجہ سے گلیاں سنسان تھیں۔ میں گھر میں بھی ساری رات جاگتی اور ڈرتی رہی۔ کئی بار مجھے لگا جیسے کوئی باہر والا دروازہ کھولنے کی کوشش کر رہا ہے۔“

”جب تم گھر گئی تھیں تو رقم کیوں نہیں لائیں؟“
”میں بھول گئی تھی اور جب میں گھر سے نکلی تو وہ لوگ باہر موجود تھے۔ انہوں نے پھر میرا پیچھا کیا اور میں ڈر کے مارے واپس نہیں گئی۔ اب بھی نہیں جاسکتی اور مجھے ہر صورت رقم لانی ہے۔ عابد کے سوا کوئی ایسا فرد نہیں ہے جس سے میں مدد مانگ سکوں۔ میں مسلسل ان سے کونٹیکٹ کی کوشش کرتی رہی مگر وہ جواب نہیں دے رہے تھے۔“ کہتے ہوئے عالیہ رو ہانسی ہونے لگی۔

”وہ سچ سچ مجبور ہے۔“ اس نے آہستہ سے کہا اور عالیہ کی ماں کی طرف دیکھا۔ ”کیا انہیں مسکن دوا دی گئی ہے؟“
عالیہ نے سر ہلایا۔ ”ان کے اعصاب پر سکون رکھنے کے لیے ڈاکٹر ز ابھی سے مسکن دوا دے رہے ہیں۔ ورنہ بی پی شوٹ کر گیا تو آپریشن نہیں ہوگا۔“

اس نے سوچا اور بولا۔ ”ٹھیک ہے، چلو میرے ساتھ... ہم ابھی تمہارے گھر سے رقم لے آتے ہیں۔“
عالیہ کسی قدر ہچکچاہٹ کے ساتھ اس کے ہمراہ چلنے کو تیار ہو گئی۔ اگر عابد کا حوالہ نہ ہوتا تو وہ کبھی کسی اجنبی پر اس طرح اعتبار نہ کرتی اور عام حالات میں تو بالکل نہ کرتی لیکن اس وقت اس کی ماں کی زندگی اور صحت کا سوال تھا۔ عالیہ نے شال پہن رکھی تھی۔ موٹر سائیکل دیکھ کر وہ چونکی۔ ”یہ تو عابد کی بائیک ہے۔“

”ہاں لیکن ابھی میرے پاس ہے۔“ اس نے موٹر سائیکل اشارت کی۔ عالیہ سمجھتی ہوئی اس کے پیچھے بیٹھ گئی۔ اس نے سردی سے بچنے کے لیے گرم شال اچھی طرح لپیٹ لی تھی۔ اس نے عالیہ سے اس کے گھر کا پتا پوچھا اور موٹر سائیکل آگے بڑھادی۔ دھند کسی قدر بڑھی ہوئی تھی لیکن تیز اسٹریٹ لائٹس کی وجہ سے سڑک دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے رفتار مناسب رکھی۔ عالیہ نے پوچھا۔ ”آپ عابد کے ساتھ ہی کام کرتے ہیں؟“
”ایسا ہی سمجھ لو۔“

اندر سے دروازہ کھولنے کی کوشش شروع ہو گئی مگر یہ آسانی سے کھلنے والا دروازہ نہیں تھا اور اسے توڑنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس نے نیچے گرا پستول اٹھایا اور ہکا بکا کھڑی عالیہ سے کہا۔

”جلدی کرو۔۔۔ رقم لو اور یہاں سے نکلو۔۔۔ ان کے اور ساتھی بھی ہو سکتے ہیں۔“

عالیہ کو بے ساختہ عابد یاد آیا۔ اس نے بھی اسی پھرتی اور مہارت سے اسے چھیڑنے والے لفنگوں کی مرمت کی تھی۔ اس کی آواز پر وہ چوکی اور اندر لپکی۔ دوسرا کمرہ جو ان کا بیڈروم بھی تھا، اس میں موجود الماری سے اس نے نہ صرف آپریشن کی رقم بلکہ ایک چھوٹا چرمی بیگ بھی اٹھالیا۔ اس میں ان کی جمع پونجی تھی۔ اس کے لیے کچھ زیور اور رقم تھی۔ عالیہ کے اندر جانے کے بعد اس نے اپنے دکھ جانے والے زخم پر ہاتھ رکھا۔ جسمانی حرکات نے شاید زخم ہرا کر دیا تھا مگر تکلیف ناقابل برداشت نہیں تھی۔ عالیہ باہر آئی اور دونوں گھر سے نکل آئے۔ عالیہ نے اندر اور باہر کے دروازے دوبارہ لاک کر دیے اور اب پریشان تھی۔

”میرے اللہ۔۔۔ اب کیا ہوگا؟ وہ تو اندر ہی ہیں۔“

”فکر مت کرو، انہیں بعد میں دیکھا جائے گا۔“ اس نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ ”جلدی کرو۔“

جیسے ہی عالیہ پیچھے بیٹھی، اس نے موٹر سائیکل دوڑا دی۔ جیسے ہی وہ گلی سے نکل کر بڑی سڑک پر آئے، ایک بائیک اسٹارٹ ہوئی اور تیزی سے ان کے پیچھے آنے لگی۔ وہ بہت چوکنا تھا۔ اس نے فوری محسوس کر لیا اور رفتار بڑھاتے ہوئے عالیہ سے کہا۔ ”سنجھل کر بیٹھو، یہ بائیک پیچھے آرہی ہے۔“

عالیہ نے جھجک اور شرم ہالائے طاق رکھ کر اسے مضبوطی سے پکڑ لیا۔ موٹر سائیکل کا پچھلا اسٹینڈ نہیں تھا۔ وہ اسی طرح ہنسی رہ سکتی تھی۔ پیچھے آنے والی بائیک طاقتور انجن کی تھی اور وہ تیزی سے قریب آرہی تھی۔ جبکہ عابد کی موٹر سائیکل کا انجن سوسی سی کا تھا اور یہ ایک حد سے زیادہ تیزی نہیں دکھا سکتی تھی۔ اچانک بائیک کی طرف سے فائرنگ کی گئی اور گولیاں ان کے آس پاس سے گزر گئیں۔ فائر کسی پستول یا ریوالور سے ہوئے تھے۔ عالیہ کے حلق سے چیخ نکلی۔ اس نے پوچھا۔ ”تم ٹھیک ہو؟“

”ہاں، میں ڈر گئی تھی۔“ عالیہ روہانے لہجے میں بولی۔ ”یہ کیا ہو رہا ہے یہ اس حد تک بڑھ گئے؟“

”سنجھل کر بیٹھنا۔“ اس نے کہا اور موٹر سائیکل

اچانک ہی ایک ذیلی سڑک پر موڑ دی۔ تعاقب میں آنے والی بائیک بھی پیچھے آئی۔ یہ بھی ڈبل روڈ تھا۔ اس سے پہلے وہ مین روڈ پر تھے اور وہاں صرف موٹر سے دوسری سڑک پر جا سکتے تھے۔ درمیانی رکاوٹ بہت بڑی تھی لیکن یہاں گرین بیلٹ ایسی تھی جس سے موٹر سائیکل دوسری طرف جا سکتی تھی۔ اس نے اچانک موٹر سائیکل گھمائی اور دوسری طرف چلا گیا۔ بائیک کی طرف سے پھر فائرنگ ہوئی اور اس بار بھی وہ بال بال بچے۔ دوسری طرف جاتے ہی اس نے بریک لگا کر موٹر سائیکل روکی اور پستول دوسری سڑک پر تیزی سے نزدیک آتی بائیک کی طرف کر کے لگا تار تین فائر کیے۔ ایک گولی بائیک چلانے والے کو لگی اور وہ لہراتی ہوئی گرین بیلٹ کے درخت سے ٹکرائی۔ ایک دھماکا ہوا۔ بائیک سواروں کی چیخیں سنائی دیں۔ وہ اس تصادم سے پہلے ہی موٹر سائیکل آگے بڑھا چکا تھا۔ عالیہ بدستور اس سے چٹخی بیٹھی تھی۔ کچھ آگے نکلنے کے بعد اس نے کہا۔

”اب ہم محفوظ ہیں۔“

تو عالیہ نے خفیف ہو کر اسے چھوڑ دیا۔ بیس منٹ بعد وہ اسپتال میں تھے۔ یہاں پرائیویٹ ڈاکٹر اور سرجن بھی کام کرتے تھے۔ عالیہ کی ماں کا آپریشن ایک پرائیویٹ سرجن کر رہا تھا، اس لیے اس کی فیس خاصی زیادہ تھی۔ عالیہ نے کاؤنٹر پر رقم جمع کرائی اور رسید لی۔ وہ ویننگ روم میں آئے تو عالیہ نے کہا۔

”میں آپ کی بہت شکر گزار ہوں لیکن میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ یہ سب کیا تھا؟ دو آدمی ہمارے گھر میں تھے اور پھر اس طرح سے ہمارا پیچھا کیا گیا۔۔۔ فائرنگ کی گئی۔۔۔“ عالیہ کہتے ہوئے کانپ گئی۔ ”گولیاں آس پاس سے گزری تھیں۔“

”مجھے نہیں پتا۔“ اس نے کہا۔ ”میں نہیں جانتا کہ یہ کون لوگ ہیں اور ان کے کیا مقاصد ہیں؟ مگر مجھے لگ رہا ہے کہ وہ اتنی آسانی سے پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔ کیا تم لوگ عارضی طور پر کہیں اور منتقل ہو سکتے ہو؟“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”ہمارا کوئی ایسا عزیز نہیں ہے جس کے ہاں پناہ لے سکیں۔“

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے کہا۔ ”تمہاری والدہ کو کتنے دن اسپتال میں رہنا ہوگا؟“

”کل آپریشن ہے اور کم سے کم دو تین دن رکھیں گے، اس کے بعد بھی کنڈیشن دیکھ کر ڈسچارج کریں گے۔“

”تم بھی یہیں رہو گی؟“

”ظاہر ہے... میں نے دفتر سے چھٹی لی ہوئی ہے۔“
 ”تب ٹھیک ہے، تم یہیں رہو اور بلا وجہ اسپتال سے
 باہر جانے سے گریز کرو۔ اگر جانا ہو تو چہرہ چھپا کر جانا۔“
 عالیہ کی رنگت زرد پڑ گئی۔ ”وہ یہاں بھی آسکتے ہیں؟“
 ”ایسا ہو سکتا ہے۔“

”میں پولیس کو رپورٹ کروں؟“
 ”اس صورت میں میرا ذکر کرنا ہوگا۔“ اس نے کہا۔
 ”بہتر ہوگا کہ تم یہیں رہو۔ یہ اسپتال ہے اور یہاں سکیورٹی
 بھی ہے یہاں تم محفوظ ہو۔“

”اب تو مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“ عالیہ نے جھرجھری لی۔
 وہ اسے کمرے تک چھوڑنے آیا۔ ”فکرمات کرو، دن
 میں کوئی مسئلہ نہیں ہوگا اور رات کو کمرے کا دروازہ اندر سے
 بند کر لیتا۔“

”آپ کہاں جا رہے ہیں؟“
 ”تمہیں جو مسئلہ تھا وہ حل ہو گیا ہے۔ دوسرے میں
 یہاں رک نہیں سکتا لیکن تم فکرمات کرو، تم عابد کو بھیج کر وگی تو
 میں آ جاؤں گا۔“

”وہ جو میرے گھر میں باتھ روم میں بند ہیں؟“
 وہ سوچ میں پڑ گیا پھر اس نے کہا۔ ”مجھے گیٹ کی
 چابی دو، میں دیکھتا ہوں۔“

عالیہ اس کے جانے کے بعد بھی اس کے بارے میں
 سوچتی رہی۔ اس نے کیسی پھرتی اور مہارت سے صورت
 حال کا مقابلہ کیا تھا۔ دو مسلح افراد کے مقابلے میں وہ اکیلا اور
 نہتا تھا۔ یہی نہیں، اس نے چلتی بائیک والے کا نشانہ لے
 کر ان بد معاشوں کے عزائم کو ناکام بنا دیا تھا۔ اگر وہ نہ ہوتا
 تو عالیہ کے ساتھ نہ جانے کیا ہوتا۔ وہ لوگ کامیاب ہو
 جاتے جو پتا نہیں کیوں اس کے پیچھے پڑ گئے تھے۔

☆☆☆

بالاجی کا برا حال تھا کیونکہ گولی اس کے گھٹنے پر لگی تھی
 اور اس نے گھٹنا توڑ دیا تھا۔ اس کے ساتھ پرویز تھا
 اور درخت سے تصادم میں اس کی ریڑھ کی ہڈی پر شدید
 ضرب لگی تھی کیونکہ وہ اچھل کر کمر کے بل درخت کے تنے
 سے ٹکرایا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ بھی ٹوٹ گیا تھا۔ بالاجی ہوش
 میں تھا، اس نے بہ مشکل اپنا موبائل نکالا اور عاطف کو کال
 کی۔ وہ کراہ رہا تھا۔ ”کہاں ہو تم لوگ... وہ نکل گئے ہمارا
 بیڑا غرق کر کے۔“

”ہم اس کے گھر کے باتھ روم میں بند ہیں۔“ عاطف
 نے گھبرائے ہوئے انداز میں کہا۔ ”دروازہ لوہے کا ہے،

اسے توڑنے کی کوشش کی تو بہت شور ہوگا۔ تم لوگ آؤ۔“
 ”تیرا دماغ خراب ہے... میرے پیر میں گولی لگی
 ہے... پرویز بے ہوش پڑا ہے... تم لوگ مدد کو آؤ۔“
 ”ہم کہاں سے آئیں... دروازہ توڑنے کی کوشش تو اتنا
 شور ہوگا کہ ہمارے آزاد ہونے سے پہلے پولیس آ جائے گی۔“

پہلی ناکامی کے بعد انہوں نے سوچا تھا کہ اب لڑکی کو
 گھر میں قابو کرنا ہے۔ پروگرام کے مطابق عاطف اور نیل
 اس کے گھر میں کود کر باتھ روم میں چھپ گئے تاکہ وہ جیسے ہی
 گھر میں داخل ہوا سے قابو کر لیں جبکہ بالاجی اور پرویز گلی
 کے کونے پر تھے تاکہ کسی ناگہانی کی صورت میں اندروالوں
 کی مدد کر سکیں۔ جب موٹر سائیکل لڑکی کے گھر سے ذرا فاصلے
 پر رکی تو بالاجی اور پرویز نے توجہ نہیں دی مگر اچانک ہی
 لڑکی جس نے شال اوڑھی ہوئی تھی، اس گھر میں داخل ہوئی
 اور مرد اس کے پیچھے گیا تو وہ دونوں چوٹے۔ پرویز نے کہا۔
 ”استاد! یہ وہی لڑکی ہے۔“

”اور یہ وہی آدمی ہے۔“ بالاجی نے دانت پیس کر
 کہا۔ ”آج اسے چھوڑنا نہیں ہے۔“

”ہم بھی چلیں؟“ پرویز نے کہا۔ ”یہ آدمی خطرناک
 ہے، پتا نہیں نیل اور عاطف کے قابو میں آتا ہے یا نہیں۔“
 اس موقع پر بالاجی کی فطری بزدلی عود کر آئی۔ اس
 نے انکار کیا۔ ”نہیں، سب اندر چلے گئے تو پھر ان کی مدد
 کون کرے گا؟“

چند منٹ کے اندر لڑکی اور آدمی اندر سے برآمد
 ہوئے اور گیٹ کو تالا لگا کر روانہ ہو گئے۔ پرویز نے کہا۔
 ”یہ تو کچھ نہیں ہوا... وہ دونوں کیا کر رہے ہیں؟“

”ان کے پیچھے چلنا ہے۔“ بالاجی نے بائیک
 اسٹارٹ کی۔ یہ طاقتور ون ٹو فائیو سی تھی۔ وہ ان کا پیچھا کر
 رہا تھا پھر اس نے پستول نکالا تو پرویز خوفزدہ ہو کر بولا۔
 ”یہ کیا کر رہے ہو استاد؟“

”دیکھتا رہ... آج اس کتے کو نہ مارا تو کچھ نہ کیا۔“
 بالاجی نے فائرنگ کی لیکن آگے والے بچ گئے۔
 پھر موٹر سائیکل ایک ذیلی سڑک پر مڑی۔ وہ پیچھے آئے تھے کہ
 موٹر سائیکل اچانک گرین بیلٹ کے دوسری طرف جا کر رکی
 اور جب وہ پاس پہنچے تو فائرنگ ہوئی۔ بالاجی کو لگا کہ اس
 کے گھٹنے میں دھمکتی ہوئی سلاخ ٹھس گئی ہو۔ اس کے حلق سے
 چیخ نکلی اور اسے پتا نہیں چلا کہ بائیک کس طرف گئی ہے۔
 دھماکے سے وہ اچھل کر نیچے جا گرا اور پرویز درخت سے ٹکرا
 کر وہیں رہ گیا۔ بالاجی کی حالت بری تھی مگر کوشش کر کے

اس نے موبائل نکالا تھا اور اب اسے پتا چلا تھا کہ وہ دونوں بھی اس کی مدد کے قابل نہیں ہیں۔ اسی اثنا میں پولیس سائرن سنائی دیا۔ پہلے ہی بالاجی کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا تھا، پولیس سائرن سن کر وہ بے ہوش ہو گیا۔

☆☆☆

وہ اسپتال سے نکل کر دوبارہ عالیہ کے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ اس کے زخم کا درد بڑھ گیا تھا مگر اب بھی یہ قابل برداشت تھا۔ اس نے بایک گھر سے کچھ دور پارک کے ساتھ روک دی۔ یہ سنان علاقہ تھا، وہاں سے وہ پیدل روانہ ہوا۔ یہاں مین روڈ سے عالیہ کا گھر قریب تھا اور کوئی دیکھنے والا بھی نہیں تھا۔ وہ گلی میں داخل ہوا اور پہلے اس نے سن گن لی مگر گھر اور آس پاس سناٹا تھا۔ اگر وہ دونوں لفنگے اندر موجود نہیں تھے تو اس کا مطلب تھا کہ وہ بغیر کسی شور شرابے کے نکل بھاگے تھے۔ اس نے گلی کا جائزہ لیا اور چابی سے دروازہ کھول کر اندر آیا۔ اس نے پستول نکال لیا تھا اور اندر آتے ہی اس نے محسوس کر لیا کہ وہ دونوں بدستور قید ہیں۔ اندر سے ان کے بولنے کی ہلکی آواز آرہی تھی۔ اس نے سائنڈ پر کھڑے ہو کر دروازے پر ہلکی سی دستک دی اور دھیمی آواز میں بولا۔ ”تم دونوں میری آواز سن رہے ہو؟“

”ہاں... خدا کے لیے ہمیں یہاں سے نکالو۔“ نیبل تڑپ کر بولا۔

اس نے حکم دیا۔ ”تمہارے پاس جو ہتھیار ہے، وہ اس روشن دان سے باہر پھینک دو۔“

”ہمارے پاس اب کچھ نہیں ہے۔“ عاطف بولا۔

”ایک پستول تھا جو گر گیا تھا۔“

”ٹھیک ہے، میں دروازہ کھول رہا ہوں دونوں ہاتھ اوپر کر کے باہر آ جاؤ۔ مجھے ذرا شبہ ہوا تو میں تمہیں شوٹ کر دوں گا۔“

اس نے ہاتھ روم کا دروازہ کھولا اور پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے پستول تان لیا تھا مگر وہ دونوں شرافت سے سر پر ہاتھ رکھ کر باہر آئے۔ اس نے دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑے ہونے کا حکم دیا تو اس بار بھی انہوں نے تعمیل کی، اس نے ان کی تلاشی لی۔ سچ سچ ان کے پاس ہتھیار نہیں تھے۔ دونوں کے پاس موبائل اور دوسری چیزیں تھیں۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ بالاجی کال کر کے انہیں پہلے ہی اپنا حشر بتا چکا ہے اور اسی لیے دونوں کی حالت خراب ہے۔ اس نے ان کے موبائل اور پرس میں موجود رقم نکال لی۔ باقی چیزوں سے تعرض نہیں کیا۔ پھر اس نے حکم دیا۔ ”میرے

ساتھ چلو۔“

”ہمیں جانے دو۔“ نیبل نے گڑگڑا کر کہا۔

”میرے باپ کی توبہ جو آئندہ اس گلی سے بھی گزروں۔“

”بکو اس کرنے کے بجائے چلو یہاں سے۔“ وہ انہیں پستول کی نوک پر باہر لایا۔ اس نے گیٹ کھینچ کر بند کیا اور ان کے ساتھ پارک تک آیا۔ وہ اس کی منت سماجت کر رہے تھے کہ وہ انہیں جانے دے۔ وہ جانتا چاہتا تھا کہ وہ لوگ عالیہ کے پیچھے کیوں پڑے تھے۔ اس نے ان سے سوالات شروع کیے۔ شروع میں انہوں نے غلط بیانی کی مگر جب اس نے پستول کے دستے سے ان کی مرمت کی تو وہ راہ راست پر آ گئے۔ روتے کراہتے انہوں نے اپنے بارے میں بتایا اور پھر عالیہ کے پیچھے آنے کی کہانی سنائی۔ یہ جان کر اس کا خون کھول اٹھا کہ وہ عالیہ کے لیے گندے عزائم رکھتے تھے۔ اس نے بلا تردد پستول سیدھا کیا اور ان کے گھٹنوں میں ایک ایک گولی اتار دی۔ وہ چیخ چلانے لگے۔ اس نے جانے سے پہلے ان سے کہا۔

”دل تو چاہ رہے کہ تمہارے سروں میں سوراخ کروں لیکن اگلی بار سہی۔ اگر دوبارہ مجھے پتا چل گیا کہ تم اس کے آس پاس نظر آئے ہو تو یہی کروں گا۔“ کہتے ہوئے اس کا لہجہ خونخوار ہو گیا تو وہ اپنے زخم کو بھول گئے۔

”ہم اس علاقے میں... نہیں آئیں گے۔“ عاطف نے روتے ہوئے کہا۔

”پولیس کو نا معلوم فرد کی کہانی سنانا، میرا حلیہ بتانا چاہو تو شوق سے بتانا لیکن لڑکی کا ذکر نہ آنے پائے تمہاری کہانی میں۔“

وہاں سناٹا تھا اس لیے فائر کی آوازیں دور تک سنی گئی ہوں گی۔ پولیس یا کسی کے آنے سے پہلے اس نے وہاں سے نکل جانا مناسب سمجھا۔ وہ راستے میں ایک بیکری پر رکا اور اس نے کھانے پینے کا خاصا سامان لے لیا۔ بھاگ دوڑ اور ایک مختصر لڑائی نے اس کے زخم میں درد جگا دیا تھا۔ جب وہ واپس عابد کے گھر پہنچا تو اچھی خاصی دھند ہو چکی تھی۔ اس نے موٹر سائیکل اندر کھڑی کی۔ وہ بالکل خاموشی سے آیا تھا۔ کچن والے دروازے سے اندر آ کر اس نے سامان کچن میں رکھا اور سب سے پہلے ہاتھ روم میں آ کر اپنے زخم کا معائنہ کیا۔ اس سے ہلکا سا خون رس رہا تھا۔ زخم اندر سے کچا تھا اور لڑائی میں اسے چوٹ نہیں لگی تھی اس کے باوجود یہ ہرا ہو گیا تھا۔ اس نے مزید پاؤڈر چھڑک کر تازہ پٹی رکھی اور ٹیپ لگا کر واپس کچن میں آیا۔ ڈبل روٹی اور انڈوں کے

ساتھ وہ بیکری کے تیار کردہ پیزا اور برگر لایا۔ اس نے ان سے ڈنر کیا اور پھر چائے تیار کی۔ چائے کے ساتھ اس نے چین کلو اور اینٹی بائیوٹک لی تھیں۔ اس محنت اور جدوجہد نے اسے تھکا دیا تھا۔ وہ بستر پر لیٹا اور بے خبر سو گیا۔

☆☆☆

قاریہ اور اس کی ماں سخت ہراساں تھے۔ پہلے ٹائیگر زخمی ہوا تھا اور اب رفیق غائب تھا۔ وہ شام کے وقت کچھ سامان لینے کے لیے نیچے مارکیٹ گیا اور اس کے بعد واپس نہیں آیا۔ قاریہ نے اسے کال کی تو اس کا موبائل بند جا رہا تھا۔ جب بہت دیر ہو گئی اور رات چھا گئی تو قاریہ نے ماں سے کہا۔ ”مجھے لگ رہا ہے کہ رفیق بابا کسی مشکل میں پڑ گئے ہیں۔“

ماں نے سہم کر پوچھا۔ ”کیا ہمارے دشمنوں نے کچھ کیا ہے؟“

”سامنے کی بات ہے۔ وہ اس گھر پر قبضے کے لیے اتنے بے تاب ہیں کہ اس کے لیے کچھ بھی کر سکتے ہیں۔“ قاریہ نے ٹپکی سے کہا۔ ”وہ اسی لیے گھر میں گھسے تھے۔ انہیں پتا ہے بھائی یہاں نہیں ہے۔“

”لیکن گھر میں کس کروہ اس پر قبضہ تو نہیں کر سکتے۔“

”امی، وہ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ رفیق غائب ہے، اب ہمیں اپنی حفاظت خود کرنی ہے۔“

”ہم دو عورتیں کیا کر سکتی ہیں؟“

قاریہ سوچ رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ”امی، ہمیں کل یہاں سے جانا ہوگا۔“

”کہاں؟“

”بھائی کے پاس... یہاں ہم محفوظ نہیں ہیں۔“

قاریہ نے کہا۔ وہ رفیق کی کوٹھری میں گئی۔ وہاں اس کی رائفل اور کارتوس رکھے تھے۔ قاریہ رائفل استعمال کرنا جانتی تھی مگر نشانہ لگانا نہیں آتا تھا۔ مکان میں آکر اس نے تمام دروازے اور کھڑکیاں اچھی طرح بند کیں۔ دروازے بہت مضبوط لکڑی کے بنے ہوئے تھے اور کھڑکیوں پر فولادی گرل تھی۔ پھر اس نے اپنا اور ماں کا مشترک کمرابھی اندر سے بند کر لیا۔ اب کوئی اندر کھس آتا تب بھی وہ آسانی سے ان کے کمرے میں نہیں آسکتا تھا۔ ماں کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی، وہ دوائے کرسو گئی مگر قاریہ خوف اور اندیشوں میں تقریباً ساری رات جاگتی رہی۔ سردی شدید تھی اور اگر آتش دان میں آگ نہ جل رہی ہوتی تو وہ سکون سے نہیں رہ سکتے تھے۔ ان کے علاقے میں برف باری تو سیزن میں

رکھ، رکھ، رکھ

ایک دو بار ہی ہوتی تھی لیکن چھ مہینے بہت سخت سردی پڑتی تھی۔ اکتوبر کے وسط سے انہیں آتش دان جلانے پڑتے تھے اور یہ سلسلہ مارچ کے وسط تک جاری رہتا تھا۔

مگر صبح ماں کو بہت تیز بخار تھا، اوپر سے موسم ابر آلود ہو گیا اور سورج نکلتے ہی بارش شروع ہو گئی۔ اگر موسم ٹھیک ہوتا تو وہ ماں کو لے کر نکل جاتی مگر اس موسم میں جانا بہت مشکل تھا۔ وہ ڈرتے ڈرتے باہر آئی۔ پہلے اس نے پورے گھر کا چکر لگایا۔ ہر چیز اپنی جگہ پا کر اس نے سکون کا سانس لیا اور کچن میں آ گئی۔ اس نے ناشتا بنایا۔ پہلے ماں کو دیا اور پھر اسے دوا دے کر کچن میں آئی۔ اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا اس لیے اس نے صرف چائے لی۔ کچن کی کھڑکی سے مکان کے دائیں طرف پھیلا ہوا باغ بہت صاف اور خوب صورت لگ رہا تھا۔ بارش کی وجہ سے مرجھایا ہوا سبزہ نکھر گیا تھا مگر وہ جانتی تھی کہ یہ عارضی ہے۔ جیسے ہی بارش رکے گی سب پھر مرجھا جائے گا۔ اپنے باپ کے بعد ان لوگوں نے سخت حالات دیکھے تھے۔ ماں نے بہت قربانی دیے کر انہیں پڑھایا، خاص طور سے عابد نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی اور اب شہر میں تھا۔ قاریہ نے دو سال پہلے گریجویشن کر لیا تھا اور اب ایجوکیشن میں ماسٹر کر رہی تھی۔ دو مہینے بعد اس کے پیپرز تھے مگر حالات کی وجہ سے پڑھائی پر توجہ نہیں دے پائی تھی۔

صبح بیدار ہوتے ہی اس نے رفیق کا نمبر چیک کیا۔ وہ بدستور بند تھا۔ اسے ٹائیگر کا خیال تھا، اس کا زخم بھر رہا تھا لیکن اسے ابھی آرام اور خوراک کی ضرورت تھی۔ قاریہ نے اسے گزشتہ شام راتب دیا تھا۔ چائے پی کر اس نے فریج سے ٹائیگر کے لیے مخصوص گوشت نکالا اور اسے ہلکا سا ابال کر عقی دروازے سے باہر آئی۔ اسے ڈر لگ رہا تھا اس لیے اس نے احتیاطاً رائفل ساتھ رکھی۔ وہ ٹائیگر کی کوٹھری میں آئی تو وہ بھوک سے بے تاب تھا۔ قاریہ نے اس کے سامنے راتب ڈالا تو وہ جلدی جلدی کھانے لگا۔ قاریہ نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ”ٹائیگر! جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ... رفیق بابا بھی غائب ہے، ہم بہت اکیلے رہ گئے ہیں۔ عابد بھائی کا موبائل بھی بند جا رہا ہے۔“

ٹائیگر نے ہلکی سی آواز نکالی اور دوبارہ کھانے میں لگ گیا۔ قاریہ نے کپڑا ہٹا کر اس کا زخم دیکھا اور پھر رکھا ہوا مرہم لپ کیا۔ وہ باہر آئی۔ بوند باندی ہلکی ہو گئی تھی اور سردی کی شدت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ واپس مکان میں آئی۔ اس نے ایک بار پھر عابد کو ایس ایم ایس کیا کیونکہ نمبر مستقل بند جا رہا تھا اور اب وہ اسے کال کرنے کی کوشش

نہیں کر رہی تھی، حالانکہ اس وقت نمبر آن تھا۔ اس سارا دن بارش ہوتی رہی۔ ماں کی طبیعت شام کے وقت کسی قدر بہتر ہوئی تھی۔ وہ قاریہ سے بات کر رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ”قاریہ! میری ایک بات مان... اگر کوئی گھر میں گھسے تو تو خاموشی سے نکل جائے گی۔“

”میں کہیں نہیں جاؤں گی۔“ اس نے انکار کیا۔ ”اگر نکلی بھی تو کہاں جاؤں گی؟ یہاں تو اپنے ہی دشمن بنے ہوئے ہیں۔“

ماں نے اپنے اگلوتے بھائی کا ذکر کیا۔ ”تو اپنے ماموں کے گھر چلی جانا...“

”امی، ان کا نام نہ لیں۔ اس سے تو بہتر ہے کہ میں قادر حیات کے گھر چلی جاؤں۔“ قاریہ نے غصے سے کہا۔ ”بس آپ سن لیں کل ہم یہاں سے جا رہے ہیں۔ بھاڑ میں جائے یہ مکان اور زمین جس نے ہمارا سکون برباد کر دیا ہے۔“ ”میری بچی... یہ تیرے باپ کی نشانی ہے۔“ ماں نے روایتی بات کی۔

”امی، بابا کی نشانی میں اور عابد بھائی ہیں... یہ بے جان مکان کہاں سے ان کی نشانی ہو گیا؟ ہو سکتا ہے آنے والے کل یہ کسی اور ملکیت ہو۔“

مگر ماں یہ بات نہیں سمجھ رہی تھی۔ اس کی وہی مخصوص دیہاتی سوچ تھی جو زمین اور مکان سے چمٹے رہنا چاہتی ہے۔ عابد کتنے عرصے سے ان سے کہہ رہا تھا کہ وہ شہر آ کر اس کے ساتھ رہیں۔ خود قاریہ کی بھی یہی خواہش تھی مگر ماں یہاں سے جانے کے لیے تیار نہیں تھی اور اس کی وجہ سے وہ بھی مجبور تھے۔ رات کے کھانے کے بعد قاریہ ایک بار پھر ٹائیگر کی کوٹھری میں اسے رات ب ڈالنے لگی۔ کتے کے کان کھڑے ہوئے تھے اور وہ ہولے سے غرار ہا تھا۔ قاریہ نے اسے پچکارا۔ ”ایزی بوائے۔“

اس نے رات ب ڈالا مگر ٹائیگر اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ قاریہ کو سردی لگ رہی تھی، اس نے ٹائیگر کے زخم کا معائنہ کیا اور واپس مکان میں آگئی۔ رات کے وقت سردی کی شدت بڑھ گئی تھی۔ اسے خیال آیا کہ سونے سے پہلے آتش دان میں مزید لکڑی ڈال دے تاکہ دروازہ بند کرنے سے پہلے پہلے دھواں نکل جائے۔ وہ کمرے میں آئی اور آتش دان کے ساتھ رکھی لکڑی اندر ڈالی۔ ماں کھانا اور دوا کھا کر سو گئی تھی۔ اس نے دروازہ کھول دیا اور باہر آئی۔ اس نے حسب معمول تمام کھڑکیاں اور دروازے چیک کیے۔ پھر کچن میں آئی تو اس کا کھلا دروازہ دیکھ کر چونک گئی۔ اسے

اچھی طرح یاد تھا کہ اس نے آکر دروازہ اندر سے بند کیا تھا تو پھر اسے کس نے کھولا؟ اچانک اسے اپنے عقب میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ وہ پلٹنے لگی تھی لیکن اس سے پہلے ہی ایک کپڑا آ کر اس کے منہ پر جم گیا جس سے تیز ہوا ٹھہر رہی تھی اور یہ بو اس کے دماغ پر چڑھتی چلی گئی۔ چند لمحوں میں اسے کچھ ہوش نہیں رہا۔

☆☆☆

وہ خود کو بہت ہلکا محسوس کر رہا تھا۔

مگر وہ کیا تھا اور گزشتہ دن کی صبح ہی آ کر کی تھی۔ وہ اٹھ کر واش روم میں آیا، اس نے پٹی ہٹا کر زخم دیکھا۔ وہ اب درست حالت میں تھا کیونکہ پٹی صاف تھی اس لیے اس نے بدلنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ وہ منہ ہاتھ دھو کر کچن میں آ گیا۔ سب سے پہلے اس نے موبائل دیکھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس پر قاریہ کے ایس ایم ایس ہوں گے لیکن اس پر صرف ایک ایس ایم ایس تھا اور وہ عالیہ کی طرف سے تھا۔ اس نے عابد کو گزشتہ روز کا مختصر احوال سناتے ہوئے اس کے ”دوست“ کا بہت ذکر کیا تھا۔ وہ مسکرا دیا۔ اس نے ناشتا کیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اب کیا کرے۔ اصولاً تو اب اسے یہاں سے چلے جانا چاہیے تھا کیونکہ اس نے جو کرنا تھا، وہ کر لیا تھا۔ اس نے ایک طرح سے عابد کا عملی شکریہ ادا بھی کر دیا تھا۔ مگر اس کے اندر ایک بے چینی سی تھی۔ اسے اب رہ رہ کر قاریہ کے پیغامات یاد آ رہے تھے۔ وہ اور اس کی ماں مشکل میں تھی اور اپنے بھائی کو پکار رہی تھی جبکہ بھائی کہیں غائب تھا مگر وہ ان کے لیے کیا کر سکتا تھا؟ عالیہ اسی شہر میں تھی اور اس کی مدد اس کے بس میں تھی لیکن وہ نہ جانے کہاں تھیں؟ اور نہ جانے انہیں کیا مسئلہ درپیش تھا؟ وہ سوچتا رہا۔ پھر ناشتا کر کے وہ گھر سے نکلا اور پیدل نزدیکی مارکیٹ پہنچا۔ وہاں اس نے ایک پی سی او سے قاریہ کا نمبر ملوایا۔ اس پر بیل جا رہی تھی لیکن کوئی کال ریسیو نہیں کر رہا تھا۔ اس نے موبائل سے ایس ایم ایس کیا۔ ”قاریہ! یہ میں کال کر رہا ہوں...“ میرے پاس بیلنس نہیں ہے، پی سی او سے کال کر رہا ہوں۔“ چند منٹ بعد اس نے دوبارہ کال ملوائی۔ اس بار کال ریسیو ہوئی۔ ایک سہمی ہوئی نسوانی آواز نے کہا۔ ”ہیلو بھائی...“

”میں بات کر رہا ہوں۔“ اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ”تم کہاں ہو؟“

”عابد بھائی۔“ وہ رونے لگی۔ ”ہم بہت مشکل میں ہیں... پلیز آپ فوراً آجائیں۔“

”میں آرہا ہوں۔“ اس نے کہا اور اسی لمحے کال کٹ گئی۔ اس نے دوبارہ کال ملوانے کا ارادہ کیا مگر پھر ملتوی کر کے واپس آیا اور اس نے ایک بار پھر ڈریسنگ روم کی درازوں کو چیک کیا۔ اسے یاد تھا کہ اس نے ایک لپٹا ہوا لفافوں کا بنڈل دیکھا تھا لیکن اسے کھول کر نہیں دیکھا تھا۔ بنڈل کھلی دراز میں تھا۔ اس نے اسے کھولا۔ توقع کے مطابق اس میں کچھ لفافے فارسیہ کی طرف سے تھے۔ اس میں اس نے عابد کو برتھ ڈے کارڈ بھیجا تھا۔ لفافے کوریئر سے آئے تھے۔ اس نے لفافے پر بھیجنے والے کا پتا دیکھا۔ پتا شمال میں دارالحکومت سے تقریباً سو کلومیٹر دور ایک چھوٹے قصبے کا تھا۔ اس نے پتے والا لفافہ نکال کر اپنے پاس رکھ لیا۔ اس کا خیال تھا کہ فارسیہ سے بات ہونے کے بعد وہ پھر ایس ایم ایس کرے گی لیکن اس نے کوئی میسج نہیں کیا تھا۔ اس نے عالیہ سے رابطہ کیا اور اس سے اس کی ماں کے آپریشن کے بارے میں پوچھا۔ انہیں صبح گیارہ بجے آپریشن روم لے جایا جاتا اور آپریشن تقریباً تین بجے تک مکمل ہو جاتا۔ عالیہ نے بتایا، سرجن کا کہنا تھا کہ آپریشن کے بعد اس کی ماں کو چوبیس گھنٹے انتہائی نگہداشت کے یونٹ میں رہنا ہوگا، اس کے بعد اسے کمرے میں شفٹ کیا جاتا۔ عالیہ اس کے ساتھ تھی اور ابھی تک اسے کسی طرف سے کوئی مسئلہ نہیں ہوا تھا۔

اگرچہ شاید اب ضرورت نہیں تھی لیکن اس نے اینٹی بائیوٹک کپسول اور پین کمرے لے لی تھی۔ گیارہ بجے وہ گھر سے نکلا، اس بار اس نے کار لی تھی۔ اتفاق سے اس میں سی این جی فل تھی اور پیٹرول ٹینک بھی آدھے سے زیادہ تھا۔ باہر اب روشنی تیز تھی، اسے ڈرائیونگ میں مشکل پیش نہیں آئی۔ وہ کسی قدر تیز رفتاری سے ڈرائیو کرتا رہا۔ آدھے گھنٹے بعد شمال کی طرف جانے والی ہائی وے پر وہ ایک چھوٹی بستی کے سامنے اترآ۔ اس نے ایک معمولی سے مکان کا دروازہ بجایا۔ دوسری بار بجانے پر اندر سے کسی نے غنودہ آواز میں پوچھا۔ ”اس وقت کون آگیا ہے؟“

”میں ہوں۔“

دروازہ کھلا، ایک دبلا اور مدقوق چہرے والا شخص سامنے کھڑا تھا۔ وہ یقیناً غشیات کے استعمال کا عادی تھا۔ اس نے اسے غور سے دیکھا اور پھر اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ ”تو...“

”ہاں میں۔“ وہ اسے دھکیل کر اندر داخل ہو گیا۔

”میں کام سے آیا ہوں۔“

مدقوق آدمی اسے اندر لایا۔ مکان اندر سے بھی

رض، فرض، قرض

معمولی سا تھا۔ ایک کمرے میں چند چار پائیاں پڑی تھیں۔ مدقوق آدمی نے اشارہ کیا تو اس نے سر دلچھے میں کہا۔ ”میں بیٹھے نہیں آیا۔“

”کام کیا ہے؟“

”مجھے اعشاریہ تین آٹھ کی گولیاں چاہئیں۔“ اس نے جیکٹ سے ایک گولی نکال کر اسے تھما کی۔ ”سائز یہی ہونا چاہیے۔“

مدقوق آدمی نے غور سے دیکھا اور بولا۔ ”مل جائیں گی مگر اصلی ہیں اس لیے قیمت زیادہ ہوگی۔“

”کیا قیمت ہوگی؟“

”تمہارے لیے پچیس کی ایک گولی ہوگی ورنہ دوسروں کو چالیس کی ایک دیتا ہوں۔“

دونوں لفنگوں سے اسے ساڑھے تین ہزار کی رقم ملی تھی۔ اس نے عابد کے پرس سے نکالی ہوئی رقم واپس رکھ دی تھی۔ خریداری کے بعد بھی اس کے پاس تقریباً تین ہزار روپے تھے۔ اس نے دل ہی دل میں حساب لگایا اور بولا۔ ”مجھے چالیس گولیاں دے دو۔“

مدقوق آدمی دوسرے کمرے میں گیا اور چند منٹ بعد وہ ایک شاپر میں گولیاں لے آیا۔ اس نے تمام گولیاں نکال کر چیک کیں اور مطمئن ہو گیا۔ اس نے ایک ہزار کانوٹ مدقوق آدمی کو دیا تو وہ خوش ہو گیا۔ ”آج صبح صبح بوہنی ہو گئی۔“

”مگر بات اپنے تک رکھنا۔“ اس نے باہر کا رخ کرتے ہوئے کہا۔ کچھ دیر بعد کار شمال کی طرف جاری تھی۔ ایک جگہ رک کر اس نے پستول نکالا اور میگزین میں پانچ گولیاں ڈالیں۔ یہ وہ گولیاں تھیں جو اس نے چلائی تھیں۔ یہ بارہ گولیوں والا میگزین تھا۔ وہ پھر روانہ ہوا، یہ ہائی وے اس قصبے تک جاتی تھی جس کا نام لفافے پر لکھا ہوا تھا۔ ایک بجے وہ قصبے کے پاس تھا۔ یہ دو سطح پہاڑیوں پر پھیلا ہوا قصبہ تھا، اس میں شاید ہزار سے اوپر گھر تھے۔ کمرشل ایریا دونوں پہاڑیوں کے درمیان تھا۔ ہائی وے بھی یہیں سے گزر رہی تھی۔ اس نے گاڑی ایک ہوٹل کے سامنے روکی لیکن اندر جانے کے بجائے وہ اس کے مخالف سمت میں قائم ڈاک خانے میں داخل ہوا۔ اس نے کاؤنٹر پر موجود شخص سے لفافے کے پتے کے بارے میں پوچھا تو اس نے کسی افضل کو آواز دی۔ ایک بوڑھا شخص سامنے آیا، اس نے ڈاکے کی مخصوص وردی پہن رکھی تھی۔ کاؤنٹر والے نے اس سے پتے کا پوچھا۔

بوڑھے ڈاکے نے بتایا۔ ”یہ دائیں والے حصے میں ذرا

بیچھے ہے۔ سڑک سے نظر نہیں آتا ہے لیکن اوپر جاؤ گے تو سرخ چھت والا مکان ہے۔ دیواروں پر آسمانی رنگ ہے۔ عبید الرحمن کا مکان ہے، پر اب تو اس کا بیٹا بھی شہر میں ہوتا ہے۔“
”مجھے اسی نے بھیجا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”گاڑی اوپر جانے کا راستہ ہے؟“

”بالکل ہے، یہ جو ہوٹل کے ساتھ سڑک ہے اس پر چلے جاؤ۔۔۔ مکان بھی اسی کے آخر میں ہے۔“

وہ شکر یہ ادا کر کے باہر آیا اور گاڑی لے کر اوپر روانہ ہوا مگر مکان نظر آتے ہی اس نے گاڑی ایک باغ کے ساتھ روک دی اور خود پیدل آگے روانہ ہوا۔ مکان پرانا لیکن خوب صورت اور صاف ستھرا تھا۔ اس کے چاروں طرف اچھی خاصی زمین تھی۔ یہ کم سے کم بھی چار کنال زمین تھی جو پہاڑی علاقوں میں خاصی بھی جاتی تھی۔ زمین دائیں طرف نشیب میں چلی گئی تھی اور اس پر باغ تھا۔ وہ چار دیواری کے پاس آیا۔ یہ مشکل سے چھ فٹ اونچی تھی۔ قاریہ نے جیسی صورت حال بتائی تھی، اس میں تو یہ چار دیواری حفاظت کے لیے قطعی نا کافی تھی کوئی بھی آسانی سے اسے پھلانگ کر اندر جا سکتا تھا۔ مکان کے اندر اور احاطے میں کوئی سرگرمی نہیں تھی۔ اس نے سوچا اور پھر کال بتل بجائی۔ پستول عقب میں ٹراؤزر میں اڑسا ہوا تھا۔ اسے جیکٹ نے ڈھانپ رکھا تھا اس لیے کسی کے دیکھ لینے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ دوبارہ بتل بجانے پر بھی کوئی رد عمل نہیں ہوا تو اس نے چھوٹا دروازہ دھکیلا تو وہ کھل گیا۔

اس کی چھٹی حس نے خبردار کیا۔ جن لوگوں کو خطرہ ہوتا ہے، وہ اس طرح دروازے کھلے چھوڑ کر نہیں رکھتے۔ کیا اس گھر میں رہنے والی عورتوں کے ساتھ کچھ ہو چکا تھا؟ اس نے آس پاس کا جائزہ لیا اور اندر داخل ہو گیا۔ اس نے دروازہ بند کر دیا تھا اور دیوار کے ساتھ لگی بیلوں کی آڑ میں اندر کی طرف بڑھا۔ مکان زیادہ بڑا نہیں تھا۔ یہ مشکل سے تہائی کنال رقبہ پر تھا۔ اس کے آس پاس کی ساری جگہ خالی تھی۔ اس پر تراشی ہوئی گھاس تھی پھول دار پودوں کے تختے تھے۔ اس نے پستول نکال لیا۔ وہ داخلی دروازے تک آیا مگر اندر جانے کے بجائے اس نے سُن گن لی۔ اندر خاموشی تھی۔ وہ پلٹ کر دے قدموں بائیں طرف آ کر دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا پیچھے کی طرف آیا۔ ایک دروازہ اس طرف بھی تھا۔ اس نے ہینڈل گھما کر اسے چیک کیا تو وہ کھلا ہوا تھا۔ بہت آہستگی سے اس نے دروازہ کھولا اور اندر قدم رکھا تھا کہ کسی نے اس کا پستول والا ہاتھ پکڑ کر اندر کھینچا۔

ذہنی طور پر تیار ہونے کے باوجود وہ مزاحمت نہ کر سکا، کھینچنے والا بہت طاقتور تھا۔ اس نے پستول کا رخ نیچے رکھتے ہوئے اسے نیچے گرا دیا۔ اس نے پستول نہیں چھوڑا اور اس کا رخ حملہ آور کی طرف کرنا چاہا کہ کوئی چیز اس کے سر سے ٹکرائی اور یک لخت اس کی مزاحمت ختم ہو گئی۔ وہ بے ہوش نہیں ہوا تھا لیکن اسے لگا جیسے اس کا جسم اس کے قابو سے نکل گیا ہو۔ وہ ساکت ہو کر خود پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔ کسی نے بیدردی اسے پلٹ کر سیدھا کیا اور پھر اس کی تلاشی لی۔ اس کا پستول پہلے ہی لے لیا تھا، اب اس کی جیبوں سے موبائل، رقم اور گولیوں کا شاپر بھی نکال لیا گیا تھا۔ کسی نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ”پوری طرح تیار ہو کر آیا تھا۔“

”ملک اسے دیکھ کر خوش ہو گا۔۔۔ اس نے کہا تھا کہ اسے زندہ لانا ہے۔“ دوسرا بولا۔

”چلو اس کے ہاتھ پاؤں باندھو۔“ پہلے نے کہا۔
”میں جب تک گاڑی لاتا ہوں۔“

وہ آنکھ بند کیے ساکت لیٹا ہوا تھا۔ پہلا آدمی باہر چلا گیا، یہاں شاید دو ہی تھے۔ دوسرا اس پر جھکا اور اس کے ہاتھ پکڑے تھے کہ اس نے دائیں پاؤں کی ایڑی اس آدمی کی رانوں کے درمیان ماری۔ تکلیف کی شدت سے اس کی آنکھیں پھٹ گئیں اور منہ کھل گیا۔ یہ وہی طاقتور آدمی تھا جس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا تھا۔ مگر نازک جگہ ٹھیک سے لگنے والی ضرب نے اسے بے حال کر دیا تھا۔ اس نے کالر سے پکڑ کر آدمی کو کھینچا اور خود ایک طرف سرکتے ہوئے اس کا سرفرش سے ٹکرایا۔ یہ ضرب بھی شدید تھی اور وہ فوری بے ہوش ہو گیا۔ فرش سے اٹھتے ہوئے اس کا سر ہلکا سا چکرایا مگر فوراً ہی وہ سنبھل گیا۔ یہ بے ہوش ہونے کا وقت نہیں تھا اگر اس وقت وہ ہوش کھودیتا تو شاید پھر بھی ہوش نہ آتا۔ اس لیے وہ ہمت سے کام لے رہا تھا۔ اس نے طاقتور آدمی کے لباس سے اپنا پستول نکالا اور پہلے اس کا دستہ اس کے سر پر رسید کیا کیونکہ وہ ہوش میں آ رہا تھا۔ اس ضرب نے اسے یقینی طور پر بے ہوش کر دیا۔

یہ مکان کے عقبی حصے کا لاؤنج تھا جس کی کھڑکیاں اور ایک دروازہ عقبی لان کی طرف کھل رہا تھا۔ وہ اسی سے اندر آیا تھا۔ اس کے برابر میں کچن تھا۔ پھر ایک بیڈروم اور سامنے والے حصے میں بڑی سی نشست گاہ تھا۔ نشست گاہ کے ساتھ اور لاؤنج کے دوسری طرف ایک کمرہ اور تھا۔ طاقتور آدمی سے نمٹ کر وہ تیزی سے مکان کے سامنے

”ہاں...“

”عورتیں کہاں ہیں؟“

جواب میں پستہ قد شخص نے ایک گندی بات کی تو اس کا ہاتھ گھوما۔ پستول کی نال نے پستہ قد کا گال پھاڑ دیا۔ کراہ کے ساتھ اس کے منہ سے خون بہہ نکلا۔ اس نے نرمی سے کہا۔ ”فضول باتوں سے گریز کرو۔“

پستہ قد شخص خون تھوکتا رہا مگر اس کے انداز سے نہیں لگ رہا تھا کہ وہ زبان کھولنے کے موڈ میں ہے۔ وہ اٹھ کر تنومند آدمی کے پاس آیا۔ وہ خوفزدہ لگ رہا تھا۔ ”تم جانتے ہو عورتیں کہاں ہیں؟“

”وہ ملک کے پاس پہنچائی جا چکی ہیں۔“ اس نے فوری جواب دیا۔

”تو بھی جلد ملک کے قدموں میں ہوگا۔“ پستہ قد شخص تھوک تھوک کر بالآخر بولنے کے قابل ہوا تھا۔ اس نے غور سے اسے دیکھا۔

”تم دونوں میرے لیے یہاں رکے تھے... کیا تم مجھے جانتے ہو؟“

”تم عابد الرحمن ہو۔“ پستہ قد نے جواب دیا تو وہ چونکا۔ اب اس کی سمجھ میں آیا کہ وہ کیوں ایسے بول رہے تھے اور ملک اسے دیکھ کر کیوں خوش ہوتا۔ اس نے سوچ کر سوال کیا۔

”تم لوگ کس ملک کی بات کر رہے ہو... یہاں تو ہر شخص ملک ہے؟“

پستہ قد شخص خاموش رہا تو اس نے دوسرا سوال کیا۔

”ملک نے ان عورتوں کو کیوں اٹھوایا ہے؟“

”ملک کی باتیں ملک جانتے... ہم تو حکم کی تعمیل کرتے ہیں۔“

اس نے طاقتور آدمی سے ملک کے بارے میں سوال کیا تو اس نے پستہ قد شخص سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

”ہم ملک قادر حیات کے لیے کام کر رہے ہیں۔“

”عورتیں کہاں ہیں؟“

”ہمیں نہیں معلوم... انہیں دوسرے لوگ لے گئے ہیں۔ ہم تمہارے لیے یہاں رکے تھے۔“

”عورتوں کو کب لے جایا گیا؟“

”کل رات دو بجے۔“

وہ سوچ رہا تھا کہ کسی ملک کو عابد الرحمن سے کیا... پر خاش تھی؟ اور اس نے اس کی ماں اور بہن کو کیوں اٹھوایا تھا؟ اب اس کی شخصیت اور بھی پراسرار ہو گئی تھی۔ وہ کہاں

والے حصے میں آیا کیونکہ گاڑی کے لیے جانے والا فرنٹ والے دروازے سے باہر گیا تھا۔ اتنے ہنگامے کے باوجود اندر خاموشی تھی۔ وہاں کوئی نہیں تھا یا تھا تو بھی کسی رد عمل کے قابل نہیں تھا۔ اس وقت اسے خیال آیا کہ ان دونوں کی گفتگو سے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اس کے منتظر تھے اور وہ اسے کسی ملک کے سامنے پیش کرنے کی بات کر رہے تھے جو اسے دیکھ کر خوش ہوتا۔ ان لوگوں کو یا کسی ملک کو اس کے بارے میں کیا معلوم تھا اور یہ بھی کہ وہ یہاں آ رہا تھا۔

اسے باہر جانے والے کی فکر تھی۔ ان لوگوں نے بہت چالاکی سے کام لیا تھا۔ اپنی گاڑی باہر کھڑی کی تھی اور خود مکان کے عقبی حصے میں اس کے منتظر تھے۔ اس سوال کا جواب اس کے ذہن میں آ گیا تھا کہ انہیں اس کی آمد کا کیسے پتا چلا۔ اسے یقین تھا کہ جب اس نے قاریہ کو کال کی تو یہ

لوگ یہاں آ چکے تھے اور اس وقت قاریہ اور اس کی ماں ان کے قبضے میں تھیں۔ ان کی مرضی سے قاریہ نے کال ریسرو کی اور اسے بھائی سمجھتے ہوئے فوراً آنے کو کہا۔ اس کا مطلب تھا کہ یہ وہی لوگ تھے جن سے اس خاندان کو خطرہ تھا۔ اس کے ذہن میں ایک خیال اور آیا۔ کیا قاریہ نے سچ سچ اسے

بھائی سمجھ لیا تھا؟ کیا وہ اپنے بھائی کی آواز نہیں شناخت کر سکتی تھی؟ باہر کسی گاڑی کے رکنے کی آواز آئی تو وہ چونکا ہو گیا۔ اس نے دروازے کے پیچھے پوزیشن سنبھال لی۔ دوسرا آدمی پوری بے فکری سے آیا تھا۔ اس لیے آرام سے مار کھا گیا۔ سر پر لگنے والی ضرب نے اسے بھی ہوش دھوا اس سے بیگانہ کر دیا۔ یہ محسوس ہوئے جسم کا پستہ قد آدمی تھا۔ اس کی تلاشی لے کر

اس نے اس کا پستول بھی نکال لیا۔ اس کا موبائل اور رقم بھی اسی کے پاس تھی۔ طاقتور آدمی کے پاس سے کوئی ہتھیار نہیں نکلا تھا۔ وہ دوسرے آدمی کو بھی پیچھے کر عقبی کمرے میں لے آیا۔ پیچھے مٹھن میں دو درختوں کے درمیان الگنی کی رسیاں بندھی تھیں۔ اس نے کچن سے چاقو لیا اور یہ رسیاں کاٹ کر

لے آیا۔ ان دونوں کے ہاتھ پاؤں باندھے۔ ان کی طرف سے اطمینان کرنے کے بعد اس نے پورے گھر کا معائنہ کیا۔ دونوں عورتیں غائب تھیں۔ ان کو یہاں سے لے جایا جا چکا تھا۔ وہ کچن سے بوتل میں پانی لایا جو بخ بستہ تھا۔ اس نے

باری باری دونوں کے سروں پر پانی ڈالا تو وہ ہوش میں آنے پر مجبور ہو گئے۔ وہ پستہ قد آدمی کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ہوش میں آتے ہی اس نے سر دلچھ میں کہا۔

”میری آواز سن رہے ہو؟“

پستہ قد شخص نے جھنجھری لی اور نفرت سے بولا۔

”میری آواز سن رہے ہو؟“

پستہ قد شخص نے جھنجھری لی اور نفرت سے بولا۔

تھا اور قادر حیات جیسے شخص کو کیوں مطلوب تھا؟ کچھ دیر بعد اس نے ان دونوں کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”مجھے ہر قیمت پر دونوں عورتیں واپس چاہئیں۔“

☆☆☆

قاریہ کو ہوش آیا تو وہ ایک چارپائی پر لیٹی ہوئی تھی اور اس کے سرہانے ماں متفکر بیٹھی تھی۔ اسے ہوش میں آتے دیکھ کر وہ بے تابی سے اس پر جھکی۔ ”قاریہ... تو ٹھیک ہے نا؟“

”جی امی۔“ اس نے کمزور لہجے میں کہا۔ ”ہم کہاں ہیں؟“

”قادر حیات کے قبضے میں ہیں۔“ ماں نے نفرت سے کہا۔

”کسی نے میرے منہ پر کپڑا رکھا تھا اور پھر میں بے ہوش ہو گئی۔“

”تیرے پاس رائفل تھی اس لیے تجھے بے ہوش کر دیا۔ پھر یہ ہمیں کہیں اور لے آئے ہیں۔“

”یہ جگہ کہاں ہے؟“ وہ اٹھ بیٹھی۔ یہ کچا سا کمرہ تھا۔ دیواریں پچی مٹی سے کی تھیں اور اوپر لکڑی اور پتھریں کی چھت تھی۔ فرش بھی کچا تھا۔ یہاں ایک چارپائی اور کچھ کاٹھ کباڑ پڑا تھا ایک طرف لائٹیں جل رہی تھیں مگر لکڑی کے دوپٹ والے دروازے کی جھری سے جھلکتی ہوئی روشنی بتا رہی تھی کہ

باہر دن نکل آیا ہے۔ ماں نے نفی میں سر ہلایا۔

”یہاں لاتے ہوئے میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی تھی۔ میں نہیں جانتی کہ ہم کہاں ہیں؟“

”آپ نے قادر حیات کو دیکھا تھا؟“

ماں نے سر ہلایا۔ ”اس نے آتے ہی مجھے بلا لیا تھا۔“

”وہ کیا چاہتا ہے؟“

”وہ چاہتا ہے کہ میں مکان اور زمین کی ملکیت کے کاغذات پر دستخط کر دوں... میں نے اسے بتایا کہ مکان اور زمین عابد کے نام پر ہے، وہی دستخط کر سکتا ہے۔“

قاریہ پریشان ہو گئی۔ ”امی، یہ آپ نے کیا کیا... اب وہ بھائی کے پیچھے پڑ جائے گا۔“

ماں نے یہ سوچا نہیں تھا، وہ بھی پریشان ہو گئی۔ ”پتا نہیں میرا بچہ کہاں ہے؟“

☆☆☆

عالیہ فکر مند تھی کیونکہ عابد کا نمبر ایک بار پھر بند جا رہا تھا۔ اس کی ماں اب ٹھیک تھی، اس کا آپریشن کامیاب رہا تھا اور وہ ہوش میں بھی آ گئی تھی۔ اس نے ڈاکٹر کے سوالات کے درست جوابات دیے تھے۔ ماں کی طرف

سے اطمینان کے بعد اسے پہلے سے زیادہ پریشانی سے عابد کا خیال آ رہا تھا۔ اس کے پاس قاریہ کا نمبر تھا لیکن وہ اسے کال کرتے ہوئے ہچکچا رہی تھی۔ اب اس سے صبر نہیں ہوا تو اس نے قاریہ کا نمبر ملا یا مگر نیل جا رہی تھی اور کوئی کال ریسیو نہیں کر رہا تھا۔ مجبوراً اس نے ایس ایم ایس کیا۔ ”میں عالیہ ہوں... عابد مجھے جانتے ہیں۔ پلیز اگر عابد تمہارے پاس ہیں تو ان سے کہو مجھے کال کریں یا موبائل آن کر لیں... عالیہ۔“

ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ اس کی ماں کی حالت توقع سے کہیں بہتر ہے اور امکان تھا کہ تین دن بعد اسے گھر جانے کی اجازت مل جائے گی۔ عالیہ رات میں بہت کم سوئی تھی اور اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں لیکن وہ سونا نہیں چاہتی تھی کہ کہیں اس دوران میں عابد یا اس کی بہن کا ایس ایم ایس نہ آ جائے۔ وہ آئی سی یو میں ماں کے ساتھ تھی پردہ ہٹا تو وہ سمجھی کہ ڈاکٹر یا کوئی نرس ہو گی اس نے آنے کو کہا تو

خلاف توقع عابد اندر آیا۔ وہ تھکا ہوا تھا اور بڑھی ہوئی داڑھی کے ساتھ خاصا مختلف لگ رہا تھا۔ ماں گہری نیند میں تھی اس لیے عالیہ نے بے ساختہ عابد کے ہاتھ تھام لیے۔ وہ گلوگیر لہجے میں بولی۔ ”شکر ہے آپ آ گئے... میں بہت پریشان تھی...“

”شکر ہے تم بھی ٹھیک ہو ورنہ میں تمہارے لیے فکر مند تھا۔“ عابد نے کہا اور ماں کی طرف دیکھا تو وہ جلدی سے بولی۔

”آپریشن کامیاب رہا... دو تین دن میں امی گھر جا سکیں گی۔ آپ کہاں تھے؟... گھر میں سب خیریت ہے نا؟“

”بتاؤں گا تمہیں۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”میں گھر نہیں گیا تھا بلکہ کام سے گیا تھا اور واپس آیا تو گھر میں چوری ہو گئی۔“

”میرے خدا... نقصان تو نہیں ہوا؟“

”چور میرا موبائل اور گاڑی لے گئے۔“

عالیہ چونکی۔ ”موبائل اور بایک...؟“

”نہیں، بایک موجود ہے کار غائب ہے۔ میں بایک پر آیا ہوں۔“

عالیہ دم بہ خود رہ گئی پھر اس نے سنبھل کر کہا۔ ”تب وہ کون تھا جو بایک پر آیا تھا اور آپ نے اسے بھیجا تھا؟“

عابد حیران ہوا۔ ”میں نے کسے بھیجا... تم کیا کہہ رہی ہو؟“

عالیہ نے اسے بتایا کہ اس کی غیر موجودگی میں کیا ہوا تھا۔ عابد سن رہا تھا اور اس کے چہرے پر فکر کے آثار بڑھ

گئے تھے۔ اس نے عالیہ کا موبائل لے کر دیکھا اور اس میں ایس ایم ایس پڑھے جو اسی کے موبائل سے بھیجے گئے تھے۔ وہ حیران تھا کہ یہ کون شخص تھا جو یوں اس کے گھر میں کھسا۔ اس نے اطمینان سے وہاں کئی دن گزارے، کھایا پیا۔ یہی نہیں وہ کھانے کا مزید سامان بھی لایا۔ پہلے اس کی بائیک استعمال کی اور پھر اس کی کار لے گیا۔ اس نے صرف چوری نہیں کی بلکہ وہ اس کے کام آیا تھا۔ اس وقت اس کے لیے وہ کیا جو کوئی اور نہیں کر سکتا تھا۔ عالیہ اسے بتا رہی تھی۔

”عابد... وہ آپ کی طرح پھرتیلا اور لڑنے کا ماہر تھا۔ اس نے اتنی آسانی سے دو مسلح لفنگوں کو قابو کر لیا اور انہیں ہاتھ بدم میں بند کر دیا پھر اس نے پیچھے آنے والی بائیک پر قافار کے اور اسے چلانے والے کو زخمی کر دیا۔“

اس نے گہری سانس لی۔ ”عالیہ! یہ اسی چور کا کام ہے۔ میں کسی بلال مصطفیٰ کو نہیں جانتا۔“

”وہ کہہ رہا تھا کہ آپ کے ساتھ کام کرتا ہے۔“

”یہ بھی غلط ہے اور شاید وہ زخمی تھا کیونکہ میرے میڈیکل باکس سے خاصا سامان استعمال ہوا ہے۔ مجھے ایک بلٹ بھی ملا ہے۔“ عابد نے اسے بلٹ دکھایا۔ ”یہ استعمال شدہ ہے۔ کیا وہ شخص زخمی لگ رہا تھا؟“

”نہیں... وہ تو بالکل ٹھیک تھا۔“

”شاید معمولی زخم تھا اسی لیے اس نے خود ہی بلٹ نکال لیا تھا۔ وہ کم سے کم دو دن میرے گھر میں رہا۔ دیکھنے میں کیسا لگ رہا تھا؟“

عالیہ نے اس کا نقشہ کھینچا۔ عابد نے سر ہلایا۔ ”میں دیکھوں گا... میرا موبائل اس کے پاس ہے۔ اپنا موبائل دو۔“

اس نے عالیہ کے موبائل سے اپنا نمبر ڈائل کیا۔ بیل جاری تھی مگر کال ریسیو نہیں ہو رہی تھی۔ اس نے مایوسی سے کہا۔ ”پتا نہیں وہ کہاں ہے لیکن میرا موبائل آن ہے۔“

”اگر موبائل آن ہے تو آپ معلوم کر سکتے ہیں کہ وہ کہاں ہے۔“ عالیہ کہتے ہوئے شرمائی۔ ”میں نے آپ کا نمبر ٹریکنگ پر لگایا ہوا ہے۔ ایک ایس ایم ایس کر کے میں آپ کی لوکیشن معلوم کر سکتی ہوں۔“

عابد خوش ہو گیا۔ ”یہ تم نے اچھا کام کیا ہے۔“

عالیہ نے لوکیشن معلوم کرنے کے لیے ایس ایم ایس کیا تو کچھ دیر بعد سروس کی طرف سے جوابی ایس ایم ایس میں لوکیشن آگئی۔ وہ حیران ہوئی۔ ”یہ تو آپ کا گاؤں ہے۔“

عابد نے دیکھا اور پریشان ہو گیا۔ اس نے قاریہ کا نمبر ملا یا۔ بیل جاری تھی مگر کسی نے کال اٹینڈ نہیں کی۔ عالیہ

نے کہا۔ ”میں نے کال اور ایس ایم ایس کیا تھا، آپ کا جاننے کے لیے لیکن قاریہ کا جواب نہیں آیا۔“

”کوئی گڑبڑ ہے... مجھے جانا ہوگا۔“ عابد نے کہا۔

عالیہ فکر مند ہو گئی۔ ”آپ چلے جائیں گے؟“

”ہاں... لیکن تم فکر مت کرو... ابھی تم یہاں ہو اگر کوئی مشکل ہو یا میں نہ آؤں اور امی کو ڈسچارج کر دیا جائے تو تم اس نمبر پر کال کر کے مدد طلب کر سکتی ہو۔“ عابد نے ایک نمبر اس کے موبائل میں فیڈ کر کے اسے ہیلپ کا نام دے دیا تھا۔ ”تمہارے پاس پیسے ہیں؟“

”ہاں... اس لحاظ سے مسئلہ نہیں ہے۔“

”میں جلد آؤں گا اور اگر نہ آسکا۔“ اس کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ عالیہ نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

”ایسا نہ کہیں... آپ آئیں گے۔ مجھے پتا ہے۔ میں انتظار کروں گی۔“

خود پر جبر کر کے عابد نے اسے اللہ حافظ کہا اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔ اس کے پاس بائیک تھی اور اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اڑ کر گھر پہنچ جائے۔ پہاڑی علاقہ شروع ہونے پر بھی اس نے رفتار کم نہیں کی۔ راستہ دو گھنٹے کا تھا لیکن وہ ڈیڑھ گھنٹے میں وہاں پہنچ گیا۔ دوپہر کے دو بج رہے تھے۔ راستے میں ایک جگہ اپنی کار دیکھ کر وہ چونکا۔ اس نے رک کر کار کا معائنہ کیا۔ وہ خالی اور لاک تھی۔ انجن بھی ٹھنڈا تھا۔ یعنی اسے یہاں آئے ہوئے دیر ہو گئی تھی۔ گھر کے قریب پہنچ کر اس نے بائیک ڈراڈور روکی اور خود پیدل روانہ ہوا۔ گیٹ کی جھری سے اندر جھانکا تو اسے ایک اجنبی گاڑی دھائی دی۔ وہ گیٹ سے اندر آنے کے بجائے چار دیواری کے ساتھ ساتھ آگے بڑھا اور ایک جگہ سے دیوار پھلانگ کر اندر داخل ہو گیا۔ اندر آتے ہی اس نے پستول نکال لیا تھا اور درختوں کی آڑ لیتے ہوئے مکان کی طرف بڑھنے لگا۔

☆☆☆

پستہ قد شخص کا حشر ہو چکا تھا۔ گال کے ساتھ ساتھ اس کا ماتھا اور ہونٹ بھی پھٹ گئے تھے اور وہ اپنے ہی لہو میں لتھڑا بہت خوفناک لگ رہا تھا۔ سامنے سے لگنے والی ضرب نے اس کے دودانت فارغ کر دیے تھے۔ اب اس سے ٹھیک سے بولا بھی نہیں جا رہا تھا۔ اس نے سرد لہجے میں کہا۔ ”مجھے تم پر ذرا بھی ترس نہیں آئے گا۔ مجھے عورتوں پر ظلم کرنے والے مردوں سے سخت نفرت ہے۔ اگر مجھے تمہیں قتل بھی کرنا پڑے تو میں بہت خوشی سے یہ کام کروں گا۔“

رخ اس کی طرف تھا۔ اس نے گہری سانس لی اور دھیمی آواز میں بولا۔ ”یہ تم ہو۔“

”تم نے پستول نہیں پھینکا۔“ اس نے لکار کر کہا تو اس نے ہاتھ پیچھے کر کے پستول اس کی طرف پھینک دیا اور بولا۔

”تم تھک چکے ہو، میں تمہارا دشمن نہیں ہوں۔ ان لوگوں نے تمہاری ماں اور بہن کو اغوا کیا ہے۔ میں ان کے بارے میں معلوم کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔“

”جھوٹ بولتا ہے یہ۔“ اب تک بھگیلی بی بی بنے رہنے والا طاقتور آدمی شیر بن کر بولا۔ ”اسی نے انہیں غائب کیا ہے اور ہمیں بھی پکڑ رکھا ہے۔“

”ابھی معلوم ہو جائے گا۔“ عابد نے اندر آتے ہوئے کہا۔ ماں اور بہن کے غائب ہونے کا سن کر وہ مضطرب ہوا تھا مگر اس نے خود پر قابو رکھا تھا۔ اس نے پستول اٹھا کر اپنی جیکٹ میں رکھا اور اس کی طرف دیکھا۔

”بلال مصطفیٰ... تمہارا اصل نام ہے؟“ اس نے سوچا اور سر ہلایا۔ ”یہی میرا نام ہے۔“ عابد چونک گیا۔ اس نے غور سے اسے دیکھا۔ ”تم جانے پہچانے لگ رہے ہو؟“

اس نے انکار کیا۔ ”ہماری کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔“ ”فون پر بھی نہیں؟“ عابد کا لہجہ معنی خیز ہو گیا تو بلال نے چونک کر اسے دیکھا۔

”تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟“ ”تم میرے گھر میں کیوں گھے تھے اور پھر تم نے میرا گھر ہی استعمال نہیں کیا بلکہ وہاں سے چیزیں بھی چرائیں۔“

”میں نے استعمال کیں، چرا یا کچھ نہیں۔“ بلال نے تصحیح کی۔ ”اگر تم اجازت دو تو میں تمہارا موبائل اور کار کی چابی واپس کر دوں؟“

”بہت آہستہ سے۔“ عابد نے اسے خبردار کیا۔ ”میں تمہیں نقصان پہنچانا نہیں چاہتا اگر تم نے مجبور نہ کیا تو...“

بلال نے ان دونوں کے پرس بھی نکال لیے تھے۔ اس نے موبائل کے ساتھ کار کی چابی بھی عابد کی طرف بڑھا دی۔ پھر ایک ہزار کانوٹ اور آگے کیا۔ ”یہ اس کے بدلے جو میں نے تمہارے بچن سے کھایا پیا تھا۔“

”اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ عابد نے بے پروائی سے کہا۔ ”تمہارا مجھ پر حق بنتا ہے۔“

”وہ کیسے؟“ بلال کہتے ہوئے چونکا۔ ”میرے خدا... تم وہی ہو...“

طاقتور آدمی مسلسل انکار کر رہا تھا کہ اسے نہیں معلوم کہ عورتیں کہاں لے جائی گئی ہیں جبکہ پستہ قد ہٹ دھرمی دکھا رہا تھا۔ اپنا حشر کروا کر بھی وہ زبان کھولنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس کے پاس سے ایک موبائل اور ملا تھا۔ اچانک اس کی نیل بجی۔ اس نے اسکرین پر دیکھا، اس پر صرف ملک لکھا ہوا تھا۔ اس نے موبائل پستہ قد کے سامنے کیا۔ ”یہ ملک کی کال ہے؟“

”ریسیو کر... کے دیکھ لو۔“ پستہ قد شخص نے مشکل سے کہا۔

مگر اس نے جواب میں موبائل واپس جیب میں ڈال لیا، کال نہیں کاٹی۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ طاقتور آدمی کو اس بارے میں نہیں معلوم ہے۔ البتہ پستہ قد جانتا ہے لیکن وہ ضدی آدمی تھا۔ زبان کھولنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس کی زبان کیسے کھلوائے؟ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا، ان عورتوں کی جان اور آبرو کی سلامتی کی امید کم ہوتی جا رہی تھی۔ وہ پستہ قد شخص کی زبان کھلوا سکتا تھا مگر اس میں بہت وقت لگتا۔ وہ جلد از جلد یہ کام کرنا چاہتا تھا۔ دوسرے اسے خطرہ تھا کہ ان لوگوں کے مزید سانحہ نہ آجائیں۔ اس نے کہا۔ ”بہتر ہے زبان کھول دو ورنہ سمجھ لو کہ یہ صرف آغاز ہے۔“

پستہ قد شخص نے خون تھوکا۔ ”تم ہم کو مار سکتا ہے، اس سے زیادہ اور کیا کر سکتا ہے۔“

”نہیں، میں اس سے زیادہ کر سکتا ہوں۔ میں تمہارے گھٹنے کی ہڈیاں گولیوں سے توڑ دوں گا اور تم دوبارہ کبھی اپنے پیروں پر کھڑے نہیں ہو سکو گے۔ پھر چاتو سے تمہاری دونوں آنکھیں نکال دوں گا۔ تمہاری زبان کاٹ دوں گا اور تمہارے کان ناکارہ کر دوں گا۔ تم زندہ رہو گے لیکن کیسے زندہ رہو گے، تم سوچ سکتے ہو؟“

پہلی بار پستہ قد شخص کے چہرے پر خوف نمودار ہوا لیکن اس نے کسمسا کر کہا۔ ”مجھ کو نہیں معلوم... اور تم اپنی فکر کرو۔“

”تم اس طرح نہیں مانو گے۔“ اس نے کہتے ہوئے پستہ قد شخص کے دائیں گھٹنے پر پستول کی نال رکھ دی لیکن اس سے پہلے کہ وہ گولی چلاتا، عقب سے ایک ٹھہری ہوئی آواز آئی۔ ”کوئی حرکت مت کرنا بلال مصطفیٰ... پستول آہستہ سے پیچھے پھینک دو۔“

اس نے آہستہ سے سر گھما کر دیکھا۔ عقبی صحن کی طرف کھلنے والے دروازے پر عابد کھڑا تھا۔ اس کے پستول کا

عابد نے سر ہلایا۔ ”تم نے دیر سے شناخت کیا۔۔۔ میں پہلے ہی تمہاری آواز سے پہچان چکا تھا۔“
 ”میں تم سے علیحدگی میں بات کرنا چاہتا ہوں۔“
 بلال نے کہا تو عابد اسے کچن میں لے آیا۔ یہاں سے وہ ان دونوں پر نظر رکھ سکتے تھے اور آپس میں بات بھی کر سکتے تھے۔

”سب سے پہلے میں جاننا چاہتا ہوں کہ تم میرے گھر میں کیوں اور کیسے گھسے؟“

”یہ بعد کی بات ہے، اس وقت زیادہ اہم تمہاری ماں اور بہن ہیں۔ وہ ان لوگوں کے قبضے میں ہیں۔“

”کن لوگوں کے؟“ عابد فکر مند ہو گیا۔ اب تک وہ سمجھ رہا تھا کہ اس کی ماں اور بہن محفوظ ہیں۔

”کوئی ملک قادر حیات ہے؟“
 وہ اچھل پڑا۔ ”قادر حیات۔۔۔ اور تم مجھے اب بتا رہے ہو؟“

”تم آتے ہی غیر ضروری باتوں میں الجھ گئے تھے۔“
 بلال نے کہا۔ ”میں ان سے یہی اگوار ہا تھا کہ ان دونوں کو کہاں رکھا گیا ہے۔“

عابد کا موڈ بدل گیا۔ اس نے دانت پیس کر کہا۔ ”یہ ضرور بتائیں گے۔۔۔ اگر نہیں بتایا تو میں ان کی بوٹی بوٹی الگ کر دوں گا۔“

☆☆☆

ملک قادر حیات اس کے لیکن وسیع احاطے والے ڈیرے میں ٹھہل رہا تھا۔ یہ اس کی زمینوں پر تھا۔ قصبے کے عالی شان مکان اور زمین کے علاوہ بھی اس کے پاس بہت بڑی زمین تھی لیکن اس کی ہوس کم نہیں ہوئی تھی۔ وہ رشتے داری کا لحاظ ایک طرف رکھ کر پستی کی انتہائی حد پر اتر آیا تھا اور اس نے قاریہ اور اس کی ماں کو اغوا کر لیا تھا۔ اس کی اس زمین پر تمباکو کاشت ہوتی تھی۔ یہاں کام کرنے والے زیادہ تر افغانی تھے جو پورے پورے خاندان سمیت یہاں رہ رہے تھے اور ان کے توسط سے قادر حیات کو کچھ ایسے افراد ملے تھے جو مجرمانہ ذہن رکھتے تھے اور معقول معاوضے پر اس کے لیے سب کرنے کو تیار رہتے تھے۔ قاریہ اور اس کی ماں کو اغوا کرانے کا کام اس نے انہی لوگوں سے لیا تھا۔ اسے خطرہ نہیں تھا کہ بات باہر نکلے گی۔ ویسے شہ سب سے پہلے اسی پر جاتا لیکن اسے اس کی پروا نہیں تھی۔ سارا کام خوش اسلوبی سے ہوا تھا، البتہ ایک مسئلہ سامنے آیا تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ مکان اور زمین کی ملکیت عابد کی ماں کے پاس

ہے لیکن اس نے انکشاف کیا تھا کہ یہ ملکیت عابد کے پاس تھی۔ اس کے پیش کار کے دفتر میں تعلقات تھے اور اس نے ایک کال کر کے تصدیق کر لی تھی کہ یہ بات درست ہے۔ اس کے آدمی قاریہ کا موبائل بھی لے آئے تھے۔ اس پر کال آنے لگی تو اس نے ریسیو نہیں کی پھر عابد کے نمبر سے ایس ایم ایس آیا کہ وہ کال ریسیو کرے۔ قادر حیات خوش ہو گیا کہ وہ جس کام کے لیے پریشان تھا، یعنی عابد سے کیسے رابطہ کرے کہ وہ یہاں دوڑا آئے، وہ خود ہو گیا تھا۔ وہ کوٹھری میں آیا جہاں دونوں ماں بیٹی قید تھیں۔ اس نے موبائل قاریہ کو دیا اور ماں کے سر پر پستول رکھا۔

”ابھی عابد کی کال آئے گی۔ اسے کہنا فوراً گھر آئے۔ اس کے خلاف ایک لفظ بھی کہا تو تیری ماں کا بھیجا باہر ہوگا۔“

قادر حیات سفاک تاثرات اور خون جیسی سرخ رنگ آنکھوں والا تو مند شخص تھا۔ نرم لہجے میں بھی بات کرتا تو ایسا لگتا تھا کہ سامنے والے کو پھاڑ کھائے گا۔ قاریہ نے بے چون و چرا اس کے حکم کی تعمیل کی اور جب اس نے اپنی بات کہہ دی تو قادر حیات نے جھپٹ کر اس سے موبائل لے کر کال کاٹ دی۔ قاریہ نے اس سے کہا۔ ”خدا کے لیے ہمیں جانے دو۔۔۔ امی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“

”چپ کر کے پڑی رہ۔۔۔ اب تمہاری قسمت کا فیصلہ عابد کے آنے پر ہوگا۔“ قادر حیات اسے جھڑک کر باہر نکل گیا۔ قاریہ نے اس پر خدا کا شکر ادا کیا تھا کہ اس کے یا ماں کے ساتھ کوئی برا سلوک نہیں ہوا تھا۔ ورنہ اس نے قادر حیات کے بارے میں سنا تھا کہ وہ عیاش شخص ہے۔ شراب اور عورتوں کا رسیا ہے۔ کال کے بعد اسے کچھ اطمینان ہوا کہ بھائی آئے گا تو شاید ان کی جان بچنے کی کوئی راہ نکل آئے۔ قادر حیات نے فوری طور پر اپنے دو آدمی روانہ کیے اور انہیں حکم دیا کہ وہ عابد کو بے دست و پا کر کے یہاں لے آئیں۔ ان میں سے پستہ قد جس کا نام اشرف شاہ تھا، اس کے ڈیرے سے روانہ ہوا اور اس نے دوسرے شخص بابر کو راستے سے لیا مگر انہیں گئے ہوئے خاصی دیر ہو چکی تھی اور اب تک وہ واپس آئے تھے، نہ ان کی طرف سے کوئی پیغام آیا۔ قادر حیات نے اشرف کو کال کی لیکن وہ ریسیو نہیں کر رہا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ قادر حیات کی بے چینی بڑھ رہی تھی۔ وہ جلد از جلد اس قصبے کو نمٹا دینا چاہتا تھا۔ وہ مکان اور زمین اس کے قبضے میں آتی تو پورے قصبے میں اس کا مکان سب سے اونچا ہو جاتا۔

”میں تم پر اعتبار نہیں کر سکتا۔ تم ایک ہاتھ سے مجھ سے سائن کراؤ اور دوسرے ہاتھ سے ان کو میرے حوالے کرو۔“ عابد نے کہا۔

”جیسا میں نے کہا ہے ویسا ہی کرو۔۔۔ ورنہ یہ دونوں بہت عذاب سے مریں گی۔ تم بھی نہیں بچو گے۔ تم میرا مقابلہ نہیں کر سکتے۔“ قادر حیات کا لہجہ سفاک ہو گیا۔

”تم مجھے جانتے نہیں ہو۔ میں اکیلا ہی تمہارے لیے کافی ہوں۔ یہ بات بھول جاؤ کہ میں تمہاری بات مان لوں گا۔“

”ٹھیک ہے، تم گھر پہنچو اور میرے آدمی جہاں لے جائیں ان کے ساتھ چلے آؤ۔“

”میں ایک گھنٹے بعد تم سے بات کرتا ہوں۔“ عابد نے کہا اور کال کاٹ دی۔ وہ کچن میں تھے اور بلال کان لگا کر سن رہا تھا۔ اس نے کہا۔

”یہ مسلسل اپنے آدمی کو کال کر رہا ہے۔ میرا خیال ہے اس کی بات کرا دو ورنہ وہ مشکوک ہو جائے گا۔“

”یہ کیسے بات کرے گا؟“ عابد نے بد مزگی سے اشرف کی طرف دیکھا۔ ”تم نے اس کا حشر کر دیا ہے۔ بولا تو فوراً پتا چل جائے گا کہ گڑبڑ ہے۔“

”دوسرے کی بات کرا دو، وہ فرمانبردار ہے جو کہو گے وہی کہے گا۔“

وہ اس کمرے میں آئے تو اتفاق سے اسی وقت اشرف کے موبائل پر کال آنے لگی۔ بلال نے بابر سے کہا۔

”کال ریسیو کرو اور قادر حیات سے کہو کہ سب ٹھیک ہے اور تم لوگ عابد کا انتظار کر رہے ہو۔ وہ ابھی تک نہیں آیا ہے۔ میری بات سمجھ گئے ہوتا؟“

بابر نے سر ہلایا۔ بلال نے موبائل اسے تھمایا اور پستول کی نال اس کے سر سے لگا دی۔ اس نے کال ریسیو کی اور تھوک نکل کر بولا۔ ”جی ملک جی! اشرف باہر ہے۔۔۔ جی موبائل میرے پاس تھا۔۔۔ اشرف نے تیل آف کی ہوئی ہے۔۔۔ اس لیے پتا نہیں چلا۔۔۔ ابھی دیکھا ہے۔۔۔ نہیں جی وہ اب تک نہیں آیا۔۔۔ ہم انتظار کر رہے ہیں۔۔۔ ٹھیک ہے ملک جی۔“ اس نے کال کاٹ دی اور مردہ لہجے میں پوچھا۔

”میں نے ٹھیک کہا نا؟“

”شاباش۔“ بلال نے اس کا شانہ تھپکا اور عابد کو اشارہ کیا۔ عابد نے ٹائیگر کو اس کی کونٹھری میں بند پایا تھا لیکن وہ ٹھیک تھا۔ وہ دوبارہ کچن میں آئے۔ ”اب وہ اپنے آدمیوں کی طرف سے مطمئن ہو گا۔ تمہارے پاس

کچھ دیر بعد اس نے دوبارہ اشرف شاہ کو کال کی، اس بار بھی اس نے ریسیو نہیں کی۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ اشرف شاہ اتنی دیر موبائل نہ دیکھے۔ کوئی گڑبڑ ہوئی تھی۔ قادر حیات متفکر ہو گیا۔ اس نے اپنے پاس موجود قاریہ کا موبائل نکالا اور اس پر دیکھا۔ عابد کے نمبر سے اس پر کال موجود تھی۔ قادر حیات نے عابد کا نمبر ملا یا۔ کچھ دیر بعد تیل جانے لگی۔ ایک بار تیل بج بج کر بند ہو گئی۔ قادر حیات نے دوبارہ نمبر ڈائل کیا۔ اس بار کال ریسیو ہوئی اور کوئی بولا۔ ”ہیلو۔۔۔“

قادر حیات کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

☆☆☆

کال عابد نے ریسیو کی۔ اس نے ہیلو کہا تو جواب میں اسے قادر حیات کی آواز سنائی دی۔ ”عابد۔۔۔ تم کہاں ہو۔۔۔ اب تک گھر نہیں پہنچے؟“

عابد نے اداکاری کی۔ ”قاریہ کا موبائل تمہارے پاس کیسے آیا اور وہ کہاں ہے؟“

”صرف قاریہ نہیں، تمہاری ماں بھی میرے پاس ہے اور بالکل محفوظ ہے۔“

”کیا بکواس کر رہے ہو؟“ عابد نے گرج کر کہا۔

”یہ بکواس نہیں حقیقت ہے۔ ایک منٹ میں تمہاری بات کراتا ہوں۔“

عابد نے بلال کی طرف دیکھ کر آنکھ ماری۔ ایک منٹ بعد قاریہ کی آواز آئی، وہ رو رہی تھی۔ عابد تڑپ گیا۔

”قاریہ۔۔۔ کیسی ہے؟ امی کہاں ہیں؟“

”وہ میرے پاس ہیں۔۔۔ بھائی اس شیطان نے ہمیں اغوا کر لیا ہے۔ پلیز ہمیں اس سے آزاد کرائیں۔۔۔ موبائل دو۔۔۔“ قاریہ کے چلانے کی آواز آئی۔ پھر قادر حیات نے کہا۔

”تم نے بات کر لی اپنی بہن سے۔۔۔ اور اطمینان ہو گیا ہو گا۔ اب تمہارے پاس صرف چھ گھنٹے کا وقت ہے۔“

”چھ گھنٹے۔۔۔ وہ کس لیے؟“

”تم اس وقت کہاں ہو؟“

”دارالحکومت میں جہاں میں کام کرتا ہوں۔“

”تم فوراً اپنے گھر کی طرف چل پڑو۔ وہاں میرے آدمی ہوں گے۔ وہ تمہیں مکان اور زمین کی ملکیت کے کاغذات دیں گے اور تم ان پر سائن کرو گے۔ جب یہ کاغذات مجھے مل جائیں گے تو تمہاری ماں اور بہن تمہیں واپس مل جائیں گی۔“

وقت ہے۔“

عابد چونکا۔ ”میرے پاس... کیا تم جا رہے ہو؟“
بلال ہچکچایا۔ ”میرا خیال تھا کہ میں جس حد تک کر سکتا
تھا میں نے کر دیا ہے۔“

عابد نے سوچا اور سر ہلایا۔ ”بلکہ زیادہ ہی کیا ہے۔
میں عالیہ کی مدد کے لیے تمہارا شکر گزار ہوں۔“

”وہ میں نے حساب برابر کیا تھا... تمہارے گھر میں
پناہ لی تھی اور اپنا علاج کیا تھا۔“

”تمہیں گولی لگی تھی؟“ عابد نے پوچھا۔ ”زخم کیسا ہے؟“
اس نے پیٹ سے شرٹ اوپر کر کے اور پٹی ہٹا کر اپنا
زخم دکھایا۔ ”اب تقریباً ٹھیک ہے، گولی بھی زیادہ اندر نہیں
گئی تھی۔“

”ہاں بہتر لگ رہا ہے۔“ عابد نے سر ہلایا۔ ”تم
کہاں جاؤ گے؟“

”جہاں تقدیر لے جائے۔“ بلال نے سر دآہ بھر کر
کہا۔ عابد اسے باہر تک چھوڑنے آیا اور آخری بار گرم جوشی
سے اس سے ہاتھ ملا کر اسے رخصت کیا۔ پھر وہ گیٹ بند
کر کے اندر آیا۔ اب اسے اشرف کی زبان کھلوانی تھی۔ وہ
کچھ چیزوں کے ساتھ لاؤنج میں آیا تو اشرف اور بابر کے
چہرے اسے دیکھ کر زرد پڑ گئے۔

☆☆☆

قادر حیات بابر سے بات کرنے کے بعد مطمئن تھا۔
اسے یقین تھا کہ جلد عابد اس کے سامنے ہوگا۔ اس کا ارادہ تھا
کہ وہ مکان اور زمین کے کاغذات پر سائن کر کے ان
تینوں کو اس وقت تک اپنی تحویل میں رکھے گا جب تک پیش
کار کے دفتر میں مکان اور زمین اس کے نام نہیں ہو جاتی۔
اسے معلوم تھا کہ کس طرح پیسا کھلا کر اپنا کام کرانا ہوتا ہے
اور پیسے کی اس کے پاس کمی نہیں تھی۔ عبید الرحمن کی زندگی
سے ہی قادر حیات کی اس زمین پر نظر تھی۔ اس نے کئی بار
کوشش کی کہ وہ اسے یہ زمین فروخت کر دے مگر عبید الرحمن
نے ہمیشہ انکار کیا۔ پھر جب ہائی وے قصبے کے درمیان سے
گزری تو زمین کی قیمت راتوں رات کہیں سے کہیں پہنچ
گئی۔ اسی لحاظ سے قادر حیات کی زمین کے لیے خواہش بھی
بڑھی۔ تمام کوششوں میں ناکامی کے بعد اسے یہ کام کرنا پڑا
تھا اور اب اسے کامیابی کی امید ہوئی تھی۔ اس خوشی میں اس
نے بوتل کھول لی۔

جب تک دھوپ تھی، وہ باہر رہا مگر دھوپ ختم ہونے
پر وہ اندر آ گیا۔ یہاں ایک چھوٹی سرخ کچیریل کی چھت

والی خوب صورت سی عمارت تھی۔ اندر نشست گاہ میں
انگلیٹھی جل رہی تھی اور اس کی حرارت سے کمر خوشگوار حد
تک گرم ہو گیا تھا۔ قادر حیات کے لیے تلا ہوا دیسی مرغ لایا
گیا تھا۔ وہ دھسکی کے ساتھ اس سے شغل کر رہا تھا۔ عابد
نے اس سے ایک گھنٹے کی مہلت لی تھی اور ایک گھنٹے سے
زیادہ وقت گزر چکا تھا۔ وہ ابھی سوچ رہا تھا کہ اسے دوبارہ
کال کرے کہ قاریہ کے موبائل کی بیل بجی۔ اس نے کال
ریسیو کی۔ عابد نے کہا۔ ”مجھے منظور ہے۔ میں تمہارے پاس
آ رہا ہوں لیکن مجھے نہیں معلوم کہ تم کہاں ہو؟“

”تمہارے گھر میں جو میرے آدمی موجود ہیں، ان کو
معلوم ہے کہ تمہیں کہاں لانا ہے۔“

”ٹھیک ہے لیکن میں پیپرز پر سائن اس وقت کروں
گا جب تم امی اور قاریہ کو میرے حوالے کرو گے۔“

”مجھے منظور ہے۔“ قادر حیات فوراً مان گیا کیونکہ
اس کا ایسا کرنے کا ارادہ نہیں تھا۔ ایک بار عابد اس کے ہاتھ
آ جاتا تو وہ قاریہ کے حوالے سے دھمکی دے کر اس سے کچھ
بھی کر سکتا تھا۔

”ٹھیک ہے، میں آ رہا ہوں۔“ عابد نے کہا۔
”کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش مت کرنا۔“ قادر
حیات نے اسے خبردار کیا۔ ”ورنہ تم جانتے ہو میں کیا کر
سکتا ہوں۔“

”کوئی چالاکی نہیں کروں گا۔“ عابد نے کہا اور کال
کاٹ دی۔ قادر حیات مسکرانے لگا۔ اس نے زیر لب کہا۔
”ایک بار تم یہاں آؤ تو...“
اس نے اپنے ملازم کو آواز دی اور اسے حکم دیا۔
”اس لڑکی کو یہاں لے آؤ۔“
”جو حکم سرکار۔“ ملازم بولا۔

☆☆☆

اشرف شاہ کی حالت بُری تھی۔ وہ اپنی دو انگلیوں اور
ایک کان سے محروم ہو گیا تھا۔ عابد نے کٹر اور استرا استعمال
کیا تھا۔ بالآخر اس نے زبان کھول دی تھی۔ اس نے قادر
حیات کے ڈیرے کی نشان دہی کر دی تھی۔ عابد نے وہاں
کے حفاظتی انتظامات کے بارے میں پوچھا۔ اشرف نے
روتے دھوتے بتایا کہ وہاں قادر حیات کے خاص بندے
بھی چار پانچ ہوتے ہیں جبکہ ڈیرے پر موجود لوگوں کی
تعداد درجن ہوتی تھی اور وہ سب اسلحہ استعمال کرنا جانتے
تھے۔ اس سے تمام معلومات حاصل کرنے کے بعد اس نے
قادر حیات کو کال کی۔ اس کے ذہن میں ایک پلان آرہا

ارض، فرض، قرض

کرتے ہو۔“ عابد کا لہجہ سرد تھا۔ یہ تیرہ تاریخ کا چاند تھا اور سات بجے چاند بلند ہوا تو پہاڑوں میں اس کی روشنی پھیل گئی۔ اس وقت وہ قادر حیات کے ڈیرے سے کچھ دور رہ گئے تھے۔ اشرف شاہ اسے گائیڈ کر رہا تھا۔ وہ جی سڑک تک پہنچے تو عابد نے جیب کی ہیڈ لائٹس بند کر دیں۔ اشرف شاہ خوفزدہ ہو گیا۔

”یہ کیا کر رہے ہو۔۔۔ اس راستے پر بغیر روشنی کے گاڑی چلانا بہت خطرناک ہوگا۔“

”تم فکر مت کرو، میں خود کشی کرنے والا شخص نہیں ہوں۔“ عابد نے کہا۔ اس نے اشرف شاہ سے کاغذات لے لیے تھے۔ وہ اس نے اپنی شرٹ کے اندر چھپا رکھے تھے۔ کچے راستے پر جیب کے انجن کو زیادہ زور لگانا پڑ رہا تھا اور اس کے غرانے کی آواز یقیناً آس پاس پھیل رہی تھی۔ ان پہاڑوں پر تمباکو کاشت کرنے والوں کے فارمز تھے۔ یہاں مقامی آبادیاں کم تھیں البتہ فارمز میں کام کرنے والے مزدوروں نے جگہ جگہ جی کوٹھریاں بنا رکھی تھیں جہاں وہ اپنے خاندان سمیت رہتے تھے۔ دس منٹ بعد اشرف شاہ نے دور ایک کچے احاطے کی طرف اشارہ کیا۔

”وہ قادر حیات کا ڈیرا ہے۔“

”یہاں تک پہنچانے کا شکریہ۔۔۔ اب تم بھی آرام کرو۔“ عابد نے کہا اور اچانک اس کے سر پر پستول کا دستہ مارا۔ وہ کراہ کر آگے جھکا اور ساکت ہو گیا۔ وہ دو ڈھائی گھنٹے سے پہلے ہوش میں نہ آتا۔ عابد نے جیب ایک طرف روک دی۔ اس نے چابی نکال لی اور رائفل لے کر نیچے اتر آیا۔ یہ چھوٹی نال کی بارہ بوروالی رائفل تھی۔ اس میں ایک وقت میں پانچ کارتوس لوڈ کیے جاسکتے تھے اور ہر بار کلب گھما کر نیا کارتوس نال میں لانا پڑتا تھا مگر مار اور درستی کے لحاظ سے یہ بے مثال ہتھیار تھا۔ عابد تیز قدموں سے درختوں اور دیواروں کے سائے میں قادر حیات کے ڈیرے کی طرف بڑھا۔ دیواریں جی مگر سات سے آٹھ فٹ بلند تھیں۔ ایک جگہ دیوار کے ساتھ پتھر پڑا ہوا تھا۔ عابد نے اس پر چڑھ کر دیوار پر ہاتھ جمائے اور اڑ پر اٹھا۔ پیٹ کے بل دیوار پر ٹک کر اس نے اندر کا جائزہ لیا۔ یہاں بجلی نہیں تھی مگر چاندنی میں اندر کا منظر واضح تھا۔

سیب کے ایک چھوٹے باغ کے ساتھ ایک خوب صورت کھیریل کی چھت والی چھوٹی عمارت تھی۔ اس کے آگے بڑا محن تھا جس میں چار پائیاں بچھی تھیں اور پلاسٹک کی میز و کرسیاں رکھی تھیں۔ اس سے ذرا آگے احاطے کی دیوار

تھا۔ اگرچہ اس میں رسک تھا لیکن وہ فار یہ اور ماں کو آزاد کرانے کے لیے ہر خطرہ مول لینے کو تیار تھا۔ اس نے اشرف سے کہا۔ ”تیار ہو جاؤ، تم میرے ساتھ چلو گے۔“

”اور میں۔“ بابر نے پوچھا۔

”تم یہیں رہو گے۔“ عابد نے کہا اور اس کے سر پر پستول کا دستہ رسید کر دیا۔ وہ بے ہوش ہو کر لڑھک گیا۔ عابد نے اسے کھینچ کر اسٹور میں بند کر دیا۔ اگر وہ ہوش میں آ کر خود کو آزاد کرا لیتا تب بھی اسٹور سے باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ اشرف کی حالت بری تھی لیکن وہ انکار نہیں کر سکتا تھا۔ عابد نے اسی کی گاڑی استعمال کی۔ یہ چھوٹی دو دروازوں والی جیب تھی۔ عابد نے اسے جیب میں دھکیلا۔ اس نے اپنی رائفل ساتھ لے لی تھی۔ پستول اس کے پاس پہلے ہی تھا۔ باہر تاریکی پوری طرح چھا چکی تھی۔ اشرف کے مطابق انہیں کوئی بیس میل دور جانا تھا۔ اس میں آخری دو میل کا سفر ایک جی پہاڑی سڑک پر تھا۔ عابد نے اشرف شاہ کے پاؤں کھول دیے تھے لیکن اس کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ عابد نے اسے وارننگ دی۔ ”اگر تم نے کوئی حرکت کی تو اپنی موت کے ذمے دار خود ہو گے۔“ وقاداری اچھی چیز ہے لیکن قادر حیات جیسے آدمی کے لیے مرجانا کتنا مناسب ہوگا، یہ تم خود سوچ سکتے ہو۔ وہ پلٹ کر تمہارے بارے میں سوچے گا بھی نہیں۔“

”میں۔۔۔ کوئی حرکت نہیں کروں گا۔“ اس نے سہم کر کہا۔ ایک کان اور دو انگلیوں سے محروم ہو کر اس کی ساری اکڑفوں رخصت ہو گئی تھی۔

”اسی میں تمہاری عافیت ہے۔“ عابد نے جیب آگے بڑھادی۔ ”یہ جیب کس کی ہے؟“

”میری ہے۔“ اشرف نے جواب دیا۔

”تم افغانی ہو؟“ عابد نے کہا تو وہ حیران رہ گیا۔

”تم نے کیسے جانا؟“

”میرا آئے دن تم لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے۔“

اشرف نے اعتراف کیا۔ ”میرا تعلق شمالی افغانستان

سے ہے۔ لیکن میں بیس سال سے یہیں ہوں۔“

”تم اور تمہارے جیسے ہزاروں لاکھوں بیس تیس

سال سے اسی سرزمین پر بیٹھے ہیں، یہاں کا کھار یہ ہے ہیں اور

اسی ملک کے خلاف کام کر رہے ہیں۔“ عابد نے جی سے کہا۔

”منشیات اور اسلحے کی ساری اسمگلنگ تم لوگ کرتے ہو۔“

”میں ان دونوں میں سے کوئی کام نہیں کرتا۔“

”تم اس سے بھی گھٹیا کام کرتے ہو، عورتوں کو اغوا

کے ساتھ چند کچی کوٹھریاں بنی ہوئی تھیں۔ کوٹھریوں کے سامنے دو مسلح افراد ٹھہل رہے تھے اور کبھی کبھی ایک طرف رکھے لوہے کے ڈرم میں جلتی آگ سے ہاتھ سینکتے تھے۔ کچھریں والی عمارت کے سامنے بھی دو مسلح آدمی موجود تھے۔ جائزہ لے کر وہ خاموشی سے اندر اتر آیا اور درختوں کے درمیان جھکا جھکا کچھریں والی عمارت کے عقبی حصے کی طرف بڑھا۔ وہ سامنے سے نظروں میں آئے بغیر نہیں جاسکتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ یہاں صرف چار مسلح افراد نہیں تھے، اشرف شاہ کے مطابق ان کی تعداد درجن بھر تھی اور کسی بھی ہنگامہ آرائی کی صورت میں وہ فوری مسلح ہو کر آجاتے۔ عمارت کے عقب میں دور تک ڈھلان پر تمباکو کے پودے لگے ہوئے تھے مگر اس وقت یہاں کوئی نہیں تھا۔

عمارت کے پیچھے بھی ایک دروازہ تھا مگر وہ اندر سے بند تھا۔ اس کے علاوہ دو کھڑکیاں تھیں اور ان پر گرل تھی۔ عمارت ایک منزلہ تھی اس لیے اوپر جانے کا بھی کوئی فائدہ نہیں تھا۔ ابھی وہ سوچ رہا تھا کہ کیا کرے کہ عقبی دروازہ کھلا۔ وہ فوری دیوار سے چپک گیا۔ ایک ملازم چلیے والا شخص کچرے کا تھیلا اٹھائے باہر نکلا اور کچھ دور واقع بھٹی کی طرف بڑھا۔ اس کا خانہ کھول کر اس نے کچرا اندر ڈال دیا۔ یہ بھٹی تمباکو پکانے کے لیے استعمال کی جاتی تھی۔ اس سے پہلے وہ شخص واپس آتا، عابد خاموشی سے کھلے دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ یہ ایک راہداری تھی جس کے دونوں طرف دو کمرے تھے۔ آگے راہداری نشست گاہ میں کھل رہی تھی۔ کل عمارت بس اتنی تھی۔ اس سے پہلے کہ ملازم واپس آتا، وہ دائیں طرف کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ یہ سجا سجا یا بیڈروم تھا۔ اس کا اعلیٰ فرنیچر اور فرش کا دبیز قالین بتا رہا تھا کہ یہ قادر حیات کے لیے مخصوص ہے۔ دیوار پر لگا کیروسین لیپ جھل رہا تھا۔ عابد چونکا۔ بڑی مسہری پر کوئی کمبل اوڑھے لیٹا ہوا تھا۔ اس نے بے آواز دروازہ بند کیا اور مسہری کی طرف بڑھا۔ پستول آگے کرتے ہوئے اس نے اچانک سونے والے کے منہ سے کمبل کھینچا تو بری طرح چونکا۔ وہ قاریہ بھی جو بے بسی سے بندھی پڑی تھی اور اس کے ہاتھ پیر بھی بندھے ہوئے تھے۔

”قاری تو...“ عابد نے بے تابی سے کہا اور پستول رکھ کر اس کا منہ کھولنے لگا۔ قاریہ کی آنکھیں تیزی سے گھوم رہی تھیں جیسے ہی عابد نے اس کا منہ کھولا وہ چلائی۔

”بھائی بچو...“

اسی لمحے عابد کو اپنے عقب میں کسی کی موجودگی کا

احساس ہوا لیکن اس سے پہلے کہ وہ پلٹتا، کوئی چیز اس کی گدی سے ٹکرائی اور اسے ہوش نہیں رہا۔ وہ اوندھے منہ مسہری کے ساتھ گر پڑا۔ وار کرنے والا قادر حیات تھا۔ اس نے چلائی ہوئی قاریہ کا منہ دوبارہ کپڑے سے بند کیا۔ ”یا گل کا بچہ... بیوقوف سمجھتا تھا کہ اتنے آرام سے ادھر کھس آئے گا۔“

عابد کو ہوش آیا تو وہ کانپ اٹھا کیونکہ اسے بہت سرد پانی منہ پر ڈال کر ہوش میں لایا گیا تھا۔ وہ نشست گاہ میں تھا اور ایک کرسی پر اس طرح بیٹھا تھا کہ اس کے دونوں ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ سامنے صوفے پر قادر حیات شاہانہ انداز میں بیٹھا دھسکی سے شغل کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ ایک مسلح آدمی کھڑا تھا۔ قادر حیات نے طنزیہ انداز میں مسکرا کر کہا۔ ”اب تجھے ہوش آگیا ہوگا۔“

عابد نے سر جھٹکا۔ ”تم جان گئے تھے کہ میں اندر آگیا ہوں۔“

”ہاں، میرا ایک آدمی اوپر رات میں دیکھنے والی دور بین کے ساتھ تھا۔ اس نے تجھے دیکھ لیا پھر تجھے اندر بلایا اور تو آرام سے چوہے دان میں چلا آیا۔ میں جانتا تھا تو اپنے گھر پہنچ گیا ہے اور ان دونوں گدھوں کو قابو کر لیا ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا تو یہیں آئے گا۔“

عابد محسوس کر رہا تھا کہ وہ بُری طرح پھنس گیا ہے اور اس کی پوزیشن بہت نازک ہے۔ قادر حیات نے نہ صرف اس کی ماں اور بہن کو قید کیا ہوا تھا بلکہ اب وہ خود اس کے قابو میں آگیا تھا۔ وہ اس سے مکان اور ملکیت کے کاغذات پر سائن کر سکتا تھا۔ اس کے بعد وہ ان کے ساتھ کچھ بھی کرنے کے لیے آزاد تھا۔ وہ انہیں مار کر غائب کر سکتا تھا یا ان کی لاشیں کہیں پھینک دیتا تب بھی اس پر کوئی الزام لگانا مشکل تھا۔ اس کی گردن دکھ رہی تھی۔ اس نے گہری سانس لی اور بولا۔ ”قادر حیات! تم اچھی طرح جانتے ہو کہ یہ مکان اور زمین میرے باپ کی ملکیت ہے اس پر تمہارا کوئی حق نہیں ہے۔“

”اب بن گیا ہے۔“

”ٹھیک ہے، تجھے منظور ہے۔ تم مجھ سے پیپرز پر سائن لے سکتے ہو لیکن یہ تبھی ہوگا جب تم میری ماں اور بہن کو آزاد کر دو گے۔“

قادر حیات مسکراتا رہا۔ ”میں بے وقوف نہیں ہوں، انہیں آزاد کر دوں اور پھر تم انکار کر دو تو میں زیادہ سے زیادہ تمہاری جان لے سکوں گا۔“

ارض، فرض، قرض

دوسری طرف گرا مگر وہ حیرت انگیز پھرتی سے اچھل کر صوفے کے دوسری طرف مچلا گیا۔ اس کا آدمی زمین سے اٹھ رہا تھا اور اس نے اپنی شاٹ گن اٹھالی تھی مگر اس سے پہلے کہ وہ قائر کرتا عابد نے گولی چلا دی وہ اس کے سینے میں اتر گئی۔

اسی لمحے دھماکے سے باہر کا دروازہ کھلا اور ایک شخص رانگل بدست نمودار ہوا۔ اسے دیکھتے ہی عابد تیزی سے کمرے کی طرف پسپا ہوا اور اس نے آنے والے پر دو قائر کیے مگر وہ بچ گیا اور جب تک وہ رانگل سیدھی کرتا، عابد بیڈ روم کے مخالف والے کمرے میں داخل ہو گیا۔ یہاں سے نشست گاہ کا بڑا حصہ نظر آ رہا تھا۔ قادر حیات وہیں کہیں تھا اور وہ اس کی نظروں سے بچ کر باہر نہیں جاسکتا تھا۔ کچھ دیر بعد اس کی آواز آئی۔ ”عابد! تم بچ کر نہیں جا سکتے... تمہاری ماں ہمارے پاس ہے۔“

”اور تمہاری جان میرے قبضے میں ہے۔ تم مرے بغیر یہاں سے گزر نہیں سکتے۔“ عابد نے جواب دیا۔ اس کا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا۔ قاریہ ان لوگوں کی رسائی سے دور تھی لیکن اس کی ماں ان کے قبضے میں تھی اور وہ اسے استعمال کر سکتے تھے۔ اس کی بات کے جواب میں قادر حیات نے چیخ کر اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ اس کی ماں کو لے آئیں۔

☆☆☆

عابد کے جانے کے چند منٹ بعد اشرف شاہ بٹنے لگا تھا۔ جب وہ اس کے سر پر ضرب لگا رہا تھا تو اس نے جان کر جسم ڈھیلا چھوڑ دیا اس لیے ضرب ٹھیک سے نہیں لگی تھی اور وہ جلد ہوش میں آ گیا۔ اس نے اٹھ کر اپنے ہاتھ آزاد کرانے کی کوشش شروع کی۔ جلد وہ اس میں بھی کامیاب رہا۔ اگرچہ کئی ہوئی انگلیوں کے زخم سخت تکلیف دے رہے تھے مگر اس نے کسی نہ کسی طرح خود کو آزاد کرا لیا۔ وہ کراہتے ہوئے نیچے اترا کیونکہ جیب میں چابی نہیں تھی۔ وہ دروازے سے لگا گھرے سانس لے رہا تھا کہ پاس ہی سے کسی نے کہا۔ ”مبارک ہو۔“

اشرف شاہ کی جان نکل گئی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تو بلال اس کے سامنے کھڑا تھا۔ ”قادر حیات کا اڈا کہاں ہے؟“

انکار کا فائدہ نہیں تھا۔ اشرف شاہ نے ہاتھ سے ڈیرے کی طرف اشارہ کیا تو بلال کا گھونسا اس کے سر پر لگا اور وہ ایک بار پھر بے ہوش ہو گیا۔ بلال نے اسے اٹھا کر

”دوسری صورت میں تم پر کیسے اعتبار کروں؟“

”تم کرو گے۔“ قادر حیات ذرا جھک کر بولا۔

”کیونکہ تم مجبور ہو۔“

”مجھے... مجھے سوچنے کی مہلت دو۔“ عابد نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔

”تمہارے پاس صرف دس منٹ کی مہلت ہے۔“

قادر حیات بولا۔ ”تمہاری بہن میرے بیڈ روم میں ہے۔ اگر تم نے سائن نہ کیے تو میں اندر چلا جاؤں گا۔“

عابد لرز گیا۔ اس نے کہا۔ ”تم ایسا نہیں کر سکتے۔“

”میں ایسا ہی کروں گا۔“ قادر حیات نے دیوار پر لگی گھڑی کی طرف دیکھا۔ ”تمہارے پاس نو منٹ ہیں۔“

عابد کے چہرے پر کھٹکھٹ کے آثار نمایاں تھے۔ وہ سمجھتا تھا کہ قادر حیات جیسے شخص پر اعتبار کرنا کس قدر مہلک ہو سکتا ہے۔ وہ سانس اور ہچھو سے زیادہ خطرناک تھا۔ ایک بار وہ سائن کر دیتا تو کھل طور پر اس کے رحم و کرم پر آ جاتا۔

قادر حیات ہر گزرتے منٹ پر اعلان کر رہا تھا۔ ساتھ ہی وہ اسے بتا رہا تھا کہ ایک بار اس نے یہ موقع گنوا دیا تو پھر معاملہ ان تینوں کی موت تک جائے گا۔ وہ انہیں چھوڑنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ وہ بعد میں بھی اس مکان اور زمین پر قبضہ کر سکتا تھا۔ پیسا اس کی ہر مشکل کو آسان کر دیتا۔ وہ مکان اور زمین کے ساتھ جان اور آبرو سے بھی جاتے۔ قادر حیات نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”یہ دونوں چیزیں واپس نہیں ملیں گی۔ مکان اور زمین تو تم اور بھی بنا سکتے ہو۔“

ایک منٹ رہ گیا تو قادر حیات کھڑا ہو گیا۔ اس بار عابد خود پر قابو نہ رکھ سکا۔ ”ٹھیک ہے... ٹھیک ہے... میں سائن کر رہا ہوں۔“

قادر حیات مسکرایا اور اس نے کاغذات اور بین عابد کے سامنے میز پر رکھ دیا۔ اس کے اشارے پر اس کے آدمی نے عابد کے ہاتھ کھول دیے۔ عابد نے بہ ظاہر دونوں ہاتھ میز کی طرف بڑھائے جیسے سائن کرنے جا رہا ہو لیکن اس نے دونوں ہاتھ ٹپکتے ہوئے اچانک پیچھے کی طرف دوپٹی جھاڑی اور قادر حیات کا آدمی اچھل کر دیوار سے جا ٹکرایا۔ قادر حیات اپنا پستول نکال رہا تھا کہ عابد اس سے جا ٹکرایا اور اسے لیتا ہوا زمین پر گرا۔ قادر حیات کراہا مگر اس نے پستول نہیں چھوڑا۔ البتہ جب عابد نے سر اس کے منہ پر مارا تو وہ بلبلا گیا اور اس بار عابد پستول لینے میں کامیاب رہا۔ اس نے قلابازی کھائی اور قادر حیات کے

دروازہ چیک کیا۔ یہ زنجیر لگا کر باہر سے بند تھا اس نے اسے کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ وہاں لائین کی روشنی تھی اور ایک بوڑھی خوفزدہ عورت چار پانی پر بیٹھی تھی۔ بلال نے جلدی سے ہونٹوں پر انگلی رکھی اور پھر آہستہ سے بولا۔
 ”آپ عابد کی امی ہیں؟“
 ”ہاں، تم کون ہو؟“

”میں اس کا دوست ہوں۔۔۔ اس کے پیچھے یہاں آیا ہوں۔“

ماں بے چین ہو گئی۔ ”عابد یہاں آ گیا ہے، یہ اس نے کیا کیا؟“

”ماں جی قاریہ کہاں ہے؟“
 ماں کا چہرہ ست گیا۔ ”وہ اسے یہاں سے زبردستی لے گئے ہیں۔“

بلال نے دروازے کی درز سے باہر جھانکا۔ ایک آدمی اسی طرف آرہا تھا۔ اس نے ماں سے کہا۔ ”ایک آدمی ادھر آ رہا ہے۔ وہ اندر آئے تو آپ اسے متوجہ رکھنا، میں اسے قابو کر لوں گا۔“

مگر وہ کچھ کر نہیں سکی۔ کواڑ باہر کھل رہے تھے اس لیے بلال ان کی آڑ بھی نہیں لے سکتا تھا۔ آنے والے نے فوراً اس کی موجودگی بھانپ لی مگر اس نے شور مچانے کے بجائے اپنی شاٹ گن کا رخ اس کی طرف کرنے کی کوشش کی اور اسی سے بلال کو موقع مل گیا۔ اس نے اسے گریبان سے پکڑ کر کھینچا اور سر کی ٹکڑی ماری۔ وہ ڈھیلا ہوا تو اس کی رائفل چھین کر ایک طرف پھینک دی اور اسے گھما کر اس کی گردن ہاتھ سے دبالی۔ وہ ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے خود کو چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ خاصا مضبوط نوجوان تھا مگر اناڑی تھا اس لیے شدید کوشش کے بعد بالآخر وہ ڈھیلا پڑ گیا اور بے ہوش ہو گیا۔

بلال نے اسے ایک طرف پھینکا اور خود گہری سانس لی۔ اب اس کے زخم میں زیادہ تکلیف تھی۔ اس کے پاس پستول تھا۔ اس نے شاٹ گن اٹھالی۔ بے ہوش آدمی کے پاس اس کے بلٹ کا پاؤچ بھی تھا۔ پھر اس نے اس کے سر پر شاٹ گن کا دستہ مارا۔ وہ قبل از وقت ہوش میں آ جاتا تو مشکل کھڑی کر سکتا تھا۔ وہ دیکھ چکا تھا کہ اشرف شاہ وقت سے پہلے ہوش میں آ گیا تھا۔ پھر اس نے کھلے دروازے سے باہر جھانکا۔ ایک آدمی کھیریل والی عمارت کے دروازے پر مورچا جمائے ہوئے تھا۔ وہ وقفے وقفے سے اندر قائر کر رہا تھا۔ دوسرا کوٹھری کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شاید

جیب کے عقبی حصے میں ڈالا اور ڈیرے کی طرف بڑھا۔ جب وہ عابد کے گھر سے نکلا تو اس کا ارادہ سچ سچ چلے جانے کا تھا مگر کچھ دیر بعد اسے لگا کہ اس نے عابد کو اکیلا چھوڑ کر اچھا نہیں کیا۔ اس کی ماں اور بہن دشمن کی قید میں تھیں اور اسے ان کو آزاد کرانا تھا۔ اسے مدد کی ضرورت تھی۔ وہ نیچے ہائی وے سے پلٹ آیا لیکن براہ راست اندر آنے کے بجائے وہ گیٹ کے پاس رک گیا۔ کچھ دیر بعد عابد جیب لے کر نکلا۔ اس کے ساتھ اشرف بیٹھا تھا۔ بلال سمجھ گیا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ عابد کے جاتے ہی وہ گیٹ پھلانگ کر اندر گیا اور اس کی موٹر سائیکل لے کر نکل آیا۔ عابد نے بعد میں موٹر سائیکل اندر کھڑی کر دی تھی اور اس کی چابی بھی اس میں لگی ہوئی تھی۔ چند منٹ بعد وہ جیب کا پیچھا کر رہا تھا۔ اس کی شناخت آسان تھی، اس کی ایک سیل لائٹ ٹوٹی ہوئی تھی۔

وہ کسی قدر فاصلے سے تعاقب کرنے لگا کیونکہ اس وقت ہائی وے پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا پھر جب جیب کے راستے پر مڑی اور اس کی روشنیاں بند ہو گئیں تو اس نے بھی احتیاطاً موٹر سائیکل کی روشنیاں بند کر دیں۔ کچے پر موٹر سائیکل چلانا زیادہ مشکل ثابت ہو رہا تھا اس لیے جیب آگے نکل گئی اور جب وہ جیب کے پاس پہنچا تو اس میں عابد نہیں تھا اور اشرف شاہ ہوش میں آ گیا تھا۔ اس سے قادر حیات کے ٹھکانے کا پوچھ کر وہ اسے بے ہوش کر کے اس طرف بڑھا۔ اس نے سامنے والے حصے کا رخ کیا جہاں دیوار کے اندر کوٹھریاں بنی ہوئی تھیں۔ ان کی چھت کی لکڑیاں باہر نکلی ہوئی تھیں۔ وہ سب سے آخری لکڑی پکڑ کر اوپر چڑھا۔ کھنچاؤ سے زخم میں تکلیف ہوئی مگر یہ زیادہ نہیں تھی۔ وہ چھت کے ساتھ دیوار پر چڑھا۔ چھت زمین کی تھی اور اس پر دباؤ پڑتا تو وہ شور کرتی۔ اس طرف کوئی نہیں تھا۔ وہ نیچے اتر آیا مگر جب اس نے دیوار سے جھانکا تو کوٹھریوں کے سامنے دو مسلح افراد ٹپکتے ہوئے نظر آئے۔

ایک فرد صحن کے پار کھیریل والی عمارت کے سامنے تھا۔ اچانک اندر سے دبے دبے قائر کی آواز آئی اور باہر موجود فرد عمارت کی طرف لپکا۔ اس نے دروازہ کھولا تھا کہ اندر سے اس پر قائر ہوئے مگر وہ بچ گیا اور پھر اس نے رائفل سے جوابی قائر کیا۔ کوٹھریوں کے سامنے موجود افراد میں کھلبلی مچی اور وہ بھی عمارت کی طرف بڑھے۔ ان کے جاتے ہی بلال آڑ سے نکلا اور اس نے پہلی کوٹھری کا

آیا۔ اس نے جلدی سے اس کے ہاتھ پاؤں کھولے اور بولا۔ ”جلدی نکلو... یہاں آگ لگی ہوئی ہے۔“

فارہ سب سن رہی تھی۔ اس کے پاؤں کی چپل غائب تھی۔ وہ ایسے ہی عابد کے ساتھ باہر آئی۔ لیکن جب اس نے عقبی دروازہ کھولنے کی کوشش کی تو وہ لاک نکلا۔ نشست گاہ کی طرف اب آگ پوری طرح پھیل چکی تھی اور اس طرف سے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اندر دھواں بھر رہا تھا۔ عابد نے کوشش کی۔ فارہ نے ہر اسماں ہو کر کہا۔ ”بھائی، باہر کیسے نکلیں؟“

”پیچھے ہٹو۔“ عابد نے کہا اور دروازے کے لاک والے حصے پر لگا تار کٹی فارہ کیسے۔ اس کے پرچے اڑ گئے۔ عابد نے ہینڈل پکڑ کر کھینچا تو اس بار دروازہ کھل گیا۔ وہ باہر نکلے تھے کہ ایک سایہ تمباکو کے پودوں میں گھستا دکھائی دیا۔ عابد نے اس پر فارہ کیا تو ایک چیخ سنائی دی۔ عابد فارہ کا ہاتھ پکڑ کر تیزی سے اگلے حصے میں آیا۔ یہاں ایک آدمی شعلوں میں گھرا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ فارہ نے کہا۔ ”یہ قادر حیات ہے۔“

وہ قادر حیات ہی تھا۔ اس نے موقع سے فائدہ اٹھا کر باہر نکلنے کی کوشش کی تھی مگر وہ آگ کی زد میں آ گیا تھا۔ آگ نے پوری طرح اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ حیرت انگیز طور پر وہ آواز نکالے بغیر جل رہا تھا۔ شاید اسے خوف تھا کہ آواز سن کر عابد نہ آجائے مگر کب تک... بالآخر اس کی برداشت جواب دے گئی اور وہ زمین پر گر کر لوٹنے اور چلانے لگا۔ کوٹھری سے ماں اور اس کے ساتھ بلال نکل آیا۔ فارہ اور عابد ماں کی طرف دوڑے اور بیک وقت اس سے لپٹ گئے۔ وہ ان دونوں کو دیکھ رہی تھی اور ٹٹول رہی تھی۔ پھر عابد بلال کی طرف بڑھا اور اس سے لپٹ گیا۔ ”تم واپس آگئے دوست؟“

”ہاں یار! مجھے اچھا نہیں لگا کہ میں تمہیں اس طرح درمیان میں چھوڑ کر چلا جاؤں... لیکن میں اپنے طریقے سے پیچھے آیا تھا۔“

”اسی وجہ سے ہم بچ گئے ورنہ یہ جانتا تھا کہ میں آؤں گا۔ اس نے میرے لیے ٹریپ بھی تیار کر لیا تھا۔ تمہارے بارے میں نہیں جانتا تھا ورنہ تم میرے ساتھ آتے تو پھنس جاتے۔“

”میں بروقت پہنچا۔“ بلال نے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ اندر تم نے کچھ کیا تھا جس کے بعد یہ ماں جی کو لینے آئے تھے۔“

اسے شک ہو گیا تھا۔ وہ اپنی رائفل آگے کیے اس طرف آنے لگا۔ جب وہ دس قدم دور رہ گیا تو بلال نے اچانک نیچے بیٹھتے ہوئے اس پر پستول سے کئی فارے کیے اور فوراً آڑ میں ہو گیا۔ ایک دھماکے سے شاٹ گن کی گولی سامنے دیوار پر لگی۔ بلال نے جھانک کر دیکھا تو وہ نیچے ساکت پڑا ہوا تھا۔

☆☆☆

عابد محسوس کر رہا تھا کہ اسے موقع تو ملا ہے لیکن وہ اب بھی پھنسا ہوا ہے۔ اگر اس کی ماں کو لایا گیا تو وہ ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو جائے گا۔ دروازے پر موجود آدمی رہ رہ کر اس کی طرف شاٹ گن سے فارے کر رہا تھا اور اسے جوابی کارروائی کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ اچانک اس کے ذہن میں ایک خیال آیا اور اس نے دیوار پر لگا ہوا کیروسین لمپ اتار کر اسے نشست گاہ کی طرف اچھال دیا۔ وہ زمین پر گر کر ٹوٹا تو وہاں آگ لگ گئی۔ قادر حیات چلا یا۔ وہ اپنے آدمیوں پر برس رہا تھا، انہیں گالیاں دے رہا تھا۔ اسی لمحے باہر سے پہلے پستول کے فارے کی اور پھر شاٹ گن کے فارے کی آواز آئی۔ قادر حیات چلا یا۔ ”اوہ حرام زادو... یہ کیا ہو رہا ہے؟“

”ملک جی... ادھر کوٹھری میں کوئی ہے۔ جیدا واپس نہیں آیا اور سب کو اندر موجود بندے نے گولی مار دی ہے۔“

”کوئی اور بھی اس کے ساتھ آیا تھا... تم سب آنکھیں بند کر کے بیٹھے رہے۔“

”وہ مجھے بھی گولی مار دے گا۔“ باہر موجود آدمی نے گھبرا کر کہا اور غائب ہو گیا کیونکہ قادر حیات چیخ چیخ کر اسے آوازیں دے رہا تھا مگر اس نے جواب نہیں دیا تھا۔ آگ اب صوفہ سیٹ کو لپیٹ میں لے چکی تھی۔ وہاں لکڑی کا خاصا سامان تھا۔ عابد نے کہا۔

”قادر حیات... اگر جل کر مرنا نہیں چاہتے تو ہاتھ اٹھا کر سامنے آ جاؤ۔“

”کبھی نہیں۔“ وہ غرایا۔ ”میرے ساتھ تم بھی مرو گے۔“

”میں اور فارہ پیچھے سے نکل جائیں گے، تم کیا کرو گے؟“ عابد نے کہا۔ ویسے اب وہ خطرہ محسوس کر رہا تھا کیونکہ آگ کی تپش یہاں تک محسوس ہو رہی تھی۔ وہ فارہ کو نکالنا چاہتا تھا مگر اسے خطرہ تھا کہ کہیں قادر حیات فرار نہ ہو جائے۔ البتہ جب آگ پھیلنے لگی تو مجبوراً وہ فارہ والے کمرے میں

”ہاں، میں اس گھٹیا شخص کے سامنے ہتھیار نہیں ڈال سکتا تھا۔“

ماں نے قادر حیات کو دیکھا جو اب خاموش اور ساکت تھا البتہ اس کے جسم سے شعلے اٹھ رہے تھے۔ ماں نے کہا۔ ”یہ شخص اپنی ہی آگ میں جل کر مرا ہے۔“

وہاں ان پانچوں کے سوا کوئی نہیں تھا اور وہ سب مارے جا چکے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ اشرف نے جھوٹ بولا تھا اور اس کی اسے پہلے ہی سزا مل چکی تھی۔ عابد نے کہا۔ ”ہمیں اب یہاں سے نکل جانا چاہیے۔“

☆☆☆

اگلی صبح ناشتے کے بعد بلال اور عابد باہر باغ والے حصے میں آئے۔ سرما کی ہلکی سی دھوپ اچھی لگ رہی تھی۔ انہوں نے بابر کورات میں ہی چھوڑ دیا تھا اور اسے خبردار کیا تھا کہ وہ اس طرف نظر آیا تو اس کی خیر نہیں ہوگی۔ بلال نے زمین اور باغ کو دلچسپی سے دیکھا۔ ”یہ تو بڑا اچھا ہے۔“

”میرے والد نے بنایا تھا، تب سے ایسے ہی پڑا ہے۔“

”ہمارا باپ بھی کچھ زمین چھوڑ کر گیا تھا اور وہی ہمارے لیے عذاب بن گئی۔“ بلال نے تلخی سے کہا۔ میکال اس کا ایک ہی بھائی تھا اور اس سے بارہ برس چھوٹا تھا۔ بلال روزگار کے لیے گھر سے نکلا۔ وہ تعلیم یافتہ تھا مگر اسے نوکری نہیں ملی اور بد قسمتی سے وہ منشیات کے سوداگروں کے چنگل میں پھنس گیا۔ ایک بار کام کیا تو یہ اس کی مجبوری بن گیا۔ کئی سال وہ پھنسا رہا۔ اس کا ضمیر اسے ملامت کرتا رہا مگر وہ ان سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکا تھا۔ کام کی وجہ سے وہ کئی کئی مہینے گھر سے دور رہتا۔ میکال کو اس نے اپنے چچا کے پاس چھوڑ رکھا تھا۔ اس کے چچا زاد بھائیوں نے میکال کو ہیر و پن کے نشے پر لگا دیا۔ جب تک اسے پتا چلا، بہت دیر ہو گئی تھی۔ میکال واپس نہیں آ سکتا تھا اور بالآخر وہ اس سفر پر نکل گیا جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔ ہاتھ اس کے چچا زادوں کا تھا لیکن بلال کو لگا کہ یہ اس کے کیے کی سزا ہے جو میکال نے بھگتی اور تب اس نے فیصلہ کیا کہ وہ موت کے سوداگروں کو تباہ کر کے رہے گا۔ وہ سامنے آئے بغیر ان کی مخبری کرنے لگا۔

کئی بار اس کی مخبری نا کام رہی لیکن جب معاملہ عابد کے ہاتھ میں آیا تو اس نے چھاپے مارے اور بہت ساری منشیات کے ساتھ کئی نامی گرامی مجرموں کو بھی پکڑا۔ وہ بلال کو آواز سے پہچانتا تھا اور ایک چھاپے کے موقع پر جب وہ

اسے گولی مارنے والا تھا، اس کی آواز سن کر رک گیا اور اسے جانے دیا۔ اس چھاپے سے فرار کے بعد بلال آوارہ گردی کرنے لگا تھا۔ اس کا دنیا سے دل اچاٹ ہو گیا تھا پھر وہ خود کو سزا دینے کے لیے نشے کی لت میں پڑ گیا۔ بلال اس کی کہانی سن کر حیران رہ گیا۔ اس نے پوچھا۔ ”اب تم کیا کرو گے؟“

”پتا نہیں، زمین سے میں پہلے ہی چچا زادوں کے حق میں دست بردار ہو گیا تھا، اب شاید کوئی کام دیکھوں۔ دراصل مجھے سوائے زمین کے اور کوئی کام آتا ہی نہیں ہے اور جو کیا ہے اس پر مرتے دم تک شرمندہ ہی رہوں گا۔“

”دوست... تم نے تلافی کر دی ہے۔ باقی اللہ معاف کرنے والا ہے۔“ عابد نے کہا۔ ”میری ایک پیشکش ہے۔“

رات میں عابد کی ماں سے بات ہوئی تھی اور اس نے عابد سے کہا۔ ”بیٹا اتنا اچھا لڑکا ہے کاش کہ قاریہ کا اس سے رشتہ ہو جائے۔ تم اس سے بات کر کے دیکھو... شاید اس کا دنیا میں کوئی نہیں ہے۔“

یہی وجہ تھی کہ عابد ہچکچاہٹ کے باوجود تیار ہو گیا تھا۔ ”دوست... تم جانتے ہو میں ملازمت مشن کی طرح کر رہا ہوں۔ میرے گھر والے اور عالیہ مشکل میں تھے۔ اس کے باوجود میں پڑوسی ملک چلا گیا۔ وہاں مجھے منشیات کے اسمگلروں کی بیخ کنی کرنا تھی۔ پھر مجھے شہر میں رہنا ہے، میں اس گھر کی حفاظت نہیں کر سکتا۔ تم نے قاریہ کو دیکھا ہے اور امی کی خواہش ہے کہ تم ان کے بیٹے بن کر یہاں رہو۔ اس گھر اور زمین کو مضبوط بازوؤں کی ضرورت ہے۔“

بلال کو اچھا لگا۔ اس نے کہا۔ ”تم جانتے ہو میرا آگے پیچھے کوئی نہیں ہے۔ میرا ماضی داغ دار ہے۔“

”ہمارا بھی کوئی نہیں ہے۔ تم نے دیکھ لیا جو رشتے دار تھا، اس نے کیا کیا۔ اس لحاظ سے ہم اور تم ایک جیسے ہیں۔ جہاں تک ماضی کا تعلق ہے تو وہ گزر چکا ہے۔ اب تم حال اور آنے والا کل دیکھو۔“

بلال نے مکان اور زمین کو دیکھا اور سر ہلایا۔ ”مجھے منظور ہے دوست۔“

عابد اس سے لپٹ گیا۔ انہیں دور سے دیکھتی قاریہ کے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ اس نے رات ماں اور بھائی کی باتیں سن لی تھیں۔

